Downloaded from Paksociety.com

جلد47 • شمارہ06 • جون2017 • زرِسالانہ 800 روپے • قیمت فی پرچا پاکستان 60 روپے •
E-mail:jdpgroup@hotmail.com(021)35802551 فیکس (021)35895313 فون • 74200 ... 229 ...

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

پبلشر و پروپرائٹر: عذرارسول • مقام اشاعت: C-63 فیز II ایکس ٹینشن ڈیفنس کمرشل ایریا، مین کورنگی روڈ کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن • مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

MEDORA OF LONDON

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com
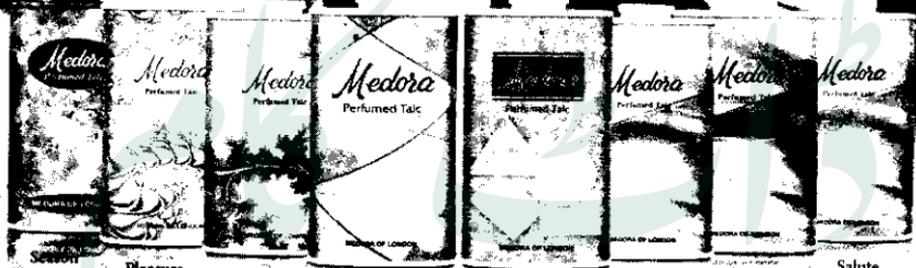
عزیزانِ من ...... السلامُ علیکم ......!

رمضان المبارک کی آمد آمد ہے۔ اس ماہِ مقدس کی مبارک باد کے ساتھ جون کا شمارہ حاضر ہے۔ ہمارے پڑوس میں جب سے موذی سرکار اقتدار میں آئی ہے وہاں تقریباً ہر روز نت نئی ہولناک وارداتیں جنم لے رہی ہیں۔ سڑک پار کرنے والی ایک گائے چلتے چلتے رک گئی اور ایک کار سوار نے راستہ بنانے کے لیے ہارن بجادیا، گائے تیزی سے سڑک پار کر گئی۔ بس ایک ہجوم نے کار کو گھیر لیا۔ کار سوار کو گھسیٹ کر باہر نکالا اور اسے ڈنڈوں اور ٹھوکروں سے اس بری طرح مارا کہ اس کی ایک آنکھ تک ضائع ہوگئی۔ دیگر گہرے زخموں کی بات الگ ہے۔ اس کا قصور یہ تھا کہ اس نے گئو ماتا پر ہارن بجایا تھا۔ وہ بے چارہ مسلمان نہیں، ایک کٹر ہندو تھا جو اپنے ہی ہم مذہب جنونیوں کا شکار بن گیا۔ گئو ماتا کی رکھشا کے نام پر دلی سے آسام تک خونی ہندو درندے دندناتے پھر رہے ہیں جن کے ہاتھوں پچاس کے لگ بھگ مسلمان نوجوان اجتماعی تشدد کے نتیجے میں موت کے گھاٹ اتارے جاچکے ہیں۔ ان درندوں کے خلاف سنجیدہ اور روادار ہندو بھی چیخ اٹھے ہیں، ٹیلی وژن پروگراموں میں اس ظالمانہ روش کو تنقید کا نشانہ بنایا جارہا ہے۔ خصوصاً ہندو سول سوسائٹی اور ہندو دانش ور شب و روز اس انسان کش رویّے کی مذمت کررہے ہیں۔ لیکن گجرات کو مسلمانوں کے خون میں نہلانے والے موذی کی سرکار خاموش تماشائی بنی ہوئی ہے، خوش ہے کہ اس بہانے مسلمان مارے جارہے ہیں، اس وحشیانہ جھونک میں دس پانچ ہندو بھی مارے یا لہولہان کردیے جائیں تو اس کے نزدیک چشم پوشی ہی بہتر ہے۔ مذہب کوئی بھی ہو، عقائد سے قطع نظر، خوں ریزی اور وہ بھی انسانوں کی، قابلِ نفرت اور قابلِ تعزیر قرار دیتا ہے۔ ہندو مذہب میں دیوی دیوتاؤں کے چرنوں میں حیوانی بھینٹ کا ذکر تو ملتا ہے لیکن کہیں بھی انسانوں کا گلا کاٹنے کی اجازت نہیں۔ یہ وحشی اور جنونی اپنی خون آشام حرکتوں سے اپنے دھرم کو بدنام کررہے ہیں۔ خاموشی، نیم رضامندی کی گھٹیا پالیسی سے موذی سرکار ان جنونیوں کو شہ دے رہی ہے۔ ایک طرف گئو رکھشا کا سیاہ قانون ہے تو دوسری طرف بھارت دنیا بھر میں گائے کے گوشت اور کھالوں کا سب سے بڑا برآمد کنندہ ہے۔ جب تک انتہا پسندوں کی یہ حکومت برقرار ہے، ہوش مندی اور اعتدال پر مبنی فیصلوں کی کوئی امید نہیں۔ انہیں پچھلے انتخابات میں اپنی غیر متوقع جیت کا گھمنڈ ہے، ہو سکتا ہے کہ اگلے انتخابات میں ووٹر اس انتہا پسندی کو یکسر مسترد کر کے بہتر حکمرانوں کو موقع دیں اور یہ بہیمانہ روش انجام کو پہنچے۔ ہم بھی اپنی محفل کا رخ کرتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ کس نے کیا روش اپنائی ہوئی ہے۔

شفقت محمود کی باتیں، کمالیہ سے ''28 اپریل کی شام بک اسٹال پر دوسرے چکر میں جاسوسی کا حصول ممکن ہوا جو اپنی تمام سحر انگیزی کے ساتھ جلوہ افروز تھا۔ ٹائٹل کی زردی ہنوز برقرار ہے۔ اس دفعہ حسینہ تقریباً مردانہ اسٹائل میں فرضی پستول کو پھونک مار کر دھواں اڑا رہی تھی۔ چوٹ کھا کر گرے ہوئے بندے کو پتا نہیں کس نے مارا تھا، اس کی دگرگوں حالت کافی تشویش ناک تھی۔ محفلِ یاراں میں اس دفعہ کافی ہلچل مچی ہوئی تھی۔ ابتدائی تبصرے پر .... پرلیلیٰ کوثر لاچاری (لاشاری) کو دیکھ کر کافی حیرت ہوئی۔ بہرحال مبارک ہو۔ کراچی سے اس دفعہ ڈاکٹر سبا ارشد بھی اپنے خصوصی نامے کے ساتھ جلوہ افروز تھیں۔ خوش آمدید۔ شکر ہے آپ کو بھی مریضوں کی چیر پھاڑ سے فرصت ملی اور محفلِ خطوط میں شرکت کی۔ اعتزاز اینڈ زریاب وصلی کی فرمائش کافی جاندار تھی۔ پتا نہیں کہاں اور کیسے ان کو رستم سیال کی زخمی ٹانگ نظر آگئی۔ بہت خوب صورت تبصرہ وصلیوں کا خاصّہ ہے۔ انیلا ظفر نے تو آتے ہی چھکے چوکے لگانے شروع کردیے۔ ایسی ایسی کھری کھری سنائیں کہ امید ہے ابھی تک سب کے منہ اور کان سرخ ہوں گے۔ وحشتِ دل کا خط بھی اچھا تھا۔ کہانیوں میں جنگِ دل ربا پڑھ کے ایسا لگا جیسے یہ دنیا اتفاقات کے سہارے چل رہی ہے۔ ایک کے بعد ایک! ایک کے بعد ایک اتفاق الامان الحفیظ ...... یقین جانیں ایسا لگا جیسے زنوبیا اسی کے لیے فوج میں بھرتی ہوئی تھی۔ انگارے مغل صاحب کی بہت تیز رفتار رہی۔ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اس میں بھی اتفاقات کا بھرپور عمل دخل تھا۔ آسیاں کا ملنا اس کے انگوٹھے کا تکنیکی استعمال کرنا بہت عجیب لگا۔ کیا ایسا ممکن ہے کہ ایک کٹے ہوئے انگوٹھے کو اتنی دیر تک استعمال کیا جائے۔ رائزل اپنی تمام تر شیطانیت اور جولانیت سمیت اسپتال برد ہوچکا ہے۔ یقیناً اس کا کردار اب ٹھنڈا ہوچکا ہے۔ قسطینا اپنی بربادی پر پشیماں ہے تو شاہ زیب وطن واپس آنے کے لیے پریشان۔ فارس امید ہے قسطینا کے دل کی نگری میں گھر کر جائے گا اور جاماجی کو بھی فتح یاب کریں گے۔ آوارہ گرد شہزی کی کیا ہی بات ہے، جذبۂ حب الوطنی سے لبریز۔ طلسم نور ہیرا اپنی حقیقی جگہ پاکستان پہنچ گیا ہے۔ اب آنسہ خالدہ کے بارے کیا حقائق سامنے آتے ہیں، شدت سے انتظار ہے۔ انسولین کا زہر جلد بازی میں جوائس رچرڈ بیان دے کر پھنس گئی ہے۔ حادثہ، تنویر ریاض کی اچھی کہانی تھی۔ مکافات، زویا اعجاز کی لاجواب تحریر۔ دوقومی نظریے کے پس منظر میں لکھی گئی مکافات ماضی قریب میں انڈین بی ایس ایف کی دگرگوں حالت کی ایسی تصویر کشی کی ہے کہ بے ساختہ داد دینی پڑی۔ لیکن علیل والی بات ہضم نہیں ہوئی۔ ناقابلِ گرفت اور غلط پیغام بھی اچھی کہانیاں تھیں جبکہ منظر امام کی مرگِ ناگہاں ایک اچھوتی تحریر تھی۔ کرم دین کے بیٹے نورو کی رُوداد کا اختتام ...... مجھے پہلے ہی اندازہ ہوگیا تھا لیکن تحریر کے سحر نے آخر تک جکڑے رکھا۔ فاروق انجم صاحب کی منصوبہ ساز نے اگلے پچھلے سارے ریکارڈ توڑ دیے ہیں۔ ساجد کے بارے میں صرف اتنا کہوں گا جن پہ تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے۔ ایسی زبردست اور جامع منصوبہ بندی کوئی انتہائی ذہین اور شاطر بندہ ہی کرسکتا ہے۔ لاجواب اور غیر متوقع انجام کی سسپنس سے بھرپور لاجواب تحریر تھی۔ اس ماہ کے لیے اتنا ہی تبصرہ میرے خیال میں کافی ہے۔ حیات باقی ملاقات باقی۔''

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

ایمانے زارا شاہ کی اسلام آباد سے کھری کھری باتیں ''ٹھنڈے شمارا پریل کے باوجود جاسوسی نے ہم تک پہنچنے میں سستی دکھائی۔ڈھونڈنے سے تو خدا بھی مل جاتا ہے یہ تو پھر ایک ڈائجسٹ تھا۔تھوڑی تلاش کے بعد پاپا کا ڈائجسٹ میرے ہاتھ میں تھا۔وکٹری کا نشان بناتی محترمہ کے علاوہ ٹائٹل وائٹل کچھ خاص نہیں لگا۔نکتہ چینی میں لیلیٰ کا انداز اور سبا ارشد کی انٹری شاندار تھی۔اعتزاز وزریاب وسلی ایک بار پھر ہلکے پھلکے انداز کے ساتھ براجمان تھے۔کہانیوں کی طرف نگاہ دوڑاتے ہی سب سے پہلے ایچ اقبال کی جنگِ دل ربا پڑھی۔ جنگ اور محبت کے گرد گھومتی ہوئی کہانی۔ویسے محبت بھی جنگ ہی کی قسم ہے۔ہوتی ہے نا کہانی تھرل اور ایڈونچر سے بھرپور تھی۔ہیلی کاپٹر، طیارے میزائل شاندار......لیکن جیسے انور نے تین مرتبہ سرحد پار کی اس سے پتا چلتا ہے لکھاری کچھ بھی کرسکتا ہے۔کسی بھی ملک کی سرحد پار کروانا اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ مجھے بھی کرنی ہے صاب کیپٹن زنوبیا کی بات کرلوں۔ ماشاء اللہ بے چاری محبت میں بھول گئی کہ اپنا ملک پہلے ہوتا ہے اس کے بعد دشمن ملک کے فوجی سے محبت کی پینگیں بڑھاتے ہیں۔انور جب جاسوس بن کے سرحد پار پیغام لے کے جاتا ہے تو کیا وہ اتنا بے وقوف ہوتا ہے اپنے ملک کی فوجی وردی پہن کے اوپر اور لباس پہن لیتا ہے۔آمیزنگ......تاکہ پکڑا جائے تو سیدھا اوپر جائے اور اس کے بعد جب اس کی گرفتاری عمل میں آتی ہے تو بجائے کسی سیل میں رکھنے کے ایک خیمے میں رکھتے ہیں۔یہ جاننے کے باوجود وہ دشمن ملک کا فوجی ہی نہیں جاسوس بھی تھا ماشاء اللہ کیا کہنے۔مزید برآں ٹیکنالوجی کا اس قدر آزادانہ استعمال......شاید میری ناقص عقل میں نہ آیا ہو۔ان سب باتوں کے باوجود کہانی بہت انٹرسٹنگ اور منفرد سی تھی۔منصوبہ ساز میں فاروق انجم نے سب کو ایک سے بڑھ کے ایک منصوبہ ساز دکھایا ہے۔ ایسی کمال کہانیوں کو پڑھتے ہوئے انسان اردگرد سے بیگانہ ہوجاتا ہے اتنا سسپنس۔ہر سطر تہلکہ انگیز......کہانی دلچسپ سے بھی دلچسپ ہوتی گئی۔کوئی بھی تکا لگانے سے قاصر تھی۔ اگر واقعی عرفان زندہ تھا تو رقم چھپائی کہاں تھی اور آخر میں رقم برآمد بھی ہوئی تو کہاں سے اف شاطر دماغ......اگر اسی دماغ کو سیدھا اپنے کام میں استعمال کرتا تب بھی ترقی کر ہی لیتا لیکن یہ شارٹ کٹ کے چکر نے سونے کی مرغی ایک ہی دفعہ ذبح کرڈالی اور جان کے الگ لالے پڑ گئے۔انسپکٹر نعمان جیسے فرض شناس پولیس والوں کی کمی نہیں ہے بشرطیکہ ناصر جیسے آستین کے سانپ ان کے ساتھ نہ ہوں......ویری ویلڈن۔زویا آپی کی مکافاتِ عمل کشمیر جیسے سلگتے موضوع پر تھی۔اس موضوع پر اتنا کچھ لکھا جاچکا پھر بھی لگتا ہے کچھ نہیں لکھا گیا۔الفاظ کا چناؤ بہترین سے بھی بہترین تھا۔ مجھے تو ہر لفظ دل میں اترتا ہوا محسوس ہوا شاید اس لیے کہ خود کشمیری ہوں۔کشمیر کے بارے میں لوگوں کو وہی دکھایا جاتا جو سنسر ہو کے پہنچتا ہے اور ایسے کتنے ہی عاقبت نااندیش روپ سنگھ اپنے ماں باپ کی خوش فہمیوں کا شکار ہو کر کشمیریوں کو شہید کرکے خود اسی طرح بے سکون ہو کے مرتے رہیں گے اور اکثر تو ڈپریشن کا شکار ہو کر خود کو گولی مار دیتے۔اسے کبھی انڈین میڈیا چھپاتا رہتا ہے یہ تب تک جاری رہے گا جب تک کشمیری آخری سانس تک لڑتے رہیں گے......ڈر جائیں سامراج سے وہ دل نہیں رکھتے۔کشمیر کے بیٹے ہیں، غلامی سے نفرت ہے ہمیں۔انڈیا کا خیال ہے سوشل میڈیا بند کرکے تسلط پالے گا تو یہ بھی اس کی خام خیالی ہے۔یہ جنگ برسوں سے جاری ہے جب میڈیا بھی نہیں تھا۔جنگیں جذبے وجنون سے جیتی جاتی ہیں سوشل میڈیا یا الیکٹرونک میڈیا سے نہیں۔یہ کہانی پڑھنے کے بعد شمارے کی باقی کہانیوں پہ تبصرہ کرنے سے قلم نے صاف جواب دے دیا ہے۔''

کراچی سے سعدیہ قادری کے دلی جذبات ''مئی کے ڈائجسٹ میں اپنا تبصرہ نہ دیکھ کر اداس سی ہوگئی اس لیے میں نے سوچا کہ آئندہ اس مایوسی سے بچنے کے لیے اس ماہ کچھ نہ کچھ لکھ کر بھیج دوں، بلیک لسٹ میں ہی سہی پر نام تو آہی جائے گا۔تبصرہ کرنے سے قاصر ہوں کیونکہ دو ماہ سے ڈائجسٹ نہیں پڑھا اور نہ پڑھ سکنے کی وجہ والدہ کی بیماری ہے۔جب امی کی طبیعت خراب ہوئی تو احساس ہوا کہ کتنی خاموشی سے امی نے پورے گھر کی ذمے داری اٹھائی ہوئی تھی۔آج اگر میں لکھنے پڑھنے کے لائق ہوں تو صرف امی کی وجہ سے، اکثر اولاد کو اپنے والدین کی قدر ومنزلت کا احساس نہیں ہوتا اور جب ان کے پاس یہ نعمت نہیں رہتی تب انہیں خیال آتا ہے لیکن جب بہت دیر ہوچکی ہوتی ہے۔آج میں اس موقر جریدے کے توسط سے سب سے یہ درخواست کروں گی کہ خدارا اپنے والدین کی قدر کریں، اگر آج آپ کسی لائق ہیں تو صرف اپنے والدین کی وجہ سے اور اپنے امی پاپا کو میں ہر چیز کے لیے شکریہ ادا کرتی ہوں۔''

مرحا گل، رمنا گل کی درابن کلاں سے مدہوشیاں ''اس مرتبہ جاسوسی اپنی ملین ڈالر مسکراہٹ اور چمکیلے بھڑکیلے، نوٹوں سے سجے والٹ، خون سے رنگیلے ہاتھ، کٹیلے سے نینوں کے ساتھ 29 کو ہمارے ہاتھوں میں پدھارا۔اوجی......جی خوش کردیا۔ایف ایس سی کے پیپرز کی ساری تھکاوٹ اتر گئی جب واپس آکر جاسوسی پیارے کو دیکھا اور پھر خوب مزے لے لے کر پڑھا۔سوچا ایگزام کے بعد انٹری دیں گے مگر جاسوسی پڑھ کر ایسا لگا جیسے افطار کے بعد روزہ دار کے سامنے ٹھنڈا میٹھا شربت رکھا ہو اور وہ اس سے سیراب نہ ہو۔سو ہم بھی اسی کیفیت میں مبتلا ہوئے اور لیٹر لکھ مارا۔ابتدائی سیٹ پر لیلیٰ لاشاری اینڈ اگلی دونوں سیٹوں پر صنف نازک کو دیکھ کر دل وچ ٹھنڈ پڑ گئی۔حالانکہ ٹھنڈ بالکل نہیں ہے۔گرمی بلا کی ہے مگر عورت پہیلی سو آپ نہیں سمجھیں گے کہ کیسی ٹھنڈ......سب سے پہلے تو دشتِ دل کا شکریہ جس نے دشتِ تنہائی میں ہم کو یاد کیا۔وشتِ دل تو آپ ہیں ہی......ذرا دشتِ جاں بھی ظاہر کیجیے۔ آپ کے لیے اور اسماعیل خان کے لیے ڈھیر ساری دعائیں کہ آپ دونوں کو اپنی محبت مل جائے۔خوش رہیے اپنے خرچے پر۔انیلہ ظفر! کمال ہے آپ نے منظر امام کو پڑھنا چھوڑ دیا ہے۔ان کو تو کوئی بدذوق انسان ہی نظرانداز کرسکتا ہے۔انکل آپ کے زبردست کمنٹس محفل کو چار چاند لگا دیتے ہیں۔باقی تبصرے بھی تاروں کی طرح چمک رہے تھے۔سخت گرمی میں انگارے کو ٹھنڈی میٹھی آئسکریم کی طرح پڑھا۔بس مغل انکل جلدی سے کہانی کو پاکستان لے آئیں تاکہ سجاول کا کھوپڑا درست ہو۔شاہ زیب نے اہم بندے کو پھڑکا دیا اور دوسرے کو (رائے زل) کمینے کو لنگڑا کردیا۔مزہ آگیا۔ویسے فارس والا لیٹر ہم سے پڑھوایا ہوتا ہمیں ھند کو پشتو کی جان پہچان ہے۔اُف......آوارہ گرد فل ایکشن میں ہے سارے ریکارڈ توڑ دیے ہیں۔لگتا ہے عابدہ دنیا سے کوچ فرما گئی ہے۔بس آخر میں سارے کردار خاص کر گبیل دادا تے زہرہ بانو، مل جائیں تو مزہ ہی الگ ہوگا۔پہلا رنگ واقعی عبرتناک تھا۔دولت کی ہوس انسان کو اندھا کردیتی ہے۔ناصر کو بھی کیے کی سزا ملی، اچھا ہوا۔دوسرا رنگ بھی حساس موضوع پر تھا جو دل پر گہرے نقش چھوڑ گیا۔نسا کی ہمت و

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

جرأت کو سلام اور خدا نے آخر میں نسا کو خوش خبری سے نوازا جو کہ نسا کے لیے انعام تھا۔ شہباز اور امجد جیسے غنڈے جلد یا بدیر اپنے انجام کو پہنچ جاتے ہیں۔ ایچ اقبال کی جنگِ دل ربا بیسٹ تھی، ویلڈن ویلڈن...... ہر قدم پر لرزہ خیز موڑ کہ ہمارا دل ہمک ہمک ہی جائے۔ مگر دو محبت کرنے والے دل مل ہی گئے، کوئی کچھ بھی نہیں بگاڑ سکا۔ دونوں کامیاب و کامران ٹھہرے۔ محبت میں بھی مشن میں بھی۔ ویسے ایچ اقبال عورت ہے کہ مرد پلیز ضرور بتا دیں، پہلے بھی پوچھا تھا مگر...... (اور پہلے بھی بتایا تھا کہ ان کا نام ہمایوں اقبال ہے) مکافات، زویا اعجاز ایک زبردست کاوش لے کر حاضر تھیں۔ سانپ (روپ) مر گیا مگر سپنو لیے چھوڑ گیا۔ زویا باجی آپ پلیز پلیز شامی تیمور لکھنے کی کوشش کریں۔ یقین مانیے آپ اس کوشش میں کامیاب رہیں گی۔ بہت دل کرتا ہے شامی، تیمور کی نوک جھوک پڑھنے کو۔ مریم کے خان سے شکوہ ہے کہ آپ نہیں لکھ رہیں کسی اچھی مغربی اسٹوری کو ترس گئے ہیں۔ چہرہ ساز ایک زبردست اسٹوری تھی مگر اندازِ تحریر امجد رئیس سے ملتا جلتا تھا۔ منظر امام ایک مرتبہ پھر دل چھو لینے والی تحریر لائے۔ کرم دین کے عزم و حوصلے کی داد دینی پڑے گی مگر دیں گے نہیں کیونکہ انہوں نے خود لکھ کر دے دی کہانی کی صورت میں۔ ایگزام کی وجہ سے بس اتنا ہی پڑھ پائے آئندہ ماہ بھرپور اور سرور بھرا تبصرہ لے کر حاضر ہوں گے۔ (ہم منتظر رہیں گے) ویسے بھی یہ تبصرہ کم سرور بھرا نہیں ہے امید ہے کہ تبصرہ شائع کر کے اس سرور کو کم نہیں ہونے دیں گے۔'' (مگر آپ ہوش و حواس سے بیگانہ نہ ہونا)

ضلع خانیوال سے **محمد صفدر معاویہ** کا مطالبہ ''مئی کا شمارہ 28 اپریل کو صدر بازار پشاور سے جا کر خریدا، سرورق کا تجزیہ کیا تو ایک ماڈل پتا نہیں دو انگلیاں جوڑ کر کس بات کا اشارہ کر رہی ہے۔ اس دفعہ ماڈل کوئی خاص تاثر پیدا نہیں کر سکی۔ ساتھ میں ایک شخص شاید اپنی قسمت اور ملکی حالات کا رونا رو رہا ہے، اوپر ایک خوش حال شخص بٹوے سے ڈالر نکال رہا ہے۔ یوں لگتا ہے نیچے عمران خان پاناما فیصلے کے بعد پریشان بیٹھا ہوا اور اوپر نواز شریف 2 ماہ کی مہلت ملنے پر مسرور ہو کہ چلو ابھی تو جان بچی۔ پتا نہیں اب یہ دو مہینے کتنے مہینوں میں گزرتے ہیں۔ آپ کا اداریہ پڑھا۔ یکم مئی مزدوروں کا دن۔ پشاور سے کوئٹہ تک اور لاہور سے کراچی تک جتنے بھی پاکستانی شہر ہیں ان کے چوراہوں پر یکم مئی کو مزدور بیٹھے نظر آئے پھر چھٹی کس بات کی ہوتی ہے، وہ اگر اس دن مزدوری نہ کریں تو گھر کا چولھا کہاں سے جلے گا۔ یہ چھٹی اشرافیہ اور اعلیٰ طبقے کے لیے ہوتی ہے۔ آپ کشمیر کی بات کرتے ہیں، بھارت نے ظلم کی انتہا کر دی۔ اب تو بھارت کے اندر سے بھی آوازیں اٹھنے لگی ہیں کہ ظلم بند کرو۔ یقین کریں اگر کشمیر، فلسطین، برما میں مسلمانوں کی جگہ کوئی غیر مسلم قوم ہوتی اور ان پر یوں ظلم ہوتا تو اقوام متحدہ کی اب تک چیخیں نکل چکی ہوتیں، کئی ممالک کی فوج ان کے حق میں لڑنے کے لیے اتر چکی ہوتی پر یہاں تو مسلم ہیں جن کا کوئی ولی وارث نہیں، اگر ہم سب مسلم ممالک آپس میں اتحاد کر لیں تو کسی کی کیا مجال کہ مسلمانوں کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھ بھی سکے پر ہم اپنے مفاد کے لیے دشمن کا کھلونا بن گئے۔ اپنی محفل میں آئے، ہمارے پڑوسی شہر سے لیلیٰ کوثر لاشاری صاحبہ کرسیِ صدارت پر بیٹھ کر بہترین تبصرہ کر رہی ہیں، مبارک ہو جی۔ مومنہ کشف، رومی بھائی، ادریس احمد، انیلہ ظفر، احسان سحر کے بہترین تبصرے محفل کی رونق بڑھا رہے تھے تو باقی تمام دوستوں کے تبصرے چار چاند لگا رہے تھے۔ محفل میں نئے شرکت کرنے والوں کو خوش آمدید۔ کہانیوں میں شروعات کی انگارے سے۔ طاہر جاوید مغل صاحب کا قلم زوروں پر ہے۔ اس دفعہ شاہ زیب نے قسطینا کے ساتھ مل کر رائے زل کو ایسی حالت میں ڈال دیا نہ وہ زندوں میں ہے نہ مُردوں میں۔ اتنی فوج کے ساتھ حملہ کرنے والے کو دو بندوں نے کیا بھرپور جواب دیا۔ ساری قتل و غارت کا حساب دیتا رہے گا اب ساری عمر، ادھر سجاول بھی اپنے حواس میں آ رہا ہے، اب کہانی اور مزے کی ہو جائے گی۔ پھر ڈاکٹر صاحب کی آوارہ گرد میں شہزی اینڈ گروپ نے ایڈوانی، بلراج سنگھ اور اس کے ساتھیوں کو جہنم واصل کیا اور جریزے کو آزاد کروا دیا اور اب خود ارضِ پاک پر واپسی کی۔ ابتدائی صفحات پر ایچ اقبال جنگِ دل ربا لے کر آئے۔ تحریر کے کرداروں کو جس طرح وقت پر انٹری دی جس حساب سے ان کو ملایا انٹرسٹنگ۔ انور اور زنوبیا کی محبت اچھی لگی۔ محبوب کی خاطر غدار کا تاج سر پر رکھنا مشکل ہوتا ہے پر زنوبیا نے انور کی محبت میں سب کچھ کر دیا۔ انور کی صلاحیت اور ہمت نے کافی متاثر کیا۔ سلیم انور کی انسولین کا زہر مختصر پر اچھی تحریر۔ سراغ رساں برگس نے قاتلہ جوائس رچرڈ کو ایک غلطی سے پکڑ لیا۔ تنویر ریاض کی حادثہ بھی اچھی تحریر تھی پر آخر میں نتیجہ ہماری سوچ کے برعکس آیا۔ تنویر ریاض دہلی کی ثبوت بھی اچھی رہی۔ زویا اعجاز مکافات لے کر آئیں۔ ہندو اور سکھ اپنے بچوں کو ہمیشہ پاکستان اور مسلمانوں سے نفرت کرنا ہی سکھاتے ہیں جبکہ ہمارے بڑے بلکہ ہمارا دین اسلام ہمیں امن اور محبت کا درس دیتا ہے اور پھر جب اسلام پر یا مسلمانوں پر کافر حملہ کرے تو پھر علی الاعلان جہاد کا حکم ہے نہ کہ ہندو بنیوں کی طرح عورتوں کو پر حملہ کرنا، ویلڈن زویا اعجاز اعلیٰ تحریر۔ تمکین رضا کی مختصر تحریر غلط پیغام بھی اچھی رہی۔ منظر امام کی مرگ ناگہاں، مجھے شروع میں شک ہو گیا تھا کرم دین کا بیٹا ہی طوفان ہو گا آخر میں نور دین ہی طوفان نکلا اور اپنے باپ کے ہاتھوں مارا گیا، باپ کی بے بسی بھی دیکھنے کے قابل تھی۔ آخری صفحات پر پہلا رنگ محمد فاروق انجم منصوبہ ساز لے کر آئے۔ عرفان اور ساجد نے پلان اچھا بنایا، سوا کروڑ کا غبن سامنے آیا مگر آخر کار حرام کی دولت نے اس کو پکڑوا دیا، حرام کی دولت بھی بھلا کسی کے کام آئی ہے کبھی۔ سرورق کا دوسرا رنگ زن آہن روبینہ رشید کے قلم سے آئی۔ نسا کی ہمدردی کا جذبہ بھی اچھا لگا اور اس نے روزینہ کے قاتل اور دہشت گرد شہباز کو انجام تک پہنچانے کے لیے راستے میں آنے والی ہر رکاوٹ کو عبور کیا۔ آخر کار اس کو انجام تک پہنچوا دیا۔ فراز کا کردار بھی اچھا رہا، بے شک پہلے اس سے غلطی ہوئی پر وہ وقت پر واپس پلٹ آیا۔ آپ سے التماس ہے کہ آپ جاسوسی یکم کو، پاکیزہ 8 کو، سسپنس 15 کو اور سرگزشت 22 کو نکالا کریں تاکہ ہمیں پڑھنے کا اور تبصرہ کرنے کا وقت مل سکے۔ اس بار بھی 25 کو سرگزشت اور 28 کو جاسوسی مل گیا تو پھر پڑھنے اور تبصرہ کرنے میں مشکل ہوئی۔ امید ہے میری آراء پر غور کیا جائے گا۔''

کراچی سے **ادریس احمد خان** کی حساس پسندی ''جاسوسی ڈائجسٹ اپنے وقت پر مل گیا۔ ذاکر صاحب کے فن کے معترف ہیں جو رنگوں میں جان ڈال دیتے ہیں اور حقیقت میں تصویر جیتی جاگتی نظر آنے لگتی ہے۔ سرورق بہت خوب تھا۔ چینی نکتہ چینی میں اداریہ بھی حسب حال تھا۔ ناموں کی فہرست میں لیلیٰ کوثر لاشاری کا نام نمایاں تھا، مبارک باد اور شکریہ کہ انہیں تبصرہ پسند آیا۔ اعتزاز اینڈ وصلی کا بھی شکریہ۔ سب دوستوں کو ہماری طرف سے

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

خلوص بھرا اسلام۔ چینی نکتہ چینی سے آگے بڑھ کر ایچ اقبال کی خوب صورت کہانی جنگِ دل ربا پڑھی جس میں وطن کی محبت کے جذبوں نے ناممکن کو ممکن بنا دیا اور پھر حسین انعام بھی زنوبیا کی صورت میں انور کو ملا، محبت کی گرمی نے ناکامیوں کو بھی کامیابیوں میں بدل دیا۔ حادثہ میں سراغ رساں نے قتل کی الجھی ہوئی ڈور کو سلجھا دیا اور اپنی چھٹی شروع ہونے سے پہلے کیس حل ہوگیا۔ ثبوت بھی اچھی کہانی تھی۔ اس کے بعد مغل صاحب کی انگارے شروع کی، ایکشن کی رفتار دھیمی رہی۔ پاسبان نے بھی اچھا تاثر دیا۔ مکافات زویا اعجاز کی کہانی بھی سبق آموز تھی اور ناقابل گرفت بھی دلچسپی سے پڑھی گئی۔ جھوٹ میں بڑی عقل مندی سے سراغ رساں مول نے مجرمہ کو پکڑ لیا اور کیس کو حل کرلیا۔ آوارہ گرد بھی جاری ہے۔ شہزی اپنی ٹیم کے ساتھ واپس پاکستان لوٹ آیا ہے۔ غلط پیغام میں بھی چالاک مجرم کی ایک نہ چلی اور قانون کی پکڑ میں آگیا۔ چہرہ ساز بھی سنسنی خیزی لیے اچھی کہانی تھی۔ مجرم کتنا ہی چالاک ہو آخر کبھی نہ کبھی قانون کی گرفت میں ضرور آتا ہے۔ بروقت بھی بہتر کہانی ثابت ہوئی۔ منظر امام کی اثر انگیز کہانی بہت اچھی لگی۔ ان کی کہانی ہر حساس دل کو جھنجوڑ کر رکھ دیتی ہے۔ مرگ ناگہاں نے بھی بہت متاثر کیا جس میں ایک باپ نے محبت پدری کے برعکس بیٹے کو ڈاکو کے روپ میں دیکھ کر گولی ماردی۔ آخری صفحات پر منصوبہ ساز محمد فاروق انجم کی کہانی اور روبینہ رشید کی کہانی زنِ آہن بھی بہت پسند آئیں۔''

میانوالی سے ساگر تلوکر کا دھیما دھیما بہاؤ'' جھلملاتا جاسوسی ملا تو دل خوشی سے اچھل اٹھا۔ سرورق اچھا تھا۔ ابتدائیہ خوب تھا۔ محفل میں لیلیٰ کوثر چھائی ہوئی تھیں، بہت مبارک۔ اسماعیل اور دشتِ دل کی شمولیت اچھی لگی اور دل سے ان کے لیے دعا نکلی۔ جنگِ دل ربا لے کر ایچ اقبال کافی عرصے بعد آئے اچھا لگا۔ انگارے، مار دھاڑ بالکل بور ہوگئی ہے۔ پرانے کردار بالکل غائب کردیے ہیں۔ جنگ وجدل سے اب شاہ زیب کو نکال ہی لیں۔ آوارہ گرد شکر ہے کچھ تبدیلی آئی۔ اب اس کہانی کا اینڈ بھی کریں۔ مکافات بہت دل پذیر کہانی تھی۔ انجم فاروق ساحلی اور محمد فاروق انجم کیا ایک شخصیت ہے۔ (جی نہیں) خط اس لیے شارٹ کٹ لکھا ہے، کہیں دوسرے دوستوں کی جگہ نہ مارلوں۔'' (آپ کی سوچ کو دوسرے بھی اپنانے کی کوشش کریں)

نوال اینڈ مشال کی دلی دعائیں'' کچھ ماہ سے ہمیں جاسوسی بہت لیٹ مل رہا تھا اور کچھ مصروفیت بھی ایسی تھی کہ خط نہ لکھ سکے۔ اس بار جاسوسی 5 تاریخ کو ملا۔ وہ بھی بہت منت کرکے کزن سے منگوایا۔ سب سے پہلے نظر پڑی ٹائٹل پر جسے دیکھ کر کچھ تجسس ہوا کہ پتا نہیں سرورق کی کہانیاں کیسی ہوں گی، ابھی دیکھ ہی رہی تھی کہ مشال صاحبہ اپنی بیٹی کے ہمراہ تشریف لے آئیں پھر کیا تھا بیٹی کو مجھے تھما کر خود جاسوسی سے چپک گئیں اور پھر ہم کفِ افسوس ملتے رہ گئے۔ کافی وقت کے بعد جاسوسی ہمارے ہاتھ لگا۔ ہم نے کہانیوں کی لسٹ دیکھی۔ نام پڑھ کر اچھا لگا۔ پھر چینی نکتہ چینی کا رخ کیا۔ اداریے میں مزدوروں کے عالمی دن کے بارے میں پڑھ کر ہمیں اپنے پیارے میاں جی یاد آگئے۔ اسی وقت ان کو فون کیا۔ دومنٹ بات کرکے کال بند کی پھر آگے بڑھے۔ پہلا تبصرہ لیلیٰ کوثر لاشاری کا تھا۔ بہت اچھا تبصرہ تھا۔ دوسرا تبصرہ ڈاکٹر سبا ارشد، شکر کریں آپ کو تیسرے دن جاسوسی مل گیا ہم تو بہت انتظار کرتے ہیں۔ بہت اچھا تبصرہ آپ کا بھی۔ صوفیہ کشف آپ نے ٹائٹل کا بہت اچھا نقشہ کھینچا۔ بہت شرارتی سی لگتی ہو آپ۔ عاصم جٹ کو خوش آمدید، پہلی بار آئے۔ توصیف علی آپ کی ماضی کی یاد اچھی رہی۔ اعتزاز اینڈ زریاب وصلی بہت اچھا تبصرہ آپ کے بارے میں اپنی کزن سے سنا تھا۔ اعتزاز اینڈ زریاب بہت اچھی رہیں آپ کی شرارتیں۔ انیلہ ظفر کا نام پڑھ کر پھر ایک بار فون اٹھایا اور کزن کو کال کرکے بتایا کہ انیلہ آپی کا خط ہے جاسوسی میں، بہت اچھا اور جاندار تبصرہ آپ کا۔ انجم فاروق اینڈ احسان سحر کے تبصرے بھی اچھے رہے۔ عبدالجبار رومی انصاری، آصف محمود، ادریس احمد خان بہت اچھے جناب۔ اسماعیل خان اللہ پاک آپ کے لیے آسانیاں عطا فرمائے۔ دشتِ دل کی خیال آرائی اچھی رہی اور مرحا گل، طاہرہ گلزار، افتخار اعوان آپ لوگ اس بار نہیں تھے۔ کہانیوں میں آوارہ گرد اور انگارے دونوں اچھی لگیں۔ پہلی کہانی جنگِ دل ربا نام اچھا لگا۔ تو شروع کی پر ایک نمبر کی بکواس رہی۔ سرورق کا پہلا رنگ اچھا لگا منصوبہ ساز اپنے نام کی طرح، زنِ آہن بھی اچھی رہی۔ انسولین کا زہر اچھی لگی۔ باقی کہانیاں ابھی پڑھنی ہیں۔ خط شامل ہو اس لیے جلدی لکھا۔ اینڈ میں اللہ پاک جاسوسی کو دن دوگنی رات چوگنی ترقی دے، آمین۔''

لاہور سے عبدالجبار رومی انصاری کی انکساری'' گیم پلان تو اچھا ہے۔ لڑکی کی مثبت سوچیں اس کے حوصلے اور اعتماد کو ظاہر کررہی ہیں باقی اس کی زد میں آنے والوں کا احوال بھی سامنے ہے اور خوشی سے سرشار نظر آنے والا مرد ایک طرف تو کوئی چور اچکا لگ رہا ہے اور دوسری طرف لگتا ہے اس کی کوئی لاٹری نکل آئی ہے۔ پڑوسی ملک کی بربریت تو پوری دنیا میں مشہور ہے یہ الگ بات کہ اس کا شکار مسلمان ہیں اور اس پر دنیا آنکھیں بند رکھتی ہے۔ جی تو لیلیٰ کوثر لاشاری نے بھی نکتوں کی لکیر کھینچ دی اور تبصرے کو خوب صورت بنا دیا، مبارک ہو جی۔ لو جی ڈاکٹر سبا ارشد تو قسطنیا کو فوت ہی کردینے والی تھیں۔ ارے وہی تو اب ہیروئن نظر آرہی ہیں، تبصرہ بہت اچھا لگا۔ مومنہ کشف نے بھی اپنے تبصرے میں خوب گل کھلائے، عمدہ۔ خوش آمدید! عاصم جٹ، واہ جی واہ توصیف علی صاحب تو پرانے تبصرہ نگار ہیں خوشی ہوئی مل کر انیلہ ظفر نے بھی سستی ختم کرکے چینی نکتہ چینی کی رونق بڑھا دی۔ زبردست! بھرپور تبصرہ بہت اچھا تھا۔ ارے ٹائٹل کو ہائی جیک کرلیا وہ بھی جاسوسی کے، واہ جی آصف محمود صاحب یہ تو ہاتھوں سے پھسل جائے گا۔ اسماعیل خان کا محبت نامہ بھی ٹھیک رہا۔ یہ دل دشت اور دشتِ دل کون ہے بھئی، ویلکم۔ مختصراً تبصرہ بھی اچھا رہا۔ آوارہ گرد، شہزی بھی جان جوکھوں سے بھرپور اپنی مہم کامیابی سے مکمل کرکے اپنے ساتھیوں سمیت واپس لوٹ آیا۔ اب پھر سے سماج اور وطن دشمنوں سے نبرد آزما ہونے کو تیار ہے۔ عابدہ کی طرف سے لگتا ہے آنسہ خالدہ منظر سے غائب ہو گئی ہیں۔ باقی اس دفعہ بغراج اور ایڈوانی کی ہلاکت کے بعد تحریر میں امن و امان ہی رہا۔ ہمدردی ایک اچھا جذبہ ہے۔ نسا کی روزینہ کے ساتھ ہمدردی اچھی رہی اور وہیں سے وطن دشمن عناصر کا سراغ لگا جن کے ساتھ دشمنی میں نسا کو بال بال بچنا پڑا اور پھر درندہ صفت لوگوں کو عدالت تک گھسیٹ لائی جہاں سے انہیں قاتلانہ حملے میں پار کرکے نشانِ عبرت بنا دیا اور نسا نے بھی امن و سکون کا سانس لیا۔ زنِ آہن سرورق کا دوسرا رنگ اچھا رہا، غلط پیغام میں شاطر کرٹ کا منصوبہ تو بے داغ تھا لیکن سراغ رساں اس سے بھی بڑھ کر تھی تو بہت جلد حراست میں آگیا۔ مختصراً کہانی اچھی رہی، کبھی کوئی شرلاک ہومز کی بھی کہانیاں لائیں نا۔ جنگِ دل ربا کہانی تو بہت اچھی تھی لیکن کردار کچھ جانداری سے ہٹ کر تھے جیسے انور نے ہیلی کاپٹر کی تمنا کی تو وہ حاضر کردیا گیا جیت

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

طیارہ مانگا تو وہ بھی بلا چون و چرا مل گیا اور دشمن نے بھی کوئی خاص چالاکی نہ دکھائی بس بھیگی بلی ہی نظر آیا۔ چلو بریگیڈیئر شمس کا منصوبہ تو مکمل ہوا اور محبوب، محبوبہ، انور اور زنوبیا بھی اپنے منصوبے میں کامیاب ہوئے۔ انگارے کی سلگن بھی جل جل اٹھی۔ قسطینا اور شاہ زیب کا منصوبہ بھی مکمل ہوا۔ حلمی مر گیا اور رائے زل زندہ لاش بن گیا۔ باقی محبت کے معاملات افسردہ ہی کرتے ہیں اکثر جیسے قسطینا کا شاہ زیب کو شادی کی پیشکش کرنا اور اس کا انکار کرنا۔“

لاہور سے **فاروق انجم ساحلی کی شائستگی** ”اس مرتبہ جاسوسی بادامی رنگ کے سنسنی خیز ٹائٹل کے ساتھ منظرِ عام پر آیا۔ کہانیوں کی تصاویر کو فہرست میں سجانا جاسوسی کی منفرد اور جاذبِ نظر روایت ہے۔ پرانی یادیں، رفاقتیں اور پرانے نغمے بھلائے نہیں جاسکتے اس لیے حاضری دی جا رہی ہے۔ توجہ فرمانے اور خط شائع کرنے کا شکریہ۔ چینی نکتہ چینی میں قارئین نے توجہ اور لگن سے تنقیدی اور حوصلہ افزا تبصرے قلمبند کیے۔ قارئین جاسوسی مطالعہ کا گہرا ذوق رکھتے ہیں۔ کہانیوں میں انسولین کا زہر، مکافات، نا قابلِ گرفت، غلط پیغام، جھوٹ اچھی کہانیاں ہیں۔ چہرہ ساز، منصوبہ ساز سسپنس اور تجسس سے بھرپور ہیں۔ مرگِ ناگہاں بھی خوب ہے۔ جنگِ دل ربا ہر لحاظ سے بھرپور اور جاندار ناول تھا۔ آوارہ گرد اور انگارے کامیابی سے آگے بڑھ رہی ہیں۔ چند تحریریں ابھی زیرِ مطالعہ ہیں۔“

ڈیرہ اسماعیل خان سے **سید عبادت کاظمی کی خلوطانویسی** ”اس دفعہ بھی جاسوسی ڈائجسٹ معطر ہوا کے جھونکوں کی طرح سخت گرمی میں ٹھنڈی پھوار بن کر موصول ہوا۔ جاسوسی کے سرورق پر اگر حسینہ کی تعریف نہ کی جائے تو زیادتی ہوگی۔ ذاکر انکل اتنی محنت جو کرتے ہیں۔ میپے پرس سے نکالتے اعتزاز وصلی کو دیکھ کر ہمیں یقین ہوگیا کہ اس دفعہ ہمیں بھی عیدی وقت پر مل جانی ہے۔ شکر ہے حسینہ کے ہونٹ اس مرتبہ درست ہی تھے آنکھیں البتہ شکرے کے مانند تیز نظر آتی تھیں۔ سر پکڑ کر روتے ہوئے شخص کو دیکھ کر مجھے بھی کسی کی یاد آگئی۔ سرورق دیدہ زیب اور دل فریب تھا۔ سرورق سے لطف اندوز ہونے کے بعد فہرست کا اپنی خوب صورت آنکھوں سے جائزہ لیا جہاں ہمارے کافی محبوب رائٹر روداد سنانے کو بے چین تھے۔ فہرست سے سیدھے ہم چینی نکتہ چینی میں تھوڑی سی چینی لینے آ نکلے۔ لیلیٰ کوثر لاشاری چینی میں ڈوبی نظر آئیں اور بے چاری چینی بانٹتے بانٹتے لگتا ہے خود خالی ہاتھ رہ گئیں ویسے مزے کی بات ہے ان کا تبصرہ کافی زبردست تھا۔ سبا راشد کے تبصرے کو دیکھ کر حیرت کے دو تین جھٹکے کھانے کے بعد ان کے تبصرے میں سیف خان کے ذکر نے پریشان کر دیا، ویسے اپنے خان جی اتنے سویٹ سچ میں ہیں ناں...... مومنہ کشف کے تیز طرار تبصرے نے مسکرانے پر مجبور کر دیا۔ توصیف کا تبصرہ طاہرہ گلزار کے مقابلے پر تھا۔ اعتزاز وزریاب وصلی تبصرہ اچھا لکھتے ہو مگر میرا ذکر نہیں تو سمجھو کسی کام کا نہیں اور عاقب سلیم وصلی کا نام بھی لکھا کرو ناں...... وصلی برادران سے گزشتہ دنوں جاسوسی ڈائجسٹ کے توسط سے ملاقات خوب رہی۔ انیلہ ظفر کا تبصرہ دیکھ کر میں سچ میں حیران رہ گیا غالباً پہلی دفعہ آئی ہیں وہ لیکن انداز لکھنے کا زبردست تھا۔ احسان سحر کی باتیں میٹھی لسی کی طرح لگیں۔ اسماعیل خان کے لیے خصوصی دعائیں، اللہ آپ کو منزل تک لے جائے۔ یہ محبت مجبور کر دیتی ہے چاہے کسی سے بھی ہو۔ منصور حبیب شاید کہیں جاب کے سلسلے میں مصروف ہیں ویسے وہ خود اور ان کے تبصرے خاصے کام کے ہوتے ہیں لیکن کبھی کبھی کام کی چیز بھی دھوکا دے جاتی ہے۔ انگارے، مغل صاحب آپ کے درشن کرنے کو دل کرتا ہے۔ شاہ زیب اور تاجور کی رام کہانی میں ایک ولن کے بعد دوسرا آتا جاتا نظر آ رہا ہے۔ آپ کی واحد کہانی جس میں ایکشن کی بھرمار ہے ورنہ میں آج تک للکار کو نہیں بھول پایا۔ خیر دیکھتے ہیں اونٹ کس کروٹ پر بیٹھتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے شہزی کو آوارہ گرد بنانے کی جو کوشش کی ہے وہ کچھ کامیاب رہی اور وہ آوارہ گردی کرنے کے بعد پاکستان آ گیا۔ لگتا ہے آنسہ خالدہ راہی ملکِ عدم ہوئی ہیں یا نوشابہ کی قید میں ہیں۔ چلتے چلتے شکیلہ اور اول خیر کے درمیان پیار ہو گیا۔ زویا اعجاز بھی ان کو تبصرہ نگار کی حیثیت سے جانتے تھے پھر فیس بک پر ان سے شناسائی ہوئی اور وہ آیا اس نے دیکھا اور فتح کر لیا، بہت زبردست لکھتی ہیں۔ مکافات میں امام دین کے خون نے اثر دکھایا، روپ سنگھ سے محبت بھری نفرت محسوس ہوئی۔ کشمیریوں کے خون سے کھیلنے والے بھارتی درندوں کی خوب منظر کشی کی، آپ کے لیے بہت نیک تمنائیں۔ فاروق انجم بہت لکھ رہے ہیں اور اچھا لکھ رہے ہیں مجموعی طور پر اسے زبردست کہانی کہہ سکتے ہیں۔ عرفان کا بھانڈا پھوٹ گیا۔ روبینہ رشید کی سبق آموز تحریر نے جکڑ لیا۔ نسا کا وطن کے لیے جذبہ اچھا لگا۔ فراز جرم کی دنیا سے نکل آیا۔ منظر امام اتنا کاٹ دار کیوں لکھتے ہیں رُلا دیتے ہیں۔ بیٹے کی باپ کے ہاتھوں موت نے اداس کر دیا۔ ایچ اقبال کی کہانی زیادہ متاثر نہیں کر پائی ویسے ان کا اصل نام کیا ہے۔ (ہمایوں اقبال) اور کاشف زبیر کی کوئی کہانی لگا دیں پرانی پلیز۔ (کیوں، ان کی ایک طبع زاد کہانی محفوظ ہے) چھوٹی کہانیوں میں نا قابلِ گرفت، پاسبان اور چہرہ ساز اچھی لگیں۔“

فیصل آباد سے **عاقب سلیم وصلی کی نیک تمنائیں** ”جاسوسی سے ہمارا تعلق کافی پرانا ہے مگر خط لکھنے کی جسارت پہلی دفعہ کر رہے ہیں اور امید کرتے ہیں ویلکم کیا جائے گا (خوش آمدید) سرورق ہمیشہ کی طرح خوب صورت ترین تھا۔ لڑکی غالباً دھمکی دے رہی تھی کہ نہ لے تو ہم سے پنگا۔ اس کے انداز سے طاہرہ گلزار کی غصیلی آواز سن کر ہم بھاگے اور پاس بیٹھے شخص سے نظریں چرائیں تو اوپر والے صاحب نے ہمیں رشوت پیش کرنے کی کوشش کی، ہم نے اس کے ہاتھ جھٹکے اور دوستوں کی عدالت میں انٹری دی۔ ادی لیلیٰ کوثر لاشاری دھواں دھار قسم کا تبصرہ کرتی نظر آئی۔ اچھا تبصرہ تھا۔ ڈاکٹر سیا ہمارے گروپ کی معصوم ایڈمن یہاں کبیر سر کے بخیے ادھیڑتی نظر آئیں کہ کوئی زخم بنا بھی تو ڈاکٹرنی صاحبہ ٹھیک کر دیں گی۔ مومنہ کشف چینی کا رونا روتی

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز کے ابتدائی دور سے وابستگی رکھنے والے ایم اے راحت اس جہانِ فانی سے انتقال فرما گئے۔ اپنے اندازِ تحریر کے باعث وہ اپنی ایک الگ پہچان رکھتے تھے۔ اور ایک طویل عرصے تک کاغذ اور قلم کے رشتے سے بندھے رہے...... اللہ تعالیٰ ان کے لواحقین کو صبرِ جمیل عطا فرمائے اور مرحوم کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام پر تفویض فرمائے۔ (ادارہ)

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

رہی مگر کسی نے ایک نہ سنی۔ عاصم جٹ کو ایک نظر دیکھا، توصیف علی کے لیے تبصرے کو آنکھیں سکیڑ کر دیکھا اور اعتزاز اور زریاب کے تبصرے کو پڑھنا شروع کیا، تبصرہ تو بہت زبردست تھا۔ انیلہ ظفر کا شاید پہلا تبصرہ وہ بھی اتنا عمدہ ویلڈن۔ اسماعیل خان اللہ آپ پر کرم کرے۔ ادریس احمد خان، رومی انصاری، ڈاکٹر سبا، وصلی برادرز، لیلیٰ صاحبہ کے تبصرے اچھے لگے۔ عبادت کاظمی میرا بہترین دوست ہے۔ محفل میں ان کی کمی محسوس ہوتی ہے۔ کہانیوں میں سب سے پہلے انگارے سے شروعات کی۔ قسطینا کی یکطرفہ محبت کا اینڈ کیا ہوگا۔ رائے زل پر شاہ زیب کے اٹیک نے مزہ دوبالا کردیا۔ کمیل دادا آوارہ گرد کا اہم فرد ہے۔ زہرہ بانو کے لیے پریکٹ رہے گا۔ شہزی کے ساتھ آگے جانے کیا ہونے والا ہے۔ لگتا ہے آنسہ خالدہ کوچ کرگئی ہیں جہان سے، کہانی بہت اچھی جارہی ہے۔ فاروق انجم کی کہانی نے زیادہ متاثر نہیں کیا۔ عرفان کی چالاکی کسی کام نہ آئی۔ ساجد پر مجھے حیرت ہوئی۔ انسپکٹر نعمان کا کردار اچھا رہا۔ دوسرا رنگ روبینہ رشید نے بہت زبردست لکھا۔ نسا کی وطن سے محبت اور عقیدت نے دل پر اثر کیا۔ اگر ہم سب ایسا سوچیں تو پاکستان سچ میں سنور جائے۔ زویا اعجاز جاسوسی کے لکھاریوں میں بہترین اضافہ ہیں۔ بھرم کے بعد ان کی یہ دوسری تحریر تھی جو مجھے بے حد پسند آئی۔ روپ سنگھ کے انجام پر دکھ بھی ہوا اور خوشی بھی باقی۔ رسالہ زیرِ مطالعہ ہے۔"

شہر اور اپنا نام بھولنے والے شیدائی کی خواہش "جاسوسی کے ہال میں موجود تمام ممبران کو میری طرف سے آداب پیش ہو، جاسوسی سے سات سال کا رشتہ ہے مگر خط لکھنے کی جسارت پہلی مرتبہ کررہا ہوں، ساتھ ہی ساتھ یہ امید بھی ہے کہ دیر سے آنے کی سزا معاف کردی جائے گی۔ بقول احمد اقبال صاحب کے میں "توبز دل" ہوں، سزا سے ڈرتا ہوں، البتہ جلیل اور شامی کی طرح ڈھیٹ اور بے شرم ضرور ہوں۔ اس لیے اپنی پہلی انٹری پر تالیوں کی آواز میں ایوانِ جاسوسی میں قدم رکھنا چاہتا ہوں اور تب تک اپنی سیٹ پر نہیں بیٹھوں گا جب تک مطالبہ پورا نہ کیا جائے، بہ الفاظ دیگر میرا دھرنا جاری رہے گا۔ اپنی پہلی انٹری میں کہانیوں پر تبصرہ نہیں کروں گا بلکہ ایک گزارش کروں گا اور وہ یہ کہ اب سے چند برس پہلے ایک سلسلہ تھا مستقبل شناس جو کہ اچ اقبال صاحب کی تصنیف تھی پلیز اس کو کتابی شکل میں شائع کریں۔"

گوجرانوالہ کینٹ سے آصف محمود کی فرمائش "اس بار جاسوسی ہاضمہ مورخہ 17-05-03 کو ملا۔ سب سے پہلے طاہر جاوید مغل کی انگارے کی طرف چھلانگ لگائی اور ایک ہی نشست میں پڑھ کر سانس لی۔ (دوبارہ ابھی پڑھتا ہے) میجر وارث جیسا ساتھی اگر قسطینا اور شاہ زیب سے غداری کرسکتا ہے تو پھر لڑنے والے معاوضہ خور جنگجو، کیا کیا نہیں کرسکتے۔ انیق نے اس بار بھی قسطینا اور شاہ زیب کو بروقت کارروائی کرکے بازی مارلی ہے۔ یہ نوجوان کردار چھپا رستم بن رہا ہے۔ شاہ زیب بھی انگارا بن کر میدان میں اترا ہے۔ یہ بات ذہن میں چبھ رہی ہے کہ ایک ہاتھ سے ناکارہ شاہ زیب آسیان پروٹوکول گارڈ بن کر ہیوی بائیک کیسے چلاسکتا ہے؟ کیسے سنبھال سکتا ہے، چلو مان لیا سنبھال لی مگر کیا۔ ایک ہاتھ والے بائیکر کو پروٹوکول کی گاڑیوں کے آگے جاتے کسی نے بھی توٹ نہیں کیا؟ چلو رائے زل، اپنی خباثت کے ساتھ شاہ زیب کا شکار بن کر اور قسطینا کی مدد سے بے جان لاش بنا، اب وانا ہانی باقی ہے۔ تاجور بھی گا ہے بگاہے یاد آئی شاہ زیب کو۔ سجاول کو ان قسطوں میں بیک اوور کیا گیا۔ جاناں کی موت، سجاول کا گیپ، ساتھیوں کا رائے زل سے مل جانا، اب دیکھیے طاہر جاوید مغل ہمراہ شاہ زیب وغیرہ کیا گل کھلاتے ہیں۔ مجموعی طور پر کہانی سرخ روئی کی طرف جارہی ہے۔ میری طاہر جاوید مغل مع ادارے سے التجا ہے اسے جلد ختم نہ کیا جائے۔ کیونکہ جاسوسی ہاضمہ اسی سے قارئین کو ہاضمہ ہورہا ہے۔ کچھ تحریریں ایسی ہوتی ہیں جنھیں کافی عرصہ یاد رکھا جاسکتا ہے۔ ابھی تو چچا کے قاتلوں سے بدلہ، ایس ایس او سے بدلہ، عالمگیر وغیرہ سے پنگا، ڈیرک وغیرہ سے ٹاکرا، سجاول کی بے بے اور مانی اور سجاول کا قلع قمع، کم از کم یہ کہانی اپنی تمام تر حشر سامانیوں کے ساتھ 10 سال تو چلنی چاہیے، اگر دیوتا 30 سال تک چل سکتی ہے تو یہ بھی۔ کیونکہ لکھنے کا ٹیمپو اور قارئین کو اپنے حصار میں لے کر چلنا کسی کسی لکھاری کے حصے میں آتا ہے۔ اس بار تو آوارہ گرد بھی کچھ بہتر رہی۔ عبدالرب بھٹی، شہزاد خان کو اب پاکستان لے آئے ہیں۔ عابدہ کو امریکا میں بے یار و مددگار چھوڑا ہوا ہے۔ عبدالرب بھٹی صاحب کرداروں کی بھرمار سے نکل نہیں رہے۔ زہرہ بانو کا پہلے کردار ایک پاورفل عورت کا رہا اور اب وہ چہار دیواری کی اسیر بن کر رہ گئی ہے، لاچار کردی گئی ہے، ایسا نہیں چلے گا ڈاکٹر صاحب، کرداروں کے ساتھ انصاف کیا جائے۔ فاروق انجم کی منصوبہ ساز ٹھیک رہی بقایا کہانیوں کا مطالعہ آہستہ آہستہ جاری رہے گا۔"

طاہرہ گلزار کی آمد پشاور سے "جب یہ خط شائع ہوگا تو اس وقت روزوں کی آمد آمد ہوچکی ہوگی۔ اس لیے سب دوستوں کو رمضان مبارک۔ امید کرتی ہوں کہ اللہ سب کو رمضان کے روزے رکھنے اور اس مہینے کی برکتیں لوٹنے کی طاقت عطا فرمائے، اللہ تعالیٰ رمضان کے مہینے میں ہم مظلوم عوام پر بھی خصوصی رحم و کرم فرمائے، آمین۔ جب 28 اپریل کی شام 6 بجے اپنا محبوب جاسوسی اتنی جلد مل گیا تو خوشی سے دل باغ باغ ہوگیا۔ چلتی ہوں اپنے دوستوں کی محفل چینی نکتہ چینی میں۔ دروازہ لیلیٰ کوثر نے بڑی سرشاری کے ساتھ کھولا۔ کیونکہ اس کی انٹری پہلے نمبر پر لشکارے مار رہی تھی۔ ڈیئر بہت ہی پیارا اور دلچسپ تبصرہ کیا ہے۔ کہانیوں پر آپ کا تبصرہ بہت غور و فکر کی نشاندہی کرتا ہے۔ واہ واہ جی مومنہ کشف تو اپنے منہ میاں مٹھو بن رہی تھی۔ مومنہ ڈیئر ذرا بڑوں کا احترام کرنا سیکھو۔ ذاکر انکل کا دماغ ابھی جگہ پر ہے اس لیے آپ کی کٹی درخواست نامنظور۔ ہائے یہ بے چارے پرویز لنکا جیسے معصوم کے پیچھے کیوں پڑ گئی ہو اور میرے چھوٹے بھائی احسان سحر کو نہ چھیڑا کرو۔ تبصرہ تو بڑا زبردست کیا ہے بس ہمارے لوگوں سے پنگا کم ہی لیا کرو۔ عاصم جٹ کا چھکیروں والا تبصرہ بھی اچھا لگا۔ توصیف علی آپ راولپنڈی کس لیے جارہے تھے۔ بھائی جاسوسی ہے ہی ایسا کہ ہر بندہ اس کے عشق میں دیوانہ ہے۔ ویسے کافی تفصیلی تبصرہ لکھا ہے، کیوں میرا جانشیں بنتا ہے، ہاہاہا۔ احسان سحر کا تبصرہ تو ہمیشہ لاجواب ہوتا ہے۔ خوش آمدید انیلہ بھٹی اور اب کی انیلہ ظفر آپ کا تبصرہ بہت جامع اور تفصیلی رہا۔ انجم فاروق ساحل بھی بہت ناراض ناراض نظر آئے۔ ارے بھائی اتنی ناراضگی اچھی بات نہیں ہے۔ احسان سحر بھی بہت شاعرانہ تبصرہ لے کر حاضر تھے۔ واقعی بھائی چوٹ امریکا کو لگے تو مزہ ہمیں آتا ہے۔ دل خوش ہوجاتا ہے۔ سحر بھائی مغلِ اعظم بمہ... ہاتھ ہولا رکھو۔ آپ کے الفاظ سے مجھے بہت دکھ ہوا ہے۔ انگارے تو لاجواب ہے بس ہیرو تھوڑا امپچور ہے، وہ بھی کیا کرے بے چارہ کب سے گولیوں کے درمیان رہ رہا ہے

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

اور قلم کار نے تو پہلے سے ہی واضح کیا ہے کہ شاہ زیب کوئی عام آدمی یا عام ریسلر نہیں۔ واہ واہ اپنے رومی صاحب تو روز بروز نکھرتے جا رہے ہیں۔ اتنا جامع، پیارا اور تفصیلی تبصرہ مزہ آگیا۔ آصف محمود تنقید تو آپ کر گئے، آپ کیا چاہتے ہیں کہ مغلِ اعظم یک قلم جنگی ماحول ختم کریں اور جذباتی اور ہوس سے بھرپور باتیں شروع کریں۔ توبہ ہے ذرا سوچ سمجھ کے تبصرہ کریں۔ ادریس احمد بھائی کا تبصرہ بھی بہت شاندار رہا ہمیشہ کی طرح۔ آخر میں دشت دل کا محبت نامہ مختصر صحیح لیکن کم از کم مجھے اور مرحا گل کو یاد رکھا ہے۔ آخر میں ایک بار پھر آغا فرید، این ایس آر مدثر، رضوان تنولی، شیر علی خان، ہمایوں سعید، قمرتی اور جاوید بلوچ اینڈ ہارٹ کیچر سے واپس آنے کی التجا۔ چلتے ہیں کہ اس بار کہانیوں کے گلِ دان میں کون کون سے پھول ہیں۔ گلاب انگارے اور چنبیلی آوارہ گرد کے علاوہ۔ اس بار میں نے مختصر کہانیاں پہلے پڑھیں۔ انسولین کا زہر پڑھی، واقعی انسولین ٹھیک ٹھاک انسان کے لیے زہر ہے۔ قاتل نے تو بہت ہوشیاری دکھائی لیکن سراغ رساں برگس ان سے زیادہ چالاک نکلا ویلڈن سلیم انور۔ اس بار عکس فاطمہ تحریر لائی جھوٹ، بڑوں نے سچ فرمایا ہے کہ جھوٹ کے پاؤں نہیں۔ جینس نے قتل کر کے ٹونی کو پھنسوایا لیکن وہ بچ گئی اور خود پکڑی گئی، اچھی کاوش۔ تمکین رضا واقعی کرٹ غلط بیانی کرنے سے پھنس گیا۔ لیکن جیری جیسا سادہ انسان نہ سمجھ سکا۔ ایس انور کی تحریر بروقت، بل ڈائس نے بہت ہوشیاری کے ساتھ مونا کو آزاد کیا ورنہ وہ پاگل ڈاکٹر تو تیزاب سے اس کو جلا دیتا۔ منظر امام اس بار پھر ایک نئی چونکانے والی تحریر مرگِ ناگہاں لے کر حاضر ہوئے، واقعی ایک باپ نے بیٹے کو نہیں ایک ڈاکو کو مارا۔ ایسا حوصلہ کسی کسی میں ہوتا ہے۔ ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کی تحریر آوارہ گرد شروع کی، شکر ہے کہ بلراج اور ایڈوانی شہزی کے ہاتھوں ختم ہو گئے اور طلسم نور ہیرا بھی شہزی کے ہاتھ لگا اور آخرکار شہزی، کبیل دادا، اول خیر اور شکیلہ پاکستان پہنچ گئے لیکن اب عابدہ کا مسئلہ پھر سے الجھ گیا ہے۔ پاکستان میں حالات بھی ٹھیک نہیں۔ زہرہ بیگم کے لیے ممتاز خان اور وزیر جان دشمن بن گئے ہیں۔ لگتا ہے آگے شہزی کے ہاتھوں یہ دونوں جہنم واصل ہوں گے۔ سرورق کی پہلی کہانی منصوبہ ساز، محمد فاروق انجم کی تحریر عرفان، ساجد اور ناصر نے شارٹ کٹ منصوبہ تو خوب بنایا تھا لیکن درمیان میں اسلم نے آکر ان کے منصوبے پر پانی پھیر دیا۔ جہاں انسپکٹر نعمان جیسا ہوشیار اور ایمان دار بندہ ہو تو پھر مجرم کیسے قانون کی گرفت میں نہیں آئے گا۔ دوسری کہانی زن آہن روبینہ رشید کی تحریر ملکی دہشت گردی اور عورتوں کے ساتھ سفاکیت کے واقعات پر ایک جاندار تحریر۔ نسا نے بہت ہمت اور حوصلے کے ساتھ حالات کا مقابلہ کیا۔ ایچ اقبال کی کہانی جنگِ دل ربا آرمی پر لکھی گئی بہت اچھی تحریر۔ تھوڑی تشنگی اور تکنیکی کمزوری کے باوجود بھی بہت شاندار تحریر۔ تنویر ریاض کی تحریر حادثہ اچھا ہوا کہ رینی اسٹیلا اور کارل کے ہاتھوں نہیں مرا۔ جاندار کہانی تھی۔“

میانوالی سے احسان سحر کی اکتاہٹ ”سلگتی یادوں کی طرح دن بھی سلگ رہے ہیں۔ ہر اچھی چیز کی اپنی ایک خوشبو ہوتی ہے۔ کچھ کو صرف سونگھا جا سکتا ہے اور کچھ کو صرف محسوس کیا جا سکتا ہے لیکن یہ خوشبو ہر اچھی چیز، اچھے کام اور اچھے نام میں ہوتی ضرور ہے۔ یہ مہکتی اور پھیلتی ہے۔ مسحر اور مسحور بھی کرتی ہے اور بعض اوقات اتنی عمدہ اور وافر ہوتی ہے کہ خوشبوؤں کے قسماقسم جانفزا جھونکے بھی آتے ہیں۔ جاسوسی ملا، ٹائٹل دیکھ لیا، آپ نے بھی دیکھ لیا۔ کہنا کچھ بھی نہیں...... کیونکہ میرے پاس کہنے کو الفاظ ہی نہیں۔ لیلیٰ کوثر لاشاری نے تمام ہی لی لاشاری سے سرشاری کے عالم میں کرسی۔ تبصرہ بھی ہوا اعلیٰ۔ ڈاکٹر سبا ارشد کو 4 چکر پر جاسوسی ملا۔ ٹھیک ہے مل تو گیا۔ مومنہ کشف کا روکھا تبصرہ پاپوں کی یاد دلا گیا۔ عاصم جٹ سوال نامے کے ساتھ حاضر تھے۔ توصیف علی صاحب گاڑی میں بیٹھے، گھوڑے سے اتر کر جہاز پر گھر پہنچے۔ کچھ غلط اندازہ تو نہیں لگا لیا میں۔ انیلہ ظفر کی کھری کھری باتیں بڑی پسند آئیں۔ جبار رومی کی انکساری، باقی سب دوستوں کے تجزیے، کالم، مضمون اچھے رہے۔ چلتے ہیں کہانیوں کی طرف۔ پہلی کاوش جنگِ دل ربا نے بوریت کے طویل جنگل میں پھینک دیا۔ بعض اوقات آغاز ہی اچھا اور متاثر کن نہیں ہوتا۔ ایسا ہی ہوا۔ انتہا درجے کی بور...... سسپنس سے خالی، اور دلچسپی کا بحران ہے، یہ کہانی پاکستانی سیاست دانوں کی طرح نظروں اور معیار سے بری طرح گری ہوئی، افسوس کچھ بھی نہیں ہو سکتا ایسے لکھاریوں کا۔ پتا نہیں ہوتا کیا لکھ رہے ہیں جیسے مجبوری میں لکھ رہے ہوں اور لکھتے ہوئے بھی بار بار منہ بنا رہے ہوں۔ انسولین کا زہر، جو اکس رچرڈ پر تمام ہوا۔ ایسی غلطیاں عموماً ہر مجرم سے نادانستگی میں سرزد ہو جاتی ہیں۔ حادثہ دلچسپ کہانی، کرسٹفر کے رومانی اور نفسیاتی شگوفوں نے مزہ دوبالا کیا۔ نفسیاتی حربوں سے کہانی ہوئی تمام۔ ثبوت بھی اچھی کاوش تھی۔ ایڈم آخر محبت سے مجبور ہوا اور گلوریا کا جھوٹ جان کر بھی نظرانداز کر دیا۔ محبت انسان کو مجبور بنا دیتی ہے۔ انگارے 3 ماہ سے بڑی مشکل اور دل پر پتھر رکھ کر پڑھ رہا ہوں۔ جو اپنی دلچسپی کھو کر بری طرح ہماری نظروں سے گر چکی ہے۔ اچھی بھلی اسٹوری جا رہی تھی۔ Z زیرے کو داخل کر کے ہمیں جز بز کر دیا کہانی نے (کیوں بھئی اس قدر عدم بیزاری، کوفت اور بے دلی کس لیے؟) پاسباں، ایک لالچی عورت کا برا انجام ایک لینڈ لیڈی کے ہاتھوں ہوا۔ لالچ انسان کو سکون کہاں حاصل کرنے دیتا ہے۔ غلط پیغام دلچسپ اسٹوری۔ جمیل کے شوہر کے نکتے کی وجہ سے قاتل پکڑا گیا۔ چہرہ ساز نہایت دلچسپ ناول، اسے میں ناول ہی کہوں گا۔ ڈاکٹر میڈرس کا جنونی اور نفسیاتی کردار، جینی چرچل کی بھاگ دوڑ، منفرد سے منفرد ثبوت کی تلاش، آخر ڈاکٹر کا ہوا برا انجام اور ایسی کاوشیں ہر ماہ دیا کریں۔ آخری کہانی آوارہ گرد پڑھی۔ بلراج سنگھ اور جنرل ایڈوانی اپنی نحوست سے آؤٹ ہوئے۔ شہزی ہیرا لیے وطن واپس آ گیا۔ اگلے معرکے کا انتظار ہے۔ او...... ٹھہریں بھئی ابھی تو کبھی نہ بور کرنے والے منظر امام تو رہتے ہیں۔ مرگِ ناگہاں، بعض دفعہ انسان سے نادانستگی میں اچھے اور برے کام ہو جاتے ہیں۔ کرم دین سے بھی نادانستگی میں دکھ بھرا لیکن ایک اچھا کام ہو گیا۔ نورو عرف طوفان اپنے باپ کے ہاتھوں انجام کو پہنچا۔ آخری بات ہمیشہ کی طرح پھر اجازت۔ قابلِ رشک ہے وہ محبت جس میں تم کسی ایسے شخص کو پالو جو تمہارے ایمان کو مضبوطی بخشے اور تمہیں نیک بنا دے۔“

ان قارئین کے اسمائے گرامی جن کے محبت نامے شاملِ اشاعت نہ ہو سکے۔

رانا بشیر احمد ایاز، رحیم یار خان، (خط بھیگا ہونے کی وجہ سے پڑھا نہیں جا سکا)۔ محمد اقبال، کراچی۔ عمران ملک، ٹنڈو آدم۔ مہک آفتاب، حیدرآباد۔ شہناز اقبال، کراچی۔ رضوانہ سحر ناز، فوجیوں والا۔ عرفان راجہ، گوجر نمان۔

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

Downloaded From Paksociety.com

جاسوسی کے اولین صفحات کے لیے مغربی ناول کا زبردست انتخاب

بلا دائرہ

امجد رئیس

سطحِ آب پر پیار و محبت کی پرکیف لہریں اور زیرِآب انتقام کا سونامی پل رہا تھا... بربریت کی دلخراش و دلدوز داستان... جہاں لہو سے لہو کو دھویا جارہا تھا... ناز پرور ناز آفرین زخم در زخم... ریزہ ریزہ وجود کے ساتھ، سچ اور جھوٹ کی تلاش میں جاں بلب تھی... لہو سے لہو کہاں دھلتا ہے... درندگی و سفاکی انتہائوں کو چھورہی تھی ماضی سے جڑے رشتے اچانک ہی ابھر آئے تھے... بھائی، بھائی کے سامنے ہتھیار بدست ہوا تھا... باپ اور بیٹی کے درمیان نہ عبور ہونے والی دیواریں حائل ہوچکی تھیں... خلش... احساسِ جرم اور اپنی شناخت کا سفر اسے لمحہ بہ لمحہ موت کے قریب کررہا تھا... اور موت ایک آہٹ کے فاصلے پر اس کی منتظر تھی... ہر موڑ پر ایک نیا انکشاف، ایک نئی آفت کے سلسلے کا سنسنی خیز احوال...

ایک خوش حال خوش و خرم خاندان کے بکھر جانے کا ناقابلِ فراموش ماجرا

نرس کے ہڑبڑانے کے بعد ڈاکٹر درگا کو بڑے میاں کے کمرے تک پہنچنے میں چند منٹ لگے تھے۔ حالانکہ ڈاکٹر گہری نیند میں تھا۔

''پلیز ڈاکٹر۔'' نرس تیزی سے سیڑھیاں چڑھ رہی تھی۔ ''جلدی آیئے۔''

ڈاکٹر درگا کو وہاں کئی مہینے ہو چلے تھے۔ وہاں ایک ہی مریض باقی بچا تھا۔ بڑے میاں اسّی سال کی عمر میں موت سے پنجہ آزما تھے۔

''کیا پنجہ آزمائی ختم ہوگئی؟'' درگا سیڑھیاں چڑھتے وقت سوچ رہا تھا۔ ''تاہم بڑے میاں کی غیر معمولی قوتِ ارادی کو ذہن میں رکھتے ہوئے اسے شک تھا کہ بڑے میاں نے ہار مان لی ہے۔

کمرے میں داخل ہوتے ہی اس نے موت کی بُو سونگھ لی۔ اس کا تجربہ بتارہا تھا کہ کہانی کا انجام ہوچکا ہے۔ بڑے میاں کے سینے کی خفیف حرکت بھی معدوم ہوچکی تھی۔ اس کا منہ کھلا ہوا تھا۔ سر ایک جانب ڈھلکا ہوا تھا۔ ڈاکٹر نے کھڑکی سے جھانکا، باہر مرنے والے کی وسیع اراضی پر شدید پہرا تھا۔ اس کے جاں نثاروں نے حفاظتی حصار قائم کیا ہوا تھا۔ بڑے میاں کے دشمنوں کی تعداد کم نہیں تھی۔ اسی طرح جاں نثار بھی اَن گنت تھے لیکن وہ بے خبر تھے کہ

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

موت چپکے سے مریض کو حفاظتی حصار سے نکال لے گئی تھی۔
ورگا نے اپنا بیگ بیڈ کے قریب میز پر رکھ دیا۔ اس نے مریض کی جوانی کی تصویر دیکھی تھی۔ وہ کسی بھینسے کے مانند طاقتور تھا اور اب وہ سکڑ کر بے روح زرد بکری کی طرح رہ گیا تھا۔ وہ کوئی عام آدمی نہیں تھا۔ فعال زندگی میں وہ خوف و وحشت کا استعارہ رہا تھا۔ اسّی سال کی عمر میں موت نے بالآخر اسے پٹخ دیا تھا...... نیچے ہال کی جانب سے آوازیں آرہی تھیں۔ صبح کی روشنی پھیل رہی تھی۔ بڑے میاں کا سب سے چھوٹا بیٹا بوبی کمرے میں داخل ہوا۔ وہ شب خوابی کے لباس میں تھا۔ اس نے باپ کے چہرے کو دیکھا پھر ڈاکٹر کی جانب نظر کی۔ کچھ کہنے سننے کی ضرورت نہ تھی۔ بوبی کی بیوی مارگا کمرے میں داخل ہوئی اور آہ و زاری کرنے لگی۔

بوبی آگے بڑھا۔ باپ کا ہاتھ چوما اور ہسپانوی زبان میں کچھ کہا۔ وہ پلٹا اور ڈاکٹر کا شکریہ ادا کیا۔ ''مجھے اپنے بھائیوں کو بتانا ہوگا۔'' ڈاکٹر ورگا نے بوبی کی آنکھوں کو پڑھنے کی کوشش کی۔

''اب کیا ہوگا؟'' ڈاکٹر نے سوچا۔ برسوں سے بڑے میاں نے اپنے رعب و دبدبے کے بل پر معاملات کو سنبھالا ہوا تھا۔ وہ ایک خطرناک آدمی تھا۔ قید میں، بیماری میں...... ہر حال میں خطرناک تھا...... مرنے کے بعد بھی...... بلائیں آزاد ہونے والی تھیں۔ خون سے خون کبھی نہیں دھلتا لیکن یہاں معاملہ دوسرا تھا۔ اب خون بہے گا۔ خون سے خون دُھلے گا۔

☆☆☆

وہ خواب نہیں، حقیقت تھی۔ واقعی اس کا تعاقب ہو رہا تھا۔ نٹالی نے رفتارِ قدم بڑھا دی۔ دھڑکن پہلے ہی ناہموار تھی۔ متعاقب کے دونوں ہاتھ جیکٹ میں تھے۔ نٹالی کی رہائش گاہ زیادہ دور نہیں تھی۔ عقب میں قدموں کی چاپ قریب ہوگئی تھی۔ نٹالی کا دل سینے میں پھڑپھڑانے لگا۔ گھر کے قریب مارکیٹ تھی۔ نٹالی تقریباً بھاگتی ہوئی مارکیٹ میں گھس گئی۔ ایک باسکٹ اٹھا کر اس نے چند ضروری اشیا اس میں رکھیں اور ریکس کے درمیان چکراتی ہوئی کاؤنٹر پر ادائیگی کر کے باہر نکلی...... وہ کہیں نظر نہیں آیا۔ لیکن جلد ہی نٹالی کی غلط فہمی دور ہوگئی۔ وہ پارکنگ میں ایک گاڑی سے ٹیک لگائے کھڑا تھا۔

وہ فیصلہ نہیں کر پا رہی تھی۔ گریگ کو فون کرے یا 911۔ اس کی رہائش بہت قریب تھی۔ اچانک وہ بھاگی۔

عمارت کا گیٹ کھول کر اندر گھسی اور گیٹ بند کر دیا۔ گہری گہری سانسیں لے کر اس نے ایلیویٹر کا رخ کیا۔ مسامات نے پسینا اگل دیا تھا۔ ساتویں منزل پر جانے کے لیے اس نے بٹن پش کیا۔ اس کے ہاتھ ابھی تک لرز رہے تھے۔ اپارٹمنٹ کی چابی اس نے پہلے ہی بیگ سے نکال لی۔

ساتویں منزل پر ایلیویٹر رکا۔ در کھل کر اطراف میں روپوش ہوگئے۔ سامنے دو آدمی کھڑے تھے۔ نٹالی کی چیخ حلق میں ہی گھٹ کے رہ گئی...... خون سرد پڑ گیا۔ نٹالی آگاہ تھی کہ وہ دو آدمی نہیں...... دو عدد موت کے ہرکارے تھے۔ پیچھے جانے کی گنجائش نہیں تھی۔ وہ دھندلی نظر سے دونوں کو گھورتی رہی...... کس نے بھیجا ہے ان کو...... باپ نے؟ کومبین؟ یا ایف بی آئی؟

☆☆☆

نیویارک کے ڈائمنڈ ڈسٹرکٹ میں اس کی اپنی کمپنی تھی۔ بنجامن راب بیس سال سے سونے کا کاروبار کر رہا تھا۔ انڈین اس کے سب سے بڑے گاہک تھے۔ دنیا میں زیورات کی ایکسپورٹ میں خود انڈینز کا بہت بڑا حصہ تھا۔ آغاز میں بنجامن راب نے چھوٹے پیمانے پر کام کا آغاز کیا تھا...... آج وہ 47th اسٹریٹ کے نصف سے زائد ڈیلرز کو گولڈ سپلائی کرتا تھا۔ یہی نہیں بلکہ دنیا کے قدآور درآمد کنندگان اس کے گاہکوں میں شامل تھے۔ اس کاروبار میں شاید ہی کوئی ایسا ہو جو اسے نہ جانتا ہو۔

ایک محبت کرنے والی بیوی اور تین خوب صورت بچوں کے ساتھ وہ ایک شاندار زندگی گزار رہا تھا۔ اس کے گیراج میں چھ کاروں کی گنجائش تھی۔ خود وہ زیادہ تر فیراری 585 استعمال کرتا تھا۔ بیس سال سے بیٹسی ہی اس کی اسسٹنٹ تھی۔ بچوں میں سب سے بڑی نٹالی، پھر ایملی اور جسٹن تھے۔ ایملی سولہ سال...... اور اسکواش میں قومی رینکنگ رکھتی تھی۔ جسٹن چودہ سال کا تھا۔ بیوی کا نام شیرلن تھا۔ ان سب کی تصاویر راب کے قیمتی آفس کی دیواروں کے علاوہ ''لارچمونٹ'' میں محل جیسے گھر میں بھی آویزاں تھیں۔ گریجویشن کے بعد نٹالی آٹھ ماہ سے البرٹ آئین اسٹائن میڈیکل کالج، برونکس میں سائیٹو جینیٹکس لیوکیمیا پر کام کر رہی تھی۔ نٹالی نے ''براؤن'' سے فیلوشپ جیتی تھی۔ ٹینا، لیب میں اس کی پارٹنر تھی۔ جو نٹالی سے ایک سال سینئر تھی۔ فیملی ہر سال تفریح کے لیے ملک سے باہر جاتی تھی۔ فرنچ ایلپس، کینیا سفاری، انڈیز......

کاروباری معاملات میں بیٹسی اور اکاؤنٹنٹ، راب

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

سے زیادہ قریب تھے...... اس وقت بھی وہ بیٹسی کے ساتھ محوِ گفتگو تھا۔ ظاہر ہے مارکیٹ کا اتار چڑھاؤ موضوع تھا۔ دفعتاً آفس کے بیرونی رخ سے توڑ پھوڑ کی نمایاں آوازیں سنائی دیں۔ پہلا خیال راب کے ذہن میں دھماکے کا تھا...... دوسرا خیال واردات کا آیا۔ راب کا تیز ردِعمل الارم کی جانب تھا۔ لیکن اس سے پہلے ہی اکاؤنٹنٹ بدحواسی کے تاثرات چہرے پر سجائے نمودار ہوا۔ اس کے عقب میں دو آدمی سوٹ میں ملبوس تھے۔ اوپر گہرے نیلے رنگ کی جیکٹس پہنی ہوئی تھیں۔

''بنجامن راب؟''

''یس......'' وہ کھڑا ہوگیا اور دراز قامت کا سامنا کیا جو انچارج معلوم ہو رہا تھا۔ سر کے بال سامنے سے اُڑنا شروع ہو گئے تھے۔

''کون ہو؟ کیسے گھسے چلے آرہے ہو؟ آخر ہو کیا رہا ہے؟''

''دراز قامت نے ایک فولڈر ڈیسک پر رکھ دیا۔ ''یہ فیڈرل جج کی جانب سے گرفتاری کا وارنٹ ہے۔''

ایف بی آئی کے کچھ اور آدمی اندر گھس آئے۔

''گرفتاری؟ کس لیے؟''

''منی لانڈرنگ، سرکار کے ساتھ فراڈ، مجرم ادارے کے ساتھ ساز باز...... مسٹر راب اتنا کافی ہے؟ دفتر میں جو کچھ ہے، وہی ہمارے لیے کافی سے زیادہ ہوگا۔''

اس سے پہلے راب کچھ کہتا، ایک ایجنٹ نے اسے پکڑ کے گھمایا اور ہتھکڑیاں پہنا دیں۔

''کیا پاگل پن ہے؟'' راب مچل اٹھا۔

''تمہیں اب تک چھوٹ دی، وہ پاگل پن تھا۔''

☆☆☆

ثنالی، ہائی پاور مائیکرو اسکوپ پر جھکی ہوئی تھی۔ ٹینا بھی اس کے قریب تھی۔ دونوں طبی اصطلاحات میں سرگوشیاں کر رہی تھیں۔ ثنالی، ڈیجیٹل فائل میں لکھتی جا رہی تھی...... وہ سفید رنگ کا لمفو بلاسٹ ہے، پیکر اسے کلر لیو کو سائٹ کہتا ہے۔ یہ لیوکومیا کا پیچھا جونک ایجنٹ ہے۔

''اگلے ہفتے ہم دیکھیں گے کہ پلازما کے محلول میں کیا ہوتا ہے......''

''تم سارا دن یہی کرتی رہی ہو؟'' ٹینا نے کہا۔

ثنالی کے جواب دینے سے پیشتر ہی اس کے سیل فون نے موسیقی نشر کی، ثنالی کا دھیان اپنے دوست گریگ کی طرف گیا اور اس نے فون واپس لیب کوٹ میں رکھ لیا۔ اگر گریگ نہیں ہے تو یقیناً پھر ماں کا فون ہوگا۔ وہ ٹینا کو لے کر لائبریری میں آگئی۔ فون کی آواز نے ایک پُرخلل اندازی کی۔ ثنالی نے فون نکال کر پیغام پڑھا۔ ''ثنالی، یہاں کوئی خرابی ہے۔ گھر فون کرو، جلدی!''

ثنالی پیغام کو گھورتی رہی۔ ایسا پیغام تیئس سال کی عمر میں اس نے کبھی وصول نہیں کیا تھا۔ اسے پیغام کے الفاظ برے لگ رہے تھے۔ اس کا ذہن تیزی سے امکانات کا جائزہ لے رہا تھا۔

''ٹینا، معاف کرنا...... مجھے گھر فون کرنا پڑے گا۔''

''کوئی مسئلہ نہیں ہے۔'' ٹینا نے جواب دیا۔

ثنالی نے دھڑکتے دل کے ساتھ نمبر پنچ کیا۔ دوسری جانب اس کی ماں نے فوراً ہی فون اٹھا لیا...... ماں کی آواز نے ثنالی کی دھڑکنوں کو مزید بڑھا دیا۔

''ثنالی......''

''ہاں، مام؟''

''تمہارے ڈیڈ''

''مام کیا ہوا ڈیڈی کو؟'' ثنالی کی آواز ازخود بلند ہو گئی۔ اس کا بدن غیر محسوس انداز میں لرز رہا تھا۔ ڈیڈ کی صحت شاندار تھی۔ کیا ہوسکتا ہے......

''مام...... م......؟''

''پتا نہیں...... سیکریٹری کا فون آیا تھا...... ایف بی آئی والے ان کو گرفتار کر کے لے گئے ہیں۔'' ثنالی کی ماں نے رندھی ہوئی آواز میں بمشکل بات مکمل کی۔ ''سیکریٹری بتا رہی تھی......''

ثنالی پھٹی پھٹی آنکھوں سے فون کو گھور رہی تھی۔

☆☆☆

راب کو ایف بی آئی کے ہیڈکوارٹر ''فولی اسکوائر'' لوئر مین ہٹن لے جایا گیا۔ وہ ایک چھوٹے سے کمرے میں بیٹھا تھا۔ جہاں چند دھاتی کرسیاں اور ایک چوبی میز رکھی تھی۔ وہ سامنے شیشے کو تک رہا تھا۔ اسے علم تھا کہ یہ دوطرفہ شیشہ ہے۔ دوسری جانب سے اسے دیکھا اور سنا جا سکتا ہے۔ یہ ایسا ہی تھا، جیسے ہم ٹی وی اور فلموں میں دیکھتے ہیں۔ کوئی خوفناک غلطی ہوئی ہے۔ وہ ایک کاروباری شخص تھا جس نے زندگی میں کوئی خلافِ قانون کام نہیں کیا تھا۔ بیس منٹ بعد دروازہ کھلنے پر راب کھڑا ہوگیا۔ وہی دونوں ایجنٹ اندر داخل ہوئے۔ ان کے پیچھے چھریرے بدن کا ایک آدمی تھا جس نے گرے سوٹ پہنا ہوا تھا۔ ہاتھ میں تھاما بریف کیس اس نے میز پر رکھ دیا۔

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

''میں اسپیشل ایجنٹ انچارج بوتھ ہوں۔'' دراز قامت نیم گنجے آدمی نے کہا۔ ''تم اسپیشل ایجنٹ روئز سے پہلے ہی مل چکے ہو اور یہ مسٹر نارڈوزی ہیں، مسٹر نارڈوزی، یو ایس جسٹس ڈپارٹمنٹ کے اٹارنی ہیں، جو تمہارے کیس سے واقف ہیں۔''

''میرا کیس......؟'' راب نے مسکرانے کی کوشش کی۔

''مسٹر راب، ہمیں چند سوالات کے جواب درکار ہیں۔'' ہسپانک ایجنٹ روئز نے کہا۔ ''ہمیں امید ہے کہ تم مکمل تعاون کرتے ہوئے پوری سچائی اور دیانت کا مظاہرہ کرو گے۔ اس طرح سب کے لیے مراحل آسان تر ہو جائیں گے۔''

''یقیناً۔'' راب نے سر ہلایا اور بیٹھ گیا۔

''اگر تم اعتراض نہ کرو تو ہم بات چیت ٹیپ کر لیتے ہیں۔'' اس نے ایک کیسٹ ریکارڈر نکال کر میز پر رکھ دیا۔

''اس میں تمہارا ہی تحفظ ہے پھر بھی تم کسی وقت چاہو تو تمہارے وکیل کا بندوبست کر دیا جائے گا۔''

''مجھے وکیل کی ضرورت نہیں ہے۔'' راب نے نفی میں سر ہلایا۔ ''میرے پاس چھپانے کے لیے کچھ نہیں ہے۔''

''یہ بڑی اچھی بات ہے، مسٹر راب۔ چھپانے کو کچھ نہ ہو تو پیچیدگیاں نہیں پیدا ہوتیں۔'' روئز نے فائل میں سے کاغذات نکال کر سلیقے سے سجائے۔

''مسٹر راب، تم نے پازا ایکسپورٹ انٹر پرائز کا نام سنا ہے۔'' اس نے ایک کاغذ پر انگلی رکھی۔

''ہاں، وہ میرے چند بڑے گاہکوں میں سے ایک ہیں۔''

''تم ان کے لیے کیا کرتے تھے؟''

''میں اوپن مارکیٹ سے گولڈ خریدتا تھا۔ ان کا ناولٹی گفٹ کا کاروبار ہے۔ میں گولڈ ان کے کہنے پر درمیانی رابطے کے ذریعے بھیجتا تھا۔''

''درمیانی رابطہ...... آرگوٹ مینوفیکچرنگ؟'' روئز نے دوسرے ورق کو آگے کیا۔

''ہاں، آرگوٹ۔''

''تمہاری گولڈ کی شپمنٹ، آرگوٹ وصول کر کے کیا کرتے تھے؟''

''مجھے نہیں معلوم۔ وہ مینوفیکچرر ہیں۔ وہ زیورات بنا سکتے ہیں۔ سونے کی پلیٹ بنا سکتے ہیں...... یا جو ''پازا'' مطالبہ کریں وہ بنا دیں۔''

''پازا کے لیے ''ناولٹی آئٹمز'' روئز نے کاغذات پر نظر ڈالی۔

راب نے کہا۔ ''وہ کیا کرتے ہیں، یہ ان کا کاروبار ہے۔ میں ان کے لیے گولڈ خریدتا تھا۔''

''یہ سلسلہ کب سے جاری تھا؟'' یہ سوال بوتھ نے کیا۔

''مجھے دیکھنا پڑے گا۔ چھ یا سات سال......''

''چھ سے آٹھ سال۔'' روئز کی نظر کاغذات پر تھی۔

''مسٹر راب، اس دوران تمہیں علم نہیں تھا کہ تمہارے بھیجے ہوئے گولڈ سے وہ درحقیقت کیا بناتے تھے؟''

راب کو یہ سوال عجیب سا لگا۔ ''بہت سی چیزیں بنائی جا سکتی ہیں۔'' راب نے شانے اچکائے۔ ''مختلف کسٹمرز کے لیے مختلف اشیا۔ حتیٰ کہ بٹن، قلم، پیپر ویٹ، کف لنکس، زیورات...... وغیرہ۔''

''لیکن اس مدت میں انہوں نے کثیر مقدار میں سونا استعمال کیا ہے۔'' بوتھ نے کہا۔ ''صرف گزشتہ برس تین ہزار ایک سو پونڈ۔ عام اندازے کے مطابق ایک اونس پر چھ سو چالیس ڈالرز...... یعنی اکتیس ملین ڈالرز، مسٹر راب۔''

بوتھ کی معلومات اور انکشاف نے راب کو متحیر کر دیا۔ اس نے محسوس کیا کہ پسینے کا قطرہ کنپٹی سے پھسل رہا ہے۔ اس نے ہونٹوں پر زبان پھیری۔ ''میں نے بتایا کہ میرا کام خریدنا اور بیچنا ہے۔ وہ مجھے کنٹریکٹ دیتے تھے اور میں ان کو سپلائی۔ دیکھو شاید تم مجھے بتانا چاہ رہے ہو......'' راب، بوتھ کو مسکراتے دیکھ کر خاموش ہو گیا۔ روئز فولڈر سے مزید کاغذات نکال رہا تھا۔ کاغذات نہیں، وہ فوٹو گراف تھے۔ سیاہ و سفید، دس انچ لمبے اور آٹھ انچ چوڑے فوٹو گراف...... عام اور غیر اہم اشیا کی تصاویر...... ہتھوڑے، پیچ کس، ہوز پائپ، تالے...... ڈور ناب......

''مسٹر راب، ان میں سے کسی کو پہچانتے ہو؟''

پہلی مرتبہ راب نے محسوس کیا کہ رفتارِ قلب بڑھنی شروع ہو گئی ہے۔

''نہیں۔'' اس نے جواب دیا۔

''تم آرگوٹ سے قیمت وصول کرتے تھے...... کک بیکس؟''

''کمیشن۔'' راب نے تصحیح کی۔

روئز نے ایک اور شیٹ نکالی۔ ''مارکیٹ میں......

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

کموڈیٹی مارکیٹ میں کمیشن ایک فیصد، ڈیڑھ...... حد سے حد دو فیصد چلتا ہے اور تمہارا چھ فیصد اور بعض اوقات آٹھ فیصد۔ کیا میں غلط ہوں؟'' روبرٹ نے بغور راب کو دیکھا۔

معاً راب کا حلق خشک ہو گیا۔ اس نے باری باری تینوں ایجنٹس کی طرف دیکھا۔ بریف کیس والا اب تک خاموش تھا۔

''جیسے کہ تم نے بتایا کہ بہت زیادہ سونا استعمال کیا گیا ہے۔'' راب نے کہا۔ ''لیکن اس کا انہوں نے کیا کیا...... یہ ان کا مسئلہ ہے۔ میں نے صرف گولڈ سپلائی کیا تھا۔''

''انہوں نے کیا، کیا سونے کے ساتھ۔'' بوتھ کا صبر جواب دینے لگا۔ ''سونا انہوں نے ایکسپورٹ کیا، مسٹر راب۔ یہ فوٹو ناولٹی گفٹس کے نہیں ہیں۔ نہ یہ فولاد، کانسی، تانبے سے بنائے گئے ہیں۔ یہ گولڈ پلیٹڈ بھی نہیں ہیں۔ یہ ٹیلین ہے۔ ٹھوس سونا۔ ان پر پینٹ کیا گیا تھا پھر عام اشیا کے مانند ایکسپورٹ کی گئیں؟''

''میرا خیال ہے، جنوبی امریکا میں کسی جگہ۔'' راب نے گھٹی ہوئی آواز میں کہا۔ ''میں یقین سے نہیں کہہ سکتا۔ سونا میں نے خریدا تھا...... لیکن میں سمجھ رہا ہوں۔''

''تم نہیں سمجھ رہے، مسٹر راب۔'' بوتھ نے آنکھیں چار کیں۔ ''تمہارا ایک پیر دلدل میں بہت گہرا چلا گیا ہے اور دوسرا، ہم جاننا چاہتے ہیں کہ دوسرا پیر اندر ہے یا باہر...... کیا تم جانتے ہو آرگوٹ کی ملکیت کس کے پاس ہے؟''

''ہیرالڈ کورن ریچ۔'' راب نے قدرے اعتماد سے جواب دیا۔ ''میں ہیرالڈ کو اچھی طرح جانتا ہوں۔''

''گڈ، اور پاز؟''

''میرے خیال میں پاز کی ملکیت اسپاسا کے پاس ہے۔ میں چند بار اس سے ملا ہوں۔''

''وہ وکٹر اسپاسا ہے۔'' روبرٹ نے ایک فوٹو آگے کھسکایا۔ ''وہ پاز میں محض ایک آپریٹنگ پارٹنر ہے...... آرٹیکلز آف ان کارپوریشن ''کے مین'' آئی لینڈ میں ''بی کے اے'' انویسٹمنٹ لمیٹڈ کے نام سے ہے۔'' روبرٹ نے چند اور فوٹو دکھائے۔ جن میں نظر آنے والے افراد ہسپانک معلوم ہوتے تھے۔

''ان میں سے کسی کو جانتے ہو؟''

اب راب درحقیقت ہراساں ہو گیا تھا۔ پسینے کا ایک اور قطرہ گردن سے ریڑھ کی ہڈی پر لکیر بنا رہا تھا۔

''نہیں۔'' اس نے شدت سے نفی میں سر ہلایا۔

''وکٹر اسپاسا، رامن رامریز، لوئیس ٹروجیلو...... یہ تینوں ''بی کے اے'' نامی کمپنی کے مرکزی عہدیدار ہیں۔ تمہارے سونے سے جو عام سی اشیا بنا کر وہاں بھیجی جاتی تھیں، وہ لوئیس وصول کرتا تھا۔'' روبرٹ نے ایک اور فوٹو آگے بڑھایا۔ تصویر میں ایک فربہ شخص فینسی سوٹ میں مرسیڈیز میں بیٹھا ہوا تھا۔

''یہ مارکیڈو فیملی کالیڈنگ منی منیجرز میں سے ایک ہے...... کولمبین ڈرگ کارٹل کی مارکیڈو فیملی۔''

''کولمبیا!'' راب کے حلق سے پھنسی پھنسی آواز نکلی۔ آنکھیں حلقوں سے ابل پڑیں۔ رنگ فق ہو گیا۔ وضاحت سے جو کہانی ایجنٹ روبرٹ سنا رہا تھا، اس کے بیشتر الفاظ اور جملے راب کی سماعت سے دور تھے...... اسے سننے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ سب کچھ ظاہر اور عیاں تھا۔ اس کا بھیجا ہوا سونا دراصل کولمبیا جا رہا تھا۔ سات آٹھ سال سے۔ خود راب کمیشن کے ساتھ جو قیمت وصول کرتا رہا تھا، وہ منشیات کی آمدنی تھی۔ کولمبین ڈرگ مافیا کے کاروبار سے حاصل شدہ بلیک منی۔

اچانک راب اچھل پڑا ''نہیں۔'' اس کے اعصاب بے قابو ہو گئے تھے۔ وہ بلند آواز میں بول رہا تھا۔ ''میں قسم کھاتا ہوں، میرا اس سیاہ دھندے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ میں سونا بیچتا ہوں...... اور بس۔ ایسا دوسرے بھی کرتے ہیں۔ وکٹر نے مجھ سے رابطہ کیا تھا۔ اگر تم لوگ مجھے ڈرانا چاہتے ہو تو تم اپنے مقصد میں کامیاب رہے ہو۔ لیکن کولمبیا، مارکیڈو میرا اس کاروبار سے کوئی تعلق نہیں، میرے ساتھ کیا کیا جا رہا ہے؟''

بوتھ نے اپنا رخسار کھجایا۔ جیسے اس نے کچھ سنا ہی نہ ہو۔

''جب وکٹر تم سے ملا تو وہ کیا چاہتا تھا؟''

''وہ گولڈ خریدنا چاہتا تھا۔ وہ گولڈ سے مختلف آئٹم بنانا چاہتا تھا۔''

''اور آرگوٹ مینوفیکچرنگ کیسے درمیان میں آگئی؟''

راب بل کھا کے رہ گیا۔ وہ سوال کا مقصد سمجھ گیا۔ آرگوٹ، راب کے دوست کی کمپنی تھی۔ ہیرالڈ۔ اس نے ہیرالڈ کو وکٹر سے ملوایا تھا پھر یہ سلسلہ برسوں چلتا رہا۔ وکٹر ادائیگی، ہیرالڈ اور وہ راب کو کرتا تھا۔

پہلی بار نارڈوزی گویا ہوا...... جسٹس ڈپارٹمنٹ کا وکیل۔ وہ آگے کی جانب جھکا۔ ''مسٹر راب، اب تم سمجھ گئے ہو کہ منی لانڈرنگ کیا ہوتی ہے؟''

☆☆☆

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

راب کو لگا، کسی نے اس کے پیٹ میں گھونسا مارا ہے۔
اس کا چہرہ سفید پڑ گیا۔ ''میں کچھ نہیں سمجھا۔'' مسامات نے پسینا اگل دیا قمیص کی پشت تر ہونے لگی تھی۔ ''میں قسم کھاتا ہوں۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ وہ سونے کے ساتھ کیا کر رہے ہیں.....سونا کیسے اور کہاں جا رہا ہے؟''

''تم نے کہا وکٹر تمہارے پاس آیا تھا؟''

''ہاں، وہ گولڈ سے مینوفیکچرنگ کے لیے میرا تعاون چاہتا تھا۔ میں نے اپنے دوست ہیرالڈ یعنی آرگوٹ کمپنی سے ملوا دیا۔ اس طرح میں وکٹر کے ریکارڈ پر بروکر تھا۔ ہیرالڈ سے ملوانے پر اس نے مجھے زیادہ کمیشن دیا۔ بی کے اے کا نام میں نے کبھی نہیں سنا۔ ہیرالڈ ایک اچھا آدمی ہے۔ میں بہت عرصے سے اسے جانتا ہوں۔''

''تم ''ریکو اسٹیٹس'' کا مطلب جانتے ہو؟'' یو ایس اٹارنی نے بریف کیس کھولا۔ ''یا پیٹریاٹ ایکٹ کے معنی؟''

''ریکو (RICO).....'' راب سناٹے میں آ گیا۔

''تم لوگ کیا سوچ رہے ہو؟'' (RACETEER INFLUENCED+CORRUPT ORG.ACT)

اٹارنی نے اسے ریکو کے بارے میں سمجھایا۔ راب کو اس وضاحت کی ضرورت نہیں تھی۔ یہ منی لانڈرنگ یا گورنمنٹ کے ساتھ فراڈ کرنے والوں پر لاگو ہوتا تھا۔ پیٹریاٹ ایکٹ کی وضاحت کے ساتھ اٹارنی نے کہا۔ ''2001ء سے یہ قانون ہے کہ باہر سے آنے والی رقم اگر بیس ہزار ڈالرز سے زیادہ ہے تو اسے رپورٹ کیا جائے۔ بصورت دیگر یہ غیر قانونی سمجھا جائے گا۔''

راب کے گھٹنوں پر ہتھوڑے کے مانند ضرب لگی۔

''پیٹریاٹ ایکٹ کی بات کیوں ہو رہی ہے؟''

''مسٹر راب، تم بدبودار دلدل میں گردن تک اتر گئے ہو.....کوئی راستہ ہے تمہارے پاس؟'' بوتھ کا لہجہ سپاٹ تھا۔

''راستہ؟'' اس کا سر گھومنے لگا۔ ''مجھے وکیل کی ضرورت ہے۔''

''نہیں، نہیں...... وکیل نہیں..... تمہیں پورا جسٹس ڈپارٹمنٹ درکار ہے۔ پھر بھی بات نہیں بنتی۔'' بوتھ نے سرد آواز میں کہا۔

روئز نے پانی کا گلاس بڑھایا۔ ''ہاں ایک راستہ ہے۔''

''کیسا راستہ؟'' راب نے پانی پیا۔

''فیڈرل پریزن سے بیس سال باہر رکھنے کا واحد راستہ۔'' بوتھ نے سنجیدگی سے کہا۔

راب کے پیٹ میں گڑگڑاہٹ ہوئی۔ اس نے حلق کی رطوبت اور آنکھوں کے پانی کو واپس کھینچا۔ ''کیسے؟''

''وکٹر، مسٹر راب۔ وکٹر، رامن، امریز اور لوئیس کا ہیڈ ہے۔ تم نے فلمیں دیکھی ہوں گی۔ ہم اسی طرح کام کریں گے۔ تم سیڑھی سے اوپر جانے کے لیے ہماری مدد کرو۔ انہیں غائب کرنا ہمارا کام ہے..... سمجھ رہے ہو۔ تمہارے دوست ہیرالڈ کا کام بھی ختم سمجھو۔''

راب کو ہیرالڈ کے ساتھ فیملی ٹرمز کا خیال آیا۔ ''اس کے ساتھ میرے بیس سال پرانے مراسم ہیں۔''

''سمجھ لو کہ وہ تاریخ کا حصہ بن چکا ہے۔ اپنے بارے میں سوچو۔''

''تمہاری ایک اچھی فیملی ہے۔'' روئز نے کہا۔ ''جن کی تصاویر تمہارے آفس میں لگی ہیں۔ تم فیڈرل پریزن میں جاؤ گے تو ان کا کیا ہوگا......بیس سال۔ وہ لوگ جیتے جی مر جائیں گے۔''

راب کے سینے میں کھولن ہونے لگی۔ اس نے اٹھ کر دیوار پر گھونسا مارا۔

''کیوں کر رہے ہو یہ..... میں نے صرف دو آدمیوں کو ملوایا۔ اسٹریٹ پر آدھے لوگ یہ کام کر رہے ہیں اور پیٹریاٹ ایکٹ صرف میرے لیے ہے۔ کیا گولڈ کا کاروبار جرم ہے؟''

وہ تینوں خاموش رہے۔ راب واپس میز پر آ گیا۔

''مجھے وکیل چاہیے۔'' اس نے ہتھیلی کی پشت سے پیشانی کا پسینا صاف کیا۔

''وکیل تو آ جائے گا لیکن تم اپنا آخری موقع بھی گنوا دو گے۔ تمہارے پاس بہترین آپشن ہے کہ ہم سے بات کرو۔ وکیل کو بلانے سے پہلے یہ دیکھ لو۔ روئز نے فوٹو اس کے حوالے کیا۔ راب نے فوٹو دیکھا اور اس کی بچی ہوئی توانائی بھی اختتام پذیر ہو گئی۔ یہ ایک نہیں کئی فوٹو تھے۔ درمیانے قد کا مونچھوں والا آدمی راب کے آفس میں اس کے ساتھ دکھائی دے رہا تھا۔ کہیں کھڑکی کے پاس، کہیں میز پر، کہیں سڑک پار کرتے ہوئے اور کہیں دونوں چائنا گرل میں لنچ کر رہے تھے۔

''آئیون بیرو آ۔'' راب نے سرگوشی کی۔ کمرے کا دروازہ کھلا اور چوتھے آدمی نے قدم اندر رکھا۔ راب کی

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

آنکھیں چوڑی ہوگئیں۔ وہ آئیون بیرو آ تھا۔ اس وقت وہ مختلف لباس میں تھا اور سوٹ زیب تن کیا ہوا تھا، جس پر بیج لگا تھا۔

''میرا خیال ہے تم ایجنٹ ایسپوسیٹو کو پہچانتے ہو۔ اگر نہیں تو تم دونوں کی میٹنگز کی ریکارڈنگ چلائی جائے؟''

راب سانس لینا بھول گیا۔ کان سائیں سائیں کررہے تھے۔ وہ گردن تک نہیں سر تک دلدل میں اتر گیا تھا۔

☆☆☆

ثانی نے بروقت فورڈہام روڈ پر بارہ دس والی ٹرین پکڑی۔ وہ لارچ مونٹ میں واقع گھر کی طرف جارہی تھی۔ وہ میڈیکل کالج سے چند ذاتی استعمال کی اشیا لے کر نکلی تھی اور گریگ کے لیے ایک مختصر پیغام چھوڑ دیا تھا۔ دورانِ سفر اس کے حواس مختل ہوئے جارہے تھے۔ ذہن ٹھیک طرح کام نہیں کررہا تھا۔ ماں کی کال نے اس کے ہوش اڑا دیے تھے۔ ڈیڈ کو ایف بی آئی نے گرفتار کرلیا ہے۔ ماں کی آواز میں لرزش اور دہشت نہ ہوتی تو ثانی اسے مذاق ہی سمجھتی۔

لیکن ماں کی آواز حقیقت بتا رہی تھی...... منی لانڈرنگ، غیر قانونی لین دین...... اسے یقین تھا کہ ڈیڈ منافع سے زیادہ دیانت داری کو اہمیت دیتے تھے۔ کمیشن میں اونچ نیچ ہوسکتی تھی...... کبھی کبھار...... ٹیکس بچانے کے لیے چھوٹا موٹا ہیر پھیر یا پھر کبھی کمپنی کی میل پر فیملی کو ڈنر دینا...... ایسا کوئی بھی کرسکتا تھا۔

لیکن ''ریکو'' اسٹیٹس، کرمنل کمپنی کے ساتھ کاروبار...... ایف بی آئی، وہ چکرا گئی۔ وہ اپنے باپ کو جانتی تھی۔ یہ ناممکن ہے۔ وہ ٹرین کی آخری کار میں تھی۔ ٹکٹ لے کر اس نے سر شیشے سے ٹکا دیا۔ وہ سانسوں کو ہموار رکھنے کی کوشش میں مصروف تھی۔

''ساکھ ہی سب کچھ ہوتی ہے۔'' اس کے ڈیڈ ہمیشہ یہی سبق پڑھاتے تھے۔ ان کے کاروبار کی بنیاد ہی ساکھ تھی۔ ثانی نے خود دیکھا تھا، ڈیڈ نے کئی منافع بخش سودے اصولوں کی بنیاد پر ٹھکرا دیے تھے۔ اس نے آنکھیں بند کرلیں۔ وہ سب سے بڑی تھی۔ ڈیڈ کے ساتھ اس کا رشتہ بھی بہت مضبوط تھا۔ وہ محبت بھی اس سے بہت کرتے تھے۔ وہ ایک پرکشش شخصیت کی مالک تھی اور حیرت انگیز طور پر ہالی ووڈ کی ہیروئن نٹالی پورٹ مین سے ملتی تھی۔ ڈیڈ ہمیشہ اسے ''نیٹ'' کہہ کر بلاتے تھے۔ ڈیڈ اسے اکثر چھیڑتے تھے کہ وہ اتنی خوب صورت کیسے ہوگئی۔ بچپن میں وہ کافی موٹی تھی۔

وہ کہتے تھے کہ اسے میڈیکل کے بجائے ہالی ووڈ میں ہونا چاہیے تھا۔ ثانی کے لیے اور اس کے بہن بھائی کی خاطر کتنی بار وہ کام چھوڑ کر آگئے تھے۔ ایک مرتبہ وہ ایملی کے اسکواش ٹورنامنٹ میں اچانک پہنچے تھے۔ وہ اپنی فیملی کے ساتھ وابستہ تھے۔ ایک اچھے شوہر اور ایک اچھے باپ کے مانند۔ ثانی کے دادا کا انتقال ہوچکا تھا۔ ثانی کو یاد پڑتا تھا کہ اس کے دادا کا انتقال شاید کار کے حادثے میں ہوا تھا۔

ثانی کا دماغ ماؤف ہوگیا۔ ''ڈیڈ، یہ کیا ہوگیا؟''

اچانک اس کے مرض کی علامات ظاہر ہونے لگیں۔ وہ جب سترہ سال کی تھی، تب ذیابیطس ٹائپ A کا شکار ہوگئی تھی۔ تناؤ کی حالت میں اس کا خطرہ بڑھ جاتا تھا۔ اس نے بیگ کھول کر بلڈ مانیٹر نکالا۔ وقت کے ساتھ وہ مرض کو سنبھالنے کے قابل ہوگئی تھی۔ ڈائٹ اور سرگرمیوں میں تبدیلی کے ساتھ جذباتی اتار چڑھاؤ کا بھی خیال رکھنا پڑتا تھا۔ دن میں دو مرتبہ دوا لینی پڑتی تھی۔ ڈیجیٹل میٹر کی ریڈنگ پر 282 کے ہندسے چمک رہے تھے۔ ''اوہ گاڈ، یہ زیادہ ہے۔'' اس نے کٹ نکال کر سرنج کے ذریعے اٹھارہ یونٹ انسولین لی۔ سوئیٹر اٹھا کر پسلیوں کے قریب پیٹ میں آہستگی سے انسولین منتقل کردی...... مرض سے متعلق ابتدائی گھبراہٹ پر اس نے برسوں پہلے قابو پالیا تھا۔ ڈیڈی اکثر و بیشتر اسے یاد دلاتے کہ اس کے اندر ایک فائٹر چھپا ہے۔

دوا لینے کے بعد سر اور آنکھوں کی دھمک، حلق کی خشکی اور تھکن کا احساس معدوم ہونے لگا۔ ٹرین لارچ مونٹ کے قریب پہنچ گئی تھی۔ اس کے گھر کے قریب ماں کی سلور رنگ کی لیکسس کھڑی تھی۔ پہلے ڈیڈ ہر معاملہ سنبھال لیتے تھے اب شاید اس کی باری تھی۔ انتہائی کٹھن مرحلہ تھا۔ اسے بالکل مختلف اور انجانے حالات کا سامنا تھا۔

☆☆☆

سیاہ لنکن لیمو، راب کے وکیل نے ارینج کی تھی۔ ان کا رخ ویسٹ چیسٹر والے گھر کی جانب تھا۔ یہ ایک مشکل اور تکلیف دہ سفر تھا۔ ایک گھنٹے قبل بنجامن راب، یو ایس کورٹ ہاؤس کے جج میوریئل سپرسٹین کے سامنے تھا۔ کورٹ ہاؤس، فولی اسکوائر پر تھا۔ وہ لمحات، وہ وقت راب کی زندگی کے لیے سب سے اذیت ناک اور شرمناک تھا۔ فردِ جرم عائد کرتے وقت اس کو کوئی رعایت نہیں دی گئی، راب نے بدقت تمام خود کو قابو میں رکھا تھا۔ جج کی آواز اسے بلیڈ کے مانند کاٹ رہی تھی۔

وکلا اور جج کی گفت و شنید کے بعد دو ملین ڈالر کی

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

ضمانت دی گئی۔ تاہم یہ واضح کر دیا گیا تھا کہ یہ ضمانت راب کی حقیقی رہائی کا پروانہ نہیں ہے۔ ایک گھنٹے بعد وہ سیاہ لنکن لیمو میں ویسٹ چیسٹر جا رہا تھا۔ وکیل میل کیپٹن، راب سے کیس کی باریکیوں پر بات کر رہا تھا۔ ''ریکو'' کی حد تک اس کا کہنا تھا کہ سونے کے متعلق وہ اپنی لاعلمی ظاہر کر چکا ہے۔ چنانچہ یہ تسلیم شدہ نہیں ہے کہ وہ جانتا تھا۔ سونے کے ساتھ کیا کیا جا رہا تھا۔ یہ امر متنازعہ ہے۔ یہ بھی حقیقت تھی کہ وکٹر بھی تسلیم نہیں کرے گا کہ اس نے جو ادائیگی راب کو کی، وہ منشیات کی آمدنی سے حاصل کی گئی تھی۔

راب کو احساس تھا کہ حرص کے تحت وہ فاش غلطیاں کر گیا تھا۔ اسے زیادہ کمیشن وصول نہیں کرنا چاہیے تھا یا پھر زائد کمیشن کی علت تلاش کرنی چاہیے تھی۔ نہ اس نے یہ سوچا کہ ایک ہی چینل سے بھاری مقدار میں سونا جاتا رہا تو اصل مقصد کیا تھا...... کل سرکار کے ساتھ میٹنگ میں اس کی زندگی کے آنے والے بیس برسوں کا فیصلہ ہونا تھا۔

سب سے بڑا مسئلہ آئیون بیرو آتھا۔ راب کی آواز بھی موجود تھی۔ بیرو آ نے وہ اس قسم کی ڈیل کے بارے میں بات چیت کرتا رہا تھا۔ وکیل میل کیپٹن سے راب کی دس سالہ پرانی دوستی تھی۔ وہ ہر ممکن کوشش کرتا رہا تھا کہ کیس کی کوئی کمزوری تلاش کر لے...... کوئی معمولی سا رخنہ۔

جبکہ راب کے لیے دشوار ترین مرحلہ فیملی کو فیس کرنا تھا جو اس پر بھروسا کرتے تھے۔ اس کی عزت کرتے تھے۔ بیس سال پرانے رشتے، لمحوں میں بکھر سکتے تھے...... ہر شے بدلنے جا رہی تھی۔ راب کے پیٹ میں اینٹھن ہونے لگی۔ وہ اس کے بارے میں کیا سوچیں گے؟ وہ اس کی بات کیسے سمجھیں گے؟ کل کو ایک آدھ روز میں میڈیا کے ذریعے سب کچھ عوام میں چلا جائے گا۔ کیا وہ دن پھر آئے گا۔ کیا وہ مجھے سمجھ جائیں گے...... مجھے معاف کر دیں گے؟ اس نے اپنی فیملی کو تباہ کر دیا تھا۔ دوسروں کی نظر میں گرا دیا تھا۔ ان کا مان توڑ دیا تھا۔ اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ آج جو کچھ ہوا، یہ اختتام نہیں تھا...... راب اس بات سے آگاہ تھا۔

سچ سامنے آنا ہی ہے تو اسے پورا آنا چاہیے......

وہ گھر پہنچ گئے تھے۔

''آؤ۔'' میل کیپٹن نے اس کا بازو پکڑا۔

''نہیں۔ یہ اب گھر نہیں صرف ایک مکان ہے۔ جو چیز اہم ہے وہ اس میں بسنے والے افراد ہیں۔ اس کی فیملی کچھ نہیں سہے گی۔ انہوں نے کچھ نہیں کیا۔ جو کچھ کرنا ہے، مجھے... خود کرنا ہے۔'' اس نے دکھی آواز میں کہا۔

''ٹھیک ہے۔ تم اندر آؤ۔''

☆☆☆

نٹالی، چھوٹی بہن ایملی اور ماں کے ساتھ کچن میں تھی۔ جب سیاہ کار ڈرائیو وے میں داخل ہوئی۔

''ڈیڈ آ گئے۔'' ایملی چیخ اٹھی۔ وہ بیرونی دروازے کی جانب لپکی۔ نٹالی نے ماں کے چہرے پر ہچکچاہٹ دیکھی۔ شاید وہ خوف زدہ تھی...... کیا ہونے والا ہے؟

''سب ٹھیک ہو جائے گا۔'' نٹالی نے ہاتھ پکڑ کر ماں کو دروازے کی طرف بڑھایا۔ ''جو کچھ بھی ہے۔ ڈیڈ ٹھیک کر لیں گے۔''

شیرن نے سر ہلا کر قدم اٹھائے......

وہ راب کو میل کیپٹن کے ساتھ کار سے اترتا دیکھ رہے تھے۔ ایملی نے دوڑ لگا دی اور سیدھی باپ کی بانہوں میں سما گئی۔ ''ڈیڈ!''

راب، ایملی کو بانہوں میں لیے شیرن اور نٹالی کو دیکھ رہا تھا۔

''اوہ، نہیں......'' شیرن نے آہستہ سے قدم بڑھائے۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ راب نے اسے گلے لگایا۔ نٹالی بغور باپ کی ہر حرکت کا جائزہ لے رہی تھی۔ راب کی حرکات ہمیشہ کی طرح کی نہیں تھیں۔

''نیٹ۔'' اس نے ہمیشہ کی طرح اسے نیٹ کے نام سے پکارا۔ ''تمہیں یہاں دیکھ کر خوشی ہوئی۔''

''اوہ ڈیڈی......'' نٹالی نے بھاگ کر ایک بازو باپ کے گلے میں حمائل کر دیا اور سر اس کے شانے پر ٹکا دیا۔ نٹالی نے کبھی باپ کے چہرے پر شرمندگی کے تاثرات نہیں دیکھے تھے۔

''چیمپئن، تم کہاں ہو؟'' راب نے جسٹن کو آواز دی۔

''ہائے، ڈیڈ۔'' وہ بھی اُن کے ساتھ آن ملا۔ وہ سب ایک ساتھ اندر گئے اور لیونگ روم میں بیٹھ گئے۔ ایملی، باپ کی گود میں تھی۔ وہاں ایک پُراسرار اور بے آرام کر دینے والا سکوت تھا۔

''سب سے پہلے میں یہ کہوں گا کہ تم میں سے کسی کو خوف زدہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔'' راب نے سکوت کا پردہ چاک کیا۔ ''میرے بارے میں تم لوگ چند بری باتیں سنو گے۔ تاہم سب سے اہم بات یہ ہے کہ میں بے قصور ہوں۔ میل کیپٹن کا کہنا ہے کہ ہمارا کیس خاصا مضبوط ہے۔''

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

''بین، یقیناً ہم سمجھتے ہیں کہ تم بے قصور ہو۔ لیکن کس معاملے میں؟'' شیرن نے استفسار کیا۔

''منی لانڈرنگ، فراڈ......'' بین راب نے کافی تفصیل گوش گزار کی۔

''کیسے؟ کس کے ساتھ؟''

''وہ جو کچھ کہہ رہے ہیں، اس کے مطابق میں نے کسی کو مرچنڈائز سپلائی کی تھیں۔ جن کا انہوں نے غلط استعمال کیا۔''

''مرچنڈائز؟'' ایملی نہیں سمجھی تھی۔

''گولڈ، ہنی......'' راب نے کہا۔

''تو اس میں کیا خرابی ہے؟'' نٹالی نے کہا۔ ''یہ آپ کا کاروبار ہے۔''

''یقین کرو۔ میں نے یہی سمجھا یا تھا...... تاہم مجھ سے چند غلطیاں سرزد ہوئی تھیں۔''

شیرن، شوہر کو تک رہی تھی۔ ''تم نے گولڈ کسے سپلائی کیا تھا؟''

بین راب نے تھوک نگلا اور دونوں ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسرے میں پھنسا لیں۔ ''ڈرگ ٹریفکرز، شیرن، کولمبیئنز۔''

شیرن کا منہ کھل گیا۔ اس نے ہنسنے کی کوشش کی۔

''بین، تم مذاق کر رہے ہو۔''

''نہیں، شیرن میں قطعی لاعلم تھا۔ میں حسبِ معمول اپنا کام کر رہا تھا۔ مجھے نہیں پتا تھا کہ وہ لوگ سونے کے ساتھ کیا کر رہے ہیں اور کس طرح اسے کہاں پہنچا رہے ہیں۔'' راب نے کچھ اور وضاحت کی۔

''میں نہیں سمجھی۔'' نٹالی نے کہا۔ ''انہوں نے آپ کو گرفتار کیوں کیا؟''

راب نے مزید وضاحت کی...... منشیات کی آمدنی کا ذکر بھی آیا۔

''کیا تم بھی پارٹی تھے؟'' شیرن کی آواز لرز اٹھی۔

''یہ کیسے ممکن ہے، شیرن؟'' راب نے کہا۔

''تو پھر تم نے کس کو ان کے ساتھ متعارف کرایا تھا؟''

راب نے سر جھکا لیا۔ ''ہیرالڈ۔ وہ بھی پھنس گیا ہے۔''

''اوہ گاڈ، بین...... یہ تم دونوں نے کیا کر دیا؟'' نٹالی کو لگا جیسے اُس کے پیٹ میں گرہ پڑ گئی ہے۔

''ڈیڈ، وہ آپ سے کیا چاہتے ہیں؟''

''گواہی، ہیرالڈ کے خلاف...... اور کولمبیئنز کے خلاف۔''

''مقدمہ؟''

''ہاں۔''

''نہیں۔'' شیرن کھڑی ہو گئی۔ اس کی آنکھوں میں حیرت اور غصے کا پانی تھا۔ ''ہماری زندگیوں کا انحصار اس بات پر ہے کہ ہم ریاست کی طرف سے گواہی دیں...... وہ بھی بہترین دوستوں کے خلاف۔ تم ایسا نہیں کر سکتے، بین۔ یہ تمہارے لیے بھی اعترافِ جرم ہوگا...... ہم لڑیں گے۔ یہ ہمارا حق ہے۔''

''ہاں، لڑیں گے، شیرن...... لیکن......''

''لیکن...... کیا؟''

''لیکن یہ کہ کولمبین لارڈز، سات آٹھ برس مجھے جو ادائیگی کرتے رہے...... وہ منشیات کی آمدنی تھی۔'' راب کی آواز خلافِ توقع بلند ہو گئی۔ بلند آواز میں کچھ اور بھی تھا۔ کچھ اجنبی سا...... نٹالی نے یہ آواز اور انداز کبھی نہیں دیکھا تھا۔ آواز میں کوئی بات تھی، جو باپ کی مکمل معصومیت کے خلاف تھی۔ سب خاموشی سے دیکھ رہے تھے...... سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے۔

پھر جسٹن نے منہ کھولا۔ ''ڈیڈ، آپ جیل نہیں جا رہے؟'' جسٹن نے وہ سوال کر دیا، جو سب کے ذہنوں میں گھوم رہا تھا۔

''نہیں، چیمپئن۔'' راب نے کہا۔ ''اس فیملی کا کوئی فرد جیل نہیں جائے گا۔''

☆☆☆

لوئیس زیادہ سوالات نہیں کرتا تھا۔ وہ چار سال سے امریکا میں تھا۔ کاغذات کے مطابق وہ اپنی بہن سے ملنے آیا تھا لیکن یہ ایک جھوٹ تھا۔ امریکا میں اس کا کوئی رشتے دار نہیں تھا۔ وہ یہاں کام کی غرض سے آیا تھا۔ وہ کام خوب کرتا تھا۔ اسے خاص طور پر چن کر بھیجا گیا تھا۔ وجہ اس کے کام کرنے کی صلاحیت تھی۔

وہ مارکیڈو کے لیے کام کرتا تھا۔ ڈرٹی جابز۔ اسے اور دیگر ارا کین کو قسم اٹھانا پڑتی تھی جس کے بعد کیا؟ کیوں؟ کیسے؟ کا سوال ختم ہو جاتا تھا۔ لوئیس، کیڈیلاک میں سفر کر رہا تھا۔ ڈرائیور تھامس نام کا لڑکا تھا جو بمشکل بیس اکیس سال کا ہوگا۔ وہ اگر بے پروا نہ ہوتا تو ایک اچھا اور بے خوف ڈرائیور ہوتا۔ لوئیس اس کے ساتھ پہلے بھی کام کر چکا تھا۔ ڈرٹی جابز۔

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

لوئیس کچھ وقت کے لیے سوچوں میں گم ہوگیا۔ کزنز، برادرز...... پورے پورے خاندان۔ سب ایک ہی اوتھ سیریمنی سے گزرتے تھے۔ ''فریدرنیدا'' جس کے بعد وہ سب ایک برادری یا برادرانہ رشتے میں بندھ جاتے تھے۔ ہمیشہ کے لیے نہ ٹوٹنے والا رشتہ۔ جس کی بنیاد ناقابلِ شکست اتحاد پر مبنی تھی۔ ''فریدرنیدا'' اگر لوئیس ''کام'' کے دوران مارا جاتا تو یہ ایک عام بات سمجھی جاتی۔ وہ موت کے لیے تیار رہتے تھے۔ اب یہ مدت کم ہو یا زیادہ...... ''فریدرنیدا'' کا بندھن موت پر ٹوٹتا تھا۔ موت وفاداری کے ساتھ ہو یا غداری کے ساتھ۔ ہائی وے سے انہوں نے منتخب روٹ پکڑا اور منزل کی طرف بڑھتے گئے۔ وہ گھر وسیع رقبے پر پھیلا ہوا تھا۔ جہاں انہوں نے گاڑی روک کر روشنیاں بند کردیں۔ وہ خاموشی سے اطراف کا جائزہ لے رہے تھے

''شروع ہوجاؤ۔'' تھامس نے اسٹیئرنگ پر انگلیاں بجائیں۔ لوئیس نے قدموں میں پڑا بیگ اٹھایا۔ باس کی ہدایات مختصر اور واضح تھیں۔ لوئیس کو پروا بھی نہیں تھی۔ وہ ٹارگٹ سے نہیں ملا تھا۔ اس کا نام تک نہیں جانتا تھا۔ اسے یہ بتایا گیا تھا کہ ٹارگٹ ''فیملی'' کے لیے نقصان دہ ہے۔ لوئیس کے لیے اتنا جان لینا کافی تھا۔ لوئیس کی دوسری خوبی تھی کہ وہ زیادہ سوچتا نہیں تھا۔ وہ کار سے نکلا تو اس کے ہاتھ میں ٹیک-9 (TEC-9) آٹومیٹک مشین پسٹل تھا۔ ایک ایکسٹرا کلپ بھی اس نے ساتھ رکھا تھا۔ اس نے روشن گھر کی جانب دیکھا۔

☆☆☆

ثانی نے اس روز گھر پر رکنے کا فیصلہ کیا تھا۔ ماں ذہنی طور پر پریشان حال تھی۔ اس نے خود کو کمرے میں بند کرلیا تھا۔ ایملی اور جسٹن بھی صدمے کی کیفیت سے دوچار تھے۔ ثانی نے ان کو بہلانے کے لیے کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ ڈیڈ نے ان دونوں کو نیچے نہیں آنے دیا تھا۔ آخر ایملی آئی پاڈ اور جسٹن وڈیو گیم میں منہمک ہوگیا۔ ثانی نیچے آگئی...... ڈیڈ، الگ تھلگ اپنے مخصوص کمرے میں بیٹھے تھے۔ گود میں ایک میگزین پڑا تھا۔ دیوار پر پلازما ٹی وی پر سی این این کی خبریں چل رہی تھیں۔

ثانی دروازے میں کھڑی رہی۔ اس کی کوشش تھی کہ چہرے کے تاثرات خوشگوار رہیں...... راب بیٹی کو دیکھ کر مسکرایا۔ ''آجاؤ۔'' راب نے ٹی وی کی آواز کم کردی۔

''شاٹ لے لیا تم نے؟''

''ڈیڈ، اب میں تئیس برس کی ہوگئی ہوں۔''

''اوکے۔''

ثانی کاؤچ پر ڈیڈ کے قریب بیٹھ گئی۔ راب نے کالج کے بارے میں استفسار کیا...... ثانی بھی براہِ راست گرفتاری کے موضوع کی طرف نہیں آنا چاہ رہی تھی۔ اس نے بتایا کہ وہ کالج میں کیا کررہی ہے۔ اس کی ٹیکنیکل گفتگو راب کے سر پر سے گزرتی رہی۔ ثانی نے بھی محسوس کرلیا۔ اچانک وہ بولی۔

''ڈیڈ، ایک دن آپ مجھ پر فخر کریں گے۔''

راب نے مسکراتے ہوئے میگزین ایک طرف رکھ دیا۔ ''میں نے ہمیشہ تم پر فخر کیا ہے، نیٹ۔''

ثانی نے محسوس کیا کہ وہ موضوع بدل سکتی ہے۔ ''ڈیڈ آپ مجھے بتاؤ گے نا؟''

''وہاٹ، سوئیٹ ہارٹ؟''

ثانی ہچکچائی۔ ''آپ نے کوئی غلط کام نہیں کیا؟''

''نیٹ، میں نے بتایا تھا...... میل کیپٹن بھی......''

''میں قانون کی بات نہیں کررہی۔ میرا مطلب ہے، آپ سے ایسی کوئی غلطی ہوئی ہو جو ہمارے علم میں ہونی چاہیے۔''

''تم کیا کہہ رہی ہو؟''

''میں خود الجھن میں ہوں۔ کیا کہوں......''

راب نے سر ہلایا۔ بیٹی کی آنکھوں میں دیکھا لیکن خاموش رہا۔

''ڈیڈی، یہ میرے لیے اہم ہے...... آپ کون ہیں۔ ہمارا کاروبار...... مہنگی ترین جگہوں پر گھومنا...... ہم ہمیشہ ''فیملی'' کی بات کرتے رہے، جو تصویروں تک محدود نہیں تھی۔ یہ فیملی آپ سے جڑی ہے۔ میرے یقین کی بنیادیں ہمیشہ آپ کے اندر تھیں۔ میں کسی اور کو نہیں دیکھنا چاہتی۔ مجھے آپ کی ضرورت ہے۔ پہلے کی طرح...... ہمیشہ کی طرح۔''

راب مسکرایا۔ ''نیٹ، تمہیں کسی اور کو دیکھنے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ میں وہی ہوں۔ پہلے کے مانند۔''

''آپ نے ہم سب کو کبھی شرمندہ نہیں ہونے دیا اور آپ آئندہ بھی نہیں ہونے دیں گے۔ میں آپ پر یقین رکھتی ہوں۔''

''تم ٹھیک کرتی ہو۔'' راب نے اسے سینے سے لگا لیا۔ ثانی کی آنکھوں سے آنسو پھسل پڑے۔

''ہم آپ کے ساتھ ہیں۔ ہم سب آپ کے پیچھے کھڑے ہیں۔ ہم لڑیں گے۔'' ثانی نے کہا۔

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

''وہ پندرہ بیس سال کی بات کر رہے تھے۔ نیٹ اس وقت تک تو تمہاری شادی بھی ہو جائے گی...... تمہاری اپنی فیملی ہو گی۔ وہ فیڈرل پریزن کی بات کر رہے تھے۔'' راب نے کہا۔

''ایسا کچھ نہیں ہوگا۔ آپ نے کچھ نہیں کیا۔ آپ اور ہم فائٹ کریں گے۔''

''ہاں۔'' راب نے آہستہ سے کہا اور نٹالی کے آنسو صاف کیے۔ قدموں کی آہٹ ابھری...... شیرن دروازے میں کھڑی تھی۔ باہر کسی گاڑی کا دروازہ بند ہوا۔ کوئی ڈرائیووے میں تھا۔

''کون ہے؟'' شیرن نے رخ پھیرا۔

''شاید نیویارک ٹائمز۔'' راب نے اندازہ لگایا۔

دفعتاً گولیوں کی بوچھاڑ نے کھڑکیوں کے پرخچے اڑا دیے۔

☆☆☆

بے تحاشا گولیاں برس رہی تھیں...... راب نے خود کو نٹالی پر گرا دیا۔ ''اٹھنا مت۔'' وہ شیرن کی جانب لپکا۔ وہ جھکی ہوئی حالت میں متحرک تھی۔ شیرن پر سکتہ طاری تھا۔ راب نے اس کا لبادہ پکڑ کر کھینچا اور اسے زمین بوس کر دیا۔

''نیچے رہو، نیچے رہو۔'' وہ چیخ رہا تھا۔ فائرنگ نے سماعت مفلوج کر دی تھی۔ دہشت کا سماں تھا۔ الارم بھی شور مچا رہا تھا۔ نٹالی نے محسوس کیا کہ حملہ آور کمرے میں ہیں۔ اسے یقین ہو گیا کہ وقتِ اجل آن پہنچا ہے۔ گھر کا ہر فرد شور مچا رہا تھا۔ نٹالی کے دونوں ہاتھ کانوں پر تھے، دل حلق میں دھڑک رہا تھا۔

''اوہ، نو'' جسٹن اور ایملی اوپر تھے۔

''ایمی، جسٹن...... نیچے مت آنا۔'' راب حلق کے بل دہاڑا تھا۔ گولیاں بارش کی طرح برس رہی تھیں...... دیواریں اور فرنیچر اُدھڑ چکے تھے۔ نٹالی نے اندازہ لگایا کہ حملہ آور کھڑکی میں سے فائرنگ کر رہا تھا۔ ان کی قسمت یاوری کر رہی تھی۔ الارم کے ساتھ منسلک پاور سسٹم ازخود آف ہو گیا تھا۔ بصورت دیگر یہ ایک خوفناک اور حتمی قاتلانہ حملہ تھا۔ جس کی زد سے بچنا محال تھا۔

حملہ جس طرح شروع ہوا تھا، معاً اسی طرح تھم گیا۔ یک دم سکوت طاری ہوا تو لگا جیسے سناٹا بھی گونج رہا ہے۔ گاڑی کا انجن اسٹارٹ ہوا اور آواز دور ہوتی چلی گئی۔ کافی دیر تک تینوں فرش کے ساتھ چپکے رہے۔ خوف کا سایہ گہرا تھا۔ سکوت میں بھی دہشت بول رہی تھی۔ نٹالی کا لہو رگوں میں جم گیا تھا...... دھیرے دھیرے سے دھڑکن کا احساس ہوا۔

''وہ چلے گئے ہیں۔'' راب کی آواز آئی۔ ''تم دونوں ٹھیک ہو؟''

''شاید۔'' شیرن بڑبڑائی۔ نٹالی نے سر ہلانے پر اکتفا کیا۔ گولیاں اس کثرت سے برسائی گئی تھیں کہ وہ جگہ میدانِ جنگ کا منظر پیش کر رہی تھی۔ ایملی اور جسٹن بھی نیچے آ گئے تھے اور منہ پھاڑے صورتِ حال کا جائزہ لے رہے تھے۔ شیرن نے دونوں کو بانہوں میں لے کر چومنا شروع کر دیا۔ نٹالی بھی بہن بھائیوں سے لپٹ گئی۔ آہیں...... سسکیاں...... آنسو۔ آہستہ آہستہ خوف و ہراس نے پر سمیٹنے شروع کیے۔ اگرچہ خوب صورت گھر کا حلیہ بگڑ چکا تھا تاہم وہ خوش قسمت رہے کہ زندہ بچ گئے۔

شیرن کی آنکھیں شوہر کی آنکھوں سے ملیں۔ شیرن کی آنکھوں میں ہراس کی جگہ الزام نے لے لی تھی۔ ''بین، تم نے ہمارے ساتھ کیا کر دیا ہے؟''

☆☆☆

''حالیہ میٹنگ کا مقصد......'' یو ایس اٹارنی نارڈوزی نے کہا۔ وہ میز کی دوسری جانب بیٹھا تھا اور توجہ میل کیپٹن کی جانب تھی۔ ''تم اور تمہارے موکل کی موجودہ صورتِ حال ہے...... چارجز سنجیدہ نوعیت کے ہیں۔ تمہارے موکل اور اس کی فیملی کے بہترین مفاد کے لیے راستہ منتخب کرنا ہے۔''

کانفرنس روم میں بوتھ اور روئز میز پر راب اور میل کے آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ وہاں ایک اسٹینو گرافر موجود تھی اور فریقین کے وکیل...... راب کی فیملی گھر پر تھی، جو حفاظتی نقطہ نظر سے ایف بی آئی کے حصار میں تھی۔

کچھ دیر دونوں وکلا کے درمیان دلائل کا تبادلہ ہوتا رہا...... پھر بوتھ نے مداخلت کی۔ ''تمہارا موکل متعدد امور سے اگرچہ بے خبر بھی تھا لیکن وہ یہ تسلیم کر چکا ہے کہ ''پاز'' اور ''آرگوٹ'' کو اسی نے متعارف کرایا تھا۔''

راب کسی قدر نروس دکھائی دیا۔ میل نے جوابی دلیل میں اس امر کو راب کی بے پروائی اور حماقت قرار دیا۔ بجائے اس کے کہ وہ شریکِ جرم تھا۔

ایجنٹ نے سر کھجایا۔ ''جیسا کہ مسٹر جیمز نے وضاحت کی ہے کہ ہم مسٹر راب اور ان کی فیملی کو محفوظ راستہ دینا چاہتے ہیں...... بجائے اس کے کہ ہمیں دوسرا راستہ اپنانا پڑے۔''

''ریکو اسٹیٹس، بہت خاص پوزیشن ہے...... ملزم کو

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

اس کے بارے میں تمام حقائق کا علم ہونا چاہیے۔'' میل نے کہا۔ ''مزید یہ کہ ملزم کی رضامندی۔''

''مسٹر میل کیپٹن، شاید آپ بھول رہے ہیں کہ آپ کے کلائنٹ نے آئیون جو دراصل ایجنٹ ایسپوسیٹو تھا، کے ساتھ بھی اسی قسم کی میٹنگز کی تھیں...... جیسی ''پاز'' کے ساتھ کی تھیں......''

''تم لوگوں نے میرے موکل کو پھنسانے کے لیے جال بچھایا تھا۔ اس کی اور اس کی فیملی کی جان کو خطرے میں ڈال دیا۔ یہ بذاتِ خود خلافِ قانون ہے۔ تم نے اسے ''پاز'' کا آدمی ظاہر کیا تھا۔ راب نے وہی بات کی جو وہ پاز کے آدمی سے کرتا۔''

بوتھ نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگائی اور روئز کو اشارہ کیا۔ روئز نے ایک فولڈر میں سے کیسٹ نکالی۔ ''مسٹر میل! تمہارے موکل نے گزشتہ آٹھ برس میں کولمبیا کے چھ وزٹ کیے۔ وہاں کس کے ساتھ کیا بات ہوئی...... وہ یہاں ٹیپ میں محفوظ ہے۔ کیا میں اسے پلے کروں یا پھر ہم اصل بات کی طرف واپس آئیں؟''

''میں سننا چاہوں گا۔'' میل کیپٹن نے جواب دیا۔

راب نے ایک ہاتھ اپنے دوست وکیل کے بازو پر رکھ دیا۔

میل نے کسمسا کر دوست کی طرف دیکھا۔

راب جانتا تھا کہ ایک دن یہ ہونا تھا۔ اگرچہ وہ ہمیشہ خود کو بہلاتا رہا کہ ایسا کبھی نہیں ہوگا مگر آج وہ دن آن پہنچا تھا۔ وہ بہت عرصے سے تیاری کر رہے تھے۔ انہوں نے کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی تھی۔

راب جانتا تھا، وہ واقف تھا، آگاہ تھا۔ اسے لگا جیسے وہ اندر سے خالی ہو گیا ہے، بالکل کھوکھلا۔ ہاں وہ اس چیز کے لیے تیار نہیں تھا کہ اتنی شدید اذیت ہوگی...... جو اسے کاٹ کے رکھ دے گی۔

''کیا چاہتے ہو؟'' اس نے اجنبی آواز میں سوال کیا۔

''مسٹر راب، تم جانتے ہو۔'' بوتھ نے کہا۔ ''لوئیس کے خلاف تمہاری گواہی چاہیے۔ تمہارا دوست بھی ہماری ضرورت ہے...... پاز اور آرگوٹ کے بارے میں ہر بات جو تم بتا سکتے ہو۔ مسٹر نارڈوزی کیا چاہتے ہیں، وہ ان پر منحصر ہے۔''

نارڈوزی کے حوالے کا سیدھا مطلب تھا کہ راب کو زندگی کے علاوہ ہر چیز سے ہاتھ دھونے پڑتے۔ اس کے اثاثہ جات، گھر، اکاؤنٹ، گاڑیاں...... وہ اس کے خلاف جاتا تو اسے جیل میں ڈال دیا جاتا۔

''ہاں، اگر تمہارے لیے یہ سب کچھ پریشان کن ہے۔'' روئز نے سنگ دلی کے ساتھ کہا۔ ''ہم تمہیں چھوڑ دیتے ہیں۔ گھومو پھرو، کاروبار کرو۔ لیکن یہ دھیان میں رکھنا کہ رات جو کچھ ہوا، اس کے بعد تم کتنے دن زندہ رہ سکو گے؟''

راب نے کرسی کھسکائی۔ ''میں نے صرف گولڈ خریدا۔ کوئی چوری نہیں کی۔ کسی کو قتل نہیں کیا۔ میں نے صرف دو کاروباری افراد کو آپس میں ملایا۔ ہزاروں لوگ یہ کرتے ہیں۔''

''دیکھو۔'' میل نے بولنا شروع کیا۔ تاہم اس کی آواز میں پہلے جیسی مضبوطی نہیں تھی۔ ''میرا موکل ایک کاروباری ساکھ رکھتا ہے۔ اس نے کوئی جرم نہیں کیا...... چھوٹی موٹی باتیں، جیسے زائد کمیشن کا معاملہ ہے، ان پر بات اتنی آگے نہیں جا سکتی۔ تمہیں جو معلومات درکار ہیں، وہ ان سے لاعلم ہے...... پاز اور آرگوٹ نے جو کچھ کیا، وہ میرے موکل کی بے خبری میں کیا۔''

''ٹھیک ہے۔ تمہارے بجائے ہم تمہارے دوست ہیرالڈ سے معلوم کر لیتے ہیں۔'' ایجنٹ بوتھ نے منہ بنایا۔ ''تم اپنے حق میں بہتری کے خواہاں نہیں ہو تو ہم کیا کر سکتے ہیں۔''

راب اسے گھورتا رہ گیا۔ کہنے کو کچھ نہیں بچا تھا۔ سب کچھ منہدم ہو گیا تھا۔ ملبا اس پر آن گرا تھا۔

''مسٹر بوتھ، تم نے میرا سب کچھ تباہ کر دیا۔ میری زندگی، میری فیملی...... سب کچھ......''

''ایف بی آئی ایجنٹ نے سینے پر ہاتھ باندھے اور کہا۔ ''میں قدرے بے تکلفی سے کہوں گا کہ کل رات جو کچھ ہوا، اس کے بعد تمہاری ترجیحات تبدیل ہو جانی چاہئیں۔ ابھی سب کچھ ختم نہیں ہوا۔''

☆☆☆

''دراصل ہم تمہارے تحفظ کی بات کر رہے ہیں۔'' روئز نے کہا۔

''میرا تحفظ......؟'' راب کے ذہن میں رات کا حملہ اور گولیوں کی تڑتڑاہٹ گونجنے لگی۔

''ہاں، اور تمہاری فیملی کا تحفظ۔''

''یہی وقت ہے کہ ہم چند حقائق واضح کر دیں۔'' دوسرا ایجنٹ بولا۔ ''اس وقت ایک خونی جنگ جاری ہے

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

مسٹر راب، یہ قبضے کی، کنٹرول کی جنگ ہے۔ کولمبین ڈرگ کارٹیل کے دو دھڑے آپس میں ٹکرا گئے ہیں۔ ایک دھڑا یہاں ہے اور دوسرا سارا امریکا میں۔ تم نے آسکر مارکیڈو کا نام سنا ہے۔‘‘

’’ہاں، کس نے نہیں سنا۔‘‘ راب نے جواب دیا۔

روبز نے ایک فوٹو آگے بڑھایا۔ راب نے تصویر دیکھی۔ تصویر آسکر مارکیڈو کی تھی۔

فوٹو دیکھ کر مقتول ججز اور خاندانوں کا تصور ذہن میں ابھرتا تھا۔

’’خیال ہے کہ مارکیڈو امریکا یا میکسیکو میں روپوش ہے۔ کوئی نہیں جانتا۔ جن کے ساتھ تم کاروبار کر رہے تھے، وہ آرگنائزیشن کا مالی بازو ہے۔ یہ بے رحم قاتل ہیں۔ یہ جن کے ہوتے ہیں، ان کی موت تک حفاظت کرتے ہیں۔ جن کے خلاف ہوتے ہیں۔ موت تک ان کا پیچھا نہیں چھوڑتے۔ خواہ ان کو اپنی جان گنوانا پڑے۔ گزشتہ چند برسوں میں آرگنائزیشن کے کچھ اہم مہرے دغا دے گئے۔ تنظیم متاثر ہوئی۔ ’’فیملی‘‘ کا مثالی اتحاد دم توڑ گیا۔ دو دھڑے بنے اور تصادم کا آغاز ہو گیا۔ مسٹر راب، یہ عام جرائم پیشہ افراد نہیں ہیں۔ نہ ہی ان کے جرائم کا کوئی انت ہے۔ یہ تمہیں بہت جلد مچھر کی طرح مسل کے رکھ دیں گے۔ یہ ’’فریدرنیدا‘‘ ہے۔ یہ اصطلاح ’’مارکیڈو برادرہڈ‘‘ کو عیاں کرتی ہے۔ گزشتہ ماہ بینسن ہرسٹ میں پورے خاندان کا صفایا کر دیا گیا تھا۔ وہ کام ’’فریدرنیدا‘‘ کا تھا۔ وہاں ایک چھ ماہ کا بچہ بے بی چیئر میں تھا۔ جس کے سر میں گولی ماری گئی تھی۔ کیا تم اور تمہارا خاندان اس کے لیے تیار ہے؟ کیا تم ساری عمر بھاگتے رہو گے؟ کیا کبھی چین کی نیند سو سکو گے؟ اگر کورٹ میں لڑنا ہے، بے شک لڑو...... تمہاری لڑائی شروع ہونے سے پہلے ختم ہو جائے گی۔‘‘

راب کو متلی کا احساس ہوا۔ وہ اپنے ہاتھوں کی لرزش چھپانے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ بلند پہاڑ سے گہرائی میں گر رہا تھا۔

’’میں تمہارے مطلوبہ افراد کے خلاف گواہی دوں گا، تب بھی مارا جاؤں گا، خاندان سمیت؟‘‘

’’نہیں، تم خود کو اور بیوی بچوں کو بچا سکتے ہو۔‘‘ میل کیپٹن نے ڈھیلی آواز میں کہا۔

بوتھ نے اثبات میں سر ہلا کر تائید کی۔ راب نے آنکھیں بند کر لیں۔

’’میں تمہیں وکٹر اور لوئیس دوں گا۔‘‘ اس نے آنکھیں کھولے بغیر کہا۔ دونوں ایجنٹوں اور یو ایس اٹارنی کے درمیان نظروں کا تبادلہ ہوا۔ تینوں مطمئن دکھائی دے رہے تھے۔ ’’اور مارکیڈو سے میرا کوئی تعلق نہیں۔‘‘

’’لیکن میری فیملی کے تحفظ کا کیا ہو گا؟‘‘ راب نے جملہ مکمل کیا۔

نارڈوزی نے جواب دیا۔ ’’بدلے میں تمہیں حفاظتی تحویل دی جائے گی۔ تم اور تمہاری فیملی ایک محفوظ مقام پر منتقل ہو جائیں گے۔ تم اپنے اثاثہ جات کی کچھ پرسنٹیج رکھ سکو گے۔ لیکن تمہارا رہن سہن پہلے جیسا تو نہیں ہو گا۔ تاہم اتنا برا بھی نہیں ہو گا۔ دس ماہ میں ٹرائل ختم ہو جائے گا۔ تب تک تم لوگ ایک جگہ رہو گے۔ اس کے بعد تم اپنی فیملی کے ساتھ غائب ہو جاؤ گے۔‘‘

’’غائب۔‘‘ راب چونک اٹھا۔ ’’تمہارا مطلب ہے کہ وٹنس پروٹیکشن پروگرام؟ وہ تو مجرموں اور گینگسٹرز کے لیے ہوتا ہے......‘‘

’’نہیں...... اس پروگرام میں ہر قسم کے افراد ہوتے ہیں۔‘‘ بوتھ نے تصحیح کی۔ ہاں ان میں ایک چیز مشترک ہوتی ہے۔ انتقامی کارروائی کا خوف۔ اگر تم نے رولز کی پابندی کی تو کوئی تمہیں یا تمہاری فیملی کو چھو نہیں سکے گا۔ حتیٰ کہ تم ملک میں اپنی پسند کا علاقہ بھی منتخب کر سکتے ہو۔‘‘

راب سوچ رہا تھا کہ وہ بیوی بچوں کو کیسے قائل کرے گا؟

’’یہی تمہارا بہترین چانس ہے۔ یہ گڑھا تم نے خود کھودا تھا۔ جب پہلی مرتبہ تم نے ان خونخوار لوگوں کے ساتھ ڈیل کی تھی۔‘‘ روبز نے کہا۔

’’کب؟‘‘ راب نے کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ اس نے پھیکے چہرے کے ساتھ شکست تسلیم کر لی تھی۔

’’ابھی، اسی وقت۔‘‘ نارڈوزی نے کاغذات نکالے۔ راب نے شیٹ کی طرف دیکھا۔ ’’یو ایس ڈپارٹمنٹ آف جسٹس فارم K - 5، کوآپریٹو وٹنس ایگریمنٹ۔‘‘

نارڈوزی نے قلم نکالا۔ ’’دستخط ہوتے ہی یہ قابلِ نفاذ ہو گا۔‘‘

☆☆☆

سب افراد گھر میں تھے۔ ایملی اور جسٹن اسکول نہیں گئے تھے۔ نٹالی اور شیرن کچن میں تھے۔ گہرے نیلے رنگ کی سیڈان کے ساتھ سیاہ رنگ کی جیپ آگے پیچھے ڈرائیوے میں داخل ہوئیں۔ پولیس اور ایف بی آئی نے

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

گھر کو گھیرا ہوا تھا۔ چھت پر بھی ایجنٹ موجود تھے۔ سیڈان میں سے ایک مرد اور عورت برآمد ہوئے۔ بعدازاں راب نے قدم باہر رکھا۔ راب گھر کے اندر پہنچا تو عورت اور مرد باہر چلے گئے۔ چند منٹ بعد فیملی کے تمام افراد ڈائننگ روم کی ٹیبل کے گرد بیٹھے۔ سب خاموش تھے۔ گھر میں ایسا تناؤ ثنالی نے پہلے کبھی نہیں محسوس کیا تھا۔

بنجامن راب نے ہمت کر کے کہانی کا آغاز کیا۔ اس دوران کئی مشکل موڑ آئے۔ سوالات، اعتراضات، احتجاج، آنسو، بیوی، بچوں کے چہرے دھواں دھواں تھے۔ جوں جوں کہانی آگے بڑھ رہی تھی حالات کی سنگینی کا احساس سوا ہوتا جا رہا تھا۔ اچانک راب نے کرسی چھوڑ دی۔

''شیرن تم دیکھ نہیں رہی ہو۔'' وہ کھڑکی کے پاس چلا گیا۔ ''یہ اسٹاک ٹریڈ نہیں ہے۔ یہ کولمبینز ہیں۔ بہت بُرے لوگ...... سفاک قاتل۔ وہ مجھے کورٹ تک بھی نہیں جانے دیں گے۔'' راب نے پردہ ہٹایا۔ ڈرائیو وے میں دو ایجنٹ جیپ کے ساتھ کھڑے تھے۔ راب نے پردہ برابر کر دیا۔ ''شیرن، یہ فیڈرل ایجنٹ ہیں جو مجھے یہاں تک لائے ہیں۔ یہ لوگ ہماری حفاظت کے لیے ہیں۔'' راب کی آنکھوں میں پانی اتر آیا۔ آواز بھرا گئی۔ ''کیونکہ ڈرگ ڈیلرز میری جان کے دشمن ہیں..... انہیں میری زندگی چاہیے۔''

کمرے میں گہری۔ خاموشی چھا گئی۔ شیرن کرسی میں پیچھے کی جانب گر کے خلا میں گھورنے لگی۔ ثنالی اپنے باپ کو تک رہی تھی۔ اچانک ہی وہ ایک مختلف آدمی کے روپ میں ڈھل گیا تھا۔

''ہم سب کو جانا پڑے گا...... مجرموں کے مانند؟''
شیرن باقاعدہ رو رہی تھی۔

''میں کہیں نہیں جاؤں گی۔'' ایملی سیڑھیوں کی طرف بھاگی۔

''میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔'' جسٹن نے کہا۔ ''وہ ہمارے گھر کی حفاظت نہیں کر سکتے؟''

''اب یہ گھر ہمارا نہیں ہے۔'' راب نے نظریں چرائیں۔

یہ ایک اور دھماکا تھا۔ شیرن کا منہ کھل گیا۔

''ٹرائل تک میں جیل میں رہوں گا۔ اس دوران تم لوگ محفوظ رہو گے۔ ٹرائل کے بعد میں تمہارے پاس آ جاؤں گا۔''

شیرن کانپنے لگی۔ ''کہاں آ جاؤ گے؟''

''شیرن، نہیں معلوم، مجھے نہیں پتا۔''

☆☆☆

ثنالی پہلی منزل پر دونوں بہن بھائی کو بہلا پھسلا رہی تھی۔ انہیں تسلی تشفی دے رہی تھی۔ بدقت تمام اس نے دونوں کو سلایا اور نیچے آ گئی۔ وہ سیدھی اپنی خواب گاہ میں گئی اور سیل فون نکالا۔

''گریگ؟''

گریگ سے مڈبھیڑ بیتھ شالوم میں ہوئی تھی۔ اس وقت ثنالی فیملی کے ساتھ گھومنے نکلی تھی۔ گریگ کی فیملی یہاں نہیں تھی۔ وہ اس وقت کولمبیا میں میڈیکل اسکول کے آخری سال میں تھا۔ ایک سال سے دونوں لوئر ایسٹ سائڈ کے اپارٹمنٹ میں ساتھ ہی رہائش پذیر تھے۔

''ثنالی، گاڈ! کہاں ہو؟ پیغام چھوڑ کر تم نے پریشان کر دیا تھا...... سب ٹھیک ہے؟''

''نہیں۔'' ثنالی نے سیدھا جواب دیا۔ اس نے آنسو روکے ہوئے تھے۔ ''گریگ، کچھ بھی ٹھیک نہیں ہے۔''

''تمہارے ڈیڈی؟ کیا ہوا؟ کیا میں کچھ کر سکتا ہوں؟''

''نہیں، یہ میڈیکل سے متعلق نہیں ہے۔ میں جلد تم کو بتا دوں گی۔ وعدہ، میں کچھ اور جاننا چاہتی ہوں۔''

''کیا؟'' اس کی آواز میں واضح پریشانی جھلک رہی تھی۔

''گریگ...... تم مجھ سے پیار کرتے ہو؟''

دوسری جانب خاموشی تھی۔ ثنالی آگاہ تھی کہ یہ حیران کن سوال تھا۔ ''مجھے علم ہے کہ ہم اکثر یہ باتیں کرتے ہیں لیکن اس وقت اس کی اہمیت اور ہے، میں سننا چاہتی ہوں، گریگ......''

''بلاشبہ، میں پیار کرتا ہوں اور تم یہ بات جانتی ہو۔''

''ہاں، میں جانتی ہوں۔'' ثنالی نے کہا۔ ''میرا مطلب تھا...... کیا مطلب تھا۔ گریگ میں تم پر بھروسا کرتی ہوں۔ کیا نہیں کرتی؟ میرا مطلب ہر معاملے میں؟ گریگ......؟''

''ثنالی، کیا تم ٹھیک ہو؟''

''ہاں، ٹھیک ہوں۔ میں سننا چاہتی ہوں۔ شاید یہ عجیب سوال ہے۔''

''ہم دونوں کو ایک دوسرے پر بھروسا ہے۔ تم نے مجھے پریشان کر دیا ہے۔ کیا بات ہے؟ جو بھی ہے، مجھے بتا دو، شاید میں مدد کر سکوں۔''

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

''نہیں، تم نہیں کر سکتے۔ شکریہ۔ گریگ، میں سننا چاہتی تھی۔ اب سب ٹھیک ہے۔''

نٹالی اپنا ذہن بنا چکی تھی۔

''گریگ، آئی لَو یو۔''

☆☆☆

ستمبر کے اواخر کی ٹھنڈی ہوا کے احساس سے عاری وہ لان کے کنارے منڈیر پر بیٹھی تھی۔ بوربن کا گلاس قریب رکھا تھا۔ وہ اپنے باپ کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ اسے کوئی شک نہیں تھا کہ ڈیڈ کے اندر کوئی چیز بدل گئی ہے۔۔۔۔۔۔ نٹالی نے ڈیڈ کی آمد کو بھی محسوس نہیں کیا۔ نہ رخ بدلا۔

راب، بیٹی کے قریب بیٹھ گیا۔

''ڈیڈ آپ کون ہو؟'' نٹالی نے خود سے سوال کیا۔

''نیٹ۔۔۔۔۔۔ اندر چلو۔''

''نہیں۔ ڈیڈی، یک دم۔۔۔۔۔۔ اچانک۔۔۔۔۔۔ میں نہیں جانتی۔ میں کوشش کر رہی ہوں کہ جان جاؤں کہ آپ کون ہو۔ آپ کی ذات کا کون سا حصہ۔۔۔۔۔۔ سوری۔۔۔۔۔۔ کون سا حصہ جھوٹ ہے؟ جس چیز نے ہمیں فیملی بنایا تھا۔ مضبوط بنایا تھا۔ آپ نے ہی اسے۔۔۔۔۔۔ کیسے؟ ڈیڈی آپ کون ہو؟''

''نیٹ، تم اپنے ڈیڈی کو بھول گئیں؟''

''نہیں۔'' اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''میرے ڈیڈی ایمان دار تھے۔ مضبوط تھے۔ انہوں نے ہمیں بھی یہی سکھایا تھا۔ ڈیڈی، آپ جانتے ہو سچ کیا ہے۔ ہر بات آپ جانتے ہو۔ جھوٹ بھی آپ جانتے ہو۔''

راب نے آہستہ سے سر ہلایا۔ ''نیٹ، سب سے بڑا سچ یہ ہے کہ میں تم سے بہت محبت کرتا ہوں۔''

''ڈیڈی، مجھے نٹالی کہو۔ آئندہ اسی نام سے پکارنا۔ وہ وقت ختم ہو گیا۔ آپ نے ختم کر دیا۔ اطراف میں دیکھیں، سب کس حال میں ہیں۔ میں جانتی ہوں، آپ کو درد ہوگا۔ کاش میں آپ کے ساتھ کھڑی ہو سکتی۔ میں خود نہیں جانتی کہ آئندہ میں آپ کو کس طرح دیکھ سکوں گی۔۔۔۔۔۔ جیسے پہلے دیکھتی تھی۔''

''اس وقت ہمیں ایک دوسرے کی ضرورت ہے۔''

راب نے نرمی سے کہا۔

''میں اس پروگرام میں شامل نہیں ہو سکتی، میں نہیں جاؤں گی۔''

راب نے بیٹی کو دیکھا۔ راب کی آنکھوں میں خوف تھا۔

''تمہیں ساتھ آنا ہوگا۔ تمہاری زندگی خطرے میں ہے۔ میں جانتا ہوں کہ تم ناراض ہو، لیکن۔۔۔۔۔۔''

''نہیں۔'' وہ بولی۔ ''میں نہیں جاؤں گی۔ میری عمر بیس سال سے زیادہ ہے۔ مجھے اپنے فیصلے خود کرنے چاہئیں۔ میں اپنے کام اور گریگ کو نہیں چھوڑ سکتی۔۔۔۔۔۔''

راب سکتہ زدہ سا نٹالی کو تک رہا تھا۔ ''تم جانتی ہو کہ اگر تم نہیں گئیں تو بہت طویل عرصے تک ہم میں سے کسی کو دیکھ نہ پاؤ گی۔''

''میں جانتی ہوں اور یہ اتنا ہی دل شکن ہے، جتنا اس وقت آپ کو دیکھنا۔'' وہ بھیگی آنکھوں کے ساتھ کھڑی ہو گئی۔

راب نے خاموشی سے ہاتھ آگے کیا۔ نٹالی نے ہاتھ تھام لیا۔ راب کا ہاتھ سرد ہو رہا تھا۔ وہ اندر چلی گئی۔ راب دیکھتا رہا۔ ایک پل تھا گزر گیا۔۔۔۔۔۔ اب قیمتِ غم دور سے تاب نہیں۔

☆☆☆

دوسرے دن دوپہر یو ایس مارشل سروس کے دو عہدیدار وہاں پہنچے۔ ایک دراز اور بھاری بھرکم تھا۔ سر کے بالوں میں سیاہ و سفید کا امتزاج تھا۔ اس کا نام فل کیو یٹ تھا۔ دوسری ایک پُرکشش عورت تھی۔ عمر چالیس کے لگ بھگ تھی۔ اس کا نام مارگریٹ سیمور تھا۔ اسے سب نے ہی اچھی نظر سے دیکھا۔ اس کی خواہش پر سب اس کو میگی کہہ رہے تھے۔ دونوں وٹنس پروٹیکشن پروگرام کی نمائندگی کر رہے تھے۔

ابتدا میں نٹالی سمجھی کہ وہ پروگرام کے متعلق معلومات فراہم کریں گے۔ لیکن معلوم ہوا کہ روانگی کی تیاری ہے۔ ہر ایک کو ایک عدد سوٹ کیس پیک کرنے کی اجازت تھی۔ باقی اشیا چند ہفتے میں پہنچنی تھیں۔ مثلاً فرنیچر اور ذاتی اشیا۔۔۔۔۔۔ شیرن کی حالت خراب تھی۔ وہ کچھ بھی چھوڑنے کے لیے آمادہ نہ تھی۔ وہ سب اس کی زندگی تھی۔۔۔۔۔۔ زندگی کو کیسے پیچھے چھوڑا جا سکتا تھا۔ ہر شے سے یادیں وابستہ تھیں۔ فوٹو البم تک چھوڑنا بھاری لگ رہا تھا۔ ہر جانب سے یادوں کے دھڑکنے کی صدا آ رہی تھی۔ وہ آشفتگی دل سے نڈھال تھی۔ نٹالی نے ماں کو سنبھالا اور مدد کی۔

سب لیونگ روم میں بیٹھ گئے۔ فل کیو یٹ نے اختصار کے ساتھ لائحہ عمل سمجھایا۔ جلد اس بات کا انکشاف ہو گیا کہ نٹالی حفاظتی تحویل میں نہیں جا رہی۔ عمر کے باعث اسے مجبور نہیں کیا جا سکتا تھا۔ ایگریمنٹ پر راب کے دستخط کفیل یا اٹھارہ سال سے کم عمر کے فیملی ممبرز کے لیے تھے۔ میگی نے نٹالی کو سمجھانے کی کوشش کی۔ تاہم اس نے جلد ہی

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

محسوس کرلیا کہ یہ لاحاصل ہے۔ طوعاً و کرہاً اس نے ثنالی کو ضروری ہدایات دیں۔ خود کو نمایاں نہ کرے، رہائش گاہ بدلتی رہے، فون بل اور بجلی کے بل اپنے نام پر نہ رکھے...... وغیرہ وغیرہ۔

ثنالی نے اثبات میں سر ہلایا۔

''کیا ہماری بنائی ہوئی ہر چیز پیچھے رہ جائے گی؟ کیا ہر چیز؟''

''نہیں۔'' ثنالی نے ماں کا ہاتھ پکڑ کر دل کے مقام پر رکھ لیا۔ ''ہر چیز یہاں ہے۔ ہر نام کے ساتھ راب ہے۔ اسے کوئی ہم سے نہیں چھین سکتا۔''

فل کیو بٹی نے نرمی سے راب کا بازو تھاما۔ شیرن آبدیدہ حالت میں ثنالی سے گلے مل رہی تھی۔ شیرن نے ثنالی کے آنسو پونچھے۔ ''مجھے نہیں معلوم، مجھے کیا کہنا چاہیے۔'' شیرن نے بلیزر میں سے خاکی رنگ کا چھوٹا سا باکس نکال کر ثنالی کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ ثنالی نے اسے کھولا' اندر سونے کی چین والا لاکٹ تھا۔ لاکٹ پر نصف سورج کا عکس تھا۔ سورج بھی سونے کا تھا۔ کناروں پر ہیرے جڑے تھے۔ سورج کی گولائی ٹھیک تھی۔ لیکن اس کی متوازی لکیر سیدھی نہیں تھی۔ یوں معلوم ہو رہا تھا، جیسے اسے توڑا گیا ہے اس وجہ سے سورج بھی نصف رہ گیا تھا۔

''ثنالی اس کے اندر راز پنہاں ہیں۔'' شیرن مسکرائی۔ ''یہ ایک کہانی ہے۔ ایک دن میں تمہیں سناؤں گی۔ تم ایک دن دوسرا ٹکڑا لے کر سورج کو مکمل کر دینا۔''

ثنالی نے آنسوؤں سے لڑتے ہوئے سر ہلایا۔

اچانک وہ مڑی اور ڈیڈی کی طرف دیکھا۔

''میں نے کچھ رقم تمہارے اکاؤنٹ میں منتقل کروا دی ہے۔ میل کیپٹن ہینڈل کرلے گا۔'' راب نے کہا۔

ثنالی خاموش تھی۔

''میں جانتا ہوں، تم ٹھیک رہو گی۔'' راب نے اُسے بانہوں میں سمیٹ لیا۔ ثنالی نے الگ ہونے کی کوشش نہیں کی۔ وہ چاہتی بھی نہیں تھی۔

''تم اب بھی میری بیٹی ہو...... یہ حقیقت تبدیل نہیں ہوسکتی...... خواہ تمہارے احساسات کچھ بھی ہوں۔''

''یس، ڈیڈی۔'' ثنالی کی آنکھیں پھر بھیگ گئیں۔

الوداعی کلمات کا تبادلہ ہوا اور جدائی کا مرحلہ آن پہنچا۔ ثنالی کی ہمت جواب دینے لگی۔ درونِ ذات ایک طوفان برپا تھا۔ اندرونی کشمکش نے اسے توڑ پھوڑ دیا۔ تیرگیٔ غم پر مسکراؤں یا غم کو زیست کا عنوان بنالوں...... بے ربطی حالات کا حل کیا ہوگا۔

مارشل کی گاڑی نے رینگنا شروع کیا۔ ثنالی دوڑ پڑی اور کھڑکی کے شیشے پر ہاتھ رکھ دیا۔ ''آئی لو یو۔''

آئی لو یو۔'' شیرن کے چہرے پر حزنیہ تاثرات جم سے گئے۔ ثنالی، گاڑی کو جاتے دیکھتی رہی۔ اس کا وجود برف کے مجسمے میں ڈھل گیا۔ آنچ تھی تو صرف بہتے ہوئے آنسوؤں میں، وہ جانتی تھی کہ اپنے پیاروں کو وہ آخری بار دیکھ رہی ہے۔ ''نہیں ہم ایک دوسرے سے دوبارہ ملیں گے، جلدی ملیں گے۔'' اس نے سرگوشی کی۔ ہر کوئی گاڑی میں سر گھما کر اسے دیکھ رہا تھا۔ دفعتاً اس کا دل زخمی پرندے کے مانند پھڑ پھڑایا۔

''ڈیڈی!'' وہ چلا اٹھی۔

اس کا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ وہ ڈیڈی کو ایسے نہیں جانے دے گی۔ ان سے جو کچھ ہوا...... انہوں نے جو کچھ کیا، انہیں معلوم ہونا چاہیے کہ میں ان سے اب بھی محبت کرتی ہوں...... وہ بھاگنے لگی۔

''ڈیڈی، رک جاؤ...... پلیز ڈیڈی......''

گاڑی رک گئی۔ رنگ دار شیشہ نیچے پھسل گیا۔ باپ بیٹی نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ راب کے چہرے پر افسردگی تھی، کرب تھا...... دونوں کچھ کہنا چاہتے تھے، دونوں لب بستہ تھے۔ ممکن ہے غم ہی زندگی بن جائے...... ممکن ہے قلب چارہ جو بھی نہ رہے...... بیس سال کم نہیں ہوتے۔ قربان اس اک لمحہ پر سارا جیون...... ثنالی کے ہونٹ لرز کے رہ گئے۔ گاڑی روانہ ہوگئی۔

ڈیڈی سمجھ جائیں گے۔ وہ اسے دیکھ رہے تھے۔ ثنالی نے دو انگلیاں اٹھا کر ہاتھ بلند کیا۔ ڈیڈی اکثر یہی اشارہ کرتے تھے۔

☆☆☆

بیچ شور روڈ پر گریگ نے کار گھر کے قریب سنگی ستونوں کے قریب روکی۔ یو ایس مارشل آفس کی گاڑی نے ڈرائیووے کی راہ مسدود کر دی۔ ثنالی کی فیملی کو گئے ہوئے تین دن گزر چکے تھے۔

مارشل آفس کی کار سے ایک ایجنٹ نے اتر کر دونوں کی شناخت کی۔ ثنالی کو دیکھ کر اس نے دوستانہ انداز میں سر کو جنبش دی۔ ثنالی، گریگ کے ساتھ آگے بڑھ گئی۔ بند گھر سائیں سائیں کر رہا تھا۔ ''یہ ہمارا گھر ہے، گریگ...... کتنا پُراسرار لگ رہا ہے۔''

''میں سمجھ رہا ہوں۔'' گریگ نے اس کا ہاتھ دبایا۔

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

ثنالی کو قطعی اندازہ نہیں تھا کہ اس کے گھر والے کہاں ہیں۔ اتنا یقین تھا کہ سب محفوظ ہیں۔ میگی نے بتایا تھا کہ وہ ثنالی کے بارے میں باتیں کرتے اور سوچتے ہیں۔ پانچ چھ گاڑیوں والا گیراج بھی سنسان پڑا تھا۔ گھر کے بیرونی دروازے پر ایک نوٹس چسپاں تھا۔ جو گھر کی بندش کا اعلان کررہا تھا...... ثنالی اندر داخل ہوگئی۔ سامان بکسوں میں پیک تھا۔ بکسوں کی منزل نامعلوم تھی اور سامان کے مالکان بھی نامعلوم مقام پر تھے۔ وہ گریگ کے ہمراہ دوسری منزل پر آگئی۔ وہ یہاں وہاں پھر رہی تھی۔ جذبات پھر بے قابو ہونے لگے، افسردگی چھانے لگی۔

''اب میری کوئی فیملی نہیں ہے۔''

''تم اکیلی نہیں ہو۔'' گریگ نے اسے شانوں سے پکڑا۔ ''میں ہوں تمہارے ساتھ۔ ہم شادی کرلیں گے۔''

ثنالی نے اسے دیکھا۔

''میں سنجیدہ ہوں۔ چاہے ہم صرف دو ہی صحیح، کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ہم شادی کرلیں گے۔''

''میں تمہاری فیملی ہوں۔'' ثنالی نے سوچا۔

☆☆☆

چودہ ماہ بعد......

''ہے، فرگو...... کم آن، بوائے۔'' وہ خزاں کی صبح تھی۔ فرگو کے ساتھ ثنالی، ٹام کنس اسکوئر پارک میں جاگنگ کررہی تھی۔ فرگو، پالتو کتے لیبراڈوڈل کا نام تھا۔ گزشتہ برس کی خوفناک یادیں دھندلانے لگی تھیں۔ تاہم انہیں بھلانا ممکن نہیں تھا۔ ثنالی اب ثنالی ہیرا تھی۔ گریگ کے ساتھ شادی کو آٹھ ماہ بیت گئے تھے۔ دونوں ایک عمارت کی ساتویں منزل پر مقیم تھے۔ گریگ نے میڈیکل پریکٹس شروع کردی تھی۔ ثنالی کا لیب میں آخری سال تھا۔ ثنالی نے جاگنگ اور پیراکی کا سلسلہ قائم رکھا تھا۔ وہ علی الصباح بدھ اور ہفتے کے دن کشتی رانی کرتی تھی۔

پروٹیکشن پروگرام کی نیوٹرل سائٹ کی مدد سے وہ خطوط، ای میلز اور فون کالز کے ذریعے فیملی سے رابطے میں تھی۔ ایملی اور جسٹن نئی جگہ پر نئی شناخت کے ساتھ نئے ماحول میں مدغم ہوگئے تھے۔ مسئلہ شیرن کا تھا...... ٹرائل کے خاتمے کے بعد سے ڈیڈی کے اور مام کے درمیان تناؤ برقرار تھا۔ ٹرائل سے چند ہفتے قبل آرگوٹ کی بک کیپر، جو سرکاری مرکزی گواہ تھی، کو دن دہاڑے قتل کردیا گیا تھا۔ پاز کا کوکمپین اہم کردار پیٹر ملک سے فرار ہونے میں کامیاب ہوگیا تھا۔ دوسرا ملزم لوئیس، ''اہم ترین گواہ'' کی عدم موجودگی کی وجہ سے بچ گیا۔ تمام تگ و دو کے بعد صرف راب کا دوست ہیراللہ ہی قابو میں آیا جسے بیس سال کی سزا ہوئی۔

ثنالی نے گھڑی دیکھی۔ آٹھ بج گئے تھے۔ ساڑھے نو بجے اسے لیب میں ہونا چاہیے تھا۔ ''چلو......'' اس نے فرگو کو اشارہ کیا۔

''اچھا کتا ہے۔'' ایک آواز آئی۔ آواز ایک جانب بینچ پر سے آئی تھی۔ ثنالی چونک اٹھی۔ اس آدمی کی چھوٹی سی داڑھی تھی۔ اس نے کارڈرائے کی جیکٹ اور گالفنگ ہیٹ پہنا ہوا تھا۔ اخبار اس کی گود میں پڑا تھا۔ ثنالی متعدد بار اسے پارک میں دیکھ چکی تھی۔

''ویسے میں جانتا نہیں ہوں کہ یہ کون سی نسل ہے؟'' اس نے مسکرا کر کتے کی جانب اشارہ کیا۔ آدمی کی داڑھی کے بالوں میں سفیدی جھلک رہی تھی۔ جس سے ثنالی نے عمر کا اندازہ لگانے کی کوشش کی۔

''یہ لیبراڈوڈل ہے۔'' ثنالی نے جواب دیا۔ ''یہ گولڈن لیب اور پوڈل کا کراس ہے۔''

''اوہ، معلوم نہیں...... بہرحال اچھا ہے۔'' وہ مسکرایا۔

ثنالی بھی مسکرائی۔

''میں نے اکثر تمہیں یہاں دیکھا ہے۔'' وہ بولا۔ ''میرا نام بریٹو ہے۔ اس کے ساتھ میری دوستی ہوگئی ہے۔'' اس نے فرگو کی گردن پر ہاتھ پھیرا۔

''میں ثنالی ہوں۔'' اس نے بے ساختہ جواب دیا۔ اسے یاد تھا کہ میگی نے کیا ہدایات دی تھیں۔ یہ ہدایت بھی شامل تھی کہ اپنا اصل نام کسی کو نہ بتانا۔ لیکن یہ آدمی ہر زاویے سے بے ضرر دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے اپنا پورا نام ظاہر نہیں کیا تھا۔

''تم شاید فوگو کو پہلے سے جانتے ہو؟''

''نہیں، تمہارے ساتھ ہی دیکھا ہے۔''

''خوشی ہوئی مل کر۔'' ثنالی نے شائستگی سے کہا۔

بریٹو نے احتراماً سر کو خم دیا۔ ثنالی جانے کا ارادہ باندھ رہی تھی کہ بریٹو کے فقرے نے اس کے بدن میں سنسنی کی لہر دوڑا دی۔

''مس ثنالی، تمہیں ذیابیطس ہے؟''

ثنالی نے فرگو کے پٹے پر ہاتھ ڈالا۔ وہ بریٹو کی آنکھوں میں دیکھ رہی تھی۔

''پلیز پریشان مت ہو۔'' وہ مسکرایا۔ ''میں نے جاگنگ کے دوران بارہا تمہیں ٹائم نوٹ کرتے اور کچھ

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

کھاتے دیکھا تھا۔ اتنی سی بات تھی۔ دراصل میری بیوی کو بھی یہ مرض تھا۔'' اس نے وضاحت کی۔

ثالی کے تنے ہوئے اعصاب ڈھیلے پڑ گئے۔ وہ اپنی بزدلی پر شرمندہ ہوگئی تھی۔

''وہ اب کیسی ہے؟'' ثالی نے اس کی جھلمل کرتی براؤن آنکھوں میں دیکھا۔

''شکریہ..... مگر وہ اب اس دنیا میں نہیں ہے۔''

''اوہ، میں معذرت خواہ ہوں۔'' ثالی نے کہا اور گھڑی دیکھی۔ ''مجھے اب چلنا چاہیے..... شاید دوبارہ ملاقات ہو۔''

''مجھے امید ہے۔'' معمر آدمی نے اپنی ٹوپی اتار دی۔

''اور فرگو تم سے بھی ملاقات ہوگی۔'' وہ مسکرایا۔

باہر نکلتے وقت ثالی نے خوامخواہ پلٹ کر دیکھا۔ وہ آدمی سر جھکائے اخبار پڑھنے میں مصروف تھا۔ اسے اپنی بزدلی پر غصہ آیا۔

☆☆☆

اس دن کے بعد ثالی کئی دن تک پارک نہیں گئی۔ شرمندگی اور غصے کا ملا جلا احساس تھا۔ واقعے کے بارے میں اس نے گریگ سے بھی ذکر نہیں کیا۔ لیکن دو روز بعد وہ اپارٹمنٹ کے بولٹ کی وجہ سے خوف زدہ ہوگئی۔ اس روز وہ لیب سے واپسی پر عجلت میں تھی۔ اس کے ایک ہاتھ میں کچن کی ضروریات کے سامان سے بھرا تھیلا تھا۔ فرگو ساتھ تھا۔ گریگ اسپتال میں تھا۔ سامان کا تھیلا سنبھالتے ہوئے دوسرے ہاتھ سے چابی لاک میں ڈال کر گھمائی۔ چابی گھمانے سے دروازہ کھلنا چاہیے تھا لیکن ایسا نہیں ہوا۔ ڈیڈ بولٹ نے دروازے کو پکڑا ہوا تھا۔ ثالی کے دماغ میں خطرے کی گھنٹی بجی۔ وہ کبھی ڈیڈ بولٹ استعمال نہیں کرتے تھے۔ عمارت میں گودام کے دروازے لگائے گئے تھے۔ ان کا اپنا میکانزم تھا۔ ڈیڈ بولٹ کھولنا دردِ سر بن جاتا تھا۔ لیز اور فون گریگ کے نام پر تھا۔ ثالی نے سامان نیچے رکھا اور بولٹ کھولنے کی کوشش کرنے لگی۔ وقت کے ساتھ وہ دروازہ کھولنے میں کامیاب ہوگئی۔

اندر قدم رکھتے ہی اس نے گریگ کو آواز دی۔ حالانکہ اس کے علم میں تھا کہ وہ وہاں نہیں ہے۔ فرگو بھی ساتھ ہی اندر گھس آیا۔ ثالی نے خوب اچھی طرح باریک بینی سے ہر چیز کا جائزہ لیا۔ اسے کوئی تبدیلی نظر نہیں آئی۔ ہر شے اپنی جگہ پر تھی۔ عجیب اسرار تھا۔ وہ سمجھنے سے قاصر تھی۔

تاہم وہ اس احساس کو ذہن سے جھٹکنے میں ناکام رہی کہ اپارٹمنٹ میں کوئی داخل ہوا تھا۔

☆☆☆

اگلے روز وہ ریسرچ یونٹ کے کیفے ٹیریا میں ٹینا کے ساتھ کافی پی رہی تھی۔ وہ دونوں اب بہترین دوست بلکہ بہنوں کی طرح محسوس کرنے لگی تھیں۔ درحقیقت ٹینا اگر ہیئر ڈائی میں کچھ زیادہ فرق کر دیتی تو دیکھنے والے انہیں جڑواں ہی سمجھتے۔

ٹینا، ثالی کو اپنے نئے پروجیکٹ کے بارے میں بتا رہی تھی۔ ثالی کا دھیان اس کی باتوں کی طرف تھا۔ معاً بلاارادہ ثالی کی توجہ کیفے ٹیریا میں دور ایک میز پر چلی گئی۔ وہ نگاہ ہٹاتے ہٹاتے رہ گئی۔ وہاں جو آدمی بیٹھا تھا، اس کے بال چھوٹے اور سخت تاروں کے مانند تھے۔ کانوں کے قریب سفیدی مائل تھے۔ مونچھیں سیاہ تھیں۔ نقوش ہسپانی باشندوں جیسے تھے۔ ثالی کو یوں لگا جیسے اس نے ہسپانی کو کہیں دیکھا ہے۔ تاہم وہ یاد نہ کرسکی۔ البتہ اسے یہ احساس ہوگیا تھا کہ وہ اسی کی جانب متوجہ تھا۔ ثالی کوشش کر رہی تھی کہ ٹینا کی باتیں غور سے سنے۔ لیکن اس کا دھیان گاہے گاہے اسی آدمی کی جانب جا رہا تھا۔ دو مرتبہ ٹینا کی نظریں چار ہوئیں۔ وہ بے چینی محسوس کر رہی تھی۔ ایک بار ثالی نے نظر اٹھائی تو وہ آدمی غائب تھا۔

''ہے، تم کہاں کھوئی ہوئی ہو؟'' ٹینا نے ثالی کے چہرے کے سامنے انگلیاں نچائیں۔

''آئی ایم سوری۔'' ثالی نے اطراف میں دیکھا اور دنگ رہ گئی۔ وہ آدمی پھر نظر آیا تھا اور سیدھا انہی کی جانب آرہا تھا۔ ''نہیں میں غلط دیکھ رہی ہوں۔'' اس نے سوچا۔ لیکن اس کا دل سوچ نہیں رہا تھا، دھڑک رہا تھا..... دھڑکن پسلیوں سے ٹکرا رہی تھی۔ آدمی کا رین کوٹ سامنے سے کھلا ہوا تھا۔ نہیں، یہاں پُرہجوم جگہ پر یہ ممکن نہیں ہے..... ثالی نے محسوس کیا کہ اس کے چہرے کی سرخی سفیدی سے بدل گئی ہے۔ وہ سر پر پہنچ گیا تھا۔ ثالی تقریباً کرسی سے اچھل پڑی۔

''تم پیکر کے لیے کام کرتی ہو؟'' اس نے سوال کیا۔

''وہاٹ؟''

''تم ثالی نہیں ہو؟'' وہ مسکرایا۔ ''میں ایک ماہ قبل تمہارے دفتر آیا تھا۔ میں تھرماجن کے لیے کام کرتا ہوں۔ تمہیں یاد ہوگا۔ میں نے تمہیں چند آلات فروخت کیے تھے۔''

''یاہ.....'' وہ مسکرائی۔ ''میں ثالی ہوں۔'' وہ

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

پُرسکون ہوگئی۔ وہ چند باتیں کر کے رخصت ہو گیا۔ اس کے جانے کے بعد ٹینا نے تشویش کا اظہار کیا۔

''کیا بات ہے۔ تم کئی روز سے اَپ سیٹ ہو...... ابھی تم اس آدمی کو دیکھ کر گھبرا گئی تھیں؟''

''میں یقین سے نہیں کہہ سکتی۔ شاید میں خوف زدہ ہو گئی ہوں۔ شاید یہ ڈیڈی سے متعلق ہے......'' پھر ثنالی نے پارک والا واقعہ ٹینا کو سنایا۔ ''کبھی لگتا ہے، میں پاگل ہو رہی ہوں۔''

''ایسا کچھ نہیں ہے۔ تم نے اپنی فیملی کھو دی ہے۔ کوئی بھی تمہاری کیفیت کو سمجھ سکتا ہے۔'' ٹینا نے جواز پیش کیا۔

''نہیں، کوئی بات ہے۔ ہمارے اپارٹمنٹ میں بھی کوئی گھسا تھا۔ میں سمجھ نہیں سکی۔ جانوروں کی حس تیز ہوتی ہے...... فرگو نے اجنبی بُو محسوس کر لی تھی۔ اس کا رویہ بدلا ہوا تھا۔'' ثنالی نے بولٹ والا واقعہ گوش گزار کیا۔

''دیکھو تم یہاں بہت وقت گزارتی ہو۔ تم زیادہ وقت گریگ کے ساتھ گزارو۔'' ٹینا نے کہا۔ ''کچھ عرصہ اپنے روزمرہ کے معمولات کو تبدیل کرو...... تم بہت بہتر محسوس کرو گی۔'' ٹینا نے مشورے دیے۔

''شاید تم ٹھیک کہہ رہی ہو، آج میں جلدی چلی جاؤں گی۔''

☆☆☆

ثنالی نے پہلے روز ہی ٹینا کے مشوروں پر عمل کیا۔ گریگ کے ساتھ جیک بلیک کی مووی بھی دیکھی اور دونوں نے کھل کر ہنسی مذاق کیا جب وہ سوئی تو بہت پُرسکون اور آسودہ تھی۔

گہری نیند میں فون کی گھنٹی بہت بری لگی تھی۔ گریگ سمجھا کہ فون اسپتال سے ہے۔ ثنالی نے چمکتے نمبر دیکھے، وہ اسپتال کے نہیں تھے۔

''ہیلو'' اس نے خمار آلود آواز میں کہا اور وقت دیکھا۔

''ثنالی، میں ٹام ہارن ہوں۔ ٹینا کا والد۔''

''ہائے۔'' ثنالی نے حیرت سے کہا۔ اس کا خمار کم ہو گیا۔

اس وقت ٹینا کے فادر کا فون۔ آواز میں پریشانی جھلک رہی تھی۔

''ثنالی، کچھ بہت برا ہو گیا ہے......''

ثنالی اٹھ کر بیٹھ گئی اور ہراساں نظروں سے گریگ کو دیکھا۔

''وہاٹ؟''

''ٹینا کو کسی نے گولی ماردی ہے۔ وہ آپریشن روم میں ہے۔ ڈاکٹرز کو زیادہ امید نہیں ہے...... ثنالی......''

☆☆☆

وہ حتیٰ الامکان تیزی سے تیس منٹ میں جیکب میڈیکل سینٹر، برونکس پہنچے تھے۔ تمام راستے گریگ نے ثنالی کا ہاتھ دبائے رکھا۔ کیب ایمرجنسی پر رکی۔ دونوں بھاگتے ہوئے چوتھی منزل پر ٹراما سینٹر کے ایمرجنسی روم میں پہنچے۔ ٹام اور ایلین ہارن باہر بینچ پر بیٹھے تھے۔ دونوں کو دیکھ کر وہ کھڑے ہو گئے۔ اُن کے چہرے اترے ہوئے تھے۔

''وہ کیسی ہے؟'' ثنالی کی آواز لڑکھڑا گئی۔

''سرجری ہو رہی ہے۔ گولی سر کے پیچھے لگی ہے۔ وہ لیب سے نکل رہی تھی۔ سڑک پر تھی۔ خون بہت زیادہ بہہ گیا ہے لیکن وہ مزاحمت کر رہی ہے۔''

''کیسے؟ کس نے کیا؟''

''بظاہر لیب سے نکلنے کے بعد اُسے گولی ماری گئی۔ مورس ایونیو پر۔ پولیس یہاں آ کے گئی ہے۔'' ٹام نے بتایا۔ ''چند افراد نے ایک آدمی کو بھاگتے دیکھا تھا۔ پولیس کا خیال ہے کہ گینگ کا معاملہ ہے۔''

ثنالی سناٹے میں رہ گئی۔ ٹینا کا گینگ سے کیا تعلق؟

''لیب سے نکل کر اس نے ہمیں کال کی تھی...... بس وہی چند منٹ اسے ملے تھے۔ وہ غلط وقت پر غلط جگہ کھڑی تھی۔''

ثنالی کے انگ انگ میں سوئیاں چبھ رہی تھیں۔ پیٹ میں شدید اینٹھن ہو رہی تھی، لیب کے باہر...... اسٹریٹ پر...... مورس ایونیو۔ آہ، وہ ٹھیک ٹھیک سمجھ رہی تھی۔ وہ گولی ثنالی کے لیے تھی۔ ثنالی کا سر چکرانے لگا۔

''وہ کب سے اندر ہے؟'' گریگ نے سوال کیا۔

''دو گھنٹے ہو گئے۔ گن کا کیلبر چھوٹا تھا۔ حملہ عقب سے ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اب تک زندہ ہے۔''

''ٹینا اسٹرانگ ہے۔ وہ اس بحران سے نکل جائے گی۔'' ثنالی نے کہا۔

''میں ابھی آتا ہوں۔'' گریگ نے کہا۔

ثنالی پشت دیوار سے لگا کے فرش پر بیٹھ گئی۔ ٹینا کی جگہ اسے اسٹریٹ پر ہونا چاہیے تھا۔ ٹینا نے اسے جلدی گھر بھیج دیا اور بعد میں خود اسی طرف سے باہر نکلی...... اوہ گاڈ۔

''سرجری جاری ہے۔ انتظار کرنا پڑے گا۔''

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

گریگ نے اطلاع دی۔ بالآخر دو بجے رات، سرجن باہر آیا۔

''وہ زندہ ہے۔ یہ اچھی خبر ہے۔'' سرجن نے بتایا۔ ''گولی دماغ میں نازک جگہ پر ہے...... سوجن بہت ہے۔ ...... زیادہ ورم کی وجہ سے ہم گولی کے ساتھ چھیڑ چھاڑ نہیں کر سکتے۔ کافی نازک معاملہ ہے۔ وہ فائٹ کر رہی ہے...... ہم بھی پوری کوشش کر رہے ہیں؟ اس کے وائٹل سائن ٹھیک ہیں۔ اس وقت ہم نے اسے مصنوعی تنفس پر رکھا ہے۔''

''کتنا انتظار کرنا ہوگا؟'' گریگ نے استفسار کیا۔

''چوبیس گھنٹے یا اڑتالیس گھنٹے......''

''نٹالی، گریگ سے لپٹ گئی۔ ٹام کی بیوی سسکیاں لے رہی تھی...... نٹالی کے دل میں نیا خوف بیٹھ گیا تھا۔ وہ دیر سے نکلتی تھی۔ وہی لیب بند کرتی تھی۔ وہ کیسے بتاتی کہ وہ گولی ٹینا کے لیے نہیں تھی۔ ٹینا کے والدین نے ٹھیک کہا تھا کہ ٹینا غلط وقت پر غلط جگہ کھڑی تھی۔

☆☆☆

ڈیڈی پہلے اس طرح کے نہیں تھے۔ ایملی کے نزدیک ڈیڈی کچھ عجیب سے ہو گئے تھے۔ ان کا رویّہ، ردِعمل...... حرکات و سکنات۔ پہلے وہ ہنس مکھ تھے، بھرپور انداز میں جینے والے۔ وہ ایملی کے اسپورٹس اور ہوم ورک میں بھی دلچسپی لیتے تھے۔ اب وہ کھوئے سے رہنے لگے تھے۔ ان کی شخصیت تقسیم ہو گئی تھی۔ اب انہیں کوئی بات بتائی جاتی تو ان کا ردِعمل پہلے جیسا نہیں ہوتا تھا۔ بعض اوقات لگتا ہے کہ انہوں نے کچھ سنا ہی نہیں۔ ایملی کو نٹالی یاد آتی تھی۔ کبھی وہ گہری سوچ میں ڈوب جاتے۔ ایک چیز باقی تھی...... وہ ایملی کے اسکواش میچز میں دلچسپی لیتے تھے۔

اس وقت بھی وہ اس کے ساتھ تھے۔ وہ کلب کا مقابلہ تھا۔ جہاں چند ماہر کھلاڑی بھی تھے۔ لیکن موسم بہار میں رینکنگ بڑھانے کے لیے اسے فائٹ کرنی تھی۔ وہ اسکول پارکنگ سے نکل کر مین روڈ پھر ہائی وے پر آ گئے۔ ایملی اپنے حریف براڈ کے بارے میں بتا رہی تھی۔ آخر میں اس نے سوال کیا۔

''ڈیڈی آپ میچ دیکھیں گے نا؟''

''کیوں نہیں ٹائیگر۔'' راب نے جواب دیا۔ انہوں نے مختلف قسم کا لباس پہنا ہوا تھا۔ جیسے کہیں جانے کا ارادہ ہو۔ حالانکہ اب انہوں نے اِدھر اُدھر آنا جانا چھوڑ دیا تھا۔

''مجھے کچھ کام ہے۔ جلد آ جاؤں گا۔''

''ڈیڈی، جلدی آیئے گا۔ دیکھیے گا میں اس براڈ کا کیا حشر کرتی ہوں۔''

''میں ضرور دیکھوں گا۔ اسے چھوڑنا مت، ٹائیگر۔''

راب گاڑی ہائی وے سے ہٹ کر بزنس پارک میں لے گیا جہاں نارتھ بے اسکواش کلب تھا۔ ایملی نے اپنا بیگ اٹھایا۔ ''اگلے مہینے سان فرانسسکو میں ریجنل مقابلے ہوں گے۔''

''اور ہم دونوں وہاں جائیں گے۔'' راب نے کہا۔

ایملی مسکرا کر بیگ سنبھالتی ہوئی اتر گئی۔

''کوئی مشورہ؟''

''اس کے بیک ہینڈ کو دبا کے رکھنا۔'' راب نے کہا۔

''اور یاد رکھنا کہ تم ایملی راب ہو...... ایملی راب۔''

☆☆☆

گیم اوپر نیچے ہوتا رہا۔ ایملی بمشکل براڈ کو ہرانے میں کامیاب ہوئی تھی۔ میچ مشکل تھا اور ایملی کی توجہ گیم پر مرکوز رہی...... اختتام پر اس کی نظر بالکونی پر گئی۔ اسے ڈیڈی کہیں نظر نہیں آئے۔

وہاٹ؟ انہوں نے میچ نہیں دیکھا۔ اسے تھوڑا سا غصہ آیا۔ پانچ بج رہے تھے۔ ایملی نے باہر نکال کر والو کو ڈھونڈا۔ گاڑی کہیں نہیں تھی۔ وہ واپس اندر جا کر انتظار کرنے لگی۔ آدھ گھنٹے بعد اس کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔

ایملی نے سیل فون نکال کر گھر کا نمبر ملایا۔

''ہم گھر پر نہیں ہیں۔'' آنسرنگ مشین نے جواب دیا۔

اس مرتبہ اضطراب نے انگڑائی لی۔ کسی کو گھر پر ہونا چاہیے تھا۔ کہاں چلے گئے سب...... چھ بج رہے تھے۔ اس نے پیغام ریکارڈ کرایا۔

''مام، میں اب تک کلب میں ہوں۔ ڈیڈی پتا نہیں کہاں ہیں۔''

☆☆☆

چوبیس گھنٹے گزر گئے تھے۔ ٹینا کی حالت جوں کی توں تھی۔ دوسرا دن بھی ایسے ہی گزر گیا۔ سرجنز گولی کے قریب نہیں پہنچ پا رہے تھے۔ زخم کے گرد سوجن غیر معمولی تھی۔ اسکین واضح تھے۔ تاہم ٹشوز ٹوٹ پھوٹ کا تعین نہیں ہو پا رہا تھا۔ سوجن کم ہونے کا انتظار کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ نٹالی کا بیشتر وقت ایلن اور ٹام کے ساتھ گزرتا تھا۔ پولیس دعویٰ کر رہی تھی کہ ایک آدمی دیکھا گیا ہے، جس نے سر پر سرخ پٹی باندھی ہوئی تھی۔ وہ سفید رنگ کی وین میں

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

سوار ہوا تھا۔ وین کا رخ موریس ایونیو کی طرف تھا۔ سرخ پٹی خون بہانے کا ''ٹریڈ مارک'' تھی۔

اس کی دوست کوما میں تھی اور پولیس گینگ کا سراغ لگا رہی تھی۔ وہ کیسے یقین کرتی؟ کیسے بتاتی؟ دوسری رات دو بجے ثالی اور گریگ اپارٹمنٹ میں تھے۔ نیند کوسوں دور تھی۔ نیند کی جانب دھیان بھی نہیں تھا۔ خیالات کا محور ٹینا تھی۔ دونوں کاؤچ پر سکتے کی حالت میں بیٹھے تھے۔

یہ دن تو آنا تھا لیکن اس طرح...... ثالی نے سر جھکا لیا۔ اس سے بہتر تھا کہ وہ ٹینا کے بجائے حسبِ معمول خود دیر سے نکلتی۔

''گریگ مجھے فل کیویٹی کو بتانا چاہیے۔ وٹنس پروٹیکشن والوں کو علم ہونا چاہیے۔'' پھر کیا ہوگا...... ثالی سمجھتی تھی کہ فوراً ہر چیز بدل جائے گی۔ انہیں بھی نئی شناخت کے ساتھ نئی زندگی کا آغاز کرنا پڑے گا۔ کسی اور علاقے میں۔ گریگ کو اپنی رہائش اور ملازمت بھی چھوڑنی پڑے گی۔

گریگ نے دماغ ٹھنڈا رکھنے کی کوشش کی۔ ''یہ ایک غیر معمولی اتفاق بھی ہوسکتا ہے۔ ممکن ہے پولیس کی لیڈ صحیح ہو۔''

''ہم دونوں جانتے ہیں کہ ایسا نہیں ہے......'' ثالی خود مری جا رہی تھی۔ اس کی بہترین دوست موت اور زندگی کی کشمکش میں مبتلا تھی۔ گریگ نے اسے بانہوں میں لے لیا۔ میگی نے انتباہ کیا تھا کہ مارکیڈو بھولتے نہیں ہیں۔ وہ انتقام لیں گے اور یہ انتقام سے آگے کی چیز ہے۔ انشورنس۔ تاکہ آئندہ کوئی ''فریدرتیدا'' کے خلاف جانے کی جرأت نہ کرے۔

ثالی اور گریگ نے ایک دو دن انتظار کا فیصلہ کیا۔

لیکن رات کسی وقت اس کی آنکھ کھل گئی۔ وہ لوگ جانتے ہیں۔ انہوں نے پولیس کو غلط راستے پر لگا دیا ہے۔ ثالی کو غلط فہمی میں ڈالنے کے لیے۔ اس دوران وہ جلد ہی اس تک پہنچ جائیں گے۔ اس مرتبہ ثالی راب ان کے سامنے ہوگی۔ ثالی نے اپنی فیملی کے تحفظ کی دعا کی اور گلے میں لٹکتا گولڈن لاکٹ باہر نکالا۔ کیا راز ہے اس میں؟ کیا وہ کبھی اس کا دوسرا حصہ حاصل کر سکے گی؟

''ماں میری آرزو ہے کہ آپ ابھی مجھے اس کا راز بتا دو۔'' اس نے دل ہی دل میں تمنا کی۔ وہ اٹھی اور دروازے کا ہیوی بولٹ لگا دیا۔

☆☆☆

''ثالی۔'' ٹام اس کے قریب آیا۔ ''گھر جاؤ، تم بہت تھک چکی ہو۔ میں جانتا ہوں کہ تم رکنا چاہتی ہو لیکن بہتر ہے کہ نیند پوری کرلو۔''

ثالی نے سر ہلایا۔ وہ سمجھ رہی تھی کہ ٹام صحیح کہہ رہا ہے۔ وہ دو دن میں چھ گھنٹے سوئی تھی۔ نہ وہ لیٹ گئی تھی۔ وہ آئی سی یو بینچ سے اٹھ گئی۔

''میں وعدہ کرتا ہوں۔'' وہ ایلیویٹر کی طرف جاتے ہوئے بولا۔ ''کوئی خبر آئی تو فوراً کال کروں گا۔''

ٹینا کو بیلیویو اسپتال کے ہیڈ ٹراما وارڈ میں منتقل کر دیا گیا تھا۔ وہ علاقے کا بہترین اسپتال سمجھا جاتا تھا۔

ثالی، لابی سے ہوکر فرسٹ اسٹریٹ پر نکل آئی۔ چھ بج رہے تھے۔ تاریکی کے آثار نمایاں ہو رہے تھے۔ کوئی کیب دکھائی نہ دی تو وہ بس کی طرف چلنے لگی...... عقبی نشست پر بیٹھ کر اس نے آنکھیں بند کرلیں۔ گریگ سولہ گھنٹے کی ڈیوٹی پر تھا۔ پہلی مرتبہ ثالی کو اپارٹمنٹ میں رات اکیلے گزارنی تھی۔ وہ سفر کے دوران میں اونگھتی رہی۔ نویں اسٹریٹ پر اس نے بس چھوڑ دی۔ رہائش گاہ چند بلاک کے فاصلے پر تھی۔ سیکنڈ ایونیو پر تاریکی تھی۔ اسے اپارٹمنٹ پہنچنے کی جلدی تھی۔ تاہم اس کی چال میں تیزی نہیں تھی۔ دفعتاً اسے احساس ہوا کہ کوئی چیز معمول سے ہٹ کر ہے۔ اس نے خود سے کہا کہ مڑ کر مت دیکھو۔ عقب میں قدموں کی مدھم چاپ سنائی دے رہی تھی۔ میں وہمی ہوگئی ہوں۔ اس نے خود کو سمجھایا۔ یہ نیویارک کا ایسٹ ولیج ہے۔ یہاں عموماً گہما گہمی رہتی ہے۔ ایک دکان کی کھڑکی کے شیشے میں ثالی نے اس کی جھلک دیکھی۔ سیاہ رنگ کی چرمی جیکٹ تھی۔ دونوں ہاتھ جیکٹ کی جیبوں میں تھے۔ سر پر ٹوپی نیچے کی جانب جھکی ہوئی تھی۔

نہیں۔ یہ وہم نہیں ہے۔ جیکٹ والا اس کے تعاقب میں تھا۔ دل کی دھڑکن ایک بار پھر اعتدال سے تجاوز کرنے لگی۔ خوف کی لہر رگ و پے میں سرایت کر گئی۔ ثالی نے رفتار میں اضافہ کر دیا۔ اس کی پناہ گاہ چند بلاک کے فاصلے پر تھی۔ دھڑکن گویا پسلیوں کو مضروب کیے دے رہی تھی۔ وہ اس سڑک پر مڑی جو اپارٹمنٹ والی عمارت کی طرف جاتی تھی۔ ثالی کو احساس ہوا کہ متعاقب چند قدم کے فاصلے پر ہے۔ وہ مارکیٹ قریب تھی، جہاں سے وہ گھر کے لیے شاپنگ کیا کرتی تھی۔ اس نے ارادہ تبدیل کیا اور تقریباً بھاگتی ہوئی مارکیٹ میں چلی گئی۔ ایک باسکٹ اٹھا کر مختلف ریکس کے درمیان چکراتی ہوئی وہ ایک جگہ رک گئی۔ اس دوران وہ دہی، دودھ اور بریڈ باسکٹ میں رکھ چکی تھی۔

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

دھڑکن اعتدال پر آ رہی تھی۔ اس نے کن انکھیوں سے کھڑکی میں جھانکا...... کوئی مشکوک آدمی نظر نہیں آیا۔ شکر ہے، وہ ادائیگی کے لیے بڑھی اور دفعتاً منجمد ہو کے رہ گئی۔ وہ سڑک کی دوسری جانب ایک کار کے ساتھ ٹیک لگائے کھڑا، فون پر بات کر رہا تھا۔ ثنالی ادائیگی کر کے باہر نکل گئی۔ دونوں کی نظریں چار ہوئیں۔ گھر زیادہ دور نہیں تھا۔ ثنالی نے بے دھڑک دوڑ لگا دی۔ جیکٹ والا بھی پیچھے بھاگا۔ ثنالی کا دل پھر نارمل رفتار بھول کربے قابو ہو گیا۔ جسم کا ریشہ ریشہ لرز رہا تھا۔ چند گز کی بات تھی۔ پلیز گاڈ...... پلیز...... وہ ہر شے سے بے نیاز انتہائی رفتار سے بھاگ رہی تھی۔ بھاگتے بھاگتے اس نے بیگ میں سے چابی نکالی اور گودام نما عمارت کے گیٹ میں ڈال کر گھمائی۔ پہلی کوشش میں ہی گیٹ کھل گیا۔ تھینک گاڈ۔ اندر گھس کر اس نے گیٹ کا پٹ کھینچا۔ گیٹ خودکار انداز میں لاک ہو گیا۔ تھینک گاڈ...... وہ لابی کی دیوار سے لگی ہانپ رہی تھی۔ پشت پر شرٹ پسینے سے تر تھی۔ گہری گہری سانسیں لے کر وہ ایلیویٹر کی طرف بھاگی۔ اچانک اسے خیال آیا کہ وہ کرے گی کیا۔ فیملی اس کی تھی نہیں۔ گریگ فوراً نہیں پہنچ پاتا۔ پولیس؟ پولیس سے وہ کیا کہے گی۔ اس کی دوست اس کی وجہ سے کوما میں تھی۔ اسے حقیقت پہلے پولیس کو بتانی چاہیے تھی۔ اب بہت دیر ہو گئی تھی۔ بہت دیر......

ثنالی نے ایلیویٹر میں قدم رکھا اور سات نمبر دبایا.... فی الحال اسے اپنے اپارٹمنٹ کی ضرورت تھی۔ ساتویں منزل پر ایلیویٹر کے دروا ہو گئے۔ دو...... دو آدمی سامنے کھڑے تھے۔ ثنالی کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ اس نے چیخنا چاہا، کوئی آواز نہیں نکلی، اس کی آنکھیں ڈبڈبانے لگیں۔ دماغ ماؤف تھا۔ واپس بھاگنے کا راستہ نہیں تھا۔ کس نے بھیجا ہے ان کو......؟

معاً ایک آدمی نے قدم بڑھایا۔ ''مس راب؟''

بدحواسی اور ڈبڈباتی آنکھوں نے نظر کو دھندلا دیا تھا۔

''مس ثنالی راب؟'' اس نے نرمی سے ثنالی کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ وہ سسک پڑی۔ وہ پہچان گئی تھی۔ فل کیوبٹ...... نام لینے والا فل کیوبٹ تھا...... وٹنس سیکیورٹی ایجنٹ۔

ثنالی واقعتاً اس کے سینے سے جا لگی۔ خوف و ہراس نے اسے مفلوج کر دیا تھا۔

''سب ٹھیک ہے، ثنالی...... سب ٹھیک ہے۔'' اس نے ثنالی کا سر سہلایا۔

ثنالی دھیرے سے الگ ہو گئی۔ ''میں...... میں سمجھی تھی کہ میرا تعاقب ہو رہا ہے۔''

''میں معذرت خواہ ہوں۔'' وہ بولا۔ ''وہ یقیناً میرا آدمی ہو گا۔''

''تم لوگ یہاں کیوں آئے؟'' وہ خود کو سنبھال رہی تھی۔

''یہ جیمز نارڈوزی ہے۔'' کیوبٹ نے دوسرے آدمی کا تعارف کرایا۔

''ہاں۔ ایک بار مقدمے کی کارروائی کے دوران میں نے دیکھا تھا۔''

نارڈوزی مسکرایا۔

''چند سوالات کرنے تھے۔ اگر ہم اندر بیٹھ جائیں؟'' ایجنٹ نے کہا۔

''کیوں نہیں۔'' ثنالی اپارٹمنٹ کی طرف بڑھی...... فرگو کو خاموش کرا کے، سامان اس نے کچن میں رکھ دیا۔

''ہاں، پوچھو...... میں جانتی ہوں کیا معاملہ ہے۔''

کیوبٹ کی آنکھوں میں عجیب تاثر ابھرا۔ اس کے سوال نے ثنالی کا سر چکرا دیا۔

''آخری بار تم نے اپنے ڈیڈی کو کب دیکھا یا سنا تھا؟''

''ڈیڈی؟؟'' ثنالی نے پلکیں جھپکائیں۔ ظاہر ہے آخری بار ٹرائل کے موقع پر۔ کیوں؟ کیا بات ہے؟''

کیوبٹ نے نارڈوزی کی طرف دیکھا اور کھنکھار کے گلا صاف کیا۔

''ثنالی ہم تمہیں کچھ دکھانا چاہتے ہیں۔'' اس نے رین کوٹ سے ایک لفافہ نکالا۔ کیوبٹ کی آواز میں کوئی ایسی بات تھی کہ ثنالی سنسنی محسوس کیے بغیر نہ رہ سکی۔

'یہ بہت خفیہ ہے اور ناقابلِ برداشت بھی۔ مجبوراً تمہیں دکھا رہے ہیں۔ حوصلہ رکھو۔''

ثنالی کا دل ڈوب سا گیا۔ اس جملے کا جو بھی مطلب تھا، بہت بُرا تھا۔ ''مجھے نروس مت کرو۔'' وہ بولی۔

''میں سمجھ رہا ہوں۔'' اس نے لفافے میں سے تصاویر نکالیں۔ تصاویر کرائم سین سے متعلق تھیں۔ ثنالی نے آنکھیں بند کر لیں۔ کیا ڈیڈی کو...... وہ آگے نہ سوچ سکی۔ اس نے کانپتے ہوئے آنکھیں کھولیں۔ نہیں وہ کسی عورت کی تصاویر تھیں۔ لیکن...... ثنالی کی آنکھیں ازخود دوبارہ بند ہو

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

گئیں۔ یہ درندگی اور سفاکی کا عکس تھا۔ حیوانیت اور بربریت...... ثنالی کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ وہ بمشکل تصاویر دیکھ پائی۔ عورت کو کرسی کے ساتھ باندھا گیا تھا۔ بدن پر زیر جامے کے علاوہ کچھ نہ تھا۔ چند تصاویر میں پوری باڈی نظر آرہی تھی اور بعض میں کلوزاپس۔ چہرہ اور بدن خونی زخموں سے آلودہ تھا۔ کہیں سوجن تھی...... کہیں نیل پڑ گئے تھے۔ تشدد کے بعد اسے گولیاں ماری گئی تھیں۔ لاش کے بالائی نسوانی حصوں کو جلایا گیا تھا۔

ثنالی نے چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپالیا۔

''آئی ایم سوری۔'' کیویٹی کی آواز آئی۔

''یہ...... یہ کسی انسان کا کام نہیں ہے۔'' ثنالی کے معدے سے رطوب اوپر چڑھی اور حلق کڑوا کر گئی۔

''اسے ہلاک نہیں کیا گیا۔ زندہ رکھا گیا ہے...... زیادہ سے زیادہ دیر تک...... تاکہ وہ کچھ بول سکے۔ گولیاں تو خوامخواہ ماری گئیں۔ یہ بھیانک تشدد تھا۔''

''میں سمجھی تھی کہ تم ٹینا کی وجہ سے آئے ہو۔''

''مجھے افسوس ہے اور ہم جانتے ہیں کہ وہ تمہارے مغالطے میں نشانہ بن گئی۔ میں ایک بار پھر اظہارِ افسوس کرتا ہوں۔'' ایجنٹ نے آخری فوٹو نکال کر سامنے رکھا۔ یہ کلوز اَپ تھا۔ ایسے زاویے سے لیا گیا تھا کہ زخمی چہرے کو پہچانا جاسکے۔ ثنالی نظر پھیرتے ہوئے رک گئی۔

''اوہ گاڈ۔ تم مجھے یہ کیوں دکھا رہے ہو۔ ڈیڈی کا ان تصویروں سے کیا تعلق ہے؟'' وہ تقریباً چیخ اٹھی۔

''شاید تعلق ہے...... غور سے دیکھو۔''

کانپتی انگلیوں سے ثنالی نے تصویر اٹھالی۔ وہ اسے پلک جھپکائے بغیر گھور رہی تھی۔ ثنالی کے چہرے کا سارا خون کسی نے نچوڑ لیا۔ اس کے کھلے منہ سے کوئی لفظ برآمد نہیں ہوا۔ البتہ اس کی سانس رک گئی تھی...... وہ مارگریٹ عرف میگی کی تصویر تھی۔

☆☆☆

ثنالی سکتے کی کیفیت میں بیٹھی تھی۔ آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ میگی ایک اچھی اور خوش مزاج عورت تھی۔ راب فیملی نے پہلی ملاقات میں ہی اسے پسند کیا تھا۔

''کس نے کیا؟ کیوں کیا؟''

''فی الحال ہم اندھیرے میں ہیں۔'' فل کیویٹی نے جواب دیا۔ وہ اٹھا اور ایک گلاس میں پانی لاکر ثنالی کو دیا۔ ''یہ واردات گزشتہ ہفتے، جمعرات کے دن ہوئی تھی۔ شکاگو کے باہر ایک گودام میں۔ ہمیں صرف اتنا معلوم ہے کہ ایجنٹ مارگریٹ، کیس کے سلسلے میں وہاں کسی سے ملنے گئی تھی۔''

پانی پیتے ہوئے بھی ثنالی کے ہاتھ لرز رہے تھے۔

''اس کی موت مقصد نہیں تھا۔ معلومات کے لیے اس پر تشدد کیا گیا۔''

''میں نہیں سمجھی۔''

''شاید تمہارے ڈیڈی کے بارے میں معلومات۔'' نارڈوزی نے کہا۔

معاً تمام صورتِ حال ثنالی پر واضح ہوگئی۔

''لیکن یہ مجھے کیوں دکھایا گیا؟''

''ثنالی، وہ جو بھی تھا...... اس نے کوئی نشان نہیں چھوڑا۔ البتہ مارگریٹ کی کار کے ڈیش بورڈ پر یہ چپکا ہوا تھا۔'' ایجنٹ نے ایک اور لفافہ نکالا۔ لفافے میں پلاسٹک کے اندر ایک کاغذ تھا۔ کاغذ سادہ تھا۔ ثنالی کی آنکھوں میں الجھن تھی۔ ''اس پر لکھ کر مٹایا گیا ہے۔ غور کرو۔''

ثنالی نے غور سے دیکھا۔ مٹے مٹے حروف نظر آئے۔

''الٹراوائلٹ روشنی میں تم پڑھ لوگی۔'' کیویٹی نے دوسرا کاغذ دکھایا۔

M-I-D-A-S

''میڈاس؟'' ثنالی نے ناسمجھی سے کیویٹی کی طرف دیکھا۔

''میڈاس، کوڈ نیم ہے۔ یہ نام تمہاری فیملی کو دیا گیا تھا۔

ثنالی کو لگا جیسے کسی نے اس کے پیٹ میں گھونسا مارا ہو اور اس کے پھیپھڑے آکسیجن سے محروم ہوگئے ہوں۔

پہلے لیب کے باہر ٹینا، پھر اس کی فیملی کیس ایجنٹ مارگریٹ، اور اب وہ اس کے ڈیڈی کا اتا پتا معلوم کر رہے تھے۔

''کیویٹی ہو کیا رہا ہے؟ میری فیملی خطرے میں ہے۔ کیا تم نے ان کو خبردار کردیا ہے؟ کیا تم نے ڈیڈی سے بات کی ہے؟''

''اسی لیے ہم یہاں پر ہیں۔'' کیویٹی نے ثنالی کی آنکھوں میں دیکھا۔ ''ثنالی تمہارے ڈیڈی لاپتا ہیں۔''

''لاپتا؟'' یکے بعد دیگرے صدمات ثنالی کے اعصاب کو توڑ رہے تھے۔ ''کب سے لاپتا ہیں؟''

''ایک ہفتے سے...... تمہیں یقین ہے کہ انہوں نے تم سے رابطے کی کوشش نہیں کی؟''

''میں اُن کے بارے میں قطعی لاعلم ہوں۔ کیا میری

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

ماں اور بہن بھائی محفوظ ہیں؟''

''ہاں۔''

''اور ڈیڈی؟''

''سچ یہ ہے کہ ہم نہیں جانتے۔ ہم ایک گارڈ تمہیں دے دیتے ہیں۔ امکان ہے کہ تمہارے ڈیڈی زندہ ہوں اور تم سے رابطہ کریں۔ تمہیں بھی ٹارگٹ بنایا جاسکتا ہے۔''

''وہ تو مجھے بنایا گیا تھا۔'' نثالی وقفہ لے کر بولی۔ ''تم نے کہا تھا کہ ٹینا کے بارے میں تمہیں علم تھا؟''

کیویٹی نے جواب دینے کے بجائے نارڈوزی کی طرف دیکھا۔ نثالی کھڑی ہوگئی۔ وہ ان دونوں کو گھور رہی تھی۔ ''تم لوگوں کو خبر تھی اور تم نے مجھ سے رابطہ کرنے کی زحمت نہیں کی؟''

''نثالی، ہم تمہاری تکلیف سمجھ رہے ہیں، لیکن پولیس......''

نثالی نے تیزی سے تخمینہ لگایا۔ ٹینا، تین دن، مارگریٹ...... ایک ہفتہ، ڈیڈی ایک ہفتہ...... انہوں نے مجھے ہوشیار کیوں نہیں کیا؟

''مجھے اپنی فیملی سے بات کرنی ہے۔'' اس نے کیویٹی کو مخاطب کیا۔

''سوری، نثالی وہ حفاظتی تحویل میں ہیں۔''

''حفاظتی تحویل؟ تو پھر میرے ڈیڈی کہاں ہیں؟''

''نثالی۔'' کیویٹی نے دفاعی انداز اختیار کیا۔ ''تمہارے ڈیڈی سے بدلہ لینے کے لیے مارکیڈو مافیا کچھ بھی کرسکتی ہے۔ ممکن ہے وہ یہ کام کر چکے ہوں۔ پروٹیکشن پروگرام کے اندر نقب لگ چکی ہے۔ جب تک ہمیں پتا نہ چلے کہ یہ ہوا کیسے...... تب تک ہم تمہاری فیملی کے تحفظ پر سمجھوتا نہیں کرسکتے۔''

''مطلب، وہ لوگ قیدی ہیں؟ اور میں بھی؟''

''دیکھو ہم نہیں جانتے کہ مارگریٹ نے قاتل یا قاتلوں کو کیا بتایا ہے یا کچھ نہیں بتایا۔ دوسرے ہم ان کی اصل شناخت سے بھی بے خبر ہیں۔ قیاس غالب ہے کہ وہ ڈرگ ڈیلرز کے آدمی تھے۔ مارگریٹ کے پاس راب فیملی کے علاوہ اور بھی کیس تھے۔''

نثالی، ایجنٹ کو دیکھتے ہوئے تمام صورتِ حال کا تجزیہ کررہی تھی۔ اس کا ذہن کہہ رہا تھا کہ کیویٹی نے تمام باتیں ظاہر نہیں کی ہیں۔ وہ جھوٹ بول رہا تھا۔ کوئی بات چھپا رہا تھا۔

''مجھے اپنی فیملی سے بات کرنی ہے۔'' نثالی بضد تھی۔

''اگر میرے ڈیڈی زندہ نہیں ہیں تو یہ جاننا میرا حق ہے۔''

''میں یہ حق تسلیم کرتا ہوں۔ نثالی ہم پر بھروسا کرو۔''

☆☆☆

نثالی کے لیے جو حفاظتی نمائندہ منتخب کیا گیا، وہ ایف بی آئی ایجنٹ روبرٹ تھا۔ نثالی بہتر محسوس کررہی تھی۔ تاہم اسے نیند نہیں آرہی تھی۔ ذہن میں فیملی کے خیالات گردش کررہے تھے۔ کیویٹی نے ڈیڈی کے بارے میں جو بتایا تھا، ذہن اسے قبول نہیں کررہا تھا۔ ڈیڈی نے کیا کیا، ٹھیک تھا یا غلط تھا۔ لیکن وہ ان کو چھوڑ کر نہیں جاسکتے تھے...... اس کا حلق بری طرح خشک ہورہا تھا۔ ہاتھ اور پیروں کی انگلیوں میں سوئیاں سی چبھ رہی تھیں۔ نثالی نے اکیوا، چیک نکال کر بلڈ ریڈنگ چیک کی۔ 315۔ اوہ گاڈ...... خاصی خراب صورتِ حال تھی۔ کچن میں جاکر اس نے فریج میں سے مطلوبہ اشیا برآمد کیں اور سرنج کے ذریعے، کیفیت کے مطابق شاٹ لیا۔ ایک ہفتے سے اس نے جاگنگ کی تھی اور نہ کشتی رانی۔

''کم آن، نثالی...... تمہیں اپنا خیال خود رکھنا ہوگا، ہر معاملے میں کاندھے تلاش کرنا چھوڑ دو۔'' اس نے فرگو کو قریب کر کے آہستہ سے کہا۔ وہ دم ہلا رہا تھا جیسے نثالی کی بات سمجھ گیا ہو۔

نثالی نے کمپیوٹر سنبھالا۔ اسے امید تو نہیں تھی، تاہم کوشش کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں تھا۔ یاہو پر جاکر اس نے شیرن کی ای میل آئی ڈی چیک کی۔ یوگا گرل 1123، اسے براہِ راست آگے نہیں بڑھنا تھا۔ بلکہ سیکیورٹی پروگرام کی کلیئرنگ ویب سے ہوکر گزرنا تھا۔ اسی لیے پیغام ٹائپ کرتے وقت اس نے اشاروں کنایوں سے کام لیا۔

مام...... دوستو...... میں تم لوگوں کی طرف سے پریشان ہوں۔ مجھے یہ بھی نہیں معلوم کہ میرا پیغام تم لوگوں تک پہنچ سکے گا۔ میں جانتی ہوں کہ ڈیڈی لاپتا ہیں۔ میں خوف زدہ ہوں کہ کوئی خراب بات ہوگئی ہے۔

میں کچھ بتانا چاہتی ہوں کہ یہاں کیا ہوا۔ لیکن میرے لیے اہم بات یہ ہے کہ کسی طرح میں تم لوگوں کی آواز سن سکوں۔ یہ لوگ کہتے ہیں کہ تم حفاظتی تحویل میں ہو۔ اگر تمہیں یہ پیغام مل جائے تو مجھے اوکے کی کال کردو۔ میں تم سب سے اور ڈیڈی سے محبت کرتی ہوں اور ڈیڈی کے لیے دعا کرتی ہوں۔ میرا دل تمہارے ساتھ ہے۔ کسی طرح مجھ سے رابطہ کرو۔ N۔

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

آدھی رات کے بعد دو بجے گریگ نے اسے کچی نیند سے بیدار کیا۔ ''میں ٹینا کے پاس رک گیا تھا۔'' اس نے نثالی کا ہاتھ دبایا۔ ''وہ گولی کے گرد سے دباؤ ہٹانے اور مردہ ٹشوز کو نکالنے کے لیے خاص طریقۂ کار پر عمل کرنے کا فیصلہ کر چکے ہیں۔''

''ٹینا ٹھیک ہے؟'' نثالی اٹھ کے بیٹھ گئی۔

''وہ لڑ رہی ہے۔'' گریگ نے کہا۔

نثالی نے کچھ دیر بعد اسے مارگریٹ کے بارے میں بتایا۔

''گریگ اگر وہ مجھے پکڑ لیتے تو......''

''اس طرح مت سوچو۔'' گریگ نے اسے سینے سے لگالیا۔

''اور ڈیڈی بھی لاپتا ہیں۔ اگر اُن کو......''

''وہ ٹھیک رہیں گے۔'' گریگ نے نثالی کو اطمینان دلایا۔

''تم روبرز سے مل لیے؟''

''ہاں، بے فکر ہو کے سو جاؤ۔''

☆☆☆

فون کی گھنٹی پر نثالی کی آنکھ کھلی۔ روشنی اور وقت دیکھ کر وہ حیران رہ گئی۔ گیارہ بج رہے تھے۔ فون نے پھر آواز دی۔

''ہیلو؟''

''نثالی، ہنی......؟''

نثالی نے جھٹکا محسوس کیا۔ ''مام، آپ ہیں؟''

''ہاں، میں ہوں۔ تم کیسی ہو؟ ہم لوگ ٹھیک ہیں۔''

''اوہ گاڈ، میں بہت پریشان تھی...... سیکیورٹی پروگرام کے اہلکار بتا رہے تھے کہ وہ لاپتا ہیں؟''

''ہاں، ہمیں معلوم ہے لیکن کسی کو نہیں پتا وہ کہاں ہیں...... 8 دن ہو گئے۔'' نثالی نے کیویٹی اور مارگریٹ کے بارے میں بتایا۔ ''مام بہت برا ہوا۔ آپ لوگ بہت خیال رکھنا اپنا۔''

''ہنی، ہم ٹھیک ہیں۔ چوبیس گھنٹے ہماری خصوصی حفاظت کا انتظام ہے۔ مجھے تمہارے ڈیڈی اور تمہاری فکر رہتی ہے۔''

''مام، ٹینا کو کسی نے گولی ماردی ہے۔''

''اوہ لارڈ...... کیا مطلب؟''

''وہ آئی سی یو میں ہے......''

''تم زیادہ باہر مت جاؤ۔ ان لوگوں کو حفاظت کرنے دو۔''

''مام، ایسا ہی ہے۔''

''ہنی، میں زیادہ دیر بات نہیں کر سکتی۔ اپنا خیال رکھنا۔''

''لیکن مام......'' کسی مرد کی آواز آئی اور لائن کٹ گئی۔

''مام...... م......''

کال غیر متوقع بھی تھی اور اطمینان بخش بھی۔ تاہم کوئی چیز نثالی کے ذہن میں چبھ رہی تھی۔ چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ مام نے کوئی اشارہ دیا ہے۔ نثالی کو کیویٹی پر پہلے بھی شک تھا۔ کال غیر متوقع تھی۔ ماما کو بھی تمام باتوں کا علم تھا۔ صرف ٹینا کے بارے میں وہ لاعلم تھیں۔ دوران گفتگو ماما نے کوئی عجیب بات نہیں کی تھی...... دفعتاً نثالی کے ذہن نے نکتہ پکڑ لیا۔ کیویٹی کے مطابق مارگریٹ کا قتل شکاگو کے باہر ایک ہفتہ قبل جمعرات کو ہوا تھا۔ ماما نے واضح طور پر آٹھ دن کہا تھا۔ وہ لفظ جمعہ استعمال نہیں کر سکتی تھیں۔ کیونکہ ان کے ساتھ ایف بی آئی کا آدمی موجود تھا۔ مطلب جمعرات کے دن ڈیڈی پروگرام میں تھے۔

ڈیڈی جمعہ سے لاپتا تھے تو قاتل مارگریٹ سے کیا معلوم کر سکتا تھا؟

☆☆☆

''کیا میرے ڈیڈی زندہ ہیں؟'' نثالی جاولنس بلڈنگ، فیڈرل پلازا کے دفتر میں درانہ وار گھستی چلی گئی تھی۔ وہ براہِ راست سیکیورٹی پروگرام ایجنٹ کی آنکھوں میں دیکھ رہی تھی۔

وہاں دو آدمی اور تھے۔ ایک نارڈوزی اور دوسرا دراز قامت بوتھ۔

''نثالی، درحقیقت ہم لاعلم ہیں۔''

''ایسا نہیں ہے۔ گزشتہ ہفتے ہمارے دروازے کا بولٹ کسی نے استعمال کیا تھا۔ اس کے بعد ہی یہ واقعات شروع ہوئے۔ کوئی شک نہیں رہا کہ کوئی ہمارے اپارٹمنٹ میں آیا تھا۔ کیا میرا فون ٹیپ ہوتا رہا ہے؟''

''نثالی، ہمارے محفوظ ترین وٹنس پروگرام میں نقب لگی ہے۔ ہمارا ایک قیمتی ایجنٹ مارا گیا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ سب کچھ بنجامن راب کیس سے تعلق رکھتا ہے۔''

''لیکن میرے ڈیڈی جمعے کے روز غائب ہوئے تھے۔ مارگریٹ کا مرڈر جمعرات کو ہوا تھا۔ اسی لیے میں پھر پوچھ رہی ہوں۔ کیا ڈیڈی زندہ ہیں؟''

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

''مس راب......'' نارڈوزی دخل انداز ہوا۔
''ہیریرا۔'' نثالی نے تیزی سے کہا۔ ''تم ہی نے کہا تھا کہ میں اپنے نام کے ساتھ ہیریرا کا لفظ استعمال کروں۔''
''مس ہیریرا۔'' لائر کھڑا ہو گیا۔ ''تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ ''سیکیورٹی پروگرام'' کے لیے اس وقت ساڑھے چار ہزار افراد کام کر رہے ہیں۔ ان میں بیشتر بہت خاص ہیں اور......''
''میرے سوال کا جواب کوئی نہیں دے رہا؟''
''مس ہیریرا۔'' بوتھ کھڑا ہو گیا۔ ''بات یہ ہے کہ تمہارے ڈیڈی نے چند ہفتے قبل تمہارے بھائی جسٹن کے نام پر ایک سیل فون خریدا تھا۔''
نثالی نے فرطِ حیرت سے اثبات میں سر ہلایا۔
''فون کو استعمال نہیں کیا گیا۔ گزشتہ جمعرات کو اس فون سے کال کی گئی اور اگلے روز تمہارے ڈیڈی، ایملی کے میچ کے دوران غائب ہو گئے۔ وہ کال شکاگو سے گئی تھی۔''
نثالی کو امید کی کرن نظر آئی۔ تاہم وہ خاموش رہی۔
''جس نمبر پر کال کی گئی تھی، وہ مارگریٹ کا خفیہ نمبر تھا۔''
''میں نہیں سمجھی۔'' نثالی نے پلکیں جھپکائیں۔ کیا وہ یہ بتانا چاہ رہے ہیں کہ اس کے ڈیڈی بقیدِ حیات ہیں۔
''نثالی تمہارے ڈیڈی کے حلیے کا ایک آدمی بدھ کی رات منی پولس کے لیے جہاز میں سوار ہوا۔ ٹکٹ پر اس آدمی کا نام جان اسکینر لکھا ہوا تھا۔ کاغذات کے مطابق وہ ایک انشورنس بروکر تھا، جس کا تعلق کرین بری، نیوجرسی سے تھا۔ اس نے ڈرائیونگ لائسنس چوری ہونے کی رپورٹ درج کرائی تھی۔ رپورٹ دو سال پرانی تھی۔ منی پولس ائرپورٹ کے اطراف میں بجٹ آفس کے قریب جان اسکینر نے گاڑی کرائے پر حاصل کی اور دو دن بعد واپس کر دی۔ ریکارڈ اور تفتیش کے مطابق گاڑی نے آٹھ سو بیس میل کا سفر طے کیا۔''
''او کے......'' نثالی اپنے احساسات سمجھنے سے قاصر تھی۔
''منی پولس سے شکاگو اور پھر واپس منی پولس پہنچا جائے تو یہ فاصلہ بنتا ہے...... آٹھ سو بیس میل۔''
نثالی کئی سیکنڈ تک بوتھ نامی ایجنٹ کو تکتی رہی۔ رگوں میں دوڑتے لہو میں مسرت کا عنصر شامل ہوا۔ وہ کہہ رہے تھے کہ ڈیڈی زندہ ہیں لیکن یہ مسرت لمحاتی تھی۔ کمرے میں چھائے ہو پتھریلے سکوت نے مسرت کے لمحوں کو نازک کانچ کے مانند کرچی کرچی کر دیا۔
''کار کا جی پی ایس سسٹم، شوم برگ کے برواِنڈسٹریل پارک کی نشاندہی کر رہا تھا۔''
''او کے......'' نثالی کی نبض نے اپنی رفتار بڑھا دی۔
کیویٹی نے ایک فوٹو آگے بڑھایا۔ ''یہ پارک کے اندر گودام کی تصویر ہے جسے تم پہلے بھی دیکھ چکی ہو اور جہاں مارگریٹ کو بے رحمی سے قتل کیا گیا۔''
نثالی کی تیز دوڑتی ہوئی نبض ایک لمحے کے لیے یکایک تھم گئی۔ دفعتاً اس پر انکشاف ہوا کہ وہ لوگ کیا سوچ رہے ہیں...... کیا خود نثالی نے ماں کی بات کا غلط مطلب لیا تھا؟
''نہیں۔'' اس نے پُرزور انداز میں نفی میں سر ہلایا۔
''تم جانتی ہو کہ وہ ایک دن پہلے غائب ہوئے۔ ہم یہ سمجھنے پر مجبور ہیں کہ وہ ایجنٹ مارگریٹ سے ملنے گئے تھے۔''
''نہیں۔'' اس کی آواز لرز اٹھی۔ ''وہ ایک دن بعد لاپتا ہوئے تھے۔''
''لائسنس دو سال قبل چوری ہوا تھا۔ اسی نام سے کریڈٹ کارڈز ایشو ہوئے تھے۔ تم سمجھ گئی ہو گی کہ منصوبہ بندی بہت پہلے سے ہو رہی تھی۔''
''یہ پاگل پن ہے۔'' وہ کھڑی ہو گئی۔ اس کے ڈیڈی کے بارے میں جاننے کے لیے مافیا نے مارگریٹ کو نہیں مارا تھا۔ ایجنٹ بوتھ کی سنائی ہوئی کہانی بتا رہی تھی کہ خود اس کے ڈیڈی نے اپنے ہی کیس ایجنٹ کا مرڈر کیا تھا۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟
''تمہارا سوال تھا کہ وہ زندہ ہیں یا......'' کیویٹی نے کہا۔ ''اصل معاملہ بہت گہرا ہے۔ تمہارے سوال کے پیچھے ایک اور بہت بڑا سوال چھپا ہے۔''
''نہیں۔'' نثالی کی آواز بلند ہو گئی۔ ''تم لوگ غلط کہہ رہے ہو۔ ڈیڈی قاتل، یہ ناممکن ہے۔'' نثالی کے تصور میں مارگریٹ کی خونچکاں تصاویر گھومنے لگیں۔ ''ملنے کا مطلب یہ نہیں کہ وہ قاتل ہیں اور محرک؟''
''نثالی، وہ مارگریٹ سے ملنے گئے تھے...... انہوں نے تمہاری فیملی کو چھوڑ دیا۔ ہم اتنا جانتے ہیں۔''
''سب جھوٹ ہے۔ شروع سے اب تک، سب تم لوگوں نے کیا۔ تم نے ان کو مار دیا۔ ان کی فیملی کو ختم کر دیا۔''

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

ثالی کے سر میں دھماکے ہو رہے تھے۔ حقائق اس نے سن لیے تھے۔ حقائق کے ثبوت میز پر پڑے تھے۔ ''وہ کیوں ایسا کر سکتے ہیں؟ کس وجہ کے تحت...... وہ کیوں اسے ختم کریں گے جو اُن کے بہبود کے لیے کام کر رہی تھی؟''

''مارگریٹ کو کوئی ایسی اطلاع ملی ہو...... کوئی کور، اپ، تمہارے ڈیڈی نہیں چاہتے ہوں کہ مارگریٹ کسی کو بتائے۔''

''او گاڈ، تم سینئر آفیسر ہو۔ ایسی بات ہوتی تو فائل ٹ ، ہوتی، ڈیڈی تک کیسے پہنچی۔ ملنے کا مطلب یہ نہیں کہ انہوں نے اسے مار دیا۔ ہو سکتا ہے مارگریٹ نے فون کیا ہو۔ نہیں...... نہیں...... نہیں۔ آہ اور اپارٹمنٹ...... وہاں، مسٹر کیویٹی تم آئے تھے۔ کیوں؟ تم نے مجھے استعمال کیا۔ تمہارا خیال تھا کہ ڈیڈی مجھ سے رابطہ کریں گے......''

ایجنٹ کیویٹی معذرت کیے بغیر ثالی کو دیکھتا رہا۔ ''تمہیں اندازہ نہیں ہے کہ کتنا کچھ داؤ پر لگا ہے؟''

''پھر بتا دو۔'' وہ دوبارہ کھڑی ہو گئی۔ ''بتا دو، اس کیس میں کتنا داؤ پر لگا ہے۔ شاید ڈیڈی زندہ نہ ہوں اور میری عزیز ترین دوست دماغ میں گولی لیے اسپتال میں پڑی ہے۔ یہ میرا داؤ ہے۔ تمہارا کیا لگا ہے۔'' ثالی نے بیگ اٹھا کر دروازے کا رخ کیا۔ ''انہوں نے تمہارے لیے گواہی دی تھی۔ حفاظت تمہاری ذمے داری تھی۔ اب حفاظت کرو۔ لگتا ہے ان کی زندگی کا تمہیں بہت یقین ہے...... ٹھیک ہے تلاش کرو، ورنہ میں کروں گی۔ میرا وعدہ ہے۔''

☆☆☆

علی الصباح عمارتوں کی چھت سے سورج کی کرنیں دریا کے پانی سے کھیل رہی تھیں۔ ثالی کوسٹ لائن کے ساتھ کشتی رانی میں منہمک تھی۔ سردی ہو یا برسات۔ وہ اپنا غصہ اور شکوک و شبہات دریا کی نذر کر رہی تھی۔ جاگنگ اور کشتی رانی، ٹائپ اے ذیابیطس سے لڑنے کے لیے حکمتِ عملی میں شامل تھیں۔ لیکن آج وہ ذہنی سکون کے لیے کر رہی تھی۔

اسے ان پر اعتبار نہیں تھا۔ ان کو یہ بھی علم نہیں تھا کہ ڈیڈی زندہ ہیں یا نہیں۔ وہ ان کے ساتھ پلی بڑھی تھی۔ ان سے جو کچھ ہوا۔ لیکن انہوں نے ہمیشہ اس کا خیال رکھا تھا۔ علالت ہو، یا پڑھائی۔ وہ اس کے پاس آتے تھے۔ انہوں نے ثالی کو زندگی سے لڑنا سکھایا تھا۔

ایجنٹ کسی اور چیز کو بچا رہے تھے۔ انہوں نے ڈیڈی تک پہنچنے کے لیے ثالی کو استعمال کیا...... داؤ پر کیا لگا ہے؟

کس کا لگا ہے؟ وہ ایک میل دور چٹانوں تک چلی گئی۔ وہ واپس پلٹی تو لہروں کے خلاف تھی۔

ماما بھی کچھ نہ کچھ جانتی ہیں۔ شاید وہ میرے بڑے ہونے کا انتظار کر رہی تھیں۔ کچھ ہے جو اَب تک مجھے نہیں معلوم۔ کیا ہو سکتا ہے؟ پیٹر جے شارپ بوٹ ہاؤس، آٹھ میں سے ایک تھا، جہاں اس کی کشتی لگتی تھی۔ چند سو میٹر کا فاصلہ تھا۔ ثالی نے اسٹروک بڑھائے اور رفتار میں اضافہ کیا۔

پرانا سوال ایک بار پھر ذہن میں ابھرا۔ ''کون ہو؟ ڈیڈی آخر تم کون ہو؟''

☆☆☆

وہ ساحلی پٹی کی اونچی چٹانوں میں کار کی چھت پر کھڑا تھا۔ دوربین آنکھوں سے لگی تھی۔ وہ دریا میں لڑکی کو دیکھ رہا تھا۔ وہ بار بار یہاں آیا تھا۔ ہر مرتبہ لڑکی دھندلی صبح میں ٹھیک سات بجے پہنچ جاتی تھی۔ بدھ اور ہفتہ۔ بارش ہو یا دھوپ۔

تم مصیبت میں پڑ سکتی ہو۔ دریا کا موڈ بدل گیا تو تمہارے لیے برا ہوگا...... بہرحال تم مضبوط ہو۔ نگراں نے سوچا۔ وہ ہر مرتبہ دور نکل جاتی تھی اور واپسی پر چیمپئن کی طرح دریا سے لڑتی تھی۔ نگراں کو یہ اچھا لگا تھا۔

وہ جانتی ہے۔ دوسروں سے زیادہ جانتی ہے کہ دریا بعض اوقات خطرہ بن جاتا ہے۔

☆☆☆

گریگ نے اپنی شفٹ بدلنے کا وعدہ کیا تھا۔ ثالی کو رات گھر پر تنہا نہیں گزارنی چاہیے تھی۔ ثالی اپنے مقالے پر کام کر رہی تھی۔ گھڑی دیکھ کر اس نے کمپیوٹر بند کیا۔ سونے سے قبل پھر سوالات نے یلغار شروع کر دی۔ سوال تھے۔ جواب ندارد۔ اس کی بے قراری بڑھنے لگی۔ اس نے گریبان سے سنہری لاکٹ نکالا۔ اسے الٹ پلٹ کر دیکھا۔ پھر وہ ٹی وی کے قریب چلی گئی جو ایک کیبنٹ پر رکھا تھا۔ کیبنٹ انہوں نے ماضی میں آئرلینڈ سے خریدا تھا۔ ثالی نے کبھی اس کی درازوں میں جھانکنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ زیریں حصے میں چار درازیں تھیں۔ دو دائیں، دو بائیں جانب۔ اس نے ایک ایک کر کے درازیں کھولیں۔ چھان پھٹک کی۔ کوئی قابلِ ذکر چیز نظر نہیں آئی۔ چوتھی دراز باقی تھی۔ ثالی نے اس کا ہینڈل کھینچا۔ دراز تھوڑی سی کھل کر اٹک گئی۔ ثالی ارادہ ترک کرنے والی تھی پھر اس نے سوچا اس کارِ لاحاصل میں اسے کیوں بخشا جائے۔ اس نے پھر کوشش کی۔ تیسری مرتبہ اس نے زور سے جھٹکا دیا۔ دراز

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

اچانک پوری باہر آگئی۔ اس میں میگزین بھرے تھے واپس فٹ کرنا چاہا تھا تو حیران رہ گئی۔ اندر عقب میں ایک اور چھوٹی دراز موجود تھی۔ گویا یہ خفیہ خانہ تھا۔ چہرے کی سرخی میں اضافہ ہوگیا۔ اس نے دراز ایک طرف رکھی اور اندر ہاتھ ڈال کر خانہ باہر نکال لیا۔ یہ ڈبا نما تھا۔ وہ اسے لے کر میز پر آگئی۔ ڈبے کے اندر فوٹو تھے۔ وہ الجھن میں تھی کہ انہیں اس طرح رکھنے کی کیا ضرورت تھی۔ 1960ء کے اواخر کا ایک فوٹو شیرن کا تھا۔ چند سرٹیفکیٹ تھے۔ نتالی نے یہ چیزیں پہلے نہیں دیکھی تھیں۔ ڈیڈی کا فوٹو بھی تھا۔ نتالی نے محسوس کیا کہ وہ ڈیڈی کے ماضی کے بارے میں زیادہ کچھ نہیں جانتی...... وہ دھند میں لپٹا ہوا تھا۔ چند خطوط تھے جو روز نے شیرن کو لکھے تھے۔ روز نے بظاہر شیرن کو بہن کہہ کر مخاطب کیا تھا۔ تاہم خطوط کی تحاریر پر پُر اسرار اور اشارتی نوعیت کی تھیں۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ ان کو دستی ترسیل کے ذریعے پہنچایا گیا ہو۔ روز کون تھی؟ ماما نے تو کبھی اپنی بہن کا ذکر نہیں کیا۔ تاہم روز بہت حسین تھی۔ بعض تصاویر کو وہ نہیں پہچان سکی۔ اگر روز بہن تھی۔ ماما نے کبھی خالہ کا ذکر نہیں کیا۔ ڈیڈی نے بھی ایسا کوئی رشتہ افشا نہیں کیا تھا؟ روز کا تعلق اسپین سے تھا۔ روز کون تھی؟ نتالی کی آنکھوں میں مسرت کے آنسو جھلک آئے۔ یادوں اور خیالات کے دریچے کھل گئے۔ تصاویر نے دل کو چھو لیا تھا۔ اسے علم ہی نہیں تھا۔ فیملی یہاں روپوش تھی...... کیسی عجیب بات تھی۔ ایک گروپ فوٹو تھا...... راب، اس کے ماں باپ۔ ممکن ہے ڈیڈی، مارگریٹ سے ملنے گئے ہوں لیکن وہ مرڈر جیسے بھیانک جرم کے مرتکب نہیں ہوسکتے۔ یہ کسی اور کا کام ہے۔ وہ فوٹو دیکھ رہی تھی اور پُر یقین تھی کہ ڈیڈی قاتل نہیں ہوسکتے۔ نتالی نے تمام فوٹو اور کاغذات ایک لفافے میں ڈالے۔ ایک تصویر باہر گر پڑی۔ یہ قدرے دھندلی اور چھوٹے سائز کی تھی۔ پرانی کوڈک فلم تھی۔ ڈیڈی کی عمر اس میں اٹھارہ سال سے کم نظر آرہی تھی۔ ان کا ایک ہاتھ اپنے ساتھ کھڑے شخص کے شانے پر تھا۔ نتالی اسے پہچاننے سے قاصر رہی۔ تاہم وہ ڈیڈی سے عمر میں بڑا لگ رہا تھا۔ ان دونوں کی ملتی ہوئی شکلوں کو جھٹلانے میں وہ ناکام رہی۔ دونوں ایک بڑے سے چوبی دروازے کے آگے کھڑے تھے۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ دیوہیکل دروازہ کسی جاگیر کے اندر جانے کا راستہ ہے...... پس منظر میں پہاڑ نظر آرہے تھے۔ دروازے کی بلندی پر قوس بنی ہوئی تھی جس پر کارمینیس، 1967ء لکھا تھا۔ کارمینیس؟...... شاید اسپین میں ہے؟ وہاں گیٹ کا نام بھی لکھا تھا۔ تاہم اسے پڑھنا مشکل تھا۔ نتالی نے آنکھیں سکیڑ کر کوشش کی...... پھر ناکام ہو کر میز کی دراز کھولی۔ چند سیکنڈ بعد اسے میگنفائنگ گلاس مل گیا۔

وہ گلاس کی مدد سے بغور نام پڑھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس کی سانس رک رہی تھی یا نظر دھوکا دے رہی تھی۔ اس کے بدن کا ریشہ ریشہ ٹوٹنے لگا۔ ڈیڈی کی جوانی کی تصویر۔ جنہوں نے اسے محبت سے پالا تھا اور وہ کبھی ان کو نہیں جان سکی۔ کبھی جانا ہی نہیں...... وہ کیا کر سکتے تھے اور کیا کر چکے ہیں...... وہ یقین کرنے کے لیے تیار نہیں تھی...... گیٹ پر کیا لکھا تھا؟ وہاں لکھا تھا۔ مارکیڈو۔

☆☆☆

اسٹیئرنگ وہیل کے پیچھے بیٹھا ہوا شخص تاریکی میں بھی علاقے کے خدوخال کی تبدیلی سے آشنا تھا۔ انڈیانا اور اوہائیو پیچھے رہ گئے تھے۔ انٹراسٹیٹ پینن سلویا کی وادیوں میں بل کھا رہی تھی۔ رخ مشرق کی طرف تھا۔ چند گھنٹے کی بات تھی۔

ڈرائیور نے ریڈیو آن کیا۔ اسے خود بھی یاد نہیں رہا تھا کہ وہ کتنے گھنٹوں سے ڈرائیو کر رہا تھا۔ بنجامن راب کی آنکھوں میں جلن ہو رہی تھی۔ گزشتہ برس سے اس کا نام جیلر تھا۔ یا پھر لائسنس کے مطابق جان اسکینر...... کیا فرق پڑتا ہے؟ یہ محض نام تھے۔ اس نے کونسا واپس جانا ہے۔ کاروبار کے دوران میں وہ ہمیشہ دعویٰ کرتا تھا۔ ''قبل از وقت تیاری'' اس کا بہترین فن تھا اور وہ اس کے لیے کافی عرصے سے تیاری کرتا رہا تھا۔ اس نے ریئر ویو میں خود کو دیکھا۔ بیس برس کی آنکھوں کی نرماہٹ کی جگہ وحشت تھی۔ اسے یقین نہیں تھا کہ وہ اب کبھی مسکرا سکے گا۔ یہ سب ماضی تھا۔ اس کی سابقہ زندگی۔ وہ جو کچھ کر آیا تھا...... وہ اسے کبھی نہیں سمجھ سکیں گے۔ وہ باکمال منصوبہ ساز تھا۔ اس کی ذات کا بدنما حصہ ہمیشہ پوشیدہ رہا تھا۔ یہی بدنما زہرناک حصہ اسے آگے بڑھا رہا تھا۔ اس کے بغیر وہ ادھورا تھا جو درد وہ ان سب کو دے آیا تھا، وہ خود بھی اس اذیت کو محسوس کر رہا تھا۔ لیکن اسے ماضی کو دفن کرنا ہوگا۔ بیس برس بھلانے پڑیں گے۔ لیکن شاید وقت لگے۔

اسے نتالی اور اس کی باتیں یاد آرہی تھیں۔ وہ خود کو مکمل طور پر تنہا اور الگ تھلگ محسوس کر رہا تھا۔ وہ سب اسے بری طرح یاد آرہے تھے۔ لیکن وہ مجبور تھا۔ اسے وہ کرنا تھا، چاہے بیس برس اور گزر جاتے...... شاید ایک دن وہ سمجھ جائیں۔ اس کو معاف کر دیں۔ فیملی اسے غلط سمجھتی رہی۔ وہ

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

کوئی اور تھا۔ ایک بات جھوٹ نہیں تھی جو کچھ ہو رہا تھا' وہ ''فیملی'' کے لیے تھا اور جو وہ کرتے جا رہا تھا، اس کا تعلق بھی فیملی سے تھا۔

لہو دھو دیتا ہے لہو کو، اسے خیال آیا۔ یہ عقیدہ تھا، کوڈ تھا، قانون تھا..... اسی کے تحت ''فیملی'' چلتی تھی۔ اس نے وہ کام کرنا ہی تھا۔ بیس برس بعد وہ وقت آ گیا تھا۔ قانون اور عقیدے کے مطابق وہ خود کو روک نہیں سکتا تھا۔ کسی قیمت پر بھی نہیں۔

یہ شکار کی تلاش کا آغاز تھا..... اب لہو کو بہنا تھا۔ یہ ''فیملی'' سے متعلق تھا۔

☆☆☆

اگلے روز کام کے دوران میں نثالی کا ذہن یکسو نہیں تھا۔ سوالات ہتھوڑے کے مانند دماغ کو کوٹ رہے تھے۔ ٹیلی اسکوپ میں جھانکتی تو گیٹ دکھائی دیتا، جس پر مارکیڈو لکھا تھا۔ وہ جان گئی تھی، اس کی زندگی ایک سراب تھا، دھوکا تھا، جھوٹ تھا..... رنگ، رس، نور، نغمہ..... سب ایک رنگین خواب تھا۔ چند روز کا بندھن بھی ہوتا ہے۔ یہاں پوری زندگی..... اور رشتہ بھی کیسا؟ باپ بیٹی کا۔ ادراک و یقین، وہم و گماں سب فانی۔

نثالی نے انٹرنیٹ پر کارمینیس کو تلاش کیا۔ وہ جگہ اسپین میں نہیں کولمبیا میں تھی۔ کولمبیا، مارکیڈو کا گھر۔ ایک لمحے میں نثالی کی دنیا بدل گئی۔ زمین بدلی، آسمان بدل گیا۔ سود و زیاں بدلا۔ کفر و ایماں بدل گیا۔ یقین گیا، اعتبار گیا۔ سرمایۂ زیست بھی ساتھ گیا۔

''فائٹ کرو۔'' ڈیڈی لڑنا سکھاتے تھے۔ اس لمحے کے لیے؟ ان حالات کے لیے؟ ماضی تو ماضی ہوتا ہے۔ یہ کیسا ماضی ہے؟ جو لمحۂ موجود میں سب کچھ لوٹ کے لے گیا۔ فیملی گئی، دوست گئے، افراد مارے گئے..... ایک جھوٹ کی حفاظت کی خاطر۔

نثالی کو خیال آیا کہ ماں کچھ جانتی ہے۔ وہ نثالی کو بتانا چاہتی ہے۔ کیا؟ تصاویر میں وہ حسین عورت کون تھی۔ روز کون تھی۔

☆☆☆

گزشتہ شب، گریگ واپس آیا تو نثالی کا چہرہ دیکھ کر ہی سمجھ گیا تھا کہ کوئی بات خرابی کی ہے۔ ''کیا بات ہے، نثالی؟''

نثالی نے اسے فوٹو پکڑا دیا۔ وہ حیرت سے دیکھتا رہا..... پھر بولا۔ ''کوئی وجہ ہو سکتی ہے۔''

''وجہ، کیسی وجہ..... انہوں نے جھوٹ بولا۔ ہم نے ساری زندگی جھوٹ کے سائے میں گزار دی۔ وہ کیا چھپاتے رہے؟ وہ ان خوفناک لوگوں کے ساتھ کیا کرتے رہے۔ آئی ایم سوری۔ میں نہیں چھپا سکتی۔ مجھے معلوم کرنا ہوگا۔''

''کیا معلوم کرنا ہوگا؟'' وہ بیٹھ گیا۔ ''ڈیڈی وہ نہیں تھے جو تم سمجھتی رہیں..... اب یہ ہماری زندگی ہے۔ ان کی نہیں۔ میں نہیں جانتا انہوں نے کیا کیا اور تم کیا کرنے جا رہی ہو لیکن یہ کھیل لیب کے اندر نہیں ہوگا۔ وہ خطرناک لوگ ہیں اور لیب سے باہر ہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ تمہارے ساتھ وہ ہو جو ٹینا کے ساتھ ہوا۔''

نثالی بات سمجھ گئی۔ کیا کرے گی..... کہاں جائے گی..... کس پر بھروسا کرے گی؟ لیکن تصویر نے دنیا بدل دی تھی۔ اسے اپنی خلش ختم کرنی تھی۔ گیٹ پر مارکیڈو کا مطلب، یہ صرف اس کے باپ سے متعلق نہیں تھا بلکہ وہ بھی جڑی ہوئی تھی۔ ہر دن، ہر لمس، ہر لمحہ، ہر یاد..... بیس سال سے زائد کا مضبوط بندھن۔ فیملی۔

سیکیورٹی پروگرام کے عہدیدار نثالی کو فیملی سے کبھی نہیں ملنے دیں گے۔ گریگ کی بات بھی ٹھیک تھی۔ لیب میں بیٹھ کر کچھ نہیں کیا جا سکتا لیکن نثالی کے پاس ایک آئیڈیا تھا۔

☆☆☆

''نثالی.....'' ہزاروں الفاظ تھے جو شیرن میل کرنا چاہتی تھی۔ ''پہلے میں یہ کہوں گی کہ میں تمہیں کتنا پیار کرتی ہوں اور کتنا مس کرتی ہوں۔ میں اداس ہوں کہ تم خطرات میں ہو۔ کچھ باتیں تمہیں بتانی تھیں۔ شاید وقت خود بتا دے..... ماضی تو ماضی ہے۔ تم اب ایک مختلف عورت ہو..... تمہارے ڈیڈی پتا نہیں زندہ ہیں یا نہیں۔ لیکن مجھے اتنا یقین ہے کہ میں اب ان کو کبھی نہیں دیکھ سکوں گی۔ تم ان کے بارے میں بہت زیادہ سختی سے فیصلہ مت کرنا۔ انہوں نے ہمیشہ تم سے محبت کی ہے۔ سب سے کی ہے۔ انہوں نے کوشش کی تھی کہ تم لوگ محفوظ رہو۔ راز کو راز رکھنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ انکشاف روح میں سوراخ کر دیتا ہے۔ زیادہ بہتر ہوتا ہے کہ بھلا دیا جائے۔ میں تمہیں سب کچھ بتاؤں گی۔ لاکٹ کے بارے میں بھی۔ تمہارے ڈیڈی کے بارے میں بھی۔ ہم کہاں رہ رہے ہیں، وہ بھی بتا دوں گی۔ چاہے کچھ ہو۔ نثالی آ جاؤ۔ ہم بہت یاد کرتے ہیں۔ ہمیں ساتھ رہنا چاہیے۔ میں رولز پر لعنت بھیجتی ہوں۔ ہنی، ہمارے پاس آ جاؤ۔ تمہیں ضرورت ہے کہ تمام سچ تمہارے سامنے آ جائے۔ شیرن۔''

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

اسے محسوس ہوا کہ وہ صحیح معنوں میں پہلی مرتبہ ماں کا رول ادا کررہی ہے؟ اس نے کئی بار تحریر کو پڑھا۔ پھر انگلی ''سینڈ'' کے آئی کون کی طرف بڑھائی۔ ہچکچائی اور سوچ میں پڑگئی۔

''اپنی زندگی جیو۔'' اس نے جیسے بیٹی سے کہا۔ اس نے سیکڑوں مرتبہ یہ پیغام لکھا تھا۔

''اپنی زندگی جیو۔ امید باقی ہے۔'' اس نے ڈیلیٹ کو پریس کیا اور پیغام غائب ہوگیا۔ وہ اسکرین کو گھورتی رہی۔ آنسو صاف کیے اور سر میز پر رکھ دیا۔

''OK، آئی لو یو، روز۔''

☆☆☆

یہ کبھی بھی پوری طرح واضح نہ ہوسکا کہ راب کے بارے میں خبر ایف بی آئی تک کس نے پہنچائی۔ ایف بی آئی نے بھی کبھی انفارمر کا ذکر نہیں کیا۔ حتیٰ کہ ٹرائل کے دوران بھی یہ نام راز ہی رہا۔ مقدمے کی کارروائی پبلک ریکارڈ کا حصہ ہوتی ہے۔ ثنالی نے ریکارڈ پڑھنے کی ضرورت کبھی محسوس نہیں کی تھی۔ لیکن اب صورتِ حال بدل گئی تھی۔ لہٰذا ثنالی قواعد کے مطابق حرکت پذیر ہوگئی۔ چند روز بعد اس کے سیل فون پر ایلس کا پیام موصول ہوا۔ ایلس، راب کے دوست میل کیپٹن کی سیکریٹری تھی۔

''مسٹر کیپٹن نے مجھے ہدایت کی ہے کہ آپ سے معلوم کروں کہ آپ کی ضرورت کیا ہے؟''......

''بتانا، ڈیڈی کے کیس کے بارے میں بات کرنی ہے۔''

وقت طے کرکے بعد ازاں، ثنالی پہلی فرصت میں بلند گلاس ٹاور میں پہنچ گئی۔ جہاں وکیل کا آفس تھا۔ سیکریٹری نے اسے ایک بڑے سے کمرے تک پہنچا دیا۔ ''سمجھو کہ تم اپنے گھر پر ہو...... کسی چیز کی ضرورت ہو تو کال کرنا۔ مسٹر کیپٹن کانفرنس میں ہیں۔ امید ہے جلد آجائیں گے۔'' وہ دروازہ بند کرکے چلی گئی۔

ثنالی کچھ دیر کے لیے چرمی نشست میں دھنس گئی۔ اس سے رہا نہ گیا اور وہ اٹھ کر کمرے کا جائزہ لینے لگی۔ شیلف میں موجود کتابوں سے اسے کوئی سروکار نہیں تھا۔ نہ وہ انہیں سمجھ پاتی۔ وہ دعا کررہی تھی کہ کوئی کام کا فولڈر ہاتھ آجائے۔ بیشتر فولڈرز کیبنٹ میں تھے۔ سب سے پہلے اس نے کیپٹن کی وسیع میز کا جائزہ لیا۔ جہاں چھ سات فولڈرز پڑے تھے۔ چند سائڈ ٹیبل پر تھے...... ثنالی کو اپنا مطلوبہ فولڈر میز پر ہی مل گیا جس پر ہیرالڈ اور راب کے نام لکھے تھے۔ فون پر ثنالی نے سیکریٹری سے کیس کا بہانہ کیا تھا۔

کیپٹن نے غالباً اسی خیال کے تحت پہلے ہی مذکورہ فولڈر نکال لیا تھا۔ ورنہ ثنالی کے لیے اسے تلاش کرنا دشوار ہو جاتا۔

ثنالی نے تیزی سے ورق گردانی شروع کی۔ پراسیکیوٹر نے راب کے خلاف ہر چیز کھول کر بیان کردی تھی۔ دفاعی وکیل (کیپٹن) نے بھرپور کوشش کی تھی لیکن خود موکل کی جانب سے کوئی تعاون نہ ملنے پر کیس میں رہی سہی جان بھی ختم ہوگئی تھی۔

''وکیل: تم جن معاملات میں ملوث رہے، ان کے بارے میں جھوٹ بولتے رہے، مسٹر راب؟''

راب: یس۔

وکیل: گرفتاری کے وقت تم نے ایف بی آئی اور جسٹس ڈپارٹمنٹ سے جھوٹ بولا۔ اپنے ملازمین اور فیملی سے بھی جھوٹ بولا؟''

راب: نہیں۔

وکیل: کیا کہنا چاہتے ہو؟

راب: کچھ نہیں۔

☆☆☆

ثنالی کا سینہ جلنے لگا۔ اس نے ورق پلٹے۔ وہ گواہ کا نام دیکھنا چاہتی تھی۔ جہاں اسمتھ لکھا تھا۔ نہیں معلوم کہ نام اصل تھا یا فرضی۔ اسمتھ کا بیان تھا کہ وہ بیچم ٹریڈنگ کے لیے کام کرتا ہے۔ یہ اسی اسٹریٹ کا نام تھا، جہاں راب فیملی رہتی تھی۔ بیچم ٹریڈنگ، راب کمپنی تھی۔ آگے نارڈوزی، اسمتھ سے سوال جواب کررہا تھا۔

نارڈوزی: مسٹر اسمتھ، بیچم میں تم کیا کام کرتے تھے؟

گواہ: اکاؤنٹنگ، کیش کا لین دین۔ ٹریڈنگ کنٹریکٹ۔

نارڈوزی: تم ''پاز'' کے ساتھ بھی لین دین کرتے تھے؟

گواہ: یس۔ (ثنالی سمجھ گئی اسمتھ کون ہے)

نارڈوزی: اور آرگوٹ کی رسیدیں؟

گواہ: یس۔ اور ادائیگی بھی۔

نارڈوزی: کسی وقت تم نے آرگوٹ کی رسیدوں پر شکوک کا اظہار کیا؟

گواہ: یس سر۔ میں نے مسٹر راب کو بھی آگاہ کیا تھا لیکن انہوں نے اہمیت نہیں دی۔

نارڈوزی: مطلب زائد کمیشن کو؟

گواہ: یس سر، اور عام اشیا آف شور بھیجی جارہی

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

تھیں۔

نارڈوزی: آف شور؟

گواہ: کے مین، ٹرینی ڈاڈ، میکسیکو..... لیکن میں آگاہ تھا کہ وہ کہاں جا رہی ہیں۔ میں نے مسٹر راب کو بتایا..... متعدد بار۔ لیکن انہوں نے ہر بار کوئی نہ کوئی بہانہ کر کے مجھے ٹال دیا۔ میں جانتا تھا کہ کن لوگوں سے ڈیلنگ ہو رہی ہے اور پیسا کہاں سے آ رہا ہے۔ میں اکاؤنٹنٹ ہوں لیکن احمق نہیں۔

نارڈوزی: پھر تم نے کیا کیا؟

گواہ: میں نے ایف بی آئی سے رابطہ کیا۔

☆☆☆

وہ ایک بھاری بھر کم آدمی تھا۔ آفس بلڈنگ سے نکلتے ہی اسٹریٹ نمبر 33 پر نتالی نے اسے جالیا۔

''ہاورڈ؟''

ہاورڈ کرٹز مین چونک اٹھا۔ اس نے راب کے ساتھ بیس سال کام کیا تھا۔ اسے تلاش کرنا دشوار نہ تھا۔ نتالی اسے بچپن سے دیکھتی آئی تھی۔ نتالی نے بیٹسی سے معلوم کر لیا تھا کہ ہاورڈ ایک ٹوائے کمپنی میں ملازم ہے۔

''نتالی'' وہ نروس دکھائی دیا۔ ''کیسی ہو تم؟''

''یہ پوچھنے کی بات ہے..... کیسا ہونا چاہیے؟''

''میں سمجھا نہیں۔''

''تم نے ڈیڈی کے خلاف جو گواہی دی ہے، وہ میں پڑھ چکی ہوں۔''

''نتالی، ایک سال گزر گیا۔'' اس نے سر کھجایا۔

''میں جانتی تھی کہ گواہی دینے والے تم ہو گے۔''

''مجھے ایف بی آئی نے گھیرا تھا۔''

''تم ہماری فیملی کے مانند تھے۔ تمہیں دکھ نہیں ہوا۔''

''میرے پاس چوائس نہیں تھی۔ وہ کسی اور کو استعمال کر لیتے۔''

نتالی نے محسوس کیا کہ وہ گھبرایا ہوا ہے۔

''آئی ایم سوری..... تمہیں وہ نہیں پڑھنا چاہیے تھا..... اور دیکھو میری اپنی لائف ہے، مجھے.....''

''اور ہماری لائف کہاں گئی؟''

''تمہیں یہاں نہیں آنا چاہیے تھا، انہوں نے غلط کیا تھا۔ میں مجبور تھا مجھے جانے دو۔ مجھے اکیلا چھوڑ دو، پلیز۔''

☆☆☆

سیکیورٹی پروگرام کا ایجنٹ اپنی جگہ پر تھا۔ نتالی کشتی رانی میں مصروف تھی۔ اس مرتبہ وہاں ایک بوٹ بھی نظر آ رہی تھی۔ نتالی نے ایسا راستہ اپنایا کہ بوٹ سے فاصلے پر رہے۔ ٹانگیں مخصوص جگہ پر جما کر اس نے چپو چلانے شروع کیے۔ ساتھ ہی وہ ہاورڈ کے بارے میں سوچ رہی تھی کہ وہ اتنا پریشان کیوں تھا۔ نتالی کو یقین تھا کہ وہ کچھ چھپا رہا تھا۔ کسی نے اس پر دباؤ ڈالا تھا کہ وہ ایف بی آئی کے پاس جائے۔ سیکیورٹی پروگرام والے بھی پوری طرح نہیں کھل رہے تھے۔

آج ہوا اور بہاؤ میں تیزی تھی۔ وہ ایک میل کے بعد گھومی تو اچانک بوٹ پر نظر پڑی۔ جو اسی کی طرف آ رہی تھی۔ بوٹ پر کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔ ''ہے، اٹھو..... سو رہے ہو کیا؟'' وہ چیخی۔ بوٹ کئی ٹن وزنی تھی۔ رفتار بھی تیز تھی۔ نتالی نے رخ بدل کر برونکس شور کی طرف چپو چلائے۔ مڑ کر دیکھا تو بوٹ بھی رخ بدل چکی تھی۔ اوہ، نو..... وہ جاگ رہے ہیں۔ اس کی ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ شروع ہو گئی۔ درمیان میں سو گز کا فاصلہ تھا۔ ان کے ارادے واضح تھے۔ بوٹ سیدھی کشتی پر چڑھائی کر رہی تھی۔ نتالی کا گارڈ روئز بوٹ کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا۔ دہشت نے نتالی کو مفلوج کر دیا۔ بوٹ نے نتالی کی فائبر گلاس سے بنی چھوٹی سی کشتی کے پرخچے اُڑا دینے تھے۔ بوٹ اتنے قریب آ گئی تھی کہ نتالی نے کیبن میں موجود دو آدمیوں کو دیکھ لیا۔ ایک نتالی کو گھور رہا تھا۔ نتالی کی امیدوں نے دم توڑ دیا۔ چند سیکنڈ کی دیر تھی۔ وہ سانس روکے پھٹی پھٹی آنکھوں سے بوٹ کو دیکھ رہی تھی۔ پانچ سیکنڈ..... چار..... تین..... آخری لمحات میں کشتی پر چھائے ہوئے بوٹ کے مہیب جثے نے ذرا زاویہ بدلا تھا۔ تند لہر بلند ہوئی اور نتالی کی چیخ نکل گئی۔ خوفناک آوازیں سنائی دیں۔ اس کا ایک چپو بھی ٹوٹ گیا۔ بوٹ قریب سے گزری اور گھومی۔

''اوہ گاڈ.....'' اگلی ساعت میں وہ پانی کے اندر تھی۔ پانی سرد اور دھندلا تھا۔ اسے لگا جیسے وہ کنکریٹ سے ٹکرائی ہو۔ دریا کا یخ پانی پھیپھڑوں میں گیا۔ اس نے اوپر جانے کے لیے ہاتھ پاؤں مارے۔ رخ بوٹ کی طرف تھا۔ معاً اسے احساس ہوا کہ بوٹ والے تو قاتل ہیں۔ وہ اس جانب نہیں ابھر سکتی تھی۔ جسم کے ہر خلیے میں دہشت سا گئی تھی۔ سیزر کک کے ذریعے اس نے انڈر واٹر تیرنا شروع کیا۔ وہ زندگی کے لیے لڑ رہی تھی۔ اسے سمت کا اندازہ نہیں تھا۔ پھیپھڑوں کی بچی کچھی آکسیجن ختم ہونے لگی۔ پھیپھڑوں میں آگ لگی ہوئی تھی۔ نتالی نے اوپر کا رخ کیا۔ سطح آب پر آتے ہی اسے کچھ سجھائی نہ دیا۔ اعصاب اور دماغ غیر

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

متوازن تھے۔ اس نے گہرے گہرے سانس لیے۔ کھانسی بھی آرہی تھی۔

اس نے ادھر اُدھر دیکھا۔ لانچ بوٹ نظر میں آگئی۔ وہ اس کی الٹی ہوئی کشتی کے گرد چکر لگا رہی تھی۔ کشتی کے دو ٹکڑے ہو گئے تھے۔ نٹالی حیران تھی کہ بوٹ وہاں کیوں گردش کررہی ہے۔ معاً اس کی نظر کالی چوٹی والے پر پڑی۔ وہ بغور اسے تک رہا تھا۔ نٹالی نے فوراً ڈبکی لگا دی۔ اتفاق سے وہ برونکس شور کے قریب ابھری تھی۔ وہ اندر ہی اندر انداز ے سے برونکس کی ساحلی پٹی کی طرف تیر رہی تھی۔ اس کے پھیپھڑے ہوا سے بھرے تھے...... ساحل تک پہنچنے میں اسے زیادہ دشواری نہیں ہوئی۔ اس نے صرف سر باہر نکالا اور بوٹ کی جانب دیکھا۔ بوٹ پوری رفتار سے مخالف سمت میں جارہی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ غائب ہوگئی۔ اس نے ریت پر الٹی کی اور لیٹ کر ہانپنے لگی۔ دماغ نے کام کرنا شروع کیا۔ اگرچہ جسم ٹھٹھرا جارہا تھا۔ آخری لمحات میں بوٹ نے معمولی سا زاویہ کیوں تبدیل کیا؟ اور وہ واپس کیوں چلے گئے؟ بصورت دیگر اس کی موت یقینی تھی۔ سامنے کی بات تھی۔ وہ نٹالی کو واضح وارننگ دے گئے تھے۔ شاید یہ پہلی اور آخری وارننگ تھی۔

☆☆☆

گریگ نے مرہم پٹی کر کے اسے گھر میں محدود کر دیا۔ پولیس کے مطابق بوٹ ایک روز قبل سٹی آئی لینڈ سے چوری ہوئی تھی۔ جو بعد میں ایسٹ ریور پر خالی ملی تھی۔ سیاہ چوٹی والے کی نگاہ اس کے ذہن میں نقش تھی۔ نظروں کا پیغام واضح تھا۔ او کے، تم جیتیں...... فی الحال......

اگر وہ اس تک پہنچ سکتے ہیں تو فیملی تک بلکہ کہیں بھی پہنچ سکتے ہیں۔ سیکیورٹی پروگرام کے مقابلے میں ان کا پلہ اب تک بھاری تھا۔ سیکیورٹی پروگرام کی رہی سہی ساکھ بھی بوٹ والے واقعے کے بعد بے معنی ہوگئی تھی۔

ڈاکٹروں نے ویلیم بھی دی تھی۔ اس لیے وہ شام تک بیدار ہوئی۔ اس واقعے نے اسے سر سے پیر تک ہلا کے رکھ دیا تھا بظاہر وہ بہتر حالت میں تھی۔ ایک سال میں جو خطوط، ای میلز وغیرہ اسے ملی تھیں۔ ان کو وہ اکارڈین کے ڈبے میں بھرتی رہی تھی۔ نٹالی نے انہیں کسی خاص خیال کے تحت محفوظ نہیں کیا تھا لیکن اب اسے خیال آرہا تھا کہ کیا ان پیغامات، کارڈز، ای میلز وغیرہ میں کوئی کام کا نکتہ دریافت کیا جاسکتا ہے، پہلے اس نے کبھی اس طرح نہیں سوچا تھا۔

کچھ دیر بعد اس نے اپنی مہم کا آغاز کیا۔ جسٹن اپنی بوٹ کے بارے میں لکھتا تھا۔ مام اکثر سرما اور برسات کے بارے میں لکھتی تھیں۔ کیا یہ ممکن ہے کہ وہ لوگ شمالی کیلی فورنیا میں ہوں۔ یا شمال مغربی ساحل پر۔ اگر وہ صحیح رخ پر سوچ رہی ہے پھر بھی یہ بہت بڑا علاقہ تھا۔

اسے ان کے نئے نام بھی نہیں معلوم تھے...... ایک سال بعد مندرجات میں تبدیلی آنا شروع ہوئی تھی۔ مارگریٹ نے وعدہ کیا تھا کہ وہ نئی سہولتیں فراہم کرے گی۔ جسٹن نے نئے دوست بنالیے تھے۔

ایملی، ڈیڈی اور اسکواش میں الجھی ہوئی تھی۔ مام گارڈن کلب میں مصروف ہوگئی تھیں۔ پھر جسٹن نے دوست کے ساتھ مل کر تہ خانے میں میوزک اسٹوڈیو بنالیا تھا۔ ایملی نے بوائے فرینڈز بنالیے تھے۔ پھر نٹالی اس پیغام پر پہنچی جہاں مام نے پہلی بار ایملی کو تنہا کنسرٹ پر جانے کی اجازت دی تھی۔

''3EB'' ایملی نے بینڈ کا نام رکھا تھا اور کچھ باتیں لکھی تھیں۔ ترجمہ کی ضرورت نہیں تھی۔ تھرڈ آئی بلائنڈ۔ نٹالی نے مسکراتے ہوئے دوبارہ پڑھا۔ اچانک اس کی مسکراہٹ معدوم ہوگئی۔ تھرڈ آئی بلائنڈ۔ نٹالی اٹھ کر کمپیوٹر پر آئی اور ''بینڈ'' کا نام گوگل کیا۔

چند سیکنڈ میں میوزیکل بینڈ کی ویب سائٹ اسکرین پر آگئی۔ نٹالی نے سائٹ پر 'نیوز' کے لنک کو کلک کیا جس پر ایک اور لنک ''ریسنٹ سمر ٹورز'' کے نام سے سامنے آیا۔ جون، دو، تین اور چودہ کو بینڈ نے لاس اینجلس میں پرفارم کیا تھا۔ جون، 6۔ سان فرانسسکو...... نو اور دس کو سیٹل، واشنگٹن، گروپ لیمو پر بائی روڈ نکلا تھا اور لیمو پر واپس آیا۔ وہ بوٹ بھی استعمال کر سکتے تھے۔ نٹالی نے حاصل کردہ معلومات کی روشنی میں معما حل کیا۔ انہیں سان فرانسسکو یا پھر سیٹل میں ہونا چاہیے تھا۔ لیکن وہ اتنا علاقہ مزید محدود کیسے کرے؟ ان شہروں میں لاکھوں لوگ آباد تھے۔ بھوسے میں سوئی تلاش کرنے والی بات تھی۔ معاً اسے اپنے نئے گارڈ اولیوا کا خیال آیا۔ جس نے کہا تھا۔ آئندہ جہاں تم جاؤ گی میں بھی جاؤں گا۔ شاپنگ کے لیے، جاگنگ کے لیے، دریا پر...... ہر جگہ۔ دوسرے گریگ اسے کہیں نہیں جانے دے گا۔ اس نے کھڑکی میں سے دیکھا۔ نیچے سڑک پر اولیوا کی گاڑی کھڑی تھی۔ اولیوا سے جان چھڑانا ناگزیر تھا...... کسی بھی طرح۔

نٹالی، فرگو کے پاس آئی۔ وہ اپنی تھوتھنی اس کے گھٹنے سے رگڑنے لگا۔ ''سوری بے بی۔'' نٹالی نے اس کے کانوں

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

کو سہلایا۔ ”گریگ مجھ پر ناراض ہوگا لیکن مجھے چند روز کے لیے جانا پڑے گا۔“

نٹالی کے پاس جتنی بھی خط و کتابت تھی، ان میں فیملی نے اپنے نام جسٹن، ایملی اور شیرن استعمال کیے تھے لیکن وہ کہاں کس نام سے رہ رہے تھے، نٹالی نہیں جانتی تھی۔ گویا بھوسے میں جو سوئی تھی، وہ اس کی جسامت اور شکل سے بھی ناواقف تھی۔

☆☆☆

پینسلوینیا ایونیو پر ایف بی آئی کے ہیڈ کوارٹر میں فل کیویٹی بارہا آیا تھا لیکن فلور نمبر 10 وہاں کبھی نہیں۔ اس نے ایلیویٹر سے باہر قدم رکھا۔ اس کا باس اور ایف بی آئی کا رابطہ افسر ہمراہ تھے۔ رات کے دس بجے تھے۔

بلاوا اور وقت دونوں کیویٹی کے لیے پریشان کن تھے۔ دروازے پر سیکیورٹی گارڈز کے اٹھتے قدم، ایف بی آئی افسر کے سر کی جنبش پر تھم گئے۔ تینوں نے ہال میں آگے بڑھنا شروع کیا۔ متعدد جگہ ورک اسٹیشن نصب تھے...... شیشے کے دفاتر بنے ہوئے تھے۔ کارنر آفس کا در کھلا ہوا تھا۔ کیویٹی نے ٹائی درست کی۔ دروازے کی تحریر پڑھی۔ ڈپٹی ڈائریکٹر، نارکوٹکس اینڈ آرگنائزڈ کرائم۔

میز کی ٹاپ شیشے کی تھی۔ عقب میں ٹیڈ کمنگ فون پر بات کر رہا تھا۔ اس کی ٹائی ڈھیلی تھی اور تاثرات ناخوشگوار تھے۔ اس نے ہاتھ کے اشارے سے تینوں کو بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ کیویٹی اور اس کا باس کمنگ کے بالمقابل بیٹھ گئے۔ دفتر کافی بڑا تھا۔ کاؤچ پر کوئی پہلے سے بیٹھا تھا۔ ایف بی آئی کے آدمی نے دروازہ بند کر دیا۔

کاؤچ پر موجود شخص کا نام ہال روش تھا۔ وہ امریکی اسسٹنٹ اٹارنی جنرل تھا۔ کیویٹی کے باس کال وہائٹ نے کیویٹی کا تعارف ہال روش سے کرایا۔

”آل رائٹ، دوستو۔“ ڈپٹی ڈائریکٹر فون بند کر کے چرمی نشست میں دھنس گیا۔ اس نے ایک لفافے میں سے فوٹو نکال کر میز پر پھیلا دیے۔ وہ مارگریٹ پر تشدد اور اس کے قتل کی تصاویر تھیں۔

”کال، مجھے یقین ہے کہ تم تصاویر پہچانتے ہو...... یہ بھی جانتے ہو کہ وہ کس کس کے لیے کام کرتی تھی؟“

کال وہائٹ نے گلا صاف کیا اور کیویٹی کی جانب دیکھا۔ ”فل......“ کیویٹی کو یاد کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ ہاں وہ اتنا جانتا تھا کہ اگلے چند منٹ میں وہ جو کچھ کہے گا وہ اس کے کیریئر کے لیے فیصلہ کن بھی ثابت ہو سکتا ہے۔

”فرینک جیعزیلی، کارکی شیاڈو، رامن کوئیٹورو“ ڈپٹی ڈائریکٹر نے آنکھیں بند کر کے بدمزدگی سے سر ہلایا۔ کیویٹی نے ہونٹوں پر زبان پھیری۔ سانس روک کر خارج کی۔ ”بیچلر نمبر ون۔“ اس نے کوڈ نیم استعمال کیا۔ کوڈ سے ہر کوئی واقف تھا۔ اصل نام لینے سے درجہ حرارت بڑھنے کا خدشہ تھا، کشادہ کمرے میں خاموشی تھی۔ ہر ایک کیویٹی کو دیکھ رہا تھا۔ ڈپٹی ڈائریکٹر نے کمنگ اور پھر اسسٹنٹ اٹارنی کی طرف دیکھا۔ ”بیچلر نمبر ون...... کیوٹ...... بیچلر نمبر ون کا کیس بھی مارگریٹ کے پاس تھا۔ ”بیچلر نمبر ون“ یو ایس کسٹڈی پروگرام کا سب سے اہم انفارمر تھا جس نے مارکیڈو فیملی کے ان گنت کارندوں کو ٹھکانے لگوایا تھا۔ یہ سلسلہ برسوں سے جاری تھا۔ بیچلر نمبر ون، گرین زون میں تھا۔

اگر مارگریٹ کو قتل کرنے والے نے بیچلر نمبر ون کے بارے میں معلومات اگلوالی تھیں تو دونوں کا تصادم لازم تھا۔ قاتل بظاہر راب تھا۔ جو خود بھی گرین زون سے غائب تھا۔

”ہمیں نہیں معلوم۔“ اٹارنی جنرل نے کہا۔ ”لیکن ہم خطرہ مول نہیں لے سکتے۔“

”ہاں، ہم یقین سے نہیں کہہ سکتے کہ قاتل نے مارگریٹ سے کیا معلوم کیا ہے؟“ کال وہائٹ نے مجبوراً کہا۔

”گڈ۔“ سیکیورٹی پروگرام کے ہیڈ نے سر ہلایا۔ ”یہاں ہم تینوں کو فیصلہ کرنا ہے کہ پروگرام کو مزید نقصان پہنچنے سے قبل دونوں کو ’بلیو زون‘ میں بھیج دیا جائے۔ کوئی اعتراض؟“

سب خاموش رہے۔

☆☆☆

یو ایس مارشل، فریڈی اولیوا کو سیکیورٹی پروگرام سے وابستگی کو چھ سال ہو چکے تھے۔ اسے ایف بی آئی کے ساتھ کام کرنا پسند تھا۔ بے بی سٹنگ، گارڈ یا اس قسم کی ڈیوٹیاں اسے مجبوراً کرنا پڑتی تھیں۔ دریا والے واقعے کے بعد اسے حسینہ کے سرہانے بیٹھنے کی ڈیوٹی ملی تھی۔ کوئی اور زیرِ تربیت بھی یہ کام کر سکتا تھا۔ چوکیداری۔ بہرحال راب کے ہاتھ آتے ہی یہ معاملہ ختم ہو جانا تھا جس کے بعد اولیوا واپس اپنی ریگولر جاب پر آ جاتا۔ اسے یقین تھا کہ جلد ہی راب کوئی غلطی کرے گا اور پکڑا جائے گا۔

”اولیوا۔“ اس کے ائرپیس میں آواز آئی۔ ”بے بی نیچے آ رہی ہے۔“ بے بی تیئس سالہ حسینہ تھی جس کے ساتھ

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

ایک کتا تھا۔

''ٹھیک ہے۔ بے بی کے ساتھ بوبی بھی ہے۔'' سارا دن گاڑی میں بیٹھنا کچھ آسان نہ تھا۔ اس کی بوریت بڑھتی جا رہی تھی۔ جسم اکڑ جاتا تھا۔ ہاتھ پیر ہلانے کا موقع کم ہی ملتا تھا۔ اس نے انگڑائی لے کر بدن کھولا۔

وہ سیدھی اولیوا کی جانب آئی۔ ''چلیں۔'' ثنالی نے چست جین، بنیان اور جیکٹ پہنی ہوئی تھی۔

''چلیے، کیا کر سکتے ہیں۔'' اگر بائیولوجی ٹیچر ایسی ہوتی ہے تو وہ اپنا شعبہ بدل کر زیادہ وقت لیب میں گزارتا۔ اولیوا نے فرگو کی جانب اشارہ کیا۔ جو قریب ہی کھمبے کے گرد گھوم رہا تھا ''ہاں، بس ایک منٹ۔'' وہ مسکرائی۔ فرگو نے کوئی اسپاٹ منتخب کر لیا تھا۔ اولیوا کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے ایک ٹانگ اٹھا کر دھار ماری۔

''یہ مجھے کیوں دیکھ رہا ہے؟'' اولیوا نے منہ بنایا۔

''شاید شرما رہا ہے۔'' ثنالی نے مسکرا کر جواب دیا۔

''ہائے، قربان جاؤں...... میں منہ اُدھر کر لیتا ہوں۔'' وہ گاڑی سے نکل آیا۔ فرگو فارغ ہوا تو ثنالی ایک طرف چل پڑی۔ کچھ دور جا کر وہ مارکیٹ کے سامنے رکی۔

''اعتراض نہ ہو تو ٹوتھ پیسٹ خرید لاؤں؟'' ثنالی نے شرارتی نظروں سے اسے دیکھا۔

''پانچ منٹ، تم جانتی ہو۔''

''او کے۔''

اولیوا ہٹ کر ایک گاڑی سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا۔ اپنا ریوالور چیک کیا اور مارکیٹ کو تکنے لگا۔ شفٹ تبدیل ہونے میں بیس منٹ رہ گئے تھے۔ پھر وہ بارہ گھنٹے کے لیے فارغ تھا۔

اس کی توجہ ان بچوں کی طرف مبذول ہو گئی جو فٹ بال کھیلتے ہوئے دھیرے دھیرے اسی کی طرف آ رہے تھے۔ ایک بچہ خاصا اناڑی تھا۔ اولیوا کو بے چیسٹر کے اپنے پرانے دن یاد آ گئے۔ وہ اپنے اسکول کی ٹیم میں تھا۔ اس کی ڈربلنگ خاصی متاثر کن تھی۔ اس نے ایک نظر مارکیٹ پر ڈالی۔ بے بی ہر برانڈ چیک کر رہی ہے؟ پانچ منٹ گزر گئے تھے۔ وہ اسے زیادہ تنگ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ چند دن کے لیے ہی سہی۔ اس کے ساتھ بات کرنا، اسے دیکھنا...... بہت خوب تھا۔ اس نے پھر بچوں کی طرف دیکھا۔ دس منٹ ختم ہونے سے پہلے اسے بے چینی شروع ہو گئی۔ محض ایک ٹیوب خریدنے کے لیے...... اتنا وقت...... کچھ گڑبڑ ہے؟ وہ گاڑی سے ہٹ گیا اور ریڈیو میں کہا۔ ''فنچ، میں مارکیٹ میں جا رہا ہوں۔ مجھے کچھ اچھا نہیں لگ رہا۔''

وہ جیسے ہی مارکیٹ میں گھسا، نظر فرگو پر پڑی۔ جو ایک طرف اطمینان سے بیٹھا تھا۔ اولیوا نے سکون کا سانس لیا۔ وہ قریب ہی ہو گی، اس نے سوچا۔ پھر اس کی نظر فرگو کے کالر میں پھنسے اخبار پر پڑی۔ اس نے اخبار نکال کر کھولنا شروع کیا۔ اس کا تمام جسم جیسے یک دم پلپلا ہو گیا۔ اخبار پر ایک جگہ لکھا تھا۔

''ڈیئر اولیوا، فرگو واپسی پر ایک بار پھر پیشاب کرے گا۔ خیال رکھنا۔ گریگ کی واپسی چھ بجے کے قریب ہو گی۔'' اولیوا نے اخبار کا گولا بنا کر اچھالا اور کاؤنٹر کی طرف دوڑا۔ پھر پہلی منزل پر گیا۔ واپس نیچے آیا۔ وہ دیوانوں کے مانند یہاں وہاں بھاگ رہا تھا۔ بعدازاں وہ عقبی راہ سے گلی میں نکل آیا۔ گلی خالی پڑی تھی۔ ایک بچہ کریٹ اور بکس اوپر تلے جما رہا تھا۔

''وہ کہاں غائب ہو گئی؟''

آئی پیڈ کا پیس کان سے نکال کر بچے نے سوال کیا۔

''کون کہاں گئی؟''

وہ اب کیا وضاحت پیش کرے گا۔ کوئی اس لڑکی کو مارنے کی کوشش کر رہا تھا، اس کے باپ نے ایک ساتھی ایجنٹ کو قتل کر دیا تھا اور اب وہ خود غائب تھی۔ اس نے ہتھیلی دیوار پر ماری۔

''ڈیئر بے بی، مجھے کس جرم میں پھنسا گئی ہو؟''

☆☆☆

بفیلو سے پرے آرچرڈ پارک، نیو یارک میں درختوں کی قطار کے ساتھ وہ گھر اسٹریٹ کے درمیان میں تھا۔ لوئیس نے اپنی سیاہ رنگ کی کار ایک مناسب جگہ پر روک دی۔ اس نے دوربین اٹھائی، جس میں نائٹ ویژن لینسز لگے تھے۔ اس گھر کے قریب سڑک کے دوسری جانب ایک فورڈ کھڑی تھی۔ اندر دو افراد کی شبیہ نظر آ رہی تھی۔ ایک اسٹیئرنگ وہیل پر شاید اونگھ رہا تھا۔ دوسرا سگریٹ نوشی میں مصروف تھا۔ لوئیس نے پورے بلاک کا ایکسرے کیا۔ سڑک پر کوئی گاڑی نہیں تھی۔ اگر کوئی گاڑی خالی کھڑی ہوتی...... وین، بس...... کچھ بھی، پھر بھی لوئیس اس امکان کو نظرانداز نہیں کر سکتا تھا کہ کتنے ایجنٹ گاڑیوں کی آڑ میں چھپے ہیں۔ بعدازاں اس نے چھتوں کا جائزہ لیا۔

ایک لانڈری ٹرک پڑوس میں آ کر رکا۔ ڈلیوری مین نے کپڑوں کا بنڈل نکالا اور جا کر بیل بجائی۔ ایک بار ٹھیک ہے۔ اگر یہ ٹرک دوسری بار ظاہر ہوا تو مشکوک ہو گا۔ شکاگو

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

کے مانند، جہاں پُرکشش فیڈرل ایجنٹ اس کے ہاتھوں ماری گئی تھی۔ وہ بہت سخت جان تھی۔ لوئیس نے اپنی مہارت اور ظلم کی انتہا کر دی۔ بالآخر وہ مطلب کی معلومات حاصل کرنے میں کامیاب رہا تھا۔ اسی کے بل پر وہ یہاں تک پہنچ پایا تھا۔

ٹرک ڈیلیوری دے کر جا چکا تھا۔ کچھ دیر بعد اس کے مطلوبہ گھر کے گیراج کا دروازہ کھلا۔ ایک درمیانی عمر کی عورت نمودار ہوئی۔ اس نے کُتّے کی رسی پکڑی ہوئی تھی۔ وہ کوڑا گاربیج بن میں ڈال رہی تھی۔ فورڈ میں سے ایک آدمی اترا اور سڑک کراس کر کے عورت کے پاس چلا گیا۔ کچھ دیر بات کر کے وہ واپس آ گیا۔ خوش شکل عورت اندرونی سمت میں غائب ہو گئی۔ دونوں آدمی دشواری پیدا کر سکتے تھے۔ تاہم لوئیس دو چار مسلح افراد سے پہلے بھی نمٹتا آیا تھا۔ فرید رنیدا۔

یہی لکھا تھا تقدیر میں۔ فیصلہ پہلے ہی ہو چکا تھا۔ اب اسے انتظار اور موقع تلاش کرنا تھا۔ اخبار میں لپٹا سگ نو ملی میٹر ساتھ رکھا تھا۔ عجلت نہیں۔ اگلی بار وہ یہ کام کر دے گا۔

☆☆☆

ٹیکسی نے نتالی کو مل ویلی، کیلی فورنیا پر اتار دیا۔ نتالی نے عمارت کے گلاس ڈور پر نمبر چیک کیا اور ٹیکسی والے کو رخصت کر دیا۔ اولیوا کو غچا دینے کے بعد وہ سیدھی ائرپورٹ پہنچی تھی......

کیلی فورنیا میں اس نے قصداً کار ہائر نہیں کی تھی۔ نتالی نے نام پڑھا۔ گولڈن گیٹ اسکواش۔ یہ چوتھی لوکیشن تھی۔ کل اس نے پالو آلٹو اور سان جوز پر قسمت آزمائی تھی۔ پرسوں بے برج اور برکلے کے اسپورٹس سینٹر کو ٹرائی کیا تھا۔ یہاں گولڈن گیٹ کے علاوہ ابھی تین کلب اور دیکھنے تھے۔ اس کے بعد سلسلہ اختتام پذیر نہیں ہوتا۔ وہ امید و بیم کی کیفیت میں تھی۔

گریگ کے لیے اس نے جو نوٹ چھوڑا تھا، اس میں دلی معذرت اور محبت کا اظہار کرتے ہوئے اپنی مجبوری بتائی تھی۔ اسے توقع تھی کہ گریگ تکلیف تو محسوس کرے گا۔ تاہم اس کی بات سمجھ جائے گا۔ وہ اسے بالکل ہی اندھیرے میں رکھنے کی متحمل نہیں ہو سکتی تھی۔ وہ اس کا شوہر تھا۔ دوست تھا۔ دنیا میں سب سے زیادہ وہ اسی پر بھروسا کرتی تھی۔

نتالی نے اسکواش کلب میں قدم رکھا۔ اسکواش کی مخصوص چھوٹی گیند کے دیواروں سے ٹکرانے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ وہاں متعدد گلاس کورٹس تھے۔ بیشتر کھلاڑی کورٹس میں تھے۔ اسکواش شرٹ میں ملبوس سرخ بالوں والا ایک آدمی فرنٹ ڈیسک کے پیچھے موجود تھا۔

''معاف کریں، مجھے کسی کی تلاش ہے...... آپ مدد کریں گے؟''

''ضرور، فرمائیے؟''

نتالی نے اسے ایملی کا فوٹو دکھایا اور اس کے بارے میں بتایا۔

''معذرت خواہ ہوں۔ میں نے کبھی اس کھلاڑی کو نہیں دیکھا۔ کم از کم اس کلب میں یا آس پاس۔ تم برکلے کو چیک کرو۔''

''میں کر چکی ہوں۔'' نتالی نے مایوسی سے کہا۔ ''بہت شکریہ۔'' نتالی نے فوٹو واپس بیگ میں رکھ لیا اگر اس کا خیال صحیح بھی ہے تو وہ کتنے کلب دیکھے گی۔ اسے اپنی حماقت کا احساس ہوا۔ وہ سائنٹسٹ تھی، سراغ رساں نہیں۔

موٹیل واپس آتے آتے اس نے ارادہ بدل دیا اور کیب ڈرائیور سے ائرپورٹ چلنے کے لیے کہا۔

☆☆☆

فل کیوبٹ صبح سات بجے کی شٹل سے واپس نیویارک پہنچا۔ اس کی منزل لوئر مین ہٹن میں ایف بی آئی ہیڈ کوارٹر تھی۔ ایک فعال اور قریبی ساتھی کی ہلاکت کافی نہیں تھی۔ اس سے بڑھ کر اس کے سبجیکٹ (راب) پر کیس ایجنٹ کے قتل کا الزام تھا۔ قیامت در قیامت۔ تمام ترونٹس سیکیورٹی پروگرام کا سب سے قیمتی مہرہ جس کی دی ہوئی اطلاعات نے اَن گنت مجرموں کو کیفرِ کردار کو پہنچایا تھا۔ وہ منشیات کی ذیل میں حکومت کا اہم ترین انفارمر تھا۔ وہ بھی زد میں تھا۔ کیوبٹ کو خود اپنا کیریئر ڈولتا دکھائی دے رہا تھا۔ وہ کڑی سے کڑی ملانے سے قاصر تھا۔ لازم نہیں تھا کہ راب پکڑا جاتا۔ بیچلر نمبر ون (کوڈ)، اسے قابو کرنا...... یہ سوچ اِک خواب کے مانند تھی۔ اس کے خیال میں بیچلر نمبر ون کو بلیوز ون میں بھیجنا بھی غلط فیصلہ تھا۔

یہ سب بھی ناکافی تھا کہ ناقابلِ یقین طور پر نتالی غائب ہو گئی۔ یہ انہونی تھی۔

نارڈوزی اور اسپیشل ایجنٹ بوتھ چوتھی منزل پر کانفرنس روم میں منتظر تھے۔

''یہ زیادہ بہتر ہے۔'' پراسیکیوٹر برہم تھا۔ کیوبٹ نے بریف کیس سے تین عدد فولڈر برآمد کیے۔ ''مجھ پر بھروسا رکھو۔'' اس نے رپورٹس سامنے رکھیں۔ وہ ڈپٹی ڈائریکٹر کا سامنا کرنے کے لیے تیار تھا۔ رپورٹس کی پیشانی پر لکھا تھا۔

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

''ناقابلِ رسائی'' ایک رپورٹ مارگریٹ سے متعلق تھی۔ دوسری بنجامن راب۔ تیسری ثنالی کے بارے میں تھی، دریا کے حادثے سے متعلق...... چند ایک جزئیات شامل نہیں تھیں۔

''ثنالی کا کیا مذاق ہے؟'' بوتھ نے کافی کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

''غائب، گون۔''

''گون؟ میں سمجھا تھا، اس کی ہمہ وقت کڑی نگرانی ہو رہی ہے۔''

''اس نے دو دن پہلے سان فرانسسکو کی فلائٹ پکڑی تھی۔ وہ اسمارٹ ہے۔ اس نے کار ہائر نہیں کی۔ ہمارے بندے ٹیکسیاں چھانتے پھر رہے ہیں۔''

''ہونہہ...... کیوبٹی، تمہارے نیلے دائرے میں ہجوم بڑھتا جا رہا ہے۔''

کیوبٹی مسکرا کر رہ گیا۔

''بہترین اندازہ کیا ہے؟'' نارڈوزی نے سوال کیا۔

''وہ کیوں بھاگی اور سان فرانسسکو کیوں گئی؟ کیا اس لیے کہ کسی نے اسے ٹارگٹ کرنے کی کوشش کی تھی؟''

''ہم محض قیاس کر سکتے ہیں کہ راب کا اس کے ساتھ رابطہ ہے۔ اس نے کوئی کال بھی نہیں کی۔ صرف ایک میسج پیغام چھوڑا ہے۔ امکان ہے کہ وہ فیملی سے ملنے کی کوشش کرے۔'' کیوبٹی نے فیڈرل ایجنٹ بوتھ کو دیکھا۔ ''تم کسی کو وہاں روانہ کرو۔''

بوتھ نے گہری سانس لی۔ ''خوب، پچھلے معمے حل ہوئے نہیں...... اب ہم لڑکی کے پیچھے بھاگنا شروع کر دیں۔ یہ نام نہاد سیکیورٹی پروگرام بند کرنے پر غور کرو۔ اس کی جگہ ڈپارٹمنٹ آف چلڈرن اینڈ فیملی بہتر رہے گا۔''

''مجھے واقعی تشویش ہے۔'' کیوبٹی نے کہا۔

نارڈوزی نے اکتاہٹ سے کہا۔ ''کیوبٹی، وہ کیا بات ہے جو تم نہیں بتا رہے ہو؟ ہم یہاں کیوں بیٹھے ہیں؟ مجھے مقدمے سے کیوں گھسیٹا گیا؟ اور سیکیورٹی پروگرام بھی مشکوک ہو گیا، ایسا پہلی بار ہوا ہے......؟''

''مارگریٹ کیس ایجنٹ تھی۔''

بوتھ کھڑا ہو گیا۔ ''ہمیں علم ہے کہ وہ کس کس کی کیس ایجنٹ تھی...... نمبر ون اور نمبر ٹو کی بھی۔''

''نہیں، تمہیں سب کا نہیں پتا۔'' اس نے بریف کیس میں سے ضمنی رپورٹ نکالی۔ ''بیچلر نمبر ون کی بیوی کی پروٹیکشن بھی اس کے پاس تھی۔''

''یہ تو ایک ہی بات ہوئی۔'' بوتھ نے کہا۔

کیوبٹی نے شانے اچکائے۔

بوتھ نے نارڈوزی کو دیکھا۔ ''کیوبٹی، پروٹیکشن پروگرام اگر سنیما گھر ہے تو سمجھ لو کہ ہاؤس فل ہو گیا ہے۔''

☆☆☆

ثنالی کی تگ و دو جاری تھی۔ کل وہ پورٹ لینڈ اور آج سیئٹل میں تھی۔ وہ آگاہ تھی کہ امکانات معدوم ہوتے جا رہے ہیں۔ سیئٹل کلب، ریڈ منڈ، کرک لینڈ اور واشنگٹن یونیورسٹی ہر جگہ ناکامی نے اس کا استقبال کیا۔ وہ موہوم امید کے سہارے آگے بڑھ رہی تھی۔ پرو اسکواش اِن بیلی وڈ کے بعد گلی بند تھی جس کے بعد اسے واپس گھر جانا پڑتا۔ کلب میں ایک پاکستانی پروفیشنل اسکواش پلیئر کی بڑی شہرت تھی۔ اس نے گہری سانس لی اور کلب کے اندر داخل ہو گئی۔ فرنٹ ڈیسک کے عقب میں خاتون کو اس نے تصویر دکھائی۔ جواب سننے اور تصویر واپس لینے کے لیے وہ ذہنی طور پر تیار تھی۔ اس کے بعد اس نے کیوبٹی اور گریگ کو کال کر کے معافی طلب کرنی تھی اور واپسی کا راستہ پکڑنا تھا۔

خاتون تصویر دیکھ کر مسکرائی۔ ''ایملی۔ یہ ہماری بہترین کھلاڑیوں میں سے ایک ہے۔''

☆☆☆

ثنالی جدید طرز کے خوب صورت گھر کو دیکھ رہی تھی۔ پتا اور فون نمبر اس نے اسکواش کلب سے حاصل کیا تھا۔ سینے میں دل کی جگہ کوئی ساز سُر بکھیر رہا تھا...... دوسری طرف خوف اور توہمات نے بھی گھیرا ہوا تھا۔ کہیں سیکیورٹی پروگرام کے ایجنٹ آس پاس اس کی تاک میں تو نہیں ہیں۔ کہیں وہ ملاقات سے پہلے ہی زیرِ دام نہ آ جائے۔ کیا کرنا چاہیے؟ وہ فیصلہ نہیں کر پا رہی تھی۔

بالآخر ہمت کر کے اس نے فون نکالا اور لرزاں انگلیوں سے نمبر ملایا۔

ایملی نے فون اٹھایا۔ ''ہیلو؟...... ہیلو؟''

''ایم۔ بے بی...... تم لوگوں کا تھرڈ آئی بلائنڈ کا ٹور پسند آیا۔''

خاموشی...... ''ثنالی؟''

''اور کون ہو سکتا ہے، بے بی...... میری جان۔''

اچانک ایملی نے شور مچا ڈالا۔ ''وہ ثنالی ہے، ثنالی ہے......'' وہ غالباً بھاگتی ہوئی سیڑھیاں چڑھ رہی تھی۔ ''مام، جسٹن...... ثنالی کا فون ہے۔ مجھے یقین نہیں آ رہا۔ میں پاگل ہو جاؤں گی۔ نمبر کہاں سے ملا؟''

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

نائلی ہنس پڑی۔ ''کلب سے۔''
پس منظر سے مزید آوازیں ابھریں...... ''تم کہاں ہو؟''

جواب دینے کے لیے نائلی کو قوت استعمال کرنا پڑی۔ ''باہر، گھر کے سامنے!''

☆☆☆

اسے سامنے دروازے پر نہیں جانا چاہیے۔ وہ آڑ میں کھڑی ہو گئی۔ ہوسکتا ہے وہ ڈیڈی کے لیے نگرانی کر رہے ہوں۔ بہر حال ان کی موجودگی لازم تھی۔ تھوڑی دیر بعد ایملی کی آواز آئی۔ ''نائلی، دروازے سے دور رہو......'' وہ اسے بتا رہی تھی کہ اندر جانے کے لیے اس نے کیا کرنا ہے۔ فون آن رکھتے ہوئے وہ ایملی کی ہدایات پر عمل کرتے ہوئے رک رک کر عقبی سمت میں چلی گئی...... ایملی کی رہنمائی میں وہ بچتی بچاتی بالآخر گھر میں داخل ہو گئی۔

''اوہ مام۔'' اس کا رُواں رُواں خوشی سے جھوم رہا تھا۔ وہ ماں سے لپٹ گئی۔ بھائی بہن نے دونوں کے گرد گھیرا ڈال دیا۔ ان کی آوازیں، باتیں...... نائلی کو لگا کہ وہ یہ آوازیں پہلی بار سن رہی ہے۔ ماں سے جیسے سیکڑوں برس بعد مل رہی ہے۔ سب لیونگ روم میں آ کر مدھم آواز میں اپنی اپنی کہانی سنا رہے تھے...... ڈیڈی کی زندگی کا یقین ماں کو بھی نہیں تھا۔ نائلی کی طرح اس معاملے میں وہ بھی لاعلم تھیں۔

شیرن کا خیال تھا کہ نائلی نے وہاں آ کر خطرہ مول لیا تھا۔ تاہم ان کی مسرت بھی دیدنی تھی۔ نائلی نے ڈیڈی کا مارکیڈو والا مخصوص فوٹو دکھایا۔ ''ماما، اس تصویر نے ہر چیز، ہر شے بدل کر رکھ دی ہے۔'' ماں نے بازو پر ہاتھ رکھ کر نائلی کو روکا۔ ان کا اشارہ واضح تھا کہ اس موضوع پر علیحدگی میں بات کریں گے۔ وہ اٹھ کر کچن میں چلی گئیں۔ چند منٹ بعد نائلی بھی کچن میں آ گئی۔

''ہنی، تمہیں جانا پڑے گا۔ کل میں تمہیں فون کر کے بتاؤں گی کہ شہر میں ہم کہاں ملیں گے۔ مجھے تم کو کچھ باتیں بتانی ہیں۔ اس دوران میں کیویٹی کو فون کر کے بتا دوں گی کہ نائلی ہمارے پاس پہنچ گئی ہے۔ میں اس سے درخواست کروں گی کہ وہ تمہیں چند روز یہاں رہنے دے۔''

نائلی جانے پر آمادہ نہیں تھی۔ لیکن شیرن نے اُسے قائل کر لیا۔

☆☆☆

اگلی صبح نائلی اپنے ہوٹل سے دیر سے نکلی تھی، مام نے 9 بجے فون کر کے اسے دوپہر میں ارنی ریسٹورنٹ میں بلایا تھا۔ ریسٹورنٹ، مارکیٹ جیسی جگہ پر تھا جہاں ہما وقت گھما گھمی رہتی تھی۔

چند منٹ بعد ہی نائلی نے کولمبیا والا ڈیڈی کی نوجوانی کا فوٹو نکال کر میز پر رکھ دیا۔ شیرن نے فوٹو اٹھایا۔ نائلی دنگ رہ گئی۔ شیرن کے تاثرات نارمل تھے۔ حیرانگی کا کوئی عنصر نہیں تھا۔ البتہ ہلکی سی معذرت ضرور تھی۔ ''تمہیں یہ مل گیا۔'' وہ مسکرائی۔

''آپ فوٹو کے بارے میں جانتی تھیں؟'' الٹا نائلی کو حیرانگی کا سامنا تھا۔ ''یہ اسپین نہیں، کولمبیا ہے۔'' وہ کچھ تلخ ہو گئی۔

''میں جانتی ہوں تصویر کیا کہہ رہی ہے۔ یہ میں نے ہی تمہارے لیے چھوڑی تھی۔''

نائلی دنگ رہ گئی۔

''میرا یقین کرو۔ میں نے سیکڑوں مرتبہ تمہیں لکھا...... تمہیں بتانا چاہا۔ لیکن میں Send کا بٹن نہ دبا سکی۔ مجھے لگا کہ بتانے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔''

نائلی نے فوٹو اٹھا کر سامنے کر دیا۔ ''یہ میرے باپ کی تصویر ہے۔ ڈیڈی کولمبیا میں مارکیڈو کے گیٹ کے پیچھے کیا کر رہے ہیں...... ڈیڈی کون ہیں؟ ماما، ڈیڈی کون ہیں؟''

پتا نہیں کہاں سے ہوا کا جھونکا آیا؟ میز پر پلاسٹک کا گلاس لڑھکا۔ نائلی اضطراری طور پر ہاتھ بڑھا کر جھکی...... اس نے کوئی آواز نہیں سنی۔ بعد میں بھی اس نے ہزاروں بار وہ لمحہ یاد کرنے کی کوشش کی لیکن یاد کرنے میں ناکام رہی کہ کوئی آواز آئی تھی۔ بس دفعتاً تیز، شعلہ صفت چبھن اس کے کندھے میں ترازو ہوئی۔ دھکا سا لگا تھا۔ وہ تقریباً کرسی سے گر ہی چلی تھی۔ وہ صرف اتنا سمجھ سکی کہ کوئی ہولناک واقعہ ظہور پذیر ہوا ہے۔ جیکٹ پر نظر پڑی۔ کندھے کے قریب شانے پر اس میں سوراخ نظر آ رہا تھا۔ کوئی درد نہیں۔ کوئی گھبراہٹ نہیں۔ وہ سمجھ نہ سکی۔ سوراخ سے لہو پھوٹ پڑا۔ ایک سیکنڈ بعد اسے ادراک ہوا۔

''اوہ نو، گاڈ...... مام شاید مجھے گولی لگی ہے۔'' وہ بولی۔ چہرے پر ہراس نظر آیا۔

شیرن کرسی میں سیدھی بیٹھی تھی۔ لیکن اس نے نائلی کی کیفیت پر ردِعمل پیش نہیں کیا۔ اس کی عینک گر گئی تھی۔ سر سامنے کی جانب جھکا ہوا تھا۔ نگاہ سینے کی جانب ساکت اور

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

پتھرائی ہوئی تھی۔ نیلے سویٹر پر ایک دھبا نمودار ہو رہا تھا۔

''مام!''

وقت جیسے تھم گیا۔ نثالی نے شانے کے سوراخ، پھر ماں کے سویٹر پر پھیلتے سرخ دائرے کو دیکھا۔ گولی نثالی کے شانے سے صاف گزر کر شیرن کے سینے میں اتر گئی تھی۔ نثالی عالمِ دہشت میں یہ منظر دیکھ رہی تھی۔

''او نو...... مام...... او گاڈ......!!''

دوسرے فائر کی آواز بھی سنائی نہیں دی۔ کوئی عورت چیخی۔ گولی پتا نہیں کسی چیز سے ٹکرا کر غلط زاویے پر گئی۔ دھاکا ہوا اور ایک شراب کی بوتل ریزہ ریزہ ہو گئی۔ نثالی اچھل کر ماں پر گری۔ دونوں زمین بوس ہو گئیں۔ نثالی نے ماں کے بے جان جسم کو نیچے چھپایا ہوا تھا اور چیخ چیخ کے آوازیں دے رہی تھی...... ہر جانب افراتفری پھیل گئی۔ بھاگو...... نکلو...... چھپ جاؤ کی ہاہا کار میں کرا کری، میزیں اور کرسیاں الٹ پلٹ گئیں۔ بچے رو رہے تھے۔ ہنگامہ سا ہنگامہ تھا۔

نثالی سسک رہی تھی۔ مردہ ماں کے چہرے سے بال ہٹا رہی تھی۔ ''ڈیئر گاڈ......''

☆☆☆

پولیس اور ایمبولینسز پہنچ رہی تھیں۔ ایک خاتون ایمرجنسی میڈیکل ٹیکنیشن نرمی کے ساتھ شیرن کی باڈی، نثالی کی گرفت سے نکالنے کی کوشش کر رہی تھی۔ نثالی آمادہ نہیں تھی۔ اگر وہ ماں کو چھوڑ دیتی تو سانحہ حقیقت بن جاتا...... جبکہ وہ حقیقت بن چکا تھا۔ پولیس، کراؤڈ کو پیچھے ہٹا رہی تھی۔ نثالی اپنی تکلیف سے بے نیاز تھی۔ بمشکل اسے قابو کیا گیا۔ دو ٹیکنیشن اس کے شانے کی دیکھ بھال کر رہے تھے۔ شیرن کی باڈی کو اسٹریچر پر منتقل کر دیا گیا۔ سائرن کی آوازیں گونج رہی تھیں۔ نثالی کو بھی اسٹریچر پر لٹایا گیا۔ اس کا سویٹر بھی خون میں بھیگ گیا تھا اور چہرہ آنسوؤں میں...... آہ یہ ٹی وی شو نہیں ہے...... حقیقت ہے۔

ڈوبتے ذہن میں، معاً شعلہ سا لپکا۔ ایک اہم چیز رہ گئی تھی۔ ''وہ میرا فوٹو گر گیا ہے...... پلیز، وہ میرے ڈیڈی کا فوٹو ہے......''

نثالی کی آہ و زاری نے چند سیکنڈ خرید لیے۔ وینڈی نامی نرس نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ قدم بڑھا کر جھکی اور کوئی چیز اٹھا کر نثالی کے ہاتھ پر رکھ دی۔

''شکریہ۔'' نثالی کمزور آواز میں بولی۔

ڈیڈی وہاں کیوں تھے؟ جواب کون دے گا۔ ماں کو معلوم تھا...... لیکن ماں؟''

☆☆☆

نثالی واپس آ گئی تھی۔ دایاں بازو گلے میں پٹی کے ساتھ لٹکا ہوا تھا۔ دو یو ایس مارشل اس کے ہمراہ تھے۔ گولی، ہڈی چھوئے بغیر صاف گزر گئی تھی۔ ایک ہفتہ مزید اس کو ہاتھ لٹکا کر رکھنا تھا۔ دنیا بھر کی ولیم اور مارفین اس کے درد و اذیت کا مداوا نہیں کر سکتی تھیں۔ نہ کوئی شے حافظے سے اس منظر، بھیانک منظر کو مٹا سکتی تھی۔

کیا ہوتا اگر وہ وہاں نہ جاتی؟ کیا ہوتا اگر وہ گریگ کی بات مان جاتی؟ کیا ہوتا اگر وہ دریا میں بوٹ کی وارننگ کو نظر انداز نہ کرتی؟ کیا ہوتا اگر وہ گھر پر سامنے کے دروازے سے جاتی۔ کیا وہ اسے ملاقات کرنے دیتے؟ اور...... اور...... کیا ہوتا...... اگر وہ گلاس سنبھالنے کے لیے نہ جھکتی؟ کیا ہے؟ کیوں ہے؟ ہست و بود، کون جانے؟

جسٹن اور ایملی، آنٹی کے ساتھ لانگ آئی لینڈ میں تھے۔ تدفین جمعرات کو تھی۔ پھر، اس کے بعد، کیا معلوم؟ شاید یہی انجام تھا۔ ناقابلِ تلافی نقصان ہو چکا تھا۔

مارکیٹ کے مخالف ہوٹل کی چھت سے اسنائپر رائفل ملی تھی اور ایک خوفناک پیغام۔ پلاسٹک بیگ میں کٹی ہوئی زبان۔ کتے کی کٹی ہوئی زبان۔ اس مرتبہ مارکیڈو کا پیغام نمایاں اور سفاکی کا مظہر تھا۔ ''زبان کھولنے والوں کا ہم یہ حال کرتے ہیں۔''

نثالی نے آنکھیں بند کر لیں۔ ''ڈیڈی کیا کر دیا تم نے؟ کہاں ہو تم؟ کون ہو تم؟'' جیٹ وے پر دونوں ایجنٹ وہیل چیئر کے ساتھ تھے۔ گریگ ہال کے اختتام پر کھڑا تھا۔ ''نثالی...... ی......''

وہ لڑکھڑا کے اٹھی اور موم کے مانند اس کے بازوؤں میں پگھل گئی۔

''انہوں نے ہمارے ساتھ ایسا کیوں کیا؟ وہ ہم سے کیا چاہتے ہیں؟''

''میں نہیں جانتا لیکن وعدہ کرتا ہوں کہ آئندہ ایسا کچھ نہیں ہونے دوں گا۔'' اس کی آواز میں عجیب تاثر تھا، عزم تھا، جبڑے بھنچے ہوئے تھے۔

''ڈیڈی کی وجہ سے...... اور پتا بھی نہیں وہ زندہ ہیں یا......'' اس نے سسکی لی۔ ''شاید وہ اب نہیں ہیں۔''

☆☆☆

تدفین والے دن کی سوگواری حد سے سوا تھی۔ ماں کا تابوت قبر میں اتارا جا رہا تھا اور باپ غائب تھا۔ نثالی دل

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

ہی دل میں پکار رہی تھی۔ دیکھو ڈیڈی تم نے کیا کر دیا۔ آؤ دیکھو، تم آئے کیوں نہیں؟ اٹھارہ ماہ...... صرف اٹھارہ ماہ میں کیا سے کیا ہو گیا۔ ماما میں نہیں روؤں گی۔ میں ہار نہیں مانوں گی۔ میں قاتل کو تلاش کروں گی۔ میں اُن درندوں کو...... ماما...... آئی لو یو...... آپ کو کبھی بھول نہیں سکتی۔ ایک سیکنڈ کے لیے بھی نہیں، گڈ بائے۔

☆☆☆

دو ہفتے گزر گئے تھے۔ ثنالی کا زخم دھیرے دھیرے مندمل ہو گیا تھا۔ تاہم وہ لیب جانے کے موڈ میں نہیں تھی۔ وہ غصے میں تھی۔ اس کے اندر کے زخم بھرے نہیں تھے۔ ایک ڈیڑھ سال میں فیملی تباہ ہو گئی تھی۔ ماں دنیا سے چلی گئی تھی۔ باپ لاپتا تھا۔ حقائق بدل گئے تھے۔ ہر سچ جھوٹ میں تبدیل ہو گیا تھا۔

ذہنی اور جسمانی طور پر وہ بہتر ہونے لگی تو سب سے پہلے ٹینا سے ملنے گئی۔ ٹینا، ابھی بھی کوما کی گہری حالت میں تھی۔ کوما طویل المدت شکل اختیار کر گیا تھا۔ وہ مصنوعی تنفس کے ساتھ منسلک تھی...... امید کی کرن ڈوب ڈوب کے جھلملا رہی تھی۔ دماغ کے کام کرنے کی صلاحیت میں خفیف سا اضافہ ہوا تھا۔ آنکھوں کے پپوٹے کبھی کبھی مرتعش ہو جاتے۔ حتیٰ کہ بعض اوقات اس کے بدن میں بھی خفیف سی تحریک نظر آتی۔ لیکن ڈاکٹرز کا کہنا تھا کہ امکانات ففٹی ففٹی ہیں۔ اس بات میں بھی شک تھا کہ صحت یاب ہونے پر کیا وہ پوری طرح نارمل زندگی گزار سکے گی۔ دوسری طرف ایک اچھی اور حیرت انگیز خبر تھی کہ کلر پکڑا گیا تھا اور وہ ایک گینگسٹر تھا۔ پولیس کی رائے ٹھیک نکلی تھی۔ ثنالی کا اس واقعے سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ گولی چلانے والا ایک سترہ سالہ لڑکا تھا۔ اس رات نشانہ بننے والا کوئی بھی ہو سکتا تھا۔ گینگ کا نام ریڈ گیڈ تھا۔ لڑکا تحویل میں تھا۔ تفصیلات پولیس نے پوشیدہ رکھی تھیں۔ اس انکشاف نے ثنالی کے ذہن سے بوجھ کا بڑا حصہ کم کر دیا۔

وہ روز لیب میں ہوتی اور ٹینا کو بھی دیکھنے جاتی۔ وہاں بیٹھتی اور یک طرفہ باتیں کرتی رہتی۔ دھیرے دھیرے اس کی سوچ کا رخ بدل رہا تھا۔ کیا کوینٹی بھی ٹھیک سوچ رہا ہے کہ ڈیڈی نے مارگریٹ کو ختم کیا تھا اور ڈیڈی زندہ ہیں جس وقت ثنالی کو معلومات ملنے والی تھیں، عین اس وقت ماما کو مار دیا گیا۔

ہر کوئی کہہ رہا ہے کہ ماضی کو بھول جاؤں مگر کیسے؟ ایف بی آئی، ڈیڈی کی طرف کیوں متوجہ ہوئی۔ اس کا سبب ہاورڈ تھا۔ ہاں ایک آدمی ہے، جو کچھ نہ کچھ جانتا ہے۔ ہاورڈ۔

☆☆☆

''ثنالی تمہیں یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔'' ہاورڈ نے کہا۔

''ہاورڈ یہ بہت اہم ہے، پلیز......''

ہاورڈ نے گلے کے ساتھ پٹی میں لٹکا ہوا اس کا بازو دیکھا اور اسکرین ڈور کھول دیا۔ وہ ثنالی کو لیونگ روم میں لے آیا۔

''میں نے پہلے بھی تمہیں بتایا تھا کہ یہ ہم دونوں کے لیے اچھا نہیں ہے۔ میں ایک منٹ دے رہا ہوں۔ اس کے بعد تم گیراج کے راستے باہر چلی جانا۔''

''ہاورڈ میں جانتی ہوں کہ تم جانتے ہو، اصل واقعہ کیا ہے؟''

آواز سن کے ہاورڈ کی بیوی بھی آ گئی۔ اس کی نظر بھی ثنالی کے دائیں ہاتھ پر گئی۔ ''ہمیں تمہاری ماں کے بارے میں سن کر صدمہ پہنچا تھا۔ وہ اچھی خاتون تھیں۔'' ہاورڈ کی بیوی نے کہا۔ ''لیکن ثنالی وہ لوگ بہت بُرے ہیں...... خونخوار درندے ہیں۔''

''ہاورڈ۔'' ثنالی نے کہنا شروع کیا۔ ''تم لوگ جانتے ہو اور میں بھی کہ وہ بہت بُرے ہیں۔ پھر چھپنے کا فائدہ...... کیا تم سمجھتے ہو کہ وہ تمہیں بھول جائیں گے...... نہیں میری ماں مر چکی ہے۔ باپ کے لیے میرے پاس کوئی آئیڈیا نہیں ہے۔ ہاورڈ کہانی ختم نہیں ہوئی ہے۔'' ثنالی نے تصویر کا ایک فریم اٹھایا جس میں ہاورڈ، بیوی بچوں کے ساتھ موجود تھا۔ خوش و خرم فیملی۔

''یہ تمہاری فیملی ہے۔ تم سمجھتے ہو کہ تم آزاد ہو؟''

''میری طرف دیکھو۔'' ثنالی نے پٹی میں جھولتا اپنا دایاں بازو آگے کیا۔ ''تم جانتے ہو...... کسی نے دباؤ ڈالا تھا، میرے ڈیڈی کے خلاف؟ کیا تمہیں معاوضہ بھی دیا گیا تھا؟ پلیز...... تم نے کیا کیا، مجھے کوئی سروکار نہیں۔ میں صرف ڈیڈی کے بارے میں جاننا چاہتی ہوں۔''

ہاورڈ کے بھاری چہرے کے تاثرات بجھتی شمع کے مانند لرز رہے تھے۔

''ثنالی تمہیں نہیں پتا کہ تم کس دلدل میں قدم رکھ رہی ہو، تم شادی شدہ ہو، اپنی نئی زندگی کا آغاز کرو۔''

''ہاورڈ، تم نہیں سمجھ رہے۔ تم جن کو بچانے کی کوشش کر رہے ہو۔ انہوں نے مجھے بھی ہلاک کرنے کی کوشش کی

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

تھی۔‘‘

’’میں کس کو بچا رہا ہوں......‘‘ اس نے بیوی کی طرف دیکھا اور آنکھیں بند کرلیں۔

’’تم سے ملنے کے بعد ہی ہارلن ریور پر مجھ پر حملہ ہوا تھا۔ وہ ایک وارننگ تھی۔ تم سے ملنے کے بعد ہی کیوں؟ کیا کوئی ہم کو دیکھ رہا تھا؟ کیا کوئی جانتا تھا کہ میں تم سے کیا چاہتی ہوں...... معاملات ڈیڈی کی ذات کے گرد گھوم رہے ہیں۔ میں انہیں جو سمجھتی تھی۔ ڈیڈی وہ نہیں ہیں۔ ماما بتانے جارہی تھیں، لیکن...... تم...... پلیز تم مت چھپاؤ، کیوں کررہے ہو ایسا؟‘‘

’’تم نہیں سمجھ سکوگی۔ یہ پازا ایکسپورٹ یا سنہری عام اشیا کے متعلق نہیں ہے۔ ہم نے ہمیشہ گولڈ ہی فروخت کیا تھا۔ تمہارے ڈیڈی گولڈ فروخت کرتے تھے۔‘‘

’’وہاٹ؟‘‘ ثانی کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ ’’وکیل کیپٹن کے کیس فولڈر میں تو تم اور ڈیڈی ٹرائل کے دوران میں کچھ اور ہی کہہ رہے تھے؟‘‘

ہاورڈ نے چشمہ اتار دیا...... تاثرات ناقابلِ فہم تھے۔ ’’کیا تم یقین کرلوگی؟‘‘

’’کیوں نہیں......‘‘ ثانی نے اسے گھورتے ہوئے سرگوشی کی۔ وہ کیا کہنے جارہا ہے۔

’’میرے گمان میں نہ تھا کہ بعد ازاں خونریزی شروع ہوجائے گی اور شیرن...... میں تصور نہیں کرسکتا تھا کہ شیرن کو زندگی ہارنی پڑے گی...... خدا مجھے معاف کرے۔‘‘

’’آخر سچ کیا ہے؟ کوئی تو مجھے سچ بتا دے۔ تم کیوں معافی مانگ رہے ہو؟ کیا کردیا تھا تم نے؟ گواہی دی تھی نہ ڈیڈی کے خلاف...... کس نے تمہیں مجبور کیا تھا؟‘‘ وہ گھٹنوں کے بل بیٹھ گئی۔

’’سچ...... اکاؤنٹنٹ کھوکھلے انداز میں مسکرایا۔ ’’سچ وہ نہیں ہے جو تم سمجھ رہی ہو۔‘‘

’’میں کچھ نہیں سمجھ رہی۔ تم بتادو۔‘‘

’’میں راب کے ساتھ وفادار تھا۔ تمہارے ڈیڈی کے لیے کچھ بھی کرسکتا تھا اور میں نے کیا۔‘‘

’’وہاٹ؟ یہ کیسی وفاداری تھی۔ تم نے اُن کے خلاف گواہی دی اور شاید دولت کی خاطر۔ کس نے پیسے دیے تھے؟‘‘ ثانی برہم ہوگئی۔

’’کس نے دی تھی رشوت؟‘‘ وہ چیخ اٹھی۔

’’بین راب!‘‘

کوئی بھینسا پوری رفتار سے ثانی سے آکر ٹکرایا۔ ایک دنیا فنا ہوگئی۔ دوسری دنیا کے آغاز کے لیے۔ کائنات درہم برہم ہوگئی۔ کائنات صغیر...... ثانی کے اندر کی کائنات...... ستارے ٹکرا گئے۔ سورج تاریک ہوگیا۔ چاند پیلا پڑ گیا۔ دھوکا ہے کرشمۂ حیات...... وہم ہے وجودِ کائنات......

’’وہاٹ؟‘‘ ثانی کو لگا کہ اس کی آواز کنویں سے نہیں، پاتال سے آئی ہے۔

’’بین راب نے ہدایت دی تھی کہ میں ایف بی آئی کے پاس جاؤں۔ ثانی اس کام کے انہوں نے مجھے بہت پیسے دیے تھے۔‘‘ وہ رو رہا تھا۔

☆☆☆

وہ لانگ آئی لینڈ ریل روڈ کی ایک کار میں سفر کررہی تھی۔ وجود ہزاروں ٹکڑوں میں تقسیم ہوچکا تھا۔ ہاورڈ کے الفاظ دہکتے انگارے تھے جنھوں نے اس کے پورے وجود کو بھسم کردیا تھا۔ کیوں؟ کیوں؟ کیوں؟ انہوں نے خود کو اور فیملی کو تباہ کردیا۔ عزت کا جنازہ نکال دیا۔ کاروبار تباہ۔ مستقبل تباہ۔ کس کا؟ جن سے وہ محبت کرتے تھے...... یہ عقدۂ لاینحل تھا۔ وہ کیسے حل کرے۔ ڈیڈی کون تھے؟ یہ سوال اپنا قد بڑھا کر اب آسمان کو چھو رہا تھا...... دماغ ہانڈی کی طرح پک رہا تھا۔ ہر شے تہ وبالا ہوگئی تھی...... پھر لاشعور نے اپنا کام کیا۔ شعور نے لاشعور کی جگہ لے لی۔ لاشعور جواب دے رہا تھا...... یادداشت کی گہرائی میں۔

جب وہ بچی تھی۔ لاشعور نے اسے یاد دلایا۔ وہ اس کی ماما کی آواز تھی۔ برہم اور فیصلہ کن۔ ڈیڈی اور مام کسی بات پر شور کررہے تھے، کوئی تکرار تھی...... ثانی کی آنکھ بھی ان آوازوں سے کھلی تھی۔ وہ بستر سے نکل کر بالائی منزل کی سیڑھیوں پر آگئی۔ ماں باپ بلند آواز میں جھگڑ رہے تھے۔ ثانی نے ڈیڈی کو کبھی اس انداز میں شور کرتے نہیں دیکھا تھا۔

’’تم اس معاملے سے دور رہو۔‘‘ وہ چیخ رہے تھے۔ ’’تمہارا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔‘‘

’’پھر کس کا ہے۔ بتادو۔ آج فیصلہ کرلو۔ وہ نہیں، ہم تمہاری فیملی ہیں۔ تمہیں ابھی فیصلہ کرنا ہوگا۔‘‘ ماں کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

ثانی خوف سے کانپ رہی تھی۔ وہ کون تھا؟ اس کے ڈیڈی تو ایک خوش مزاج، نرم رُو، محبت کرنے والے انسان تھے۔ وہ کس بات پر لڑرہے تھے۔ وہ مشتعل تھے اور انہوں نے فیصلہ کردیا۔ انہوں نے ماما کو تھپڑ مار کر فیصلہ سنادیا...... ثانی نے منہ پر ہاتھ رکھ کر خود کو چیخنے سے روکا۔

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

☆☆☆

وہ اسٹیشن پر ٹرین سے اتری اور سڑک پر آگئی۔ وہ تنویمی کیفیت میں چل رہی تھی۔ ڈیڈی کیا چاہتے تھے، اچانک اس کی سمجھ میں آگیا تھا۔ فیصلہ تو انہوں نے ماما کو تھپڑ مار کر اسی وقت سنا دیا تھا۔ اتنے طویل عرصے بعد مارکیڈوز کے ساتھ ڈیلنگ کو انہوں نے ظاہر کر دیا تھا۔ اپنے دوست کو جیل پہنچا دیا تھا۔ محبت کرنے والی فیملی کو بدحال کر دیا تھا۔ یہ سب ایک پلان تھا لیکن کیوں؟ وہ بھی اتنے عرصے بعد...... کیا سیکیورٹی پروگرام کے ایجنٹ یہ سب کچھ جانتے تھے؟ کیا وہ ڈیڈی کی اصلیت سے واقف تھے۔ مارگریٹ کا جو حال کیا گیا تھا کیا ڈیڈی یہ کر سکتے تھے؟ کیا مارکیڈوز شروع سے مارگریٹ کی تاک میں تھے؟ ثنالی کا دماغ سوالات کا ایسا جنگل بن گیا تھا جس کے تمام اشجار ایک دوسرے میں الجھ گئے تھے۔ ڈیڈی کو اپنی زندگی برباد کرنے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ وہ پروٹیکشن تو نہیں تھی۔ ورنہ وہ سیکیورٹی پروگرام سے باہر کیوں نکلتے؟ ثنالی نے سوچنا بند کر دیا۔ اس کا دماغ سن ہو گیا تھا۔

سیل فون کی گھنٹی بجی۔ ثنالی نے دیکھا، گریگ کی کال تھی۔ اس نے جواب نہیں دیا اور چلتی رہی۔ ڈیڈی مارگریٹ سے کیا معلوم کرنا چاہتے تھے؟ اگر ڈیڈی نے مارگریٹ پر وحشیانہ ظلم کیا تو یقیناً ان کے اندر ایک خونخوار درندہ چھپا بیٹھا ہے۔ کیا اب شک کی گنجائش ہے کہ کولمبیا کے بدنام زمانہ ڈرگ ڈیلرز میں سے ایک مارکیڈو فیملی سے ڈیڈی کا کوئی تعلق نہیں ہے؟

☆☆☆

''کہاں چلی گئی تھیں؟ میں فون کرتا رہا۔'' گریگ نے سوال کیا۔ ثنالی نیم مردہ انداز میں صوفے پر ڈھیر ہو گئی۔

''ثنالی؟''

''ڈیڈی نے یہ ڈراما خود رچایا تھا...... خود جیل گئے تھے۔ انہوں نے ہاورڈ کو کوارٹر ملین ڈالر دیے تھے کہ وہ ایف بی آئی تک اطلاع پہنچا دے۔ ایف بی آئی نے کچھ نہیں کیا۔ سب کچھ منصوبہ بندی کے ساتھ ڈیڈی نے خود کیا۔''

گریگ اٹھ کے بیٹھ گیا۔ ''تم ہوش میں ہو؟''

''یہی سچ ہے۔'' ثنالی نے ہاورڈ کے بارے میں بتایا۔

''پھر اب کیوں؟ یہ سلسلہ اسی طرح جاری رہتا تو کیا مضائقہ تھا؟''

''ہاں، اس کا جواب میرے پاس نہیں ہے۔ بہرحال ڈیڈی کی فیملی ہم نہیں مارکیڈوز تھے...... کوئی بھی جیل نہیں گیا۔ وکٹر اور نہ لوئیس...... جن کے خلاف ڈیڈی نے گواہی دی تھی اور جن کی گورنمنٹ کو ضرورت تھی۔ کتنی عجیب بات ہے۔ پھر وہ خود بھی غائب ہو گئے۔ صرف اُن کا دوست ہیرالڈ پھنس گیا۔ ڈیڈی ہی میرے سب کچھ تھے۔ مجھے ان سے محبت تھی۔ گریگ، میرا دماغ کام نہیں کر رہا۔''

''تم پھر اس بھنور میں ڈوب رہی ہو۔ تم خوش قسمت تھیں کہ تمہاری زندگی بچ گئی۔ یہ لوگ حیوان ہیں۔ تم کیوں بار بار اس چکر میں الجھ جاتی ہو۔'' گریگ نے سمجھایا۔

''میں خوش قسمت نہیں ہوں۔'' وہ چلا پڑی۔ ''میں جاننا چاہتی ہوں...... تم نہیں سمجھ رہے، میری ماں کچھ بتانا چاہتی تھی۔''

☆☆☆

لانڈری ٹرک پھر وہیں تھا۔ اس مرتبہ لوئیس ٹرک میں سے برآمد ہوا۔ آٹھ بج رہے تھے۔ فورڈ اپنی جگہ کھڑی تھی۔ ٹرک اس مرتبہ سڑک کے دوسری جانب فورڈ کے قریب تھا۔ ٹرک کا نوجوان ڈرائیور سر میں گولی کھانے کے بعد لوئیس کے ہاتھوں قیدِ حیات سے آزاد ہو چکا تھا۔ لوئیس نے ایک ہاتھ میں لانڈری بیگ اٹھایا اور محتاط انداز میں فورڈ سے قریب تر ہو گیا۔ گونگا سگ نو ملی میٹر ہاتھ میں آگیا۔ پہلی گولی سگریٹ نوش ایجنٹ کی زندگی کا چراغ گل کر گئی۔ سگریٹ جل رہی تھی۔ گولی نہیں، شیشہ ٹوٹنے کی آواز نے دوسرے ایجنٹ کو الرٹ کیا۔ اس نے بیک وقت ریڈیو کی طرف اور دوسرا ہاتھ جیکٹ میں ریوالور نکالنے کے لیے بڑھایا۔ لوئیس نے دو فائر کیے اور گولیاں دوسرے ایجنٹ کے سینے میں روپوش ہو گئیں۔ لوئیس نے دروازہ کھولا اور تیسری گولی پیشانی پر چپکا کر زندگی کے ہر امکان کو ختم کر دیا۔ اس نے اطراف میں دیکھا۔ سڑک صاف تھی۔ لانڈری ٹرک نے منظر چھپایا ہوا تھا۔ گن اس نے پیچھے پتلون میں اُڑس لی اور بڑھ کر اپنے مطلوبہ گھر کا رخ کیا۔ سیڑھیاں چڑھ کر اس نے گھنٹی بجائی۔ ونڈو بلائنڈ میں جھری پیدا ہوئی۔ بھورے بالوں والی عورت کی جھلک نظر آئی۔ لوئیس کی گن کپڑوں کے بیگ کے نیچے تھی۔

''برابر والا گھر ہے۔'' عورت نے بائیں جانب اشارہ کیا۔ لوئیس نے دانت نکال کر بیگ دکھایا۔ انداز یہی تھا کہ وہ کچھ نہیں سمجھا۔ بعدازاں فرنٹ ڈور میں جھری نمودار

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

ہوئی۔ سرکاری گارڈ نے دروازہ کھولے بغیر کچھ کہنا چاہا۔ لوئیس نے بلاتامل کاندھے کا زوردار دھکا مارا۔ اندرونی چین ٹوٹ گئی۔ دروازہ کھلا۔ بھورے بالوں والی ایجنٹ چیخ مار کر زمین بوس ہوئی۔ وہ اپنی گن ٹٹول رہی تھی۔ جب لوئیس نے دو گولیاں اس کے سفید بلاؤز میں اتار دیں۔

''سوری۔'' وہ بڑبڑایا اور دروازہ بند کر دیا۔ ایک کتا کچن سے جھپٹا۔ لوئیس کی چلائی ہوئی گولی اس کی گردن میں پیوست ہوگئی۔ لوئیس جانتا تھا کہ اسے سرعت سے کام نمٹانا ہے۔ وہ لاعلم تھا کہ گھر میں کتنے ایجنٹ ہیں۔ دوسرے باہر کار میں کوئی آنے جانے والا لاشیں دریافت کرسکتا تھا۔

لیونگ روم سنسان تھا۔ لوئیس نے فون ہک پر سے ہٹا دیا۔

''پام۔'' ایک اور عورت کی آواز آئی۔ ''تم نے انہیں بتا دیا کہ پڑوس میں جائیں؟'' آواز کچن سے آئی تھی۔ لوئیس آواز کی سمت بڑھا۔ اسے وہی عورت نظر آئی جو چند روز قبل کوڑا کرکٹ پھینکنے باہر نکلی تھی اور ایک ایجنٹ نے اس سے بات کی تھی۔

لوئیس کو دیکھ کر اس کے ہاتھ سے چائے کا کپ گر کر ٹوٹ گیا۔ اس کے بال تقریباً سفید تھے۔

''وہ کہاں ہے؟ سنیورا؟''

عورت نے عالمِ حیرت میں پلکیں جھپکائیں۔ وہ صورتِ حال کو سمجھنے سے قاصر نظر آرہی تھی۔ ''ڈوبی؟ کیا کیا تم نے ڈوبی کے ساتھ؟'' اس نے ڈوبی کو پکارا۔

''ماما، میرے ساتھ ڈراما مت کرو۔ ورنہ تمہیں بھی ڈوبی کے پاس پہنچادوں گا۔''

''ایجنٹ برن ماٹر کہاں ہے؟'' عورت نے لوئیس کی وحشت ناک آنکھوں اور ہاتھ میں موجود گن کی طرف دیکھا۔ لوئیس نے آگے بڑھ کر گن کی نال اس کے گال پر رکھ دی۔ ''کوئی مدد کے لیے نہیں آئے گا۔ جلدی بتاؤ، وہ کہاں ہے؟ میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔'' وہ غرایا۔

عورت کی آنکھوں میں بے بسی اور خوف تھا۔ یہ تاثر لوئیس درجنوں مرتبہ دیکھ چکا تھا۔ عورت کے تصور میں تھا کہ وہ کیا جواب دے گی اور اس کے ساتھ ہی اس کی زندگی کا خاتمہ ہوجائے گا۔ ''کون کہاں ہے؟ کیا چاہتے ہو؟''

''بتا دو گی تو زندہ رہو گی۔ جلدی کرو۔ شوہر کہاں ہے؟''

''میرا شوہر؟ وہ یہاں نہیں ہے۔ میں قسم کھاتی ہوں...... میں نہیں جانتی وہ کہاں ہے۔''

لوئیس نے مغلظات بکتے ہوئے اسے دھمکانا شروع کیا۔

''میں قسم کھاتی ہوں۔ وہ چند ہفتے پہلے یہاں سے چلا گیا تھا۔''

''کہاں؟'' لوئیس نے اس کے بال جکڑ کر گن کی نال آنکھ پر رکھ دی۔

وہ فریاد کررہی تھی۔ مچل رہی تھی۔ ''پلیز، یقین کرو...... ایجنٹ یہاں کیوں ہیں...... یہ بھی مجھے نہیں معلوم۔ پلیز میں قسم کھاتی ہوں۔'' وہ سسکیاں لے رہی تھی۔

''اوکے لیڈی۔'' اس نے عورت کا کمزور ہاتھ پکڑ کے جلتے ہوئے برنر کے قریب کر دیا۔ عورت دہشت کے عالم میں آہ و زاری کررہی تھی۔ اس نے ناکام مزاحمت شروع کردی۔ پتلیاں حلقوں سے ابل پڑیں......

''کچھ یاد آیا؟'' اس نے آخری بار پوچھا۔

☆☆☆

چند بلاک دور جانے کے بعد لوئیس نے ٹرک پہاڑی کے دامن میں روکا اور اس کے ڈرائیونگ کیبن سے باہر آگیا۔ کسی نے تعاقب نہیں کیا تھا...... وہاں واٹر ٹریٹمنٹ پلانٹ کی پارکنگ تھی۔ اس نے کپڑے بدلے، اسٹیئرنگ اور ڈور ہینڈل کو صاف کیا......ضروری صفائی کرنے کے بعد وہ تاریکی میں ایک جانب چل دیا۔

کچھ دور چلنے کے بعد وہ ایک کار کے پاس پہنچا۔ یہ کرائے کی ٹویوٹا تھی۔ وہ کار کا دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گیا۔

''کیا رہا؟'' ڈرائیور نے سوال کیا۔ ''یہاں سے نکل چکا ہے لیکن نیویارک میں ہے۔''

''نیویارک؟'' ڈرائیور نے حیرت کا اظہار کیا۔

''اس کی بیوی نے مرنے سے پہلے یہی بتایا تھا۔''

''کوئی بات نہیں۔ میں جانتا ہوں، وہ کہاں ملے گا۔'' ڈرائیور نے گاڑی گھمائی۔

☆☆☆

گریگ چاہتا تھا کہ وہ اپنے معمولات تبدیل کرے۔ وہ کئی ہفتے بعد فرگو کے ساتھ جاگنگ کے لیے پارک میں آئی تھی۔ تقریباً دو بلاک پر ہی اس کا سانس پھول گیا۔ نٹالی نے فرگو کی رسی چھوڑ دی اور خود گھاس پر بیٹھ گئی۔

کچھ فاصلے پر اس کے سامنے سیاہ چرمی جیکٹ اور دھوپ کا چشمہ لگائے ایک آدمی بیٹھا تھا۔ وہ اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ نٹالی نے فرگو کی تلاش میں اطراف میں نظر دوڑائی۔ پھر اس آدمی کی طرف دیکھا اور کھڑی ہوگئی۔ اس کے اٹھتے ہی ایک آواز

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

آئی۔ ''ثنالی!''

ثنالی تیزی سے گھومی...... کشیدہ ہوتے اعصاب پُرسکون ہو گئے۔ اس آدمی نے چشمہ اتار دیا تھا۔ آواز اسی نے دی تھی۔ ثنالی نے پہچان لیا۔ وہ بریٹو تھا۔ اس مرتبہ اس نے ٹوپی کی جگہ چشمہ لیا ہوا تھا۔

''تم ڈر گئیں شاید۔'' اس کی چھوٹی سی داڑھی اپنی جگہ پر تھی۔ وہ مسکرایا۔ وہی گالف کیپ اس کی گود میں رکھی تھی۔ ''تم کئی ہفتے بعد آئی ہو؟'' اس کا لہجہ اور آواز ہمیشہ کی طرح نرم اور شستہ تھی۔

''وہ میری ایک عزیز دوست حادثے کا شکار ہو گئی تھی۔ زیادہ تر میں اس کے پاس ہوتی تھی۔''

''اوہ، آئی ایم سوری۔'' اس نے اظہارِ افسوس کیا۔ ''اگر تم خیال نہ کرو تو کچھ دیر بیٹھ جاؤ۔ میں اپنے پرانے دوست سے مل لوں۔'' اس کا اشارہ فرگو کی جانب تھا۔

''شیور۔'' ثنالی ریلیکس ہو گئی تھی۔ عام طور پر وہ دونوں گھر کی، فیملی یا لیب کے بارے میں بات کرتے تھے۔ لیکن آج...... ثنالی کو لگا جیسے وہ اس کا منتظر تھا۔ احتراماً وہ فاصلہ برقرار رکھ کر بیٹھا تھا۔

''اب کیسی ہے تمہاری دوست؟''

''امید ہے، بہتر ہو جائے...... حالت بہت اچھی نہیں ہے۔''

''اوہ...... امید ہے وہ ٹھیک ہو جائے گی۔ تمہاری ماں کے بارے میں سن کے دلی افسوس ہوا تھا۔'' اس نے سادگی اور سچائی سے کہا۔ ثنالی کو کرنٹ لگا۔ وہ جانے کا بہانہ ڈھونڈ رہی تھی۔ یوں محسوس ہوا جیسے اس نے کوئی اور بات سنی ہے۔ اسے کیونکر علم ہوا۔ کئی ہفتوں بعد ملاقات ہوئی تھی۔ وہ اس کی ماں کے نام سے ناواقف تھا۔ اگر اخبار میں بھی ڈیتھ نوٹس پڑھا ہوگا...... تو اسے کیا معلوم کہ شیرن کون تھی۔

''آپ کیسے جانتے ہیں؟''

تب معمر آدمی نے ایک اور حیران کن حرکت کی۔ اس نے سر کے اشارے سے ایک آدمی کو سگنل دیا۔ وہ آدمی ملازم یا باڈی گارڈ کے مانند بینچ سے ذرا ہٹ کے کھڑا تھا۔ اشارہ پا کر وہ مؤدبانہ انداز میں دور ہٹ کے دوسری بینچ پر بیٹھ گیا۔ ثنالی نے سنسنی محسوس کی۔ یہ کیا ہو رہا ہے؟ تاہم کچھ ٹھیک نہیں ہے۔ اس نے قریب آتے ہوئے فرگو کی رسی پکڑی۔ وہ اٹھنے کے لیے تیار تھی۔ اس نے گیٹ کی طرف دیکھا۔ شاید کوئی پولیس والا نظر آ جائے۔

''کون ہو تم؟'' اس نے محتاط انداز میں سوال کیا۔

''پلیز۔'' آدمی نے ہاتھ بڑھا کر ہتھیلی اس کے بازو پر رکھ دی۔ ''رک جاؤ۔''

''کون ہو تم؟'' ثنالی نے پھر سوال دہرایا۔ اس کے لہجے میں شبہات کی آمیزش تھی۔

''ڈرو مت۔'' اس کی آواز میں گداز تھا۔ نیلی آنکھوں کی روشنی بڑھ گئی تھی لیکن اس نے جو کہا...... وہ الفاظ کی آری تھی جس نے ثنالی کی ہڈیوں تک کو کاٹ کے رکھ دیا۔

''ثنالی، میں آسکر مارکیڈو ہوں۔''

☆☆☆

ثنالی کے بدن کا ہر خلیہ جم کے رہ گیا۔

آسکر مارکیڈو کی شناخت، ڈرگ ڈیلر اور سفاک، بے رحم قاتل کی تھی جس نے ثنالی کی آنکھوں کے سامنے اس کی ماں کا خون کیا تھا اور غالباً ڈیڈی کو بھی ختم کر دیا تھا۔ وہ کیا کرے؟ اس کے ذہن نے کام کرنا چھوڑ دیا۔ وہ پلک جھپکائے بغیر برف جیسی نیلی آنکھوں کو دیکھ رہی تھی۔ دہشت میں ڈوبی چیخ حلق میں گھٹ کے رہ گئی۔ آسکر کا آدمی زیادہ دور نہیں تھا۔

''ثنالی، پلیز...... تمہیں مجھ سے گھبرانے، ڈرنے کی قطعی ضرورت نہیں ہے۔ یہ میرا وعدہ ہے۔ آسکر مارکیڈو کا وعدہ۔ برعکس اس کے خوف مجھے ہے...... تمہاری جانب سے۔''

ثنالی بے قابو ہوئی جا رہی تھی۔ سینے میں آگ لگی تھی۔ یہ آدمی قابلِ گردن زدنی ہے۔ اس کی ماں کا قاتل۔ اس کے آدمیوں نے اس پر دریا میں حملہ کیا تھا۔ ڈرگ کارٹل۔ فرید رشیدا...... ہر خرابی اور بربادی کی ذمے دار......

''تمہارے ڈیڈی......''

''کیا ہوا ڈیڈی کو؟ وہ مر گئے...... تم نے اُن کو......''

''نہیں۔ وہ زندہ ہیں۔ درحقیقت وہ میری تلاش میں ہیں۔ مجھے ختم کرنا چاہتے ہیں۔''

''وہاٹ؟ میں یقین نہیں کر سکتی۔'' وہ مشتعل ہو گئی۔ ''تم جھوٹ بول رہے ہو۔'' ثنالی نے دونوں مٹھیاں بھینچ لیں۔ باکسر کے مانند۔ کسی چیز نے اسے روک لیا۔ وہ معمر آدمی کا سکون اور اطمینان تھا۔ وہ اسی طرح بیٹھا رہا۔ ثنالی کے اشتعال پر اس نے کسی قسم کا ردِعمل پیش نہیں کیا۔

اچانک ثنالی کے احساسات میں صرف غیر یقینی اور غصہ رہ گیا۔

''کیا مطلب؟ وہ تم کو تلاش کر رہے ہیں؟''

''ہاں اسی لیے انہوں نے منصوبہ بنایا۔ گرفتاری کا

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

ڈراما کیا...... اور گورنمنٹ سیکیورٹی پروگرام میں چلے گئے۔ ثنالی، مجھے یقین ہے کہ تم یہ سب جان چکی ہو۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟''

ثنالی کی نظر اس کی نگاہ سے بندھ کے رہ گئی۔ خاموشی...... ''ہاں میں جانتی ہوں۔ لیکن اس کا مطلب کیا ہے؟''

''ہاں، مطلب...... وہ سیکیورٹی پروگرام میں تحفظ کے لیے نہیں گئے تھے۔ وہ اس پروگرام کو بریک کرنے گئے تھے۔''

ثنالی کو آسکر کی باتوں میں سچائی محسوس ہونے لگی۔ اگرچہ اسے سمجھ نہیں آرہا تھا اور وہ سمجھنے کی کوشش کررہی تھی۔

''تم یہ سب مجھے کیوں بتارہے ہو؟ اور میں ہر بات پر کیسے یقین کرلوں؟''

''مجھے یقین ہے کہ تم یقین کرلوگی۔ سچائی کی اپنی زبان ہوتی ہے۔ تم زیادہ دیر اندھیرے میں نہیں رہ سکتیں۔ تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ مارگریٹ ہم دونوں کی کیس ایجنٹ تھی۔ منشیات کے دھندوں میں ملوث افراد کی اطلاع فراہم کرنے والوں کو یہاں رکھا جاتا ہے...... وہ قید نہیں ہوتے...... تم جانتی ہو اس پروگرام کی نوعیت کو۔ جو تمہارے والد نے ٹرائل میں جانے سے پہلے تمہیں بتائی ہوگی۔''

آسکر نے ثنالی کے بازو کو چھوا۔ اس مرتبہ ثنالی نے کوئی حرکت نہیں کی۔

''ثنالی، میں نے بیس برس سیکیورٹی پروگرام میں گزارے ہیں۔''

ثنالی اُسے دیکھتی رہی گئی۔ یہ درندہ، جس کے نام کا مطلب تھا۔ ''تشدد اور موت۔'' جس کے لیے ڈیڈی ٹرائل میں گئے۔

''نہیں۔'' ثنالی نے ہاتھ کھینچا۔ ''تم مارکیڈو ہو۔ ایف بی آئی کے مطابق تم ڈیڈی کو مارنا چاہتے تھے......''

''ثنالی، ایف بی آئی نے بہت کچھ کہا ہوگا۔ ان باتوں کا مقصد صرف مجھے کور فراہم کرنا تھا۔ بیس برس سے میں مارکیڈو ڈرگ کارٹل سے دور ہوں۔ ہاں میں ان کے خلاف اطلاعات فراہم کرتا رہا ہوں۔ میری اطلاعات سے تمہارے ڈیڈی کا کوئی تعلق نہیں۔ ڈرگ ڈیلنگ میں کوئی ایک گروپ یا کوئی ایک ملک ملوث نہیں ہے۔ مارگریٹ میری شناخت اور محل وقوع سے واقف تھی۔ تمہارے ڈیڈی کا آدمی اسی لیے مارگریٹ سے ملا تھا کہ مجھے تلاش کرکے ختم کردیا جائے۔ میں یہ ثابت کرسکتا ہوں، ثنالی راب۔''

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

اوہ گاڈ...... وہ سب کچھ جانتا ہے، میں اسے کیونکر جھٹلاؤں...... وہ کہہ رہا تھا۔ ڈیڈی کا آدمی، یعنی ڈیڈی مارگریٹ سے نہیں ملے تھے۔ اس کے تاثرات...... اس کی آنکھیں۔ نثالی نے اس کے چہرے کو بغور دیکھا۔ گول ٹھوڑی، رخساروں کی ہڈیاں، آنکھوں میں مقصد اور شفاف نیلا رنگ...... اگر داڑھی ہٹا کر عمر کم کر دی جائے۔

''اوہ میرے خدا...... میں اسے جانتی ہوں۔'' وہ دنگ رہ گئی۔

''میں تمہیں پہچان گئی۔ میں نے تم دونوں کا فوٹو دیکھا ہے۔ کارمینس میں گیٹ کے نیچے؟'' اس کے چہرے پر روشنی پھیل گئی۔

''کون ہو تم؟ تم سب کیسے جانتے ہو؟ میرے ڈیڈی کو بھی؟''

معمر آدمی نے سر جھکا کر اوپر کیا۔ وہ خاموش تھا۔

''نثالی، بنجامن راب میرا بھائی ہے۔''

☆☆☆

نثالی گرتے گرتے بچی۔ اس نے بینچ کا سہارا لے لیا۔

''سگا بھائی؟''

''نہیں...... لیکن روز اور شیرن سگی بہنیں تھیں۔''

تمام شکوک اور خوف تحلیل ہو گیا۔ سچ سامنے آ گیا تھا۔ وہ حقیقت بیان کر رہا تھا۔ وہ روز کو بھی جانتا تھا۔

''کیوں...... اب کیوں؟ اتنے برس بعد؟''

''ایک ضعیف آدمی کا انتقال ہو گیا ہے...... کولمبیا میں اسی جگہ پر، کارمینس...... تم جانتی ہو۔ نثالی، وہ ضعیف آدمی میرا باپ اور تمہارا دادا تھا۔''

''نہیں، میرے دادا کا انتقال برسوں پہلے اسپین میں ہوا تھا۔'' اس نے نفی میں سر ہلایا۔

''نہیں، تمہارے والد کے والد اب تک بقیدِ حیات تھے۔'' آسکر مارکیڈو نے کہا۔ ''اور گزشتہ بیس برسوں میں وہ میرے محافظ بھی تھے۔ مارکیڈوز کے دو دھڑے ہو گئے تھے...... اور اب مزید ٹوٹ پھوٹ شروع ہو گئی ہے۔ کولمبیا میں خون خرابا شروع ہو گیا ہے اور یہاں بھی۔ لیکن یہاں مارکیڈوز کا وجود قریب الختم ہے......''

نثالی نے الجھن سے آنکھیں جھپکائیں۔ ''محافظ؟''

''میں بتاؤں گا...... تمہیں بہت سی باتوں سے لاعلم رکھا گیا ہے۔ تمہارے دادا کے رخصت ہوتے ہی سب کچھ بدل گیا۔ جو لوگ مجھے ختم کرنا چاہتے تھے، وہ تمہارے دادا کی وجہ سے رکے ہوئے تھے۔ عہدِ قدیم کی وجہ سے، قسم، قانون، اٹوٹ بندھن۔ اب عہد ٹوٹ چکا ہے۔''

''کیسا عہد؟''

''فرید رنیدا...... یہ لفظ تم نے سنا ہے؟''

نثالی نے اثبات میں سر ہلایا۔

''مجھے علم ہے کہ یہ لفظ تمہارے لیے خوف و دہشت کی علامت کے سوا کچھ نہیں۔ ہمارے لیے یہ عزت، وقار اور غیرت کا مسئلہ ہے۔ جس کے لیے کچھ بھی کیا جا سکتا ہے۔ جیسے بعض ممالک میں غیرت کے نام پر خودکشی اور قتل کیے جاتے ہیں...... اس لفظ کا مطلب ہے برادری (فیملی)...... برادری کا ہر فرد برادر ہے جو برادری کے قاعدے قوانین اور اصولوں سے انحراف نہیں کر سکتا۔ کولمبیا میں ایک ڈرگ بیرن یا کارٹل نہیں ہے۔ ہماری ''فیملی'' مارکیڈو کہلاتی ہے...... میں کہہ رہا تھا کہ یہ عہد بہت سخت اور مضبوط ہوتا ہے۔ کوئی باپ اپنی بیٹی سے جتنی محبت کرتا ہے...... یہ اس سے بھی زیادہ مضبوط ہوتا ہے۔ فرید رنیدا۔''

نہیں، ناقابلِ یقین...... نثالی ششدر رہ گئی۔

''تمہارے ڈیڈی، برسوں سے فرید رنیدا کے لیے کام کر رہے تھے۔ یہ ان کی جاب تھی، ڈیوٹی۔ لیکن انہیں ایک حساب چکانا تھا۔ اسکور برابر کرنا تھا۔ وہ ان کے لیے اتنا اہم تھا کہ انہوں نے سارا آرام تج دیا۔ اپنا گھر بار قربان کر دیا۔ تمہیں بھی، ایملی اور جسٹن کو بھی چھوڑ دیا۔ بیس سال گزرنے کے بعد بھی۔ میں سمجھتا ہوں۔ یہ خون سے متعلق ہے...... محبت سے زیادہ طاقتور۔ نثالی، تمہارے ڈیڈی کو میرا خون چاہیے، یہ محبت سے بڑھ کر ہے۔ نشانہ میں ہوں۔ وہ میری تلاش میں ہے۔ اس کے لیے وہ کچھ بھی کرے گا۔ ہر حد کراس کرے گا؟ کیونکہ میں نے بیٹی کی محبت میں ''فرید رنیدا کے اصول توڑ دیے تھے۔ میرا یقین محبت ہے۔ محبت سے بڑھ کر کچھ نہیں۔''

''مطلب، ڈیڈی زندہ ہیں۔'' نثالی کی آواز ہر تاثر سے عاری تھی۔ یہ محض ایک سوال تھا۔

''بلاشبہ...... اور ممکن ہے کہ وہ آس پاس کہیں موجود ہوں۔''

نثالی نے اضطراری طور پر اطراف میں دیکھا۔ اگر وہ زندہ ہیں تو انہوں نے رابطہ کیوں نہیں کیا۔ ماما کے جانے کے بعد بھی نہیں؟ خود اس کے زخمی ہونے کے بعد بھی نہیں۔ ایملی اور جسٹن کو ان کی ضرورت ہے۔ اگر یہ حقیقت ہے تو تسلیم کرنے کے لیے بہت بڑی ہے، بہت تلخ ہے، بہت سنگین ہے۔

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

''تم جھوٹ بول رہے ہو۔'' وہ اچانک کھڑی ہوگئی۔ ''ان کے خلاف مجھے استعمال کررہے ہو۔ ماما کو تم لوگوں نے مارا...... مجھے زخمی کیا۔ فرید رنیدا کی کہانی بھی مضحکہ خیز ہے۔''

''تم جانتی ہو کہ یہ سچ ہے۔ تم نے فوٹو دیکھا تھا۔'' مارکیڈو کے اعتماد اور اطمینان میں کوئی خلل نہیں پڑا۔ ''شیرن کو مارنے کا میں تصور نہیں کرسکتا۔ کس نے مارا؟ تمہیں پتا چل جائے گا۔''

کشمکش نثالی کے اعصاب توڑ رہی تھی۔ آسکر کا چہرہ اور آنکھیں، سچائی کی عکاس تھیں...... اس کی معلومات اور وہ فوٹو۔

''یہ کافی نہیں ہے۔'' وہ تھکی ہوئی آواز میں بولی۔ ''میں اپنے ڈیڈی کو جانتی ہوں۔ تم نے کہا تھا کہ تم ثابت کرسکتے ہو...... کیسے؟''

''میں جانتا تھا۔ بات یہاں تک پہنچے گی۔'' آسکر مارکیڈو نے شکن آلود جیکٹ سے ٹشو میں لپٹی کوئی چیز نکالی اور نثالی کے ہاتھ پر رکھ دی۔ نثالی کا دل زور سے دھڑکا۔ اس نے ٹشو ہٹانا شروع کیا۔ جو شے اندر سے برآمد ہوئی، اس نے نثالی کی دنیا ایک بار پھر زیروزبر کردی۔ وہ جانتی تھی کہ آسکر سچ بولتا رہا ہے۔ وہ ہر بات سے واقف ہے...... وہ اس کو گھورتی چلی گئی۔ آنکھوں میں آنسو اُمڈ آئے۔

اس کی ہتھیلی پر سونے سے بنا سورج کا دوسرا نصف حصہ رکھا تھا۔

☆☆☆

اس کا وجود زلزلے کی زد میں تھا۔ وجود تقسیم ہوگیا تھا۔ اس نے گلے سے چین اتاری اور دونوں حصوں کو جوڑا۔ سورج اس طرح ٹوٹا تھا کہ چند دندانے ٹک...... ٹک...... کی آواز کے ساتھ ایک دوسرے میں بیٹھ گئے۔ سورج مکمل ہوگیا۔

آسکر نے نثالی کا ہاتھ پکڑ لیا۔ نثالی نے کوئی مزاحمت نہیں کی۔ وہ ایسی باتیں بتارہا تھا، جو نثالی نے پہلے نہیں سنی تھیں۔

''تمہارے ڈیڈی اس وقت بچے تھے۔ وہ اسپین سے نہیں کولمبیا سے آئے تھے، ہمارا ملک کولمبیا۔ روز کا تعلق ارجنٹائن سے تھا۔''

''کیا مطلب؟'' نثالی چکرا گئی۔

''وہ میری بیوی تھی۔ راب اس کے ساتھ شادی کرنا چاہتا تھا۔ روز مجھے پسند کرتی تھی۔ وہ خوامخواہ میرا دشمن ہو گیا۔ لیکن تمہارے دادا کی زندگی میں وہ کچھ نہیں کرسکتا تھا۔ بعدازاں ذیابیطس کے مرض نے روز کی جان لے لی۔ اگر وہ حمل سے نہ ہوتی تو بچ جاتی...... وٹنس پروگرام میں ایجنٹ نے میری شادی بھی کرادی تھی۔''

''تم...... تم نے ابھی بیٹی کا ذکر کیا تھا؟''

''ہاں روز نے بیٹی کو جنم دیا تھا۔''

''وہ کہاں ہے؟''

''وہ تمہارے دادا کی وجہ سے محفوظ ہے۔''

''کہاں؟''

''سب بتاؤں گا...... میں روز کی محبت کو زندہ رکھنا چاہتا تھا۔ میں ''فرید رنیدا'' سے منحرف ہوگیا۔ میں سمجھ گیا تھا...... خون سے خون کو نہیں دھویا جاسکتا۔ ہماری محبت آج بھی زندہ ہے اور مجھے اسے زندہ رکھنا ہے۔''

نثالی گنگ تھی۔ اس کا دماغ کام نہیں کررہا تھا۔ شیرن کے الفاظ یاد آئے...... جب تم سورج کو مکمل کرلوگی تو بہت سارے راز کھل جائیں گے...... شیرن بہت کچھ جانتی تھی۔

''تمہاری ماں نے مجھے سورج کا نصف حصہ دیا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ ایک دن میں تمہیں سچ سے آگاہ کروں گا۔ میں کروں گا، بین راب نہیں۔''

''میں کیسے یقین کروں؟ میں بیس سال سے دیکھ رہی ہوں کہ ڈیڈی، ماما سے کتنی محبت کرتے تھے۔ وہ ان کو کیسے مار سکتے ہیں؟'' نثالی نے کھوئے کھوئے انداز میں لاکٹ کو دیکھا۔ ''تم کیوں مجھے بتارہے ہو؟ تم کیوں میرے سامنے آئے ہو؟ تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟''

''میری مدد کرو...... راب کو تلاش کرنے میں۔''

''کیوں؟ تاکہ تم اُن کو ماردو...... جو کچھ بھی ہوا، لیکن وہ اب بھی میرے باپ ہیں۔ تمہاری ہر بات سچ لگتی ہے۔ لیکن اگر یہ سب سچ ہے تو پھر میری تمام زندگی کی حیثیت ایک جھوٹ کے سوا کچھ نہیں۔''

''جھوٹ نہیں...... یہ تمہاری حفاظت کا......''

''نہیں، میری زندگی جھوٹ بن کر رہ جائے گی۔''

آسکر نے دھیرے سے لاکٹ اس کے ہاتھ سے اٹھا کر اس کے گلے میں ڈال دیا۔ ''اب تم مکمل ہو۔ یہی تمہارا سچ ہے جس کی تمہیں تلاش تھی...... تم پر منحصر ہے کہ کس دروازے سے گزرتی ہو؟ سچائی کے یا جھوٹ والے دروازے سے؟''

☆☆☆

کرائم سین پر فلیش لائٹس چمک رہی تھیں۔ پولیس اور ایف بی آئی موجود تھیں۔ کیوبٹی شناخت دکھا کر کھلے

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

دروازے سے اندر چلا گیا۔ پہلی لاش ایجنٹ پامیلا کی تھی۔
وہ چند سیکنڈ رکا، پھر کچن کی طرف بڑھ گیا۔ دوسری لاش وہاں
سے ہٹالی گئی تھی۔ تاہم وہاں تشدد کی علامات موجود تھیں۔
ایجنٹ بوتھ بھی وہیں تھا۔ اس نے دس پندرہ تصاویر کیویٹی کو
تھمادیں۔

کیویٹی کا کلیجا منہ کو آگیا۔ سروس میں اسے چھبیس
سال ہوگئے تھے۔ ایسے حالات سے اس کا واسطہ نہیں پڑا
تھا۔ اس دوران اس نے سیکیورٹی پروگرام کا کوئی گواہ نہیں
کھویا تھا۔ سیکیورٹی پروگرام کے جس گواہ کو بھی نئی شناخت
دی گئی، وہ کبھی افشا نہیں ہوئی تھی۔ سیکیورٹی پروگرام کو پہلے
کوئی توڑ نہیں سکا تھا۔

فوٹو وہ دیکھ رہا تھا۔ رپورٹ وہ پڑھ چکا تھا۔ مارنے
سے پہلے مقتولہ کو بھی میگی کی طرح تشدد کا نشانہ بنایا گیا تھا۔
ایک ہاتھ کی صرف ہتھیلی تھی، باقی ہاتھ غائب تھا۔ دونوں
ہتھیلیوں کو برنر پر ہڈیوں تک کو جھلسا دیا گیا تھا۔

''کم از کم ایک کلیو تو مل گیا ہے۔'' بوتھ نے سنجیدگی
سے کہا۔ میگی کو مارنے والے نے میگی سے یہاں کا پتا معلوم
کیا تھا۔''

کیویٹی کے لیے مقتولہ کا شوہر ایک اثاثہ تھا۔ جسے
بیس سال پہلے کیویٹی نے نئی شناخت دی تھی۔ اور اسے قائل
کیا تھا کہ وہ شادی کر لے۔ مقتولہ کی دردناک موت کیویٹی
کے دل پر بھاری بوجھ تھی۔ وہ غریب تو اپنے شوہر کی حقیقت
سے بھی ناواقف تھی۔ اس نے فوٹو واپس کر دیے۔

بعدازاں انہوں نے واٹر ٹریٹمنٹ پلانٹ پر ڈیلیوری
ٹرک اور اطراف کا جائزہ لیا۔ فارنسک والے اور فوٹوگرافر
اپنا کام کر رہے تھے۔ ٹرک میں کپڑوں کے نیچے سے
ڈرائیور کی لاش ملی تھی۔ سڑک پر دونوں ایجنٹوں کو ملا کر
مقتولین کی تعداد پانچ ہوگئی تھی (کتا شامل نہیں تھا)

''یہ کس کا انداز ہے؟ کون ہو سکتا ہے؟'' بوتھ کی
پیشانی پر لکیریں تھیں۔ دونوں نے جواب نہیں دیا۔ دونوں
جانتے تھے۔ مارکیڈوز۔ کیویٹی سوچ رہا تھا کہ راب نہیں ہو
سکتا۔ اگر ہے تو یہ اس کا طریقہ کار نہیں ہو سکتا۔ پھر نئی سوچ
ابھری۔ اگلا نشانہ کون ہے؟ اس نے فوٹو واپس کیے۔ ''کوئی
نئی چیز سامنے آئے تو کال کرنا۔''

''کہاں کے ارادے ہیں؟'' بوتھ نے سوال کیا۔

''بلیوز ون۔''

☆☆☆

تین بج رہے تھے۔ نٹالی سونے کی ناکام کوشش
کر رہی تھی۔ ڈیڈی، مارکیڈو فیملی کا حصہ تھے بلکہ اُن کی
اصل فیملی وہی تھی۔ پیدائش سے لے کر اب تک۔
فریڈرنیدا۔ یہ سب انہوں نے محبت کرنے والوں سے چھپا
کے رکھا، جن سے وہ خود بھی محبت کرتے تھے۔ پتا نہیں
کرتے تھے یا نہیں...... اب اپنے بھائی سے بدلہ لینے کے
لیے وہ آزاد تھے۔ آسکر کے مطابق دادا کے جانے کے بعد
آخری رکاوٹ بھی ختم ہوگئی تھی۔ یہ کیسا سچ تھا جس نے سب
کو مشکل میں ڈال دیا تھا۔ کتنی جانیں ضائع ہوگئی تھیں یا
ہونے والی تھیں...... ہر یاد گھونسے کے مانند اس کے پیٹ
میں لگ رہی تھی۔ ڈیڈی انہیں چھوڑ کر وٹنس پروگرام میں
آسکر کے لیے گئے تھے۔ مارگریٹ نے ایک مرتبہ کہا تھا کہ
وہ مارکیڈوز کو اچھی طرح جانتی ہے۔ وہی دونوں کی کیس
ایجنٹ تھی۔ آسکر کی کہانی جتنی بھی اذیت ناک سہی، اسے
جھٹلایا نہیں جا سکتا تھا۔ سچ آسکر کی آنکھوں میں تھا۔ زباں
پہ...... چہرے پر لکھا تھا، وہ نٹالی سے زیادہ جانتا تھا۔ ماں کو
بھی یہی بتاتا تھا۔ جب وہ بچی تھی تو ڈیڈی اسی بات پر ماما
سے لڑ رہے تھے۔

وہ کیا کرے؟ تمام حقائق کیویٹی کے سامنے رکھ
دے۔ لیکن کیوں؟ وہ لوگ کب اس سے سچ بولتے رہے
تھے۔ وہ تو مارکیڈو کی حقیقت سے واقف تھے اور بیس سال
سے اسے تحفظ فراہم کر رہے تھے...... درحقیقت وہ ڈیڈی
کے پیچھے پڑے تھے...... کیونکہ ڈیڈی نے سیکیورٹی پروگرام
اُڑا کے رکھ دیا تھا۔

اسے یاد آیا کہ جب اس نے سیکیورٹی پروگرام میں
جانے سے انکار کیا تھا تو ڈیڈی کتنے پزل ہوئے تھے، ان کا
وجود جیسے سکڑ گیا تھا۔ تھکے ہوئے ذہن نے نٹالی کو جانے کب
سلا دیا۔

☆☆☆

ایک روز کے وقفے سے وہ لیب میں پہنچ گئی۔
مصروف رہنا بہتر تھا۔ ورنہ وہ جلد ہی پاگل ہو جاتی۔ بار بار
اس کا ذہن بھٹک جاتا۔ کبھی خیال آتا کہ کام چھوڑ کر واپس
گھر چلی جائے...... سیل فون نے اسے کشمکش سے نجات
دلائی۔

''ہیلو، نیٹ۔''

الفاظ گولی کی طرح اس کی سماعت سے ٹکرائے تھے۔

''ڈیڈی......؟'' اس کا دماغ سن ہو گیا۔ کھڑے
رہنا دوبھر ہو گیا۔ وہ بیٹھ گئی۔ ''وہ کہہ رہے ہیں آپ نے
مارگریٹ اور مام کو......'' وہ رو پڑی۔

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

''بے بی میں جانتا ہوں...... سب جھوٹ ہے۔ ڈیڈی پر بھروسا کرو۔ سب مارکیڈو کا کیا دھرا ہے۔ تمہاری آواز سن کر میں بہت خوش ہوں۔ میں تمہیں دیکھنا چاہتا ہوں۔''

''ڈیڈی آپ واپس سیکیورٹی پروگرام میں آجاؤ۔''

''نیٹ، وہ مجھے ماردیں گے۔ وہ میرے اوپر قتل کا الزام لگا رہے ہیں۔ میں نے ان کی ایجنٹ پر تشدد نہیں کیا۔ نہ اُسے قتل کیا۔ اور میں تمہاری ماں کو کیسے مار سکتا ہوں...... کسی کو مت بتانا، میں نے رابطہ کیا تھا۔ ڈیڈی سے وعدہ کرو۔ کسی کا اعتبار نہ کرو۔ میں جلد ملوں گا آئی لو یو۔'' رابطہ منقطع ہوگیا۔ نٹالی نے نمبر محفوظ کرلیا۔

نٹالی کے حلق میں کانٹے پڑ گئے تھے۔ اس نے بدقت تمام آسکر کا نام زبان پر لانے سے خود کو روکا تھا۔

☆☆☆

''نٹالی۔'' کیویٹی کی آواز تھی۔ ''کیا میں اندر آسکتا ہوں؟''

نٹالی خاموشی سے ایک طرف ہوگئی۔ کیویٹی نے اس کے ہاتھ کے بارے میں دریافت کیا۔ رسمی باتیں کیں...... پھر بتایا کہ وہ بفیلو سے آرہا ہے۔ نٹالی خاموش رہی۔

''وہاں ایک عورت کا قتل ہوگیا ہے۔''

نٹالی خاموش تھی۔ کیویٹی ابھی تک کھڑا تھا۔

''پلیز سن لو۔''

''اس بار تصویر نہیں لائے؟'' نٹالی نے لب کشا کیے۔

''اس کی عمر پچاس سال تھی۔ اس پر خوفناک تشدد کیا گیا تھا۔''

''مجھے افسوس ہوا...... اسے بھی ڈیڈی نے مارا ہے...... یہ بتانے آئے ہو؟''

''اس کی حفاظت پر مامور دو ڈپٹی مارشل اور ایک راہ گیر بھی قتل ہوا ہے۔'' کیویٹی نے نٹالی کے طنز کو نظرانداز کر دیا۔

اس مرتبہ نٹالی ردِعمل نہ چھپا سکی۔ جسم لرز اٹھا۔

''ایک ایجنٹ گھر کے اندر تھی اسے بھی قتل کر دیا گیا۔''

ایک ساتھ پانچ قتل۔ نٹالی کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ یہ کیا ہے...... کب تک ہوتا رہے...... کون کررہا ہے؟

''نٹالی، پلیز...... صرف اتنا بتادو کہ آخری بار ڈیڈی سے رابطہ کب ہوا تھا؟''

''کس کا؟''

کیویٹی نے ٹھنڈی سانس بھری۔ ''تم کچھ بھی سوچو...... تمہارے ڈیڈی کو کسی کی تلاش ہے...... وہ جو بھی، اب اس کی حفاظت سے کسی کو دلچسپی نہیں ہے۔ تم مزید خون خرابا روک سکتی ہو۔'' اس نے گویا التجا کی۔

''یعنی تم لوگ جانتے تھے کہ ڈیڈی زندہ ہیں اور یہ بھی جانتے تھے کہ انہیں کس کی تلاش ہے؟'' اس کی آواز میں گہرا طنز اور شکوہ تھا۔

کیویٹی نے تسلیم کیا کہ اس نے کہیں جھوٹ بولا تھا۔ اس اعتراف کے بعد وہ کچھ دیر مزید تعاون حاصل کرنے کی کوشش کرتا رہا لیکن ناکام رہا۔ پھر اس نے ایک لفافہ نکالا۔

''ایک اور تصویر؟'' نٹالی نے پھر طنز کیا۔

تصویر دیکھ کر اس کے دل کی دھڑکن بڑھ گئی۔ وہ آسکر تھا۔

''یہ چہرہ دیکھا ہے کہیں؟''

''نہیں۔'' اس نے تصویر واپس کردی۔

اس مرتبہ کیویٹی کی آنکھوں میں شکوہ تھا۔ اس نے

غرقِ محبت

''کب تک مجھ کو بھولو گے!''

چاہتوں کا بھیدوں بھرا یہ سوال اسے حال سے بے حال کیے ہوئے تھا۔ اس نے محبوب کی آہٹوں پر کان اور راہوں میں پلکیں بچھائے زندگی تمام کردی مگر...... فاصلوں میں کمی نہ آئی۔ ابھی تو زندگی کی تلاش جاری تھی کہ اچانک اس انداز میں رقصِ اجل شروع ہوا کہ وہ چاہتوں کے مدفن پر حسرتوں کے پھول چڑھانے پر مجبور ہوگیا۔

جون 2017ء کے شمارے میں سسپنس

کے آخری صفحات پر جادوئی انداز لیے......

محبوب قلمکار طاہر جاوید مغل کی چونکا

دینے والی سحرانگیز طویل داستان آپ کی توجہ کی منتظر

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

ثانی کا چہرہ پڑھ لیا تھا۔ کیویٹی نے رومال میں لپٹی ہوئی کوئی چیز نکالی۔

''کاش اس کی ضرورت نہ پڑے...... میں نے شروع میں کہا تھا نہ کہ اس مرتبہ صرف تمہاری حفاظت مطلوب ہے۔'' اس نے رومال کھولا اور گن اس کے حوالے کر دی اور سیفٹی کیچ کے بارے میں بتایا۔

ثانی اُسے جاتا دیکھ رہی تھی۔ وہ دروازے کے قریب پہنچ گیا۔

''وہ کون تھی؟ بفیلو میں...... جسے تشدد کر کے مارا گیا؟''

جواب میں کیویٹی نے پھر آسکر کا فوٹو نکالا۔ اس تصویر میں ایک عورت اور ایک کتا نظر آرہا تھا...... ثانی سناٹے میں رہ گئی۔

کیویٹی نے شانے اچکائے۔ تصویر واپس رکھی اور کہا۔ ''کسی کی بیوی تھی۔''

☆☆☆

یہ اچھا ہوا کہ گریگ مورگن اسٹیٹلے سینٹر کی ملازمت پر آمادہ ہو گیا۔ سینٹر، شہر کا بہترین پیڈیاٹرک آرتھوپیڈک پروگرام تھا۔ ثانی مطمئن تھی کہ وہ اب نیویارک میں ہی رہے گا۔ تنخواہ بھی ٹھیک ٹھاک تھی اور چالیس ہزار ڈالر کا بونس۔ آفس بھی خوب صورت تھا۔

جمعے کی رات ثانی نے اسے چنیدہ دوستوں کے ساتھ ڈنر دیا۔

اگلی صبح انہوں نے دوست کی ویگن میں گریگ کا پرانا ضروری سامان بکسوں میں بھر کر نئے دفتر میں پہنچایا اور اسے سجانے میں مصروف ہو گئے۔ دفتر کے دروازے پر ''ڈاکٹر گریگ ہریرا'' لکھا تھا۔ بک شیلف میں ہسپانوی کتابیں بھی تھیں۔ ''ان کی کیا ضرورت تھی؟'' ثانی نے منہ بنایا۔

''رعب پڑتا ہے، جان۔'' گریگ نے آنکھ دبائی۔

''اور یہ کس لیے؟'' ثانی نے گیبرئل گارسیا مارکیز کی کتاب ''تنہائی کے سو سال'' اٹھائی۔ اس نے ورق گردانی کے لیے کھولی تو کتاب ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے گر گئی۔

''میکسیکو سے لائے ہو گے؟'' اس نے جھک کر کتاب اٹھائی تو کتاب کے کور کا اندرونی فلیپ کھل گیا جس پر ایک نام لکھا تھا۔

''ثانی کا جسم برف میں ڈوب گیا...... یا جہاز کریش ہو گیا...... اس نے نام پڑھا۔ ''گریگور یو کنسر جا مارکیڈو۔

اس نے نیچے پڑھا۔ نیشنل اسکول، کارمینس 1989۔ ثانی نے گریگ کی طرف دیکھا۔ گریگ کا چہرہ سفید پڑ چکا تھا۔ ثانی کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔ وہ لڑکھڑا کے پیچھے ہٹی۔ اس نے دوبارہ پڑھا۔ پھر گریگ کے چہرے کے تاثرات دیکھے۔ شک کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ اچانک اسے اپنے سامنے ایک اجنبی نظر آیا۔ کون تھا؟ وہ گریگ نہیں تھا۔ ثانی نے کتاب نیچے پھینکی اور دروازے کی طرف بھاگی۔ آہ...... یہ بھی ایک منصوبہ تھا۔ وہ چار سال سے گریگ کے ساتھ تھی۔

''سنو، پلیز...... میری بات سنو۔'' گریگ نے اسے روکنا چاہا۔

''میرے پیچھے مت آنا۔'' وہ ہال میں نکل گئی۔ اس نے ایلیویٹر کے بٹن پر ہتھیلی جما دی۔ گریگ آواز دیتا ہوا آرہا تھا۔ ''پلیز رک جاؤ۔'' ثانی نے وحشت کے عالم میں سیڑھیوں کی طرف دیکھا۔ معاً ایلیویٹر کے در وا ہونے لگے۔ وہ خالی تھا۔ ثانی نے اندر گھس کر دروازہ بند کرنے کے لیے سبز بٹن پر ہاتھ مارا۔ گریگ قریب تھا...... اس نے بازو وَن سے بند ہوتے در روکنے کی کوشش کی لیکن اسے معمولی تاخیر ہو گئی تھی۔ ثانی نے لابی کا بٹن پش کیا اور دونوں ہاتھ منہ پر رکھ لیے...... ہر بُن مو سے پسینا پھوٹ پڑا۔ لابی میں پہنچتے ہی اس نے دوڑ لگا دی۔ دوست کی ویَن عقبی سمت میں 168 اسٹریٹ پر کھڑی تھی۔ ثانی براڈوے کی طرف بھاگ رہی تھی۔ اس کے دماغ میں ایک ہی بات تھی کہ براڈوے کے ہجوم میں گھس جائے۔ وہ کیب کو بھی دیکھ رہی تھی، معاً اسے سب وے دکھائی دیا۔ میٹرو کارڈ اس کے والٹ میں تھا۔ وہ سب وے کی سیڑھیاں اتر گئی۔

جب تک اس کی ٹرین آ نہیں گئی، دل ڈھول کے مانند بجتا رہا۔ دھڑکنوں کا آہنگ اس وقت گھٹنا شروع ہوا جب ٹرین کے دروازے بند ہوئے اور اس نے رفتار پکڑی۔

☆☆☆

فل کیویٹی، ویسٹ 49 اسٹریٹ کے لفی نامی بار میں بیٹھا تھا۔

''اکیلے اکیلے۔'' ایک آواز آئی۔

کیویٹی نے گردن پھیری۔ ''نہیں براڈ اور جولی کا انتظار کر رہا ہوں۔''

بوتھ نے برابر کے اسٹول سے اخبار ہٹایا اور بیٹھ گیا۔

''اداس لگ رہے ہو؟''

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

''کیا پیو گے؟'' کیوبٹی نے بیئر کی طرف توجہ دی۔

''بعد میں پیوں گا۔ پہلے یہ دیکھو۔'' بوتھ نے ایک لفافہ نکالا۔

کیوبٹی کا قہقہہ بے ساختہ تھا۔

''کس نے گدگدی کی؟'' بوتھ نے اظہارِ حیرت کیا۔

''یار، جب بھی نٹالی راب سے ملتا ہوں۔ اسے تصویریں دکھاتا ہوں۔ آخری بار ملا تو بھنا گئی تھی۔''

''خوب...... یہ دیکھو۔''

کیوبٹی نے شیٹ پڑھی، اوپر لکھا تھا۔ ''کرمنل ایویڈنس''...... (سیٹل آفس، ایف بی آئی...... پائیک مارکیٹ ہوسائٹڈ، شیرن راب۔

''کرائم سین پر فیلڈ آفیسر کے ساتھ ہماری ٹیم بھی پہنچی تھی۔'' بوتھ نے سمجھایا۔ ''وہ ٹیم پہلے ہی، اتفاق سے بہت قریب تھی۔ انچارج نیا اور جوشیلا تھا۔ سمجھ دار بھی۔ جس ہوٹل سے فائرنگ ہوئی تھی۔ اس نے اُدھر دوڑنے کے بجائے کیمرے کی مدد سے بھاگنے والی گاڑیوں کے نمبر نوٹ کر لیے...... ان میں سب سے آگے کرائسلر بیرن تھی۔ اس کا نمبر مشی گن کا تھا۔ EV67490...... احتیاطاً ہم نے پچھلی دو گاڑیوں کو بھی ٹارگٹ کیا۔''

''اسمارٹ۔'' کیوبٹی نے فوٹو دیکھے۔

''وہ کرائے کی گاڑی تھی۔ دو دن پہلے ہائر کی گئی تھی۔ حملے کے اگلے روز ساکرامینٹو ائرپورٹ کے قریب واپس کر دی گئی۔''

کیوبٹی نے بے صبری سے اسے دیکھا۔ تمہارے لیے بیئر کا آرڈر دوں یا نام بتا رہے ہو؟''

''وہ اسکینر...... جان اسکینر۔ رپورٹ میں جزئیات بھی ہیں لیکن تفصیل کی ضرورت نہیں۔''

کیوبٹی کی آنکھیں چوڑی ہو گئیں۔

''اسکینر کا لائسنس ہی راب تک پہنچنے کے لیے کافی رہا......''

''مطلب ہم بے خبر تھے جو کچھ ہو رہا تھا، اس کے پیچھے مارکیڈو نہیں بلکہ راب کا ہاتھ تھا۔ کتے نے اپنی بیوی کو بھی نہیں بخشا۔ ہم راب کو کمتر سمجھنے کی خوفناک غلطی کرتے رہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ اسسٹنٹ ڈائریکٹر کمنگس کی سوچ اسی رخ پر ہے۔ اور وہ پہلے ہی دونوں کو بلیو زون میں بھیجنے کا فیصلہ کر چکا ہے...... کسی بھی قیمت پر۔ سیکیورٹی پروگرام میں مزید گڑبڑ اس کی برداشت سے باہر ہے۔

''راب اور مارکیڈو ایک دوسرے کے مقابل ہیں...... مجبوری ہے۔ دونوں کو بلیو زون میں لے جانا ہوگا۔'' بوتھ نے شانے اچکائے۔

کیوبٹی سر ہلا کر کھڑا ہو گیا۔ اس کا دھیان نٹالی کی طرف چلا گیا۔ اسے علم تھا کہ نٹالی نے اسے صحیح بات نہیں بتائی تھی۔ نٹالی کے تحفظ کے لیے اب وہ دگنا متفکر تھا۔

☆☆☆

دنیا اندھیر ہو گئی تھی۔ بچا کیا تھا۔ ایک گریگ کا سہارا تھا جس نے اسے سمیٹا ہوا تھا۔ گریگ نے اسے خوفناک احساسِ تنہائی سے محفوظ رکھا تھا اور اب...... وہ بہت بلندی سے گری تھی۔ تنہائی کی اتھاہ گہرائی میں۔ وہ کہاں جائے۔ پولیس؟ کیوبٹی؟ انہیں سب کچھ کھول کے بتا دے...... ہر بات، وہ ٹکڑوں میں تقسیم ہو گئی تھی۔ لگتا تھا، ہر ہڈی ٹوٹ گئی ہے۔ وہ چل کیسے رہی تھی۔ وہ ہار گئی تھی۔ شکستِ فاش۔ فون مرتعش ہوا۔ گریگ کال کر رہا تھا۔ وہ پندرہ بیس مرتبہ کوشش کر چکا تھا۔ متواتر کوشش کر رہا تھا۔ پیغام دے رہا تھا...... نٹالی، پلیز اٹھا لو...... پلیز......

اس مرتبہ نٹالی نے فون اٹھا لیا۔ جسم کے ہر ریشے میں دکھن تھی۔

''نٹالی۔'' وہ چلایا۔ ''پلیز مجھے وضاحت کا موقع دو۔''

''وضاحت کے لیے کیا بچا ہے۔ میں تو پہلے ہی نیم مردہ تھی۔ تم نے میرے ساتھ کیا کر دیا؟''

''میں تسلیم کرتا ہوں۔ میں جھوٹا نہیں ہوں۔ چار سال پہلے مجھے تم سے متعارف کرایا گیا تھا۔ تمہاری دیکھ بھال کے لیے۔ میں قسم کھاتا ہوں۔ ہاں میرا نام کنسرجا ہے۔ آئی ایم سوری۔ نٹالی میں ابتدا میں ہی تمہاری محبت میں گرفتار ہو گیا تھا۔ یہ سب سے بڑا سچ ہے۔ میں اپنی زندگی کی قسم کھاتا ہوں۔''

''تم کس کے لیے کام کرتے ہو؟''

''کسی کے لیے نہیں۔ میں صرف تمہارا شوہر ہوں۔''

''نہیں، نہیں۔ تم ڈیوٹی پر تھے۔ تمہاری ڈیوٹی ختم ہو گئی۔''

''پلیز مجھے بتاؤ تم کہاں ہو؟'' اس کی آواز میں مایوسی اور درد تھا۔ ''میں تم سے محبت کرتا ہوں......''

''گریگ چلے جاؤ...... جاؤ۔''

''نہیں، میں نہیں جاؤں گا۔''

☆☆☆

دروازہ کھلتے ہی آنٹی ایبی کی آنکھوں میں حیرت اُمڈ

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

آئی۔

''ثالی، اوہ مائی گاڈ۔تم یہاں؟'' ثالی کی خالہ کو سمجھنے میں ایک سیکنڈ لگا کہ کوئی خراب بات ہے۔ ''کیا ہوا، بے بی؟''

''آنٹی، میں چند روز یہاں رہ لوں؟''

''ہاں کیوں نہیں...... یہ پوچھنے کی بات ہے۔ ایملی، جسٹن، دیکھو کون آیا ہے۔'' تھوڑی دیر کے اندر گھر میں ہڑبونگ مچ گئی۔

''تم میرے کمرے میں سو جانا۔'' ایملی نے جوش کے ساتھ کہا۔

''تم جِل کا کمرا بھی استعمال کرسکتی ہو۔'' آنٹی نے کہا۔

''کوئی مائنڈ تو......''

''میری جگہ تمہاری ماں ہوتی تو وہ بھی اسی طرح پیش آتی میرے ساتھ۔'' ثالی نے اثبات میں سر ہلایا۔

''انکل جارج کہاں ہیں؟''

''وہ سات بجے تک آئیں گے۔''

ایملی کی اسکواش جاری تھی۔ اس کی نئی ٹیم کا نام ''فرینڈز'' تھا۔ ریٹنگ میں ٹیم تیسرے نمبر پر تھی۔ آنٹی ایبی کے بچے جِل اور میٹ ہیولٹ ہائی اسکول میں تھے۔ انکل ڈیوڈ آئے تو ایبی کے ساتھ کچن میں ہاتھ بٹانے لگے تاکہ ثالی، ایبی اور جسٹن کے ساتھ وقت گزار سکے۔ آنٹی سے شوہر کی بات مخفی رکھنا اچھا نہ تھا۔ تاہم اس نے اصل بات نہیں بتائی۔ اسی طرح ڈیڈی کی زندگی کی اطلاع بھی اس نے بہن بھائی کو دے دی۔ اس اطلاع پر وہ ہیجان کا شکار ہو گئے تھے اور جاننا چاہتے تھے کہ وہ کہاں پر ہیں۔ ثالی نے لاعلمی کا اظہار کیا اور یہ سچ بھی تھا۔ اس نے اتنا ہی بتایا کہ وہ ٹھیک ہیں۔

☆☆☆

(سیون الیون)

اگلی صبح ہیولٹ کے 7-11 اسٹور میں جا کر اس نے پے فون میں ضروری تبدیلیاں کیں جس کے بعد کوئی سیل فون اسے ٹریس نہیں کرسکتا تھا۔ رات وہ بہت کچھ سوچتی رہی تھی۔ اس نے اس طویل اور خونی کہانی کو انجام تک پہنچانا تھا۔ ڈیڈی، کیوینی، مارکیڈو اور گریگ سب دغاباز تھے۔ سب نے کسی نہ کسی شکل میں اسے دھوکا دیا تھا اور ان میں سے ہی کوئی ایک تھا، جس پر اسے آخری بار بھروسا کرنا تھا۔ یہ ایک دشوار اور خطرناک فیصلہ تھا...... اس نے نمبر پنچ کیے۔ رابطہ ہونے پر وہ بولی۔ ''او کے، میں تیار ہوں۔ کیا پوچھنا ہے؟''

''نیٹ، میں خوش ہوں کہ تم نے ایک اچھا فیصلہ کیا ہے۔''

ملاقات کے لیے ثالی نے ایک پبلک پلیس کا نام لیا۔ جہاں تنہائی کا کوئی امکان نہیں تھا۔ اس نے رابطہ ختم کر دیا۔ کوئی ہمیشہ زندہ نہیں رہتا۔ آسکر مارکیڈو کی بیوی، شیرن، مارگریٹ...... یہ اور دیگر زندہ ہوتے اگر وہ سیکیورٹی پروگرام میں جانے سے انکار نہ کرتی؟ کون جانے؟ اس نے بیگ کی تہ میں کیوینی کی دی ہوئی گن کے اوپر میک اَپ کیس رکھ دیا۔

☆☆☆

اس کال کے تھوڑی دیر بعد لوئیس کے فون کی گھنٹی بجی۔ وہ بروک لین میں تھا۔ کرائے کے ایک سال خوردہ اپارٹمنٹ میں۔ فون اٹھانے کے چکر میں ہاتھ سے ٹکرا کے اس کے بیوی بچوں کی تصویر نیچے گر گئی۔ بڑبڑاتے ہوئے اس نے فون اٹینڈ کیا۔ اس کال کا وہ سارا دن انتظار کرتا رہا تھا۔

''تیار ہو جاؤ۔'' دوسری طرف سے آواز آئی۔ ''آج رات تمہاری ضرورت ہے۔''

''میں تیار ہوں۔'' وہ فوٹو اٹھا کر بیوی بچوں کی تصاویر دیکھنے لگا۔

''لوئیس تم نے ہر کام اچھا کیا ہے۔ میں تمہاری وفاداری سے خوش ہوں۔ آج کا کام بھی اچھی طرح کرنا۔ اس کے بعد تم اپنے گھر بیوی بچوں کے پاس جانے کے لیے آزاد ہو۔'' رابطہ منقطع ہو گیا۔ لوئیس کو بھی گھر جانے کی بے قراری تھی۔ اس نے اپنے سب سے چھوٹے لڑکے کو صرف ایک بار دیکھا تھا۔

☆☆☆

ثالی پرامیناڈو، بروک لین میں تھی۔ اس کے عقب میں ایسٹ ریور کے دوسری جانب مین ہٹن کی بلندیاں تھیں۔ اتوار کا دن تھا۔ رش زیادہ ہی تھا۔ کراؤڈ ہی اس کے لیے حفاظتی دیوار تھا۔ بروک لین برج، کیبلو کے سہارے اس کے سر پر تھا۔ اس نے اطراف کا جائزہ لیا۔ وہاں پولیس کے دو اہلکار بھی موجود تھے۔

پھر اچانک ہی وہ نظروں میں آ گیا۔ فاصلہ زیادہ نہیں تھا۔ دونوں کی نگاہیں چار ہوئیں۔ اس کے ہونٹوں پر وہی بیس سال جیسی مسکراہٹ تھی۔ تاہم ثالی نے مسکراہٹ میں غیر یقینی کا مدھم تاثر دیکھ لیا۔ ثالی کے اعصاب تناؤ کی آخری

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

حد پر تھے۔

''ہیلو نیٹ۔''

گوگو کی شدید کیفیت پر قابو پا کر وہ بولی۔ ''ڈیڈی، تم کون ہو؟''

''کیا مطلب، نیٹ۔ میں تمہارا ڈیڈی ہوں۔''

ثنالی نے نفی میں سر ہلایا۔ ''مجھے یقین نہیں...... شاید آپ تھے۔''

راب مسکرایا اور ثنالی کو ماضی کی چند باتیں یاد دلائیں......

''آپ کا اصلی نام کیا ہے۔ ہماری فیملی کا سچ کیا ہے؟ روزا کون تھی؟ وہ اسپین سے نہیں آئی تھی؟''

''کس نے تم سے باتیں کی ہیں؟ کس نے تم سے جھوٹ بولا ہے؟'' راب نے ہاتھ بڑھایا۔ ثنالی پیچھے ہٹ گئی۔

''میں جانتی ہوں، ڈیڈی۔ آپ عرصے سے مارکیڈوز کے لیے کام کرتے رہے ہیں۔''

''تم میری بیٹی ہو۔ اس کے علاوہ سب جھوٹ ہے۔'' وہ بولا۔

ثنالی کا خون کھول اٹھا۔ اس نے بیگ میں ہاتھ ڈالا۔

''میں بتاتی ہوں جھوٹ کیا ہوتا ہے۔'' اس نے کولمبیا کا فوٹو نکالا، جس میں راب، بھائی کے ساتھ کھڑا تھا۔ ''یہ، یہ جھوٹ ہے...... جھوٹ ایسا ہوتا ہے۔ آپ کی ساری زندگی جھوٹ ہے۔ بیس سال سے آپ جھوٹ بولتے رہے۔ کیا کہوں؟ میں آپ کو گالی بھی نہیں دے سکتی۔ لیکن آپ انسان نہیں ہیں۔''

راب کے تاثرات میں کوئی فرق نہیں پڑا۔ اس نے فوٹو پر نظر ڈالی اور مسکرایا۔ یہ مختلف مسکراہٹ تھی۔ ''کہاں سے ملا یہ؟''

''لعنت ہے...... ہم سب آپ پر ساری زندگی بھروسا کرتے رہے۔ خود اپنے آپ سے زیادہ......''

''میں نے پوچھا...... کہاں سے ملا یہ؟''

ثنالی کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔ ''کیا فرق پڑتا ہے اس بات سے۔ یہ تو آپ بتائیں گے۔ بولیں سب جھوٹ تھا۔ بتا دیں آپ کیا کرتے رہے۔ آپ کون ہیں؟ ہم کون تھے؟'' ثنالی کی آواز بلند ہو گئی۔ جس پر چند افراد متوجہ ہوئے۔ راب نے قدم بڑھایا۔ ثنالی پیچھے ہٹ گئی۔

''وہ تمہارا بھائی ہے۔ میں تمہارے باپ کے بارے میں بھی جانتی ہوں۔ میں جانتی ہوں کہ پروگرام میں جانے کا ڈراما تم نے خود رچایا تھا...... اس کا مقصد بھی جانتی ہوں۔'' وہ آپ سے تم پر آ گئی۔ ''تم نے مارگریٹ کو قتل کیا۔ تم نے اپنی ہی بیوی کو قتل کر دیا...... بفیلو میں اس عورت کو قتل کر دیا۔ تم آدمی ہو یا خونی جانور؟''

راب نے کافی دیر بعد پلکیں جھپکائیں۔ اس نے سرد نگاہ سے اسے دیکھا۔ نظروں میں فولاد کی سختی تھی۔ کوئی تاثر نہیں تھا۔ یک دم گویا شخصیت بدل گئی۔ وہاں کوئی اور کھڑا تھا۔ وہ بنجامن راب نہیں تھا۔

''وہ کہاں ہے۔ سوئٹ ہارٹ۔'' اس کی آواز کھردری ہو گئی۔ ''مجھے معلوم ہے کہ تم اس سے ملی ہو۔ اسی نے تمہارا ذہن آلودہ کیا ہے۔'' راب کی آنکھوں میں بے حد چبھن تھی۔ ثنالی کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ اس کا خیال گن کی طرف گیا۔ اسے احساس تھا کہ اب اسے نکل جانا چاہیے۔ وہ پیچھے ہٹتی گئی۔ ہجوم میں اس کا رخ پولیس کی طرف تھا۔ راب جگہ بناتا ہوا چند قدم آگے آیا پھر رک گیا۔

''صرف تم ہی واحد ذریعہ نہیں ہو۔'' عقب سے اس کی آواز آئی۔ وہ اب ثنالی کو دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ ثنالی کے قدم تیزی سے اٹھ رہے تھے۔ ایک اسٹور کی ونڈو پر ہاتھ رکھ کر اس نے گہرے گہرے سانس لیے۔ دفعتاً شیشے میں اس کی نظر عکس پر گئی۔ لاکٹ گلے سے نکل کر سینے پر آ گیا تھا۔ اس کے ذہن میں جھماکا ہوا۔ ڈیڈی مکمل لاکٹ دیکھ کر سمجھ گئے ہوں گے کہ آسکر سے اس کی ملاقات ہو چکی ہے۔

☆☆☆

گریگ اَن گنت بار کوشش کر چکا تھا۔ کتنے ہی پیغام چھوڑے تھے۔ بمشکل ایک بار تھوڑی سی بات ہو سکی تھی۔ اس نے مایوس ہو کر فون ایک طرف اچھال دیا۔ رات میں کچھ دیر کے لیے وہ کچی پکی نیند لے سکا تھا۔ امید کرتا رہا، دعا کرتا رہا، ہر آہٹ پر اسی کا گمان ہوتا...... کیا وہ دوبارہ اس پر اعتبار کرے گی۔ ثنالی کی بدگمانی درست تھی لیکن وہ اس بات سے لاعلم تھی کہ گریگ درحقیقت اسے دل و جان سے چاہتا تھا اور یہ اس کی ڈیوٹی نہیں تھی۔

وہ کیا بتاتا۔ محبت پر اس کا اختیار نہیں تھا۔ وہ اچھا ڈاکٹر، اچھا شوہر اور بہترین دوست تھا جس چیز نے ہزاروں بار اس کا دل دھڑکایا تھا وہ غیر متوقع طور پر عیاں ہو گئی تھی۔

لیکن ''فیملی'' بلڈ لائن...... وہ اسے دفن نہیں کر سکتے تھے۔ وہ بھی دو ٹکڑوں میں بٹ گیا۔ یہ بھی فیملی اور وہ بھی فیملی۔ تاہم اسے اپنی محبت کی طاقت پر بھروسا تھا۔ اسے

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

اپنی بلڈ لائن سے نفرت محسوس ہونے لگی۔ وہ شرمندہ تھا۔ لیکن اصل فیملی کے بغیر وہ ایک آوارہ، لاوارث، سڑک چھاپ لڑکا ہوتا...... بلڈ لائن کا قرض وہ کب تک اتارے گا۔ یہ سودا اب اسے مہنگا لگ رہا تھا۔ اسے علم تھا کہ ثالی خطرے میں ہے اور وہ بے بس کروٹیں بدل رہا تھا۔

اچانک سیل فون گنگنایا۔ وہ اچھل پڑا۔ ''ثالی......؟''

لیکن آواز سن کر اس کے دل کی دھڑکن رک گئی۔

''بچے، آج تمہاری ضرورت ہے۔ لیب پہنچو۔''

☆☆☆

ایک ہی مقام تھا، جہاں وہ جا سکتی تھی۔ اس نے بورو ہال سے ٹرین نمبر 5 پکڑی۔ وہ سیدھی برونکس تک گئی۔ 180 اسٹریٹ اسٹیشن پر اس نے ٹرین چھوڑ دی۔ اتوار کی وجہ سے پبلک شاپنگ کے لیے نکلی ہوئی تھی۔ وہ مورس ایونیو پر تھی۔ اسے سرخ اینٹوں سے بنی تین منزلہ عمارت نظر آرہی تھی۔ دروازے کی پیشانی پر پیکرز لیب لکھا تھا۔ وہاں وہ محفوظ تھی۔ محدود وقت کے لیے ہی سہی۔ اس نے چابی لاک میں گھمائی اور الارم کوڈ پنچ کیا۔ دروازہ کھول کر وہ اندر آئی اور اسے بند کر دیا۔ خوب اطمینان کرنے کے بعد وہ دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑی ہوگئی۔

معاً اسے ڈیڈی کا آخری جملہ یاد آیا۔ ''صرف تم ہی واحد ذریعہ نہیں ہو۔'' اس کا دل کٹ کے رہ گیا۔ خیال ایملی اور جسٹن کی طرف گیا۔ کیا انہیں معلوم ہے کہ وہ دونوں آنٹی ابیی کے گھر پر ہیں۔ وہ بدحواس ہوگئی...... ثالی نے سیل فون نکالا۔ کیوبیٹی کا نمبر تلاش کر کے اس نے بے چینی سے رابطہ کیا۔ کون جانے وہ کہاں ہے۔ دھڑکن بڑھنے لگی۔ تیسری گھنٹی بجی اور کیوبیٹی کی آواز آئی۔ تھینک گاڈ۔

''میں...... ثالی ہوں۔'' وہ تقریباً چیخ اٹھی۔

''کیا ہوا؟ کیا مسئلہ ہے؟''

''میں نے ڈیڈی کو دیکھا ہے۔ میں جانتی ہوں، وہ کیا کر چکے ہیں۔ صورتِ حال بہت گمبھیر ہے۔ میں مارکیڈو کو بھی جانتی ہوں۔ اسے بھی دیکھا اور ڈیڈی میری تلاش میں ہیں۔ کیونکہ انہیں علم ہوگیا ہے کہ میں جانتی ہوں...... وہ کہاں ہے؟''

''کون کہاں ہے؟ خود کو سنبھالو۔''

''مارکیڈو...... میں جانتی ہوں۔''

''اوکے تم کہاں ہو؟''

''میں لیب میں ہوں۔ محفوظ ہوں۔''

''وہیں رہو۔ کسی صورت باہر مت نکلنا۔ میں نیوجرسی میں ہوں۔ ایف بی آئی سے رابطہ کرتا ہوں۔ ایف بی آئی کے علاوہ کسی کے لیے دروازہ مت کھولنا۔ میں بھی یہاں سے نکلتا ہوں۔''

ثالی نے ہامی بھری، ایملی اور جسٹن کے بارے میں بتایا کہ وہ بھی خطرے میں ہیں۔

''میں سنبھال لوں گا۔''

کیوبیٹی سے بات کر کے اس نے فوراً آنٹی کا نمبر ملایا۔ ''ہم گھر پر نہیں ہیں۔'' وائس ریکارڈنگ میں جواب ملا۔ پھر اس نے ایملی اور جسٹن کا نمبر ملایا...... رابطہ نہیں۔ اس کی بوکھلاہٹ بڑھ گئی۔ ہراس کے عالم میں اس نے پیغام دیا۔ ''ایمی تم اور جسٹن کسی محفوظ جگہ پر چلے جاؤ۔ پڑوس میں...... دوست کے گھر۔ آنٹی کے گھر سے نکل جاؤ۔ مجھ پر بھروسا کرو۔ جلدی کرو۔ وضاحت بعد میں...... پولیس تمہیں پہنچ رہی ہے۔''

اس نے پھر آنٹی کا نمبر ملایا، لیکن کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔

بعدازاں اس نے بیگ میں سے گن نکالی۔ کیا وہ ڈیڈی کے خلاف اسے استعمال کر سکے گی؟ اسی وقت ڈور بزر بولنے لگا۔

''تھینک یو گاڈ۔'' وہ تیزی سے اٹھی۔ گن کاؤنٹر پر رکھ دی اور ہال وے میں بھاگ کر فرنٹ ڈور پر آئی۔

''کون ہے وہاں؟'' اس نے سوال کیا۔

''ایجنٹ بوتھ، ایف بی آئی۔'' جواب آیا۔

ثالی استقبالیہ ڈیسک کے پیچھے گئی اور وڈیو مانیٹر کو دیکھا۔ بلیک اینڈ وہائٹ اسکرین پر بوتھ نظر آرہا تھا۔ اس کے پیچھے بیس بال کیپ میں دوسرا ایجنٹ تھا جس نے شناختی بیج بلند کیا ہوا تھا۔

ثالی نے بھاگ کر دروازہ کھول دیا۔ سبز بتی جل اٹھی اور اسی وقت سیل فون بھی بجنے لگا۔ وہ دونوں اندر آگئے۔ بوتھ کی آنکھیں غیر فطری انداز میں بجھی ہوئی تھیں۔ ثالی کو احساس ہوا کہ آنکھیں زندگی کی روشنی سے محروم ہیں۔ اس کے سینے پر دو سرخ دھبے تھے۔ وہ زمیں بوس ہوگیا۔ پیچھے والے آدمی نے کارڈ ایک طرف اچھال دیا۔ ثالی کی آنکھیں دہشت سے پھیل گئیں۔ وہ بجتے ہوئے فون کی طرف متوجہ ہوئی۔

''نیٹ، فون رکھ دو۔'' راب نمودار ہوا۔ وہ مانیٹر کی زد سے باہر تھا پھر اس نے دوسرے ایجنٹ کی لاش کو دھکیلا...... وہ بوتھ کے قریب گرا۔

☆☆☆

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

حلق سے نکلنے والی چیخ بے ساختہ تھی۔ نتالی نے دونوں لاشوں کو دیکھا اور باپ پر نظر ڈالی۔

''تم یہاں رکو۔'' راب نے ٹوپی والے کو اشارہ کیا اور ہال وے میں قدم رکھا۔ اس نے دروازہ بند کیا لیکن لاک نہیں لگایا۔

''نیٹ بتاؤ، وہ کہاں ہے؟'' اس کی آواز میں سے نرمی اور محبت معدوم ہو چکی تھی۔ نتالی الٹے قدموں چل رہی تھی۔ یہ صدمہ، فکر ونظر کے تمام زاویے توڑ گیا تھا۔ اس کی حالت پہلے ہی بوسیدہ تھی۔ دو دن اس نے ہیومولن (انسولین) بھی نہیں لی تھی۔ وہ بار بار پلکیں جھپکا رہی تھی۔ اس کے اندازے اور تجربے کے مطابق گلوکوز کی سطح 400 کے آس پاس تھی۔ دل گویا بڑھ کر دگنے سائز کا ہو گیا تھا۔ اس کو چند بلاک کے فاصلے پر میڈیکل سینٹر میں ہونا چاہیے تھا۔ ہیومولن اس کے بیگ میں نہیں تھی۔ اس نے لیب میں آتے ہی چیک کیا تھا۔ ریڈنگ 435 سے اوپر گئی تو وہ کوما میں جا سکتی تھی...... وہ ارادے کے بل پر کھڑی تھی۔ معاً نتالی نے محسوس کیا کہ وہ کاؤنٹر کے قریب ہے جہاں گن رکھی تھی۔

وہ لیب کے دوسرے حصے میں جانا چاہ رہی تھی۔ جہاں وہ تجربات کرتی تھی۔ وہاں لاک ہونے کے بعد وہ کسی کو کال کر سکتی تھی۔ اچانک وہ رخ بدل کر بھاگی اور تجربہ گاہ میں گھس گئی۔ دروازہ بند کر کے اس نے خود کو دروازے پر گرا دیا۔ بچی کھچی تمام توانائی اس نے دروازہ لاک کرنے پر لگا دی لیکن راب کے مقابلے میں ظاہر ہے یہ ناکافی تھی۔

''نو، ڈیڈی......نو۔''

دروازہ چھوڑ کر، جو اس کے ہاتھ میں آیا اس نے پھینک کر مارا۔ بیکرز، وائلز، جارز......

''میں تمہاری بیٹی ہوں۔'' وہ چلائی۔ سینے میں ایک حشر بپا تھا۔ حلق میں کانٹے اگ رہے تھے۔ وہ ایک بازو سامنے کیے بڑھتا رہا۔ نتالی نے ٹوٹے ہوئے بیکر سے اس پر وار کیا۔ لیکن راب نے بہ آسانی اس کی کلائی پکڑ کر مروڑ دی۔ نتالی کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ بیکر کا ٹکڑا نیچے گر گیا۔

''میری ماں کو کیوں مارا؟ وہ محبت کرتی تھی۔ ہم سب محبت کرتے تھے۔ ڈیڈی، کیوں؟'' اس کی آواز بھٹکنے لگی۔ اس نے ہتھیار کی تلاش میں اِدھر اُدھر دیکھا۔ کاؤنٹر پر گن پڑی تھی۔ لیکن وہ ہال وے میں تھی۔ راب کے ایک ہاتھ میں اس کی گن تھی۔ دوسرے ہاتھ سے اس نے نتالی کی گردن دبوچ کر پیچھے دھکیلا۔ آکسیجن کے لیے پھیپھڑوں نے زور لگایا۔ منہ ماہیٔ بے آب کے مانند کھل گیا۔

''ڈیڈی......ی......'' اس کی آنکھیں حیرت اور تکلیف سے پھٹ گئیں۔

دفعتاً راب نے گردن چھوڑی اور گولڈ چین پر ہاتھ مارا۔ لاکٹ باہر آ گیا۔ ''بتاؤ، وہ کہاں ہے؟''

''میں یہاں ہوں۔ تمہارے قریب۔'' عقب سے آواز آئی۔

☆☆☆

لوئیس، حسبِ ہدایت ہال کے باہر ٹھہرا ہوا تھا۔ اس نے اپنا کام صفائی سے کیا تھا۔ لڑکی کا تعاقب کامیاب رہا۔ علاوہ ازیں دو ایجنٹ بھی اس کے ہاتھوں مارے گئے۔ بس اب صرف ایک کام رہ گیا تھا۔ جو ذرا ٹیڑھا تھا۔ لیکن اس کے بعد وہ واپس اپنی بیوی بچوں کے پاس جانے کے لیے آزاد تھا۔ راب اندر کیا کر رہا ہے؟ اس نے سگریٹ سلگاتے ہوئے سوچا۔ گھڑی پر نظر ڈالی اور گہرا کش لیا۔ وہ آخری کام کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ ''فریدرنیدا'' کے نام پر وہ ہر امتحان میں پورا اترا تھا۔ اس کے خیالات اپنے بچوں کی طرف چلے گئے۔ وہ بچوں کو فٹ بال اور بیس بال میں کوچ کر سکتا تھا۔ اسے بچے پسند تھے۔ اس کے پاس کافی رقم جمع ہو گئی تھی۔ ممکن ہے کہ وہ ان سب کو کولمبیا سے یہیں پر لے آئے۔ اس نے سگریٹ کو بوٹ کے نیچے مسلا اور دروازے کے پٹ پر ہاتھ رکھ کر اندر جھانکا۔ اس کے اندازے سے زیادہ تاخیر ہو گئی تھی۔ اسی وقت اس کی پشت سے کوئی چیز ٹکرائی۔ گھونسا تھا یا کچھ اور...... شناخت میں الجھے بغیر وہ گھٹنوں کے بل پر گرا۔ اس نے اذیت کی لہر کے ساتھ ہاتھ پیچھے کیا...... واپسی پر ہاتھ لہو میں تر تھا۔ ایک اور گھونسا؟ وہ منہ کے بل گرا...... نہیں، یہ گھونسا نہیں تھا۔ منہ سے خون رسنے لگا۔ نظر دھندلا گئی۔ اس نے گردن موڑی۔ مختصر داڑھی والا آدمی، جس کے سر پر ٹوپی تھی، وہاں کھڑا تھا۔ کھانسی آئی، اس نے خون کی الٹی کی۔ اس سے زیادہ کون جانتا تھا کہ دو وار کتنے ہلاکت خیز تھے اور وہ موت کی شاہراہ پر چل پڑا تھا۔ سینے میں جیسے بلیڈ چل رہے اور حلق میں خون کے غرغرے۔ یہی طریقہ تھا، ٹھیک اندازہ تھا۔

بس خواب، بیس بال، بیوی، بچے، ''فیملی''...... ''فریدرنیدا'' سب جھوٹ تھا۔ سچ سرخ رنگ کا تھا جو منہ سے نکل رہا تھا۔ داڑھی والا نیچے بیٹھ گیا اور اسپینش زبان میں بولا۔ ''گھر جانے کا وقت ہے۔'' گن کی نال اس نے لوئیس کی کھوپڑی پر رکھ دی، ٹریگر دبا اور لوئیس ہر قسم کے احساس سے بیگانہ ہو گیا۔

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

''امیگو، تمہاری ڈیوٹی ختم۔''

☆☆☆

''بنجامن۔'' آواز میں سکون تھا۔ ''یہاں۔''
ثانی نے دیکھا کہ ڈیڈی کے چہرے کی ہر لکیر گہری ہوگئی تھی۔ راب نے ثانی کی آنکھوں میں دیکھ لیا تھا، پیچھے کون کھڑا ہے۔
مارکیڈو نے قدم بڑھائے۔ ''برادر، گن رکھ کر گھوم جاؤ۔''
ثانی کے باپ نے ایسا ہی کیا۔ ثانی بھی تجربہ گاہ سے باہر آگئی۔ ایک پیچ در پیچ غیر معمولی کہانی کا کلائمکس آن پہنچا تھا فریدر نیدا۔ دو بھائی رُوبرو تھے۔ ریسرچ لیب، میدانِ کارزار تھی۔ کیمیکل کی جگہ خون بہہ رہا تھا۔ عقیدہ یہی تھا۔ خون سے خون دھلتا ہے۔ بیس برس بعد دونوں آمنے سامنے تھے۔
''میری تلاش تھی، بین۔'' آسکر مارکیڈو مسکرایا۔ ''لو میں آگیا۔'' اس نے گن عام سے انداز میں پکڑی ہوئی تھی۔
''کیا ارادہ ہے؟'' راب نے سوال کیا۔
''ماروں گا نہیں۔'' آسکر نے جواب دیا۔ ''ہاں، باہر والا اور تمہارے دیگر آدمی مارے جا چکے ہیں۔ بہت خون بہہ گیا۔ کیا خیال ہے۔ اب اور نہیں۔ شیرن اور میری بیوی روز یا نلمر... کیوں، جھوٹ نہیں ہے نا؟''
''پھر کیا چاہتے ہو؟'' راب نے بھائی کو تولا۔
''کیا چاہتا ہوں؟'' مارکیڈو نے ثانی کو دیکھا۔ ''میں چاہتا ہوں کہ ثانی سچ سن لے۔ جو شیرن نہ سنا سکی۔ بس ہم تین ہیں۔ ثانی سے تم نے کیا چھپایا خود اسے بتا دو۔'' وہ ایک قدم آگے آگیا۔ اس کی نگاہ برمے کے مانند دماغ میں گھسی جا رہی تھی۔
راب کی پُتلیاں حلقوں میں گردش کر رہی تھیں۔ اس کی کیفیت پنجرے میں بند درندے کے مانند تھی۔ اس نے آہستگی سے ثانی کی جانب حرکت کی۔ ثانی اس کی بے قراری اور بے بسی کو دیکھ رہی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ وہ ثانی کو یرغمال بنانے کی کوشش کرے گا۔ وہ خود بھی کچھ دور ہٹ گئی۔
''ہتھیار کے سائے میں کیا سچ بولا جا سکتا ہے۔ لاکٹ بھی تم نے مکمل کیا۔ گن بھی تمہارے پاس اور سچ بھی تم جانتے ہو۔'' راب نے کہا۔
پھر جو حرکت مارکیڈو نے کی، ثانی کو لگا جیسے بجلی کا ننگا تار اس کی جلد سے چھو گیا ہو...... مارکیڈو نے گن قریبی اسٹول پر رکھ دی تھی وہ خالی ہاتھ کھڑا تھا۔
''بین، اب صرف سچ باقی ہے۔ ثانی کو بتاؤ، کیا تم خوف زدہ تھے سچ بتانے سے؟''
ثانی کو ادراک ہوگیا کہ اب اس کا زندہ بچ نکلنا محال ہے۔ خون میں بڑھتا ہوا گلوکوز کا عنصر اثر پذیری میں شدت اختیار کر رہا تھا اور مارکیڈو نے گن چھوڑ کر ٹھیک نہیں کیا تھا۔ تاہم وہ مارکیڈو کے اطمینان پر انگشت بدنداں تھی۔
''ڈیڈی! سچ کہاں چھپا ہے؟'' وہ بولی۔ ''بتا دیں۔''
راب نے کوئی جواب نہیں دیا۔
مارکیڈو مسکرایا۔ ''بین، بتا دو گے تو کیا فرق پڑے گا۔ کچھ بھی نہیں۔ شیرن تو ہے نہیں اور نہ تم شیرن کے پیچھے تھے۔'' مارکیڈو کی آنکھوں میں سکون اور اعتماد کے سوا کچھ نہ تھا۔ ''یا میں جھوٹ بول رہا ہوں...... تم شیرن کو ہی نشانہ بنا رہے تھے؟...... یہی وقت ہے، سچ اس کو بتا دو...... یہ اس کا حق ہے۔''
وہاں مرگ آسا سناٹا چھا گیا۔
مارکیڈو کی معنی خیز نگاہ نے ثانی کو مسحور کر دیا۔ اُسے ساعت کا دھوکا معلوم ہوا...... وہ اپنے باپ کی طرف مڑی۔
''مجھے......؟'' اس کی زبان لڑکھڑا گئی۔
''تم نے مجھے مارنے کی کوشش کی تھی؟ کیوں؟''
ثانی کی نظروں کے سامنے دھند بڑھ گئی۔ اس کے تصور میں وہ منظر ابھرا جب وہ شیرن کے ساتھ ارنی نامی اوپن ریسٹورنٹ میں بیٹھے تھے۔ ہوا کے ہلکے جھونکے نے پلاسٹک کا گلاس لڑھکا دیا...... وہ بے ساختہ گلاس پکڑنے کے لیے جھکی تھی اور گولی اس کے شانے میں سے گزر کر شیرن کی زندگی کا دیا بجھا گئی...... اگر وہ نہیں جھکتی......؟
راب نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کا ہاتھ عقب میں گیا۔ واپس آیا تو اس میں گن تھی۔ مارکیڈو سابقہ حالت میں کھڑا تھا۔ اس نے دفاع کے لیے رتی بھر کوشش نہیں کی۔
ثانی چیخی۔ ''نو'' اور فائر ہوا۔ ''گولی مارکیڈو کی دائیں ران میں گھس گئی۔ اس کے دونوں گھٹنے مڑے تاہم وہ گھٹنوں کے بل کھڑا رہا۔ چہرے پر اذیت و پریشانی کا نام و نشان تک نہ تھا۔ ''بین، بتا دو۔ کیونکہ تم بتاؤ گے تو درد ہوگا...... گولی کیا کر سکتی ہے...... تمہیں تو درد پہنچانا تھا...... خون بھی اور درد بھی...... سر میں گولی مارنے سے درد کہاں ہوتا ہے...... درد جذبات اور احساسات و محبت کو پارہ پارہ

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

کرنے سے ہوتا ہے۔ خون سے خون کو دھوؤ گے؟ یہ تم ٹھہر کے کرو گے۔ میں غلط کہہ رہا ہوں؟ لیکن یہ عقیدہ باطل تھا۔ ورنہ لوئیس کے فوراً بعد تمہاری باری یقینی تھی، میرے ہاتھوں...... یہی وقت ہے، جلدی کرو۔ بتاؤ۔'' مارکیڈو نے ثنالی کو دیکھا، اس کی آنکھوں میں نرمی اور یقین کے ساتھ ثنالی نے محبت کی جھلک دیکھی۔ وہ خود بے سوز وصدا، لب بستہ کھڑی تھی۔ آنکھوں سے موجِ خون رواں تھی۔

''بتاؤ، لاکٹ کے بارے میں بھی بتاؤ۔ اس کا راز بھی بتاؤ۔'' مارکیڈو، ثنالی کو دیکھ کر یوں مسکرایا جیسے وہ اس کی بیٹی ہے۔ ''ثنالی تمہاری ماں چاہتی تھی کہ لاکٹ تم تک پہنچے۔'' وہ متواتر ثنالی کو دیکھ رہا تھا۔ ''شیرن نہیں...... تمہاری ماں چاہتی تھی۔''

وہ جاں بلب ہوگئی۔ انکشاف در انکشاف۔ رگِ جاں میں شگاف پڑ گیا۔ یوں لگا کہ وہ بارود کے ڈھیر پر کھڑی ہے......

''بین بتادو...... جب درد دیتے ہو، تشدد کرتے ہو تو کیسے کرتے ہو......''

فائر ہوا، گولی مارکیڈو کے شانے میں بیٹھ گئی۔ وہ پیچھے کی جانب جھول گیا اور ایک ہاتھ فرش پر ٹکا دیا۔

ثنالی کی چیخ دلخراش تھی۔ ''نو، ڈیڈی...... نو۔''

اس نے اپنا سویٹر اتار کر مارکیڈو کے کندھے پر لپیٹ دیا۔ شیرن، ماں، لاکٹ، اس کے اپنے دماغ میں دھماکے ہو رہے تھے۔

''وہ کیا کہہ رہے ہو تم؟''

''ہاں، وہ بہت خوب صورت تھی۔ اسے ذیابیطس ہو گیا تھا اور میں مقدمے میں پھنس کر جیل جا رہا تھا۔ میں بچی کو ٹھیک طرح کیونکر پالتا۔ میرے پاس کوئی چوائس نہیں تھی۔''

ثنالی کو یاد آیا کہ پارک میں مارکیڈو نے بتایا تھا کہ اس کی بیوی کا انتقال ذیابیطس کی وجہ سے ہوا تھا۔ وہ نرمی سے ثنالی کو دیکھ رہا تھا۔ ''بین! میں بچی کو ماں کے بغیر کیسے چھوڑ دیتا۔ میں جانتا تھا کہ بچی کم از کم کہاں بہترین انداز میں پل بڑھ سکتی ہے...... محفوظ رہ سکتی ہے۔ تمہارے ساتھ اپنی خالہ کے گھر......''

تیسرا فائر...... مارکیڈو پہلو دبا کر زمین بوس ہوگیا۔

ثنالی کے ذہن میں بجلی کڑکی۔ راز، راز نہ رہا۔ کہنے سننے کو کچھ نہ رہا۔ وہ اپنے حقیقی باپ کو دھیرے دھیرے مرتا دیکھ رہی تھی۔ شیرن بھی اس کی ماں نہیں تھی۔ ثنالی کے دماغ کا ہر خلیہ ساکت ہوگیا تھا۔ وہ جان گئی کہ روز اس کی حقیقی ماں تھی۔

''میں نے سوچا تھا کہ میں نے تمہارے لیے صحیح فیصلہ کیا تھا۔'' مارکیڈو نے ثنالی سے کہا۔

''ہاں، لیکن اس وقت...... جب تک تم نے ''فیملی'' کے اصول نہیں توڑے تھے۔'' راب نے کہا۔

''میری بیٹی...'' فرید رنیدا سے زیادہ قیمتی ہے۔ خون سے خون کو نہیں دھویا جاسکتا۔ میں مطمئن ہوں برادر میں نے تم سے کبھی غداری نہیں کی۔''

راب نے چوتھے فائر کے لیے نشانہ لیا۔ ''نہیں۔'' ثنالی دیوانہ وار جھپٹی...... راب نے اسے ایک طرف دھکا دیا۔ وہ لیب کاؤنٹر کے قریب ٹرے سے ٹکرا کر گری۔ ٹرے میں موجود ٹیوبس فرش پر بکھر گئیں۔ دفعتاً اسے احساس ہوا کہ وہ جہاں گری تھی۔ وہیں ذرا اوپر کاؤنٹر پر اس کی گن رکھی تھی۔

''بین، دیکھو اُسے...... تم نے سب کچھ کھو دیا۔ تمہارا دل فقیر کے کشکول کے مانند ہے۔ جسے فرید رنیدا یا نام نہاد ''فیملی'' نہیں بھر سکتی...... خالی دل کے ساتھ کہاں جاؤ گے؟''

''میں تو واپس جاؤں گا۔'' راب نے اس کی پیشانی کا نشانہ لیا۔ ''لیکن تم کہاں جاؤ گے؟ کہیں بھی نہیں...... جہنم میں۔''

''نہیں مسٹر بین راب۔'' ثنالی کو اپنی ہی آواز اجنبی لگی۔ اس نے مضبوطی سے دونوں ہاتھوں میں گن پکڑی ہوئی تھی۔ گن کا رخ راب کی جانب تھا۔

☆☆☆

ثنالی نے یہ فقرہ بول بھی دیا اور گن بھی تان لی۔ لیکن وہ اپنے اگلے قدم سے بے خبر تھی۔ راب نے بھائی کی جانب سے توجہ ہٹالی۔ ویسے بھی مارکیڈو حرکت نہیں کرسکتا تھا۔

''نیٹ، تم مجھے شوٹ کرو گی؟''

''مت کہو مجھے نیٹ۔''

''ثنالی، یہاں سے چلی جاؤ۔ کرنے دو اسے جو وہ کرنا چاہتا ہے۔'' مارکیڈو نے ثنالی سے کہا۔

''نہیں۔'' وہ راب کو گھورتی رہی۔ وہ اب تک اتنے صدمے اٹھا چکی تھی۔ اتنی تکلیف سہہ چکی تھی کہ بے حس ہوگئی تھی۔ اس وقت وہ نگاہ کے سامنے چھائی دھند سے لڑ رہی تھی۔

''اِسے نیچے رکھ دو۔'' راب نے کہا۔ ''وہ صحیح کہہ رہا

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

ہے۔تم یہاں سے چلی جاؤ...... میں تمہیں تکلیف پہنچانا نہیں چاہتا۔‘‘ اس کا گن والا ہاتھ جھک گیا تھا۔

’’اوہ، تم پہلے ہی اتنے زخم دے چکے ہو کہ دنیا بھر کا مرہم بھی ان کی تکلیف کم نہیں کرسکتا۔‘‘

راب نے وقفہ لیا۔ وہ گہری نگاہ سے ثنالی کی کیفیات پڑھ رہا تھا۔ پھر ایک پُراسرار مسکراہٹ کے ساتھ اس کا گن والا ہاتھ دوبارہ اٹھنا شروع ہوا۔ دھیرے دھیرے۔ ’’تم مجھے مارو گی؟ جس نے تمہیں بیس برس تک محبت سے پالا...... تم یہ کیسے کرسکتی ہو؟‘‘ راب کی مسکراہٹ نے ثنالی کو لرزا دیا۔

’’ڈیڈ!‘‘ وہ بولی۔ آنسو آنکھوں سے رواں تھے۔

’’مجھے مجبور مت کرو۔‘‘

’’گو۔‘‘ مارکیڈو نے کہا۔ اس کے آس پاس فرش پر خون پھیلتا جارہا تھا۔ ’’گو...... شوٹ۔ اگر تم یہ کرسکتی ہو...... شوٹ۔‘‘

’’ہم دونوں جانتے ہیں کہ میں کسی وقت بھی اسے ختم کرسکتا ہوں۔ مار دو مجھے...... شوٹ بے بی۔ یہی وقت...... کیا تم ایسا کرسکتی ہو؟‘‘ راب نے گن کا رخ ثنالی کی طرف کر لیا۔

ثنالی کو ہاتھ میں گن برف کا ٹکڑا معلوم ہورہی تھی اور انگلیاں بھی منجمد تھیں۔ ’’ٹریگر دباؤ...... دباؤ۔‘‘ اس کے اندر کوئی چیخ رہا تھا۔ ’’دباؤ...... وہ تمہارا باپ نہیں ہے۔ وہ ایک جانور ہے۔‘‘ ثنالی نے سینے کا نشانہ لیا اور آنکھیں بند کرلیں۔

کیو بیٹی کی ہدایات کو یاد کیا۔ اس کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ اسے یقین نہیں تھا کہ گولی کس طرف جائے گی...... دھماکا ہوا۔ ٹریگر دبا کر اس نے آنکھیں کھول دیں۔ رنگ فق تھا۔ راب کے تاثرات بدل گئے تھے۔ وہ لڑکھڑایا۔ اس کا ایک ہاتھ جیکٹ کی جیب میں تھا۔ راب نے ہاتھ باہر نکالا تو وہ خون میں تر تھا۔ وہ غیر یقینی نظروں سے ثنالی کو گھور رہا تھا۔ شکر ہے کہ گولی ہوا میں نہیں گئی تھی۔ راب کے اندر پوشیدہ حیوان باہر آگیا تھا۔ ڈراما، جھوٹ، محبت...... بیس سال سب تحلیل ہوگئے تھے۔

راب نے گن کا رخ مارکیڈو کی کھوپڑی کی طرف کردیا۔

’’نہیں۔‘‘ ثنالی چلائی اور ٹریگر دبا دیا۔ راب گھوم گیا۔ گولی اس مرتبہ اس کے دائیں بازو میں لگی تھی۔ اس نے ایک ہاتھ سے بازو دبایا، گن چھوٹ کر فرش پر گر گئی۔ راب نے خونی نظر سے ثنالی کو دیکھا اور گری ہوئی گن کی طرف گیا۔

’’پلیز...... رک جاؤ۔‘‘ ثنالی رو رہی تھی۔ گن دونوں ہاتھوں میں تھی۔ ہاتھ کانپ رہے تھے۔ وہ راب کے قریب چلی گئی اور ہینڈ گن سے اس کے سینے کا نشانہ لیا۔

’’جو کرنا ہے کرو...... اپنے باپ کو مار دو۔‘‘

’’تم میرے باپ نہیں ہو۔‘‘ اس نے دھندلی نظر سے باپ کی شبیہ کو دیکھا۔

راب ہانپتے ہوئے جھکا اور گن پکڑ لی۔

’’نہیں۔ رک جاؤ۔‘‘

راب نے نیچے بیٹھے بیٹھے گن کا رخ ثنالی کی طرف کیا۔

ثنالی کا سر گھوم رہا تھا۔ نگاہ کے سامنے دھند کے بادل تھے۔ اسے محسوس ہوا کہ وہ ٹریگر تک نہیں دبا سکتی۔ اس کی ٹانگیں بھی لرز رہی تھیں۔ فائر کرنے کی کوشش ناکام ہوگئی۔ اعصاب ساتھ چھوڑ رہے تھے۔ وہ گرنے ہی والی تھی کہ دھماکا ہوا۔ ثنالی کے بجائے راب آگے کی جانب گرا۔ اس کے سینے سے خون کی پھوار نکلی۔ گن پھر گر گئی...... وہ خود بھی گرا...... کبھی نہ اٹھنے کے لیے۔

ثنالی نے آنکھیں سکیڑ کر دروازے کی جانب دیکھا۔ وہاں سفید رنگ کا بھوت کھڑا تھا...... گریگ۔

’’میں نے کہا تھا نہ کہ میں تمہیں کبھی نقصان نہیں پہنچنے دوں گا۔ تم ہمیشہ مجھ پر بھروسا کرسکتی ہو۔‘‘ گریگ نے کہا۔

ثنالی کا پورا وجود لرز رہا تھا۔ اس نے گن چھوڑ کر کاؤنٹر کا سہارا لیا۔

آخری آواز مارکیڈو کی تھی جو ثنالی نے سنی۔ وہ گریگ سے کہہ رہا تھا۔ ’’اسے دوائی دو...... جلدی کرو۔‘‘

گریگ، ثنالی کی طرف بھاگا۔

ثنالی کے منہ سے سرگوشی کی شکل میں دو الفاظ نکلے۔ ’’میڈیکل سینٹر۔‘‘ پھر وہ گریگ کی بانہوں میں بے ہوش ہوگئی۔

☆☆☆

پولیس منٹوں میں لیب تک پہنچ گئی تھی۔ ایمرجنسی میڈیکل سروس کی گاڑیاں پیچھے آرہی تھیں...... لیب ’’وار زون‘‘ کا منظر پیش کررہی تھی، خون، لاشیں، زخمی...... پٹرول کارز کی روشنیاں اور سائرن سے فضا گونج رہی تھی۔

ثنالی، گریگ کی بانہوں میں تھی۔ اسے نیا حوصلہ اور توانائی مل گئی تھی۔ تاہم انسولین کی ضرورت پیش از پیش تھی۔ اس نے گریگ کو صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ اس نے ایمرجنسی میڈیکل ٹیم کے سامنے تعارف پیش کیا اور اولین

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

کارروائی کی ہدایت کی...... ٹیم کا ایک حصہ مارکیڈو کو سنبھال رہا تھا۔ ایسے حالات ثنالی کے گمان سے ملین میل کے فاصلے پر تھے۔ لہٰذا وہ شاک کی حالت میں تھی۔ تاہم ضروری انسولین ملنے کے بعد اس نے سنبھلنا شروع کیا...... اس نے پولیس کو بتایا کہ وہ صرف سیکیورٹی پروگرام کے ایجنٹ کیویٹی سے بات کرے گی۔

راب مر چکا تھا۔ مارکیڈو زندہ تھا۔ اگرچہ اس کی سانس کی ڈوری نازک دھاگے کے مانند تھی۔ ثنالی کا ایک ہاتھ اپنے حقیقی باپ کے رخسار پر تھا۔ وہ متواتر اسے حوصلہ دے رہی تھی۔ شاید بیٹی کی زندگی اور محبت تھی کہ وہ کسی نہ کسی طرح موت سے لڑ رہا تھا۔ وہ نیم بے ہوشی کے عالم میں کچھ بڑبڑا رہا تھا۔ ثنالی نے محسوس کیا کہ اب بھی کچھ رہ گیا ہے جو وہ اسے بتانا چاہ رہا ہے۔ ثنالی نے اس کا ہاتھ دبایا۔ ''پلیز، کچھ نہ بولیں...... آپ کو کچھ نہیں ہوگا۔''

کچھ دیر بعد کیویٹی بھی خونی منظرنامے پر طلوع ہوا۔ ثنالی اسے دیکھتے ہی اٹھ کے اس کے ساتھ لپٹ گئی۔

''وہ...... وہ...... مائی ڈیڈی۔'' وہ ہچکیاں لے رہی تھی۔ ''اس نے مارکیڈو کی طرف اشارہ کیا۔ ڈیڈی...... نہیں راب...... ب...... باہر والے آدمی...... کے ساتھ آئے تھے۔ انہوں نے دونوں ایجنٹ مار دیے تھے۔ میں سمجھی...... میں...... مم...... مجھے ڈیڈی...... نہیں راب کو مارنا پڑا...... اسے بچاؤ۔ وہ میرا...... باپ ہے...... میں سب......''

''چپ ہو جاؤ۔ میں جانتا ہوں۔ یہ باتیں بعد میں ہوں جائیں گی۔ وقت کم ہے۔'' اس نے ثنالی کو خود سے علیحدہ کرنے کی کوشش نہیں کی۔ تاہم وہ سسکیاں لیتی ہوئی خود ہی الگ ہو گئی۔

ایمرجنسی کے عملے نے مارکیڈو کے اسٹریچر کو گھیرا ہوا تھا۔

''کہاں لے جا رہے ہو؟'' ثنالی کی آواز رندھ گئی۔

کیویٹی نے اسے شانوں سے پکڑ لیا۔ ''ثنالی، آئی ایم سوری...... یہ تم نہیں سمجھ سکتیں۔ دعا کرو کہ وہ بچ جائیں۔''

''ہاں وہ زندہ رہیں گے۔ میرے لیے زندہ رہیں گے۔'' وہیل اسٹریچر کے پہیے گھومے۔ عملہ ایمبولینس اور پھر اسپتال میں جانے سے پہلے جو کچھ کرسکتا تھا، وہ کر رہے تھے۔

''نہیں!'' وہ چیخی اور بھاگ کر باپ کا ہاتھ پکڑ لیا۔

''میں نے ٹھیک کیا تھا۔'' وہ کمزور آواز میں بولا۔

''ہاں۔'' ثنالی نے ہاتھ دبایا۔

وہ مسکرایا۔

ثنالی کوریڈور میں ساتھ چل رہی تھی۔

''وہ تم سے محبت کرتا ہے۔ گریگ کو میں نے بھیجا تھا، تمہاری حفاظت کے لیے......''

''میں سمجھ گئی۔''

''میری جیب میں کچھ ہے، اسے نکال لو۔''

ثنالی کا ہاتھ مارکیڈو کی جیکٹ کی جیب میں گیا۔ واپس آیا تو اس میں ایک لاکٹ تھا۔

''یہ تم سے باتیں کرے گا۔ تمہیں کچھ بتائے گا۔'' اس نے کہا۔

''ثنالی نے اس وقت تک اس کا ہاتھ نہیں چھوڑا۔ جب تک اسے ایمبولینس میں منتقل نہیں کر دیا گیا۔ اسے معلوم تھا کہ وہ اسے پروگرام میں واپس لے جا رہے تھے۔ وہ دوبارہ نہیں مل سکے گی۔

''گڈ بائے۔'' وہ روتے روتے مسکرائی۔ ''ڈیڈی......''

کیویٹی نے ثنالی کے شانے پر ہاتھ رکھا۔

''ان کے ساتھ کیا ہوگا؟'' ثنالی نے سوال کیا۔

''کون؟ کس کی بات کر رہی ہو؟'' وہ دھیمے سے مسکرایا۔

ثنالی خاموش رہی۔ پھر اُس نے لاکٹ والی مٹھی کھولی۔ وہ پالش کی ہوئی چاندی کا ایک پرانا لاکٹ تھا۔

''یہ تم سے باتیں کرے گا۔'' ایک سرگوشی ثنالی کی سماعت میں ابھری۔ ثنالی نے اسے کھولا اور پلکیں جھپکنا بھول گئی۔ وہی تصویر۔ سبز مقناطیسی آنکھیں، حسین چہرہ، ریشمی زلفیں۔ ثنالی آئینہ دیکھ رہی تھی۔ وہ اس کی ماں کی تصویر تھی۔ خشک آنکھوں سے دو آنسو کہیں سے نکل آئے۔ وہ مسکرائی۔ تصویر کے نیچے نام کھدا ہوا تھا۔ روز پاکلر۔ ایک منٹ بعد اس کے گلے میں دو لاکٹ نظر آ رہے تھے۔

''تھینک یو، ماما۔''

☆☆☆

پوری طرح سنبھلنے میں ثنالی کو کئی روز لگے۔ میڈیکل کیئر کے ساتھ پولیس اور ایف بی آئی کے ساتھ میٹنگز بھی چلتی رہیں۔

یہ کیسا انجام تھا۔ ناقابلِ فراموش۔ راب کا آخری فقرہ بھی صحیح تھا۔ ''تم گزشتہ بیس برسوں کو کیونکر مٹا سکو گی؟''

وہ گریگ کے ساتھ رٹز میں کافی پی رہی تھی۔

''آئندہ کوئی چیز خفیہ نہیں ہوگی، میرا وعدہ، پکا وعدہ۔''

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

''گریگ، ڈیڈی کہہ رہے تھے کہ تم مجھ سے بہت محبت کرتے ہو؟''

''بہت زیادہ!'' گریگ نے کہا۔

''سچ؟''

''ہاں۔ اور تم؟''

''کم۔''

''کتنا کم؟''

''بہت کم!''

''سچ کہہ رہی ہو؟''

''ہاں۔''

''کتنا سچ؟''

''بہت، بہت...... تھوڑا سا۔'' دونوں ایک ساتھ مسکرائے۔

☆☆☆

ٹینا نے بھی زندگی اور موت کی جنگ جیت لی تھی۔ تاہم بستر پر تھی اور جواب دینے کے قابل نہیں تھی۔ کبھی کبھی ہاتھ اور آنکھوں کی مدد سے اشارے کر دیتی تھی۔ ثنالی روز پابندی سے ملاقات کے لیے جاتی تھی۔ تینا اسے آنکھیں کھول کر دیکھتی اور ثنالی یک طرفہ باتیں شروع .... کر دیتی۔ ایک روز ثنالی نے محسوس کیا کہ ٹینا کچھ کہنے کی کوشش کر رہی ہے۔ ثنالی نے اپنا کان اس کے لرزتے ہونٹوں پر رکھ دیا۔

''اوہ مائی گاڈ!'' وہ خوشی سے اچھل پڑی۔ ٹینا نے ایک تکنیکی لفظ بولا تھا، جو اس کی ریسرچ سے متعلق تھا۔ ثنالی باہر بھاگی۔ ''میں گریگ اور تمہاری ماں کو فون کر کے آتی ہوں۔ وہ بھی لاؤں گی جو تم نے بولا ہے۔ لو یو۔''

☆☆☆

''تم بتاتی کیوں نہیں ہو؟'' گریگ نے اصرار کیا۔ وہ پھر رٹز میں بیٹھے تھے۔

''کیا بتاؤں؟''

''وہی...... کتنا زیادہ پیار کرتی ہو؟''

''بتایا تو تھا۔''

''ٹھیک سے بتاؤ۔''

ثنالی نے مسکرا کر اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ ''قریب آؤ، ٹھیک سے بتاتی ہوں۔''

''یہ ہوئی نہ بات۔'' گریگ نے چہرہ آگے کیا۔

''بن پیے نشہ رہتا ہے...... محبت نہیں عشق کا پوچھ۔''

''ہائیں۔'' گریگ کا منہ کھل گیا۔ ''کب سے؟''

''کیا، کب سے؟''

''تم ریسرچ کر رہی ہو یا شاعری...... پھر کہنا۔''

''کیا کہا تھا میں نے؟'' وہ انجان نظر آئی۔

گریگ کا قہقہہ بلند ہوا۔

''پاگل ہو رہے ہو۔'' ثنالی نے اُس کے منہ پر ہاتھ رکھا۔

''پاگل؟ میں تو درماندگیٔ خرد کی آخری حد پر ہوں......''

''بس معاف کرو۔'' ثنالی نے ہاتھ جوڑ دیے۔

''ڈاکٹر ٹھیک ہو۔ کیٹس کی ٹانگ مت توڑو۔ اور ایک بات بتاؤ۔'' ثنالی نے ہنسی دبائی۔

''پوچھیے جناب؟''

''گریگ کیا میں بلیو زون میں کبھی پازون کے باہر ڈیڈی سے مل سکوں گی؟''

''یہ ایک کرشمہ تھا کہ وہ بچ گئے۔'' گریگ نے کہا۔

''کون جانے کبھی ملاقات کا کرشمہ بھی ظہور پذیر ہو جائے۔''

☆☆☆

یہی سچائی تھی کہ وہ اپنے ماں باپ کے ساتھ منسلک تھی اور یہ رشتہ کبھی نہیں ٹوٹ سکتا تھا...... میموریل سروس، اختتامی دعائیہ دور میں داخل ہو رہی تھی۔ ربی نے حاضرین سے کھڑے ہونے کی درخواست کی۔

''اس قبرستان میں جو لوگ دفن ہیں۔ انہیں ہماری دعاؤں کی ضرورت ہے۔ ان کے رشتے دار اور چاہنے والے یہاں موجود ہیں۔ آپ لوگ اب بھی ان کے ساتھ ہیں...... دعا کیجیے۔'' ربی نے بولنا شروع کیا اور حاضرین فقرے دہراتے رہے۔

''خود کو آزاد محسوس کریں اور اپنے چاہنے والوں کا نام لیں۔''

دوسری قطار میں کوئی کھڑا ہوا۔ ''روتھ برنسٹن۔'' اس نے کہا۔ ایک اور آواز آئی۔ ''ایلن مارکس۔'' ایک اور ''آرتھر لیوین...... عقب میں کوئی کھڑا ہوا۔ ''کترینہ ڈیوڈ'' ...... کچھ دیر بعد خاموشی چھا گئی۔ ربی نے انتظار کیا۔ حاضرین کو دیکھا۔

اسے کوئی غرض نہیں تھی۔ ماضی میں کیا ہوا۔ اس کی رگوں میں کس کا خون دوڑ رہا ہے...... سچی محبت نا قابلِ تسخیر تھی۔

ثنالی، ایملی اور جسٹن کا ہاتھ پکڑ کر کھڑی ہو گئی۔

''شیرن راب۔'' اس نے بلند آواز میں کہا۔ ''ہماری ماں۔''

ہاں یہ بھی ایک سچ تھا۔

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

فرض شناس

جمال دستی

دورِ جدید میں ہر کام کے قاعدے... قوانین بدل چکے ہیں... کاروبارِ زندگی میں بھی ہوشیاری سے کام لینا پڑتا ہے... پُرسکون، مطمئن اور آسودہ شب و روز گزارتے ہوئے اچانک ہی اس کی زندگی میں ہلچل بپا ہو گئی اور وہ چلتے چلتے ان راستوں پر بڑھتی چلی گئی... جہاں سے واپسی کے لیے کوئی راستہ نہیں نکلتا تھا...

فرض شناسی: مردم شناسی کے کڑے امتحان سے گزرنے والی دوشیزہ کا سنسنی خیز احوال

صبح ہونے میں کچھ دیر تھی لیکن ٹیلی فون کی گھنٹی نے سراغ رساں لیفٹیننٹ سائرس اوبرن کو وقت سے پہلے اٹھنے پر مجبور کر دیا۔ اس نے اندھیرے میں ہی فون تلاش کیا اور ریسیور کان سے لگا لیا۔ باہر بارش ہو رہی تھی اور کھلی ہوئی کھڑکی سے آنے والی ہوا ٹھنڈی، مرطوب اور فرحت بخش محسوس ہو رہی تھی۔ دوسری طرف سارجنٹ فرٹز ڈولنگر تھا۔ اس نے ایک قتل کے بارے میں بتایا جس کی اطلاع دا پینگوئن کے بارٹینڈر نے صبح تین بجے دی

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

تھی۔

''وہی جو ایوکینون اور لی کومٹ کے کونے پر ہے؟''
اوبرن جمائی لیتے ہوئے بولا۔''اگر اس نے ڈھائی بجے بار بند کر دیا تھا تو اسے یہ جاننے میں اتنی دیر کیوں لگی کہ اس کا ایک گاہک گھر نہیں گیا ہے؟''

''لاش بار میں نہیں ہے۔ وہ بار کے عقب میں واقع کچرے کے ڈھیر کے برابر میں پڑی ہوئی ہے۔ وہ بار بند ہونے کے بعد کچرے کا تھیلا پھینکنے وہاں گیا تو اس نے وہ لاش دیکھی۔''

''وہ لاش کس کی ہے؟''

''جینی شیرون۔ عمر سینتالیس سال۔ شوہر سے علیحدگی ہو چکی ہے۔ صرف ایک سوراخ کے سوا جو اس کی داہنی آنکھ کے اوپر ہے، اس کا چہرہ ڈرائیونگ لائسنس کی تصویر سے ملتا ہے۔ وہ دا ایلڈرز گیٹ نامی کمپنی میں کام کرتی ہے جہاں وہ شادی سے پہلے کے نام رولی سے پہچانی جاتی ہے۔''

اوبرن اب بستر کے کنارے پر بیٹھا ہوا تازہ ہوا میں گہرے گہرے سانس لے رہا تھا۔ اس نے پوچھا۔''کیا اسے لوٹا گیا ہے؟''

''نہیں، اس کا جیبی پرس جس میں نقد رقم اور کریڈٹ کارڈ رکھے ہوئے تھے اور چابیوں کا گچھا لاش کے پاس ہی ملے ہیں۔''

''کیا اسے ایک ہی گولی لگی ہے؟''

''ایک اس کے سر میں لگی اور دوسری گردن سے پار ہو گئی۔ نک کا کہنا ہے کہ یہ گولیاں کم از کم دو گز کے فاصلے سے چلائی گئی ہیں۔''

''نک کے علاوہ وہاں اور کون موجود ہے؟''

''کرونی اور اسٹول اطلاع ملتے ہی وہاں پہنچ گئے تھے۔ انہیں ہتھیار اور اس کی کار کی تلاش ہے۔ اس کے علاوہ شواہد اکٹھا کرنے والا ٹیکنیشن بھی آنے والا ہے لیکن وہ ابھی نہیں پہنچا۔''

اوبرن نے ناشتے کے دوران ریڈیو آن کیا تو اسے معلوم ہوا کہ وہ میموریل ڈے تھا اور اسے ڈولنگر کے ہمراہ اس مرتبہ کام پر حاضر ہونا تھا۔ جب وہ جائے وقوعہ پر پہنچا تو بارش تھم چکی تھی لیکن فضا کہر آلود تھی اور صبح ہونے کے کوئی آثار نہیں تھے۔ دا پینگوئن، کا مرکزی دروازہ پلیس ڈی لا پیکس کے سامنے تھا جو انیسویں صدی میں بنی ہوئی فرانسیسی طرز کی عمارت تھی۔ اس طرف جانے والے راستے پر اسٹریٹ لائٹس روشن تھیں۔ صرف بار میں ایک لائٹ جل رہی تھی جبکہ اطراف کی دیگر عمارتیں تاریکی میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ جائے وقوعہ کے گرد زرد رنگ کا فیتہ باندھ دیا گیا تھا۔ اوبرن نے اپنی گاڑی ڈولنگر کی کار اور کورونر آفس کی وین کے درمیان کھڑی کر دی۔

اسے دیکھ کر ڈولنگر اپنی کار سے باہر آیا اور مقتولہ کا ڈرائیونگ لائسنس پکڑاتے ہوئے بولا۔''کوئی ہتھیار نہیں ملا اور نہ ہی گولیوں کے خالی خول۔ تین بلاک کے فاصلے کے اندر اس کی کار بھی نظر نہیں آئی۔'' اس نے اوبرن کو کار کی تفصیل اور رجسٹریشن نمبر بتاتے ہوئے کہا۔''اگر وہ بس کے ذریعے یہاں آئی تھی تو اسے ایک بجے سے پہلے گھر واپس چلے جانا چاہیے تھا کیونکہ اس کے بعد بسیں بند ہو جاتی ہیں۔''

''بشرطیکہ وہ کسی دوسرے کے ساتھ سفر نہ کر رہی ہو۔ مثلاً اس کا سابق شوہر؟''

''نک اس سے بات کر چکا ہے۔''

کوڑے دان لکڑی کے تختوں کی مدد سے آٹھ فٹ طویل تکون کی شکل میں بنایا گیا تھا۔ جس پر کوئی چھت نہیں تھی اور اس کی ایک سائڈ بار کے عقبی حصے کی جانب کھلی ہوئی تھی۔ کورونر آفس سے آیا ہوا تفتیش کنندہ نک اسٹیمی ایک گراف پیپر پر جائے وقوعہ کا اسکیچ بنا رہا تھا۔ کوڑے دان کے احاطے میں بھی تاریکی چھائی ہوئی تھی جبکہ لاش کو ترپال سے ڈھک دیا گیا تھا۔ اوبرن نے اپنی ٹارچ نکالی اور اسٹیمی کو اشارہ کیا۔ اس نے مقتولہ کے چہرے پر سے چادر ہٹا دی۔

جینی شیرون دبلی پتلی تھی اور اس کے چھوٹے سیاہ بالوں میں کہیں کہیں سفیدی جھلک رہی تھی۔ اس نے سیاہ رنگ کا پینٹ سوٹ پہن رکھا تھا۔ اس کا چہرہ میک اپ سے عاری تھا اور نہ ہی اس نے ایک انگوٹھی کے سوا کوئی زیور پہن رکھا تھا۔ اس کی گردن سے خون تیزی سے نکل کر زمین میں پھیل رہا تھا۔

''تم نے اس کے سابق شوہر سے بات کی؟'' اوبرن نے پوچھا۔

''وہ بہت زیادہ بکھرا ہوا نظر آتا ہے اور مجھ سے مسلسل یہی کہتا رہا کہ یہ لاش جینی کی نہیں ہو سکتی۔ وہ صبح ہونے پر مجھ سے دوبارہ رابطہ کرے گا تاکہ مردہ خانے آ کر لاش کو شناخت کر سکے۔'' اسٹیمی نے لاش کو دوبارہ احتیاط سے ڈھانپتے ہوئے کہا۔''وہ ہاؤلے روڈ پر واقع ایک اخبار کے دفتر میں پریس مین کے طور پر کام کرتا ہے۔ اگر وہ یہ ثابت نہیں کر سکا کہ شفٹ کے آغاز سے ہی وہ کام پر موجود

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

تھا تو یہ اس کی جائے وقوعہ سے غیر حاضری کا ایک ٹھوس ثبوت ہوگا۔"

کرائم لیب کے سارجنٹ کیسٹرل کو آتا دیکھ کر اسٹیمی بہ آوازِ بلند غرانے لگا۔ گو کہ کورونر کے نمائندے کی حیثیت سے یہ اس کی ذمے داری تھی کہ لاش کے ہٹائے جانے تک وہ جائے وقوعہ پر اپنا کنٹرول قائم رکھے لیکن کیسٹرل تحقیقات کے لیے اپنے بنائے ہوئے قوانین اور ضابطوں کے ذریعے اثرانداز ہونے کی کوشش کرتا اور اس کے آنے سے پہلے دوسرے افسران کی جانب سے کی گئی کارروائی اس کی نظر میں غلط ہوتی۔

اس سے پہلے کہ ان دونوں میں ٹکراؤ ہوتا، اوبرن اپنے ساتھی ڈولنگر کو لے کر ایک طرف چلا گیا اور بولا۔ "وہ بارٹینڈر، کیا نام ہے اس کا۔ یہاں موجود ہے؟"

"مارکوس ڈن سیٹ۔ وہ اندر ہی ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ اس نے مقتولہ کو پہلے کبھی نہیں دیکھا۔"

بار کا عقبی دروازہ کھلا ہوا تھا۔ ڈن سیٹ بوتھ کے ایک کونے میں کمر جھکائے منرل واٹر کی بوتل پر نظریں جمائے ہوئے بیٹھا تھا۔ اس نے سفید قمیص پر کاسنی رنگ کی بو ٹائی لگا رکھی تھی اور اس کے چہرے سے لگ رہا تھا جیسے وہ ایک ہفتے سے نہیں سویا۔

"تم سے صرف دو سوال کروں گا۔" اوبرن نے کہا۔ "کیا تم نے اس عورت کو رات کے وقت بار میں دیکھا تھا؟"

"جہاں تک میرے علم میں ہے۔ میں نے اسے اپنی زندگی میں پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ تم چاہو تو دوسرے بارٹینڈر اور ویٹرس سے بھی پوچھ سکتے ہو۔ وہ سب ڈھائی بجے گھر چلے گئے تھے۔ میں نے ڈولنگر کو ان کے نام اور فون نمبرز دے دیے ہیں۔"

اوبرن اس کے سامنے والی بینچ پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ "تم سارجنٹ ڈولنگر کو جانتے ہو؟"

"ہاں، میں اس سے مل چکا ہوں۔ جیسا کہ میں نے اسے بتایا کہ تین بجے سے کچھ پہلے کچرا پھینکنے گیا تھا تو وہاں اس کی لاش دیکھی۔"

"اس سے پہلے تم وہاں کب گئے تھے؟"

ڈن سیٹ نے آنکھیں موند لیں اور گالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔ "شاید نصف شب کے قریب۔"

"کیا تم نے یا کسی اور نے گولی چلنے کی آوازیں سنیں؟"

ڈن سیٹ نے پن بال مشین، پول ٹیبل اور ڈارٹ بورڈ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "یہاں ہر وقت ان کی وجہ سے شور ہوتا رہتا ہے۔ کوئی اور آواز کیسے سنائی دے گی۔"

جب اوبرن واپس باہر گیا۔ اس وقت تک کیسٹرل اعشاریہ پینتالیس سے چلائی گئی گولی کا خول تلاش کر چکا تھا جو کچرا گھر کی دیوار میں دھنسی ہوئی تھی۔ غالباً یہ وہی گولی تھی جو مقتولہ کی گردن کے آر پار ہوئی۔ اس کی منطق یہ تھی یا وہ کم از کم اپنے آپ کو یقین دلانے کی کوشش کر رہا تھا کہ قاتل نے گولی ایک خیمے کے پیچھے سے چلائی تھی جو پلیس ڈی لا پیکس کے قریب نصب تھا۔

"وہ نصف شب کے قریب اس کچرا گھر کے پاس کیا کر رہی تھی؟" اوبرن نے پوچھا۔ "اور قاتل نے اسے اندھیرے میں کس طرح دیکھ لیا؟"

"یہ میرے دائرۂ کار میں نہیں ہے۔" کیسٹرل نے کہا اور کچرا گھر کی طرف بڑھ گیا تاکہ مزید کوئی ثبوت تلاش کر سکے۔ سورج طلوع ہوتے ہی ڈولنگر قرب و جوار کے لوگوں سے بات کرنے کے لیے چل دیا۔ اس امید پر کہ شاید کسی نے گولی چلنے کی آواز سنی ہو جبکہ اوبرن مقتولہ کے اپارٹمنٹ کی طرف روانہ ہو گیا۔ راستے میں اس نے ریڈیو آن کیا۔ اس میں جینی کی موت کی خبر نشر ہو رہی تھی۔ "پولیس اس بارے میں معلومات تلاش کر رہی ہے۔ مقتولہ کا نام جینی شیرون، عمر سینتالیس سال، اس کی لاش آج صبح پینگوئن کے باہر پڑی ہوئی ملی۔ اگر کسی کو اس بارے میں علم ہو......"

فیئر فیکس اپارٹمنٹ کی عمارت متوسط درجے کے رہائشی علاقے میں واقع تھی۔ البتہ اس کا معیار دوسری عمارتوں سے کچھ بہتر تھا۔ جینی کی مقفل شدہ کار اس جگہ کھڑی ہوئی مل گئی جو کرائے داروں کے لیے مخصوص تھی۔ میل باکس اور اپارٹمنٹ کے دروازے پر اس کا پرانا نام رولی، لکھا ہوا تھا۔ سٹی ڈائریکٹری کے مطابق وہ اس اپارٹمنٹ کی واحد کرائے دار تھی۔ اس کے باوجود اوبرن نے اس کی چابی استعمال کرنے سے پہلے ڈوربیل بجانا اور دروازے پر دستک دینا ضروری سمجھا۔

اس سے پہلے ہی وہاں کوئی موجود تھا جو اس جگہ کی تلاشی لینے کے ساتھ ساتھ لیونگ روم اور طعام گاہ کی درازیں بھی کھنگال رہا تھا۔ اوبرن پانچ منٹ تک دہلیز میں کھڑا تمام تفصیلات ذہن نشین کرتا رہا۔ اس نے اپنے سیل فون سے اس جگہ کی نصف درجن تصویریں اتاریں۔

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

دروازہ دوبارہ مقفل کیا اور عقبی راستے کی طرف چلا گیا۔
گلی میں بچے ایک کافی کے ٹن کو فٹ بال بنا کر چھٹی کے دن سے لطف اندوز ہو رہے تھے اور ذرا آگے کسی کیڑے مار کمپنی کا ٹرک کھڑا ہوا تھا۔ ڈرائیور کی نشست پر بیٹھا ہوا شخص کافی کی پیالی منہ سے لگائے بچوں کے کھیل کو بڑے انہماک سے دیکھ رہا تھا۔ اوبرن بچوں کے پاس پہنچ کر بولا۔

''تم لوگ یہاں کتنی دیر سے کھیل رہے ہو؟ کیا تم میں سے کوئی یہاں رہتا ہے؟''

یہ ایسا علاقہ تھا جہاں لوگ سوٹ میں ملبوس افراد کو دیکھ کر گھبرا جاتے تھے۔ اسی لیے اوبرن کو نہ صرف یہ کہ کوئی جواب نہیں ملا بلکہ تمام بچے سیکنڈوں میں منتشر ہو گئے۔ جینی کے اپارٹمنٹ کا عقبی دروازہ زبردستی کھولا گیا تھا۔ لگتا تھا کسی نے چھینی ہتھوڑے کی مدد سے اس کے کنڈے کو لکڑی کی چوکھٹ سے الگ کر دیا تھا۔ اوبرن نے کسی چیز کو ہاتھ لگائے بغیر کچھ مزید تصویریں لیں پھر ہیڈ کوارٹر کو فون کیا جہاں پہلی شفٹ شروع ہو چکی تھی۔ اس نے اب تک کی پیش رفت سے آگاہ کرتے ہوئے شواہد جمع کرنے والے ٹیکنیشن کے لیے درخواست کی۔ وہ اسٹیبی کی خیرخواہی میں کیسٹرل کو جائے وقوعہ سے ہٹانا چاہ رہا تھا لیکن اس کے پاس ایسا کرنے کا اختیار نہ تھا۔
فون کرنے کے دوران اس نے گلی میں نظر دوڑائی۔ ٹرک میں بیٹھا ہوا شخص جس نے پرانی سی وردی اور سفید ہیٹ پہنا ہوا تھا۔ اب عمارت کے عقبی حصے میں رکھے ہوئے کچرے کے ڈبوں کی قطار میں کچھ تلاش کر رہا تھا۔ اوبرن نے باہر جانے سے پہلے مزید دو فون کیے اور اس سے پوچھا۔

''چوہے پکڑ رہے ہو یا کسی بڑے شکار کی تلاش میں ہو؟''

اس نے ٹارچ کی روشنی ملبے پر ڈالتے ہوئے کہا۔ ''یہ معمول کی چیکنگ ہے۔''

''میرا تعلق پولیس سے ہے۔'' اوبرن نے اسے اپنا بیج دکھاتے ہوئے کہا۔ ''لیکن تم مجھے کچھ مختلف لگ رہے ہو۔ میرے ذرائع کے مطابق تمہارا ٹرک فلاڈیلفیا کی ایک ایجنسی کا ہے اور اسے وہیں کے رہنے والے ایک شخص فوسٹر بروک نے پرسوں کرائے پر لیا تھا۔''

''میرا نام فوس ہے۔'' اس نے تلاش کا کام روکتے ہوئے کہا۔ ''اس ٹرک کو چیک کرنے کی کوئی خاص وجہ؟''

''ایک سے زیادہ وجوہات ہیں۔ تم نے کام کی وردی کے ساتھ ڈریس، شوز اور رنگین دستانے پہن رکھے ہیں جس کے اوپر لگے ہوئے شولڈر اکھڑ گئے ہیں۔ اسی طرح تم نے گلے میں شناختی کارڈ بھی نہیں ڈالا جو صریحاً قانون کی خلاف ورزی ہے۔ تمہارا سفید ہیٹ کسی نئی کار کی طرح چمک رہا ہے اور تمہارے کلپ بورڈ پر لگا ہوا گلابی کاغذ ٹرک کے کرائے کا معاہدہ ہے۔''

بارش دوبارہ شروع ہوئی تو وہ دونوں اس سے بچنے کے لیے سیڑھیوں پر بنے ہوئے سائبان کی طرف چلے گئے۔ بروک نے ٹارچ اور دستانے اپنی جیبوں میں رکھے اور ایک کارڈ دکھایا جس کے مطابق وہ سیکیورٹیز اینڈ ایکسچینج کمیشن کا ایک ایجنٹ تھا۔

''کیا تم یہاں اپارٹمنٹ سولہ میں رہنے والی جینی شیرون سے ملنے آئے ہو؟''

''میں اسی سے ملنے آیا تھا۔ اس نے گزشتہ ہفتے ہمیں ایک رپورٹ بھیجی تھی جس میں ایک گروپ کی غیر قانونی سرگرمیوں کے بارے میں بتایا گیا تھا جن کا تعلق اس کمپنی سے ہے جہاں وہ کام کرتی ہے۔ اس کا خیال تھا کہ وہ انہیں بے نقاب کر سکتی ہے۔''

''کیا تمہاری اس سے بات ہوئی؟''

''نہیں۔ اس نے بس ہمیں اپنا پتا بتایا تھا اور یہ کہ وہ چھٹی کی وجہ سے دوپہر تک گھر پر ہی ہوگی، اگر ہم کہیں اس کے دفتر کے قریب آئے تو اس کی لاش ہی ملے گی اور وہ مر ہی گئی۔''

''تمہیں اس کی موت کے بارے میں کیسے علم ہوا؟''

''بیس منٹ پہلے میں نے ریڈیو پر یہ خبر سنی جب میں یہاں بیٹھا اس کے فون کی گھنٹی کا انتظار کر رہا تھا۔''

''صرف یہی نہیں بلکہ کسی نے اس کے اپارٹمنٹ کی تلاشی بھی لی۔ کہیں وہ تم ہی تو نہیں تھے؟''

''مجھے الزام مت دو۔ اس کے مرنے کی خبر سننے کے بعد میں نے ایسا سوچا بھی نہیں۔ میں صرف ان بچوں کا کھیل ختم ہونے کا انتظار کر رہا تھا تاکہ اس کا کوڑے دان دیکھ سکوں۔ شاید مجھے وہاں سے کوئی ایسی چیز مل جائے جسے اس کی شکایت پر کارروائی میں استعمال کیا جا سکے۔''

جاتی ہوئی بہار کی صبح آہستہ آہستہ گرم ہو رہی تھی۔ بروک نے کافی کا مگ اپنی جگہ پر رکھا اور ٹرک کو مقفل کر دیا۔ اب وہ دونوں اوبرن کی کار میں بیٹھے ہوئے باتیں کر رہے تھے۔ ''میں نہیں جانتا کہ ہم دونوں اس معاملے

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

میں کس حد تک ایک دوسرے کی مدد کرنے کے قابل ہو سکیں گے۔'' اوبرن نے کہا۔ ''لیکن ایک ہی شخص کو دو الگ الگ طریقوں سے تلاش کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ وہ جس شخص کو بے نقاب کرنا چاہ رہی تھی' اس نے پہلے اسے قتل کیا پھر اس کے اپارٹمنٹ میں داخل ہو کر ثبوت تلاش کرنے کی کوشش کی تاکہ انہیں ضائع کر سکے جیسے ہی لیبارٹری سے میرا آدمی آیا۔ ہم اپارٹمنٹ میں جا کر دیکھ سکتے ہیں کہ کیا کچھ غائب ہے۔ کیا تم نے ناشتا کر لیا؟''

''ہاں۔''

''اس نے اپنی رپورٹ میں خاص طور پر کس بات کی نشاندہی کی تھی۔ میرا مطلب ہے کہ کیا اس نے کچھ لوگوں کے نام بتائے تھے یا کسی ثبوت کی پیشکش کی تھی؟''

''اس نے کسی کا نام نہیں لیا بلکہ کہا کہ وہ اس پر کام کر رہی ہے۔ اس کی کوشش ہے کہ کسی ایک کو بے نقاب کیا جائے۔''

''یہی اس کی آخری غلطی تھی۔'' اوبرن نے خیال ظاہر کیا۔

بروک اپنی نشست پر گھومتے ہوئے بولا۔ ''میں تمہارے ساتھ تعاون کرنے کے لیے تیار ہوں لیفٹیننٹ۔ ویسے یہ میرا عمومی طریقہ نہیں ہے۔ ہمارا ادارہ کوئی کرمنل اتھارٹی نہیں۔ ہم ہتھیار اپنے ساتھ نہیں رکھتے اور نہ ہی گرفتاریاں کرتے ہیں۔ ہماری تحقیقات ننانوے فیصد کمپیوٹر کے ذریعے ہوتی ہے اور جہاں کہیں وفاقی قوانین کی خلاف ورزی نظر آئے تو ہم عدالت میں مقدمہ دائر کرتے ہیں جو عموماً عدالت کے باہر ہی تصفیہ پر ختم ہو جاتا ہے ورنہ عدم ثبوت کی بنا پر خارج یا اپیل کی صورت میں ہمارے خلاف فیصلہ آتا ہے۔''

شہادتیں جمع کرنے والا ایک ٹیکنیشن جس کا نام فرانسس تھا۔ ایک سفید وین میں آیا اور اس نے اوبرن کی کار کے برابر میں اپنی گاڑی کھڑی کر دی۔ اس نے جینی کے اپارٹمنٹ کی چابی اوبرن سے لی اور اپنے سامان سمیت عمارت میں چلا گیا۔ اوبرن اور بروک اس کے واپس آنے کا انتظار کرنے لگے۔

''کیا تمہیں ایلڈرز گیٹ فنڈ کے بارے میں اور بھی اطلاعات ملی ہیں؟''

''نہیں، لیکن وہ بھی دوسرے اجتماعی فنڈز کی طرح ہماری نظروں میں ہے۔''

''اجتماعی فنڈ کی تعریف بیان کرو؟''

''ایک ایسی سرمایہ کار کمپنی جو دوسرے لوگوں سے پیسے جمع کر کے سٹہ کھیلتی ہے۔ اس میں کرنسی کا اتار چڑھاؤ، حصص مارکیٹ کی صورتِ حال اور شرح سود میں کمی بیشی بھی شامل ہیں، یہ ایسا جوا ہے جس میں بیک وقت دو گھوڑوں پر شرط لگائی جاتی ہے۔ یہ مکمل طور پر جائز بھی ہو سکتا ہے لیکن ان میں سے زیادہ تر اس کاروبار میں نہیں رہ سکتے جب تک وہ قانون کی خلاف ورزی کرتے ہوئے ناجائز ذرائع استعمال نہ کریں۔''

''ان سائڈر ٹریڈنگ بھی اسی کی ایک شکل ہے؟''

بروک نے دونوں ہاتھ اپنے ہیٹ پر رکھے اور بولا۔ ''بنیادی طور پر حصص کا کاروبار یہی ہے کہ ایک دن شیئر خریدو اور موقع ملنے پر اسے بھاری منافع کے ساتھ فروخت کرو جو کہ عملاً ممکن نہیں کیونکہ عین اسی وقت لاکھوں لوگ بالکل ایسا ہی کرنے کی کوشش میں لگے ہوتے ہیں۔ اس کاروبار میں شامل لوگ ہر ممکن طریقے سے معلومات حاصل کرتے ہیں لیکن ضروری نہیں کہ انہیں انفارمیشن ٹیکنالوجی میں بھی مہارت حاصل ہو۔ ان سائڈر ٹریڈنگ کا مطلب ایسا منافع بخش کاروبار جس کی بنیاد ان معلومات پر ہوتی ہے جو عام لوگوں کو دستیاب نہیں۔ یہ معلومات کمپنی میں کام کرنے والے کام کے دوران حاصل کرتے ہیں یا کسی دوسرے سے خریدتے ہیں ورنہ غیر قانونی طور پر دوسری کمپنی کے ڈیٹا بیس میں گھس کر حاصل کرتے ہیں۔ ان سائڈر ٹریڈنگ کو ثابت کرنا بہت مشکل ہے اور ہر ہفتے لاکھوں شیئرز کا لین دین ہونے کی صورت میں اس کا سراغ لگانا تقریباً ناممکن ہے۔ ہم طاقتور پروگرام کے ذریعے ایسے سرمایہ داروں پر نظر رکھتے ہیں جو ایک ہی وقت میں ایک جیسی منافع بخش سرمایہ کاری کرتے ہیں پھر ہم اس میں مشترکہ عنصر تلاش کرتے ہیں۔''

اس کا لیکچر جاری تھا۔ یہاں تک کہ عمارت کے کرائے دار اور قرب و جوار میں رہنے والے چھٹی کا دن منانے کے لیے گھروں سے باہر آنے لگے۔ بالآخر فرانسس بھی عمارت سے باہر آ گیا۔ ''ایک شخص دستانے پہن کر اس کے اپارٹمنٹ میں داخل ہوا لیکن وہ چور نہیں تھا۔'' اس نے بڑے وثوق سے کہا۔ ''آنسرنگ مشین پر بھی کوئی پیغام نہیں ہے۔ اس کا سیل فون لاش کے ساتھ ہی ہو گا۔''

''نہیں، کوئی سیل فون یا اسمارٹ فون نہیں ملا۔ شاید اس کی کار میں ہو۔''

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

یہ سن کر فرانسس اس کی کار کا معائنہ کرنے چل دیا جبکہ اوبرن اور بروک اپارٹمنٹ کے عقبی راستے سے اندر چلے گئے۔ اندر داخل ہوتے ہی ایک عجیب سی بو محسوس ہوئی۔ فرنیچر اور دیگر اشیا سلیقے سے رکھی ہوئی تھیں۔ کچھ کتابیں بھی نظر آئیں جو اکاؤنٹنگ، ہربل دواؤں، سراغ رسانی اور ذاتی دفاع کے موضوعات پر تھیں۔

ایک الماری میں دہی اور سبز چائے کی وافر مقدار رکھی ہوئی تھی لیکن تمباکو، شراب، خواتین کے رسالے یا سلائی کا سامان نظر نہیں آیا۔ گھر میں داخل ہونے والے شخص نے دو قیمتی کیمروں کو بھی ہاتھ نہیں لگایا جبکہ لیونگ روم میں رکھی ہوئی کافی ٹیبل پر خالی جگہ ظاہر کر رہی تھی کہ یہاں لیپ ٹاپ رکھا ہوگا لیکن اس وقت موجود نہیں تھا۔ بروک بچوں کی طرح پورے گھر میں ٹہل رہا تھا جیسے اسے کسی خاص چیز کی تلاش ہو، اس کے ساتھ وہ تھوڑا سا مضطرب بھی نظر آ رہا تھا۔ انہوں نے کچھ کاغذات الٹ پلٹ کر دیکھے لیکن وہ ذاتی نوعیت کے تھے اور ان سے انہیں کوئی مدد نہیں مل سکتی تھی، پندرہ منٹ بعد وہ خالی ہاتھ باہر آ گئے۔

فرانسس نے بھی کار کی تلاشی مکمل کر لی تھی۔ اسے سیل فون، لیپ ٹاپ، کاغذ یا کوئی ایسی چیز نہیں ملی جسے بطور شہادت استعمال کیا جاتا۔ اس نے اپارٹمنٹ کی چابی اوبرن کے حوالے کی اور اس کے عقبی دروازے کو سیل کرنے کے لیے دوبارہ عمارت میں چلا گیا۔ بروک اپنا ہیٹ اٹھانے لگا تو اوبرن نے پوچھا۔

''یہاں سے تم کہاں جاؤ گے؟''

''میں نہیں جانتا جب تک مجھے اگلی ہدایت نہ ملے۔'' وہ گھڑی دیکھتے ہوئے بولا۔ ''میرا اندازہ ہے کہ وہ مجھے گھر جانے کے لیے کہیں گے کیونکہ جس کسی نے بھی اسے قتل کیا ہے۔ لگتا یہی ہے کہ وہ اپنے ہمراہ ثبوت بھی لے گیا ہے جو جینی نے کمپیوٹر کے ذریعے اکٹھے کیے تھے۔''

''تم ایلڈرز گیٹ کے لوگوں سے پوچھ گچھ نہیں کرو گے؟''

''بالکل نہیں، اگر انہیں معلوم ہو گیا کہ میں شہر میں موجود ہوں تو وہ صرف تین سیکنڈ میں ہمارا آپریشن کسی اور شکل میں تبدیل کر دیں گے۔''

''تم کہاں ٹھہرے ہوئے ہو؟''

''گوسا کر موریٹ کوٹ۔'' اس نے جواب دیا پھر ان کے درمیان فون نمبروں کا تبادلہ ہوا۔ اور وہ اس پر متفق ہو گئے کہ کیس ختم ہونے تک ایک دوسرے کے ساتھ رابطے میں رہیں گے۔ رخصت ہونے سے پہلے اوبرن نے سیکنڈ ڈسٹرکٹ ہیڈ کوارٹرز کو اپنی پوزیشن اور تحقیقات میں ہونے والی پیش رفت سے مطلع کیا۔ اس کے سپروائزر کیپٹن مینگ نے اسے مشورہ دیا کہ وہ اندرون شہر واقع فراڈ یونٹ کے کیپٹن ہوسٹن سے رابطہ کرے کیونکہ اس میں مالی بدعنوانی کا امکان ہے۔ اوبرن نے اندرون شہر جانے کے بجائے ہوسٹن سے فون پر رابطہ کیا۔

''تم سیکیورٹی اینڈ ایکسچینج کمیشن کی بات کر رہے ہو؟'' وہ ناک سکیڑتے ہوئے بولا۔ ''یہ ایک ایسا کتا ہے جو کاٹنے کے بجائے صرف بھونکنے پر ہی اکتفا کرتا ہے۔ ان سے کسی قسم کے تعاون کی امید مت رکھو۔ تم وفاقی ایجنٹوں کو نہیں جانتے۔ وہ تم سے ساری معلومات لے لیں گے لیکن قومی سلامتی کا بہانہ بنا کر اپنی معلومات تم سے شیئر نہیں کریں گے۔''

''یہ شخص بروک مجھے ایک سست رفتار کوچ کے مانند لگتا ہے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ تم اس کے فلاڈیلفیا والے دفتر سے اس کیس کا پس منظر معلوم کر سکو۔''

''اس کا امکان بہت کم ہے۔ بہرحال تم مجھے کچھ لوگوں کے نام بتاؤ۔''

ابھی اس نے سلسلہ منقطع کیا ہی تھا کہ ڈولنگر کا فون آ گیا۔ اسے بھوک لگ رہی تھی۔ اوبرن نے اس سے کہا کہ وہ سیکنڈ ڈسٹرکٹ ہیڈ کوارٹرز سے ایک بلاک فاصلے پر واقع ٹاور پیزا میں آ جائے۔ کھانے کا آرڈر دینے کے بعد اوبرن نے اسے جینی کے اپارٹمنٹ کی تلاشی کے بارے میں بتایا اور پوچھا کہ اس کے پاس کیا معلومات ہیں۔

''ایک اور بارٹینڈر گیون برنیٹ اور ویٹریس شرلے اسکوٹو نے بھی جینی کے ڈرائیونگ لائسنس پر لگی ہوئی تصویر سے اسے شناخت نہیں کیا۔ اس بار کے قریب چند ہی مکانات ہیں۔ میں نے تین مختلف لوگوں سے بات کی جنہوں نے گزشتہ شب گولیاں چلنے یا دھماکوں کی آوازیں سنی۔ وہ یہی سمجھ رہے تھے کہ چھٹی کے موقع پر آتش بازی ہو رہی ہے۔''

''گولی چلانے والے کے لیے یہ ایک مفید اتفاق ہوا ہوگا۔''

''یہ دیکھو، ممکن ہے کہ یہ اتفاق نہ ہو۔''

وہ کسی مالی لین دین کا پرنٹ آؤٹ تھا جس پر تین کالموں میں ہندسے درج تھے لیکن اس صفحے کے وسط میں ایک پیغام واضح طور پر لکھا ہوا تھا۔ ''اشد ضروری۔ ہمیں

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

نصف شب کے قریب پلیس ڈی لا پیکس میں ملنا ہے۔''

''یہ تمہارے پاس کیسے آیا؟''

''جب لاش کو لے جایا جا رہا تھا تو جینی کا ایک جوتا گر پڑا۔ یہ کاغذ اس میں تہ کیا ہوا رکھا تھا۔ کیسٹرل نے اس کی کاپیاں کروالیں۔''

اوبرن نے اس کاغذ کو دیکھا۔ اس میں کوئی تہ نظر نہیں آرہی تھی۔ وہ بولا۔''کیا اس کی وین میں فوٹو کا پیپر بھی ہوتا ہے؟''

''ہاں۔''

کھانے کے دوران انہوں نے اس کاغذ کے مضمرات پر گفتگو کی۔ جینی کو اس کی موت ہی جائے ملاقات پر لے کر آئی تھی اور بظاہر یہی لگ رہا تھا کہ ایلڈرز گیٹ فنڈ کے ہی کسی شخص نے یہ ملاقات طے کی تھی۔ اب اس کمپنی کے دفتر جانا بہت ضروری ہو گیا تھا لیکن اس بات کا بہت کم امکان تھا کہ چھٹی کی وجہ سے وہاں کوئی ملے۔ لہٰذا اوبرن نے پہلے جینی کے سابق شوہر کارل شیرون سے ملنے کا فیصلہ کیا۔ اطلاعی گھنٹی کی آواز سن کر وہ دروازے پر آیا اور بولا۔

''پولیس، اندر آجاؤ۔''

وہ انہیں ایک تاریک راہداری میں لے جاتے ہوئے بولا۔''کیا تم یقین سے کہہ سکتے ہو کہ وہ جینی کی ہی لاش ہے۔''

''ہاں، ہمیں پورا یقین ہے۔'' اوبرن نے کہا۔''اس کی شکل ڈرائیونگ لائسنس پر لگی ہوئی تصویر سے مل رہی ہے۔''

شیرون نے اپنے سر پر ہاتھ پھیرا اور کاؤچ پر پڑی ہوئی چیزوں کو ہٹا کر ان کے بیٹھنے کے لیے جگہ بنانے لگا۔

''تمہارے ساتھ گھر کے دیگر افراد بھی رہتے ہیں؟'' اوبرن نے پوچھا۔

''اگر تمہاری مراد بچوں سے ہے تو میں بے اولاد ہوں۔'' وہ ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔''تمہیں کچھ اندازہ ہے کہ اس کے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا۔ میرا مطلب ہے کہ وہ نصف شب کے قریب بار میں کیا کر رہی تھی۔ وہ تو ڈرنک نہیں کرتی۔''

''ہمیں یقین نہیں کہ وہ بار میں گئی تھی۔'' ڈولنگر نے کہا۔''اس کی لاش بار کے عقب میں ایک کچرا گھر کے نزدیک ملی ہے۔ کیا تم دونوں اب بھی رابطے میں تھے؟''

''ہاں، مجھے رہ رہ کر یہ خیال آتا ہے کہ ہم اب بھی ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔ بدقسمتی سے ہم ایک چھت کے نیچے سکون سے نہ رہ سکے۔''

''کیا تمہارے پاس اس کے اپارٹمنٹ کی چابی تھی؟''

''نہیں، علیحدگی کے بعد اس کا سوال ہی نہیں ہوتا تھا۔ میں تو کبھی اس کے گھر کے اندر بھی نہیں گیا۔''

''ہمیں جائے وقوعہ یا اس کے اپارٹمنٹ سے کوئی سیل فون بھی نہیں ملا۔ میرا خیال ہے کہ اس کے پاس فون تو ہوگا؟''

''یقیناً، کیا تم نے اس کی کار میں دیکھا؟''

''کیا تمہیں اس کا فون نمبر معلوم ہے؟''

شیرون نے کسی ہچکچاہٹ کے بغیر فون نمبر بتا دیا۔ ڈولنگر نے فوراً ہی اس فون نمبر پر کال کی لیکن کوئی جواب نہیں ملا۔

''ہم سمجھتے ہیں کہ تم اس وقت اپنے کام پر گئے ہوئے تھے جب کورونر کے تفتیشی افسر نے صبح میں تمہیں فون کیا۔ تمہاری شفٹ کب شروع ہوتی ہے؟''

''نو بجے جب سیکشن اے کے لوگ اپنا کام ختم کر کے چلے جاتے ہیں۔ کہیں تم یہ تو نہیں سوچ رہے کہ میں نے جینی کو قتل کیا ہے؟''

''کسی نہ کسی نے تو یہ کام کیا ہے۔'' اوبرن نے اسے یاد دلایا۔''ہمارا یہی کام ہے کہ اسے تلاش کریں۔ ہمارے سوالوں سے پریشان مت ہونا۔ ہم دوسرے لوگوں سے بھی اس طرح کے سوالات کریں گے۔ کیا تم نے اسٹیفی کا فون سننے کے بعد شفٹ ختم کر دی تھی؟''

''میں نے کوشش کی تھی لیکن فورمین نے شفٹ ختم ہونے سے پینتالیس منٹ پہلے مجھے چھٹی دی۔''

''اندازاً کیا وقت ہوگا؟''

''میں پانچ بجنے میں بیس منٹ پر گھر آیا تھا۔''

''کیا تم پلانٹ سے سیدھے گھر آئے تھے؟''

''بالکل۔'' شیرون نے بیزار ہوتے ہوئے کہا۔

''ہم سمجھ رہے ہیں کہ تمہاری بیوی کا قتل ٹارگٹ کلنگ ہے۔'' ڈولنگر نے کہا۔''تمہارے خیال میں کون اس کی موت کا خواہاں تھا؟''

''میرا خیال ہے کہ کوئی نہیں۔ وہ.....'' یہ کہتے ہوئے وہ رک گیا پھر کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے بولا۔''وہ منفی شخصیت کی مالک تھی لیکن یہ ایسی وجہ نہیں کہ کوئی اسے قتل کرے۔''

''ہمیں اس امکان پر غور کرنا ہوگا کہ اس کی موت کا

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

تعلق اس کی ملازمت سے ہے۔ کیا وہ کافی عرصے سے ایلڈرز گیٹ فنڈ میں کام کر رہی تھی؟''

''اسے وہاں کام کرتے ہوئے دس سال سے زیادہ ہوگئے تھے۔''

''کیا تم جانتے ہو کہ وہ کیا کام کرتی تھی؟''

''وہ دفتر سے باہر اپنے کام کے بارے میں گفتگو نہیں کرتی تھی۔ میرا خیال ہے کہ وہ ریکارڈ ہینڈل کرتی تھی۔''

''کیا اسٹاک کی خرید و فروخت اور کمپنی کے کاروباری فیصلوں سے بھی اس کا کوئی تعلق تھا؟''

''مجھے یقین ہے کہ اس نے کبھی ان میں سے کوئی کام نہیں کیا۔ اس کے پاس اکاؤنٹنگ کی ڈگری تھی لیکن وہ سرٹیفکیٹ یافتہ اکاؤنٹنٹ نہیں تھی اور جہاں تک میرے علم میں ہے۔ اس کے پاس کبھی شیئرز نہیں رہے۔''

''کیا تمہیں ایسے کسی تنازعات یا اختلافات کے بارے میں علم ہے جو دورانِ ملازمت اس کے کسی کے ساتھ رہے ہوں۔''

''اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔'' شیرون نے بے بسی سے کہا۔

ڈیڑھ بجے وہ شیرون کے گھر سے سیکنڈ ڈسٹرکٹ ہیڈ کوارٹر کے لیے روانہ ہوئے۔ راستے میں اوبرن نے کہا۔ ''میں نے وہاں جینی کی کوئی تصویر نہیں دیکھی۔''

''ہاں، کم از کم لیونگ روم میں تو نظر نہیں آئی اور لگتا ہے کہ اس کے پاس جینی کا سیل فون بھی نہیں ہے۔''

''بشرطیکہ اس کی کار کی ڈکی میں یا وائبریشن پر نہ ہو۔''

چھٹی کی وجہ سے ہیڈ کوارٹر میں بہت کم لوگ موجود تھے۔ اوبرن نے کیس کی فائل کھولی جبکہ ڈولنگر نے متعلقہ عملے کو مقتولہ، اس کے سابق شوہر، پینگوئن کے بار ٹینڈرز اور ویٹریس کے بارے میں تفصیلات فراہم کرنے کے لیے کہا۔

اگلے روز اخبارات اور مقامی نشریاتی اداروں نے جینی کے قتل اور اس کی تحقیقات کے بارے میں معمول کے مطابق سنسنی خیز انداز اختیار کیا اور اس معاملے کی پراسراریت کے بارے میں پولیس کی ناکامی پر دبے دبے الفاظ میں تنقید بھی کی۔ کچھ ہی دیر بعد اسٹیمی نے ای میل کے ذریعے اوبرن کو مطلع کیا کہ کارل شیرون نے اپنی سابق بیوی جینی کی لاش کو شناخت کر لیا ہے اور گزشتہ شام پوسٹ مارٹم کے دوران اس کے جسم سے اعشاریہ پینتالیس کا ایک اور خول نکالا گیا ہے۔ اب یہ دونوں خول لیبارٹری میں تجزیے کے لیے بھیجے جا رہے ہیں۔ اس کے خون میں شراب اور منشیات کے اثرات بھی نہیں پائے گئے۔ اندرونِ شہر سے ملنے والی دیگر اطلاعات میں جائے وقوعہ کے بارے میں کیسٹرل کی رپورٹ اور مقتولہ کے اپارٹمنٹ اور کار کے بارے میں فرانزک کی رپورٹ شامل تھی۔

ایجنٹ بروک کو فون پر کہا گیا کہ وہ گوسا کر موٹر کورٹ میں رک کر اگلی ہدایات کا انتظار کرے۔ لہٰذا اس نے اوبرن اور ڈولنگر کے ساتھ ایلڈرز گیٹ کے دفتر جانے سے معذرت کر لی۔ جو بوسٹ وک ٹاور کے نصف فلور پر محیط تھا۔ وہاں کی ہر چیز بشمول استقبالیہ، قیمتی قالین، آرام دہ کرسیاں، شیشے کی دیواریں اور ایلومینیم کے دروازے کھڑکیاں کمپنی کی مضبوط مالی حیثیت کی عکاسی کر رہی تھیں۔

ڈولنگر نے استقبالیہ کلرک کو اپنی اور اوبرن کی آمد کا مقصد بتایا تو انہیں فوراً ہی ایک دوسرے کمرے میں پہنچا دیا گیا جہاں کمپنی کے صدر ایم این خان نے پُرجوش انداز میں ان کا استقبال کرتے ہوئے کہا۔

''تمہاری آمد غیر متوقع نہیں تھی۔'' اس نے خوش اخلاقی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ''ہم نے صبح ہی رپورٹرز کو راہداری میں پڑاؤ ڈالتے دیکھ لیا تھا اور ہم سمجھ گئے تھے کہ تم کسی بھی وقت آسکتے ہو۔''

اوبرن نے کہا۔ ''مجھے یقین ہے کہ تم سمجھ رہے ہو گے۔ ہمیں اس امکان پر غور کرنا ہے کہ مس شیرون کا تعلق اس کے کام یا کم از کم کسی ایک ساتھی سے ضرور ہے۔''

''بالکل، میں نے تمہارے آنے سے پہلے ہی اس کے ذاتی ریکارڈ کی فوٹو کاپیاں کروالی ہیں۔ یہاں وہ جینی رولی کے نام سے پہچانی جاتی تھی۔ تم انہیں اپنے پاس رکھ سکتے ہو۔''

اوبرن اور ڈولنگر نے اس فائل کو دیکھنا شروع کیا جو خان نے انہیں دی تھی۔ جینی کا عہدہ کلرک ڈیٹا انٹری کا تھا۔ وہ تیزی سے ورق پلٹتے ہوئے اس کے بارے میں بنیادی معلومات لیتے رہے۔ مثلاً اس کی ملازمت کا معاہدہ، حاضری کا ریکارڈ، تنخواہ میں ہونے والا وقتاً فوقتاً اضافہ اور کارکردگی کا جائزہ وغیرہ وغیرہ۔ اس کی سالانہ کارکردگی کی رپورٹیں مسٹر خان کی دستخط شدہ تھیں اور ان میں سے ایک ایسے اسٹاف ممبر کی تصویر ابھرتی تھی جن میں قوت متحرکہ کی، کام کرنے کی ناکافی استعداد اور قابلِ اعتراض شخصی خاصیت شامل تھی۔ اسے ضدی، تعاون نہ کرنے والی اور

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

تنگ نظر کہا گیا تھا۔

''مجھے حیرت ہے۔'' ڈولنگر نے تبصرہ کرتے ہوئے کہا۔''ایسا خراب ریکارڈ رکھنے والی عورت اتنے سالوں تک یہاں کیسے کام کرتی رہی۔''

خان کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ دوڑ گئی اور وہ محتاط انداز میں بولا۔''اس میں کچھ خوبیاں بھی تھیں۔ وہ چاہے بیمار ہو یا صحت مند، کبھی چھٹی نہیں کرتی تھی، اسی طرح کی بورڈ پر اس کی مہارت بھی قابل تعریف تھی۔ وہ اپنی غلطیاں بھی تسلیم کر لیتی تھی گو کہ اس سے کبھی کوئی فائدہ نہیں ہوا۔''

اوبرن نے فائل کے صفحات پلٹتے ہوئے کہا۔''اس کے کام کی اصل نوعیت کیا تھی؟''

خان انگلیوں پر اس کے فرائض گنواتے ہوئے بولا۔ ''مختلف سائنس سے اسٹاکس کے بارے میں ایسی معلومات ڈاؤن لوڈ کرنا جو ہمارے یا ہمارے گاہکوں کے مفاد میں ہوں، آفس نیٹ ورک کے ذریعے ان معلومات کو ان ہاؤس ٹیم کے اراکین میں تقسیم کرنا، تمام معلومات کو محفوظ کرنا اور ضرورت پڑنے پر دوبارہ حاصل کرنا۔''

''کیا ایسا کوئی امکان ہے کہ وہ کسی غیر قانونی سرگرمی میں ملوث ہو گئی ہو۔ مثلاً ان معلومات کی فروخت؟''

خان نے کندھے جھٹکتے ہوئے کہا۔''ایسی معمولی سی لغزش کا مطلب ملازمت سے برطرفی اور مجرمانہ فعل کا ارتکاب ہے۔ اگر تمہارے پاس ایسا کوئی ثبوت ہے تو مجھے یہ موقع دو کہ میں خود ہی متعلقہ حکام کو اس کی اطلاع دے دوں۔ اس سے پہلے کہ وہ کوئی کارروائی کریں۔''

''کیا کام کے سلسلے میں اس کا واسطہ عام لوگوں سے بھی پڑتا تھا؟''

''نہیں، اس کا گاہکوں سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ وہ صرف دفتر کے لوگوں سے رابطے میں رہتی تھی۔''

''تمہارے دفتر میں اور کتنے لوگ کام کرتے ہیں؟''

''مجھ سمیت دس افراد ہیں۔''

اوبرن اپنے بریف کیس میں رکھے ہوئے پُراسرار کاغذ کے بارے میں سوچتے ہوئے بولا۔''دوسرے لوگوں کو اطلاع دینے کے لیے وہ کیا طریقہ استعمال کرتی تھی۔ میرا مطلب ہے ان کے پاس جانا، ٹیلی فون کرنا یا پھر ای میل؟''

''وہ اس مقصد کے لیے دفتر کا اندرونی کمپیوٹر نیٹ ورک استعمال کرتی تھی۔''

''دفتر کے دوسرے لوگوں کے ساتھ اس کے کیسے تعلقات تھے؟''

''تم خود ہی ان سے پوچھ لو۔ وہ سب یہاں موجود ہیں اور میں نے انہیں سختی سے ہدایت کی ہے کہ جینی کی موت کی تحقیقات کے سلسلے میں پوری طرح تعاون کیا جائے۔ میری سیکریٹری تمہیں ان کے ناموں کی فہرست مع پتے اور فون نمبر دے گی۔ تم یہیں دفتر میں ان سے انٹرویو کر سکتے ہو۔''

ان سب کی عمریں تیس اور چالیس کے درمیان تھیں اور انہوں نے پرانی وضع کے سوٹ پہن رکھے تھے۔ سیکریٹری کے علاوہ اسٹاف میں صرف ایک اور عورت ڈیبی فرینکلن تھی جو جینی کی طرح ڈیٹا انٹری کلرک کے فرائض انجام دے رہی تھی۔ سراغ رسانوں نے ان سے مختلف نوعیت کے سوالات کیے۔ مثلاً مقتولہ کے بارے میں ان کے تاثرات کیا ہیں؟ اس کے ساتھ ان کے ذاتی تعلقات کی نوعیت کیا تھی؟ ان کے خیال میں اسے قتل کرنے کی کیا وجہ ہو سکتی ہے اور یہ کہ وہ اس وقت کہاں تھے جب اسے قتل کیا گیا؟

کسی نے بھی جینی کے ساتھ سماجی تعلقات کا اعتراف نہیں کیا۔ اس کی شخصیت کے بارے میں بھی انہوں نے منفی تبصرے کیے۔ کسی نے بھی اس کی موت پر دکھ کا اظہار نہیں کیا۔ وہ کبھی کسی کے ساتھ لنچ پر نہیں گئی۔ اس کے بارے میں عمومی تبصرہ یہی تھا کہ وہ سر پھری، ضدی، خود پرست، عیب جو، شکی مزاج اور چڑچڑی تھی۔

ان میں سے ایک اسپنیر یمنز کا رویہ انہیں کچھ مشکوک لگا۔ وہ جائے وقوعہ سے اپنی غیر موجودگی کے بارے میں واضح طور پر کچھ نہ بتا سکا۔ اوبرن نے سوچا کہ وہ مسٹر خان سے کہہ کر اس شخص کی ذاتی فائل کو ضرور دیکھے گا۔ سیکریٹری کا انٹرویو کرنے کے بعد انہوں نے وہ جگہ دیکھنے کی خواہش کی جہاں جینی کام کرتی تھی۔ وہ بالکل صاف نظر آ رہی تھی۔

دوسرے روز ہیڈ کوارٹر میں تمام عملہ موجود تھا۔ انہیں دس منٹ میں اسپنیر یمنز کے بارے میں مکمل رپورٹ مل گئی۔ اسے کئی مرتبہ غیر محتاط ڈرائیونگ کرنے کے الزام میں جرمانہ ہو چکا تھا۔ گیارہ سال پہلے اسے سرکاری املاک کو نقصان پہنچانے اور گرفتاری میں مزاحمت کرنے پر تین ماہ کی سزا سنائی گئی تھی۔

''شاید ایسے لوگوں کو اس لیے ملازم رکھا جاتا ہے کہ

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

وہ بھٹکے ہوئے ملازمین کو راہ راست پر لاسکیں۔'' اوبرن نے خیال ظاہر کیا۔

''میں نہیں جانتا لیفٹیننٹ۔تم اس کا ریکارڈ دیکھو۔ بدتمیز، من موجی اور تند خو شخص، ایلڈرز گیٹ جیسے ادارے کے لیے کیسے مناسب ہوسکتا ہے۔''

انہوں نے ملک نواز خان سمیت دفتر کے تمام اسٹاف کا ریکارڈ مانگ لیا۔اوبرن نے جائے وقوعہ سے ملنے والے کاغذ کو اپنے کمپیوٹر میں اسکین کیا اور ایک مختصر پیغام کے ساتھ بروک کے سیل فون میں بھیج دیا۔ پسندیدہ چینی ریستوران میں لنچ کرنے کے بعد وہ دفتر واپس آگئے اور اب تک کی حاصل شدہ معلومات کا جائزہ لینے لگے۔ پہلا سوال یہی ذہن میں آیا کہ کس نے اسے ملاقات کے لیے پیغام بھیجا اور کیسے؟

''ممکن ہے کہ یہ پیغام اسی نے بھیجا ہو۔'' اوبرن نے خیال ظاہر کیا۔

''کیسے؟''

''شاید وہ خود بھی اسے نہ جانتی ہو۔ بروک نے بتایا ہے کہ وہ کسی ایسے شخص کا نام ظاہر کرنا چاہ رہی تھی جو غیر قانونی اسٹاک ٹریڈنگ میں ملوث تھا۔ کہا جاسکتا ہے کہ اس نے غلطی سے اسے اندرونی پائپ لائن میں ڈال دیا جس کے ذریعے خفیہ معلومات بھیجی جاتی ہیں۔''

''لیکن اسے قتل کیوں کیا گیا؟''

''کیونکہ جس کسی نے بھی یہ پیغام وصول کیا۔وہ شاید جانتا تھا کہ یہ جعلی پیغام ہے اور انہوں نے محسوس کیا کہ پیغام بھیجنے والا پائپ لائن میں داخل ہوگیا ہے اور غالباً پہلے ہی اس آپریشن سے متعلق معلومات کو نقصان پہنچا چکا ہے۔''

''اس لیے اسے راستے سے ہٹا دیا جائے۔''

''ممکن ہے کہ انہیں پہلے سے معلوم ہوگیا ہو کہ کس نے یہ میٹنگ بلائی ہے۔''

اوبرن نے اپنا سیل فون نکالا اور راکیل ہیرس کو ایک پیغام بھیجا جو ماہر نفسیات تھی۔ جواب میں اس نے فوراً ہی فون کیا اور بولی۔''آج کیسے میرا خیال آگیا؟''

''تم سے ایک بات پوچھنی ہے۔''

''ذاتی یا پیشہ ورانہ؟''

''تکنیکی۔'' ماہر نفسیات بننے سے پہلے وہ کمپیوٹر انسٹرکٹر کے طور پر کام کرتی تھی۔''کسی بھی مختصر پیغام کو ایک فنانشل رپورٹ کے درمیان چھپانے کے کتنے طریقے ہیں؟''

''لاکھوں۔کیا ہم کسی کوڈ، خفیہ تحریر یا اشاراتی زبان میں بھیجے گئے پیغام کی بات کررہے ہیں؟''

''یوں سمجھ لو کہ یہ کسی ایسے شخص کی جانب سے ہے جو غیر متحرک، غیر مستعد اور دہی کے ساتھ سبز چائے کی شوقین ہے۔''

''میں تمہارا سوال سمجھ گئی۔'' اس نے کمپیوٹر کی انگلیوں پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔''اب اپنی ای میل دیکھو۔''

اس ای میل میں دو سطور پر مشتمل ایک مزاحیہ نظم تھی جس کے عموماً پانچ مصرعے ہوتے ہیں۔

''بقیہ مصرعے کہاں ہیں؟'' اوبرن نے پوچھا۔

''اسے سیاہ حروف میں تبدیل کرو۔''

''یہ تو پہلے ہی سیاہ ہیں۔''

''سب نہیں ہیں۔ جو کہہ رہی ہوں وہی کرو۔'' یہ کہہ کر اس نے فون بند کردیا۔

اوبرن نے اس کے کہنے پر عمل کیا تو پوری نظم ظاہر ہوگئی۔اس نے دوبارہ راکیل کو فون کرکے پوچھا۔

''تم نے یہ کیسے کیا؟ یقیناً ای میل کے ذریعے سفید پس منظر میں سفید حروف نہیں بھیجے جاسکتے۔''

''کوشش کرو۔تم نے ابھی مجھے ایسا کرتے ہوئے دیکھا ہے۔'' یہ کہہ کر راکیل نے فون بند کردیا۔

اوبرن اور ڈولنگر کو اس کی تصدیق کرنے میں پانچ منٹ بھی نہیں لگے کہ جس پیغام کے الفاظ سفید کردیے جائیں گے۔ ای میل میں وہ جگہ خالی نظر آئے گی اور پیغام وصول کرنے والا اسے فوراً ہی اصلی حالت میں واپس لاسکتا ہے۔

''اور فوراً ہی اسے مٹا بھی سکتا ہے۔'' ڈولنگر نے تبصرہ کیا۔

فراڈ یونٹ کے کیپٹن ہوسٹن نے فون کرکے بتایا کہ اس کا فلاڈیلفیا میں واقع سیکیورٹی اینڈ ایکسچینج کمیشن کے علاقائی دفتر سے رابطہ ہوا ہے اور اسے کچھ ایسی معلومات ملی ہیں جو ان کے لیے دلچسپی کا سبب ہوسکتی ہیں۔ ابھی وہ ان ٹکڑوں کو اس معمے میں جوڑنے کی کوشش کرہی رہے تھے کہ اوبرن کے فون پر بروک کی کال موصول ہوئی۔ لگتا تھا کہ اس نے بھی اپنے طور پر فلاڈیلفیا آفس سے بات کی تھی اور اسے حکم ملا تھا کہ وہ ایلڈرز گیٹ فنڈ کے دفتر پر چھاپا مار کر ان کے ڈیٹا بیس کی تلاشی لے تاکہ غیر قانونی اسٹاک ٹریڈنگ کے شواہد مل سکیں۔

''کیا تم وارنٹ کے بغیر یہ کارروائی کرسکتے ہو؟''

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

''میں ابھی عدالت سے ہی آرہا ہوں اور میری گاڑی سیکنڈ اسٹریٹ پر کھڑی ہوئی ہے۔ کیا تم میرے ساتھ وہاں جانا چاہو گے؟''

''وہ تو ٹھیک ہے لیکن میں اس وقت اندرونِ شہر کے بجائے سیکنڈ ڈسٹرکٹ ہیڈ کوارٹر میں ہوں اور مجھے دوبارہ وہاں جانے کے لیے افسرانِ بالا سے اجازت لینا ہو گی۔''

تقریباً چار بجے اوبرن اور ڈولنگر کی ملاقات پوسٹ وک ٹاور کی پارکنگ لاٹ میں بروک سے ہوئی۔ وہ اس وقت نئے ماڈل کی کرائے کی کار میں سوار تھا۔

''تمہارا ٹرک کہاں گیا؟'' اوبرن نے پوچھا۔

''اس میں خرابی پیدا ہو گئی ہے۔ تیسرا گیئر بڑی مشکل سے لگتا ہے۔''

دفتر کے تمام لوگ ایک کانفرنس ٹیبل کے گرد بیٹھے ہوئے تھے البتہ اسپیئر مینز اور ڈپٹی فرینکلن وقت سے پہلے جا چکے تھے۔ وارنٹ ہونے کی وجہ سے بروک کو تمام ریکارڈ تک رسائی مل گئی اور اس نے اس کا بھرپور فائدہ اٹھایا۔ اوبرن اور ڈولنگر کا دائرہ کار قتل کی تحقیقات تک محدود تھا لیکن انہوں نے اپنی آنکھیں اور کان کھلے رکھے۔ انہیں موہوم سی امید تھی کہ بروک کی کارروائی کے نتیجے میں وہ کچھ فائدہ حاصل کر سکیں گے۔

آدھے گھنٹے سے بھی کم وقت میں بروک نے ایلڈرز گیٹ کے مین فریم سے سیکڑوں صفحات اپنی یو ایس بی میں منتقل کر لیے۔ دونوں سراغ رسانوں کو اس کی یہ کارروائی مشکوک لگی۔ اس نے کوئی سوال نہیں کیا اور نہ ہی کوئی وارننگ یا دھمکی دی۔ کارروائی کے اختتام پر اس نے ایک رسید پر دستخط کیے اور چل دیا جیسے وہ ائرکنڈیشنر کا فلٹر تبدیل کرنے آیا تھا۔

وہ تینوں اگلے لائحہ عمل کی تیاری کے لیے بروک کی کار میں اکٹھے ہوئے۔ وہ پہلے ہی اپنا موٹیل چھوڑ آیا تھا اور شام میں واپس فلاڈیلفیا جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ جب وہ اوبرن سے سیکیورٹی اینڈ ایکسچینج کمیشن کی متوقع انکوائری کے بارے میں بات کر رہا تھا تو پچھلی نشست پر بیٹھے ہوئے ڈولنگر نے اپنے موبائل فون پر کوئی نمبر ڈائل کیا۔

''اپنے دونوں ہاتھ اسٹیئرنگ وہیل پر رکھو۔'' اوبرن نے بروک کو مشورہ دیا۔ ''تم اس سے اتفاق کرو گے کہ مقتولہ کا سیل فون اپنے قبضے میں رکھنے پر تمہیں کچھ وضاحتیں دینا ہوں گی۔''

بروک نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔ ''میں نے اس کے اپارٹمنٹ کی تلاشی لی تھی اور اگر وہ بچے گلی میں نہ کھیل رہے ہوتے تو تمہارے آنے سے پہلے میں جا چکا ہوتا۔''

''کسی کے گھر میں داخل ہونا اور وہاں سے چیزیں ہٹانا نقب زنی ہے اور یہ ایک مجرمانہ فعل کہلاتا ہے۔''

''یقیناً ایک عام شہری پر اس کا اطلاق ہوتا ہے لیکن جب معاملہ وفاقی تحقیقات......''

''بہتر ہے کہ تم اپنے وفاقی قانون کی بھی وضاحت کر دو۔ شاید تم آئین سے بات شروع کرو لیکن تمہارے پاس تلاشی کا وارنٹ نہیں تھا اور نہ ہی اس کی کوئی معقول وجہ نظر آتی ہے۔ تم نے مجھے خود بتایا تھا کہ تمہارے پاس پولیس کے اختیارات نہیں ہیں۔ تم اپنے آپ کو زیرِ حراست سمجھو۔'' یہ کہہ کر اوبرن نے اس کے حقوق پڑھنا شروع کر دیے۔

''بروک نے جھک کر ڈیش بورڈ میں لگی ہوئی گھڑی کو دیکھا اور بولا۔ ''کمیشن آدھ گھنٹے کے اندر ایک وکیل کا بندوبست کر لے گا تا کہ مجھے اس معمولی جرم کے الزام سے بری کیا جائے۔''

''ہم اس معمولی جرم سے آگے کی بات کر رہے ہیں۔'' اوبرن نے کہا۔ ''کل تم نے مجھے بتایا تھا کہ تم جس عورت سے ملنے آئے، وہ مر چکی تھی جس کی خبر تمہیں ریڈیو سے ملی۔ ریڈیو پر اس کا نام جینی شیرون بتایا گیا جو اس کے ڈرائیونگ لائسنس پر درج تھا لیکن اس نے سیکیورٹی اینڈ ایکسچینج کمیشن کو جو پیغام بھیجا اس میں اپنا نام رولی لکھا تھا۔ ہمیں اس کار کی تلاشی لینا ہو گی مسٹر بروک اور ہمارے پاس اس کی معقول وجہ ہے۔''

ڈولنگر نے اسے ہتھکڑی لگا کر اسٹیئرنگ وہیل سے باندھ دیا اور اس سے کار کی چابی لے لی۔ کار کی ڈکی سے انہیں جینی کے سیل فون اور لیپ ٹاپ کے علاوہ ایک تین فٹ لمبی سلاخ ملی جو یقیناً جینی کے دروازے کی چٹخنی کھولنے کے کام آئی ہو گی۔ اس کے علاوہ اعشاریہ پینتالیس کا ایک سیمی آٹومیٹک پستول بھی ہاتھ لگا جس کے میگزین میں دو راؤنڈ کم تھے۔

اوبرن نے اس پر ایک اور الزام لگایا جو ایک سنگین جرم کے بارے میں تھا اور ایک بار پھر اس کے حقوق دہرائے۔ ''تمہارے چیف مسٹر بیلارڈ کی اندرونِ شہر آمد شام سات اور آٹھ بجے کے درمیان متوقع ہے۔'' اس نے

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

بروک کو بتایا۔ ''میرا خیال ہے وہ ہمیں یہ نہیں بتائے گا کہ جینی کا قتل تمہارے فرائض میں شامل تھا یا ابھی ابھی تم نے خان اینڈ کمپنی کے دفتر میں جو ڈراما رچایا جو پولیس والوں کے نزدیک ایک کھیل سے زیادہ نہیں تھا۔ وہ اتنے سیدھے نہیں جیسا کہ نظر آتے ہیں۔ تم اب بھی ہم سے تعاون کر کے اپنے لیے آسانی پیدا کر سکتے ہو۔''

یہ کہہ کر وہ لمحہ بھر کے لیے رکا پھر بولا۔ ''تم انکل سام کے علاوہ کس کے لیے کام کر رہے ہو؟''

''اس نام کی تمہارے لیے کوئی اہمیت نہیں۔''

''ان کے نام چھپانے سے تمہیں کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔'' اوبرن نے کہا۔ ''اس دفتر کے کتنے لوگ اس کھیل میں شریک ہیں؟''

''یمنز اور دو کلرکوں کے سوا سب اس میں شامل ہیں۔ یہ لوگ اپنی ناک کے نیچے ہونے والا کھیل نہیں سمجھ سکے۔''

''لیکن ان میں سے ایک نے سمجھ لیا۔'' اوبرن نے اسے یاد دلایا۔

انہوں نے تمام ثبوت اوبرن کی گاڑی کی ڈکی میں منتقل کیے اور کرائے کی کار وہیں چھوڑ دی۔ اوبرن قیدی کو لے کر اندرونِ شہر چلا گیا۔ اب بروک کے ہاتھ پچھلی نشست سے بندھے ہوئے تھے اور ڈولنگر اس کی نگرانی کر رہا تھا۔ جب بروک کو اپنی پوزیشن کا اندازہ ہوا تو اس نے بتدریج اس بین الاقوامی گروہ کے بارے میں سب کچھ بتا دیا۔

کئی بڑی ٹریڈنگ کمپنیوں کے ملازمین بڑی باقاعدگی سے شیئرز کی قیمتوں میں آنے والے اتار چڑھاؤ کے بارے میں خفیہ معلومات ایک بیرون ملک ایجنسی کو فراہم کرتے ہیں جو گروہ کے اراکین کو مناسب وقت پر سرمایہ کاری کے لیے کہتی ہے۔ جینی کو اتفاقیہ طور پر ان میں سے ایک طریقہ معلوم ہو گیا تھا جس کے ذریعے ایلڈرز گیٹ کے نیٹ ورک کے اندر ہی خفیہ معلومات بھیجی جا رہی تھیں۔

''اس نے نصف شب کے قریب ملاقات کا پروگرام بنایا۔ اس امید پر کہ وہ اسٹاف کے ایک بے ایمان شخص کو بے نقاب کر سکے گی۔'' بروک نے کہا۔ ''ہمارا خیال تھا کہ وہ ملاقات کے لیے آنے والے شخص کو بلیک میل کرنے کا منصوبہ بنا رہی ہے۔ وہ اسی طرح کی عورت تھی۔''

جب وہ فرسٹ ڈسٹرکٹ ہیڈ کوارٹر پہنچے تو دوسری شفٹ شروع ہو چکی تھی۔ بروک پر نقب زنی اور قتل کے الزامات تھے۔ اس کی تصویریں اور انگلیوں کے نشانات لیے گئے پھر اسے جیل بھیج دیا گیا۔ سیکیورٹی اینڈ ایکسچینج کمیشن کا اسسٹنٹ چیف جیفری بیلارڈ سورج غروب ہونے کے وقت پہنچا۔ اس کی حالت سے لگ رہا تھا جیسے اسے فالج یا دل کا دورہ پڑا ہو۔ اس نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے کافی کی پیالی پکڑی اور اسے منہ سے لگا لیا۔

ڈولنگر نے اس کے سامنے بروک کے خلاف جتنے بھی ثبوت رکھے۔ وہ سب بیلارڈ کے لیے ذہنی و جسمانی تکلیف کا سبب تھے۔ وہ بے یقینی کے عالم میں بروک کے شناختی کارڈ کو دیکھ رہا تھا جو دوسرے ثبوتوں کے ساتھ ڈولنگر کی میز پر پڑا ہوا تھا۔ کافی دیر خاموش رہنے کے بعد وہ بولا۔ ''یہ شخص شروع سے ہمارے ساتھ تھا۔ میں نے ہمیشہ اس کی ایمانداری پر بھروسا کیا۔''

جب اوبرن اور ڈولنگر سیکنڈ ڈسٹرکٹ ہیڈ کوارٹرز کے لیے روانہ ہوئے تو اوبرن نے کہا۔ ''ایک اور شخص کے کیریئر کا خاتمہ ہو گیا۔''

''ہاں، ایک اور پنشن ضبط ہو گئی۔''

''کیا تم سمجھتے ہو کہ رولی اب بھی زندہ ہوتی اگر وہ یہ جال نہ بچھاتی۔''

''وہ تو ٹھیک ہے لیکن ایسا کوئی ثبوت نہیں ملا جس سے پتا چلتا کہ وہ کسی کو بلیک میل کرنے کا منصوبہ بنا رہی تھی۔ اس کی سب سے بڑی غلطی یہ تھی کہ اس نے سیکیورٹی اینڈ ایکسچینج کمیشن کو خط لکھ دیا جو سیدھا بروک کی میز پر پہنچا پھر اس کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ وہ ملاقات کے بہانے اسے کسی جگہ بلا کر راستے سے ہٹا دے۔''

''تمہارے خیال میں اگر یہ بلیک میلنگ نہیں تو کیا اس کی فرض شناسی تھی؟'' اوبرن نے کہا۔

''عین ممکن ہے۔ اس کی شخصیت کے متضاد پہلوؤں کو دیکھ کر یہی کہا جا سکتا ہے کیونکہ وہ بغیر سوچے سمجھے کام کرنے کی عادی تھی۔''

''اوبرن سرد آہ بھرتے ہوئے بولا۔ ''کاش وہ جان سکتی کہ اس فرض شناسی کی اسے کتنی بڑی قیمت چکانی پڑے گی۔''

ڈولنگر سوچ رہا تھا کہ یہ اس کی فرض شناسی تھی یا پاگل پن کہ وہ اپنے ہی بچھائے ہوئے جال میں پھنس گئی۔

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

''ایک پرائیویٹ سراغ رساں کے دفتر کے لحاظ سے یہ خاصا فینسی ہے۔'' سارجنٹ ڈاسن نے کہا۔ ''پولیس فورس چھوڑنے کے بعد اس کا یہ کاروبار ٹھیک ٹھاک چل رہا تھا۔''

''صرف اب تک۔'' لیفٹیننٹ ملرائے نے تبصرہ کیا۔

اس کی نظریں شاہ بلوط کی بڑی سی میز، دیوار پر مزین قیمتی پینٹنگز اور پلش فرنشنگ کا جائزہ لینے لگیں۔ لیکن یہ تمام تاثر ہیری جیمز کی مڑی تڑی خون میں لت پت لاش کی موجودگی سے زائل ہوگیا تھا جو کھڑکی کے نیچے قالین پر پڑی تھی۔

گرمیوں کی صبح کے سورج کی کرنیں کمرے کی واحد کھلی ہوئی کھڑکی سے اندر آرہی تھیں۔ گو یہ ایک گرم دن تھا لیکن ہیری جیمز کی لاش کی موجودگی کی وجہ سے کمرا ٹھنڈا محسوس ہو رہا تھا۔

لیفٹیننٹ ملرائے نے ایک بار پھر پرائیویٹ سراغ رساں کی لاش کا جائزہ لیا۔ ''ایسا لگتا ہے کہ قاتل نے پیچھے سے وار کر کے اس کی کھوپڑی چٹخائی ہے۔'' اس نے اپنے ساتھی سارجنٹ ڈاسن سے کہا۔

سائے کی گواہی

سلیم انور

بڑے بڑے ثبوت بھی جھوٹی گواہی کے سامنے بے سود ثابت ہو جاتے ہیں... اور بعض اوقات معمولی سے نکتے سے وہ بات سمجھ میں آجاتی ہے جس کی بدولت کیس کا فیصلہ آپ کے حق میں چلا جاتا ہے... قتل کی ایک ایسی انہونی واردات کا ماجرا... قاتل کی سوچ نے اسے بروقت اور برمحل راہ سجھادی تھی...

نکتہ آفریں اور ذہنِ رسا رکھنے والے سراغ رساں کی کمال پروری

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

''ہاں۔'' سارجنٹ نے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔
''اور اس کے برابر میں موجود خون آلود ہتھوڑی ہی وہ ہتھیار لگتی ہے جس سے یہ کام کیا گیا ہے۔''
''غالباً ایسا ہی ہے اور شاید پٹرول مین گریگ بھی اسی ہتھوڑی کے وار سے بے ہوش ہوا ہے۔ آؤ باہر ویٹنگ روم میں چلتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ پٹرول مین گریگ کا اس بارے میں کیا کہنا ہے۔''

پٹرول مین گریگ اپنی کھوپڑی کے عقب میں ابھرے ہوئے گومڑے پر برف کے بیگ سے محتاط انداز میں ٹکور کر رہا تھا۔ ''میں سڑک پار واقع کیفے پر کافی کا ایک کپ پینے کے لیے رک گیا تھا۔ جب میں وہاں سے باہر نکلا تو مجھے ایک بلند آواز چیخ سنائی دی۔ یوں لگا جیسے چیخ کی آواز اسی عمارت سے آئی ہے۔ سو میں لپک کر یہاں پہنچا اور دروازہ بجانا شروع کر دیا مگر کسی نے جواب نہیں دیا۔ البتہ میں نے دیکھا کہ دروازہ پوری طرح سے بند نہیں تھا۔ سو میں نے دروازے کو دھکا دیا تو وہ کھل گیا۔ اندرونی دفتر کا دروازہ بھی بند نہیں تھا اور کمرے کے اندر میں نے جو دیکھا وہ میں بیان کر چکا ہوں اور وہ تمہارے علم میں ہے۔''
''ہاں، وہ تو ہمارے علم میں ہے۔'' لیفٹیننٹ ملرائے نے کہا۔ ''لیکن یہ تمہاری کہانی کا اختتام نہیں ہے۔''
یہ سن کر پٹرول مین گریگ نے تیوریاں چڑھا لیں اور کرسی پر اپنے بھاری بھرکم وجود کو حرکت دیتے ہوئے پہلو بدل کر بولا۔ ''نہیں، میرے خیال سے یہ میری کہانی کا اختتام نہیں ہے۔ پھر مجھ سے ایک احمقانہ حرکت سرزد ہو گئی۔ میں سوچے سمجھے بغیر کمرے میں موجود لاش کی جانب بڑھا۔ اسی وقت میرے شانوں پر کسی کا سایہ پڑا۔ لیکن اس سے قبل کہ میں گھوم کر دیکھتا......'' اس نے جھرجھری لیتے ہوئے برف کا بیگ اپنی کھوپڑی سے اٹھا لیا۔
''سو تم اس حملہ آور کی ایک جھلک تک نہیں دیکھ پائے؟'' سارجنٹ ڈاسن نے تنک کر کہا۔
''قطعی نہیں۔ میں چند منٹوں کے لیے بے ہوش ہو گیا تھا۔ اگلی بات جو مجھے یاد ہے کہ ہیری جیمو کی سیکریٹری میرے پاس کھڑی چلا رہی تھی۔''
لیفٹیننٹ ملرائے نے ایک نگاہ اپنے ساتھی سارجنٹ ڈاسن پر ڈالی۔ ''میرے خیال سے اب ہمیں سیکریٹری سے سوالات کرنے چاہئیں۔ اس دوران ہم پیرامیڈیکل کے عملے سے کہتے ہیں کہ ان میں سے کوئی ایک پٹرول مین گریگ کی کھوپڑی کے زخم کا ایک بار جائزہ لے لے۔''

سیکریٹری میری فالکون نے ایک سرخ رومال سے اپنی آنکھیں پونچھیں اور بولی۔ ''ہیری نے مجھ سے شادی کرنے کو کہا تھا۔ یہ کل ہی کی بات ہے اور اب......'' وہ اپنے رومال کو اپنی انگلیوں سے بل دیتے ہوئے خاموش ہو گئی جیسے الفاظ اس کے حلق میں اٹک گئے ہوں۔
''کیا مسٹر ہیری عام طور پر دفتر تمہارے آنے سے پہلے آجاتے تھے؟'' ملرائے نے شائستگی سے پوچھا۔
نازک اندام سیکریٹری نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ ''ہیری صبح سویرے آنا پسند کرتا تھا...... حتیٰ کہ مصروفیت نہ ہونے کے باوجود بھی۔''
''تب تو کاروبار آج کل مندا ہی ہوگا؟''
''ہاں، وہ آج کل کسی ایسے کیس پر کام نہیں کر رہا تھا کہ جس کے تانے بانے اس واردات سے جوڑے جا سکیں۔'' سیکریٹری نے ایک ہلکی سی سسکی لیتے ہوئے کہا۔
''ہوسکتا ہے کہ اس واردات کا تعلق ماضی کے کسی کیس سے رہا ہو؟'' سارجنٹ ڈاسن نے رائے ظاہر کی۔ ''اس نے اپنے پیشے میں یقیناً کچھ دشمن بھی بنا لیے ہوں گے۔''
''میرا بھی یہی خیال ہے لیکن جب وہ کسی کیس پر کام کر رہا ہوتا تھا تو مجھے تمام تفصیلات سے مکمل طور پر آگاہ نہیں کرتا تھا۔ وہ مجھے بس اتنا ہی بتایا کرتا تھا جو اس کے خیال میں میرے علم میں لانے کے لیے مناسب ہوتا تھا۔ وہ اس معاملے میں محتاط تھا۔''
''ہم اس کی فائلیں دیکھنا چاہیں گے مس میری۔''
''یقیناً، جو چاہیں دیکھ لیں۔ تمہیں جاننا چاہیے کہ جب میں نے پردہ اٹھایا تھا تو اس وقت کھڑکی کھلی ہوئی نہیں تھی۔''
''کھڑکی کھلی ہوئی نہیں تھی؟'' لیفٹیننٹ ملرائے نے ایک اچٹتی نگاہ کھڑکی سے باہر پارکنگ لاٹ کے پار فوٹوگرافر کے اسٹوڈیو پر ڈالی۔ ''آج صبح تم نے اندر آنے کے لیے کون سا دروازہ استعمال کیا تھا؟''
''صرف ایک ہی دروازہ ہے...... وہی جو اس عمارت کی دوسری جانب ہے۔''
''شکریہ...... آں...... ایک اور بات۔ وہ ہتھیار......؟''
''کیا یہ وہی ہتھوڑی ہے؟ اگر ایسا ہے تو ہتھوڑی ہیری کی نہیں ہے۔ لیکن کل میں نے جم لیسی کو اسی طرح کی ایک ہتھوڑی سے اپنے اسٹور کے سامنے کام کرتے ہوئے دیکھا تھا۔''
''جم لیسی؟''

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

''ہاں، وہ اس سامنے واقع فوٹو اسٹوڈیو کا مالک ہے۔اس کی ہیری سے کبھی نہیں بنتی تھی۔''

لیفٹیننٹ ملرائے اپنے ساتھی سارجنٹ ڈاسن کے ہمراہ جم لیسی سے پوچھ گچھ کرنے چل دیا۔

''مجھے نہیں معلوم تمہارا کیا خیال ہے کہ میں تمہیں کیا بتا سکتا ہوں۔'' جم لیسی کا لہجہ شکایتی تھا۔

''تو پھر تم جانتے ہو گے کہ ہم یہاں کیوں آئے ہیں؟''

''یقیناً۔ جب میں نے پولیس کی گاڑیاں اور ایمبولینس دیکھی تو میں یہ چیک کرنے کے لیے کہ معاملہ کیا ہے، لپک کر باہر آ گیا۔''

''ہمیں علم ہے کہ کل تم کسی ہتھوڑی کی مدد سے کسی چیز کو رپیئر کر رہے تھے۔''

''ہاں، اپنی چھپر بندی کے لیے کام کر رہا تھا۔ تو پھر کیا ہوا؟'' جم لیسی نے جواب دیا۔

''کیا میں وہ ہتھوڑی دیکھ سکتا ہوں، پلیز......'' لیفٹیننٹ ملرائے نے کہا۔

''ممکن نہیں۔ کل میں اسے باہر سے اسٹور میں لانا بھول گیا تھا۔ اس وقت میں اسی کو تلاش کر رہا تھا۔ لیکن...... لعنت ہو۔ تم یہ تو نہیں کہہ رہے ہو کہ اس واردات میں میری ہتھوڑی استعمال ہوئی ہے؟''

''یقیناً ایسا ہی دکھائی دے رہا ہے، مسٹر جم لیسی۔''

''لیکن، یہ میں ہرگز نہیں ہوں۔ گو ہیری جیمز کا قتل میرے لیے حیران کن نہیں ہے۔ جب اس نے پہلی مرتبہ یہاں اپنا کام شروع کیا تھا تو میں نے اس کے لیے چند تصویریں ڈیولپ کی تھیں۔ وہ گندی تصویریں تھیں۔ میں نے اس سے کہا تھا کہ وہ اپنا یہ گندا کاروبار کہیں اور لے جائے۔ وہ لوگوں کا تعاقب کیا کرتا تھا اور ان کی ذاتی زندگیوں میں تاک جھانک کیا کرتا تھا۔ وہ اخلاقی طور پر ایک گرا ہوا اور گھناؤنا شخص تھا۔''

وہ جائے واردات کی جانب واپس چل دیے۔ ''یہ کام کسی بھی شخص کا ہو سکتا ہے۔'' سارجنٹ ڈاسن نے لیفٹیننٹ ملرائے سے راستے میں کہا۔ ''کسی نے بھی وہ ہتھوڑی اٹھالی ہو گی اور ہیری جیمز کو قتل کر دیا ہو گا۔'' پھر اس نے کھلی ہوئی کھڑکی کی جانب اشارہ کیا۔ ''اگر کھڑکی بند تھی جیسا کہ اس کی سیکریٹری میری فالکون نے بتایا تھا تو یقیناً جب وہ اپنی گاڑی میں پہنچی تھی تو اس وقت قاتل اندر دفتر میں موجود تھا۔ وہ کھڑکی کے راستے ہی فرار ہوا ہو گا۔''

لیفٹیننٹ ملرائے نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

جب سارجنٹ ڈاسن فرش کے قالین پر خون کے دھبے کا جائزہ لینے کے لیے جھکا تو لیفٹیننٹ ملرائے کی تیوریاں چڑھ گئیں اور وہ غور سے سارجنٹ ڈاسن کو دیکھتا رہا۔

''یقیناً ایسا ہی ہے۔ میں نے پہلے اس بات پر کیوں غور نہیں کیا، ڈاسن۔ میرے خیال سے مجھے معلوم ہو گیا ہے کہ قاتل کون ہے۔''

''واقعی!''

''ہاں۔''

''کیسے پتا چلا؟''

''جب تم خون آلود قالین کی جانب بڑھ رہے تھے تو میں نے تمہارا سایہ دیکھا اور پھر سچ سامنے آ گیا۔ پٹرول مین گریگ نے کہا تھا کہ اس پر حملہ کرنے والے کا سایہ اس وقت اس کے شانے پر پڑا تھا جب وہ ہیری جیمز کی لاش کی جانب بڑھ رہا تھا لیکن ایسا ممکن نہیں تھا کیونکہ کھڑکی کے راستے سورج کی جو روشنی کمرے میں پڑ رہی تھی اس سے تمام سائے اس فرد کی پشت پر پڑنے تھے نا کہ اس کے سامنے!''

سارجنٹ ڈاسن یہ سن کر ششدر رہ گیا۔

جب پٹرول مین گریگ کو اس کا جھوٹ باور کرایا گیا تو اسے اپنے جرم کا اقرار کرنا ہی پڑ گیا۔

''اگر تم لوگ یہ سمجھتے ہو کہ ہیری جیمز کا یہ فینسی آفس اس کی سراغ رسانی کی کمائی سے بنا ہوا ہے تو اس بارے میں دوبارہ غور کریں۔ وہ اور کچھ نہیں، ایک بے ایمان، دھوکے باز، چاپلوس بلیک میلر تھا۔ وہ میری ایک ایسی احمقانہ غلطی کی بنیاد پر جو مجھ سے برسوں پہلے اس وقت سرزد ہوئی تھی جب ہم پارٹنر ہوا کرتے تھے، میرا خون نچوڑے جا رہا تھا۔

''جب میں نے باہر ہتھوڑی پڑی ہوئی دیکھی اور موقع غنیمت جانا تو یہ کام کر دیا۔ لیکن جب میں نکلنے والا تھا تو مجھے سیکریٹری کی کار کا دروازہ بند ہونے کی آواز سنائی دی۔ میرا خیال نہیں تھا کہ میں اپنے بھاری بھرکم وجود کے ساتھ ہیری جیمز کے دفتر کی کھڑکی سے باہر نکل پاؤں گا۔ سو میں نے خود سے ہتھوڑی سے اپنے سر پر ضرب لگا لی اور خود پر قاتل کے حملہ کرنے کی کہانی گھڑ لی۔'' پٹرول مین گریگ نے اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا اور پھر سر جھکاتے ہوئے اپنے دونوں ہاتھ آگے بڑھا دیے۔

سارجنٹ ڈاسن نے اس کے ہاتھوں میں ہتھکڑی پہنا دی اور لیفٹیننٹ ملرائے نے اسے اس کے حقوق پڑھ کر سنانا شروع کر دیے۔

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

طاہر جاوید مغل

انگارے

چوبیسویں قسط

نیکی کر دریا میں ڈال... بات محاورے کی حد تک ٹھیک ہو سکتی ہے لیکن خود غرضی اور سفاکی کے اس دور میں نیکی کرنے والے کو ہی کمر میں پتھر باندھ کر دریا میں ڈال دیا جاتا ہے۔ انسان بے لوث ہو اور سینے میں دردمند دل رکھتا ہو تو اس کے لیے قدم قدم پر ہولناک آسیب منہ پھاڑے انتظار کررہے ہوتے ہیں۔ بستیوں کے سرخیل اور جاگیرداری کے بے رحم سرغنہ لہو کے پیاسے ہو جاتے ہیں... اپنوں کی نگاہوں سے نفرت کے انگارے برسنے لگتے ہیں... امتحان در امتحان کے ایسے کڑے مراحل پیش آتے ہیں کہ عزم کمزور ہو تو مقابلہ کرنے والا خود ہی اندر سے ریزہ ریزہ ہو کر بکھرتا چلا جاتا ہے لیکن حوصلہ جوان ہو تو پھر ہر سازش کی کوکھ سے دلیری اور ذہانت کی نئی کہانی ابھرتی ہے۔ وطن کی مٹی سے پیار کرنے والے ایک بے خوف نوجوان کی داستان جسے ہر طرف سے وحشت و بربریت کے خون آشام سایوں نے گھیر لیا تھا مگر وہ ان پیاسی دلدلوں میں رکے بغیر دوڑتا ہی چلا گیا... اثرورسوخ اور درندگی کی زنجیریں بھی اس کے بڑھتے ہوئے قدم نہیں روک سکیں۔ وقت کی میزان کو اس کے خونخوار حریفوں نے اپنے قدموں میں جھکا لیا تھا مگر وہ ہار مان کر پسپا ہونے والوں میں سے نہیں تھا...

سطر سطر رنگ بدلتی... ایک لہو رنگ اور دل گداز داستان...

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

گذشتہ اقساط کا خلاصہ
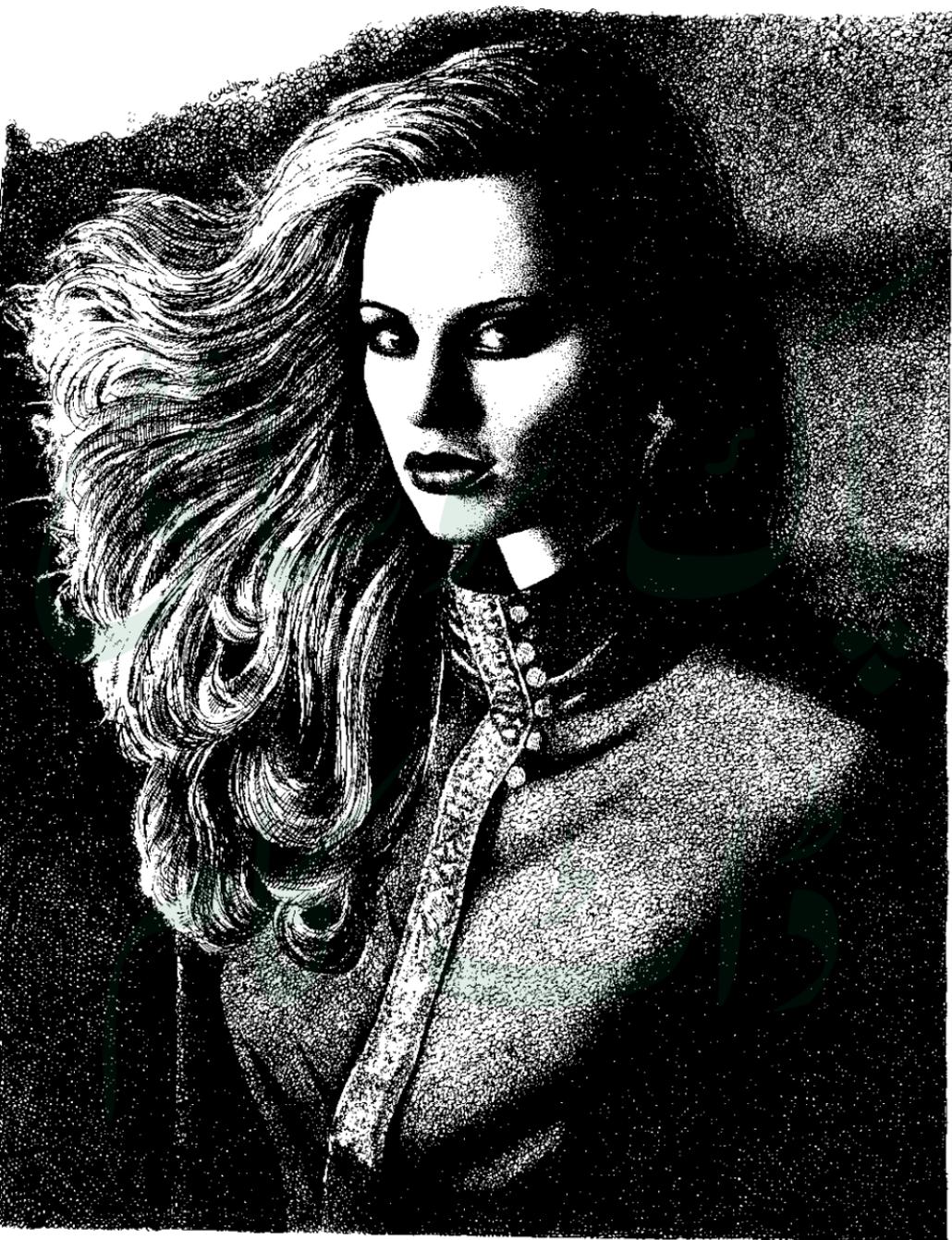
میں ڈنمارک سے پاکستان کسی کی تلاش میں آیا تھا مگر یہ تلاش شروع ہونے سے پہلے ہی ایک ایسا واقعہ ہوگیا جس نے میری زندگی کو تہ وبالا کر دیا۔ میں نے سرراہ ایک زخمی کو اٹھا کر اسپتال پہنچایا۔ مقامی پولیس نے مددگار کے بجائے مجرم ٹھہرایا اور یہیں سے جبر و ناانصافی کا ایسا سلسلہ شروع ہوا جس نے مجھے شکیل داراب اور لالہ نظام جیسے خطرناک لوگوں کے سامنے کھڑا کر دیا۔ یہ لوگ ایک قبضہ گروپ کے سرخیل تھے جو رہائشی کالونیاں بنانے کے لیے چھوٹے زمینداروں اور کاشت کاروں کو ان کی زمینوں سے محروم کر رہا تھا۔ میرے چچا حفیظ سے بھی زبردستی ان کی آبائی زمین ہتھیانے کی کوشش کی جارہی تھی۔ چچا کا بیٹا ولید اس جبر کو برداشت نہ کر سکا اور شکیل داراب کے دست راست انسپکٹر قیصر چودھری کے سامنے سینہ تان کر کھڑا ہوگیا۔ اس جرأت کی سزا اسے یہ ملی کہ ان کی حویلی کو اس کی ماں اور بہن فائزہ سمیت جلا کر راکھ کر دیا گیا اور وہ خود دہشت گرد قرار پا کر جیل پہنچ گیا۔ انسپکٹر قیصر اور لالہ نظام جیسے سفاک لوگ میرے تعاقب میں تھے، وہ میرے بارے میں کچھ نہیں جانتے تھے۔ میں MMA کا یورپی چیمپئن تھا، وسطی یورپ کے کئی بڑے بڑے گینگسٹر میرے ہاتھوں ذلت اٹھا چکے تھے۔ میں اپنی پچھلی زندگی سے بھاگ آیا تھا لیکن وطن پہنچتے ہی یہ زندگی پھر مجھے آواز دینے لگی تھی۔ میں یہاں سے بیزار ہو کے واپس ڈنمارک جارہا تھا کہ ایک انہونی ہوئی۔ وہ جادوئی حسن رکھنے والی لڑکی مجھے نظر آگئی جس کی تلاش میں، میں یہاں پہنچا تھا۔ اس کا نام تاجور تھا اور وہ اپنے گاؤں چاندگڑھی میں نہایت پریشان کن حالات کا شکار تھی۔ میں اس کے گاؤں جا پہنچا اور ایک ٹریکٹر ڈرائیور کی حیثیت سے اس کے والد کے پاس ملازم ہوگیا۔ انیق بطور مددگار میرے ساتھ تھا۔ تاجور کا غنڈا صفت منگیتر اسحاق اپنے ہمنواؤں زمیندار عالمگیر اور پیر ولایت کے ساتھ مل کر تاجور اور اس کے والد دین محمد کے گرد گھیرا تنگ کر رہا تھا۔ مقامی مسجد کے امام مولوی فدا کی موت میں بھی اسی زمیں دار کا ہاتھ تھا۔ مولوی جی کی بیٹی زینب ایک عجیب بیماری کا شکار تھی۔ وہ زمیندار عالمگیر کے گھر میں ٹھیک رہتی لیکن جب اسے وہاں سے لایا جاتا تو اس کی حالت غیر ہونے لگتی۔ اسی دوران میں ایک خطرناک ڈاکو سجاول نے گاؤں پر حملہ کیا۔ حملے میں عالمگیر کا چھوٹا بھائی مارا گیا۔ میں تاجور کو حملہ آوروں سے بچا کر ایک محفوظ جگہ لے گیا۔ ہم دونوں نے کچھ اچھا وقت گزارا۔ واپس آنے کے بعد میں نے بھیس بدل کر مولوی فدا سے ملاقات کی اور اس نتیجے پر پہنچا کہ عالمگیر وغیرہ نے زینب کو جان بوجھ کر بیمار کر رکھا ہے اور یوں مولوی صاب کو مجبور کیا جارہا ہے کہ وہ اپنی بچی کی جان بچانے کے لیے اسحاق کی حمایت کریں۔ میں نے مولوی صاحب کو اس بلیک میلنگ سے نکالنے کا عہد کیا مگر اگلی رات مولوی صاحب کو قتل کر دیا گیا۔ ایک گھناؤنی درگاہ کے خاتمے کے بعد ہم کھردوں کی جانب گامزن تھے کہ میں اور تاجور سجاول ڈاکو کے ڈیرے پر جا پہنچے۔ یہاں سجاول کی ماں (ماؤجی) مجھے اپنا ہونے والا جوائی سمجھی۔ جس کی پوتی مہناز عرف مانی سے میری بات طے تھی۔ یوں سجاول سے ہماری جان بچ گئی۔ یہاں سجاول نے میرا مقابلہ باقرے سے کرا دیا۔ سخت مقابلے کے بعد میں نے باقرے کو چت کر دیا تو میں نے سجاول کو مقابلے کا چیلنج کر دیا۔ میرے چیلنج نے سجاول سمیت سب کو پریشان کر دیا تھا۔ اس دوران ایک خط میرے ہاتھ لگ گیا جسے پڑھ کر چاندگڑھی کے عالمگیر کا مکروہ چہرہ سامنے آگیا۔ اس خط کے ذریعے میں سجاول اور عالمگیر میں دراڑ ڈالنے میں کامیاب ہوگیا۔ متوقع مقابلے کے بارے میں سوچتے سوچتے میرا ذہن ایک بار پھر ماضی کے اوراق پلٹنے لگا۔ جب میں ڈنمارک میں تھا اور ایک کمزور پاکستانی کو گورے اور انڈین غنڈوں سے بچاتے ہوئے خود ایک طوفان کی لپیٹ میں آگیا۔ وہ غنڈے ٹیکساری گینگ کے لوگ تھے جس کا سرغنہ جان ڈیرک تھا۔ مجھ سے بدلہ لینے کے لیے انہوں نے میری یونیورسٹی دوست ڈیزی کے ساتھ اجتماعی کھیل کھیلا، پھر ڈیزی غائب ہوگئی۔ اس واقعے کے بعد میری زندگی میں ایک انقلاب آگیا۔ مجھے چھ ماہ جیل ہوئی۔ پھر میرا رجحان مارشل آرٹ کی طرف ہوگیا اور ایسٹرن کنگ کی حیثیت سے MMA کی فائٹس میں تہلکہ مچاتا رہا اور دوسری طرف اسکائی ماسک کی اوٹ، میں ٹیکساری گینگ کے غنڈوں سے برسرپیکار رہا۔ اسی مارشل آرٹ کی بدولت میں نے سجاول سے مقابلہ کیا اور سخت مقابلے کے بعد برابری کی بنیاد پر ہار مان کے سجاول کا دل جیت لیا۔ سجاول سے کہہ کر میں نے انیق کو بلوا لیا۔ سجاول ایک حسین دوشیزہ سنبل کو نو بیاہتا دلہن کی طرح سجا سنوار کر ریان فردوس (وڈے صاحب) کی خدمت میں تحفے کے طور پر پیش کرنا چاہتا تھا۔ میں، انیق اور جاناں ساتھ تھے۔ ہم ریان فردوس کے محل نما بنگلے پاراہاؤس پہنچے۔ وڈا صاحب اپنے دو بیٹوں کے ہمراہ برونائی سے پاکستان شفٹ ہوا تھا۔ برونائی میں اس کی خاندانی دشمنی چل رہی تھی۔ سجاول کو پاراہاؤس میں کلیدی حیثیت حاصل ہوگئی تھی۔ پاراہاؤس میں کوئی بڑا چکر چل رہا تھا۔ کھوج لگانے پر پتا چلا کہ بڑے صاحب کے دونوں بیٹوں میں زہریلا عنصر پایا جاتا ہے۔ زینب والا معاملہ بھی اسی طرف اشارہ کر رہا تھا۔ اسی وجہ سے زینب کو بھی اغوا کر لیا گیا۔ ابراہیم اور کمال احمد کے لیے جو لڑکیاں تیار کی گئی تھیں، وہ پاراہاؤس پہنچ چکی تھیں۔ ایک تقریب میں دونوں لڑکیوں کی رونمائی کی گئی تو ان میں ایک زینب تھی۔ ابراہیم نے مجھ پر اور سجاول پر اعتماد کا اظہار کیا تھا۔ ابراہیم نے بتایا کہ دونوں بھائیوں میں زہریلا پن موجود ہے اسی لیے ان کے لیے ایسی لڑکیاں ڈھونڈی گئی ہیں۔ میں نے ابراہیم کو آگاہ کیا کہ زینب پوری طرح محفوظ نہیں ہے اور شادی کی صورت میں اسے نقصان پہنچ سکتا ہے۔ یہ سن کر ابراہیم پریشان ہوگیا۔ ادھر آقا جان جو پاراہاؤس کا کرتا دھرتا تھا، اس نے سرغنہ ثاقب کے فرار کا ڈراما رچایا۔ ایک بار پھر پاراہاؤس میں دھماکے گونج اٹھے۔ تابڑتوڑ گولیاں چلیں اور مقابلے میں سرغنہ ثاقب اور اس کا ساتھی عبرت ناک موت مارے گئے۔ میرے کہنے پر ابراہیم نے زینب کا خون ٹیسٹ کرایا تو حقیقت کھل کر سامنے آگئی۔ اس تمام قتل و غارت میں آقا جان ملوث تھا مگر کوئی اس پر شک کرنے کو تیار نہ تھا۔ ثاقب کی موت کے بعد برونائی میں مخالفین نے بڑی کارروائی کر کے وڈے صاحب کے برادرِ نسبتی کو مار ڈالا تھا۔

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

بڑی بیگم صاحبہ کا رو رو کر برا حال تھا، ان حالات سے نبرد آزما ہونے کے لیے میں اور سجاول وڈے صاحب کے ساتھ بروناٸی جانے کے لیے تیار تھے۔ بروناٸی جانے سے پہلے میں ایک نظر تاجور کو دیکھنا چاہتا تھا۔ ایک طویل فاصلہ طے کر کے میں تاجور کی ایک جھلک ہی دیکھ پایا تھا کہ گاؤں کے چند لڑکوں نے مجھے گھیر لیا۔ میرے سامنے وہ بچے تھے۔ اپنی ہار کے بعد ایک دلیر لڑکا میرے گلے کا ہار بن گیا اور میرا پیچھا کرتا ہوا پارا ہاؤس تک آ گیا۔ سیف عرف سیفی کی بیٹی نکالنے کے لیے ہم اسے اپنے ساتھ بروناٸی لے آئے تھے یہاں حالات بہت خراب تھے۔ آقا جان کا بیٹا مخالف پارٹی بن چکا تھا اور امریکن ایجنسی کے ساتھ مل کے پورے علاقے پر قبضہ کرنا چاہتا تھا۔ آقا جان کی بھتیجی قسطینا کمانڈر اور جی دار آفیسر تھی۔ وہ ایسٹرن کنگ کی حیثیت سے جانی جاتی تھی۔ میں کئی مہم میں اس کے ہمراہ رہا۔ ریان فردوس کی پہلی بیوی اور اس کے بیٹے کی شورشیں بڑھتی جا رہی تھیں۔ مجھے شروع سے آقا جان پر شک تھا۔ وہ مجھے اغوا کر کے اپنے ٹارچر سیل لے گیا۔ میرے ساتھ جاناں بھی اس کی لپیٹ میں آ گئی۔ جاناں کسی نہ کسی طرح مجھ تک پہنچ گئی وہ زخموں سے چور تھی۔ آقا جان اور قلمی نے خوفناک منصوبہ بندی کی تھی۔ بالآخر میرے جو خدشات تھے وہ حرف بہ حرف درست ثابت ہوئے۔ رائے زل اور امریکن ایجنسی کی قوت نے محل پر دھاوا بول دیا تھا۔ افراتفری اور قتل و غارت گری نے اینٹ سے اینٹ بجا دی تھی۔ اس حملے میں ریان فردوس اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھا تھا۔ اب ریاست پر کلی طور پر رائے زل کا قبضہ ہو چکا تھا۔ ہم سب بڑی مشکل سے جان بچانے میں کامیاب ہو سکے تھے۔ ہم سب زیر زمین پُرآسائش تہ خانے میں منتقل ہو چکے تھے...... آقا جان اور رائے زل کے کارندے ہماری تلاش میں تھے۔ ابراہیم اور زینب کا برا حال تھا۔ میری ذات ان کے لیے بہت بڑا سہارا تھی۔ کمال اس جنگ میں جان سے دھو بیٹھا تھا۔ میں ہاتھ پر ہاتھ رکھ کے نہیں بیٹھ سکتا تھا۔ نہایت ہوشیاری سے ایک منصوبہ تشکیل دیا۔ اور میں اس جلسے میں جا پہنچا جہاں رائے زل اور آقا جان کی ٹیم موجود تھی۔ میں نے رائے زل کو گولیوں کا نشانہ بنایا تھا اور یہ کارنامہ انجام دے ڈالا تھا۔ ہمارا منصوبہ تقریباً کامیابی سے ہمکنار ہوا تھا۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

اگلے روز میں نے خود کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کیا۔ کل رات قسطینا سے میری بڑی اہم بات چیت ہوئی تھی اور مجھے خوشی تھی کہ قسطینا نے میری باتوں کو سمجھا ہے۔ کچھ بھی تھا وہ ایک غیر معمولی ذہین اور جانباز کمانڈر تھی۔ دیکھنے میں ایک خوبرو لڑکا نظر آتی ہوگی مگر اس کے اندر ایک بہادر لیڈر کی تمام خوبیاں موجود تھیں اور یقیناً ان میں سے ایک خوبی یہ بھی تھی کہ اسے اپنے جذبات کو سنبھالنا اور خود کو حالات کے مطابق ڈھالنا آتا تھا۔ میں نے اسے جذبات کے راستے سے ہٹا کر حقیقت کا راستہ دکھایا تھا...... مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ اس نے میری رہنمائی کو سنجیدگی سے لیا ہے۔

اچانک کمرے میں برقی روشنی پھیل گئی۔ سیف نے نعرہ لگایا۔ ”آ گئی۔“

انیق ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ ”یہ پاکستانی آواز کہاں سے آئی ہے۔“

”کیا مطلب؟“ سیف نے پوچھا۔

”یہ آ گئی اور چلی گئی والی آوازیں تو ہمارا قومی ورثہ ہیں۔ یہاں کس ناہنجار نے لائٹ بھیجی ہے اور کس بے وقوف نے نعرہ لگایا ہے؟“

میں نے کہا۔ ”زیادہ مسخری نہ کرو۔ خدا کا شکر کرو کہ جنریٹرز نے کام شروع کر دیا ہے۔“

اسی دوران میں بن مشہد نے بھی اندر آ کر یہی مژدہ سنایا، وہ بولا۔ ”اب ہو سکتا ہے کہ ہم کو بُرے بھلے ٹی وی سگنلز بھی ملنے لگیں۔ یہاں دو چھوٹے سائز کے ٹی وی سیٹ موجود ہیں۔ میں ابھی چیک کرتا ہوں۔“

قریباً پانچ منٹ بعد بن مشہد ایک پورٹیبل ٹی وی لے کر اندر داخل ہوا۔ اسکرین قریباً 16 انچ کی رہی ہوگی۔ اس پر شائیں شائیں کی آواز کے ساتھ مدھم تصویر بھی آ رہی تھی۔ کئی دنوں بعد جو پہلی نیوز ہم نے سنی، وہی تکلیف دہ تھی۔ ایک ٹاک شو میں تین افراد بیٹھے محوِ گفتگو تھے۔ اینکر پرسن نے کہا۔ ”کچھ لوگ یہ کہتے ہیں کہ ہرایکسی لینسی مادام ہاناوانی کی پیش گوئی درست ثابت ہوئی ہے۔ انہوں نے برسوں پہلے کہہ دیا تھا کہ محترم ریان فردوس کے دونوں بیٹوں کی موت زہر کی وجہ سے ہوگی۔“

ایک صحافی نے کہا۔ ”لیکن...... کمال احمد کی موت کی وجہ زہر خورانی کیسے ہوگئی۔ وہ تو فاقہ کشی کی وجہ سے جاں بحق ہوئے جس ویران گودام میں انہوں نے خود کو چھپایا تھا، وہ اندر سے مقفل ہو گیا۔ بدقسمتی سے وہ باہر نہ نکل سکے اور نہ ان کی آواز کسی تک پہنچ سکی۔“

”آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔“ اینکر پرسن نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔ ”لیکن اگر غور کیا جائے تو بات پھر وہیں پر آ جاتی ہے جیسا کہ ہم جانتے ہیں...... بلکہ اب تو عام لوگ بھی جان گئے ہیں کہ کمال احمد اور ابراہیم کو کھانے میں روزانہ زہر کی ڈوز دی جاتی تھی تاکہ ان پر زہر اثر نہ کر سکے مگر جب فاقہ کشی کی وجہ سے محترم کمال احمد کو ڈوز نہ ملی تو ان

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

کا جسم اس کمی کو برداشت نہ کر پایا۔ یعنی ان کی موت تو زہر کی وجہ سے ہی ہوئی نا۔''

شرکا میں سے دوسرے شخص نے اپنا گنجا سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''میں آپ کی بات کی تائید کرتا ہوں۔ آپ نے واقعی ایک اچھا نقطہ نکالا ہے۔ مادام کی پیش گوئی تو یہی تھی تا کہ دونوں بھائیوں کی موت زہر کی وجہ سے ہوگی۔''

میں نے دیکھا ابراہیم کا رنگ زرد ہو رہا تھا۔ اس کی آنکھوں پر آنسوؤں کی یلغار ہوئی اور اس نے سسکیاں لینا شروع کر دیں۔ زینب اس کے پاس ہی کھڑی تھی۔ یہ ٹاک شو چونکہ انگلش میں تھا اس لیے زینب کی سمجھ میں یہ باتیں نہیں آئی تھیں۔ تاہم اپنے شوہر کو اشک بار دیکھ کر وہ بھی خشک پتے کی طرح لرزنے لگی تھی۔

''کیا ہوا انیق بھائی؟'' اس نے قریب کھڑے انیق کو کندھے سے ہلا کر پوچھا۔

انیق نے سوالیہ نظروں سے میری جانب دیکھا پھر زینب کو بتا دیا کہ ٹاک شو کے ذریعے کیا خبر ہم تک پہنچی ہے۔

ٹاک شو میں ہونے والی گفتگو سے پتا چلتا تھا کہ کمال احمد کی موت والا واقعہ چار پانچ روز پرانا ہے اور اب اس پر خیال آرائیوں کا سلسلہ چل رہا ہے۔ زینب نے بھی زارو قطار رونا شروع کر دیا تھا۔ وہ بڑی معصوم روح تھی۔ اس کے تقریباً سارے سسرالیوں نے ہی اسے نظرِ کرم سے محروم رکھا تھا لیکن وہ ان کی مصیبت یا موت کا سن کر یوں دکھی ہوتی تھی جیسے وہ اس کے خونی رشتے ہوں۔

کمانڈر فارس جان بھی اب شائیں شائیں کرتے ٹی وی کے قریب آن کھڑا ہوا تھا اور تکلیف دہ گفتگو کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ دانت پیس کر بولا۔ ''ڈی پیلس پر مال زادوں کا قبضہ ہو چکا ہے۔ یہ پیدائشی جھوٹے ہیں۔ ان کے منہ میں زبان نہیں کسی بہت پلید جانور کا چھڑا ہے جو صرف بکواس کرنا جانتا ہے۔ انھوں نے ہز ہائی نس کمال احمد کو خود مارا ہوگا۔ اب لوگوں کو بتایا جا رہا ہے کہ وہ کسی گودام میں بند ہونے سے مرا ہے۔ یہ سب کمینے مل کر بیگم نورل کو اذیت دینا چاہتا ہے۔ پہلے اس کے شوہر کی لاش اسے دکھائی، پھر اس کے جوان بیٹے کی......'' فارس جان کی آنکھوں میں آتشیں آنسو تھے۔

قسطینا اور تبارک بھی آ گئے۔ بہت دیر سوگ کی سی کیفیت رہی۔ سب ابراہیم کو دلاسا دینے کی ناکام کوشش کر رہے تھے۔

ٹی وی پر جو کچھ بتایا جا رہا تھا، اس سے پتا چل رہا تھا کہ رائے زل کی حالت کو ابھی تک پوشیدہ رکھا جا رہا ہے۔ عوام کو یہی بتایا جا رہا ہے کہ وہ روبصحت ہے۔ جاماجی کے شہری علاقے میں ظلم و ستم کا بازار بدستور گرم تھا۔ مخالفین کو چن چن کر ختم کیا جا رہا تھا اور جیلوں میں ٹھونسا جا رہا تھا۔ ہماری تلاش کا کام بھی زور و شور سے جاری تھا۔

ایک موقع پر نیوز کاسٹر نے کہا۔ ''یہ بات اب تقریباً ثابت ہو چکی ہے کہ قسطینا کمانڈر فارس اور شاہ زیب وغیرہ نے چھوٹے صاحب ابراہیم کو ان کی دلہن سمیت یرغمال بنا رکھا ہے۔ وہ سرنگ کے اندر جس پناہ گاہ میں کئی دن چھپے رہے ہیں وہاں سے بھی اس بات کے ٹھوس ثبوت ملے ہیں کہ ابراہیم اور زینب ان کے ساتھ ہیں۔ وہاں سے یہ شواہد بھی ملے ہیں کہ کسی کو وہاں رسیوں سے باندھ کر رکھا گیا تھا۔ غالب امکان یہ ہے کہ وہ ہز ہائی نس ابراہیم ہوں گے۔''

پھر نیوز کاسٹر نے اپنے رپورٹر سے سوال جواب شروع کر دیے۔ فیلڈ رپورٹر نے ایک سوال کے جواب میں کہا۔ ''اب تفتیش کرنے والے حکام یہ سوچنے پر مجبور ہو گئے ہیں کہ قسطینا اور اس کے ساتھی شاید جزیرے سے راہِ فرار اختیار کر چکے ہیں۔ اس سلسلے میں اس فوجی ٹرک کا حوالہ بھی دیا جاتا ہے جو پچھلے ہفتے کے شروع میں ساحل سے کچھ فاصلے پر کھڑا ملا تھا۔ اس پر فوجی میس کے لیے پورک (سؤر کا گوشت) لے جایا جا رہا تھا۔

میں نے قسطینا کو اشارہ کیا کہ وہ ابراہیم کو دوسرے کمرے میں لے جائے اور تسلی تشفی دے۔

اسی دوران میں مجھے سنبل نظر آئی۔ اس نے قریب آ کر کہا۔ ''سجاول صاحب آپ کو بلا رہے ہیں۔ کچھ کہنا چاہتے ہیں۔''

کچھ دنوں سے سجاول کی حالت کافی اچھی تھی۔ میں اس کے کمرے میں پہنچا تو وہ سکون سے بیٹھا چائے پی رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر کہنے لگا۔ ''آؤ ذرا باہر چلتے ہیں۔''

میں اس کی بات پر دل ہی دل میں مسکرایا۔ یہاں کوئی ''باہر'' تو تھا ہی نہیں۔ اگر بہتا ہوا پانی تھا تو وہ بھی زیرِ زمین تھا۔ مچھلیاں، پرندے، یا چند پودے نظر آتے تھے تو وہ بھی انڈر گراؤنڈ ہی تھے۔ یہ ایسی جگہ تھی جس نے کبھی سورج کی روشنی دیکھی ہی نہیں تھی۔

ہم نے چھوٹی لائٹس اٹھائیں اور ٹہلتے ہوئے دریا کے کنارے آ گئے۔ روشنی پانی کی لہروں پر اور بنجر پتھروں پر جھلملانے لگی۔ ہم ایک پتھر سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئے۔

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

سجاول نے نارمل انداز میں کہا۔ ''یار! میرے ہوش ٹھکانے پر نہیں تھے۔ پتا نہیں کیا کیا بکتا رہا ہوں، میرا کہا سنا معاف کرنا۔''

میں نے اپنا ہاتھ اس کے بھاری بھرکم ہاتھ پر رکھ دیا۔ ''سجاول! اگر دل صاف ہوں تو پھر زبان سے کہا گیا، برے سے برا لفظ بھی کوئی معنی نہیں رکھتا۔''

وہ لمبی سانس لے کر بولا۔ ''شاہ زیب! تو نے مجھے بدلا ہے۔ نہیں تو میں بالکل اور طرح کا بندہ تھا۔ میں نے زندگی میں کبھی کسی کو دوست نہیں بنایا اور نہ شاید کبھی بناؤں گا۔''

''تو پھر مجھے کیوں بنایا؟'' میں ہولے سے مسکرایا۔

وہ بدستور کھوئی کھوئی آواز میں بولا۔ ''کوئی ویلا (وقت) ایسا ہوتا ہے جس میں بڑی طاقت ہوتی ہے۔ یہ طاقت بہت کچھ بدل دیتی ہے...... میں اپنی اور تیری ہتھ جوڑی کو کبھی نہیں بھول سکوں گا۔ وہ میری اب تک کی زندگی کی سب سے بڑی لڑائی تھی اور وہ بھی اپنے ڈیرے پر...... اپنے سارے کارندوں اور ساتھیوں کے سامنے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر میں اس لڑائی میں ہار جاتا تو شاید سردار بھی نہ رہ سکتا......اور کیا پتا کہ کسی کو منہ بھی نہ دکھاتا اور چپ چاپ کسی طرف نکل جاتا۔''

''چلو چھوڑو ان پرانی باتوں کو سجاول۔''

''لیکن میرے لیے یہ بات کبھی پرانی نہیں ہوگی۔ تم نے میرے لوگوں کے سامنے میری عزت رکھی اور میری ہار کو اپنی ہار بنا لیا۔ ایسے کاموں کے لیے لوہے کا جگر چاہیے ہوتا ہے شاہ زیب! اور میں سمجھتا ہوں کہ تم لوہے کا جگر رکھتے ہو۔''

''یار! اب تم شرمندہ کر رہے ہو۔ کوئی اور بات کرو۔''

وہ کچھ دیر خاموش رہ کر بولا۔ ''سنا ہے تم یہاں جاماجی میں بھی بہت مشہور ہو گئے ہو۔ تم نے لڑائی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ہے اور ایک بڑے نازک موقع پر کمانڈر قسطینا کی جان بھی بچائی ہے؟''

میں نے کہا۔ ''تمہاری یہ مشہوری والی بات ٹھیک ہے۔ لیکن اس حوالے سے مجھے تم سے ایک چھوٹا سا شکوہ بھی ہے۔'' میں نے آخری الفاظ مسکراتے ہوئے کہے تھے۔

وہ سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھنے لگا۔

خاموشی ذرا طویل ہوئی تو میں نے کہا۔ ''سجاول! میں نے تمہیں ایک دفعہ بتایا تھا نا کہ میرے پیچھے کچھ لوگ ہیں۔ انہی کی وجہ سے میں نے اپنی شناخت کو چھپا رکھا تھا...... سجاول، وہ بہت خطرناک ہیں۔ ان جیسے لوگ تم نے پہلے نہیں دیکھے ہوں گے۔ وہ میرے خون کے پیاسے ہیں۔ مجھے تلاش کرتے پھر رہے ہیں۔ مجھے نہیں لگتا کہ وہ اب زیادہ دیر مجھ سے دور رہیں گے۔''

سجاول کا چہرہ بجھ سا گیا۔ آنکھوں میں گہری تشویش اُمڈ آئی۔

میں نے کہا۔ ''میں خدانخواستہ تمہیں کوئی الزام نہیں دے رہا۔ تم نے اگر قسطینا کو میرے بارے میں بتایا تو وہ کسی بری نیت سے نہیں تھا بلکہ یہ تمہارے اندر کی خوشی تھی کہ تمہارا دوست ایک جانا پہچانا شخص ہے اور ویسے بھی یہ بات جلد یا بدیر کھلنی ہی تھی۔ اس کا کوئی نہ کوئی بہانہ بن ہی جانا تھا۔ کوٹلی میں بھی تمہارے ایک کارندے باقر نے مجھے پہچان لیا تھا۔''

''کون لوگ ہیں وہ، جو تمہیں ڈھونڈ رہے ہیں؟'' سجاول نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

''چلو، یہ موضوع پھر کسی وقت سہی، ابھی کوئی اور بات کرتے ہیں۔ تمہاری طبیعت اب کیسی ہے؟''

وہ میرے فقرے کو نظرانداز کرتے ہوئے بولا۔ ''شاہ زیب! میں ان لوگوں میں سے نہیں جو زبان سے ''یار یار'' کی رٹ لگاتے ہیں لیکن میرے دل نے تمہیں اپنا یار سمجھا ہے...... اور جو یار کے دشمن ہوتے ہیں، وہ اپنے دشمن ہوتے ہیں۔ کبھی موقع پڑا تو میں یہ ثابت کر کے دکھا دوں گا۔'' سجاول کے لہجے میں پنجاب کے بہتے پانیوں کا زور اور سرکش ہواؤں کی آشفتہ سری تھی۔

''ابراہیم کے بھائی کمال کے بارے میں کچھ پتا چلا؟'' میں نے سجاول سے پوچھا۔ اس نے چونک کر انکار میں سر ہلایا۔ میں نے اسے بتایا۔ ''عزت مآب ریان فردوس کے بعد اسے بھی مار دیا گیا ہے لیکن کہا یہ جا رہا ہے کہ اپنی موت کا سبب وہ خود بنا ہے۔''

سجاول نے تاسف سے سر ہلایا۔ ''بیگم نورل پر تو ظلم کے پہاڑ ٹوٹ گئے ہیں، انیق مجھے بتا رہا تھا کہ وہ زخمی بھی ہیں؟''

''ہاں جب گرے فوجیوں نے ریان فردوس کو قتل کیا تو بیگم نورل نے شوہر کے سامنے ڈھال بننے کی کوشش کی۔ سنا ہے انہیں کافی زخم آئے تھے۔ بہرحال اب وہ بہتر ہیں...... جن دنوں لڑائی ہو رہی تھی، وہ تمہیں بھی یاد کرتی رہی

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

ہیں۔''

''بڑی چنگی عورت ہے۔ میں دل سے اُس کی عزت کرتا ہوں۔ اگر ہمیں اس کی مدد کرنے کا کوئی موقع مل جائے تو بڑی اچھی گل ہوگی۔''

سجاول کو تجسّس تھا کہ اس کے بعد ڈی پیلس اور نیوسٹی میں کیا ہوتا رہا ہے۔ میں نے اسے چیدہ چیدہ حالات سے آگاہ کیا۔ میں بھی اس کے حالات تفصیل سے جاننا چاہتا تھا لیکن میری خواہش تھی کہ میں اصرار نہ کروں بلکہ وہ خود ہی بتائے تا کہ اس کے ذہن پر بوجھ نہ پڑے۔

اچانک انیق کی آواز آئی۔ وہ پناہ گاہ کے بیرونی دروازے پر کھڑا تھا اور مجھے آواز دے کر بلا رہا تھا۔ ''ایک تو تمہارا یہ نکو شہزادہ تمہیں کہیں چین نہیں لینے دیتا۔'' سجاول نے بڑبڑانے والے انداز میں کہا۔

ہم تاریک دریا کے تاریک کنارے سے اٹھ کر انیق کے پاس پہنچے۔ وہ بولا۔ ''قسطینا آپ دونوں کو بلا رہی ہیں۔ رائے زل کے بارے میں خبر چل رہی ہے۔''

میرے ذہن میں پہلا خیال یہی آیا کہ وہ مرگیا ہے۔ تبارک کے مطابق اور دیگر خبروں کے مطابق اس کی حالت بڑی پتلی تھی مگر جب میں نے انیق کا چہرہ دیکھا تو اس پر مختلف تاثرات نظر آئے۔ ہم اندر پہنچے۔ برقی روشنی نے اب اس پناہ گاہ کو مزید پُرآسائش بنا دیا تھا۔ قسطینا، فارس جان، بن مشہد اور تبارک وغیرہ ٹی وی کے سامنے حیران بیٹھے تھے۔ اسکرین پر نگاہ دوڑانے کے بعد میں بھی ششدر نظر آنے لگا۔ وہاں فربہ اندام رائے زل اپنے تمام تر رعب داب اور ہیبت کے ساتھ موجود تھا۔ وہ ڈی پیلس کی عظیم الشان نشست گاہ میں تھا۔ طلائی تاروں والی مرصّع ٹوپی، شاہی مُچّھا اور ہیروں جڑی جوتی، معززین کی ایک طویل قطار اس کے سامنے مؤدب دکھائی دے رہی تھی۔ وہ ان کے ساتھ مصافحہ کرتا اور مسکراہٹیں بکھیرتا آگے بڑھ رہا تھا۔

''یہ کیسے ہوسکتا ہے؟'' میں نے حیرت سے ڈاکٹر تبارک کی طرف دیکھا۔

''یقین نہیں آرہا۔'' تبارک نے بھی شدید الجھن سے کہا۔ ''بیس پچیس دن تو کیا یہ شخص بیس پچیس مہینوں میں بھی ٹھیک نہیں ہوسکتا تھا اور...... اسے دیکھ کر تو لگتا ہے کہ اسے کچھ ہوا ہی نہیں تھا......''

نشست گاہ میں ایک جانب رائے زل کی والدہ ہاناواتی بڑی شان سے براجمان تھی۔ چوڑی چکلی عورت، جڑاؤ گہنوں سے سجی ہوئی اور کسی مجسمے کی طرح ساکت۔ اس نے نشست گاہ کے اندر بھی سیاہ عینک لگا رکھی تھی اور یہ عینک اس کی شخصیت کو مزید پُراسرار بناتی تھی۔ اس سے دو تین میٹر دور ایک نسبتاً چھوٹی نشست پر آقا جان بھی موجود تھا۔ اس کی ایک ٹانگ پر پلاستر کی موجودگی کا پتا چلتا تھا۔

کیپٹن بن مشہد نے اسکرین کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''کہیں...... ایسا تو نہیں کہ یہ کوئی اور ہو، رائے زل نہ ہو۔''

''نہیں۔'' قسطینا نے پورے یقین سے کہا۔ ''یہ رائے زل ہی ہے۔'' پھر وہ یک دم جیسے چونک سی گئی۔ اس کے تاثرات بدل گئے۔ اس نے ایک بار پھر اسکرین کو دھیان سے دیکھا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ سرسراتے لہجے میں بولی۔ ''ہاں...... یہ ہوسکتا ہے کہ جسے جلسہ گاہ میں گولیاں لگیں، وہ رائے زل نہ ہو۔'' ہم سب سناٹے میں رہ گئے۔

نیوز کاسٹر تبصرہ کررہا تھا۔ ''آج پورے جزیرے کے لیے نہایت خوشی کا دن ہے۔ جزیرے کی سب سے ہر دلعزیز شخصیت عزت مآب رائے زل موت کو شکست دے کر اٹھ کھڑے ہوئے ہیں اور پھر سے اپنے عوام کے درمیان ہیں۔ یہ سب کچھ ایک کرشمے کی طرح ہے۔ اب میں نامور صحافی مسٹر مائیکل کے تاثرات سے آپ کو آگاہ کرتا ہوں۔ اس نے نامور صحافی کو لائن پر لیا۔ اس نے دھیمے لیکن لرزاں لہجے میں کہنا شروع کیا۔ ''میں ابھی کچھ لوگوں سے بات کررہا تھا۔ اکثریت کا یہ کہنا ہے کہ یہ ایکسی لینسی مادام ہاناواتی کی کرشماتی شخصیت کا ایک اور کھلا ثبوت ہے۔ جب بہترین امریکن اور آسٹروی ڈاکٹرز بھی عزت مآب کی صحت کی طرف سے ناامید تھے۔ مادام نے فرمایا تھا کہ اوپر والے نے چاہا تو چند دن میں ان کا فرزند اپنے پاؤں پر کھڑا ہوجائے گا اور اپنے لوگوں کے درمیان ہوگا۔ اس وقت بہت سے لوگوں نے اس بیان کو ایک دکھی اور مضطرب ماں کی ذاتی سوچ قرار دیا تھا لیکن آج سب کچھ ہمارے سامنے ہے۔ بے شک یہ اکیسویں صدی ہے۔ بے شک سائنس بہت آگے جاچکی ہے لیکن سائنس کتنی بھی آگے چلی جائے، صدیاں کتنا بھی سفر طے کرلیں مگر انہونیوں کی گنجائش تو ہمیشہ رہی ہے اور رہے گی۔ اور یہ انہونیاں اسی سائنس کے اندر سے پھوٹیں گی جس کے ہم گرویدہ ہیں۔''

تبصرہ کرنے والا بول رہا تھا لیکن ہمارے کانوں میں قسطینا کے الفاظ ہی گونج رہے تھے۔ اس نے کہا تھا کہ بے شک یہ رائے زل ہی ہے...... لیکن ہوسکتا ہے کہ جلسہ گاہ میں نشانہ بننے والا رائے زل نہ ہو...... اس سے مشابہت رکھنے

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

والا کوئی اور شخص ہو۔ (وی آئی پیز کی سیکیورٹی کے جو انتظامات کیے جاتے ہیں، ان میں اکثر اس طرح کے اقدامات بھی اٹھائے جاتے ہیں)

قسطینا نے تبارک سے پوچھا۔ ''کیپٹن! تمہارا کہنا ہے کہ تم نے اسپتال میں رائے زل کو قریب سے دیکھا تھا۔ کیا تمہیں یقین ہے کہ وہ رائے زل ہی تھا؟''

تبارک مؤدب لہجے میں بولا۔ ''یور ہائی نس! میں نے آپ کو بتایا تھا کہ وہاں اسپتال میں سیکیورٹی بے حد سخت تھی۔ غیر معمولی اقدام کیے گئے تھے۔ دو تین بڑے ڈاکٹرز اور خاص میڈیکل اسٹاف کے علاوہ کسی کو رائے زل کے روم میں جانے کی اجازت نہیں تھی۔ میں نے بھی کچھ فاصلے سے ہی دو تین بار رائے زل کو دیکھا تھا، اس وقت ان کے چہرے پر آکسیجن ماسک بھی تھا۔''

قسطینا نے اپنے کان کی لو کو کھینچتے ہوئے کہا۔ ''میرے خیال میں نوے فیصد امکان اس بات کا ہے کہ جلسہ گاہ کے اسٹیج پر بیٹھا ہوا شخص رائے زل نہیں تھا۔''

''لیکن اسے کچھ ہی دیر بعد مائیک پر آکر تقریر بھی تو کرنا تھی؟'' میں نے نقطہ اٹھایا۔

''ہوسکتا ہے شاہ زائب کہ...... تقریر سے چند منٹ پہلے نقلی رائے زل اٹھ کر بیک اسٹیج پر جاتا اور اصلی آکر خطاب شروع کردیتا۔''

بن مشہد نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''یور ہائی نس! میں نے بھی کچھ اس سے ملتی جلتی بات سنی ہوئی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ سیکیورٹی کے لیے رائے زل سے مشابہت رکھنے والا ایک شخص موجود ہے۔ بالکل ایک جیسی دو گاڑیاں بھی موجود ہیں۔ نیوسٹی میں آتے جاتے یہ دونوں گاڑیاں استعمال ہوتی ہیں اور کچھ پتا نہیں ہوتا کہ کس گاڑی میں واقعی رائے زل موجود تھا۔''

ابراہیم نے گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے کہا۔ ''لیکن یہ کیسے ممکن ہے کہ جلسہ گاہ کے اسٹیج پر بھی اصلی اور ''ڈپلی کیٹ'' رائے زل میں کوئی فرق محسوس نہ ہوسکا؟''

بن مشہد نے مؤدب لہجے میں کہا۔ ''جناب! اگر آپ جلسہ گاہ کی وڈیو دیکھیں تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ...... مسٹر رائے زل کو جس جگہ بٹھایا گیا تھا وہاں خاص انداز سے لائٹنگ کی گئی تھی۔ حالانکہ ابھی دن کی روشنی موجود تھی اور لائٹنگ کی ایسی خاص ضرورت بھی نہیں تھی۔''

''کیا کہنا چاہتے ہو کیپٹن؟'' ابراہیم نے کہا۔

''باقی اسٹیج کی نسبت اس جگہ روشنی ترچھی اور زردی مائل تھی جہاں مسٹر رائے زل، حلمی اور آقا جان وغیرہ بیٹھے تھے۔ ایسی روشنی چیزوں کو وضاحت سے دکھانے کے بجائے ان میں دھندلاہٹ لے آتی ہے۔ اس تکنیک کو اسٹیج ڈراموں وغیرہ میں استعمال کیا جاتا ہے...... اگر وہ واقعی ڈپلی کیٹ رائے زل تھا تو اس کے لیے یہ روشنی موزوں تھی۔''

میں نے دیکھا قسطینا کی آنکھوں میں ایک دکھ سا کروٹیں لینے لگا تھا۔ وہ اپنے ایک ہاتھ کو دوسرے ہاتھ سے مسل رہی تھی۔

ٹی وی کے سگنل زیادہ واضح نہیں تھے۔ پھر بھی اسکرین پر کچھ پُرجوش لوگوں کے چہرے نظر آرہے تھے۔ ان لوگوں میں سے کچھ نے اپنے ہاتھوں میں بڑے بڑے پوسٹرز بھی اٹھار کھے تھے۔ ان پوسٹرز میں ہاناوانی کو کسی کھلی قبر میں بیٹھے دکھایا گیا تھا اور اس کے سر کے اوپر ایک ''نورانی'' دائرہ معلق تھا۔ پوسٹرز پر بڑے بڑے حروف میں لکھا تھا...... عہدِ حاضر کی لاثانی درویش...... ہمارے ماذو وارا (یعنی قبر کی ملکہ)

اسکرین پر نظر آنے والے تقریباً تمام لوگ جزیرے کے مقامی باشندے تھے۔ ان میں یقیناً کچھ ایسے رضا کار بھی شامل ہوں گے جنہوں نے جنگ کے آغاز پر ہی خوف زدہ ہوکر اپنے راستے قسطینا اور کمانڈر افغانی سے جدا کرلیے تھے۔ پوسٹرز کی تحریر ملائی زبان میں تھی۔ اس کا ترجمہ انیق نے میرے لیے کیا تھا۔

یوں لگ رہا تھا کہ ہاناوانی کا جادو اب سر چڑھ کر بول رہا ہے اور ہر طرف اس کے اور رائے زل کے نام کا ڈنکا بج رہا ہے۔ اگر واقعی جلسہ گاہ میں رائے زل کو گولیاں نہیں لگی تھیں تو پھر یہ ان ''ماں بیٹے'' کی بڑی خوش قسمتی تھی۔ اب یہ خرانٹ عورت اس واقعے کو بھی اپنی ماورائی صلاحیتوں کی تشہیر کے لیے استعمال کررہی تھی۔

☆☆☆

ہمارے شب و روز اس زیرزمین دنیا کی تاریکی میں ڈوبے ہوئے تھے۔ وہی بہتے پانی کا شور، کسی وقت کسی پرندے کی پھڑپھڑاہٹ...... یا پھر سنگلاخ پتھروں سے ٹکرا کر ہماری گونجتی ہوئی آوازیں۔ بن مشہد نے بتایا تھا کہ اس زیرزمین آبی دھارے میں سمندر کا پانی بھی شامل ہے۔ یہی وجہ تھی کہ یہاں چھوٹی بڑی مچھلیاں اور دیگر آبی حیات نظر آتی تھی۔ یہ پانی آگے جاکر نجانے زمین کی کس گہرائی میں مدغم ہوجاتا تھا۔

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

یہاں وقت کا حساب بس گھڑیوں کی مدد سے ہوتا تھا۔ باہر کی کوئی آواز ہم تک نہیں پہنچتی تھی۔ موسم کی بات کی جائے تو خنکی کچھ کم محسوس ہورہی تھی۔ اور بن مشہد کا کہنا تھا کہ باہر بہار کی آمد آمد ہے۔ جزیرے میں بہار کی آمد پر کوئی تہوار بھی منایا جاتا تھا۔ یہ ویلنٹائن تو نہیں تھا مگر اسی طرز کا تھا۔ شادی شدی جوڑے اور پیار کرنے والے ایک دوسرے کو تحائف دیتے تھے۔

تہوار کے دن صبح بن مشہد کچھ اداس اداس نظر آیا۔ شاید اسے اپنی فیملی یاد آگئی تھی ۔ وہ بیوی بچے جو جنگ کی آگ نے بھسم کر ڈالے تھے۔ وہ ایک جانباز تھا اور اپنی جان پر کھیل کر قسطینا کے لیے خدمات انجام دے رہا تھا اور شاید اس کی یہی مصروفیت تھی جس کی وجہ سے وہ دھیرے دھیرے اپنے بے پناہ صدمے کو بھولتا جار ہا تھا۔

بن مشہد کے برعکس اس دن کمانڈر فارس جان مجھے کچھ خوش دکھائی دیا۔ وہ تاریک دریا کے کنارے پتھر سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ قریب ہی ”پورٹ ایبل لائٹ“ رکھی تھی۔ یہاں ہمیں کسی قسم کا خطرہ تو نہیں تھا اس کے باوجود رائفل فارس جان کے کندھے سے لٹکی رہتی تھی اور گولیوں والی بیلٹ اس کی کمر پر دکھائی دیتی تھی۔ شاید یہ اسلحہ اس کے جسم کا اٹوٹ انگ بن چکا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا ٹیپ ریکارڈر تھا۔ یہ وہی ٹیپ ریکارڈر تھا جس پر فارس جان نے جاماجی کے سپاہیوں کا مقبول ترانہ ریکارڈ کر رکھا تھا۔ ہم سچے سویرے تک لڑیں گے...... ہم جاتے اندھیرے تک لڑیں گے...... لیکن آج فارس جان ترانہ نہیں سن رہا تھا بلکہ یہ ایک رومانی پشتو گیت تھا اور پشتو گیتوں کی طرز تو بے مثال ہوتی ہے۔

مجھے دیکھ کر اس نے ٹیپ ریکارڈر آف کر دیا۔ ”آئیں، بیٹھیں، شاہ زیب صاحب۔“ وہ بڑے خلق سے بولا۔

میں نے اس کے قریب بیٹھتے ہوئے کہا۔ ”سنا ہے، آج جاماجی کا کوئی تہوار ہے؟“

وہ مسکرایا۔ ”اس اندھیری پاتال میں تہواروں کا کیا پتا چلتا ہے۔“

”لیکن دلوں کا تو اپنا موسم ہوتا ہے اور اپنا ماحول۔ اندھیرے میں بھی کرنیں چمکتی ہیں۔“

اس نے چونک کر میری طرف دیکھا اور میرے چہرے پر کوئی خاص تاثر نہ پا کر بولا۔ ”خو آپ تو ایک گریٹ فائٹر ہے، لیکن کسی وقت تھوڑا اسا شاعر بھی لگتا ہے۔“

میں کہنا چاہتا تھا کہ تم بھی تو ایک جنگجو کمانڈر ہو مگر کسی کی محبت میں ڈوبے ہوئے ہو لیکن میں خاموش رہا۔ ویسے میں جانتا تھا کہ آج کل قسطینا اور فارس جان میں بات چیت ہوتی ہے اور کسی وقت قسطینا کا رویہ فارس سے خاصا مہربانی کا بھی ہو جاتا ہے۔ مجھے بے حد خوشی تھی کہ قسطینا نے میری بات کو سمجھا تھا...... اور شاید اسے دل سے قبول بھی کیا تھا۔ وہ کوئی عام لڑکی نہیں تھی۔ اس کے اندر ایک بہت فعال اور جہاندیدہ روح تھی۔ وہ کچھ دنوں کے لیے رومانیت کے دھارے میں ضرور بہہ گئی تھی لیکن اب اس نے حقائق کو دیکھنا شروع کر دیا تھا۔ وہ ایک انقلابی مزاج رکھتی تھی اور اس مزاج کے لیے اس کو کمانڈر فارس جان سے بہتر ساتھی کون مل سکتا تھا۔ آج بھی میں نے دیکھا تھا کہ فارس جان اور قسطینا دیر تک کامن روم میں بیٹھے باتیں کرتے رہے تھے۔ کسی وقت فارس جان کے سرخ د سپید چہرے پر مسکراہٹ بھی نمودار ہوتی تھی پھر قسطینا نے فارس جان کے بازو کا زخم بھی بڑی توجہ سے دیکھا تھا اور اسے کوئی مشورہ دیا تھا۔ یہ زخم، دو تین ہفتے پہلے ہونے والی گھمسان کی لڑائی کے نتیجے میں آیا تھا۔

”آج کل ابراہیم کو کیا ہوا ہے برادر؟“ فارس جان نے اچانک مجھ سے سوال کیا۔

”کیوں کیا ہوا؟“

”وہ ام کو کچھ کمزور اور بیمار لگتا ہے۔“

کمزور تو مجھے بھی لگتا ہے...... شاید اس نے والد اور بھائی کی موت کا زیادہ صدمہ لیا ہے۔“

”ہاں، یہ بات بھی ہوگا مگر شاید اس کے علاوہ بھی کچھ ہے، آپ نے اس کا رنگ دیکھا ہے کتنا پھیکا پڑ رہا ہے‘ کہیں......“ فارس کہتے کہتے چپ ہو گیا۔

”کیا کہنا چاہتے ہو؟“

وہ اپنے بالکل سیدھے بالوں میں انگلیاں چلا کر پُرسوچ لہجے میں بولا۔ ”برادر! کہیں ایسا تو نہیں کہ ابراہیم کو NEUROTOXI کا جو ڈوز دیا جاتا ہے وہ کم زیادہ ہو گیا ہو۔“

NEUROTOXI اس زہریلے عنصر کا نام تھا جو ابراہیم اور کمال احمد ایک عرصے سے استعمال کر رہے تھے۔ چند دن پہلے کمال احمد کی موت بھی اسی وجہ سے ہوئی تھی کہ اسے یہ ڈوز نہیں مل سکی تھی۔ اچانک میرے ذہن میں اندیشہ جاگا۔ یہ تو مجھے معلوم تھا کہ ابراہیم نے ہوشیاری کا ثبوت دیا تھا اور ڈی پیلس سے نکلتے وقت اس ”زہر“ کی

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

معقول مقدار اپنے ساتھ لے آیا تھا جو اس کے لیے تریاق کی حیثیت رکھتی تھی۔ اب کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ یہ ''تریاق'' ختم ہوتا جا رہا ہو اور اس کے اثرات ابراہیم کی صحت پر پڑ رہے ہوں۔

میں اسی وقت ابراہیم کے کمرے میں اس سے ملنے پہنچ گیا۔ میں نے دروازے پر دستک دی۔ جواب نہیں ملا تو دروازہ کھول کر اندر چلا گیا۔ وہ نماز پڑھنے میں مصروف تھا۔ یہ وہی کمرا تھا جو اس پناہ گاہ میں عزت مآب ریان فردوس کے لیے تیار کیا گیا تھا۔ یہاں میوزک کے لیے زبردست آڈیو سسٹم موجود تھا اور ایک گوشہ ''بار روم'' کی ضروریات پوری کرنے کے لیے بنایا گیا تھا لیکن اب یہاں کا ماحول بالکل مختلف تھا۔ یہاں عبادت کی جا رہی تھی اور جس کو یہاں رہنا تھا، وہ مکافات کا شکار ہو کر منوں مٹی کے نیچے سو رہا تھا۔

ابراہیم کو نماز میں مصروف چھوڑ کر میں زینب والے کمرے میں آ گیا۔ آج محبت کے تہوار کی رات تھی۔ لیکن زینب اور ابراہیم آج بھی الگ الگ کمروں میں الگ الگ سونے والے تھے...... زینب دوزانو بیٹھی ابراہیم کا کوئی لباس استری کرنے میں مصروف تھی۔ مجھے دیکھ کر جلدی سے دوپٹا سر پر رکھ لیا اور مؤدب کھڑی ہو گئی۔ میں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور اس کے سامنے نشست پر بیٹھ گیا۔ آج کل وہ بالکل سادہ نظر آتی تھی۔ بناؤ سنگھار نہیں کرتی تھی اور نہ چمکیلا لباس پہنتی تھی۔ ایک وجہ تو سسر اور جیٹھ کی موت بھی تھی، لیکن میرا اندازہ تھا کہ اس کی مکمل سادگی کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ وہ کسی بھی طرح ابراہیم کے جذبات میں کوئی ہلچل نہیں چاہتی تھی۔ کسی طرح کا تناؤ...... کسی طرح کا احساس محرومی۔

رسمی گفتگو کے بعد میں نے کہا۔ ''زینب! مجھے ابراہیم کچھ کمزور لگ رہا ہے۔ کیا وجہ ہے؟ وہ ٹھیک تو ہے؟''

زینب نے پہلے تو بات گول کرنے کی کوشش کی مگر پھر اس نے جو بات بتائی، وہ میرے اندیشے کے عین مطابق تھی۔ اس نے بتایا'' ابراہیم اپنے کھانے میں جو زرد رنگ کی دوا (زہر) استعمال کرتے ہیں اس کی مقدار اب انہوں نے کم کر دی ہے۔ ان میں جو تبدیلی آئی ہے، اس کی وجہ یہی ہے۔''

''تم نے پوچھا نہیں کہ وہ ایسا کیوں کر رہا ہے؟''

''پوچھا تھا لیکن انہوں نے بتایا نہیں۔ میں نے زیادہ زور بھی نہیں دیا۔ کیونکہ وہ پھر دکھی ہو جاتے ہیں۔''

زینب نے اپنے معصوم لہجے میں کہا۔

''کہیں ایسا تو نہیں زینب کہ وہ دوا اب کم مقدار میں رہ گئی ہو اور ابراہیم اسے بچا کر استعمال کر رہا ہو۔''

''یہ بھی ہو سکتا ہے...... مگر دوا وہ بڑی احتیاط سے الماری میں تالا لگا کر رکھتے ہیں۔ میں نے تو کبھی دیکھی بھی نہیں جی۔''

اسی دوران میں قدموں کی چاپ ابھری اور ابراہیم دروازے پر نمودار ہوا۔ دبلا پتلا لڑکا جو مصائب کے گھیرے میں تھا۔ اس کے رخساروں کی ہڈیاں نمایاں اور جلد زردی مائل نظر آتی تھی۔ میں نے بہتر سمجھا کہ اس سے اس کے کمرے میں جا کر بات کی جائے۔

کمرے میں میرے اور ابراہیم کے درمیان چند منٹ گفتگو ہوئی۔ میں نے صاف محسوس کیا کہ وہ بات کرتے ہوئے ہانپ جاتا ہے اور اس کی دُبلی پتلی گردن پر پسینے کی نمی بھی جھلک دکھاتی ہے۔ جلد ہی میں اصل موضوع پر آ گیا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ اس نے اپنی خوراک میں تبدیلی کیوں کی ہے، جتنی ڈوز وہ مدتوں سے لے رہا ہے اس میں کمی کی وجہ کیا ہے؟

وہ سمجھ گیا کہ میرے اصرار پر زینب نے مجھے اس بارے میں بتا دیا ہے۔ وہ کچھ دیر خاموش رہا، پھر ایک گہری سانس لے کر بولا۔ ''شاہ زیب بھائی! آپ سمجھ رہے ہیں کہ جو زہر میں کھانے میں استعمال کرتا ہوں اس کی مقدار کم رہ گئی ہے اور میں اس کی بچت کر رہا ہوں۔''

''بالکل۔ میرے ذہن میں تو یہی بات آئی ہے۔''

''ایسا نہیں ہے بھائی۔'' وہ عجیب دکھ بھرے انداز میں بولا۔

''تو پھر کیا بات ہے؟''

''میں نے جان بوجھ کر ڈوز کم کی ہے۔''

''یہ جانتے ہوئے بھی کہ کمال احمد کو ڈوز نہ ملنے کی وجہ سے ہی موت کا سامنا کرنا پڑا ہے۔''

''تو مر ہی جاؤں گا نا۔'' وہ میری طرف دیکھے بغیر بولا۔

''یہ کیسی باتیں کر رہے ہو ابراہیم؟''

اس نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری، پھر چند گھونٹ پانی پیا اور بولا۔ ''شاہ زیب بھائی! میں ایسی زندگی جینا نہیں چاہتا۔ میں چاہتا ہوں کہ یا تو مجھے اس مجبوری سے چھٹکارا مل جائے یا پھر یہ زندگی ختم ہو جائے۔ میں...... جان بوجھ کر اپنی ڈوز کم کر رہا ہوں۔ مجھے بہت تکلیف اٹھانا پڑ رہی

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

ہے لیکن میں اپنی اور زینب کی خاطر یہ سب کچھ جھیل رہا ہوں اور جھیلوں گا۔''

میں نے دیکھا پسینا اس کی پیشانی پر نمودار ہونے لگا تھا۔ وہ کھینچ کھینچ کر سانس لے رہا تھا۔ ''تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے ابراہیم؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں ٹھیک ہوں، یہ وقتی بے چینی ہے۔'' اس نے پھر چند گھونٹ پانی پیا۔ جذباتی لہجے میں بولا۔ ''میں اب اس سے دور نہیں رہوں گا۔ اسے پاؤں گا یا ختم ہو جاؤں گا اور اسے آزاد کر دوں گا۔'' اس کا اشارہ یقیناً زینب کی طرف ہی تھا۔

اس کا پورا جسم ہولے ہولے لرز رہا تھا پھر وہ لیٹ گیا۔ پسینا اس کے مساموں سے پھوٹ نکلا۔ وہ بستر پر پہلو بدلنے لگا۔ میں نے دیکھا اس کی جلد پر کہیں کہیں ہلکے سرخ دھبے نمودار ہو رہے تھے۔ ایسے ہی گہرے دھبے ریان فردوس کی جلد پر مستقل نظر آتے تھے۔

''ابراہیم...... تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں۔'' میں نے اسے شانے سے پکڑ کر ہلایا۔

''یہ عارضی ہے...... میں جلد ٹھیک ہو جاؤں گا'' وہ بولا۔ پھر اس نے زینب کو آوازیں دیں۔

زینب شاید پہلے سے ہی منتظر تھی۔ جلدی سے اندر آ گئی۔ ابراہیم کی حالت دیکھ کر وہ فوراً دوزانو اس کے سرہانے بیٹھ گئی اور اس کا سر اپنی گود میں رکھ لیا۔ اس نے میری طرف دیکھا۔ وہ جیسے خاموشی کی زبان میں کہہ رہی تھی آپ فکر نہ کریں۔ چلے جائیں۔ میں انہیں سنبھال لوں گی۔

میں باہر آ گیا۔ ذہن میں ہلچل تھی۔ کمال احمد کی موت بھی تو ایسے ہی ہوئی تھی۔ ابراہیم اتنا بڑا رسک کیوں لے رہا تھا۔ شاید...... یہ محبت کی طاقت تھی جو اسے اتنے بڑے خطرے سے لڑا رہی تھی۔

میں باہر تو آ گیا مگر میرا دھیان مسلسل ابراہیم کی طرف ہی رہا۔ میں نے تصور کی نگاہ سے دیکھا کہ زینب نے ابراہیم کو اپنی بانہوں میں سمیٹا ہوا ہے۔ اس کے ساتھ لیٹی ہوئی ہے۔ اس کی تکلیف کو اپنے اندر جذب کرنے کی کوشش کر رہی ہے اور اس میں کسی حد تک کامیاب بھی ہے۔ دوسروں کا درد محسوس کرنے والی اور درد کو چن لینے والی لڑکی تھی۔ اپنے شوہر کا درد کیوں نہ چنتی۔

مجھے ڈی پیلس کا ایک منظر یاد آ گیا۔ بند کمرے میں وہ اپنے شوہر کی محبت میں سرشار ہو کر اس کی بانہوں میں چلی گئی تھی۔ اس نے گوارا نہیں کیا تھا کہ وہ ابراہیم کی جائز بیوی بن کر بھی اسے اپنے لیے ترساتی رہے۔ تمام خوف بالائے طاق رکھ کر اس نے خودسپردگی کا انداز اختیار کیا تھا مگر ابراہیم کی محبت اور سچی لگن کی داد دینا پڑتی تھی۔ اس نے زینب کی زندگی کی خاطر خود کو باکمال طریقے سے روک لیا تھا۔ مجھے محسوس ہوا تھا کہ اس واقعے کے بعد ابراہیم کے لیے زینب کی محبت میں بہت اضافہ ہوا ہے۔

☆☆☆

زیرِ زمین مسلسل برقی روشنی میں رہ کر دل و دماغ کی عجیب کیفیت ہو گئی تھی۔ کسی وقت عجب سی اداسی حواس پر چھا جاتی تھی۔ یہ بات اب نیوز سے ثابت ہو چکی تھی کہ رائے زل پوری طرح صحت مند ہے اور پوری توانائیوں کے ساتھ روزمرہ کے کام کر رہا ہے۔ اب یہی بات قرین قیاس لگتی تھی کہ جلسہ گاہ میں زخمی ہونے والا رائے زل نہیں تھا۔ کسی وقت عجیب سی بے چینی مجھے گھیر لیتی تھی۔ اس وقت کچھ ایسا ہی تھا۔ میں آرام دہ بستر پر ٹیک لگائے نیم دراز تھا مگر یہ آرام دہ بستر کانٹوں کا بستر بنا ہوا تھا۔ کوئی ٹوٹ کر یاد آ رہا تھا...... وہ کہاں تھی، کیا کر رہی تھی؟ ہرے بھرے کھیتوں اور باغوں پر سورج چمک رہا ہو گا۔ بہار کی ہوا دلوں میں پھول کھلا رہی ہو گی۔ ریشمی کا لکھا ہوا خط جو نجانے کہاں کہاں کا سفر کر کے جزیرے تک آ پہنچا تھا۔ ایک بار پھر دماغ کو کچوکے لگانے لگا۔ وہ خط میں نے پھاڑ دیا تھا مگر اس کے سارے لفظ ذہن پر نقش تھے...... ریشمی نے تاجور کے بارے میں لکھا تھا۔ وہ جھوٹی زندگی جیے گی۔ وہ ساری عمر روتی رہے گی۔ جتنا میں اسے جانتی ہوں کوئی نہیں جانتا......

میرے خیالوں کا تانا بانا انیق کی اچانک آمد سے ٹوٹا، وہ ہمیشہ کی طرح بلائے ناگہانی کی طرح ہی نازل ہوا تھا۔ بالکل یہی لگا جیسے اسے کسی نے زور سے دھکا دیا ہو اور وہ گرتے گرتے بچا ہو، اس کے عقب میں کوئی نہیں تھا۔

''یہ کیا کر رہے ہو؟'' میں نے قدرے غصے سے کہا۔

''دھکے کھا رہا ہوں جی...... اور کیا کر رہا ہوں۔''

''کس نے دیا ہے دھکا، یہاں تو کوئی نہیں؟''

اس نے بتیسی نکالی۔ ''دراصل...... میں دھکے کھانے کی پریکٹس کر رہا ہوں جناب...... عنقریب مجھے دھکے پڑنے والے ہیں اور اس کے لیے تیاری ضروری ہے۔''

''کس سے دھکے پڑنے والے ہیں؟''

''امریش پوری صاحب سے...... اور کس سے؟ اب وہ ماشاء اللہ صحت مند ہو چکے ہیں۔ ان کے ہوش و حواس بھی ٹھیک کام کر رہے ہیں۔ بہت جلد وہ کسی نہ کسی کیس میں میرا

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

Downloaded From Paksociety.com

http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

Downloaded from Paksociety.com

ریمانڈ لے ہی لیں گے۔ بقول پہلوان حشمت، بکرے کی ماں کب تک میں میں کرے گی۔''

''زیادہ بدگمانی اچھی نہیں ہوتی۔'' میں نے کہا۔

''آپ اسے بدگمانی کہتے ہیں؟'' اس نے اپنی قمیص کا بھیگا ہوا گریبان مجھے دکھاتے ہوئے کہا۔

''کیا ہوا ہے؟''

انیق اپنے مخصوص انداز میں بولا۔''ابھی کچھ دیر پہلے مجھے امریش صاحب کے کمرے سے خرخراہٹ کی عجیب آوازیں آئیں، جیسے ان کے گلے میں کوئی پھندا سا لگ گیا ہو، میں یہی سمجھا کہ ان کا آخری وقت آ گیا ہے...... اور دعائیں قبول ہوگئی ہیں۔ ایسے وقت میں چمچ سے پانی پلاتے ہیں، میں ان کے کمرے میں گھسنا چاہ رہا تھا جب یہ اتنی بڑی کلی انہوں نے میرے منہ پر کردی۔ کلی بھی کیا پورا کلا تھا۔ دراصل جناب گلا صاف کرنے کے لیے غرارے فرما رہے تھے۔ اب چاہیے تو یہ تھا کہ معذرت کرتے...... لیکن امریش پوری اور معذرت؟ الٹا مجھے ہی ڈانٹ پھٹکار شروع کردی بلکہ ڈانٹ بھی کم تھی پھٹکار زیادہ تھی۔ دراصل امریش پوری......''

یکا یک انیق کو چپ ہونا پڑا۔ سجاول اندر آ گیا تھا۔ قدرے اچھے موڈ میں تھا بولا۔''یہ ہر وقت کسی امریش پوری کی باتیں ہوتی رہتی ہیں؟''

انیق غضب کا اداکار تھا۔ بڑی جلدی اپنے تاثرات بدل لیتا تھا، سنبھل کر بولا۔''وہ آپ کو بتایا تھا نا کہ انڈیا میں میرا ایک چاچا ہے...... یوں کہہ لیں کہ چاچا بنا ہوا ہے۔''

وہ اپنا ماتھا مسل کر بولا۔''یار انڈیا والے چاچے کو چھوڑو، اس پاکستانی چاچے کے لیے ایک کپ چائے لے کر آؤ بلکہ ہم دونوں کے لیے لے آؤ، کیوں شاہ زیب؟'' میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

انیق نے مجھ سے انگلش میں پوچھا۔''اس کی چائے میں تھوڑا سا زہر ملا لاؤں؟''

سجاول اپنی پاٹ دار آواز میں بولا۔''تم سے کئی دفعہ بکواس کی ہے کہ میرے سامنے منہ ڈنگا کر کے انگلش نہ بولا کرو۔''

''اوہ سوری جی، غلطی ہوگئی۔'' انیق نے سہم جانے کی اداکاری کی اور کسی مزید سوال سے پہلے ہی باہر نکل گیا۔

''یہ کیا بک رہا تھا؟'' سجاول نے پوچھا۔

''کچھ نہیں...... بس انگلش میں منہ مارنے کا شوق ہے...... کہہ رہا تھا کہ کبھی کبھی قہوہ بھی پی لیا کریں۔''

سجاول نے مجھے گھور کر دیکھا اور بولا۔''اس کو باندھ کر رکھو۔ کسی دن ضائع ہو جائے گا۔''

''ادھر کیسے نکل آئے؟'' میں نے سجاول سے پوچھا۔

''ایک اُڑتی سی بات کان میں پڑی ہے ابھی۔ کہتے ہیں کہ آلے دوالے ہماری ہی تلاش ہو رہی ہے۔ میرا مطلب ہے کہ وہ لوگ پانی میں بھی آ گئے ہیں۔''

''پانی میں؟''

''ہاں، ابھی کوئی خبر چلی ہے کہ آس پاس جو ٹاپو وغیرہ ہیں، ان پر ڈھونڈا جا رہا ہے ہمیں۔''

اطلاع تشویش ناک تھی۔ اس سے پہلے کہ میں مزید کچھ پوچھتا، قسطینا اور فارس جان تیز قدموں سے ہماری طرف آتے دکھائی دیے۔ میں اور سجاول احتراماً قسطینا کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔ قسطینا نے بیٹھنے کے بجائے کھڑے رہنا ہی مناسب سمجھا۔ وہ بولی۔''شاہ زائب! میں چاہتی تھی کہ تم سے بھی مشورہ کر لیا جائے نیوز کے مطابق صورتِ حال کچھ تشویش ناک ہے۔ پتا چلا ہے کہ رائے زل کے کوسٹل گارڈز اردگرد کے سمندر میں حرکت کر رہے ہیں۔ نیوز میں کچھ وڈیوز بھی دکھائی گئی ہیں، آس پاس کے کچھ ٹاپوؤں پر بھی سرچ آپریشن ہوا ہے۔''

میں نے کہا۔''آپ کو اندیشہ ہے کہ وہ لوگ یہاں بھی پہنچ سکتے ہیں؟''

''بالکل یہ اندیشہ موجود ہے لیکن اطمینان کی بھی ایک دو باتیں ہیں۔ پہلی تو یہ کہ یہاں آس پاس چھوٹے موٹے درجنوں ٹاپو ہیں۔ ہمارے والا ٹاپو ان میں سے ایک ہے...... دوسری یہ کہ اس پناہ گاہ کا راستہ، سرنگ والی پناہ گاہ کی طرح لاجواب ہے، کوئی داخلی راستے کے آس پاس بھی گھومتا رہے گا تو اسے پتا نہیں چلے گا کہ اس پتھر کو اس کی جگہ سے سرکایا جا سکتا ہے۔''

''بالکل آپ بجا فرما رہی ہیں۔'' فارس جان نے گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے انگلش میں کہا۔''کوئی اس چٹان کے پاس سال بھر خیمہ لگا کر بیٹھا رہے تو بھی اس کی اصل نہیں جان سکتا۔ وہ سب کچھ بے مثال ہے۔''

''لیکن ایک بات کا اندیشہ ضرور ہے۔'' قسطینا نے کہا۔''وہ لانچ جو بن مشہد نے کنارے پر کیموفلاج کی ہے، ہمارا پول کھول سکتی ہے۔ بے شک اسے بہت اچھی طرح چھپا دیا گیا ہے مگر رسک تو اپنی جگہ موجود ہے۔''

''تو کیا سوچا ہے آپ نے؟'' میں نے پوچھا۔

''دو طریقے ہیں یا تو اس کے پیندے میں سوراخ کر

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

کے اسے ڈبو دیا جائے لیکن اس میں مسئلہ یہ ہے کہ یہاں سمندر بہت گہرا نہیں ہے۔ کوئی جدید آلہ اس ڈوبی ہوئی لانچ کی نشاندہی کرسکتا ہے پھر یہ بھی ہے کہ لانچ میں موجود کچھ اشیا تیر کر پانی کی سطح پر آسکتی ہیں۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ لانچ کو ویسے ہی یہاں سے روانہ کردیا جائے۔''

''کیا مطلب یور ہائی نس؟'' میں نے پوچھا۔

''اس میں کافی فیول موجود ہے۔ اسے اسٹارٹ کر کے اور اس کے کنٹرول کو ایڈجسٹ کر کے کھلے سمندر میں چھوڑ دیا جائے۔ وہ خود ہی سفر کر کے یہاں سے بہت دور نکل جائے گی۔''

دو چار منٹ اس موضوع پر بات ہوئی۔ اس دوران میں ابراہیم بن مشہد اور تبارک بھی پہنچ گئے۔ مشورے سے یہی فیصلہ ہوا کہ لانچ کو اسٹارٹ کر کے کھلے سمندر میں چھوڑ دینے والا آپشن مناسب ہے۔ اس کام کے لیے کسی ایک فرد کو اس پناہ گاہ سے باہر نکلنا تھا اور لانچ تک پہنچنا تھا۔ انیق، بن مشہد اور تبارک تینوں نے خود کو اس کام کے لیے پیش کیا۔ بہرحال فیصلہ تبارک کے بارے میں ہوا۔ وہ لانچ کے کنٹرول کو دوسروں سے بہتر سمجھتا تھا۔

یہ کام جتنی جلدی ہوجاتا، اتنا ہی بہتر تھا۔ کچھ غور وفکر کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچے کہ تبارک اور بن مشہد دونوں باہر جائیں گے، بن مشہد داخلی راستے سے قریباً پچاس میٹر آگے اونچی جگہ پر کھڑا رہ کر اردگرد نظر رکھے گا اور اگر کوئی خطرہ محسوس ہوا تو بذریعہ واکی ٹاکی تبارک کو خبردار کرے گا۔ تبارک نیچے جا کر لانچ کو روانہ کرے گا اور اس میں سے چند ضروری اشیا لے کر واپس آجائے گا۔

میں نے کہا۔ ''پتھر کو دھکیلنے کے لیے کم از کم تین بندوں کی ضرورت تو ہوتی ہے۔ میں اور فارس جان بھی چلے جاتے ہیں، ہم باہر نہیں نکلیں گے۔''

قسطینا نے اس تجویز کو قبول کیا لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ فارس جان کے ساتھ میں نہیں بلکہ سیف جائے گا۔

''سیف کیوں؟'' میں نے پوچھا۔

وہ بولی۔ ''تم فی الحال اپنے زخمی کندھے کو سنبھالو۔ مجھے اس کی بے حد فکر ہے۔''

''میں اب ٹھیک ہوں یور ہائی نس۔'' میں نے بازو کو حرکت دیتے ہوئے کہا۔

''جتنے ٹھیک ہو، میں اچھی طرح جانتی ہوں۔ تمہیں مزید آرام کی ضرورت ہے۔''

''لیکن......''

''لیکن کچھ نہیں۔'' اس کا لہجہ قطعی تھا۔ ''اگر مجھے یور ہائی نس کہتے ہو تو پھر میری بات بھی ماننا پڑے گی۔''

میں اس کے معنی خیز لہجے کو اچھی طرح سمجھ رہا تھا۔ اب وہ بے تکلفی والی بات ختم ہورہی تھی۔

قریباً ایک گھنٹے بعد تبارک باقی ساتھیوں کے ہمراہ داخلی راستے کی طرف روانہ ہوگیا۔ ان کو قریباً ڈیڑھ سو پتھریلی سیڑھیاں چڑھ کر داخلی راستے تک پہنچنا تھا اور پھر پتھر کو سرکا کر تبارک اور بن مشہد کو باہر نکلنا تھا۔ سب ہی کے پاس آتشیں اسلحہ موجود تھا۔ یہاں آٹھ دس واکی ٹاکی بھی تھے جن میں دو اس وقت بن مشہد اور تبارک کے پاس تھے۔

ماہنامہ پاکیزہ کراچی

میں، قاری بہنوں کی دلچسپی کے لیے ایک نیا اور منفرد سلسلہ باتیں بہاروخزاں کی..." پیش کیا جارہا ہے جس میں ہر قاری بہن دیے گئے سوالوں کے جوابات دے کر شمولیت اختیار کرسکتی ہے۔ آپ کے خیالات واحساسات ہمارے لیے بہت اہمیت رکھتے ہیں۔

تو قارئین آج ہی

ماہنامہ پاکیزہ

اپنے ہاکر سے بک کروالیں

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

سیف اس ساری صورتِ حال پر خوش نظر آ رہا تھا۔ ایسے ماحول میں اس کا جوان خون جوش مارتا تھا اور اس کی جی داری، سرخی بن کر اس کے توانا چہرے پر جھلک دکھانے لگتی تھی۔ وہ لوگ چلے گئے۔ قسطینا نے ایک واکی ٹاکی آن کر لیا تھا اور اس کے ذریعے فارس جان سے مسلسل رابطہ رکھے ہوئے تھی۔ وہ لوگ داخلی راستے پر پہنچے، انہوں نے کامیابی سے پتھر کو سرکایا۔ پھر تبارک اور بن مشہد باہر نکل گئے۔ جاتے ہوئے انہوں نے فارس اور سیف کے ساتھ مل کر وزنی پتھر کو پھر اس کی جگہ پر کر دیا۔

آٹھ دس منٹ گزرے ہوں گے جب ہمیں فائر کی بہت مدّھم آواز سنائی دی۔ یہ اتنی مدّھم تھی کہ بس گمان ہوتا تھا کہ کہیں ہیوی رائفل سے گولی چلائی گئی ہے۔ کچھ دیر بعد ایسی ہی آواز دوبارہ آئی۔ قسطینا نے سوالیہ نظروں سے میری جانب دیکھا۔

میں نے کہا۔ ''لگتا تو یہ فائر ہی ہے۔''

''تبارک یا مشہد کو کیا ضرورت پڑی ہے گولی چلانے کی؟''

ابراہیم نے کہا۔ ''شاید کوئی اچھا شکار نظر آ گیا ہو اُن میں سے کسی کو...... یہاں پرندے اور حلال جانور تو موجود ہیں۔''

ہمارے ان جملوں کے دوران میں ہی فارس جان کی آواز واکی ٹاکی پر ابھری۔ اس نے قسطینا کو مخاطب کرتے ہوئے ملائی زبان میں پوچھا۔ ''یور ہائی نس! آپ نے بھی گولی چلنے کی آواز سنی ہے؟''

''ہاں فارس، ہم اسی کے بارے میں بات کر رہے تھے۔''

''اگر آپ کہیں تو میں باہر جا کر دیکھوں؟'' فارس نے پوچھا۔

''نہیں ابھی انتظار کرو۔'' قسطینا نے جواب دیا اور اگر ہو سکے تو تبارک یا مشہد سے رابطہ کرو۔''

''او کے۔'' فارس جان نے کہا۔

ابھی بمشکل دو تین منٹ ہی گزرے تھے کہ فارس جان کی سنسناتی آواز واکی ٹاکی پر ابھری۔ ''یور ہائی نس! گڑ بڑ ہو گئی ہے۔ باہر کچھ لوگ موجود ہیں۔ کیپٹن بن مشہد اندر آ گیا ہے ہم نے راستہ بند کر دیا ہے۔''

فارس جان کا مطلب یہ تھا کہ ان تینوں نے ہنگامی صورتِ حال کے پیش نظر پتھر کو دھکیل کر دہانے کو ڈھانپ دیا ہے۔

''بن مشہد کیا کہتا ہے؟'' قسطینا نے پوچھا۔

''بن مشہد کو چھ سات کے قریب لوگ نظر آئے ہیں لیکن ہو سکتا ہے ان کے مزید ساتھی بھی ہوں۔''

''کیپٹن تبارک سے رابطہ ہوا؟'' قسطینا نے پوچھا۔

''نہیں مگر مشہد کوشش کر رہا ہے۔'' فارس جان کی ہانپی ہوئی آواز ابھری۔

یہ ہم میں سے کسی کے گمان میں بھی نہیں تھا کہ تبارک اور بن مشہد باہر نکلیں گے تو باہر لوگ موجود ہوں گے۔

یہ کون لوگ ہو سکتے ہیں؟ کیا واقعی گرے فورس اور ایجنسی کے افراد ہمیں تلاش کرتے ہوئے یہاں پہنچ چکے تھے؟ اگر ایسا تھا تو انہوں نے فائرنگ کس پر کی تھی؟ کیا تبارک نشانہ بن چکا تھا؟ یہ بات تو طے تھی کہ اتنی جلدی تبارک اپنا کام مکمل نہیں کر پایا ہو گا اور لانچ یہیں ٹاپو کے کنارے موجود ہو گی، اگر لانچ موجود تھی تو پھر یہ بات بھی یقینی تھی کہ ہمارا یہاں ٹاپو پر موجود ہونا راز نہیں رہے گا۔

قسطینا نے کہا۔ ''میرا خیال ہے ہمیں آگے جانا چاہیے۔''

ہم نے اپنی رائفلیں سنبھالیں، فالتو راؤنڈ ساتھ لیے اور سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئے۔ ابراہیم بھی جانا چاہتا تھا مگر زینب اور سنبل کے پاس بھی کسی کا رہنا ضروری تھا۔ قسطینا نے لائٹ والی کیپ پہن لی تھی۔ میرے ہاتھ میں طاقتور ٹارچ تھی۔ سجاول بھی قدرے سست قدموں سے ہمارے پیچھے آ رہا تھا۔

پتھر کے طویل زینے طے کر کے ہم بالآخر دہانے تک پہنچ گئے۔ اب بالکل خاموشی تھی۔ مزید کوئی فائر بھی سنائی نہیں دیا تھا۔ سب کو تبارک کا انتظار تھا۔ مگر مسئلہ یہ تھا کہ تبارک کی آمد کا پتا کیسے چلے گا۔ اس کے دو طریقے تھے یا تو وہ کسی ٹھوس شے کے ذریعے سرکنے والے پتھر کو ٹھونک کر آواز پیدا کرتا یا اگر اس کا واکی ٹاکی کام کر رہا تھا تو اس کے ذریعے رابطہ کرتا۔ بغیر تبارک کو پہچانے پتھر کو سرکانے میں بہت رسک تھا۔

قریباً دس منٹ اسی شش و پنج میں گزر گئے پھر دو تین مزید فائر سنائی دیے چونکہ اس مرتبہ ہم دہانے کے بالکل پاس تھے اس لیے واضح آواز آئی۔ مجھے محسوس ہوا کہ ان میں سے ایک فائر کسی شاٹ گن کا ہے۔ یعنی شکار والا امکان بھی رد نہیں کیا جا سکتا تھا۔ تبارک کی طرف سے ابھی تک کوئی رابطہ نہیں تھا۔ قسطینا اور فارس جان بار بار اسے واکی ٹاکی پر سگنل بھیج رہے تھے۔ اچانک تبارک کی طرف سے جواب

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

آ گیا۔ اس کے لہجے نے ہم سب کو چونکایا۔ وہ تکلیف میں محسوس ہوتا تھا۔ اس نے بتایا کہ ٹاپو پر کچھ مسلح لوگ موجود ہیں۔ وہ ان سے بچنے کی کوشش میں ایک پتھر سے پھسل کر ایک تنگ کھائی میں گر گیا ہے اور اس کی ٹانگ پر سخت چوٹ آئی ہے۔

یہ ایک بری خبر تھی۔ قسطینا نے اسے تسلی دی اور کہا کہ وہ اپنی لوکیشن بتائے اور کیا وہ کھائی سے نکلنے کی کوشش کر سکتا ہے؟

''کوشش تو کر رہا ہوں یور ہائی نس...... لیکن چڑھائی بالکل سیدھی ہے۔''

''چوٹ کس نوعیت کی ہے؟'' قسطینا نے پوچھا۔

''ٹخنے اور پنڈلی پر ضرب آئی ہے۔'' کیپٹن ڈاکٹر تبارک نے اپنی کراہ دباتے ہوئے کہا۔

جیسا کہ بعد از اں پتا چلا وہ ہم سے چھپا رہا تھا، اس کی ٹانگ تین جگہ سے بری طرح ٹوٹ چکی تھی۔

فارس جان نے اس سے پوچھا۔ ''لانچ کی صورتِ حال کیا ہے؟''

''میں اس تک نہیں پہنچ سکا کمانڈر، وہ لوگ ایک دم نمودار ہوئے۔ میں ان سے چھپنے کے لیے ایک جھنڈ میں گھس گیا جب وہ جھنڈ کی طرف آئے تو میں وہاں سے بھاگا اور تب یہ حادثہ ہوا۔'' تبارک کی آواز درد کی شدت سے ٹوٹ رہی تھی۔

''انہوں نے تمہیں دیکھا؟'' قسطینا نے پوچھا۔

''میرا خیال ہے یور ہائی نس، وہ نہیں دیکھ سکے۔''

''وہ فائر کیسے تھے؟''

''مجھے لگتا ہے کہ وہ پرندوں کا شکار کھیل رہے ہیں لیکن وہ شکاری نہیں ہیں یور ہائی نس! وہ ایجنسی اور گرے فورس کے لوگ ہیں، ان میں سے کئی باقاعدہ یونیفارم میں ہیں۔''

میں نے گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے واکی ٹاکی پر پوچھا۔ ''تمہارا کیا خیال ہے کیپٹن تبارک! تم وہاں ان کی نظر سے محفوظ ہو؟''

''میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا، ابھی تھوڑی دیر پہلے...... جو دو تین فائر سنائی دیے ہیں وہ ذرا فاصلے پر ہوئے ہیں لیکن اگر وہ لوگ...... اس طرف آ گئے تو کھائی میں ضرور جھانکیں گے۔ ابھی سورج ڈوبنے میں قریباً ایک گھنٹا باقی ہے...... تب تک تو خطرہ موجود ہے۔''

وہ بولتے ہوئے کوشش کر رہا تھا کہ اس کی آواز میں زیادہ تکلیف نہ جھلکے مگر پھر بھی کسی وقت آواز ٹوٹ سی جاتی تھی۔

کچھ دیر بعد اس نے بتایا کہ اسے کوئی چیز ٹھونکے جانے کی آوازیں کافی قریب سے آ رہی ہیں، اس نے اندیشہ ظاہر کیا کہ شاید وہ لوگ کہیں پاس ہی موجود ہیں اور سفری خیمے لگا رہے ہیں اگر تبارک کا اندازہ درست تھا تو اس کا مطلب یہی تھا کہ وہ لوگ جلدی یہاں سے جانے والے نہیں۔

جونہی ہماری گھڑیوں کے مطابق سورج ڈوب گیا اور اندھیرا اچھا گیا ہم نے ٹارچیں بجھائیں اور بڑی احتیاط سے سلائڈنگ پتھر کو حرکت دی۔ تازہ ہوا کے جھونکے نباتات کی خوشبو کے ساتھ اندر آئے۔ کمانڈر فارس اور میں نے سر نکال کر احتیاط سے باہر دیکھا۔ کچھ فاصلے پر روشنیاں نظر آئیں۔ ''اوہ خدایا۔'' فارس جان نے ہونٹ سکیڑ کر کہا۔

یہ روشنیاں تقریباً اسی جگہ پر نظر آ رہی تھیں جہاں کیپٹن تبارک نے اپنی لوکیشن بتائی تھی۔ درمیان میں شاید چالیس پچاس میٹر کا فاصلہ رہا ہوگا۔

''میرے اندازے کے مطابق یہ آٹھ ٹینٹ ہیں۔ دو درجن کے قریب افراد تو ہوں گے۔'' میں نے کہا۔

''امارا خیال ہے برادر! اس سے بھی زیادہ ہیں۔ وہ دیکھو نیچے دو تین اور خیمہ بھی نظر آ رہا ہے۔''

اب قسطینا نے بھی سر باہر نکال لیا تھا اور اردگرد کا جائزہ لے رہی تھی۔ صورتِ حال واقعی سنگین تھی۔ اچانک ہوا کے دوش پر تیر کر ایک ہلکا سا پُرمسرت قہقہہ سنائی دیا پھر کسی نے امریکن لہجے میں انگلش بولی اور اپنے کسی ساتھی کے پیچھے بھاگا۔ یوں لگا کہ وہ تیزی سے ہماری طرف بڑھ رہے ہیں۔ قسطینا نے سر اندر کر لیا اور تیزی سے بولی۔ ''بند کر دو۔''

میں اور فارس اس کے کہنے سے پہلے ہی پتھر کو حرکت دے چکے تھے۔ پتھر کو سرکا کر دہانے کو ڈھانپ دیا۔ اب پتھر کی سلائڈنگ رواں ہو گئی تھی اور وہ آسانی سے حرکت کرتا تھا۔ اس کی ''روک'' ہٹا کر ایک بندہ بھی اسے پوری قوت سے دھکیلتا تو وہ متحرک ہو سکتا تھا۔ ہم سب کچھ دیر دم بخود کھڑے رہے۔ پھر قسطینا نے دوبارہ ٹارچ روشن کر لی اور واکی ٹاکی آن کر لیا۔

کیپٹن تبارک بدستور مشکل میں تھا۔ قسطینا نے اسے بتایا کہ اس سے کچھ فاصلے پر ان لوگوں نے کیمپ لگا لیے ہیں...... ان کی تعداد بھی توقع سے زیادہ ہے۔

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

تبارک بولا۔ ''مجھے بھی یہی لگ رہا تھا کہ وہ یہاں کیمپنگ کا ارادہ رکھتے ہیں۔''

''تمہارا درد اب کیسا ہے کیپٹن؟'' کمانڈر فارس جان نے پوچھا۔

''درد تو ہے لیکن درد سے بھی بڑا مسئلہ یہ ہے کہ کھائی کی تین دیواریں تو تقریباً سیدھی ہیں۔ چوتھی جانب سے اوپر آنے کی کوشش کی جا سکتی تھی لیکن دو تین گھنٹے پہلے یہاں بارش ہوئی ہے اور اس نے بے حد پھسلن کر دی ہے۔''

کمانڈر فارس جان، بن مشہد اور انیق وہاں موجود رہے، ہم سیڑھیاں اتر کر واپس پناہ گاہ میں آ گئے۔ تبارک کا پناہ گاہ سے باہر رہ جانا بے حد تشویش ناک تھا۔ بن مشہد نے ٹھیک ہی کہا تھا اگر گرے فورس اور ایجنسی والے مہینوں سر پٹختے رہتے تو بھی اس جگہ کا کوئی سراغ نہیں پا سکتے تھے لیکن اگر کیپٹن تبارک ان کے ہتھے چڑھ جاتا تو پھر وہ تشدد کر کے اس سے سب کچھ اگلوا سکتے تھے۔ بندہ کتنا بھی مضبوط ہو، ایک حد تک ہی برداشت کر سکتا ہے۔

وہ رات بڑی پریشان کن تھی۔ جب تک یہ خیمہ زن مسلح افراد یہاں سے کوچ نہ کرتے، تبارک کو اس کھائی سے نکالنا ممکن نہیں تھا۔ دوسری جانب یہ خطرہ بھی تھا کہ اگر وہ صبح تک وہاں رہا تو پھر اس کے دیکھے جانے کا امکان پیدا ہو جائے گا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ تبارک نے اب واکی ٹاکی پر بتا دیا تھا کہ اس کی ٹانگ ٹوٹ چکی ہے اور وہ از خود کھائی سے باہر نہیں نکل سکتا۔ اب وہ اپنے درد کو سہہ نہیں پا رہا تھا اور بات کرتے ہوئے اس کے منہ سے بے ساختہ کراہ نکل جاتی تھی۔ آدھی رات کے بعد قسطینا نے فارس جان، بن مشہد اور انیق کو بھی دہانے سے واپس بلا لیا۔ اب وہاں ان کے رکے رہنے کا کوئی فائدہ بھی نہیں تھا۔ رات بارہ بجے کے لگ بھگ کیپٹن تبارک نے بتایا کہ اس کی ٹانگ کا درد بہت زیادہ ہے۔ اس نے نیچے لیٹ کر ٹانگ کو کھائی کی دیوار پر اس طرح ٹکا دیا ہے کہ وہ اونچی ہو گئی ہے اور درد میں کچھ افاقہ ہو گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ ڈاکٹر ہونے کے ناتے وہ اس طرح کے کلیے جانتا تھا۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ اس نے اپنے اوپر کچھ خشک شاخیں اور گھاس پھونس اس طرح پھیلا لیا ہے کہ اسے آسانی سے دیکھا نہ جا سکے۔

وہ ہمیں تسلیاں دے رہا تھا مگر ہم جانتے تھے کہ اس کی حالت اتنی اچھی نہیں۔ قسطینا مسلسل جاگ رہی تھی۔ میں اور فارس جان بھی سو نہیں پا رہے تھے۔ ابراہیم کو بہت صبح اٹھنا ہوتا تھا اس لیے وہ سو گیا تھا، سجاول بھی سو گیا تھا۔ زینب اونگھ رہی تھی اور سنبل کے ہلکے خراٹے ساتھ والے کمرے میں سنائی دے رہے تھے۔

قسطینا نے کہا۔ ''خدا کرے کہ کل یہ لوگ پڑاؤ اٹھا لیں۔''

''لیکن مجھے نہیں لگتا کہ ایسا ہوگا بلکہ یہ اندیشہ بھی موجود ہے کہ کل مزید لوگ یہاں آ جائیں۔'' میں نے کہا۔

''ہاں اگر ان لوگوں نے لانچ دیکھ لی تو پھر یہ یہاں سے ٹلیں گے نہیں......''

اسی طرح کی گفتگو میں رات کا تیسرا پہر بھی اختتام تک پہنچ گیا۔ مجھے توقع نہیں تھی مگر کہتے ہیں کہ نیند سولی پر بھی آ جاتی ہے۔ یکے بعد دیگرے قسطینا اور فارس جان بھی سو گئے۔ میں نے قسطینا کا واکی ٹاکی آف کر دیا۔ کیونکہ دوسری طرف اب مکمل خاموشی تھی۔ شاید کیپٹن تبارک بھی درد سے نڈھال ہو کر سو گیا تھا...... یا پھر بے ہوشی کی حالت میں چلا گیا تھا۔ میں نے کامن روم کا جائزہ لیا...... اور اس کام کے لیے تیار ہو گیا جس کا منصوبہ کافی دیر سے میرے ذہن میں پنپ رہا تھا۔ میں جانتا تھا...... اور یہ میرے دل کی گواہی بھی تھی کہ اگر صبح ہونے سے پہلے کیپٹن تبارک کو ریسکیو نہ کیا گیا تو رسک بہت بڑھ جائے گا...... اور یہ بھی ممکن تھا کہ کیپٹن تبارک کی جان چلی جائے۔

جس کھائی میں کیپٹن تبارک گرا تھا اس کا حدود اربعہ اس نے کافی حد تک بتا دیا تھا۔ نائیلون کی ایک مضبوط رسی کا میں نے انتظام کر لیا تھا۔ اس رسی کو کسی قریبی درخت کے ساتھ باندھ کر اور کھائی میں اتر کر تبارک کو باہر لایا جا سکتا تھا۔ میں اکیلا جانا چاہتا تھا اور مجھے 80 فیصد یقین تھا کہ میں یہ کام کر لوں گا۔ MAC10 کا مشین پسٹل میری جیکٹ کے نیچے موجود تھا رسی میں نے کمر کے گرد لپیٹ لی تھی اور طاقتور ٹارچ ہاتھ میں تھی۔ میرا کندھا اب تقریباً ٹھیک تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ میں اسے کچھ خاص سمتوں میں حرکت نہیں دے سکتا تھا۔ ایک عام شخص کے لیے تو شاید یہ اتنا بڑا مسئلہ نہ ہو لیکن جب بات MMA جیسی فائٹنگ کی ہو اور جان ڈیرک جیسے لوگوں سے ٹکرانے کی ہو تو پھر یہ ایک بڑا بلکہ بہت بڑا مسئلہ تھا۔

میں نے بے حد خاموشی کے ساتھ پتھریلی سیڑھیاں طے کیں اور دہانے تک پہنچ گیا۔ رگوں میں لہو کی گردش تیز ہو چکی تھی اور ایک طرح کا تناؤ تھا۔ میں اکیلا اس لیے نکلا تھا کہ ناکامی کے امکانات بھی موجود تھے۔ بالفرض میں پکڑا جاتا تو مجھے اپنے اوپر یہ اعتماد تھا کہ میری ہڈیوں سے میرا

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

گوشت علیحدہ بھی کر دیا جائے تو مجھ سے میری مرضی کے خلاف کچھ اگلوایا نہیں جاسکے گا۔ پکڑے جانے اور پھر اپنی زبان بند نہ رکھ سکنے کا مطلب یہی تھا کہ پناہ گاہ میں موجود سب لوگ گرے فورس اور ایجنسی کی گرفت میں آجاتے اور اسی سنگین ترین خطرے سے بچنے کے لیے تو میں تبارک کو ریسکیو کرنا چاہتا تھا۔

میں نے چند گھنٹے پہلے ہی جانچ لیا تھا کہ دہانے کا پتھر اب روانی سے حرکت کرتا ہے، اس کے اندر کی طرف ایک ''روک'' لگی ہوئی تھی۔ میں نے یہ روک ہٹائی، کافی کوشش کرنا پڑی لیکن ناکامی نہیں ہوئی۔ میں نے پتھر کو اس حد تک سلائڈ کرلیا کہ وہاں سے باہر نکل سکوں۔ سلائڈ نگ کے وقت مدھم آواز بھی پیدا ہوئی جو سناٹے کے سبب نمایاں محسوس ہوئی۔ بہرحال کیمپ خاصے فاصلے پر تھے۔ اندیشہ نہیں تھا کہ وہاں کچھ سنا گیا ہوگا۔ دھکیل کر میں نے پتھر کو پھر برابر کر دیا۔

ہریالی اور بلند درختوں سے لدا ہوا یہ ٹاپورات کی ان آخری گھڑیوں میں بالکل خاموش تھا۔ کسی شب بیدار جانور کی آواز بھی سنائی نہیں دیتی تھی۔ یقینی بات تھی کہ لاتعداد پرندے اردگرد موجود ہوں گے لیکن وہ اپنے گھونسلوں میں دبکے ہوئے تھے۔ صاف آسمان پر ستاروں کی چمک تھی اور سمندر کی طرف سے خنک ہوا چل رہی تھی۔ دائیں جانب ذرا نشیب میں قریباً سو میٹر دور خیموں کی روشنیاں موجود تھیں۔ ان سے تھوڑا ہٹ کر وہ کھائی تھی جہاں کل شام سے کیپٹن تبارک شدید اذیت جھیل رہا تھا۔

میں محتاط انداز میں اس جانب بڑھا۔ ٹارچ روشن کرنے کا رسک نہیں لیا جاسکتا تھا۔ مشین پسٹل جیکٹ کے نیچے تھا اور ایک اسٹریپ کے ساتھ میرے گلے میں جھول رہا تھا۔ میں اسے ایک سیکنڈ کے نوٹس پر استعمال کرسکتا تھا۔

واکی ٹاکی میرے پاس موجود تھا مگر اسے استعمال کرنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ تبارک کی طرف مکمل خاموشی تھی اور اس سے اندیشہ جاگتا تھا کہ شاید وہ بے ہوش ہوگیا ہے۔

میں چالیس پچاس قدم ہی آگے گیا تھا کہ ایک مدھم سی آواز سنائی دی۔ میں اسے کوئی معنی نہیں پہنا سکا۔ ایک دو منٹ کے توقف کے بعد میں پھر آگے بڑھا، ایک ڈھلوان سے اترتے ہوئے مجھے یک دم ٹھٹکنا پڑا، میرے عقب میں کوئی موجود تھا۔ میرا ہاتھ پسٹل کے دستے پر تھا، میں تیزی سے مڑا۔ میرے سامنے سیف کھڑا تھا۔ وہ گھبرا کر بولا۔ ''یہ میں ہوں استاد جی۔''

اس نے اپنی آواز پست رکھی تھی پھر بھی وہ کچھ فاصلے تک تو گئی ہوگی۔ میں دانت پیس کر رہ گیا۔ دل تو یہی چاہا کہ ٹریگر دبا دوں۔ ''یہ کیا حماقت ہے۔ تم ہوش میں تو ہو؟'' میں نے سرسراتی آواز میں کہا۔

''استاد جی! مجھ سے رہا نہیں گیا۔ آپ اکیلے نکل آئے تھے اور میں چنگی طرح جانتا ہوں کہ آپ کتنا خطرے والا کام کرنے لگے ہیں۔''

''جی تو یہی چاہ رہا ہے کہ اپنا سر پھاڑ لوں یا تمہارا......'' میں غصے کی زیادتی کے سبب مزید کچھ نہ کہہ سکا۔

اب میں گھاٹی کے بالکل قریب پہنچ چکا تھا۔ اسے واپس بھیج دینے کا بھی کوئی فائدہ نہیں تھا۔ نہ ہی لڑنے جھگڑنے سے کچھ حاصل تھا۔ وہ لجاجت سے بولا۔ ''ہوسکتا ہے جی کہ یہ اکیلے بندے کا کام ہی نہ ہو۔ ہم دو ہوں گے تو کیپٹن صاحب کو آسانی سے نکال سکیں گے۔ اس کی آواز قدرے اونچی ہوگئی تھی۔

''اچھا اب ذرا بکواس آہستہ کرو۔'' میں نے تیز سرگوشی کی۔

رائفل اس کے کندھے سے جھول رہی تھی اور وہ ہر قسم کے ایکشن کے لیے بے تاب نظر آتا تھا۔ لہو کا گھونٹ پی کر میں نے اسے بتایا کہ ہم کھائی کے بالکل پاس پہنچ گئے ہیں اور خیموں کی روشنیاں بھی سامنے ہی نظر آرہی ہیں، ہمیں احتیاط سے آگے جانا ہوگا۔

ہم جھک کر اور سنبھل سنبھل کر پاؤں رکھتے ہوئے آگے بڑھے۔ پاس ہی وہ بڑے پتھر نظر آئے جن کے عقب میں تبارک نے کھائی کی نشاندہی کی تھی۔ نگاہیں اب اندھیرے میں کافی حد تک دیکھ رہی تھیں۔ ہم اوندھے لیٹ گئے اور احتیاط سے کھسکتے ہوئے کھائی کے کنارے تک پہنچ گئے۔ نوے فیصد امکان اس بات کا تھا کہ یہ وہی کھائی ہے جس میں شدید زخمی کیپٹن تبارک پڑا ہوا ہے۔ کوئی آواز کوئی سرسراہٹ سنائی نہیں دیتی تھی۔ کیپٹن کے پاس بھرا ہوا پستول موجود تھا۔ اس بات کا اندیشہ بھی تھا کہ وہ ہماری آمد سے خوف زدہ ہوتا اور فائر کر دیتا۔ مسئلہ یہ تھا کہ اس کا واکی ٹاکی یکسر خاموش تھا۔ میرے ذہن میں تدبیر آئی۔ میں نے ایک بار پھر واکی ٹاکی پر سگنل بھیجے۔ بھنبھناہٹ کی نہایت باریک اور مدھم آواز سنائی دی۔

یہ آواز تاریک کھائی میں سے ہی آئی تھی۔ تصدیق کے لیے میں نے دوبارہ کال کی اور تصدیق ہوئی۔ کیپٹن

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

تبارک یہیں پر تھا۔ یہ بات بھی تقریباً یقینی ہوگئی کہ وہ ہوش میں نہیں ہے۔ واکی ٹاکی بالکل ٹھیک کام کر رہا تھا مگر تبارک کال ریسیو نہیں کر رہا تھا۔ نیچے اترنے کے لیے میری بے تابی بڑھ گئی۔ ٹارچ روشن کرنا کسی طور بھی مناسب نہیں تھا۔

سیف نے سرگوشی کی۔ ''سگنل کی آواز سے تو یہی پتا چلتا ہے کہ دس بارفٹ سے زیادہ گہرائی نہیں۔''

''شاید۔'' میں نے مختصر جواب دیا۔

''جناب! اگر اجازت ہو تو میں اتر دوں؟''

''تم اجازت لیتے ہوئے اچھے نہیں لگتے۔ بس چھلانگ لگا دو اندر۔''

''سوری جی، غلطی ہوگئی، دراصل......''

''اچھا، اب مزید جھوٹ نہ بولنا...... اِدھر اُدھر کوئی ایسا درخت دیکھو جس سے رسی باندھی جاسکے۔''

سیف نے ایک درخت دیکھ کر رسی باندھ دی اور باقی رسی نیچے گرا دی۔ میں نے آہستہ آہستہ نیچے اترنا شروع کیا اور یہی وقت تھا جب میرے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ مجھے نیچے گہرائی سے پستول کا سیفٹی کیچ ہٹائے جانے کی بہت مدھم آواز سنائی دی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ کیپٹن تبارک بے ہوش نہیں ہے۔ اگلا لمحہ فائر کا بھی ہوسکتا تھا۔ اب قدرے بلند آواز سے بولے بغیر گزارا نہیں تھا۔ میں نے تیز سرسراتے لہجے میں کہا۔ ''تبارک! یہ میں ہوں شاہ زیب!''

''اوہ گاڈ...... تھینکس گاڈ۔'' نیچے آٹھ دس فٹ کی گہرائی سے تبارک کی کراہتی ہوئی آواز آئی۔

کھائی کی ایک دیوار عمودی نہیں تھی بلکہ بچوں کی سلائڈ جیسی تھی۔ رسی کی مدد سے نیچے اترنا مجھے زیادہ دشوار محسوس نہیں ہوا۔ ٹارچ اب بھی روشن نہیں کی جاسکتی تھی۔ میں نے نیم تاریکی میں بغور دیکھا۔ کیپٹن تبارک کی حالت پتلی تھی۔ ٹانگ تو ٹوٹ ہی چکی تھی، سر اور چہرے پر بھی چوٹوں کے آثار تھے۔

میں نے اسے اپنے ساتھ لگایا۔ ''تمہیں بہت برداشت کرنا پڑا ہے تبارک! لیکن اب ہم آگئے ہیں۔''

''آپ نے بڑا خطرہ...... مول لیا...... ہے۔'' وہ کراہتے ہوئے بولا۔

''لیکن تم کال ریسیو کیوں نہیں کر رہے تھے؟''

''واکی ٹاکی میرے پاس نہیں ہے، وہ نیچے گر چکا ہے۔'' اس نے ایک چھوٹے گڑھے کی طرف اشارہ کیا۔

میں نے نیچے جھک کر اور ہاتھ لمبا کر کے واکی ٹاکی تلاش کیا۔ وہ مجھے مل گیا۔ تبارک نے کہا۔ ''مجھ میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ اسے نکال سکتا۔''

میں نے کہا۔ ''میں سمجھتا ہوں کہ یہ بھی تمہاری ہمت ہے کہ تم اب تک ہوش میں ہو۔''

میں نے اس کی دائیں ٹانگ کو بغور دیکھا۔ اس نے گھٹنے اور ٹخنے کے درمیان پنڈلی پر چند شاخیں رکھ کر اوپر اپنی قمیص کی دھجیاں باندھ دی تھیں۔ یوں خود ہی اپنے آپ کو فرسٹ ایڈ دی ہوئی تھی، آخر کو آرمی ڈاکٹر تھا۔

میں اس کے لیے ایک درد کش انجکشن بھر کر ساتھ لایا تھا۔ میں نے اس کے بازو پر یہ سریع الاثر انجکشن دیا۔ تین چار منٹ کے اندر اس کی حالت کچھ بہتر ہوگئی۔

میں نے تبارک سے کہا۔ ''کیپٹن! تمہیں بس تھوڑی سی مزید ہمت کرنا پڑے گی۔ یہ ڈھلوان ایسی نہیں ہے جس پر چڑھا نہ جاسکے۔ میں تمہارے بائیں پاؤں کو اپنے ہاتھ کی سپورٹ دوں گا۔ تم اس پاؤں کے زور پر اوپر کی طرف ''کرال'' کرنا۔ دس بارہ فٹ سے زیادہ گہرائی نہیں ہے یہ۔''

کیپٹن تبارک کی قوتِ برداشت قابلِ داد تھی۔ ایک موقع پر کمانڈر فارس جان نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ بن مشہد اور تبارک کا تعلق پاسبان بریگیڈ کے خاص الخاص یونٹ سے ہے۔ یہ لوگ دشمن کے علاقے میں ڈیوٹی انجام دیتے ہیں اور گرفتاری کی صورت میں زبان کھولنے کے بجائے موت کو گلے لگانا بہتر سمجھتے ہیں۔

میں نے رسی کا ایک سرا کیپٹن تبارک کی کمر سے باندھ دیا اور سیف کو دبی آواز میں ہدایت کی کہ وہ رسی کو پوری طرح تان کر رکھے تاکہ کیپٹن کو سہارا ملتا رہے۔

''آپ بے فکر رہیں جی۔'' سیف نے پُرجوش سرگوشی کی۔

کیپٹن کی دائیں ٹانگ بے جان شے کی طرح اس کے جسم کے ساتھ لٹک رہی تھی۔ اس نے بائیں ٹانگ کے زور پر اوپر چڑھنا تھا۔ وہ کراہتا ہوا ڈھلوان پر اوندھے منہ لیٹ گیا۔ سیف نے رسی تان لی۔ میں نے کیپٹن کے بائیں پاؤں کو اپنے ہاتھ کی ٹیک دی، اس نے زور لگایا۔ اس کے ہونٹوں سے بے ساختہ کراہ نکلی تاہم وہ ڈیڑھ دو فٹ اوپر جانے میں کامیاب ہوگیا۔ یہ عمل میں نے اور کیپٹن تبارک نے وقفے وقفے سے پانچ چھ مرتبہ دہرایا...... بالآخر ہم باہر نکل آئے، یہ ایک طویل کوشش تھی۔

''زبردست کیپٹن! تم نے کر دکھایا۔'' میں نے اس کی کمر سے رسی کھولتے ہوئے کہا۔ وہ بری طرح ہانپ رہا

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

تھا۔ میرے اپنے کندھے میں بھی ہلکا درد ہونے لگا تھا مگر یہ ایسا نہیں تھا کہ اس کے بارے میں سوچا جاتا۔

سیف نے درخت سے رسی کھول کر اسے گول گول لپیٹا اور اپنے کندھے سے لٹکا لیا۔ ہماری بائیں جانب فقط تیس چالیس منٹ کی دوری پر گرے فورس اور ایجنسی کے کیمپس کی روشنیاں نظر آرہی تھیں۔ کیپٹن تبارک نے تکلیف زدہ آواز میں کہا۔ ''میرا خیال ہے کہ ہمیں واکی ٹاکی بند کر دینے چاہئیں۔''

''میں نے کر دیے ہیں۔'' میں نے اسے تسلی دی۔ (اس وقت واکی ٹاکی پر سگنل کی آواز آنا بہت خطرناک تھا)

''کیا یہ اچھا نہیں ہوگا کہ میں کیپٹن صاحب کو اپنی کمر پر لاد لوں؟'' سیف نے پوچھا۔

''کر لو گے؟''

''کیوں نہیں جی۔ جب ہم کبڈی کی پریکٹس کرتے ہیں تو اس میں ہل بھی کھینچتے ہیں۔ کمر لوہے کی طرح پکی ہو جاتی ہے۔'' وہ سینہ تان کر بولا۔

کیپٹن تبارک کو کھڑا کرنا اور پھر کمر پر لادنا ایک مشکل مرحلہ تھا۔ میں نے اسے بمشکل اٹھایا۔ جب سیف نے اسے کمر پر لاد کر اپنا توازن درست کیا تو تبارک کو دھچکا لگا۔ اس کے منہ سے بے ساختہ ایک بلند کراہ نکلی۔ چند لمحوں کے لیے ہم تینوں ہی ٹھٹک گئے۔ آواز خاصی اونچی تھی۔ ہم درختوں کے پیچھے ساکت ہو کر ردِعمل دیکھنے لگے۔ خاموشی کے سوا اور کچھ محسوس نہیں ہوا مگر پھر اچانک کیمپنگ کی طرف چند روشنیوں نے حرکت کی۔ بائیں جانب نشیب کے درختوں میں بھی کچھ سرسراہٹ سنائی دی۔ ہم تاریکی میں تھے اور درختوں کے سائے ستاروں کی معمولی روشنی کو بھی روکے ہوئے تھے۔ یہ توقع ہرگز نہیں تھی کہ وہ لوگ آسانی سے ہم کو دیکھ پائیں گے...... یہی وجہ تھی کہ جب ڈیڑھ دو منٹ بعد ایک سایہ تاریکی سے برآمد ہو کر کسی بلا کی طرح مجھ پر جھپٹا تو میں ششدر رہ گیا۔

چونکہ میں کسی ایسے حملے کے لیے قطعی تیار نہیں تھا۔ میں پہلو کے بل پتھروں پر گرا۔ ایک بھرپور مکا میری ٹھوڑی پر لگا اور دماغ میں چنگاریاں سی چھوٹ گئیں۔ دو توانا افراد مجھ سے لپٹ گئے۔ اس کے ساتھ ہی مجھے اندازہ ہوا کہ دو تین افراد سیف پر بھی جھپٹ پڑے ہیں اور کیپٹن تبارک، سیف کی کمر سے پھسل کر پتھروں پر گر گیا ہے۔ ''یو باسٹرڈ۔'' مجھ سے بھڑنے والا ایک شخص پھنکارا۔ اس کے لہجے نے مجھے سمجھا دیا کہ وہ امریکن ہے، میرے دماغ میں پہلے ہی چنگاریاں ناچ رہی تھیں۔ امریکی لہجے نے انہیں اور بھڑکا دیا۔ میرے سر کی طوفانی ضرب چہرے پر سہہ کر امریکی ڈھلوان پر لڑھکا۔ اس دوران میں دوسرے نے میرے سر پر رائفل کا بٹ رسید کیا۔ یہ بھی امریکی تھا اور ایجنسی کی یونیفارم میں تھا۔ میں نے اسے گھما کر ایک درخت سے دے مارا۔

''اوئے مار دوں گا۔'' مجھے سیف کی بھڑک سنائی دی۔ وہ دو افراد سے گتھم گتھا تھا۔ تبارک مجھے نظر نہیں آیا۔

پہلا امریکی اٹھ کر پھر مجھ پر جھپٹا مگر اب دو مزید سفید فام اس کے ساتھ تھے۔ وہ مجھے تر نوالہ جان کر آگے بڑھے تھے۔ ان کے انداز میں بہت اعتماد تھا۔ اس اعتماد کی غالباً دو وجوہات تھیں۔ ایک تو یہ کہ میں دیسی تھا...... دوسرے وہ امریکن ایجنسی کے تربیت یافتہ لوگ تھے اور لڑائی کی اعلیٰ ترین تکنیک جانتے تھے، ان کی پہلی بات تو یقیناً درست تھی کہ میں دیسی تھا لیکن دوسری بات درست نہیں تھی۔ لڑائی کی تکنیک میں، میں اُن سے کہیں آگے تھا۔ میں نے چند سیکنڈ میں ان کو ناکوں چنے چبوا دیے۔ ایک کی ٹانگ ٹوٹ گئی اور دوسرا ڈھلوان پر لڑھک کر چالیس پچاس فٹ نیچے چلا گیا۔ تیسرے شخص نے میری ٹانگ پر فائر کرنا چاہا لیکن تب تک میں بھی اپنے گلے میں جھولتے ہوئے مشین پسٹل پر گرفت مضبوط کر چکا تھا۔ میری چلائی ہوئی گولی امریکی کی گردن چیر کر گزر گئی۔

یہی وقت تھا جب ہم سب تیز روشنیوں میں نہا گئے۔ بالکل یہی لگا کہ دن نکل آیا ہے۔ ''ہینڈز اَپ...... ہینڈز اَپ......'' کئی آوازیں سنائی دیں۔

سیف کے ہاتھ میں چھرا تھا اور اس نے چھریرے بدن والے ایک گرے فوجی کو عقب سے جکڑا ہوا تھا۔ چمکتا ہوا تیز دھار چھرا فوجی کی گردن پر تھا۔ فوجی نے دیگر حملہ آوروں کی طرح سیاہ عینک لگا رکھی تھی اور وہ رینک کے اعتبار سے گرے فورس کا لیفٹیننٹ نظر آتا تھا۔ اسی دوران میں ہمارے عقبی درختوں میں بھی کئی طاقتور سرچ لائٹس روشن ہو گئیں۔ مطلب صاف تھا کہ ہم گھیرے میں آچکے ہیں۔ گھیرنے والے تاریکی میں تھے اور ہم جیسے دن کی روشنی میں نہائے ہوئے تھے۔

جس امریکی کی گردن پر میری نائن ایم ایم پسٹل کی گولی لگی تھی، وہ بے سدھ پڑا تھا مگر سانس لے رہا تھا۔ خون کی ایک چوڑی لکیر گھاس کی پتیوں اور کنکروں کو پھلانگتی چلی جا رہی تھی۔ اس نیم مردہ کے چہرے پر بھی عینک تھی۔ اب

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

یہ بات سمجھ میں آ رہی تھی کہ یہ امریکی تاریکی کے باوجود اتنی تیزی سے ہم تک کیسے پہنچ گئے تھے۔ انہوں نے ''اینٹی ڈارک'' چشمے لگا رکھے تھے۔ اس کے علاوہ دیگر لوازمات، بلٹ پروف جیکٹس، ہیلمٹس، ہیڈ فونز، کیپ لائٹس سب کچھ ان کے جسموں پر سجا ہوا تھا۔ سپر پاور کے 'سپر' لوگ......

اب وہ چاروں طرف سے دہاڑ رہے تھے۔ ''ہتھیار پھینک دو...... اوندھے منہ لیٹ جاؤ...... اپنے ہاتھوں کو اپنے جسموں سے دور رکھو۔''

یقینی بات تھی کہ تاریکی میں درجنوں رائفلیں ہماری طرف اٹھی ہوئی ہیں۔ سیف نے میری طرف دیکھا اور اس نے گرے فوجی پر اپنی آہنی گرفت کچھ اور مضبوط کر دی، اس کے ساتھ ہی اس کی سیاہی مائل گردن پر اپنے چھرے کا دباؤ بڑھا دیا۔ لیکن وہ بے چارہ جانتا نہیں تھا کہ اس ایک گرے لیفٹیننٹ کی یہاں کوئی اہمیت نہیں ہے، ہم اس کی موت کا ڈراوا دے کر اپنی طرف بڑھنے والے دشمنوں کو روک نہیں سکتے تھے۔ وہ درجنوں میں تھے اور انہوں نے اپنی انگلیاں ٹریگرز پر رکھی ہوئی تھیں۔ وہ ہم دونوں کو فوری طور پر نہ بھی مارتے تو بری طرح زخمی کر سکتے تھے۔

''ہتھیار نیچے...... ہاتھ اوپر...... اوندھے لیٹ جاؤ۔'' کوئی امریکی آفیسر گرجا۔ ان کی آوازوں سے پتا چل رہا تھا کہ وہ گھیراتنگ کرتے جا رہے ہیں۔

میں نے سیف کو اشارہ کیا۔ اس نے گرے لیفٹیننٹ کو چھوڑ دیا۔ لیفٹیننٹ نے سیف کو انگلش میں گالی دی اور چند قدم پیچھے ہٹ کر اپنا سروس پستول نکال کر مجھ پر دہاڑا۔ ''اپنا پسٹل گلے سے اتار کر دور پھینکو...... اوندھے لیٹ جاؤ...... جلدی کرو۔''

فی الحال ہدایات ماننے کے سوا چارہ نہیں تھا۔ میں نے MAC10 پسٹل گلے سے اتار کر دور پھینک دیا اور اوندھا لیٹ گیا۔ تھوڑی سی پس و پیش کے بعد سیف نے بھی میری تقلید کی۔ زمین سنگلاخ اور ٹھنڈی تھی۔ ہمارے گرد گھیرا مزید تنگ ہو گیا۔ روشنیاں ہمیں فوکس کرنے لگیں۔

''اپنے ہاتھ موڑ کر پشت پر رکھو، ہیڈ ڈاؤن...... سیدھے لیٹے رہو۔'' امریکی لہجے کی گرجدار آوازیں پھر سنائی دیں۔

میں نے ہاتھ پیچھے موڑے۔ کلائیوں پر سرد لوہے کا لمس محسوس ہوا۔ ہمیں ہتھکڑیاں پہنائی جا رہی تھیں۔

کیپٹن تبارک کی کراہ سنائی دی۔ اس کراہ سے کم از کم یہ اطمینان تو ہوا کہ وہ زندہ ہے۔ کڑک دار فوجی آوازوں سے پتا چلتا تھا کہ اسے بھی ہتھکڑی پہنائی جا رہی ہے۔

ایک امریکن اپنی ٹانگیں چوڑی کیے میرے اوپر کھڑا تھا۔ اس نے میرے سر کے عقبی بالوں کو اپنی سخت مٹھی میں جکڑا اور پھنکارا۔ ''تمہارے باقی ساتھی کہاں ہیں۔ جلدی بتاؤ...... ورنہ شوٹ کر دوں گا۔''

میں اوندھا لیٹا تھا۔ مجھے اس کی منحوس شکل نظر نہیں آ رہی تھی اور یہ اچھا ہی تھا ورنہ ہو سکتا تھا کہ میں اپنے طیش کو سنبھال نہ سکتا اور اس کے چہرے کو اگالدان کے طور پر استعمال کر گزرتا۔ اس نے میرے سر کو دو تین بار سخت زمین پر پٹخا اور پھر پسلیوں میں ٹھوکریں رسید کرنے لگا۔ دو تین امریکی سیف کو بھی مار رہے تھے اور اس سے باقی ساتھیوں کا پوچھ رہے تھے۔ درختوں میں چاروں طرف سرچ لائٹس اور طاقتور ٹارچیں گردش کرنے لگی تھیں۔ وہ لوگ باقی افراد کو ڈھونڈ رہے تھے۔ ان کی تعداد ہماری توقع سے کہیں زیادہ تھی۔ کم و بیش چالیس افراد تو ہمیں یہاں نظر آ رہے تھے۔ یقینی بات تھی کہ کچھ خیموں میں بھی ہوں گے اور دو چار اُن بوٹس کے پاس بھی جن پر یہ لوگ یہاں پہنچے تھے۔ ہر طرف ان کے للکارے گونجتے محسوس ہوتے تھے۔ شکر کا مقام تھا کہ ہم سلائڈنگ پتھر سے قریباً ڈیڑھ سو میٹر کے فاصلے پر تھے اور یہاں اَن گنت پتھر تھے اور چٹانیں تھیں۔ اگر یہ لوگ سلائڈنگ پتھر کے بارے میں کوئی آئیڈیا رکھتے بھی تھے تو اسے ڈھونڈنا جوئے شیر لانے کے برابر تھا۔

ایک اسٹریچر وہاں پہنچ چکا تھا۔ کیپٹن تبارک کو اسٹریچر پر لٹا دیا گیا۔ مجھے اور سیف کو گن پوائنٹس پر خیموں کی طرف دھکیلا جانے لگا۔

☆☆☆

ہم کو ایک بڑے خیمے میں لایا گیا تھا۔ اب دن کا ہلکا ہلکا اجالا پھیلنا شروع ہو گیا تھا۔ دن امید کی روشنی لے کر آتا ہے مگر یہ دن ہمارے لیے بے حد سختی لے کر آیا تھا۔ میں اور سیف خیمے میں اوندھے پڑے تھے۔ تبارک اسٹریچر پر تھا۔ اس اونچی چھت والے خیمے کو درجنوں مسلح سپاہیوں نے گھیر رکھا تھا۔ جو تین چار امریکی گارڈز ہمارے ساتھ لڑائی میں زخمی ہوئے تھے ان میں دو کی حالت تشویشناک تھی۔ انہیں طبی امداد کے لیے فوراً جاماجی کی طرف روانہ کر دیا گیا تھا۔ ان کی روانگی کا پتا ایک اسپیڈ بوٹ کی آواز سے چلا تھا جو ٹاپو کے کنارے سے جاماجی کی طرف روانہ ہوئی تھی۔

ایک ہٹا کٹا امریکن جو سیکیورٹی ایجنسی کا آفیسر تھا،

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

میرے عین سامنے کرسی ڈال کر بیٹھ گیا تھا۔ اس کے حکم پر دو رائفل مینوں نے مجھے اٹھا کر فرش پر بٹھا دیا۔ ہلکی نیلی آنکھوں والے آفیسر نے بڑی جگر پاش نظروں سے مجھے دیکھا اور بولا۔ ''ایم ایم اے کا اتنا بڑا فائٹر اور اس حال میں۔ تمہاری بدبختی پر رونا آرہا ہے۔ بہتر ہوتا کہ اس طرح پکڑے جانے کے بجائے تم ڈی پیلس پر ہونے والی لڑائی میں ہی ٹھکانے لگ گئے ہوتے۔''

''موت کا وقت مقرر ہے، وہ پہلے کیسے آجاتی؟'' میں نے کہا۔

''لیکن اب موت کی توقع نہ رکھو۔ وہ اتنی آسانی سے نہیں ملے گی۔'' وہ زہرخند لہجے میں بولا۔ چند لمحے خاموش رہ کر کرسی پر بیٹھا بیٹھا آگے کو جھکا اور گمبھیر لہجے میں کہنے لگا۔ ''میرا ایک بڑا ہمدردانہ مشورہ ہے تم کو۔ جو جو کچھ تم سے پوچھا جائے بتاتے چلے جاؤ۔ ورنہ بڑا سخت عذاب جھیلنا پڑے گا۔ جو بندہ تم سے پوچھ گچھ کے لیے آرہا ہے وہ پیدائشی ظالم ہے۔ آنکھوں آنکھوں میں بندے کی جان کھینچ لیتا ہے.....''

ابھی آفیسر کا فقرہ مکمل ہوا ہی تھا کہ بھیڑیے جیسے چہرے والا ایک گرانڈیل امریکن اندر داخل ہوا۔ اس کا قد ساڑھے چھ فٹ سے بھی نکلتا ہوا تھا۔ اس کی آنکھوں میں جیسے آگ سی روشن تھی۔ وہ ٹانگیں چوڑی کر کے ہم تینوں کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ اپنی آنکھوں کے پٹاخے نکالے اور مجھے گھور کر نہایت زہریلے لہجے میں بولا۔ ''تو تم ہو جس نے ڈی پیلس کے سامنے آقا جان کو تھپڑ مارا تھا۔''

کرسی پر بیٹھے آفیسر نے کہا۔ ''بے شک یہی ہے۔''

گرانڈیل امریکن بولا۔ ''بہت بھاری قیمت چکانا پڑے گی اِسے۔ اس کی آنے والی سات پشتوں میں بھی کوئی اس طرح کی حرکت نہیں کرے گا اور ہوسکتا ہے کہ ان کی مائیں صرف ٹنڈے پیدا کریں جو کسی کو تھپڑ مارنے کے قابل ہی نہ ہوں۔'' اس کی آنکھیں ہی نہیں پورا چہرہ جیسے شعلوں کی آنچ پر تھا۔ اپنی توانا گردن گھما کر اس نے اردگرد دیکھا۔ جیسے درندہ کسی ریوڑ کے پیچھے بھاگتے ہوئے اپنے شکار کے لیے کمزور جانور چن لیتا ہے اس نے کیپٹن ڈاکٹر تبارک کو چن لیا۔ وہ ایکشن میں آنے والا تھا اس لیے نیلی آنکھوں والا آفیسر اور دیگر افراد خیمے سے باہر نکل گئے۔ خیمے میں صرف ہم تینوں یعنی میں، سیف اور کیپٹن تبارک رہ گئے۔

گرانڈیل آفیسر ٹانگیں کھولے ہمارے سامنے کھڑا تھا اور اس کے عقب میں اس کے ساتھ آنے والے دو مسلح اہلکار

بہترین تحریریں، لاجواب روداد اور اعلیٰ داستانیں پڑھنے والوں کے لیے سرگزشت کا مطالعہ ضروری ہے

ماہنامہ سرگزشت کراچی

شمارہ جون 2017ء کی جھلکیاں

نوائے خلیل

اس قلمکار کی داستانِ زیست جسے ہر گام پر دکھ ملے

بابائے سندھی فلم

پاکستانی فلمی دنیا کے ایک اہم شخصیت کا ذکرِ خاص

نایاب پرندے

ان پرندوں کی کہانی جو تیزی سے نایاب ہو رہے ہیں

خود اعتمادی

ایک دوشیزہ کی سچ بیانی جس نے اپنا ٹوٹتا گھر بچا لیا

ایم اے راحت

ناسور ایک نہایت تیز رفتار طویل کہانی، شمشال سے ٹورنٹو ایک الگ انداز کی سفر کہانی، جون کی شخصیت، اس ماہ سے جڑی شخصیات کا مختصر مختصر سا تذکرہ

اور بھی بہت کچھ جسے آپ کو پڑھنا چاہیے۔ آپ پڑھنا چاہتے ہیں۔

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

تھے۔ یہ خیمہ باہر سے بھی کڑے پہرے میں تھا۔ فضا میں ہیلی کاپٹرز کی پھڑ پھڑاہٹ سنائی دینے لگی تھی۔ اندازہ ہوتا تھا کہ ہر طرف گھنٹیاں بج گئی ہیں اور اب اس سنسان ٹاپو کی ''رونق'' میں گونا گوں اضافہ ہونے والا ہے۔

وہ کیپٹن تبارک کے عین سامنے پہنچ کر بولا۔ ''میرا نام تو جیک ہے لیکن مجھے پیار سے لونگ ہٹلر کہتے ہیں اور یہ بھی بتادوں کہ ہٹلر میرے سامنے پانی بھرتا ہے۔'' اس کے لہجے میں واقعی کسی خونخوار جانور جیسی دہشت ناکی تھی۔

اسٹریچر پر لیٹا ہوا تبارک بس کراہ کر رہ گیا۔ لونگ ہٹلر یعنی لمبے ہٹلر نے.... اپنی بات جاری رکھی۔ ''تم حرام زادے تو ہو ہی غدار بھی ہو۔ گرے فورس کے درمیان رہ کر ہی گرے فورس کی جڑیں کاٹتے رہے ہو۔ جاسوسی کرتے رہے ہو اور جاسوس کی سزا کچھ اور کڑی ہو جاتی ہے۔ کیا خیال ہے اس سزا تک پہنچنا چاہتے ہو یا پہلے ہی کچھ بتا دو گے۔''

''تم کیا پوچھ رہے ہو؟'' تبارک نے اپنی اذیت دباتے ہوئے کہا۔

''بڑا آسان سوال ہے۔ آدم کی بیٹی قسطینا، ریان فردوس کا بیٹا ابراہیم، وہ افغانی چرغد فارس جان اور باقی بھگوڑے کہاں ہیں؟''

''وہ یہاں نہیں ہیں، وہ جاچکے ہیں۔''

''تو پھر کس ماں کی گود میں گھس کر بیٹھے ہوئے ہیں؟''

''مجھے نہیں پتا...... ہم تینوں میں سے کسی کو نہیں پتا...... ہم...... ٹاپو کے اس حصے میں آئے تھے...... میں کھائی میں گر گیا...... یہ لوگ مجھے نکالتے رہے...... وہ ہنگامی طور پر یہاں سے چلے گئے۔''

''تمہیں پیدا کرنے والی یقیناً کسی ''بہت بڑے جھوٹے'' کے ساتھ سوتی رہی ہے۔'' وہ اپنے وزنی بوٹ سے تبارک کے سر پر ٹھوکر لگا کر بولا۔ ''تم بھگوڑے جس لانچ پر یہاں پہنچے تھے، وہ ہم نے ڈھونڈ لی ہے اور وہ یہیں پر موجود ہے۔''

''ہمارے پاس دو لانچیں تھیں۔'' تبارک نے حاضر دماغی سے جواب دیا۔

''ٹھیک ہے، تمہاری بات مان لی۔ دو لانچیں موجود تھیں اور جب باقی بھگوڑوں کو پتا چلا کہ ہم آرہے ہیں تو وہ ہنگامی طور پر یہاں سے نکل گئے لیکن میرے چاند! میرے ہیرے، مجھے یہ بتاؤ کہ تم لوگوں کے پاس واکی ٹاکی تھے۔ انہوں نے تمہیں اطلاع نہیں کی کہ ہم رفو چکر ہو رہے ہیں۔''

''یہاں...... پر...... سگنل آتے بند ہو گئے تھے۔''

تبارک نے پھر حاضر دماغی کا مظاہرہ کیا۔

''تمہارا مطلب ہے کہ وہ جگہ یہاں سے دور ہے لیکن میرے چاند! اس جگہ کا پتا تو تمہیں بتانا ہوگا تاکہ ہم وہاں کی زیارت کر کے اپنی آنکھوں کو ٹھنڈک دے سکیں کہ ہاں یہ ہے وہ مقام جہاں آدم کی بھگوڑی بیٹی نے قیام فرمایا تھا۔''

تبارک نے کہا۔ ''وہ ہم سب کے لیے قابلِ احترام ہیں، تم لوگ اُن کا نام تمیز سے لو۔''

''وہ ایک بار مل جائے...... پھر ''سب کچھ'' تمیز سے ہی کریں گے۔'' لونگ ہٹلر معنی خیز انداز میں بولا اور ایک مزید ٹھوکر تبارک کے سر پر رسید کی۔

صورتِ حال بگڑتی جارہی تھی۔ لونگ کے اشارے پر ایک شخص باہر سے آیا اور تبارک کی شدید زخمی ٹانگ پر کچھ باندھنا شروع کر دیا۔ ٹانگ اوٹ میں تھی، مجھے نظر نہیں آرہا تھا کہ تبارک کو کس طرح کی ''ٹریٹ منٹ'' دی جارہی ہے۔ قریباً ایک منٹ بعد جب وہ شخص اپنی جگہ سے اٹھا تو لونگ ہٹلر کی صحیح سفاکی کھل کر سامنے آگئی۔ یہ سب کچھ واقعی بدترین بربریت کے زمرے میں آتا تھا۔ تبارک کے ٹخنے سے نائیلون کی موٹی رسی باندھی گئی تھی۔ یہ وہی رسی تھی جس کی مدد سے کچھ دیر پہلے ہم نے تبارک کو کھائی سے نکالا تھا۔

دراز قد امریکن کے اشارے پر دو افراد تبارک کو رسی کی مدد سے گھسیٹتے ہوئے خیمے سے باہر لے گئے۔ تبارک بے حد قوتِ برداشت کے باوجود ذبح ہونے والے جانور کی طرح چلا اٹھا تھا۔ اسے خیمے کے عین سامنے ایک درخت سے الٹا لٹکا دیا گیا۔ خیمے کے کھلے ہوئے در سے مجھے اور سیف کو سب کچھ صاف نظر آرہا تھا۔ سورج کی روپہلی کرنوں میں تبارک کے تڑپنے پھڑکنے کا منظر دردناک تھا۔ وہ زخمی ٹانگ جس کو بے حد احتیاط اور علاج کی ضرورت تھی، تبارک کے جسم کا سارا بوجھ سہارے ہوئے تھی۔ وہ اذیت کی انتہا کو چھو رہا تھا۔ جیک عرف لونگ کے حکم پر دو گرے فوجیوں نے اپنی بھاری بھرکم چرمی پیٹیاں اتاریں اور تبارک کو اندھا دھند پیٹنے لگے۔ ایک منٹ کے اندر اندر وزنی بکلوں نے تبارک کو لہولہان کر دیا۔ نیچے گھاس سرخ دکھائی دینے لگی۔

لونگ ہٹلر بار بار معروف انگلش گالی بک رہا تھا اور تبارک سے پوچھ رہا تھا۔ ''کہاں ہے تمہاری ماں...... کہاں ہے تمہارا باپ؟''

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

ماں سے مراد قسطینا اور باپ سے مراد ابراہیم تھا۔ شاید تبارک بھی اب جان گیا تھا کہ جان بچنا مشکل ہے۔ جب لونگ نے اسے تیسری بار ''غدار حرامی'' کہا تو وہ چلا اٹھا۔ ''غدار میں نہیں تم ہو...... تم ہو سفید سؤر! تم لوگ یہاں عزت مآب کی فیملی کی سیکیورٹی دینے آئے تھے۔ ان کے ٹکڑوں پر پلتے رہے اور انہی پر چڑھ دوڑے۔ لالچ اور ہوس نے تمہیں اندھا ہی نہیں کیا، بے غیرت بھی بنا ڈالا۔ تم دنیا میں جہاں جاتے ہو، یہی کرتے ہو...... یہی کرتے ہو...... حرام تمہارے خون میں شامل ہے۔''

اب ''لونگ'' خود بھی بہیمانہ تشدد میں شامل ہو گیا۔ وہ الٹے لٹکے کیپٹن تبارک کے سر اور چہرے کو اپنے وزنی بوٹ کی ٹھوکروں سے لہولہان کرنے لگا...... وہ دہاڑا۔ ''اپنے ساتھیوں کا بتاؤ ورنہ اسی جگہ تمہاری ہوا پرواز کر جائے گی۔''

''نہیں بتاؤں گا...... میرے جسم کا ایک ایک ریشہ الگ کر دو گے تو بھی نہیں بتاؤں گا...... اپنی زمین کے لیے...... اپنے جاماجی کے لیے ایک نہیں سو جانیں بھی قربان ہیں۔'' وہ سینے کی پوری قوت سے پکارا۔

میں نے اس کے ایک ٹوٹے ہوئے دانت کو زمین پر گرتے ہوئے صاف دیکھا۔ اس کی ٹھوڑی کا گوشت پھٹ کر لٹک رہا تھا۔

ہاں مجھے ٹھیک ہی بتایا گیا تھا۔ بن مشہد اور تبارک وغیرہ پاسبان بریگیڈ کے سخت جان ترین لوگوں میں سے تھے۔ یہ وہ لوگ تھے جو وردی یا تنخواہ کے لیے نہیں اپنے جذبات...... اپنے سچے کھرے احساسات کے لیے کام کرتے تھے۔ ایسے لوگ کسی بھی جگہ ہوں، کسی بھی ادارے سے منسلک ہوں، قابلِ فخر ہوتے ہیں۔

مجھے اور سیف کو ابھی تک کچھ نہیں کہا گیا تھا۔ شاید یہ بھی ان لوگوں کی حکمتِ عملی ہی تھی۔ ہمیں اپنے ساتھی کا دردناک انجام دکھایا جا رہا تھا اور ہمیں اندر سے توڑنے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ اب ہمارے پاؤں کو بھی ''کیبل ٹائی'' کی مدد سے کسا جا چکا تھا۔ اندازہ ہوتا تھا کہ اس ٹاپو پر ہیلی کاپٹرز کا اترنا ممکن نہیں، وہ ہوا میں ہی پھڑ پھڑا رہے تھے تاہم پانی کے راستے سے لانچیں اور اسپیڈ بوٹس یہاں پہنچنا شروع ہو گئی تھیں۔ مجھے اپنے اردگرد نئے نئے چہرے نظر آ رہے تھے۔ تمتمائے ہوئے سفاک چہرے۔ ان چہروں کے تاثرات گواہی دے رہے تھے کہ آنے والی گھڑیاں ہمارے لیے بے حد سخت ہیں۔

سیف نے دھیمے لہجے میں کہا۔ ''استاد صاحب! میں ایک بار پھر معافی مانگتا ہوں۔''

''معافی کس بات کی؟'' میں نے کہا۔ ''جو کچھ ہوا ہے تمہاری وجہ سے نہیں ہوا۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ جو ہوا ہے اس کی وجہ سے تم بھی پھنس گئے ہو۔''

سیف باہر نظر دوڑاتا ہوا بولا۔ ''یہ تو بہت زیادہ لوگ ہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ قسطینا بی بی اور کمانڈر فارس وغیرہ ہماری مدد کرنے کا سوچ کر باہر نکل آئیں؟''

''اللہ کرے کہ وہ اس طرح نہ سوچیں۔'' میں نے بھی سرگوشی میں کہا۔ ہم اردو بول رہے تھے اس بات کا امکان نہیں تھا کہ دس پندرہ قدم دور کھڑے مسلح امریکن ہماری بات سن لیں گے۔

سیف نے کہا۔ ''فائرنگ کی آوازیں تو انہوں نے نیچے سن ہی لی ہوں گی اگر انہوں نے پتھر کو نیچے سے ''روک'' لگا لی ہے تو پھر اس کو کھسکایا تو بالکل نہیں جا سکے گا۔''

میں نے اثبات میں سر ہلایا اور اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ ایک امریکن رائفل مین ٹہلتا ہوا چند قدم آگے آ گیا تھا۔ ہم دونوں پر عقابی نظر رکھی جا رہی تھی اور ہر ہر حرکت کو نوٹ کیا جا رہا تھا۔

خاموش ہو جانے کے باوجود سیف کی آنکھوں میں ایک سوال تھا۔ کیا ہم کیپٹن تبارک کے لیے کچھ کر سکتے ہیں؟ جواب نفی میں تھا۔ کم از کم فی الحال تو نفی میں تھا۔ کچھ کرنے کا سوچنا ایسے ہی تھا جیسے خودکشی کا سوچا جائے۔ اسی دوران میں گرے فورس کا ایک ملائیشین میجر تیز قدم اٹھاتا ہوا جیک عرف لونگ کے پاس پہنچا۔ اس نے انگلش میں کہا۔ ''نو سر! ابھی تک کوئی کھوج نہیں ملا۔ زمین بھی گھاس والی ہے یا پھر پتھریلی ہے۔ قدموں کے نشان ملنا بھی مشکل...... بلکہ ناممکن ہے۔''

''ناممکن کا لفظ کم ہی استعمال کیا جائے تو اچھا ہے۔'' بلند قامت لونگ نے زہریلے لہجے میں کہا۔

میجر نے اپنا سیل فون لونگ کی طرف بڑھایا اور اس پر موجود کچھ ڈیٹا اس کو دکھایا۔ اس ڈیٹا کا تعلق کیپٹن تبارک سے ہی تھا۔ تبارک کے سارے کوائف اور سروس ریکارڈ وغیرہ۔ لونگ بلند آواز سے پڑھتا گیا۔ تبارک کی فیملی کی کچھ تصاویر بھی اس ڈیٹا میں موجود تھیں۔ فاصلے کے باوجود میری نگاہ ان تصاویر تک پہنچ رہی تھی۔

تبارک کی حالت اب ناگفتہ بہ تھی۔ اس کے بالائی جسم پر صرف ایک بنیان تھی اور یہ سفید سے سرخ رنگ میں

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

تبدیل ہو چکی تھی۔ اس کی ٹوٹی ہوئی ٹانگ اس بری طرح کھنچی ہوئی تھی کہ اپنی اصل لمبائی سے قریباً ایک فٹ بڑی نظر آتی تھی۔ یہ بڑا ہولناک منظر تھا اور اسے نظر بھر کر دیکھا نہیں جاسکتا تھا۔ کیپٹن تبارک اب نیم بے ہوشی کی سی کیفیت میں تھا۔ اس کا جوان خون مسلسل سبز گھاس پر ٹپک رہا تھا اور پھیل رہا تھا۔ وہ آہنی برداشت رکھتا تھا مگر جیسے ''لونگ'' نے ابھی کہا تھا کہ ''ناممکن'' کا لفظ ٹھیک نہیں...... کیا کہا جاسکتا تھا کہ سب کچھ اتنا کرب ناک ہو جاتا کہ تبارک کی برداشت سے باہر ہو جاتا۔

میجر سے ناکامی کی اطلاع ملنے کے بعد لونگ کا پارا کچھ اور چڑھ گیا، اس نے اشارہ کیا اور چار بپھرے ہوئے امریکی گارڈز نے اندر آکر مجھے اور سیف کو بیلٹس اور ٹھوکروں سے بے طرح پیٹنا شروع کر دیا۔ باہر تبارک پر بھی ایک بار پھر بے رحم ہلا بول دیا گیا تھا۔ میں ایسی چوٹوں کا ہمیشہ سے عادی تھا مگر سیف بری طرح کراہ رہا تھا۔ ردعمل کے طور پر اس نے امریکی گارڈز پر اپنی بندھی ہوئی ٹانگیں بھی چلائیں اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اسے زیادہ بے دردی سے مارا گیا۔ اس کے ناک منہ سے خون جاری ہو گیا اور رخسار پر بھی گہری چوٹ آئی۔

لونگ کے اشارے پر ہمیں پیٹنے والے باہر چلے گئے۔ شاید لونگ ابھی اپنی ساری توجہ کیپٹن تبارک پر ہی مرکوز رکھنا چاہتا تھا۔ تبارک کی ٹھوڑی کی کھال اب کئی انچ نیچے لٹک رہی تھی اور ایک سرخ جھالر کا منظر پیش کرتی تھی۔ وہ منہ میں کچھ بڑبڑا رہا تھا شاید پڑھ رہا تھا۔

لونگ نے زہر خند لہجے میں کہا۔ ''جنت میں جانے کا بہت شوق ہوتا ہے نا تم لوگوں کو۔ امید ہے کہ آج ہی جنت کا دروازہ کھل جائے گا تمہارے لیے۔ بس ابھی ایک دو گھنٹے کے اندر۔''

اس نے ایک بار پھر تبارک سے کچھ پوچھا جس کا جواب اس نے چٹانی خاموشی سے دیا۔ سیل فون لونگ کے ہاتھ میں تھا۔ اس میں کیپٹن تبارک کا ڈیٹا تھا اور یقیناً اس کی فیملی کی تصویریں بھی...... لونگ پنجوں کے بل...... الٹے لٹکے ہوئے تبارک کے قریب بیٹھ گیا۔ اس نے تبارک کو ایک تصویر دکھا کر کوئی بے ہودہ بات کی۔ یقیناً یہ بات اتنی ہی بے ہودہ ہوگی کہ نیم جان تبارک برداشت نہیں کر سکا۔ اس نے لونگ کے منہ پر تھوک دیا۔ شعلہ صفت لونگ کا پارا ایک دم ساتویں آسمان کو چھو گیا۔ اس نے جواباً تبارک کے منہ پر تھوکا۔ ''باسٹرڈ...... باسٹرڈ۔'' وہ چلایا۔

پھر اس نے دو قدم پیچھے ہٹ کر اپنے سروس پسٹل کی چار گولیاں تبارک کے سر اور سینے میں اتار دیں۔ الٹا لٹکا ہوا کیپٹن تبارک کا جسم تین چار بار اچھلا اور پھر ذرا سے اینٹھ کر ساکت ہو گیا۔ اس کے بچے کھچے خون کی دھاریں سرسبز گھاس کو بھگونے لگی تھیں۔

ہم نے جی جان سے جینا ہے، اور سینہ تان کے جینا ہے

ہم جاتے اندھیرے تک لڑیں گے، اور سچے سویرے تک لڑیں گے
اور اگر ہم واپس نہ آسکے
تو ہمارے بچوں سے کہنا، ہم سرخرو ہوئے

...... ابھی تھوڑی دیر پہلے لونگ نے تبارک کی موت کے حوالے سے ایک دو گھنٹے کی بات کی تھی لیکن ایک دو منٹ بعد ہی وہ زندگی کی سرحد پار کر گیا تھا۔ اس نے ٹھیک ہی کہا تھا، موت کا وقت مقرر ہے۔

میں غم و اندوہ کی شدت سے جیسے چیخ کر رہ گیا اور شدید اضطرابی کیفیت میں چلایا۔ ''دیکھو لونگ اتنا ظلم کرو جتنا سہہ سکو۔ تمہیں بھگتنا پڑے گا...... بھگتنا پڑے گا......''

لونگ نے بھنا کر پستول میری طرف سیدھا کیا...... اور باقی کی چار گولیاں مجھ پر داغ دیں۔ دھماکوں سے فضا لرز اٹھی۔ یہ گولیاں میرے سر کے بالوں اور چہرے کے آس پاس سے گزریں اور خیمے کی دہری پرت میں سوراخ کرتی ہوئی نکل گئیں۔ ظاہر ہے کہ آفیسر لونگ کا نشانہ اتنا کچا نہیں تھا۔ وہ فی الحال مجھے صرف دہشت زدہ کرنا چاہتا تھا۔

باہر سے آنے والی آوازوں سے پتا چلتا تھا کہ پورے ٹاپو پر قسطینا، ابراہیم اور کمانڈر فارس وغیرہ کی تلاش جاری ہے۔ اب لونگ کی قہرناک نگاہیں سیف پر مرکوز تھیں۔

جیسے کسی بہت سنسنی خیز میچ میں پھنسی ہوئی ٹیم کا بیٹسمین آؤٹ ہوتا ہے تو اگلے بیٹسمین کے سینے میں دھڑکن کے گولے پھٹنے لگتے ہیں کیونکہ اب اسے گراؤنڈ میں اور پچ پر جانا ہوتا ہے۔ کچھ یہی کیفیت شاید سیف بھی محسوس کر رہا تھا۔ اسے اب تفتیش کے میدان میں بدترین ٹارچر کی پچ پر جانا تھا۔

میرے سخت احتجاج کے باوجود قریباً پندرہ منٹ بعد کیپٹن تبارک کی جگہ سیف درخت سے الٹا لٹکا تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ اسے دونوں ٹانگوں سے باندھ کر لٹکایا گیا تھا...... اور اس کے ہاتھ پشت پر ہتھکڑی میں جکڑے ہوئے

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

تھے۔ سیف انگلش نہیں بول سکتا تھا لہٰذا تفتیش میں مدد دینے کے لیے ایک اردو بولنے والا بھی موجود تھا۔ یہ گرے فورس کا ایک انڈین اردلی تھا۔ لونگ نے سیف سے بھی وہی سوال کیا جو کچھ دیر پہلے تبارک سے کیا جاتا رہا تھا۔ اس کے بعد اس پر تشدد کا سلسلہ شروع ہوا۔ اس پر بے تحاشا بیلٹس برسائی گئیں پھر اس کے گوشت کو پلاس کی مدد سے نوچا جانے لگا۔ یہ اتنا تکلیف دہ عمل تھا کہ سیف کی کربناک آہ و بکا دور دور تک گونجنے لگی۔

میں نے آنکھیں بند کرلی تھیں مگر کان تو کھلے تھے اور کانوں میں انگلیاں میں اس لیے نہیں ٹھونس سکتا تھا کہ ہاتھ پشت پر جکڑے ہوئے تھے۔ یہ آوازیں سننے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں تھا۔

دیکھتے ہی دیکھتے حالات نے کس بری طرح ہمیں جکڑا تھا۔ لانچ کو کنارے سے ہٹائے جانے کا فیصلہ قسطینا نے سب کے مشورے سے کیا تھا...... مگر شاید یہ فیصلہ اتنا درست نہیں تھا یا شاید فیصلہ تو درست تھا مگر قسطینا کو یہ توقع نہیں تھی کہ تلاش کرنے والے اتنی جلدی اس ٹاپو پر بھی چلے آئیں گے۔ تبارک اور بن مشہد لانچ کو یہاں سے روانہ کرنے کے لیے نکلے تھے اور نتیجہ یہ ہوا تھا کہ تبارک حادثاتی طور پر کھائی میں گر گیا۔ تبارک کا باہر رہنا شدید خطرے کی علامت تھا۔ اسے بے پناہ اذیت سے نکالنے اور واپس پناہ گاہ میں لانے کے لیے میں باہر آیا تھا...... اور میرے پیچھے سیف نے باہر آنے کی غلطی کی...... اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ بھی سراسر حالات کی کارفرمائی تھی۔ جب ہم زخمی تبارک کو لے کر پناہ گاہ کی طرف جانے والے تھے یہ لوگ ہماری موجودگی سے آگاہ ہوگئے تھے اور اب یہاں کیل کانٹے سے لیس بے شمار گرے فوجی اور ایجنسی کے گارڈز جمع ہوچکے تھے۔ کوسٹل گارڈز نے ٹاپو کو گھیر لیا تھا۔ اس صورتِ حال میں قسطینا اور باقی ساتھیوں کی دانشمندی ہی تھی کہ انہوں نے باہر آنے کی غلطی نہیں کی تھی۔ یقیناً انہوں نے اپنے واکی ٹاکی بھی بند کردیے تھے اور مکمل خاموشی اختیار کرلی تھی۔

دوپہر تک سیف تقریباً نیم جان ہوچکا تھا اس کا پسینا اور خون دھاروں کی صورت گر رہا تھا اور بالائی دھڑ پر بے شمار گہرے نیل اور چھوٹے بڑے زخم تھے۔ ایک حد تک جا کر انسان کی اذیت بھی اس کا ساتھ چھوڑنے لگتی ہے مگر تشدد کرنے والے اذیت کی حس کو برقرار رکھنے کے لیے نت نئے طریقے ڈھونڈ لیتے ہیں۔ سیف کے زخموں پر محاورتاً نہیں بلکہ حقیقتاً نمک چھڑکا گیا...... اور پلاس سے جسم کے مختلف حصوں کو نوچا گیا۔ ایک دو مرحلے پر مجھے محسوس ہوا کہ اس کی قوتِ برداشت جواب دے جائے گی اور وہ کچھ نہ کچھ بول دے گا۔ ایسے ہی ایک مرحلے پر میں نے وحشیانہ خصوصیات رکھنے والے لونگ کو اپنی طرف متوجہ کرلیا۔ میں نے اس سے کہا کہ میں اسے کچھ بتانا چاہتا ہوں۔

''شرط یہ ہے کہ جھوٹ نہیں بولو گے۔'' وہ زہریلے ناگ کی طرح پھنکارا۔

میں نے اثبات میں سرہلایا۔

''اور وقت گزارنے کی کوشش بھی نہیں کرو گے۔''

میں نے پھر اثبات میں سرہلایا۔ حالانکہ دونوں مرتبہ میں نے غلط سرہلایا تھا۔

''کہاں ہے بھگوڑی، اور باقی بھگوڑے؟'' لونگ نے میرے سامنے بیٹھتے ہوئے کہا۔ اس کی شکل ہی نہیں، اس کی ساری خو بو بھیڑیے والی تھی۔ بھیڑیا جو شکار کو زندہ ہی نوچ لیتا ہے۔

میں نے کہا۔ ''سیف ٹھیک بتا رہا ہے۔ وہ لوگ دوسری لانچ پر یہاں سے نکل گئے ہیں۔''

''کہاں گئے ہیں؟''

''برونائی کی طرف۔''

اس نے میرے منہ پر زناٹے کا تھپڑ مارا۔ ''بکواس کرتے ہو تم۔ سارے راستوں کی نگرانی ہو رہی ہے۔ آبی مخلوق کے علاوہ ہر چیز کو چیک کیا جا رہا ہے۔'' وہ پھنکارا۔

میرے منہ میں خون کا نمکین ذائقہ گھل گیا تھا۔

اس کے ساتھ ہی وہ باہر نکلا اور ایک بار پھر سیف پر پل پڑا۔ اس کے ماتحت بھی اس کا ساتھ دینے لگے۔ مار تو سیف کو جا رہا تھا مگر اذیت کی انتہا کو میں چھو رہا تھا۔ وہ میرے لیے یہاں تھا۔ غلط تھا یا صحیح تھا مگر اس کے یہاں ہونے کی وجہ میں تھا۔ ڈھائی تین بجے کے لگ بھگ سیف بے ہوش ہوگیا۔ کبڈی کے میدان کا نامور گبرو کھلاڑی کسی چیتھڑے کی طرح درخت سے الٹا لٹک رہا تھا۔ اب وہ لوگ اسے مزید اذیت نہیں دے سکتے تھے اس لیے اسے نیچے اتار کر کچھ طبی امداد دی گئی۔

کچھ دیر بعد وہ ہوش میں تو آ گیا لیکن نیم جان تھا۔ دو گرے فوجی اس کی بغلوں کے نیچے گھس گئے اور اسے کھینچتے ہوئے خیمے کے اندر لے آئے۔ وہی نیلی آنکھوں والا امریکی آفیسر اندر داخل ہوا جس نے مجھے مخلصانہ مشورہ دیا تھا کہ لونگ کے ہتھے چڑھنے سے پہلے ہم اپنے ساتھیوں کے بارے میں بتا دیں۔ نیلی آنکھوں والے کا نام پال کورنی

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

معلوم ہوا۔ اس کی ہدایت پر ایک گرے فوجی نے میرے دونوں پاؤں کو باندھنے والی کیبل ٹائی کھول دی اور اس کی جگہ ایک بیڑی پہنا دی۔ اس کے بعد میرے ہاتھ پشت پر سے کھولے گئے اور آگے کی طرف بیڑی کے دوسرے سرے سے لگی ہتھکڑی میں لاک کر دیے گئے۔ یہ بیڑی لگنے کے بعد میرے ہاتھ آگے کی طرف تو ہو گئے تھے مگر پوزیشن یہ ہو گئی تھی کہ اب میں سیدھا کھڑا نہیں ہو سکتا تھا۔ اگر مجھے چلنا بھی ہوتا تو چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا ہوا رکوع کی حالت میں ہی چل سکتا تھا۔ بدنام زمانہ کیمپ گوانتانامو میں بھی عراق جنگ کے قیدیوں کو ایسے ہی چلتے پھرتے دکھایا جاتا تھا۔ ایسی ہی بیڑی سیف کو بھی پہنا دی گئی جو خیمے کے ''میٹ'' پر پشت کے بل بے سدھ لیٹا تھا۔ اس کارروائی کے دوران میں دو رائفلیں ایک لحظے کے لیے بھی میری جانب سے نہیں ہٹی تھیں۔ دونوں رائفل مین بالکل ریڈ الرٹ رہے تھے۔ نیلی آنکھوں والا پال میرے قریب آیا اور بولا۔ ''میری سفارش پر تم دونوں کو چند گھنٹے کی مہلت دی جا رہی ہے، اپنا اچھا برا ٹھیک طرح سوچ لو۔ بہت بری موت سے بچنا چاہتے ہو تو منہ کھول دو۔ اس کے علاوہ کوئی راستہ نہیں ہے تم دونوں کے پاس۔''

''مشورے کا شکریہ۔''

''میری یہ باتیں چند گھنٹے بعد بہت یاد آئیں گی تمہیں۔ اول تو لونگ تم دونوں کو اتنی آسانی سے مرنے نہیں دے گا اور اگر مر بھی گئے تو جان مفت میں جائے گی تمہاری۔ آدم کی بیٹی اور اس کے ساتھیوں کو ہر صورت ہم اب ڈھونڈ ہی لیں گے۔ لہٰذا ایک بار پھر مشورہ ہے بہت گندی موت سے بچ جاؤ۔''

میرے کچھ بولنے سے پہلے ہی اس نے چٹکی بجائی اور اپنے ماتحت سے کہا کہ ہم دونوں کی چوٹوں کو میڈیکلی ٹریٹ کیا جائے اور ہمیں کھانے کے لیے کچھ دیا جائے۔

سیف کی حالت دیکھ دیکھ کر میرا دل رو رہا تھا۔ وہ نیم بے ہوشی میں کراہتا چلا جا رہا تھا۔ کسی وقت کچھ بڑبڑانے لگتا تھا۔ الفاظ سمجھ میں نہیں آ رہے تھے۔ میں نے اس کا سر اونچا کر کے اسے تھوڑا سا پانی پلایا۔ اسی دوران میں ایک آرمی ڈاکٹر اپنے اسسٹنٹ کے ساتھ آن وارد ہوا۔ سیف کے جسم پر زخم تو ان گنت تھے لیکن کچھ زخم ایسے تھے جن سے مسلسل خون رس رہا تھا۔ اس اخراج کو روکنے کے لیے ملائیشین ڈاکٹر نے میڈیکل ٹیپ کے ذریعے آٹھ دس پٹیاں سیف کے جسم سے چپکا دیں۔ میرے ایک دو زخموں کو بھی مرہم پٹی سے نوازنے کی کوشش کی گئی لیکن میں نے انکار کر دیا۔ ''اس کی وجہ؟'' ڈاکٹر نے طنزیہ لہجے میں پوچھا۔

''ابھی اور بہت سے زخم لگنے ہیں کہاں کہاں مرہم رکھو گے۔ رہنے دو یہ ناٹک۔'' میرا لہجہ بھی طنزیہ تھا۔

ہمارے اس جہازی سائز خیمے کے گرد اتنا کڑا پہرا تھا کہ چڑیا بھی پر نہیں مار سکتی تھی۔ ہمارے تفتیشی افسر لونگ کو کسی ضروری کام سے جاماجی جانا پڑ گیا تھا۔ اسے چار پانچ گھنٹے تک واپس آ جانا تھا اور یہی چار پانچ گھنٹے ہمیں سوچ بچار کے لیے بھی دیے گئے تھے۔ میں اچھی طرح جانتا تھا کہ اس وقفے کے بعد مجھ پر اور سیف پر ہونے والا تشدد مزید بہیمانہ ہو جائے گا۔ میرا دل گواہی دینے لگا تھا کہ اب سیف شاید زیادہ دیر برداشت نہ کر سکے گا۔ وہ مسلسل بڑبڑا رہا تھا۔ جو چند الفاظ میری سمجھ میں آئے ان سے اندازہ ہوا کہ وہ اذیت کی انتہا کو چھو رہا ہے۔

اس کے الفاظ کچھ اس طرح کے تھے...... مجھے مار دو...... جلدی مار دو...... میں کچھ بولنا نہیں چاہتا...... میں کیا بولوں...... میں کیا کہوں......''

یہ بے ربط الفاظ تھے مگر ان کے اندر ایک ناقابل بیان کرب چھپا تھا۔ میری آنکھوں میں شاید ہی کبھی نمی آئی ہو لیکن ان لمحوں میں آ گئی۔ اپنے سیلانی پن اور جذباتی رویّے کی وجہ سے وہ ہنستا کھیلتا اپنے سکھیرا گاؤں سے نکلا تھا اور یہاں موت کے شکنجے میں جکڑ گیا تھا۔ میں نے اس کے خون آلود بالوں پر ہاتھ پھیرا۔ ''تمہیں کس نے کہا تھا سیف کہ میرے پیچھے آؤ۔ تم نے اپنی جان کو اتنی بڑی مصیبت میں کیوں ڈالا؟''

اس نے مچی مچی آنکھوں سے میری طرف دیکھا، جیسے میرا فقرہ سمجھنے کی کوشش کر رہا ہو۔ پھر آنکھیں بند کر لیں۔ آنکھوں کے گوشوں سے دو موتی اس کی کنپٹیوں کی طرف رینگ گئے۔

میں نے اب تک کی زندگی میں کئی برے وقت دیکھے تھے، لیکن یہ شکنجہ بے حد سخت اور بے رحم تھا۔ میں تو شاید اس شکنجے کی سختی کو کسی نہ کسی طرح جھیل لیتا اور آخری سانس تک اپنی زبان بند رکھتا لیکن میں نے محسوس کر لیا تھا کہ سیف ایسا نہیں کر سکے گا اور وہ ایسا نہ کر سکا تو جو کچھ ہونا تھا، اس کا تصور بھی جانکاہ تھا۔ قسطینا، ابراہیم اور کمانڈر فارس وغیرہ کو بدترین موت کے گھیرے میں آ جانا تھا اور سب سے بڑھ کر زینب' عقابوں میں گھری ہوئی چڑیا، میں نے جس سے وعدہ کر رکھا تھا کہ اپنی زندگی میں اس پر کوئی آنچ نہ آنے دوں

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

گا، میں نے تصور کی نگاہ سے اس معصوم چڑیا کو لونگ جیسے بے رحم عقابوں کے پنجے میں دیکھا اور سر تا پا پسینے میں ڈوب گیا۔

بن مشہد نے شاید ٹھیک ہی کہا تھا کہ ہمارے دشمن برسوں بھی سر پٹختے رہیں تو اس بے مثال پناہ گاہ کا کھوج نہیں لگا سکتے۔ لیکن یہ بے مثال پناہ گاہ میرے یا سیف کے منہ سے ادا ہونے والے ایک دو لفظوں سے بدترین قتل گاہ بن سکتی تھی۔ میں کھوئی کھوئی نظروں سے سیف کی طرف دیکھتا رہا۔ گھڑی کی سوئیاں بڑی تیزی سے ہماری مہلت کو ختم کر رہی تھیں۔ دور دور تک امید کی کوئی کرن نہیں تھی......

بالآخر میں ایک فیصلے پر پہنچ گیا۔ یہ بے حد سخت فیصلہ تھا مگر یہی فیصلہ سیف کے لیے بہتر تھا اور ہم سب کے لیے بھی۔ میں نے اپنے سینے پر کوہ ہمالیہ سے بھی بڑا وزن رکھ کر سیف کو اس اذیت سے چھٹکارا دلانے کا فیصلہ کر لیا۔ ہاں اس کے سوا اب کوئی چارہ نہیں تھا۔ میں نے اور میری چھٹی حس نے بہت کچھ اچھی طرح پرکھ لیا تھا۔

شام گہری ہو رہی تھی۔ اس ویران ٹاپو پر ہر طرف روشنیاں جھلکنے لگیں اور وزنی بوٹوں کی دھمک سے نشیب و فراز لرزنے لگے۔ سمندر یہاں سے بس سو ڈیڑھ سو میٹر ہی دور تھا۔ اسپیڈ بوٹس اور لانچیں مسلسل آ جا رہی تھیں۔ ایسی ہی کسی اسپیڈ بوٹ یا لانچ پر درندہ صفت لونگ بھی یہاں واپس پہنچنے والا تھا اور ہم دونوں کو پھر زندگی اور موت کے درمیان لٹکانے والا تھا۔

میں نے کوشش کر کے سیف کو ایک بڑے کشن کے سہارے نیم دراز کر دیا۔ ''کچھ کھاؤ گے سیفی؟'' میں نے نرمی سے پوچھا۔

اس نے نفی میں سر ہلایا۔

''تھوڑا سا دودھ پی لو۔'' میں نے کہا۔ اس نے پھر انکار کیا۔ ''بہت درد ہو رہا ہے نا؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں استاد صاحب!'' وہ بمشکل بول پایا۔ اس کا گلا اور سینہ اندر سے زخمی تھا۔

''آرام آ جائے گا۔ میں دودھ میں دوا ڈال رہا ہوں۔''

''یہ...... یہ ہمیں...... مار کیوں نہیں دیتے؟'' وہ بڑے کرب سے بولا۔

''مارنے میں ان کا نقصان ہے۔'' میں نے اس کے خون آلود بالوں کو پیشانی سے ہٹایا۔

پہریدار خیمے سے کچھ فاصلے پر چلے گئے تھے اور یہ نیلی آنکھوں والے پال کے حکم سے ہی ہوا تھا۔ شاید وہ چاہتا تھا کہ ہم دونوں یکسوئی سے گفتگو کر سکیں۔ کھانے پینے کا وافر سامان ہمارے اردگرد رکھا ہوا تھا۔ اس میں ڈبا بند خوراک، مچھلی اور جوسز وغیرہ شامل تھے۔ میں نے ایک ڈبے میں سے دودھ ایک کپ میں انڈیلا۔ میری قمیص کے ایک کف کی سلائی کے اندر وہ تھوڑا سا زہر موجود تھا جو جاناں سے برآمد ہوا تھا...... آرسنک نامی یہ زہر میں نے ایک انچ کے ایک کاغذ میں تہ کر کے اپنے کف کے اندر کسی نازک ترین وقت کے لیے چھپا رکھا تھا اور یہ نازک ترین وقت تھا۔ میں نے انگوٹھے کی مدد سے قمیص کے کف کی یہ کچی سلائی ادھیڑی اور کاغذ کی تہ کھول کر زرد سفوف دودھ میں انڈیل دیا۔ سیف بے چارے میں دیکھنے کی سکت کہاں تھی۔ ایجنسی کے گارڈ بھی فاصلے پر تھے۔ کسی کو بھنک نہیں پڑی۔

کہنے والے کہہ سکتے ہیں کہ وہ میرا رقیب تھا۔ کہنے والے کہہ سکتے ہیں کہ میں ایک تیر سے دو شکار کرنا چاہتا تھا۔ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ میرے لاشعور میں موجود تھا کہ سیف میرے راستے سے ہٹ جائے لیکن میں جانتا ہوں اور پورے یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ فیصلہ میری زندگی کا دردناک ترین فیصلہ تھا...... اور میں جانتا تھا کہ نیچے چھپی ہوئی زینب اور دیگر لوگوں کو بچانے کے لیے اور کوئی راستہ نہیں رہا۔

یہ وہ زہر تھا جو جاناں کی انگوٹھی میں تھا اور اس نے اپنی جان لینے کے لیے رکھا ہوا تھا۔ جیسے دانے دانے پر مہر ہوتی ہے شاید زہر زہر پر بھی ہوتی ہے۔ میں نے بائیں ہاتھ سے سیف کا سر کشن پر تھوڑا سا اٹھایا۔ اس کی ناک کی ہڈی شاید ٹوٹ چکی تھی۔ آنکھیں سوجتی جا رہی تھیں۔ میں نے پیار سے کہا۔ ''لو سیفی، پی لو۔''

اس نے نیم وا آنکھوں سے میری طرف دیکھا۔ جیسے خاموشی کی زبان میں کہہ رہا ہو...... آپ کے ہاتھوں تو زہر بھی پی سکتا ہوں...... اس نے دو گھونٹ لیے پھر رک گیا۔ بھرائی ہوئی کربناک آواز میں بولا۔ ''آپ...... مجھ سے...... ناراض تو نہیں؟''

میں نے نفی میں سر ہلایا۔

وہ ایک نادان جوشیلے بچے کی طرح پناہ گاہ سے نکل کر میرے پیچھے چلا آیا تھا۔ غلطی تو بڑی نہیں تھی لیکن کبھی کبھی چھوٹی غلطی کی بڑی سزا جھیلنا پڑتی ہے۔ چند گھونٹ میں وہ باقی کا دودھ بھی پی گیا۔ میں نے اس کا سر دوبارہ کشن نما تکیے پر ٹکا دیا اور چوڑی پیشانی پر بوسہ دیا۔ دودھ والے کپ کو

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

میں نے پانی سے کھنگال دیا۔

دو تین منٹ بعد ہی سیف کی حالت بگڑنا شروع ہو گئی۔ وہ سینہ مسلنے لگا اور بری طرح کراہنے لگا۔ گرے سپاہیوں نے اسے تڑپتے مچلتے دیکھ لیا۔ وہ اس کی طرف لپکے۔ لونگ بھی، انڈین مترجم سمیت بھاگا ہوا آیا۔ وہ اسے مرتا کیسے دیکھ سکتا تھا۔ اس نے سیف کے سر کے خون آلود بالوں کو پکڑا اور اس کا چہرہ اونچا کیا۔ یہی وقت تھا جب سیف نے ابکائی لی اور خونی الٹی کر دی۔

''کیا ہوا ہے اسے؟'' لونگ دہاڑا۔ پھر خیمے کے دروازے کی طرف منہ کر کے پکارا۔ ''ڈاکٹر کو بلاؤ، جلدی کرو......اس کو مرنا نہیں چاہیے۔''

وہ رنگ رنگیلا پنجابی گبرو تھا، محبت سے بھرا ہوا، زندگی کے سارے رنگوں سے لبریز۔ اس کے ماں باپ اس کے سر پر سہرا سجانے کے سپنے دیکھ رہے تھے اور وہ یہاں، سکھیرا گاؤں سے ہزاروں میل دور اس خیمے میں دم توڑ رہا تھا۔ امریکی ڈاکٹر اپنے لوازمات کے ساتھ بھاگا ہوا پہنچ گیا لیکن تب تک سیف کے سانس پورے ہو چکے تھے۔ میرا ہاتھ اس نے اپنے ہاتھ کی مضبوط گرفت میں لے رکھا تھا۔ وہ کبڈی شاہ تھا۔ بے مثال گرفت رکھتا تھا لیکن آج وہ میری کلائی پر اور اپنی زندگی پر گرفت برقرار نہ رکھ سکا......گرفت ختم ہو گئی......وہ مر گیا۔

☆☆☆

رات گزر چکی تھی، یہ اگلا دن تھا۔ سورج چمک رہا تھا۔ میرے اردگرد بہت سی آوازیں تھیں۔ میں اسی درخت سے الٹا جھول رہا تھا جس سے پہلے کیپٹن تبارک جھولا تھا اور پھر سیفی۔ دونوں مر گئے تھے اور اب یقیناً میری باری تھی۔ لونگ نے صبح سویرے مجھے اسی بے دردی سے پٹوایا تھا جس سے تبارک اور سیفی کو پٹوایا گیا تھا۔ موٹے بکلز والی بیلٹس کے ذریعے یہ بڑی ظالمانہ مار تھی۔ میرے جسم پر صرف پتلون تھی اور کھال جگہ جگہ سے ادھڑ چکی تھی۔ میرے خون کے قطرے بھی اسی جگہ گر رہے تھے جہاں پہلے تبارک اور سیفی کے گرے تھے۔

مارنے والوں کا سوال ایک ہی تھا۔ ''تمہارے باقی ساتھی کہاں ہیں؟''

میرا جواب بھی ایک ہی تھا۔ ''وہ دوسری لانچ پر یہاں سے جا چکے ہیں۔ مجھے ٹھیک سے کچھ پتا نہیں۔''

جب جب یہ جواب میں نے دیا تھا۔ میرے جسم کو بدترین اذیت سہنا پڑی تھی اور میرے زخموں اور اندرونی چوٹوں میں اضافہ ہوا تھا۔ مجھے کچھ معلوم نہیں تھا کہ ان لوگوں نے کیپٹن ڈاکٹر تبارک اور سیفی کی لاشوں کے ساتھ کیا کیا ہے۔ نہ ہی یہ پتا تھا کہ وہ اب تک سیفی کی فوری موت کا سبب جان سکے ہیں یا نہیں۔ دراصل ان لوگوں کے پاس اتنا وقت ہی نہیں تھا کہ باریک بینی کے ساتھ کچھ دیکھ سکتے۔ وہ تو بس جلد از جلد کوئی نتیجہ نکالنا چاہتے تھے۔ ہمیں تشدد کی چکی میں پیس کر وہ راز اگلوانا چاہتے تھے جو وہ اپنے طور پر کسی بھی طرح جاننے کے قابل نہیں تھے ہاں ایک بات تھی۔ مجھ سے مار پیٹ کے دوران میں ایک مرتبہ بڑی اچھی طرح میری پتلون کی تلاشی لی گئی تھی۔ میں نے دھندلائے ہوئے ذہن کے ساتھ سوچا تھا کہ شاید انہیں سیفی کی موت کے سلسلے میں کسی طرح کی زہر خورانی کا شک ہوا ہے۔

مجھے اذیت سہنا آتا تھا۔ میں MMA کا یورپی چیمپئن تھا۔ میں نے خونخوار فائٹرز کے حملے سہے تھے اور خود کو اپنے قدموں پر کھڑا رکھا تھا۔ اذیت سہنا اور جوابی وار کرنا میری فطرت کا حصہ بن چکا تھا۔ فی الوقت میں جوابی وار کے قابل تو نہیں تھا لیکن میری قوتِ برداشت نے میرے جلادوں کو انگشت بدنداں کر دیا تھا۔ میں اپنے جسم کو جیسے اپنے ذہن سے بہت دور لے گیا تھا۔

میں اور میرا مرحوم دوست مامون، جمنازیم میں سخت ترین تربیتی سیشن کیا کرتے تھے۔ ماضی کی صدائیں میرے کانوں میں گونج رہی تھیں۔ میں کہتا۔ ''مامون! مجھے خوب مارو بس چہرے پر کوئی زخم نہ آئے۔''

''ہڈی چاہے ٹوٹ جائے؟''

''توڑ سکتے ہو تو توڑ دو۔''

وہ مجھے بے دریغ پیٹنے لگتا۔ میں صرف دفاع کرتا۔ وہ ہانپ جاتا۔ کچھ دیر بعد میں اسے مارتا اور وہ صرف دفاع کرتا۔ چوٹیں مزہ دینے لگتیں......اذیت ایک نشے کی طرح محسوس ہوتی۔ ایسا نشہ جس میں جوابی وار کی خواہش ایک آگ کی طرح دہکتی۔ وہی تربیتی سیشن تھے جنہوں نے مجھے یورپ کے ایم ایم اے دنگلوں کا سخت ترین حریف بنایا تھا۔ اب پچھلے کئی گھنٹے سے ایک ایسا ہی سیشن چل رہا تھا۔ مگر یہ تربیتی نہیں تھا۔ یہ جان نکال دینے والا سیشن تھا۔ اس میں احتیاط بس ایک ہی کی جا رہی تھی کہ جس کی جان نکالی جا رہی ہے اس کی جان کہیں سچ مچ نکل ہی نہ جائے۔

میرے زخموں میں نمک بھرا گیا تھا اور الکحل اچھالی گئی تھی۔ میری سانس روکی گئی تھی اور میرے جسم کے نازک حصوں پر ضربات لگائی گئی تھیں۔

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

کچھ دیر کے لیے میں شاید ہوش وحواس سے بیگانہ بھی ہو گیا تھا۔ شاید اسی لیے اب مجھے تھوڑا سا وقفہ دیا گیا تھا مگر میں بدستور لٹک رہا تھا۔

میں اچھی طرح جانتا تھا، جب تک میں اپنی زبان بند رکھوں گا تب تک میرے ساتھی محفوظ رہیں گے...... اور وہ ڈرا سہما جوڑا بھی جو ہر مصیبت کے وقت صرف اور صرف میری طرف دیکھتا تھا۔ زینب اور ابراہیم...... کسی وقت تو وہ مجھے ڈرے سہمے بچوں کی طرح لگتے تھے۔ جدائی اور موت کے اندیشوں میں گھرے ہوئے، ان کے نزدیک میں وہ سب کچھ کرسکتا تھا جو کرنا چاہتا تھا۔ وہ غیر شعوری طور پر مجھ پر بے حد بھروسا کرنے لگے تھے، آج بہت سی دوسری باتوں کے ساتھ ساتھ یہ ''بھروسا'' بھی کڑے امتحان سے دوچار تھا۔

میں نے پلکیں جھپکائیں تو آنکھوں میں جمع ہوجانے والے خون کے سبب چپچپاہٹ کا احساس ہوا۔ دھوپ بھی سرخ نظر آئی۔ میں نے تصور ہی تصور میں زینب اور ابراہیم کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''تم دونوں کی محبت میری آواز کو خاموش رکھے گی۔ آخری دھڑکن اور آخری سانس تک...... اور مجھے امید ہے کہ تم بچ جاؤ گے پھر گرما کی کسی سہانی شام کو یا چاندنی رات کو تم اپنی پناہ گاہ سے باہر نکلو گے اور ایک محفوظ زندگی کو اپنے سامنے جگمگاتا ہوا پاؤ گے۔

میری نگاہوں میں ابراہیم کا چہرہ گھومنے لگا۔ اس سے آخری ملاقات یاد آئی۔ اس نے اپنے ''عارضے'' سے ایک دلیرانہ لڑائی شروع کردی تھی۔ وہ زہر کی ڈوز کم کررہا تھا اور اپنی تکلیف سے دیوانہ وار لڑ رہا تھا۔ پتا نہیں کہ اب اس کی حالت کیسی تھی پھر مجھے سجاول کا خیال آیا۔ مجھے اس کی طرف سے اندیشہ تھا۔ وہ ایک جوشیلا اور سرکش شخص تھا۔ وہ دوستی کا حق ادا کرنے کے لیے باہر نکلنے کی کوشش کرسکتا تھا لیکن اس کی ذہانت بھی ہر شبہے سے بالاتر تھی۔ یقیناً پرسوں رات آخری پہر ہونے والی تابڑتوڑ فائرنگ سے ہی ان سب لوگوں کو پتا چل گیا ہوگا کہ باہر بہت زیادہ نفری اور مزاحمت موجود ہے۔ عین ممکن تھا کہ ٹی وی کی نیوز سے بھی انہیں کچھ نہ کچھ اندازہ ہو گیا ہو۔

امریکن ڈاکٹر میرے پاس آیا۔ اسی ''لٹکی ہوئی حالت'' میں اس نے میرا طبی معائنہ کیا اور تیکھے لہجے میں بولا۔ ''گڈ، تم مزید تشدد کے لیے اب بالکل فٹ ہو۔''

پھر اس نے رخ پھیر کر لونگ کے ایک حبشی ماتحت کو آواز دی۔ ''آجاؤ دوستو! چیمپ فٹ ہے۔''

یہ ''سیشن'' پہلے سے زیادہ سخت تھا۔ اس مرتبہ بھیڑیا صفت لونگ نے پلاس کا استعمال بھی کیا۔ میرے جسم کو کئی جگہ سے نوچا گیا اور بے دردی سے مسلا گیا۔ میں اب بلند آواز سے کراہ رہا تھا۔ ضبط کے بند دیر ہوئی ٹوٹ گئے تھے۔ میرے انگوٹھے کے ناخن کو اس بے رحمی سے اکھاڑا گیا کہ گوشت کا ایک ٹکڑا بھی ساتھ ہی اتر گیا۔ اس کے بعد بائیں ہاتھ کی ایک انگلی کے ساتھ بھی یہی سلوک کیا گیا۔

''مرہم لگاؤ اِس کے زخموں پر۔'' لونگ کی بھاری آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔

یہ مرہم دراصل تیز ترین شراب 69 کی شکل میں تھا۔ اس میں الکحل کی مقدار بہت زیادہ ہوتی ہے۔ اسے میرے پورے جسم پر انڈیل دیا گیا۔ اسپرٹ نے جیسے میرے پورے جسم پر دہکے ہوئے خنجر چلا دیے۔ تکلیف برداشت سے باہر ہوگئی، میرا جسم کئی بار مچلا...... اور پھر ذہن تاریکی میں ڈوبتا چلا گیا۔

پتا نہیں کہ کتنی دیر بعد حواس کچھ بحال ہونا شروع ہوئے۔ اردگرد کی آوازیں جیسے ہزاروں میل دور سے میرے کانوں تک پہنچ رہی تھیں۔ اس نیم بے ہوشی اور غشی کی سی کیفیت میں میرے تصور نے مجھے چند مناظر دکھائے۔ ایسے تصوراتی مناظر عموماً عجیب اور بے ربط ہی ہوا کرتے ہیں۔

میں نے دیکھا میرے اردگرد بہت سے بھیڑیے ہیں۔ موٹے کلّے، چھوٹی آنکھیں اور دہشت ناک آوازیں۔ لیکن ان کی تھوتھنیوں کی جگہ بڑے بڑے پلاس ہیں۔ وہ ان پلاسوں کی مدد سے مجھے نوچ رہے ہیں۔ پھر کسی شیر کی دہاڑ سنائی دیتی ہے وہ سب مجھ سے دور چلے جاتے ہیں۔ سامنے ڈھلوان والے جنگل میں چھپ جاتے ہیں......

کچھ دیر بعد میرے تصور کی نگاہ نے مجھے تاجور کی جھلک دکھائی۔ وہ میری طرف آرہی تھی۔ اس کے پیچھے پہلوان حشمت تھا۔ وہ دونوں دیہاتی لباس میں میری طرف بھاگے آرہے تھے۔ مجھے اس درخت سے اتارنا چاہتے تھے...... لیکن جب تاجور میرے پاس پہنچی تو ایک دم اس نے اپنا دوپٹا ناک پر رکھ لیا۔

میں نے پوچھا۔ ''کیا ہوا تاجور؟''

''آپ سے شراب کی بُو آرہی ہے۔ آپ تو شراب میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ میں آپ کے پاس نہیں آسکتی۔'' وہ وہیں رک جاتی ہے۔ ہانپا ہوا پہلوان حشمت بھی وہیں رک جاتا ہے۔

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

''ہاں......تم سے بُو آوت ہے۔ میں جانت ہوں تم وِسکی میں ڈوبے ہو۔'' وہ وہیں اپنی جگہ ساکت ہوتے ہیں۔ میں الٹا لٹکا دیکھتا رہتا ہوں۔ میرے پورے جسم کو انگارے جلا رہے ہیں۔

''میں آپ کے پاس نہیں آسکتی شاہ زیب۔'' وہ مصمّم ارادے سے کہتی ہے اور پہلوان حشمت کو اپنے ساتھ لے کر واپس مڑتی ہے۔

وہ ڈھلوانی جنگل کی طرف جا رہی ہے......اور وہاں وہ بھیڑیے چھپے ہوئے ہیں جن کی تھوتھنیوں کی جگہ خون آلود پلاس ہیں، بڑے بڑے پلاس۔

میں پکارتا ہوں۔ ''رک جاؤ تاجور، اُدھر نہ جاؤ۔ وہ ماردیں گے......وہ نوچ لیں گے۔''

وہ نہیں سنتی۔ پہلوان حشمت بھی نہیں سنتا۔ دونوں بڑھتے جاتے ہیں۔

''میری بات سنو تاجور! وہاں بہت خطرہ ہے۔ رک جاؤ...... واپس آجاؤ...... اچھا میں تم سے وعدہ کرتا ہوں۔ میں اب یہ نہیں پیوں گا، مجھ سے کبھی بُو نہیں آئے گی۔ میں تم سے وعدہ کرتا ہوں۔ تم رک جاؤ...... واپس آجاؤ۔''

وہ مڑتی ہے۔ ہوا اس کی لٹوں کو اُڑاتی ہے۔ وہ ہولے سے مسکراتی ہے اور اوجھل ہو جاتی ہے۔ پہلوان حشمت بھی اوجھل ہو جاتا ہے......میرے چہرے پر سرد پانی کے چھینٹے مارے جا رہے تھے۔ مجھے لگا...... بلکہ مجھ پر انکشاف ہوا کہ میرے سر کے اندر جو بے پناہ دباؤ جمع ہو چکا ہے وہ اب نہیں ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ میں اب الٹا لٹکنے کے بجائے زمین پر لیٹا ہوا ہوں۔

یہ خیمہ تھا۔ امریکی اور ملائیشین ڈاکٹر میرا معائنہ کر رہے تھے۔ بی پی آپریٹس نے میرے بازو کو جکڑ رکھا تھا۔ جکڑن کم ہوئی۔ امریکی ڈاکٹر نے کہا۔ ''بی پی بہت بڑھ گیا تھا۔ دماغی شریان پھٹنے کا چانس بن جاتا تھا۔''

''ایک ڈرپ لگا دی جائے...... یا پھر انفیوژن؟'' ملائیشین ڈاکٹر کی آواز آئی۔

''گلوکوز ڈرپ ٹھیک رہے گی۔'' امریکی نے کہا۔

میرا تخیّل ابھی تک کام کر رہا تھا۔ کانوں میں اپنی ہی آواز گونج رہی تھی......میں تم سے وعدہ کرتا ہوں۔ میں اب یہ نہیں پیوں گا مجھ سے کبھی بُو نہیں آئے گی۔

مجھے بارہا محسوس ہوا تھا کہ مجھے تاجور سے دور کرنے میں کچھ کردار اس بُو کا بھی ہے۔ پتا نہیں کیوں دھیرے دھیرے مجھے اس بُو سے نفرت ہونے لگی تھی۔ وہیں لیٹے لیٹے میں نے دل ہی دل میں کہا کہ میں اس جان لیوا مصیبت سے نکل گیا تو زندگی بھر الکحل کو ہاتھ نہیں لگاؤں گا۔ میں نے کہیں پڑھا تھا کہ کچھ ایسا ہی عہد کسی بادشاہ نے بھی کیا تھا۔ شاید بابر نے، پانی پت کی فیصلہ کن لڑائی سے پہلے عہد کیا تھا کہ وہ زندگی بھر شراب کو ہاتھ نہیں لگائے گا۔

وہ رات بھی بے پناہ اذیت اور دکھ کی رات تھی۔ تبارک اور سیف کی موت کا غم میرے سینے پر کسی پہاڑ کی طرح ٹھہرا ہوا تھا۔ خاص طور سے سیف عرف سیفی کا غم۔ وہ پُرجوش زندگی کا طالب تھا اور اس طلب میں وہ اس اندوہناک منزل تک آپہنچا تھا۔ اس کے آخری الفاظ اب تک میرے کانوں میں تھے۔ آپ...... مجھ سے...... ناراض تو نہیں؟ میری چوٹیں اور میرے زخم آگ کی طرح دہک رہے تھے۔ لونگ اور اس کے ماتحت مجھے اتنی اذیت بھی دینا نہیں چاہتے تھے کہ میں مر جاؤں اور اتنی رعایت بھی نہیں برتنا چاہتے تھے کہ وقت اُن کے ہاتھ سے نکل جائے۔ یقیناً رائے زل اور آقا جان جیسے لوگوں کا ان پر بے پناہ دباؤ تھا۔

آدھی رات کے وقت ایک گرے لیفٹیننٹ نے مجھے ٹھوکر مار کر جگایا اور بولا۔ ''اب بھی وقت ہے۔ سوچ لو۔ لونگ جیک صاحب کا کہنا ہے کہ کل صبح والا تفتیشی سیشن تمہارے لیے بہت خوفناک ہوگا......اور شاید آخری بھی۔''

فقرے کے آخری تین چار الفاظ پر تو میں ہرگز یقین نہیں کر سکتا تھا۔ مجھے جان سے مار دینا کسی صورت بھی ان لوگوں کے حق میں نہیں تھا۔ ہاں، زندگی اور موت کے درمیان لٹکانا اِن کو ''سوٹ'' کرتا تھا۔

''صبح ایک بار پھر امریکی ڈاکٹر نے میرا طبی معائنہ کیا۔ اس نے تھوڑا سا اعتراض بھی کیا، اس کے باوجود تفتیشی اہلکار مجھے خیمے سے باہر اسی درخت کے پاس لے گئے جو اس سے پہلے دو افراد کی جان لے چکا تھا۔ میری حالت چونکہ اتنی اچھی نہیں تھی لہٰذا مجھے بیڑی ڈالنے کا تردد نہیں کیا گیا تھا۔ صرف ہاتھ پشت پر جکڑ دیے گئے تھے۔ جب یہ لوگ مجھے درخت کی طرف لے جا رہے تھے، میری نگاہ ایک عجیب وضع کی گاڑی پر پڑی۔ یہ آٹو رکشا کے سائز کی گاڑی بیس پچیس فٹ کے فاصلے پر کھڑی تھی۔ یہ بکتر بند تھی اور اس کے پہیوں کی جگہ ٹینک کی طرز پر آہنی بیلٹ تھی۔ غالباً اس گاڑی کو کسی بڑی لانچ پر لاد کر یہاں ٹاپو پر لایا گیا تھا تاکہ جانی نقصان سے محفوظ رہ کر قسطینا وغیرہ کی تلاش کی جاسکے۔ اس کی ڈرائیونگ سیٹ پر ایک موٹا سا امریکی بیٹھا اونگھ رہا

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

تھا۔

میرے دھندلائے ہوئے سے ذہن میں یہ سوچ ابھری کہ اگر میں کسی طرح اس گاڑی میں گھس جاؤں تو ہر قسم کی فائرنگ سے محفوظ ہو جاؤں گا اور کسی جانب نکلنے کی کوشش کر سکوں گا۔ جتنی تیزی سے یہ خیال میرے ذہن میں آیا اتنی ہی تیزی سے یہ بھی آیا کہ میں پشت پر بندھے ہاتھوں سے بھی کچھ نہ کچھ کام لے سکتا ہوں۔

کسی گرفتار شخص کے ہاتھ پشت پر باندھ دیے جائیں تو اسے بہت محفوظ تصور کر لیا جاتا ہے، لیکن اگر تھوڑا سا غور کیا جائے تو پشت پر بندھے ہاتھوں سے بھی خاصی سنگین قسم کی کارروائی کی جا سکتی ہے۔

پلک جھپکتے میں، میں نے قسمت آزمائی کا فیصلہ کر لیا۔ میں ایک کالے امریکی گارڈ کے پاس سے گزر رہا تھا۔ میری بائیں بغل کے نیچے ایک امریکی نے اپنی مضبوط گرفت بنا رکھی تھی اور ایک طرح سے مجھے سہارا دیتا ہوا درخت کے پاس لے جا رہا تھا۔ میرے اندر اتنی توانائی تو نہیں تھی لیکن جتنی بھی بچی کھچی توانائی تھی میں نے اسے جمع کیا۔ میری نگاہوں کے سامنے تبارک اور سیفی کے موت کے مناظر گھومے۔ ایک آتشیں لہری بدن میں اٹھی۔ میں دیکھ چکا تھا کہ کالے امریکی کے ہولسٹر میں اس کا سروس پستول موجود ہے اور ہولسٹر کا بکل بھی بند نہیں۔ میرے ہاتھوں اور ہولسٹر کے درمیان بمشکل دو فٹ کا فاصلہ تھا۔ میں پیچھے کی طرف گیا۔ خود کو، گھٹنوں میں خم دے کر تھوڑا سا نیچے کیا اور ہولسٹر میں سے پستول نکال لیا۔ سیفٹی کیچ ہٹا کر میں نے پہلا فائر اسی گارڈ پر کیا جس نے مجھے بغل سے تھام رکھا تھا۔ گولی اس کے پہلو میں لگی۔ ''اوہ گاڈ!'' وہ بے ساختہ پکارا۔

میں نے تڑپ کر خود کو اس کی گرفت سے چھڑایا اور منی سائز بکتر بند کی طرف بڑھا۔ سارے بدن پر چوٹیں تھیں لیکن نجانے اس وقت اتنی طاقت کہاں سے آ گئی تھی۔ میں نے دو تین فائر مزید کیے اور لپک کر بکتر بند میں گھس گیا۔ یہ سارا عمل بمشکل تین چار سیکنڈ میں مکمل ہو گیا تھا۔ بکتر بند کے دروازے کا جائزہ میں پہلے ہی لے چکا تھا، اس لیے اسے بند اور لاک کرنے میں مجھے زیادہ دشواری نہیں ہوئی۔

ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا ہوا ست الوجود امریکی اب جاگ گیا تھا اور سرخ انگارا آنکھوں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ یہ سرخی غصے یا جوش کے سبب نہیں بلکہ نیند کے سبب تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ اس سرخی میں بے حد تحیر بھی تھا۔ اس نے خود کو حرکت دینا چاہی لیکن اب اس کے لیے دیر ہو چکی تھی۔

میں نے اپنے، پشت پر بندھے ہاتھوں کو موڑ کر پستول اس کے چربی دار پہلو سے لگا دیا تھا۔

''خبردار! جان سے مار دوں گا۔'' میں نے ''قاتل'' لہجے میں کہا۔

ڈرائیور اپنا ہاتھ ہولسٹر کی طرف لے جا رہا تھا۔ وہیں کا وہیں رک گیا۔

''اسٹارٹ کرو اپنی اس والدہ کو۔'' میں نے امریکیوں کے ہی لب و لہجے میں حکم دیا۔

وہ میری آنکھوں میں اپنی موت دیکھ چکا تھا۔ اس نے لرزاں ہاتھوں سے اگنیشن میں چابی گھمائی۔ گاڑی اسٹارٹ ہو گئی۔

یہی وقت تھا جب بکتر بند کو کئی فائر لگے۔ یقیناً مجھے ہی نشانہ بنانے کی اضطراری کوشش کی گئی تھی۔ بکتر بند کی کھڑکیاں روزنوں کے مانند چھوٹی اور بلٹ پروف تھیں۔

''ساحل کی طرف چلو۔'' میں نے بندھے ہاتھوں سے ہی پستول اس کی توند میں گھسیڑتے ہوئے کہا۔

اس نے چند لمحے تذبذب میں رہنے کے بعد گیئر کی طرف اپنا ہاتھ بڑھایا اور یہی وقت تھا جب وہ کام ہوا جس کی مجھے ہرگز توقع نہیں تھی۔ عقب سے کسی نے میری گردن کو اپنے بازو کے شکنجے میں لے لیا۔ دراصل پچھلی نشست پر بھی ایک شخص لیٹا ہوا تھا جس پر میری نظر نہیں پڑی تھی۔ مجھے مصیبت میں دیکھ کر فربہ اندام ڈرائیور نے دروازہ کھول کر خود کو باہر لڑھکا دیا۔ میں نے جھلاہٹ میں گولی چلائی مگر وہ ہوا میں گئی۔ میرے بازو پشت پر تھے میں اس شخص کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا جس نے مجھے عقب سے دبوچا تھا۔ پھر بھی میں نے سر کے پچھلے حصے سے اس کے چہرے پر تسلی بخش ضرب لگائی۔ اسی دوران میں دو تین ہٹے کٹے امریکی گارڈز مجھ پر پل پڑے۔ پستول میرے ہاتھ سے چھین لیا گیا۔ وہ غلیظ گالیاں بک رہے تھے اور مجھ پر جھپٹ رہے تھے......

مجھے مُکّے رسید کیے گئے اور گھسیٹ کر پھر اسی درخت کے قریب پہنچا دیا گیا۔ میں نے دیکھا، میری گولی سے زخمی ہونے والے گارڈ کو اٹھا کر ایک ٹینٹ میں لے جایا جا رہا تھا۔

لونگ کے حکم پر مجھے سب سے پہلے وہی ڈبل ایکشن بیڑی پہنائی گئی جو پاؤں کے علاوہ ہاتھوں کو بھی جکڑ لیتی تھی اور زیرِعتاب شخص رکوع کے بل چلنے پر مجبور ہو جاتا تھا۔ یہ بیڑی پہنانے کے بعد مجھے الٹا تو نہیں لٹکایا گیا۔ وہیں پتھریلی زمین پر پھینک کر مار پیٹ شروع کر دی گئی۔ اس مار

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

پیٹ میں کل سے زیادہ شدت اور غضب ناکی تھی۔ وجہ ظاہر تھی میں نے تھوڑی دیر پہلے "عدم تعاون" کی زبردست مثال قائم کی تھی۔ آلو اور سؤر کے گوشت پر پلے ہوئے ایک ہٹے کٹے گارڈ کو گولی مار کر شدید زخمی کر دیا تھا۔

جو کچھ ہو رہا تھا، ناقابلِ بیان تھا۔ وہ مجھے جان سے بھی نہیں مار سکتے تھے اور کسی طرح کا رحم کرنا بھی نہیں چاہتے تھے۔ تشدد کا وہ سیشن اپنی مثال آپ تھا۔ اس سیشن میں جو بدترین کام ہوا تھا کہ میرا زخمی کندھا ایک بار پھر انگارا بن گیا تھا۔ پتا نہیں کہ اس میں کیا نئی ٹوٹ پھوٹ ہوگئی تھی۔ میری کنپٹی پر لگنے والی، وزنی بوٹ کی ایک شدید ضرب کے بعد میری آنکھوں تلے پھر اندھیرا چھا گیا۔ کانوں میں دور افتادہ آوازیں آرہی تھیں۔ کوئی بڑی اسپیڈ بوٹ کنارے پر آکر رکی تھی۔ کوئی امریکی وائرلیس پر بلند آواز میں پیغامات دے رہا تھا۔ گرے فورس کے دو فوجی آپس میں کسی بات پر جھگڑ رہے تھے۔

میں پہلو کے بل سخت زمین پر پڑا تھا۔ مجھے لگا کہ میری گردن پر کچھ بہہ رہا ہے۔ نیم بے ہوشی کی سی کیفیت تھی۔ اندازہ نہیں ہو پا رہا تھا کہ یہ خون ہے یا پسینا۔ سورج چمک رہا تھا۔ زخموں پر اس کی تپش محسوس ہوتی تھی۔ امریکی ڈاکٹر کی دور افتادہ آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

"ابھی کچھ ریسٹ دیا جائے اسے۔"

"دو مہینے کا ریسٹ دے دیا جائے۔" لونگ کی کرخت طنزیہ آواز سنائی دی۔

"بی پی زیادہ نیچے گر گیا ہے۔ کہیں یہ بھی ہاتھ سے نہ نکل جائے۔" یہ آواز شاید نیلی آنکھوں والے پال کی تھی لیکن حواس پر گہری دھند سی چھائی ہوئی تھی۔ میں یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ اسی کی آواز ہے۔

ان وحشیوں میں صرف ایک وہی تھا جو نسبتاً نرم رویہ رکھے ہوئے تھا یا پھر ڈاکٹر کی بات میں تھوڑا سا توازن ہوتا تھا لیکن یہ توازن کسی ہمدردی کی وجہ سے نہیں، اپنی پیشہ ورانہ ذمے داری کے تحت تھا۔

نیم بے ہوشی ہی کی حالت میں مجھے اندازہ ہوا کہ میں نے دو تین دفعہ قے بھی کی ہے۔ دھندلائی ہوئی نظروں سے میں نے اوپر نیلگوں آسمان کی طرف دیکھا۔ چیلیں پرواز کر رہی تھیں اور ان سے بھی اوپر دو ہیلی کاپٹر پھڑ پھڑا رہے تھے۔ شاید اس چھوٹے سے جزیرے (ٹاپو) کی فضائی نگرانی بھی ہو رہی تھی۔

کیا میں مرنے والا ہوں؟ میں نے خود سے سوال کیا، کیا ان لوگوں کی نفرت اور درندگی میری جان لے جائے گی؟ ٹھیک ہے...... وہ لے لیں جان۔ لیکن میں بھی انہیں کچھ بتا کر نہیں دوں گا ایک لفظ نہیں...... ایک عجیب سی ضد اور ایک بے نام توانائی میرے اندر پروان چڑھتی جا رہی تھی۔ میں نے دل ہی دل میں جیسے خود سے کہا...... شاہ زیب! تم کوئی عام شخص نہیں ہو۔ تم یورپی چیمپئن ہو، ان امریکیوں پر ثابت کر دو کہ مزاحمت کیا ہوتی ہے؟ چپ کے معنی کیا ہوتے ہیں...... اور برداشت کس بلا کا نام ہے۔

رات گزر گئی۔ صبح پھر اپنی "خود ساختہ جہنم" کا فرشتہ لونگ میرے سر پر کھڑا تھا۔ وہ غالباً پھر مجھے تشدد کی ٹکٹکی پر کسنا چاہ رہا تھا مگر پال اسے تھوڑے انتظار اور تحمل کا کہہ رہا تھا۔ دونوں میں باقاعدہ بحث شروع ہوگئی تھی۔ کبھی کبھی اس بحث میں ڈاکٹر بھی کوئی فقرہ جوڑ دیتا تھا۔

کئی زوردار ٹھوکریں میری زیریں پسلیوں پر لگیں اور میرا پورا جسم جھنجھنا اٹھا۔ میری ناف میں درد کی شدید ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ ٹھوکریں مارنے والا یقیناً لونگ ہی تھا۔ وہ گالیاں بکتا ہوا غالباً خیمے سے باہر چلا گیا تھا، مجھ پر بار بار تاریکی کے حملے ہو رہے تھے۔ آوازیں دور چلی جاتی تھیں اور میں اردگرد کے ماحول سے بے خبر ہو جاتا تھا۔

پھر مجھے اندازہ ہوا کہ مجھے پیشاب کی نالی لگی ہوئی ہے اور میں خیمے کے بجائے کسی گاڑی یا کشتی میں ہوں۔ یہ کشتی ہی تھی۔ اس کے ہچکولے کشتی جیسے تھے۔ میرے بازو میں کوئی انجکشن دیا جا رہا تھا۔ میرے دھندلائے ہوئے ذہن میں یہ خیال ابھرا کہ مجھے ٹاپو سے واپس جامائی لے جایا جا رہا ہے۔

☆☆☆

میرے اگلے چار پانچ روز ایک عجیب سی دھند میں لپٹے ہوئے تھے۔ مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ میں نشہ آور دواؤں کے زیرِ اثر ہوں۔ کسی وقت حواس ٹھیک بھی کام کرنے لگتے تھے، میرے کندھے کا آپریشن ہو چکا تھا اور اس میں پلیٹیں وغیرہ بھی ڈال دی گئی تھیں۔ میرے زخموں اور اندرونی ضربات کو بھی ٹریٹ کیا جا رہا تھا۔ جس انگوٹھے سے ناخن کھینچا گیا تھا اس کا زخم بگڑا ہوا تھا۔ پورے انگوٹھے میں انفیکشن تھا۔ ایک دو بار میں نے نیلی آنکھوں والے پال کو بھی اپنے قریب دیکھا۔ ایک دن اس نے نرم لہجے میں کہا۔ "دیکھو مسٹر ایسٹرن کنگ! اپنے آپ پر ظلم مت کرو۔ تمہارے پاس اس کے سوا اور کوئی راستہ نہیں کہ تم ہمیں قسطنیا

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

اور ابراہیم وغیرہ تک پہنچا دو۔''

میں نے بمشکل بولتے ہوئے کہا۔ ''میرا جواب وہی ہے جو میں دے چکا ہوں اور آئندہ بھی یہی رہے گا۔''

''لیکن آئندہ صورت حال ایسی نہیں رہے گی جیسی اب ہے۔ لونگ تمہیں جلد از جلد واپس مانگ رہا ہے۔ میں نے تمہارے لیے کافی بھاگ دوڑ کی ہے اور فی الحال ان لوگوں کو تم سے دور رکھا ہوا ہے جو تمہیں انسان سے ایک پھٹے پرانے خون آلود چیتھڑے میں تبدیل کر دینا چاہتے ہیں۔''

''حیرت ہوتی ہے کہ تم بھی امریکی ہو۔'' میرا لہجہ طنزیہ تھا۔

''سارے امریکی ایک سے نہیں...... بلکہ شاید کوئی قوم اور کوئی نسل بھی ساری کی ساری اچھی یا بری نہیں ہوتی۔''

''اگر تم اچھے ہو تو پھر یہ تمہاری ایک نہیں چلنے دیں گے، میں جانتا ہوں کہ یہ سب میرے خون کے پیاسے ہیں۔ میں تب تک ہی زندہ ہوں جب تک اپنی زبان نہیں کھولتا۔''

''مگر تمہاری یہ زندگی موت سے کئی گنا بدتر ہوگی ایسٹرن عرف شاہ زیب! ہاں اگر تم زبان کھول دو، میں تمہیں کچھ گارنٹی دینے کو تیار ہوں۔''

''جہاں آقا جان اور رائے زل جیسے لوگ موجود ہیں، وہاں ایسی گارنٹی کوئی معنی نہیں رکھتی مسٹر پال! ویسے بھی جب میں قسطینا اور ابراہیم کے بارے میں کچھ جانتا ہی نہیں تو بتا کیسے سکتا ہوں۔''

پال کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ اپنے غصے کو ضبط کرتے ہوئے بولا۔ ''مجھے ڈر ہے کہ تمہاری یہ ہٹ دھرمی تمہیں لے ڈوبے گی۔ کھیل کا میدان ایک اسٹار کھلاڑی سے محروم ہو جائے گا اور مزید ستم یہ کہ...... یہ قربانی رائگاں جائے گی۔ آخر کو تو ہم نے ان بھگوڑوں کو ڈھونڈ ہی لینا ہے۔ تم جانتے ہی ہو، بڑے بڑے نامور لوگ اپنی پوری کوشش کے باوجود ہم سے چھپ نہیں سکے۔ جب ہم تہیہ کرتے ہیں تو پھر ڈھونڈ لیتے ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''میرا سر درد سے پھٹا جا رہا ہے۔ تمہاری باتیں میرے سر میں ہتھوڑوں کی طرح لگ رہی ہیں۔'' میں نے آنکھیں بند کرتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے پھر بات کریں گے۔ ویسے بھی تمہارے انجکشنز کا وقت ہو چکا ہے۔'' پال نے کہا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

یوں لگتا تھا کہ میرے جسم کا 75 فیصد حصہ پٹیوں میں جکڑا ہوا ہے یا پھر اس پر کوئی آئنٹمنٹ وغیرہ لگی ہے۔ کندھا اور بازو بھی پلاستر میں تھا۔ میرے کمرے کے گرد سخت پہرا تھا۔ سی سی ٹی وی کیمرے مجھے فوکس کیے ہوئے تھے۔ اسٹیل کی ایک زنجیر میرے ٹخنے سے باندھ کر بیڈ سے منسلک کر دی گئی تھی۔

کچھ عرصہ پہلے جب آقا جان نے مجھے اور جاناں کو اٹھوا کر ''آشیانے'' نامی عقوبت خانے میں پہنچایا تھا تو وہاں بھی مجھے بری طرح زدوکوب کیا گیا تھا۔ لیکن اب جو تشدد ہوا تھا اس نے ''آشیانے'' والے واقعے کو بالکل غیر اہم بنا ڈالا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ اگر میں ایک پروفیشنل نہ ہوتا تو لونگ کی دی ہوئی اذیت...... تبارک اور سیف کی طرح میری بھی جان لے چکی ہوتی۔

چھ سات دن تک چند گہری چوٹوں کے سوا میرے باقی زخم مندمل ہونا شروع ہو گئے۔ یہ گہری چوٹیں ٹانگوں اور پسلیوں پر تھیں۔ ایک دن نہایت سخت سیکیورٹی میں مجھے اسپتال سے ڈی پیلس لے جایا گیا۔ میرا کندھا اب اس قابل ہو گیا تھا کہ بازو کو پیچھے کی طرف موڑ کر میرے ہاتھ ہتھکڑی میں جکڑے جا سکتے۔ بند گاڑی کی کھڑکیوں کے شیشے ''ون سائیڈڈ'' تھے، میں باہر دیکھ سکتا تھا لیکن باہر والے اندر نہیں جھانک سکتے تھے۔

جانی پہچانی سڑکیں نظر آئیں۔ جنگ کی تباہ کاری کے آثار اب بھی اکثر جگہ دکھائی دے رہے تھے۔ تاہم لگتا تھا کہ عام لوگوں کی زندگی معمول پر آنا شروع ہو گئی ہے جگہ جگہ گرے سپاہی اور ایجنسی کے امریکی گارڈز دکھائی دیتے تھے۔ اہم سڑکوں پر ناکا بندیاں بھی موجود تھیں۔ میں نے چہرہ شیشے سے لگا رکھا تھا۔ سوچا کہ اگر عام شہری مجھے دیکھتے تو یقیناً بہت سے پہچان لیتے اور ہو سکتا ہے کہ کچھ مجھے دیکھ کر خوشی اور جوش کا اظہار بھی کرتے۔ اب یہاں میرا ایک نام تھا۔

ڈی پیلس کے اندر پہنچے تو انیق اور سیف کی یاد بُری طرح آئی۔ خاص طور سے سیف یاد آیا۔ وہ انہی در و دیوار میں چوکڑیاں بھرتا تھا اور کرخت سنگھ کے ساتھ مل کر دیسی کھانے اور دیسی مصروفیات انجوائے کرتا تھا۔ کبھی دیسی مرغی کا کڑاہی گوشت ڈھونڈنے نکلا ہوا ہے، کبھی سنگھاڑے کھا رہا ہے اور کبھی انیق سے سلطان راہی کی داستانِ حیات سن رہا ہے۔ اب وہ سب کچھ یہاں نہیں تھا۔ کرخت سنگھ کے بارے میں اتنا پتا چل سکا تھا کہ مجھے بچانے کی کوشش کے بعد وہ زخمی ہو کر اسپتال پہنچا تھا اور شاید اب روبصحت ہے۔

ڈی پیلس میں مجھے ایک نہایت آرام دہ اپارٹمنٹ

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

میں رکھا گیا، لیکن آرام دہ ہونے کے باوجود یہ کسی لاک اپ کی طرح بند اور محصور تھا۔ صرف دو آہنی دروازے تھے جو سلائڈ کرتے تھے۔ ایک کھڑکی تھی جس میں لاک اپ ہی کی طرح شفاف ٹھوس اسٹیل کی سلاخیں لگی تھیں۔ اپارٹمنٹ میں کوئی ایک ایسی شے بھی موجود نہیں تھی جسے کسی بھی طرح حملے یا دفاع کے لیے استعمال کیا جاسکتا۔ اس اپارٹمنٹ کی چھت پر پانچ کلوز سرکٹ کیمرے دکھائی دیتے تھے جو ایک ایک انچ کو کور کررہے تھے۔ اپارٹمنٹ کو ہر طرف سے مسلح گارڈز نے گھیرا ہوا تھا۔

رات کو پال مجھ سے ملنے کے لیے آیا۔ اس کی آمد سے پہلے گارڈز نے مجھے حکم دیا کہ میں سلاخوں کے قریب کھڑا ہو کر اپنے بازو پیچھے کی طرف موڑوں۔ میں نے ہدایت پر عمل کیا۔ میرے ہاتھ الٹی ہتھکڑی میں جکڑ دیے گئے۔ پال اندر آگیا۔ غالباً مجھے انتہائی خطرناک قیدی کا درجہ دیا گیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ میرے ہاتھ بندھے ہونے کے باوجود پال کورنی مجھ سے آٹھ دس فٹ کی دوری پر بیٹھا۔

سلاخ دار کھڑکی میں سے رائفل مین مجھ پر کڑی نظر رکھے ہوئے تھے۔ پال نے کہا۔ ”کیمرے اور آڈیو سسٹم بند ہے۔ ہم یہاں جو گفتگو کریں گے، وہ بالکل محفوظ ہوگی۔“

”تم لوگوں کی بات پر یقین کرنا کافی مشکل ہوتا ہے لیکن کرلیتا ہوں۔“

”تم پر ضرورت سے زیادہ سختی ہوئی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اب تمہیں کچھ راحت ملے اور تم ٹھنڈے دل و دماغ سے کچھ سوچ سکو۔“

”تم کس راحت کی بات کررہے ہو۔ کیا تم لوگ میری فرینڈ جاناں کو واپس لاسکتے ہو، کیپٹن تبارک اور میرے دوست سیف کو پھر سے زندہ کرسکتے ہو۔ وہ ماں باپ کا اکلوتا بیٹا تھا۔ اس کی شادی کے دن گنے جارہے تھے۔ تم لوگوں کی وجہ سے وہ اپنی زمین سے ہزاروں میل دور یہاں ایڑیاں رگڑ کر مرا ہے۔ انہیں اسے کفن بھی نصیب ہوا ہے یا نہیں۔“

”تمہارے دونوں ساتھیوں کی موت کا بہت افسوس ہے ایسٹرن! لیکن ان کی لاشوں کو پورا احترام دیا گیا ہے۔ انہیں یہاں لاکر مسلمانوں کے طریقے سے دفنایا گیا ہے۔“

”بہت شکریہ۔“ میں نے طنزاً کہا۔ ”مجھے لگتا ہے کہ مجھے بھی کافی احترام دیا جائے گا مگر لاش بنانے کے بعد۔“

”میں دل و جان سے چاہتا ہوں کہ تم زندہ رہو، لیکن اس کے لیے تمہیں یہ تو بتانا ہی پڑے گا کہ تمہارے ساتھی کہاں ہیں۔ انہیں زمین کھا گئی یا آسمان نگل گیا۔“

”مجھے نہیں پتا اور اگر ہوتا بھی تو میں ہرگز نہ بتاتا۔“

”ابھی تم نے لونگ کی سنگدلی کا بس آٹھ دس فیصد دیکھا ہے۔ اس کے پاس تمہاری زبان کھلوانے کے ایک سو ایک طریقے ہیں ڈیئر ایسٹرن۔“

”تو تم اسے کوشش کرنے دو۔“ میں نے کہا۔ میرے اندر پھر وہی کیفیت پروان چڑھنے لگی جس نے مجھے کئی روز تک لونگ کی بے پناہ سفاکی سہنے کا حوصلہ بخشا تھا اور پُرعزم رکھا تھا۔

”چلو، پہلے میں تو کوشش کرلوں۔“ وہ مسکرایا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

اس کے جانے کے بعد گارڈز نے مجھے پھر سلاخوں کے پاس بلایا اور میری الٹی ہتھکڑی کھول دی۔ وہ ہتھکڑی لگاتے یا کھولتے تھے تو میرے انگوٹھے کا زخم تکلیف دیتا تھا۔

رات کے نو دس بجے ہوں گے جب میرے اپارٹمنٹ کا دروازہ کھلا اور خوب صورت قامت والی ایک حسین وجمیل انڈین لڑکی اندر داخل ہوئی۔ اس کے ساتھ ایک باوردی ملازم بھی تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک بڑی طشتری تھی اور کھانے کے بہت سے لوازمات تھے۔ لڑکی کی عمر بمشکل بیس بائیس سال ہوگی۔ وہ نہایت ہیجان خیز لباس میں تھی۔ بال گہرے سیاہ، آنکھیں چمکدار بادامی اور بدن آئینے کی طرح شفاف۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا وہ ایک ماڈل گرل تھی۔ اس کا نام بینش کرسٹل تھا۔ بینا بھی کہتے تھے۔ وہ کسی بھی عابد، زاہد کے ایمان کا بیڑا غرق کرنے کی صلاحیت رکھتی تھی۔ اس کی بادامی آنکھوں میں دعوت اور خود سپردگی کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ اس نے شستہ انگلش میں مجھ سے لگاوٹ کی باتیں شروع کیں۔ ساتھ ہی مجھے یہ بھی بتایا کہ اس وقت سارے سی سی ٹی وی کیمرے بند ہیں اور ہم مکمل خلوت میں ہیں۔

اس نے ایک جدید الماری کھولی۔ یہ شراب اور وہسکی کی بوتلوں سے بھری ہوئی تھی۔ (جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا، یہ بوتلیں خاص قسم کے ”ان بریک ایبل“ شیشے کی تھیں۔ مقصد یہی تھا کہ میں اس شیشے سے کسی کو یا خود کو نقصان نہ پہنچا سکوں۔ وہاں موجود پیمانے بھی اسی خاص شیشے کے تھے) لڑکی بینش کے لباس میں بھی کوئی بکل کوئی ڈوری وغیرہ نہیں تھی۔ وہ سارا لباس ہی بس ایک ڈیڑھ میٹر کپڑے پر مشتمل تھا۔ بس ہلکی پھلکی گلابی شرٹ اور نیکر۔

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

شراب کو دیکھ کر ایک ترنگ سی دل میں اٹھی۔ غم کے بے پناہ حصار سے نکلنے کے لیے مجھے کسی سہارے کی ضرورت تھی لیکن پھر اپنا عہد یاد آیا۔ وہ عہد میں نے کس سے کیا تھا؟ کسی عام شخص سے نہیں اس ہستی سے جو شاید میری رگوں میں خون بن کر دوڑتی تھی اور دل میں دھڑکن بن کر رہتی تھی۔

میں الماری کی طرف بڑھتا بڑھتا رک گیا۔ پلٹ کر بستر پر نیم دراز ہو گیا۔ لڑکی اندر سے ڈری سہمی تھی۔ یقیناً وہ جانتی تھی کہ اسے یہاں بھیجنے والوں نے اسے ایک نہایت خطرناک قیدی کے سپرد کیا ہے۔

''کیا رائے زل واقعی زندہ ہے؟'' میں نے لڑکی سے پوچھا۔

''میں آپ کی بات کا مطلب نہیں سمجھی۔'' وہ دبے لہجے میں بولی۔

''وہ تو قبر کے کنارے پہنچ چکا تھا پھر بھلا چنگا کیسے ہو گیا؟''

''کچھ لوگ اسے میڈیکل کا کرشمہ کہتے ہیں جی...... کچھ مادام بانا دانی کی خاص صلاحیتوں کا نتیجہ قرار دیتے ہیں۔ بہت سے مقامی لوگوں نے تو مادام کے مجسمے بنانا شروع کر دیے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ جاماجی پر ہی نہیں ایک دن پورے بروناکی پر مادام کا حکم چلے گا۔''

''تمہارا اپنا کیا خیال ہے بینا کرسٹل؟''

''میں...... زیادہ کچھ نہیں جانتی۔'' وہ ہولے سے بولی اور اشتعال دلانے والے انداز میں بل کھا کر میرے قریب نیم دراز ہو گئی۔ اس کا بالائی لباس اس کے سرکش جسم سے برسرِ پیکار تھا اور قطعی بے بس نظر آتا تھا۔

میں نے ذرا غصے سے کہا۔ ''یہ کیا طریقہ ہے؟ یہ کیا پہن رکھا ہے تم نے؟''

وہ اس کا دوسرا مطلب سمجھی۔ ذرا متذبذب رہنے کے بعد بولی۔ ''مم...... میں سمجھی نہیں۔ کیا آپ یہ چاہتے ہیں کہ میں...... اسے اتار دوں؟''

''نہیں، میں یہ چاہتا ہوں کہ تم اپنے یہ فتنہ پرور کندھے ڈھانپ لو اور کوئی شال وغیرہ لے کر وہاں سامنے کرسی پر بیٹھو۔'' میں نے روکھے لہجے میں کہا۔

وہ جلدی سے بستر سے اتر گئی۔ میری ہدایت کے مطابق اس نے الماری کھول کر ایک بیڈ شیٹ نکالی اور اس سے اپنا بالائی جسم ڈھانپ کر کرسی پر بیٹھ گئی۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ میں وہ کچھ نہیں چاہتا جو وہ مجھے آفر کرنے کے لیے یہاں آئی ہے۔

میں نے اس سے پوچھا۔ ''تمہاری معلومات کمال احمد کی موت کے بارے میں کیا ہیں؟ کیا واقعی اس نے خود کو کسی گودام میں بند کر لیا تھا جہاں خوراک نہ ملنے کے سبب اس کی جان چلی گئی؟''

''میری معلومات اس کے بارے میں زیادہ نہیں، لیکن نیوز میں یہی بات آئی ہے اور عام لوگوں کا خیال بھی یہی ہے کہ مسٹر کمال احمد خوراک کے ساتھ کوئی خاص دوا لیتے تھے۔ وہ دوا نہ ملنے کے سبب ان کی موت واقع ہو گئی۔''

''کمال احمد کی والدہ بیگم نورل اب کہاں ہیں؟''

''مجھے ان کے بارے میں کچھ پتا نہیں۔''

''پتا تو تمہیں سب کچھ ہو گا لیکن شاید تمہیں یہاں بھیجنے والے تمہارے آقاؤں نے کہا ہوا ہے کہ زبان بند رکھنی ہے، بس اپنے کانوں سے کام لینا ہے۔''

''نہیں، ایسی کوئی بات نہیں۔ مجھے صرف آپ کو کمپنی دینے کے لیے یہاں بھیجا گیا ہے۔''

''کمپنی دینے کے لیے انہوں نے اپنی کسی ہم قوم کو یہاں کیوں نہیں بھیجا۔ حالانکہ بہت سی امریکن کال گرلز بھی یہاں پائی جاتی ہیں۔''

وہ پریشان نظروں سے میری طرف دیکھتی رہی، ماتھے پر پسینے کی چمک تھی۔

میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''کسی امریکن یا یورپین کو اس لیے یہاں نہیں بھیجا گیا کہ ان لوگوں کی ایک جان ہماری سو جانوں سے زیادہ قیمتی ہوتی ہے۔ مجھ سے خوف زدہ ہیں یہاں کے سفید سؤر۔ میرے ہاتھ الٹی ہتھکڑی میں جکڑے بغیر میرے سامنے نہیں آتے لیکن تمہیں میرے حوالے کر دیا گیا ہے، میرے ہاتھ باندھے بغیر۔''

وہ کچھ اور سہم گئی۔ ''میں تو بس وہی کرتی ہوں...... جو مجھے حکم دیا جاتا ہے۔''

''ہم ہمیشہ سے وہی کرتے ہیں جو ہمیں حکم دیا جاتا ہے۔ اسی لیے انگریزوں نے دو سو سال ہم پر حکومت کی۔ اسی لیے ہم اب بھی ان کے غلام ہیں۔ عظیم برطانیہ...... سپر پاور امریکا اور اس کے حواری، یہی تو ہیں ہمارے آقا......'' میں نے کئی اور سخت جملے کہے۔

پال نے کہا تھا کہ کلوز سرکٹ کیمرے بند ہیں، کسی طرح کا آڈیو سسٹم بھی آن نہیں، مگر اس پر یقین کرنا مشکل تھا۔ میں اسی لیے دل کی بھڑاس نکال رہا تھا۔ اس بے چاری کو واقعی ایک لاوارث چیز کی طرح میرے سامنے پھینک دیا

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

گیا تھا۔ فرض محال اس کی جگہ کوئی امریکی ماڈل گرل ہوتی اور میں اس کی گردن توڑنے کی دھمکی دے کر کوئی مطالبہ منوانے کی کوشش کرتا تو ان لوگوں کو دانتوں پسینے آجاتے۔ اس کے لیے انہوں نے ایک انڈین پارسی لڑکی کو چنا تھا۔ اچانک میں بہت بری طرح چونک گیا۔ لڑکی کے چہرے پر عجیب سے تاثرات ابھرے وہ اپنی جگہ سے اٹھی۔ کچھ دیر تک پشیمان نظروں سے میری طرف دیکھتی رہی۔ میں اسی طرح بستر پر نیم دراز تھا۔ اس نے نیچے بیٹھ کر میرے پاؤں پکڑ لیے۔ ''پلیز مجھے اس طرح دور مت رکھیں۔ میں آپ کی خدمت کے لیے بھیجی گئی ہوں۔ ناکام واپس جاؤں گی تو مجھ سے باز پرس ہوگی۔''

لڑکی کی بات چونکانے والی تھی مگر اس سے زیادہ چونکانے والا وہ کام تھا جو اس نے کیا۔ اس نے کاغذ کا ایک پرزہ میری جراب میں اُڑس دیا تھا۔

میں سناٹے میں رہ گیا۔ لڑکی سے میرا رویہ تبدیل ہو گیا۔ میں جو اسے یہاں سے بھگانے کے چکر میں تھا، رک گیا۔ ہم اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگے۔ میں نے اس سے کہا کہ وہ کھانے کی طشتری بیڈ پر لے آئے۔ میں آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا اور اسے بھی بیٹھنے کو کہا۔ روسٹ چکن، سی فوڈ اور ایک دو کانٹی نینٹل ڈشیں تھیں۔ کھانے کے دوران بھی اس سے عام نوعیت کی گفتگو ہوتی رہی۔ بے شک کیمرے بند تھے لیکن 75 فیصد امکان اس بات کا موجود تھا کہ ہمیں دیکھا اور سنا جا رہا ہوگا۔

کاغذ پر کیا لکھا تھا، میں جلد از جلد جاننا چاہتا تھا لیکن اس اپارٹمنٹ میں کوئی ایسی جگہ موجود نہیں تھی جہاں جا کر اسے پڑھا جا سکے۔ واش روم بھی محفوظ نہیں تھا۔ آخر وہی ڈراما کرنا پڑا جو کیا جا سکتا تھا۔ میں خود کو بتدریج بینش کے قریب کرتا چلا گیا۔ اس کا لباس پہلے بھی قابلِ ذکر نہیں تھا، اب بالکل ہی ناپید ہو گیا۔ ہم بیڈ پر دراز ہو گئے اور ہلکے گلابی رنگ کی وہ ریشمی چادر اوڑھ لی جو ''ایسے موقعوں'' پر اکثر اوڑھی جاتی ہے۔ اس ہلکی گلابی چادر نے ہمیں چھپا لیا مگر کمرے میں جلنے والی ٹیوب لائٹ کی بالکل مدھم سی روشنی ہم تک پہنچ رہی تھی۔ یہ روشنی نہ ہونے کے برابر تھی مگر اتنی ضرور تھی کہ میں آنکھیں سکیڑ کر وہ پرچی نما کاغذ پڑھ سکتا۔

بہت باریک لکھائی تھی۔ شکستہ انگلش میں چند سطور لکھی گئی تھیں...... بلکہ یوں لگتا تھا کہ جلدی میں گھسیٹی گئی ہیں، لکھا تھا۔

''وہ ضرور تم کو زیر کرنے کی کوشش کرے گی۔ اور ایسا کرنا اس کے لیے مشکل بھی نہیں لیکن میرا دل کہتا ہے کہ تم ایک طاقت ور ذہن رکھتے ہو۔ تم کوشش کرو تو اپنا دفاع کر سکتے ہو۔ جب وہ تمہاری آنکھوں میں دیکھے تو اپنی سانس اندر کھینچ کر روک لو۔ اپنے جسم کو ڈھیلا نہ چھوڑو... اس کی دونوں آنکھوں کے بجائے کسی ایک آنکھ پر زیادہ توجہ دو اور سب سے اہم بات...... خود کو کسی جسمانی یا ذہنی تکلیف میں مبتلا کر لو۔ مثلاً اگر تمہارے ہاتھ میں کوئی نکیلی چیز ہے تو اسے اپنی ہتھیلی میں چبھو لو۔ اپنے کسی زخم کو چھیل لو...... یا ایسا کچھ بھی کر لو یا پھر خود کو ذہنی اذیت میں مبتلا کرنے کے لیے کوئی ایسا واقعہ اپنے ذہن میں لاؤ جو تمہاری زندگی میں بہت دردناک ثابت ہوا ہو۔

وہ میری ہمشیرہ ہے۔ میں اُس کی عادات بڑی اچھی طرح جانتا ہوں، وہ اپنے شکار پر صرف تین مرتبہ جھپٹتی ہے۔ ناکام ہو جائے تو پھر کوشش نہیں کرتی۔ میرا دل کہتا ہے کہ تم اسے ناکام کر سکتے ہو۔

تمہارا خیر خواہ حاذق ذکریا۔

میرے دل و دماغ میں زبردست ہلچل مچ گئی۔ یہ کیا تحریر تھی؟ کس نے لکھی تھی؟

یہ نام کچھ جانا پہچانا لگ رہا تھا۔ حاذق ذکریا نے کسی ہمشیرہ کا ذکر کیا تھا پھر سب کچھ ایک برق کی طرح ذہن میں کوند گیا۔

قسطینا نے بتایا تھا کہ مادام ہاناوانی کا ایک بڑا بھائی بھی تھا۔ وہ بھی ہاناوانی ہی کی طرح کچھ پُراسرار صلاحیتیں رکھتا تھا۔ برسوں پہلے ہاناوانی اور اس کے بھائی حاذق ذکریا میں اختلافات پیدا ہو گئے تھے۔ ہاناوانی عیش و عشرت اور جاہ و حشمت کی طرف چلی گئی، اس کا بڑا بھائی حاذق ذکریا درویش صفت ہو کر جنگلوں کی طرف چلا گیا۔ میں نے ایک بار پھر کاغذ کی تحریر پر اس کا نام پڑھا۔ تمہارا خیر خواہ حاذق ذکریا۔

ہاں یہ وہی تھا۔ میں نے چادر کے نیچے بینش کی طرف دھیان سے دیکھا۔ میری ہدایت کے مطابق وہ مجھ سے لپٹی ہوئی تھی اور اپنی حرکات و سکنات سے یہی ظاہر کر رہی تھی کہ ہم اس ریشمی چادر کے نیچے ایک دوسرے کی بانہوں میں گم ہیں۔ حقیقت اس سے بہت مختلف تھی۔ مرد و زن کی قربت والا احساس دور دور تک موجود نہیں تھا۔

میں نے اُسے اپنے ساتھ لپٹایا۔ میرے ہونٹوں اور اس کے بائیں کان کے درمیان کوئی فاصلہ نہ رہا۔ میں نے نہایت مدھم سرگوشی کی۔ ''کس نے دیا یہ کاغذ؟''

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

''گروجی نے''
''کون گروجی؟''
''مادام ہاناوانی کے بڑے بھائی، وہ ایک پاس والے ٹاپو میں رہتے ہیں۔ لوگ کشتیوں پر بیٹھ کر ان سے ملنے جاتے ہیں اور دعائیں وغیرہ کراتے ہیں۔'' بینش نے میرے کان میں جوابی سرگوشی کی۔
''تم اُن سے کب ملی ہو؟''
''تین دن پہلے، میں اپنی والدہ کے ساتھ وہاں گئی تھی، اور بھی بہت سی لڑکیاں جاتی ہیں، کچھ شوبز والی ہیں، کچھ یہاں ڈی پیلس میں ملازمت کرتی ہیں۔''
''لیکن کہتے ہیں کہ مادام ہاناوانی اور اس کے بھائی حاذق میں جھگڑا ہے۔ وہ ایک دوسرے سے ملتے نہیں۔ تم ڈی پیلس میں ملازم ہو پھر بھی حاذق ذکریا کو گرو کہہ رہی ہو۔''
''وہ واقعی بہت بڑے گرو ہیں۔ مادام ہاناوانی کی طرف سے کوئی پابندی نہیں ہے کہ لوگ گرو حاذق ذکریا جی سے نہ ملیں۔''
''یہ تحریر تم تک کیسے پہنچی؟''
''گروجی نے میری والدہ کو دی تھی...... اور کہا تھا کہ تمہاری بیٹی کا ستارہ چمک رہا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ یہ ایک بڑا کام کرے۔ میری والدہ نے بڑے کام کی وضاحت چاہی تو انہوں نے کہا...... مجھے لگتا ہے کہ تمہاری بیٹی ڈی پیلس میں ایک خاص کام کے لیے چنی جائے گی۔ اسے ایک بہت خاص بندے کے پاس بھیجا جائے گا اگر یہ وہاں جائے تو پھر میرا ایک کام کرے۔ میں ایک پرچی دوں گا، یہ پرچی اسے اس خاص بندے تک پہنچانا ہوگی۔ والدہ نے گروجی کے قدم چھوئے اور یہ پرچی اُن سے لے لی۔'' بینش میرے کان میں مدّھم سرگوشیاں کررہی تھی اور اس کی گرم سانس میرے چہرے سے ٹکرا رہی تھی۔
اگر اس کمرے میں خفیہ کیمرے موجود بھی تھے تو گلابی رنگ کی اس سلکی چادر نے انہیں یکسر ناکام بنا رکھا تھا۔ وہ ایک پُرکشش لڑکی تھی اور بڑے ہیجان خیز انداز میں میرے ساتھ لیٹی ہوئی تھی مگر ان دنوں میرا دل و دماغ جس کیفیت میں سے گزر رہے تھے، میرے اندر رومانی احساسات کا دور دور تک نشان نہیں تھا۔ میں نے اپنے پیاروں کو کھویا تھا۔ اپنے جسم اور اپنی روح پر بے پناہ اذیت جھیلی تھی۔ میرے سینے میں انگاروں کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ میں نے عین اس کے کان میں سرگوشی کی۔ ''تمہیں یہ سب کرتے ہوئے ڈر نہیں لگا؟''
وہ منمنائی۔ ''ڈر تو بہت لگ رہا تھا۔ آپ سے بھی، اور اپنے کام سے بھی۔ لیکن گروجی کے لیے تو ہم سب کی جان بھی حاضر ہے۔ انہوں نے بہت کچھ دیا ہے اپنے چاہنے والوں کو...... اور اب بھی دے رہے ہیں۔''
میں نے ہاتھ بڑھا کر کمرے کی لائٹ آف کردی۔ اندھیرا چھا گیا مگر آج کل جس طرح اینٹی ڈارک عینکیں موجود ہیں اینٹی ڈارک کیمرے بھی زیر استعمال ہیں۔ ہمارا چادر کے نیچے ہی رہنا ضروری تھا۔ میرا ذہن مختلف کڑیاں جوڑ رہا تھا۔ اور اس کوشش میں کامیاب تھا۔ میرا دل گواہی دینے لگا کہ عنقریب مجھے مادام ہاناوانی کے سامنے لے جایا جائے گا۔ قبرص کی ملکہ المعروف ماذوداوا۔ وہی عورت جو آنکھوں کے جادو کی ماہر تصور کی جاتی ہے۔ اس تحریر کے ذریعے میرے ایک خیر خواہ نے مجھے اس آزمائش کے لیے تیار کیا تھا۔ لیکن میں تو اس خیر خواہ کو صرف نام سے جانتا تھا، کبھی میرا اور اس کا آمنا سامنا نہیں ہوا تھا مگر لگتا تھا کہ وہ میرے حالات سے پوری طرح واقف ہے، اور میری مدد کرنا چاہتا ہے۔ اسے اندیشہ تھا کہ ہاناوانی ہپناٹزم کے حوالے سے، مجھ پر اپنی صلاحیتوں کا استعمال کرے گی اور جو کام بدترین تشدد سے نہیں ہو پایا وہ "SUGGESTION" کے ذریعے کرنے کی کوشش کی جائے گی۔
اسی قسم کا اندیشہ میرے اپنے ذہن کی گہرائیوں میں بھی کہیں موجود تھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ پُراسرار شخص کی یہ پُراسرار تحریر میرے دل کو لگی تھی۔ اس تحریر کو ایک بار پھر پڑھنے کے بعد میں نے چادر کے اندر ہی منہ میں ڈال کر چبا لیا اور نگل لیا۔
میں نے بینش کے کان میں پوچھا۔ ''کیا تم پھر گروجی سے ملو گی؟''
''میں نہیں جانتی۔ اس کا پتا میری والدہ کو ہوگا۔''
میں نے کہا۔ ''تم میرے بارے میں کیا جانتی ہو؟''
''آپ ہر ہائی نس قسطینا کے قریبی ساتھی ہیں۔ لڑائی میں آپ نے جان کی بازی لگا کر ہر ہائی نس قسطینا کی جان بچائی۔ جزیرے میں بہت سے لوگ ہیں جن کی نظروں میں آپ ایک ہیرو ہیں۔ میں...... سوچ بھی نہ سکتی تھی کہ ایک دن اس طرح آپ کی خدمت میں بھیجی جاؤں گی۔ آپ کے جسم پر اتنے زخم دیکھ کر مجھے دکھ بھی ہوا ہے اور آپ سے بہت ڈر بھی لگا۔ مجھے خطرہ تھا کہ آپ کا غصہ مجھ پر نکلے گا اور

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

میں کسی مصیبت میں گرفتار ہو جاؤں گی لیکن گروجی کی باتوں کا حوصلہ بھی تھا...... اُن کا دیا ہوا حوصلہ بہت طاقت رکھتا ہے، بہت زیادہ۔''

میں نے کہا۔ ''اگر تمہارا یا تمہاری والدہ کا رابطہ پھر گروجی سے ہو تو ان سے کہو کہ میں نے ان کی بات کو سمجھا ہے اور اس پر پوری طرح عمل کی کوشش کروں گا۔ میری طرف سے ان کا شکریہ ادا کرو......''

''جیسے آپ کا حکم ہو۔'' وہ بولی۔

''ان سے کہنا...... میں چاہتا ہوں کہ مجھے ان کی رہنمائی پھر بھی ملتی رہے۔''

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد میں نے سرگوشی کی۔ ''تم بہت خوب صورت ہو، کوئی بھی مرد تمہاری خواہش کر سکتا ہے۔ اس صورتِ حال کو اپنی ناقدری یا بے عزتی نہ سمجھنا۔''

''میں جانتی ہوں کہ آپ بہت مشکل حالات سے گزر رہے ہیں۔ میرے لیے بھی بڑے اعزاز کی بات ہے کہ میں آپ کے کسی کام آسکی ہوں۔ آپ ان لوگوں میں سے ہیں، جن سے...... جاماجی کے عوام نے...... اچھے دنوں کی امید باندھ رکھی ہے۔''

ہم نے ایک دوسرے کے کان میں چند سرگوشیاں مزید کیں، ان سے مجھے یہ بھی پتا چلا کہ جن بیس لوگوں کے سروں پر انعام مقرر کیا گیا تھا، ان میں سے آدھے سے زیادہ مل گئے ہیں اور انہیں رائے زل کے حکم پر سرِ عام پھانسی بھی دے دی گئی ہے۔ اب زیادہ زور ہرہائی نس قسطینا اور ان کے ساتھیوں کی تلاش پر ہے۔ یوں لگتا ہے کہ حکومتی مشینری کو اس کے سوا اور کوئی کام ہی نہیں۔ رات دن ان کی تلاش جاری ہے۔

ان سرگوشیوں کے دوران میں ہم کسی وقت دو چار فقرے قدرے بلند آواز میں بھی بولتے تھے تاکہ اگر ہماری آواز سنی جا رہی ہو تو کسی کو ہماری مسلسل خاموشی پر شک نہ ہو۔ تحریر کے حوالے سے میرے ذہن میں زبردست ہلچل تھی۔

☆☆☆

اور پھر وہ دن آیا جب میں نے خود کو اس خطے کی سب سے انوکھی اور پُراسرار عورت کے روبرو پایا۔ میرے ہاتھ پشت پر ہتھکڑی میں جکڑے تھے اور پاؤں کو بھی کیبل ٹائی کی مدد سے باندھا گیا تھا۔ میں ایک کرسی پر بیٹھا تھا۔ یہ ڈی پیلس کا وہی پُرشکوہ کمرا تھا جو کبھی وڈے صاحب ریان فردوس کے بیڈ روم کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ مادام ہاناوانی مجھ سے آٹھ دس فٹ کی دوری پر ایک عالیشان نشست پر بیٹھی تھی۔ کمرے کی لائٹنگ اس طرح کی گئی تھی کہ ہاناوانی کے گرد روشنی کا ایک ہالہ سا نظر آتا تھا۔ کمرے کی روشنیوں نے پورے ماحول کو ایک اونگھتی ہوئی سی کیفیت دے دی تھی۔ میری کرسی نہایت آرام دہ تھی اور میری پلکوں پر ایک عجیب سا بوجھ تھا۔ اب مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ مجھے ہاناوانی کی خدمت میں پیش کرنے سے پہلے جو کھانا دیا گیا تھا اس میں کوئی خاص نشہ آور چیز موجود تھی۔

ہاناوانی نہایت بیش قیمت لباس میں تھی۔ اس کے زیورات میں قیمتی پتھر اور موتی جگمگا رہے تھے، ایک مسحور کن سی خوشبو اس کے جسم سے پھوٹتی محسوس ہوتی تھی۔ سیاہ چشمہ پہنے وہ ہمیشہ کی طرح بالکل ساکت بیٹھی تھی۔ گارڈز مجھے اس کے مقابل چھوڑ کر جا چکے تھے اور اب ہم دونوں کے سوا اس کمرے میں اور کوئی نہیں تھا۔ مجھے لگا کہ میرا سر چکرا رہا ہے اور ایک کمزوری سی میرے اندر اترنا چاہ رہی ہے۔ مجھے تحریر میں کہی ہوئی باتیں یاد آئیں۔

اپنے جسم کو ڈھیلا مت چھوڑنا۔ سانس روک کر رکھنا۔

اس عورت کی دونوں آنکھوں کے بجائے ایک آنکھ میں دیکھنے کی کوشش کرنا خود کو کسی ذہنی یا جسمانی تکلیف میں مبتلا رکھنا۔

پھر مادام ہاناوانی نے اپنا سیاہ چشمہ اتارا۔ میں بے ساختہ اس کی طرف دیکھنے پر مجبور ہوا۔ یوں لگا اس کے زیورات کی طرح اس کی آنکھوں میں بھی دو ہیرے ہی رکھے ہیں۔ میں نے سمجھا تھا کہ وہ کچھ بولے گی...... کچھ کہے گی مجھ سے۔ مگر جو کچھ ہوا وہ بالکل مختلف اور اچانک تھا۔ اردگرد کا سارا ماحول جیسے کسی دھند میں چھپ گیا۔ مجھ سے بہت دور چلا گیا۔ میرے سامنے ایک بہت بڑا بھنور تھا لیکن یہ پانی کا نہیں سات رنگوں کا بھنور تھا۔ ساتوں رنگ بے حد تیزی سے گھوم رہے تھے۔ بھنور کی اندرونی آنکھ مجھے اپنی طرف کھینچ رہی تھی۔ میرے ڈوبتے ہوئے ذہن میں وہی بات آئی کہ بھرپور مزاحمت کرنی ہے اور خود کو ذہنی یا جسمانی طور پر کسی تکلیف میں مبتلا رکھنا ہے۔ میں نے اپنی پشت پر بندھے ہوئے دائیں ہاتھ کو حرکت دی۔ ایک بات جیسے پہلے سے میرے ذہن میں موجود تھی۔ ہاتھ کا انگوٹھا بری طرح مجروح تھا۔ ہلکی سی ٹھیس بھی برداشت نہیں ہوتی تھی۔ میں نے بیدردی سے اپنے اس انگوٹھے کو موڑا اور شہادت کی انگلی سے اسے دبا دیا۔ درد کی ناقابلِ بیان لہریں انگوٹھے کی پور

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

سے لے کر کہنی تک پھیلنے لگیں۔
مجھے صاف محسوس ہوا کہ ست رنگے بھنور کی بے پناہ کشش قدرے کم ہوگئی ہے۔جو نادیدہ ڈوریں مجھے اس کی طرف کھینچ رہی تھیں، ان کا تناؤ کم ہوگیا ہے۔ کچھ دیر یہ زبردست کشمکش جاری رہی، پھر مجھے اپنے اردگرد دو بے حد بدہیئت عورتیں نظر آئیں۔ سیاہ بھجنگ......اور سرخ آنکھوں والی۔ انہوں نے اپنے بال کھول رکھے تھے اور بین کررہی تھیں۔ ان کے لمبے دانت چمکارے مارے تھے۔ وہ مجھے اس بھنور کی طرف ہانک رہی تھیں۔ ''ہم چاند گڑھی سے آئی ہیں۔ ہم نے وہاں بھی بہت خون پیا ہے۔'' وہ پکار رہی تھیں۔

اپنے انگوٹھے پر دباؤ بڑھاؤ...... تکلیف پیدا کرو...... تکلیف پیدا کرو۔ میرے ذہن میں سے ایک آواز بلند ہوئی۔

میں نے انگوٹھے کو مسل ڈالا۔ مجھے لگا کہ خون رسنے لگا ہے۔ پس بہنے لگی ہے۔ درد کی لہریں بلند و بالا تھیں۔ بین کرتی ہوئی اور کریہہ آوازوں میں چلاتی ہوئی ایک عورت کا چہرہ بالکل میرے ازلی دشمن جان ڈیرک جیسا ہوگیا۔ وہ عورت مردانہ آواز میں دہاڑنے لگی۔ بہت اذیت دے کر ماروں گا۔ موت کو ترسو گے...... دہاڑنے کے ساتھ ساتھ وہ عورت بھی دوسری عورت کی طرح مجھے ست رنگے بھنور کی طرف دھکیل رہی تھی۔ میں اپنی جگہ جم کر کھڑا رہا۔ میرے ہاتھ میں اٹھنے والی درد کی لہریں مجھے حواس کھونے سے بچاتی رہیں...... کچھ دیر یہ جان لیوا کشمکش بھی جاری رہی...... پھر ختم ہوگئی۔

مجھے لگا کہیں بہت دور سے مادام ہاناوانی کی بھنبھناہٹ جیسی آواز میرے کانوں تک پہنچ رہی ہے۔ وہ مسلسل بول رہی ہے مگر نظر آرہی ہے نہ ٹھیک سے سنائی دے رہی ہے۔ ست رنگا بھنور بھی میری آنکھوں کے سامنے تھا۔ اس میں ستارے سے چمک رہے تھے۔ حالتِ مدہوشی میں بھی میرا دل گواہی دے رہا تھا کہ اگر میں اس بھنور میں چلا گیا تو پھر وہی ہوگا جو ہاناوانی مجھ سے چاہے گی۔
اچانک اس بہت بڑے بھنور کے اندر سے سیاہ نقطے سے نمودار ہوئے۔ وہ ذرا واضح ہوئے تو پتا چلا کہ انسانی سر ہیں۔ یہ سر اور سیاہ بال واضح ہوتے چلے گئے۔ یہ خوبرو لڑکیاں تھیں۔ سر سے پاؤں تک عیاں۔ بدن سانچے میں ڈھلے ہوئے اور بلوری، نظر ان پر پڑے تو پھر حرکت کرنا بھول جائے۔ ان کی آنکھوں میں خمار ہی خمار تھا۔ پھر ان کے درمیان سے تاجور نمودار ہوئی۔ پری پیکر، کشش کی مورتی، مہ رخ مہ جبیں۔ اس کے جسم پر گلاب کے پھولوں کا لباس تھا جو اسے کہیں سے چھپاتا تھا، کہیں سے عیاں کرتا تھا۔ اس کی آنکھوں کا بے پناہ نشہ مجھے اپنی طرف بلا رہا تھا۔ اس نے عجیب گونجتی ہوئی سی آواز میں کہا۔ ''مجھے جھوٹ نہ سمجھیں...... میں سچ ہوں...... مجھے چھو کر دیکھ لیں، آپ کو یقین آجائے گا۔ آپ حیران رہ جائیں گے کہ خیال کس طرح حقیقت میں بدلتا ہے۔''
ذہن میں دھند بھرتی جارہی تھی، میرے اندر کچھ کمزور پڑ رہا تھا۔ اگر یہ صرف تخیل کی کارفرمائی تھی تو بھی اتنی دلکش تھی کہ میں اسے چھونا چاہتا تھا۔ میں اس کے جسم کے سارے پھول چن لینا چاہتا تھا اور پھر اسے بانہوں میں لے کر اپنی تمام تر آسودگی کے ساتھ اسی بھنور کے اندر چلا جانا چاہتا تھا، کوئی میرے اندر سے کہہ رہا تھا اگر یہ سب کچھ تخیل اور فریبِ نظر بھی ہے تو بھی اتنا پُرلطف ہوگا کہ تاقیامت اس کے سُرور میں ڈوبے رہو گے۔
ایک دوسری آواز دل کے نہاں خانوں سے ابھری۔ خود کو کمزور نہ پڑنے دینا...... خود کو ذہنی یا جسمانی اذیت میں مبتلا کرنا...... کرتے چلے جانا......
میں نے خود کو ذہنی اذیت دی۔ جاناں کی موت...... اس کی خون میں لتھڑی ہوئی انگلیاں...... موت کی ہچکیاں، سیف کا آخری فقرہ...... آپ مجھ سے ناراض تو نہیں...... زہر کی اذیت سے اس کا تڑپتا ہوا زخمی جسم...... عبدالکریم کی پھانسی اور نزع کے عالم میں اس کے جسم پر گولیوں کی بوچھاڑ...... میں نے جسمانی اذیت کو بھی اس میں شامل کیا۔ میرے انگوٹھے کا زخم پھٹ گیا۔ مجھے لگا میرے ہاتھ پر لہو کی ''چپچپاہٹ'' ہے۔ پورا بازو درد کی شدت سے لرز رہا ہے۔ ٹیسیں تیز تر ہوتی جارہی ہیں۔ پتا نہیں کہ کتنا وقت اسی طرح گزرا، پھر ست رنگے بھنور میں چمکتے ہوئے ستارے بجھ گئے۔ تاجور کا چہرہ اوجھل ہوگیا۔ بھنور کے رنگ ماند پڑنے لگے...اور پھر...... معدوم ہوگئے۔ مجھے لگا، کسی نے میرے سینے پر زور سے لات رسید کی ہے اور میں کرسی سمیت فرش پر لڑھک گیا ہوں...... میرے حواس بحال ہونے لگے...... میں نے دیکھا کہ مادام ہاناوانی والی پُرشکوہ نشست اب خالی پڑی ہے۔●

خونریزی اور بربریت کے خلاف
صف آرا نوجوان کی کھلی جنگ
باقی واقعات آیندہ ماہ پڑھیے

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

خطرہ

شاکر لطیف
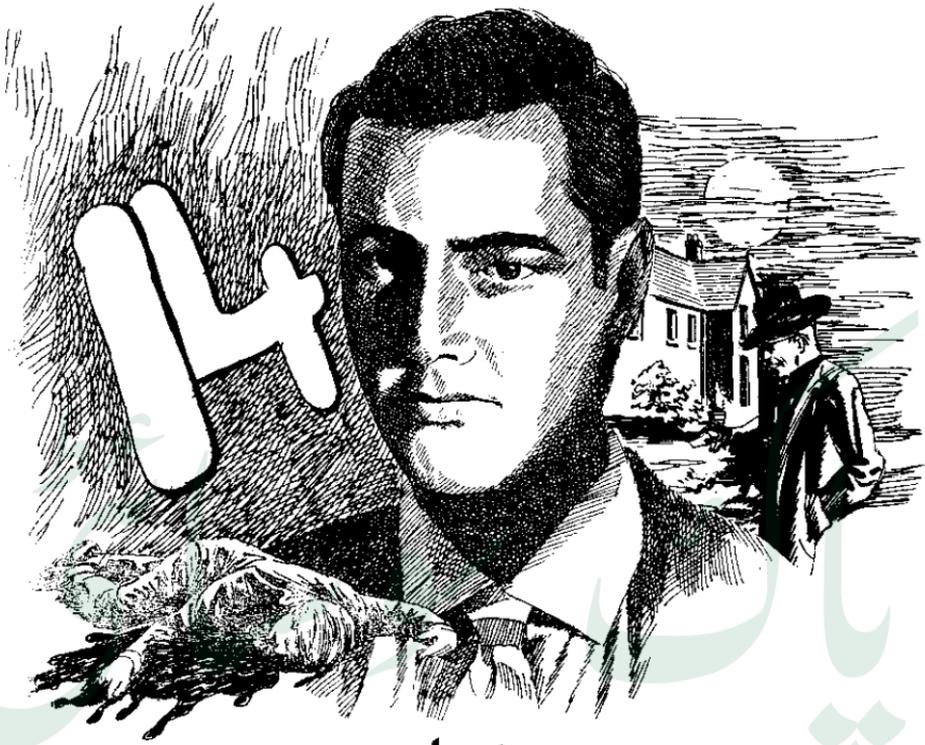
جادثات اور سانحات انسانی زندگی کے ساتھ سفر میں رہتے ہیں... انسان میں زندگی کی رمق جب تک باقی ہے... وہ ہر حادثے سے نمٹ سکتا ہے... ایک ایسے ہی شخص کی روداد... وہ خطرے کی زد میں تھا مگر اس سے بے خبر تھا...

شہر میں ہونے والی قتل کی پراسرار وارداتوں کا سنسنی خیز احوال

میں اس وقت بڑے انہماک سے ٹی وی پر آنے والی خبریں دیکھ رہا تھا، یہ خبریں شہر میں ہونے والے قتل کی بھیانک وارداتوں کے بارے میں تھیں۔ پچھلے چار مہینوں میں قتل کی چار خوفناک وارداتوں نے پورے شہر میں سنسنی پھیلا دی تھی۔ رہی سہی کسر میڈیا پر جاری ہونے والی مرچ مسالے دار خبریں پوری کر رہی تھیں۔ اس بارے میں میری ذاتی رائے یہی تھی کہ شہر میں خوف وہراس پھیلانے میں اس قاتل کے ساتھ ساتھ کچھ کردار میڈیا کا بھی تھا جن کا موضوع

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

ہی آج کل اس پراسرار قاتل کی شخصیت تھی۔ وہ کون تھا اور اس قدر بے رحمانہ انداز میں لوگوں کو کیوں مار رہا تھا۔ وہ ایسا کر کے اپنا کون سا مقصد پورا کرنا چاہتا تھا۔ میڈیا پر اس سلسلے میں مختلف افسانے اور کہانیاں پھیلائی جارہی تھیں۔ تاہم پولیس کی جانب سے جاری کردہ رپورٹ زیادہ اہم اور قابلِ غور تھی۔

پولیس کے مطابق ابھی تک قاتل کی تلاش جاری تھی اور اسے جلد ہی گرفتار کرلیا جائے گا۔ اب تک کی تفتیش سے یہی لگتا ہے کہ یہ کوئی ماورائی چکر ہے۔ کوئی ذہنی مریض اپنا کوئی جادوئی عمل تکمیل تک پہنچانے کے لیے لوگوں کی جانیں لے رہا ہے، لندن شہر میں ماضی میں بھی ایسے واقعات ہو چکے تھے جب بلیک میجک کے ماہرین نے لوگوں کی جانیں لی تھیں۔ پولیس کے موقف کی ٹھوس وجوہات بھی موجود تھیں اب تک ہونے والے قتل کی ان تمام وارداتوں میں کچھ باتیں یکساں تھیں۔ قتل ہونے والے تمام افراد کو مارنے کے بعد ان کی آنکھیں نکال لی جاتی تھیں، تمام قتل مہینے کی چودہ تاریخ کو ہی کیے جاتے تھے جس کی وجہ سے یہ قیاس کیا جارہا تھا کہ یہ کوئی جادوئی چکر ہے کیونکہ چودھویں رات کا چاند کالا جادو کرنے والے افراد کے لیے بڑی اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔ تمام مقتولین میں یہ بات بھی مشترک تھی کہ سب کو پہلے سر میں کوئی آہنی چیز مار کر بے ہوش کیا گیا تھا۔ اس کے بعد زہریلا انجکشن لگا کر ہمیشہ کی نیند سلا دیا گیا تھا جس کے بعد انتہائی صفائی سے ان سب کی آنکھیں نکال لی گئی تھیں۔ اب تک ایک نوجوان، دو خواتین اور ایک بزرگ شہری قاتل کا نشانہ بن چکے تھے جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ اس کا نشانہ کوئی مخصوص جنس یا عمر کے افراد نہیں ہیں۔ اسے بس انسانی آنکھیں درکار ہوتی تھیں۔ حیرت ناک بات یہ تھی کہ ہر لاش کے پاس ایک سفید رنگ کا کارڈ ملتا تھا جس پر مقتول کا نام کندہ ہوتا تھا۔ یعنی قاتل کو معلوم تھا کہ اس کا نشانہ بننے والا کون ہے۔ وہ اچانک کسی کو قتل نہیں کرتا تھا بلکہ اس کے لیے ٹھوس پلاننگ کرتا تھا۔ پولیس نے یہ بات تسلیم کی تھی کہ قاتل چاہے کوئی جادوگر ہو یا نفسیاتی مریض مگر تھا ایک ذہین اور شاطر انسان جو قتل کرنے کے بعد اپنے پیچھے کوئی سراغ نہیں چھوڑتا تھا۔

اس کا نشانہ بننے والا پہلا شخص ایک پچیس سالہ نوجوان تھا جو ایک اسٹور میں کیشیئر تھا۔ وہ لیٹ نائٹ اپنی ڈیوٹی آف کر کے اسٹور سے نکلا اور پھر پیدل ہی اپنے گھر کی جانب روانہ ہوا کیونکہ اس کی رہائش گاہ زیادہ دور نہ تھی اس لیے یہ اس کا معمول تھا تاہم ایک تاریک گلی سے گزرتے ہوئے وہ قاتل کا نشانہ بن گیا۔ دونوں خواتین کی کہانی بھی اس سے زیادہ مختلف نہ تھی۔ وہ بھی لیٹ نائٹ اپنی ڈیوٹی آف کر کے گھر واپس جاتے ہوئے قاتل کا نشانہ بنی تھیں۔ تاہم بزرگ شہری کو ان کے گھر میں گھس کر قتل کیا گیا تھا، ان کی فیملی کسی پارٹی میں شرکت کرنے گئی ہوئی تھی اور وہ اس وقت گھر میں اکیلے تھے۔ پوسٹ مارٹم میں ان کی موت کی وجہ بھی زہریلا انجکشن ہی بتائی گئی تھی۔

میڈیا کے بعض نمائندے پولیس کو خاصی تنقید کا نشانہ بھی بنا رہے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ اگر پولیس پہلے قتل کے بعد ہی قاتل کو گرفتار کرنے میں کامیاب ہو جاتی تو مزید انسانی جانیں ضائع ہونے سے بچ جاتیں۔ میڈیا پولیس رپورٹ سے بھی پوری طرح متفق نہیں تھا۔ بعض کے نزدیک یہ ضروری نہیں تھا کہ یہ کسی کالے جادو کے ماہر کا ہی کام ہو، یہ بھی ممکن تھا کہ کوئی دہشت گرد اپنے مذموم مقاصد کی تکمیل کے لیے شہر میں خوف و ہراس پھیلانا چاہتا ہو یا یہ بھی ممکن تھا کہ وہ واقعی میں کوئی پاگل یا نفسیاتی مریض ہو۔ تاہم یہ بھی حقیقت تھی کہ جب تک قاتل گرفتار نہیں ہو جاتا یہ تمام آرا اندازوں اور مفروضوں پر ہی مشتمل تھیں۔ ابھی حتمی طور پر کوئی بھی کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔

آج بھی مہینے کی چودہ تاریخ تھی۔ پولیس کی طرف سے باقاعدہ لوگوں کو وارننگ جاری کی گئی تھی کہ آج اپنے گھر سے نکلتے وقت بہت احتیاط سے کام لیں، خاص کر جو لوگ تنہا گھر سے باہر جائیں وہ بہت محتاط رہیں اور اپنے آس پاس سے بالکل غافل نہ ہوں۔ اس بات کا امکان موجود ہے کہ وہ پُراسرار قاتل آج پھر کسی کو اپنا نشانہ بنائے گا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ وہ کسی کے گھر میں گھسنے کی کوشش کرے، اس لیے اپنے گھر کی کھڑکیاں اور دروازے مقفل رکھیں اور کسی بھی انجان شخص کے لیے اس وقت تک دروازہ نہ کھولیں جب تک اس کے بارے میں تسلی نہ کرلیں۔

میں نے ٹی وی بند کر دیا کیونکہ ایک ہی قسم کی خبریں بار بار دیکھ کر میں بور ہونے لگا تھا مگر پھر بھی میں نے ایک بار اپنے گھر کی کھڑکیاں اور دروازے چیک کر لیے...... شاید دل ہی دل میں، میں بھی اس پُراسرار قاتل سے خوف زدہ تھا اور پھر دو خواتین کو قتل کرنے کا واقعہ تو میری رہائش گاہ سے صرف ایک کلومیٹر دور پیش آیا تھا اس لیے میری احتیاط بجا تھی۔

میرا نام ڈیوڈ پارکر ہے۔ میں لندن کے ایک بینک میں منیجر کے عہدے پر فائز ہوں۔ تاہم اب جلد ہی میری

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

ریٹائرمنٹ ہونے والی تھی۔ تاہم مجھے اپنے آنے والے کل کی کوئی خاص فکر نہیں تھی۔ میں جانتا تھا کہ پنشن کی رقم سے بھی میرا خرچ اچھی طرح چلتا رہے گا اور پھر میں اپنے گھر میں اکیلا ہی رہائش پذیر تھا اس لیے اخراجات بھی اتنے زیادہ نہ تھے۔ میری بیوی مارتھا کو وفات پائے تقریباً ایک سال سے زیادہ کا عرصہ گزر چکا تھا۔ ایک بیٹا تھا جو کافی عرصہ پہلے شادی کر کے آسٹریلیا منتقل ہو چکا تھا۔ اس سے ملے ہوئے بھی کافی عرصہ گزر گیا تھا بس کبھی کبھی فون پر بات چیت ہو جاتی تھی۔ وہ اپنی بیوی کے ساتھ بہت خوش و خرم زندگی بسر کر رہا تھا اور ایک باپ ہونے کے ناتے میں بھی اس کی خوشی میں خوش تھا۔ میری اپنی زندگی بھی خاصے آرام اور سکون سے گزر رہی تھی۔ اگرچہ کبھی کبھی مارتھا کی کمی محسوس ہوتی تو طبیعت پر ہلکی سی اُداسی طاری ہو جاتی اور اکیلے پن کا احساس بھی ہونے لگتا۔ مجھے چائے کی طلب محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے کچن میں جا کر اپنے لیے چائے بنائی اور پھر ڈرائنگ روم میں آ کر ایک آرام دہ صوفے پر براجمان ہو کر دوبارہ اس پُراسرار قاتل کے بارے میں سوچنے لگا۔

آخر اسے چار انسانی جانیں لے کر کیا حاصل ہونے والا تھا۔ کیا وہ اس قدر توہم پرست تھا کہ اسے یقین تھا کہ اس طرح وہ اپنا کوئی مقصد پورا کر سکے گا، جہالت کی بھی حد ہوتی ہے۔ میں ایک پڑھا لکھا انسان تھا اور اس حقیقت سے آگاہ تھا کہ کالا جادو کی حقیقت کسی شعبدے سے زیادہ نہیں ہو سکتی۔ حقائق کی دنیا میں رہنے والے کبھی ایسی باتوں پر یقین نہیں رکھتے۔ شاید وہ قاتل واقعی میں کوئی نفسیاتی مریض یا خوابوں کی دنیا میں رہنے والا شخص ہے جس کا خیال ہے کہ قتل جیسے گھناؤنے فعل کا ارتکاب کر کے وہ اپنی منزل پا لے گا۔ میں لندن جیسے شہر کا رہائشی تھا جہاں کی زیادہ تر آبادی پڑھی لکھی تھی مگر شاید کچھ جاہل بھی موجود تھے جنہوں نے پورے شہر کا امن و امان تباہ کر رکھا تھا اور میری رائے کے مطابق لندن پولیس کو اس پُراسرار قاتل کی شکل میں ایک بار پھر کسی توہم پرست اور جاہل کا سامنا تھا۔ مجھے اس بات کا بھی پورا یقین تھا کہ پولیس اس قاتل کو پکڑنے میں کامیاب ہو جائے گی کیونکہ ایسے معاملات میں لندن پولیس کا ریکارڈ بہت شاندار ہے۔ بہر حال یہ سب بعد کی باتیں تھیں موجودہ صورتِ حال میں، میں دل ہی دل میں دعا کر رہا تھا کہ آج اس جنونی کے ہاتھوں کسی کی جان ضائع نہ ہو۔

میرے گھر کی بیل بجی تو میں چونک کر اپنے خیالات کی دنیا سے باہر آ گیا۔ رات کے آٹھ بجے تھے اور اس وقت میرے پرانے دوست پروفیسر مارتھر کے سوا کوئی بھی مجھ سے ملنے نہیں آتا تھا۔ ”کون ہے۔“ میں نے دروازے کے پاس جا کر پوچھا۔ ”میں ہوں۔ پروفیسر مارتھر کی آواز سن کر میں نے ایک طویل سانس لیتے ہوئے دروازہ کھول دیا۔

پروفیسر مارتھر میرا ہمسایہ بھی تھا۔ وہ بے اولاد تھا اور تقریباً چھ ماہ پہلے اس کی بیوی کا انتقال ہو گیا تھا جس کے بعد سے ہنس مکھ پروفیسر کچھ بجھا بجھا سا رہنے لگا تھا۔ میں جانتا تھا کہ اسے اپنی بیوی سے بہت محبت تھی اور بیوی کی موت کے بعد ہی اس کے مزاج میں یہ تبدیلی رونما ہوئی تھی۔ تاہم مجھے یقین تھا کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ وہ نارمل ہو جائے گا۔ جب میری بیوی کا انتقال ہوا تھا تو شروع شروع میں مجھے بھی کچھ اچھا نہیں لگتا تھا۔ تیس بتیس سال کی رفاقت ساتھ چھوڑ جائے تو ایسا ہی ہوتا ہے۔

”ہیلو پروفیسر! کیسے ہو؟“ دروازہ کھول کر میں نے خوش دلی سے اس کا استقبال کیا۔

”ٹھیک ہوں، دروازہ اندر سے بند کر دو۔ مجھے تم سے بہت ضروری بات کرنی ہے۔“ اس نے اندر آتے ہی مضطرب لہجے میں کہا تو میں چونک پڑا۔

”کیا بات ہے پروفیسر! تم اتنے پریشان کیوں دکھائی دے رہے ہو؟“ اسے ڈرائنگ روم میں بٹھاتے ہوئے میں نے استفسار کیا۔ میرے لیے اس کی آمد غیر متوقع نہیں تھی۔ وہ میرا دوست تھا اور اکثر اس وقت آ کر میرے پاس بیٹھ جاتا تھا۔ ہم وقت گزاری کے لیے شطرنج اور کارڈ وغیرہ بھی کھیلتے تھے۔ اس کے علاوہ گپ شپ کرنے اور کافی پینے میں بھی وقت اچھا گزر جاتا تھا مگر آج شاید اسے کوئی مسئلہ تھا۔

”اصل میں، میں ایک شخص سے پریشان ہوں۔ وہ پچھلے کئی دنوں سے میرے گھر کے آس پاس منڈلا رہا ہے اور اس وقت بھی میرے گھر کے بالکل سامنے کھڑا ہوا ہے۔ مجھے وہ آدمی ٹھیک نہیں لگ رہا، میری چھٹی حس کہہ رہی ہے کہ وہ آدمی خطرناک ہے اسی لیے میں تمہارے پاس چلا آیا ہوں تا کہ تم سے اپنی تشویش کے بارے میں مشورہ کر سکوں۔“ اس نے جواب دیتے ہوئے کہا۔

”تم کس کی بات کر رہے ہو پروفیسر؟“ میں نے حیرت بھرے لہجے میں پوچھا۔ ”کون تمہارے گھر کے آس پاس منڈلا رہا ہے؟“

”میں اسے نہیں جانتا۔“ پروفیسر مارتھر نے۔ ”میں نے اسے تین چار دن پہلے ہی دیکھا ہے، شروع شروع میں تو

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

...سے نظر انداز کر دیا مگر پھر ایک دن میں بازار سے ...ہا تھا۔ تو میں نے اسے اپنے گھر کی کھڑکی سے اندر ...ہوئے دیکھا میں فوراً اس کے پیچھے پہنچا اور اس سے ...کہ وہ بلا اجازت میرے گھر میں تاک جھانک کیوں ...ہے، اس طرح اچانک پکڑے جانے کی وجہ سے وہ ...پٹا گیا مگر پھر بولا کہ وہ تو کھڑکی کا ڈیزائن چیک کر رہا ...اس سے غلطی ہوئی کہ وہ بلا اجازت ایسا کر رہا تھا جس ...لیے وہ معذرت خواہ ہے، یہ کہہ کر وہ شخص چلا گیا مگر اگلے ...میں نے دوبارہ اسے دیکھا، مجھے محسوس ہوا جیسے وہ شخص میری نگرانی کر رہا ہے، نہ جانے کیوں مجھے اس سے انجانا سا خوف محسوس ہو رہا ہے۔ تم نے ٹی وی پر چلنے والی خبروں کو تو دیکھا ہی ہوگا جس میں شہر میں گھومنے والے کسی جنونی قاتل کے بارے میں وارننگ جاری کی گئی ہے۔'' پروفیسر کی بات سن کر میں بُری طرح چونک گیا اور مجھے اپنی ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ سی دوڑتی ہوئی محسوس ہوئی۔

''تم ٹھیک کہہ رہے ہو پروفیسر۔'' میں نے کہا۔ ''میڈیا میں آج کل اس پُراسرار قاتل کا بڑا چرچا ہے، پورا شہر ہی خوف زدہ ہے۔ پولیس کے مطابق آج چودہ تاریخ ہے اور اس بات کو خارج از امکان قرار نہیں دیا جا سکتا کہ وہ جنونی آج پھر کسی کو اپنا نشانہ بنائے گا مگر یہ بھی ضروری نہیں کہ تمہارے گھر کے آس پاس منڈلانے والا شخص وہی ہے۔''

''فی الحال میں بھی یقین سے یہ بات نہیں کہہ رہا۔'' پروفیسر نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے جواب دیا۔ ''مگر نہ جانے کیوں مجھے احساس ہو رہا ہے کہ وہ شخص میرے لیے خطرہ بن سکتا ہے اس کی شخصیت خاصی خوفناک معلوم ہوتی ہے، وہ لمبا رین کوٹ اور سر پر گول ہیٹ پہنے دور سے ہی نمایاں نظر آتا ہے، اگر تم کھڑکی سے میرے گھر کا جائزہ لو تو وہ تمہیں کھڑا نظر آجائے گا اگر یہ وہی پُراسرار قاتل ہے جس نے پورے شہر کو دہشت زدہ کر رکھا ہے تو پھر اس کا اگلا نشانہ میں ہی ہوں۔''

''ہمیں فوراً پولیس کو مطلع کر دینا چاہیے۔'' پروفیسر مارتھر کی بات سُن کر میں نے تیز لہجے میں کہا۔ میرے لہجے میں گھبراہٹ کا عنصر نمایاں تھا۔

''نہیں۔'' پروفیسر مارتھر نے نفی میں سر ہلا دیا۔ ''میں جب تک اس کے بارے میں کنفرم نہیں ہو جاتا اس وقت تک پولیس کو مطلع نہیں کروں گا۔ میں نہیں چاہتا کہ میرا خیال غلط ثابت ہو اور مجھے اس شخص اور پولیس کے سامنے شرمندگی اٹھانی پڑے۔''

میرا دل چاہا کہ پروفیسر کو متنبہ کروں کہ جب وہ شخص تمہیں ایک لاش میں تبدیل کر دے گا اور تمہاری آنکھیں نکال لے گا اس وقت تم اس کے بارے میں یقیناً کنفرم ہو جاؤ گے مگر چاہتے ہوئے بھی میں اپنے خیالات کو زبان پر نہ لا سکا۔

''پروفیسر میری اب بھی یہی رائے ہے کہ پولیس کو مطلع کر دیا جائے اگر ہمارا خیال غلط ثابت ہوا تو ہم اس شخص اور پولیس سے معذرت کر لیں گے، اگر ایک انجان شخص تمہارے گھر کے آس پاس منڈلا رہا ہے تو تمہیں اس بات کا حق حاصل ہے کہ اس کے بارے میں چھان بین کرو۔'' میں نے پُرزور لہجے میں کہا۔ حقیقت تو یہ تھی کہ جب سے پروفیسر نے مجھے اس شخص کے بارے میں بتایا تھا مجھے اپنے بارے میں بھی تشویش لاحق ہو گئی تھی کیونکہ پروفیسر مارتھر اور مجھ میں یہ بات یکساں تھی کہ ہم دونوں ہی اپنے گھروں میں اکیلے رہتے تھے اگر پروفیسر کا مفروضہ درست ثابت ہوتا اور وہ شخص واقعی میں وہی قاتل تھا تو پھر اس کے ساتھ ساتھ میری جان کو بھی خطرہ تھا کیونکہ اکیلا رہائش پذیر ہونے کی وجہ سے میں بھی اس کے لیے آسان شکار ثابت ہو سکتا تھا۔

''ذرا کھڑکی سے اس کا جائزہ تو لو، یہ بھی ممکن ہے کہ وہ جا چکا ہو۔'' پروفیسر نے میری تجویز ایک بار پھر ان سنی کرتے ہوئے کہا۔

پروفیسر کی بات سُن کر میں کھڑکی کے پاس پہنچ گیا جہاں سے باہر کا جائزہ لیا جا سکتا تھا۔ میں نے پردہ ہٹایا اور باہر کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔ موسم خاصا سرد تھا اور اب دھند کی وجہ سے زیادہ دور تک دیکھ پانا بھی ممکن نہیں رہا تھا۔ تاہم وہ مجھے نظر آ گیا۔ پروفیسر نے ٹھیک ہی کہا تھا، وہ شخص واقعی میں خاصا طویل القامت تھا۔ اس نے سیاہ رنگ کا لمبا کوٹ پہن رکھا تھا۔ سر پر گول ہیٹ کی وجہ سے اس کا چہرہ بھی خاصی حد تک چھپ گیا تھا اور پھر اگر اس نے ہیٹ نہ بھی پہن رکھا ہوتا تو دھند کی وجہ سے اس کا چہرہ واضح طور پر دیکھ پانا ممکن نہ تھا تاہم اس کے رخ سے مجھے اتنا اندازہ تو ہو ہی گیا کہ اس کی توجہ اس وقت میرے گھر کی جانب تھی۔ میرے دل کی دھڑکنیں بے ترتیب ہونے لگیں اور مجھے بھی یوں محسوس ہونے لگا جیسے یہ شخص شہر میں گھوم کر باقاعدہ پلاننگ کے تحت قتل کرنے والا وہی آدمی ہے اور اب اسے کسی نئے شکار کی تلاش ہے جو کہ میں بھی ہو سکتا تھا۔ خود کو بغیر آنکھوں والی لاش کے طور پر دیکھنے کا تصور ہی بڑا روح فرسا تھا۔

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اس کا چہرہ دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا مگر دھند کی وجہ سے وہ ایک ہیولے کی طرح نظر آ رہا تھا۔ اسی لمحے اس کے جسم میں حرکت پیدا ہوئی اور اس نے میرے گھر کی جانب بڑھنا شروع کر دیا۔ میں بے اختیار کھڑکی سے پرے ہٹ گیا۔ اسے اپنے گھر کی جانب قدم بڑھاتے دیکھ کر میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے اور مجھے یقین ہونے لگا تھا کہ یہ وہی جنونی قاتل ہے۔

”پروفیسر وہ اسی جانب آ رہا ہے۔“ میں نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”مجھے لگتا ہے کہ اس کے بارے میں تمہارا شک درست ہے۔“

”اس کی اگلی حرکت سے ثابت ہو جائے گا کہ میرا شک درست ہے یا غلط، اگر اس نے تمہارے گھر کے اندر داخل ہونے کی کوشش کی تو پھر یہ وہی ہے۔ محض اس کے اس طرف آنے سے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس کے بارے میں ہمارے شکوک و شبہات درست ہیں۔ بہرحال تمہیں ہمت سے کام لینا چاہیے، ابھی تک اس نے ایسی کوئی حرکت نہیں کی جو قانون کے دائرۂ گرفت میں آتی ہو۔“ پروفیسر نے میرے اوسان خطا ہوتے دیکھ کر مجھے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

”میں بزدل نہیں ہوں، پروفیسر مارتھر۔“ میں نے خجالت آمیز لہجے میں کہا۔ ”مقابلہ کرنا مجھے بھی آتا ہے۔ میں تو بس یہ کہہ رہا تھا کہ مجرموں سے نمٹنا پولیس کا کام ہے ہمارا نہیں۔“

”پہلے ثابت تو ہو جائے کہ وہ مجرم ہے بھی یا نہیں، کہیں ہمارے شکوک و شبہات کا پہاڑ بعد میں مٹی کا ڈھیر ثابت ہو جائے اور ہمیں شرمندگی کا سامنا کرنا پڑے۔“ پروفیسر نے ناصحانہ لہجے میں کہا۔

”اور اگر یہ شخص وہی جنونی قاتل ہوا تو......؟“ میں نے استفسار کیا۔

”تو پھر ہم پولیس کو مطلع کر دیں گے۔“ پروفیسر پُرخیال لہجے میں بولا۔ ”ویسے بھی ہم دو ہیں اگر وہ اندر داخل ہو بھی جائے تو اتنی آسانی سے ہمارا شکار نہیں کر سکتا۔“

”یہ بھی تو ممکن ہے پروفیسر کہ اس کے پاس کوئی آتشی ہتھیار ہو۔“ میری گھبراہٹ نہ چاہتے ہوئے بھی میرے لہجے سے عیاں ہو رہی تھی۔

”میرا خیال ہے کہ تم ضرورت سے زیادہ گھبرا رہے ہو۔“ پروفیسر نے استہزائیہ لہجے میں کہا۔ ”تم اپنے گھر میں موجود ہو اور غالباً تم نے ساری کھڑکیاں اور دروازے بھی اندر سے بند کر رکھے ہیں۔ وہ اتنی آسانی سے اندر داخل نہیں ہو سکتا۔“

اس سے پہلے کہ میں پروفیسر مارتھر کو کوئی جواب دیتا میرے گھر کی بیل بج اٹھی اور میں بے اختیار اچھل پڑا۔

”مجھے یقین ہے کہ بیل اسی نے دی ہے۔ میں دروازہ نہیں کھولوں گا۔“ میں نے تیز لہجے میں کہا۔

”ٹھیک ہے۔“ پروفیسر مارتھر نے کندھے اچکا کر کہا۔ ”کسی کے گھر کی گھنٹی بجانا بھی قانوناً کوئی جرم نہیں ہے۔ اب سب کچھ واضح ہو جائے گا اگر یہ شخص ہمارے لیے خطرہ نہیں ہے تو پھر واپس چلا جائے گا اگر اس نے اندر داخل ہونے کے لیے کوئی دوسرا راستہ اختیار کیا تو پھر میرا شبہ درست ثابت ہو جائے گا کہ یہ وہی جنونی قاتل ہے۔“

پروفیسر مارتھر کی بات میں وزن تھا۔ میں خاموشی سے اپنی جگہ پر کھڑا رہا، مجھے اس بات سے خاصی سبکی کا احساس بھی ہو رہا تھا کہ میں نے پروفیسر کے سامنے اپنی حرکتوں سے یہ ظاہر کر دیا تھا کہ میں اندر سے ایک ڈرپوک آدمی ہوں، مجھے اندازہ تھا کہ یہ وقت گزرنے کے بعد بھی وہ اس واقعے کو بنیاد بنا کر میرا مذاق اڑانے سے باز نہیں آئے گا۔ میں نے دل ہی دل میں فیصلہ کیا کہ اب میں پروفیسر کے سامنے مزید بزدلی یا گھبراہٹ کا مظاہرہ نہیں کروں گا اور اپنے اوسان بحال رکھوں گا۔

گھنٹی کی آواز کچھ دیر تک آتی رہی اور پھر خاموشی چھا گئی۔ ابھی یہ بات وثوق سے نہیں کہی جا سکتی تھی کہ وہ واپس چلا گیا ہے اسی لمحے ایک طرف کی کھڑکی کے پاس سے ہلکی ہلکی آواز سنائی دی تو میں لرز کر رہ گیا۔ یہ کھڑکی باہر سے متصل تھی اور آواز سے محسوس ہو رہا تھا کہ کوئی اسے کھولنے کی کوشش کر رہا ہے۔

پروفیسر مارتھر نے معنی خیز نظروں سے میری طرف دیکھا اور پھر صوفے سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے انگلی کے اشارے سے مجھے خاموش رہنے کا کہا اور پھر کمرے میں موجود ایک گلدان اٹھا کر دبے پاؤں چلتا ہوا کھڑکی کے پاس جا پہنچا اور ایک سائڈ پر دیوار کے ساتھ اپنی پشت چپکا کر کھڑا ہو گیا گویا اسے یقین تھا کہ وہ شخص کھڑکی کھولنے میں کامیاب ہو جائے گا۔ اس لیے وہ اس کا استقبال کرنے کے لیے پوری طرح تیار ہو گیا تھا۔

پروفیسر کو ایسا کرتے دیکھ کر میں بھی ایک صوفے کی اوٹ میں چھپ گیا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ کھڑکی کا پردہ ہٹا کر دیکھنے پر اس کی نظر مجھ پر پڑے۔ اگرچہ موسم خاصا سرد تھا اور میں نے ہیٹر بھی آن نہیں کیا تھا مگر اس کے باوجود میرے ماتھے پر پسینے کے قطرے نمودار ہو چکے تھے۔

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

مجھے پروفیسر کی جرأت اور ہمت پر حیرت بھی ہو رہی تھی۔ وہ ایک خطرناک قاتل کا مقابلہ کرنے کے لیے اس طرح کمربستہ ہو جائے گا، یہ میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔ وہ میرا بہت پرانا دوست تھا تاہم میں نہیں جانتا تھا کہ وہ اس قدر مضبوط اعصاب کا مالک ہے ورنہ یہ حقیقت تھی کہ میں آنے والی صورتِ حال سے بری طرح خوف زدہ تھا اور میری حالت پروفیسر کے بالکل برعکس تھی۔ میرے لیے یہ تصور ہی لرزہ خیز تھا کہ اگر پروفیسر اس شخص کو قابو کرنے میں ناکام رہا تو کیا ہوگا۔ شاید کل ہم دونوں کی بغیر آنکھوں کی لاشیں دریافت ہوں گی۔ یہ خیال آتے ہی میں بے اختیار جھرجھری لے کر رہ گیا اور میرے دل میں یہ خیال تقویت پکڑنے لگا کہ مجھے پولیس کو اطلاع کر دینی چاہیے تھی۔ میرا موبائل فون سامنے صوفے پر پڑا تھا۔ فیصلہ کرتے ہی میں اپنی جگہ سے اٹھا مگر ایک زوردار کھٹکے کی آواز نے مجھے دوبارہ بیٹھنے پر مجبور کر دیا۔ وہ شخص نہ جانے کیسے بند کھڑکی کھولنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ یعنی اب وہ اندر داخل ہونے والا تھا۔ اس شہر کا سب سے خطرناک اور سفاک قاتل میرے گھر میں داخل ہونے والا تھا۔ میرے جسم پر کپکپاہٹ طاری ہونے لگی۔ میں نے صوفے کی آڑ سے کھڑکی کا جائزہ لیا۔ پہلے پردہ ذرا سا کھسکا اور کسی نے اندر جھانک کر دیکھا۔ تاہم میں اور پروفیسر مارتھر ایسی پوزیشن میں تھے کہ اس طرح سے جھانکنے پر اسے دکھائی نہیں دے سکتے تھے۔ کچھ ہی دیر میں اس کا سر اندر داخل ہوا اور پھر وہ تیزی سے اندر کود آیا۔ عین اسی لمحے دیوار کے ساتھ چپک کر کھڑے پروفیسر مارتھر کا ہاتھ حرکت میں آیا اور اس نے اپنے ہاتھ میں موجود گلدان پوری قوت سے اس شخص کے سر پر دے مارا۔ ضرب خاصی زوردار تھی۔ اپنے سر پر پڑنے والی اس غیر متوقع اور ناگہانی افتاد نے اسے سنبھلنے کا موقع ہی نہ دیا تھا۔ وہ تیورا کر زمین پر گر گیا۔ اس کے سر سے خون بھی بہہ رہا تھا اور اس کا جسم بے حس و حرکت ہو چکا تھا۔

''باہر آجاؤ ڈیوڈ، یہ شخص بے ہوش ہو چکا ہے اور بے ہوش آدمی خطرناک نہیں ہوتا۔'' پروفیسر مارتھر نے اس شخص کے گرانڈیل وجود کا جائزہ لیتے ہوئے مجھے مخاطب کیا۔

''ویلڈن پروفیسر، ویلڈن!'' میں نے صوفے کی اوٹ سے باہر آتے ہوئے تحسین آمیز لہجے میں کہا۔ ''مجھے اندازہ نہیں تھا کہ تم اتنے بہادر آدمی ہو، تمہارا یہ روپ میرے لیے نیا اور انوکھا ہے۔''

''تعریف کا شکریہ۔'' پروفیسر نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ''یہ شخص اب تین سے چار گھنٹوں تک بے ہوش رہے گا۔ ہم لوگ خوش قسمت ہیں کہ ہمیں خطرے کا بروقت احساس ہو گیا۔ ورنہ یہ بھی حقیقت ہے کہ بعض انسانوں کو اپنی زندگی کے آخری لمحات تک خطرے کا احساس نہیں ہوتا۔ حالانکہ خطرہ ان کے قریب ہی ہوتا ہے۔''

''تم ٹھیک کہہ رہے ہو پروفیسر، آج تم نے اس خطرے کا بروقت تدارک کر کے اپنے ساتھ ساتھ میری جان بھی بچائی ہے۔ میں پولیس کو فون کر رہا ہوں، مجھے یقین ہے کہ کل کے اخبارات کی شہ سرخیوں میں تمہارا کارنامہ سرِفہرست ہوگا، جو کام پورے لندن کی پولیس نہیں کر سکی وہ ایک پروفیسر نے کر دکھایا۔'' یہ کہتے ہوئے میں نے صوفے پر موجود اپنا موبائل فون اٹھا لیا اور پولیس کا نمبر ملانے لگا۔ پروفیسر میرے بالکل پیچھے کھڑا تھا۔

''رک جاؤ......!'' دفعتاً میرے کانوں میں ایک اجنبی آواز گونجی۔ اس کے ساتھ ہی ایک کان پھاڑ دینے والا دھماکا ہوا اور موبائل فون میرے ہاتھ سے نیچے گر گیا۔ وہ شخص نہ صرف ہوش میں آ چکا تھا بلکہ اس نے انتہائی سرعت سے اپنا پستول نکال کر پروفیسر کو گولی بھی مار دی تھی۔ پروفیسر مارتھر زمین پر گرا تڑپ رہا تھا اور میں پھٹی پھٹی نگاہوں سے یہ سارا نظارہ دیکھ رہا تھا، مجھے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ شخص سر پر اتنی سخت ضرب لگنے کے باوجود ہوش میں کیسے آ گیا تھا۔

اس کے سر پر بہنے والا خون اس کے چہرے پر بھی آ گیا جس کی وجہ سے اس کی شکل بہت بھیانک لگ رہی تھی۔ سب کچھ اتنی تیزی سے اور آناً فاناً ہوا تھا کہ مجھے سنبھلنے کا موقع ہی نہ مل سکا تھا۔ پروفیسر مارتھر کا تڑپتا جسم اب ساکت ہو چکا تھا۔ اس کے عین دل کے مقام پر ایک چھوٹا سا سوراخ ہو چکا تھا اور اس کی بے نور آنکھیں اس بات کی گواہی دے رہی تھیں کہ وہ ملکِ عدم سدھار چکا ہے اور اب شاید میری باری تھی۔ میں خود کو مکمل طور پر بے بس اور اس سفاک درندے کے رحم و کرم پر محسوس کر رہا تھا۔ میں جانتا تھا کہ گولی چلنے کی آواز کافی دور تک سنی گئی ہوگی اور کوئی نہ کوئی پولیس کو بھی مطلع کر دے گا مگر شاید پولیس کے پہنچنے تک بہت دیر ہو چکی ہوگی۔ میں اس بری طرح سے خوف زدہ ہو چکا تھا کہ مجھ میں مزاحمت کرنے کی ہمت بھی دم توڑ چکی تھی۔ میں ابھی تک اس بات پر انگشت بدنداں تھا کہ سر پر پڑنے والی اس قدر سخت ضرب کے باوجود وہ اتنی جلدی ہوش میں کیسے آ گیا تھا۔ شاید وہ بے ہوش ہوا ہی نہیں تھا۔

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

غالباً اس نے بھی میرے چہرے سے حیرت بھانپ لی تھی۔

''تم شاید اس بات پر حیرت زدہ ہو کہ میں ہوش میں کیسے آ گیا۔ وہ سرد اور بھاری آواز میں بولا۔ ''اسے تم میری خوش قسمتی سے تعبیر کر سکتے ہو، آج سے دو سال قبل ایک ایکسیڈنٹ میں میری کھوپڑی کا پچھلا حصہ پچک گیا تھا اور میں مرتے مرتے بچا تھا۔ ڈاکٹروں نے میرے سر کے پچھلے حصے کا آپریشن کر کے ٹوٹی ہوئی ہڈی کی جگہ اسٹیل کی پلیٹس لگا دی تھیں۔ میں اکثر اس وجہ سے اپنے سر میں درد محسوس کرتا تھا اور اس وقت کو کوستا رہتا تھا جب میں حادثے کا شکار ہوا تھا مگر وہ کہتے ہیں نا کہ سب کچھ اچھائی کے لیے ہی ہوتا ہے۔ اس لیے جب میرے سر پر ضرب پڑی، اسٹیل کی پلیٹس کی وجہ سے اثر براہِ راست دماغ تک نہیں جا سکا اور میں بس وقتی طور پر چکرا کر گرنے کے بعد فوراً ہی ہوش میں آ گیا، اگر میں سچ مچ بے ہوش ہو جاتا تو نہ آج تم زندہ بچتے اور نہ میں۔ اس کے آخری الفاظ میرے لیے حوصلہ افزا تھے۔ کیا وہ مجھے زندہ چھوڑنے والا تھا؟ کیا پروفیسر کی صورت میں اسے اپنا شکار مل گیا تھا اور اسے آج مزید کسی کو مارنے کی ضرورت نہیں تھی۔

''کیا تم مجھے جان سے نہیں مارو گے۔'' امید کی کرن نظر آتے ہی میں بولا۔ ''یقین کرو میں پولیس کو تمہارے حلیے کے بارے میں کچھ نہیں بتاؤں گا۔ تم پروفیسر کی آنکھیں نکال کر خاموشی سے چلے جاؤ، مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ میرے سیف میں رقم بھی موجود ہے، تم چاہو تو لے جا سکتے ہو، بس مجھے زندہ چھوڑ دو، اپنی جان بچانے کے لیے میں تمہاری کوئی بھی شرط بخوشی تسلیم کر لوں گا۔''

میری بات سُن کر اس کے حلق سے ایک زوردار قہقہہ بلند ہوا اور اسے اس طرح ہنستے دیکھ کر میرے جسم پر دوبارہ کپکپاہٹ طاری ہو گئی۔ اس کا خون بہنا اب بند ہو چکا تھا اور بہہ کر چہرے پر آنے والا خون بھی جم چکا تھا۔ وہ واقعی میں ایک سفاک درندہ لگ رہا تھا۔ وہ ایک جیتے جاگتے انسان کو مارنے کے بعد کس قدر بے فکری سے ہنس رہا تھا۔ میں نے سن رکھا تھا کہ قاتلوں کے اعصاب بہت مضبوط ہوتے ہیں اور آج اس کا عملی مشاہدہ بھی ہو رہا تھا۔

''تو تم ابھی تک غلط فہمی کا شکار ہو۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''میں تمہاری جان لینے نہیں بلکہ تمہاری جان بچانے آیا ہوں۔''

''کیا مطلب؟'' میں نے حیرت زدہ لہجے میں سوال کیا۔

ایک پولیس افسر صاحبِ ذوق تھے۔ جب وہ ترقی پا کر تبدیل ہوئے تو ان کے ماتحتوں نے عشائیہ کے ساتھ مشاعرے کا بھی اہتمام کیا۔ کھانے کے بعد مشاعرہ شروع ہوا۔ تمام شعرا آ چکے تھے۔ البتہ مقامی کالج کے پرنسپل کا انتظار تھا۔ انہیں مشاعرے کی صدارت کرنا تھی۔ جب وقت زیادہ ہو چکا تو اسٹیج سیکریٹری نے مشاعرہ شروع کرنے کا اعلان کیا اور شوکت تھانوی مرحوم سے درخواست کی کہ وہ صدارت فرمائیں۔ شوکت صاحب ڈائس پر آئے اور مائک اپنے قریب کر کے بولے: حضرات! سیکریٹری صاحب کا یہ حکم میرے لیے غیر متوقع نہیں۔ مجھے علم تھا کہ تھانے کے مشاعرے کی صدارت کے لیے یہ لوگ ضرور کسی تھانوی ہی کو پکڑیں گے۔

☆☆☆

ایک دولت مند آدمی دیوالیا ہو گیا تھا۔ عدالت میں مقدمے کے دوران میں جج نے پوچھا۔ ''آخر اتنی ساری دولت کہاں چلی گئی؟'' دولت مند آدمی کے وکیل نے برجستہ کہا۔ ''تیز عورتوں اور سست گھوڑوں کے پاس۔''

☆☆☆

ایک شخص نے ملازمت سے ریٹائر ہونے کے بعد پرچون کی دکان کر لی۔ دکان چل نکلی تو اس نے ملازم بھی رکھ لیا۔ دکان بڑی تیزی سے ترقی کرنے لگی۔ ایک دن اس کا دوست ٹہلتا ہوا آیا اور ملازم کو دیکھ کر چونکا۔ ''ایں! یہ تو بھینگا ہے؟''

اس شخص نے برا مانتے ہوئے کہا۔ ''تم میرے ملازم کی توہین نہ کرو۔ یہ میرا محسن ہے۔''

اس دوست نے تعجب سے پوچھا۔ ''وہ کیسے؟''

اس شخص نے جواب دیا۔ ''دکان کی ترقی کا راز وہی ہے۔ اس کی وجہ سے چھوٹی موٹی چوریاں نہیں ہوتیں۔ کسی کو پتا ہی نہیں چل پاتا کہ وہ کس طرف دیکھ رہا ہے۔''

☆☆☆

ملازم (مالک سے)۔ ''میرا حساب کر دیجیے۔ میں بیگم صاحبہ کی وجہ سے کام نہیں کر سکتا۔''

مالک (حیرانی سے)۔ ''مگر تم کو بیگم صاحبہ سے کیا شکایت ہے؟''

ملازم۔ ''جی چھوٹی موٹی تو سیکڑوں شکایتیں ہیں مگر سب سے بڑی شکایت یہ ہے کہ وہ مجھے آپ کی طرح ڈانٹتی ہیں۔''

کراچی سے امتیاز احمد کی حیرت

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

''مطلب صاف اور سیدھا سا ہے اگر مجھے گولی چلانے میں چند لمحوں کی بھی تاخیر ہو جاتی تو پروفیسر اپنے ہاتھوں میں موجود گلدان کی زوردار ضرب سے تمہارا سر توڑ کر رکھ دیتا۔ تمہاری ساری توجہ اپنے موبائل فون کی جانب تھی۔ پروفیسر نے گلدان تمہارے سر پر مارنے کے لیے بلند کرلیا تھا۔ میرے پاس اس کے سوا کوئی چارہ کار نہ تھا کہ میں اس پر گولی چلا دیتا۔ میرا نام کارلوس ہے، سارجنٹ کارلوس۔ تم سمجھ ہی گئے ہوگے کہ میں پولیس والا ہوں۔ شہر میں ہونے والی قتل کی ان بھیانک وارداتوں کے بعد ہم اس قاتل تک پہنچنے کے لیے اپنا پورا زور لگا رہے تھے کیونکہ ہمارے خیال میں یہ کسی بلیک میجک کرنے والے آدمی کا کام تھا اس لیے ایسے تمام افراد کی نگرانی کی جارہی تھی جو جادو وغیرہ میں دلچسپی رکھتے تھے۔ وہیں سے ہمیں پروفیسر مارتھر کے بارے میں معلوم ہوا۔ اس نے پانچ چھ ماہ پہلے کالے جادو کے کافی ماہرین سے ملاقاتیں کی تھیں۔ اسے میجک کی ان کتابوں سے دلچسپی تھی جس میں کسی مرنے والی روح سے ملاقات کی جاسکتی تھی اگرچہ ہمارے نزدیک یہ سب تو ہمات اور حقائق کے منافی باتیں ہیں مگر بعض اوقات پڑھے لکھے افراد بھی ایسی باتوں کا شکار ہوجاتے ہیں۔ نہ جانے پروفیسر مارتھر جیسا پڑھا لکھا آدمی کیسے ان چکروں میں پڑ گیا۔ ہمارے لیے یہ بات بڑی اہمیت کی حامل تھی کہ جن تاریخوں کو پروفیسر نے کالا جادو کے ماہرین سے ملاقاتیں کی تھیں، قتل کی یہ لرزہ خیز وارداتیں اس کے بعد شروع ہوئی تھیں۔ ہم اس کے بارے میں معلومات ملتے ہی اس کے پیچھے لگ گئے تھے۔ ہم نے اس کے بارے میں جو معلومات اکٹھی کیں، ان کے مطابق پروفیسر کو اپنی مرحوم بیوی سے بہت محبت تھی اور وہ اکثر اپنے عزیز و اقارب کے سامنے اس بات کا اظہار بھی کرتا رہتا تھا کہ وہ جلد ہی اپنی بیوی سے ملاقات کرے گا۔ انسانوں کی آنکھیں نکال کر یہ عمل بھی اس جاہل پروفیسر کو غالباً کسی بلیک میجک کی کتاب میں نظر آیا ہوگا۔ وہ اپنی بیوی کی روح سے ملاقات کا خواہاں تھا اور امید میں بڑی طاقت ہوتی ہے۔ پروفیسر بھی امید کے سہارے یہ گھناؤنا کھیل کھیل رہا تھا۔

بہر حال اس پر شبہ ہوتے ہی ہم نے اس پر نظر رکھنا شروع کردی تھی کیونکہ یہ کیس پولیس کے لیے چیلنج بن چکا تھا اس لیے میں پچھلے کئی دنوں سے خود اس کی نگرانی کررہا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اگر پروفیسر پر ہمارا شبہ درست ہے تو وہ چودہ تاریخ کو پھر کسی کی جان لے گا مگر ہماری مجبوری یہ تھی کہ ہم بغیر کسی ٹھوس ثبوت کے اسے گرفتار نہیں کرسکتے تھے۔ پروفیسر کو بھی شاید مجھ پر شبہ ہوگیا تھا۔ وہ مجھے ڈاج دے کر پچھلے دروازے سے تمہارے گھر کی جانب آیا مگر میں نے اسے دیکھ لیا۔ میں نے کچھ دیر تک اس کا انتظار کیا۔ کیونکہ میں نگرانی کرنے کے دوران دیکھ چکا تھا کہ وہ پہلے بھی تمہارے گھر آتا جاتا رہتا ہے مگر آج چودہ تاریخ تھی اور وہ مجھے جس طرح دھوکا دے کر اس طرف آیا تھا مجھے خطرے کا احساس ہونے لگا۔ میں نے تمہارے گھر کی بیل بجائی مگر جواب نہ ملنے پر خطرے کا احساس دوچند ہوگیا۔ میری معلومات کے مطابق تم اس گھر میں اکیلے رہائش پذیر ہو اس لیے اس کے لیے آسان شکار ثابت ہوسکتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ میں کھڑکی کے راستے اندر داخل ہوا مگر اندر داخل ہوتے ہی میرے سر پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ اگر میں ہوش میں نہ رہتا تو کل تمہاری اور میری بغیر آنکھوں کی لاشیں دریافت ہوتیں۔''

یہ کہتے ہوئے کارلوس نے اپنا پستول کوٹ کی جیب میں ڈالا پھر وہ آگے بڑھ کر پروفیسر کی لاش کے پاس آیا اور اس کی تلاشی لینا شروع کردی۔ کچھ ہی دیر میں وہ اس کی جیب سے ایک خنجر، انجکشن جو یقیناً زہر سے بھرا ہوا تھا اور ایک سفید رنگ کا کارڈ برآمد کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ اس نے کارڈ پر ایک سرسری سی نظر ڈالی اور پھر اسے میری طرف بڑھا دیا۔ کارڈ دیکھتے ہی میری ٹانگوں نے میرا ساتھ دینے سے انکار کر دیا۔ کیونکہ کارڈ پر میرا نام کندہ تھا اب کسی شک و شبے کی گنجائش باقی نہیں بچی تھی... گویا میرا پرانا اور عزیز دوست مارتھر ہی شہر میں ہونے والے ان پُراسرار قتل کا ذمے دار تھا اور اپنی بیوی سے ملاقات کرنے کی خواہش میں مجھے بھی اپنے اس گھناؤنے کھیل کی بھینٹ چڑھانے والا تھا۔

میں بے اختیار صوفے پر نڈھال ہو کر بیٹھ گیا۔ میں کارلوس کو اپنے لیے خطرہ سمجھ رہا تھا جبکہ وہی مسیحا ثابت ہوا تھا اور پروفیسر جس کے بارے میں مجھے اندازہ ہی نہیں تھا کہ وہ کچھ ہی دیر میں مجھے مارنے والا تھا۔ کارلوس فون پر کسی سے بات کررہا تھا شاید مدد کے لیے پولیس کی مزید نفری بلا رہا تھا۔ کیونکہ پروفیسر مارتھر کی لاش اٹھوانے کا بھی بندوبست کرنا تھا۔ میرے ذہن میں پروفیسر کے وہ الفاظ ابھی تک گونج رہے تھے جو اس نے کارلوس کو بے ہوش کرنے کے بعد مجھ سے کہے تھے کہ بعض اوقات خطرہ انسان کے بالکل قریب ہوتا ہے اور اسے آخری وقت تک احساس نہیں ہوتا....

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

وہی خدا ہے

ایم اے راحت

رفاقتوں اور رشتوں کی زنجیر میں بندھا اسی لیے جاتا ہے کہ ایک دوسرے کے دکھ سکھ بانٹے جائیں... خوف و دہشت کی فضا میں پروان چڑھتی ایک ایسی ہی کہانی کے اُتار چڑھائو... رفتہ رفتہ وہ قریبی رشتوں کو کھو چکا تھا... جو بچے تھے انہیں کھونا نہیں چاہتا تھا... مگر ہر لمحہ ایک بے کلی... پُراسراریت اور ڈر کی آہنی زنجیریں اسے جکڑی رہتی تھیں۔

وہم گمان......خواب وخیال کی بھیانک
تعبیریں......انتقام ودہشت کی قیامتیں......

آسمان تاریک ہوگیا، بادلوں کے غول مست ہاتھیوں کی طرح جھومتے ہوئے آسمان کا سفر طے کرتے نہ جانے کہاں سے آئے اور کہاں جانے لگے۔ مجھے احساس ہوا کہ وہ صف بندی کر رہے ہیں زمین پر حملہ آور ہونے کے لیے۔ پھر ان کا لشکر آراستہ ہوگیا۔ اب ان کے درمیان کوئی رخنہ نہیں رہا تھا۔ تاحدِّ نگاہ ایک ہی رنگ نظر آرہا تھا۔ سرمئی رنگ پھر بادلوں کے بدن کے مسامات کھل گئے۔ موٹی موٹی بوندیں زمین کی طرف لپکیں اور ذرا سی دیر میں جل تھل ہو

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

گیا۔ میں نے بھوری پتھریلی چٹان کے سائبان تلے پناہ لی تھی۔ یہ چٹان میرا گھر تھا۔ سخت دھوپ اور سرد ہواؤں سے بچنے کے لیے میں نے ہمیشہ اس کی پناہ لی تھی۔ آج بھی میں نے اسی کی پناہ لی تھی۔

جنگل کی اس زندگی میں یہ میری پہلی بارش تھی۔ بارش کا موسم جو آگیا تھا۔ اطراف میں پرندوں کی آوازیں اُبھر رہی تھیں۔ درختوں پر بندر کود رہے تھے۔ ان کے درمیان بھی کوئی مسئلہ درپیش تھا۔ یقیناً یہ کوئی دلچسپ مسئلہ ہوگا۔ دل چاہا کہ ان کے درمیان ثالث بنوں لیکن بارش اتنی دھواں دھار ہورہی تھی کہ سائبان سے باہر نکلنا ممکن نہیں تھا۔

پرندے بھی میری طرح پتوں کے سائبان تلاش کررہے تھے۔ کچھ کو پناہ مل گئی تھی اور کچھ بھٹک رہے تھے۔ جہاں بندروں کا قبضہ تھا وہاں پرندوں کا گزر نہیں تھا۔ بندر دانت نکال کر خوخیا کر انہیں بھگا رہے تھے۔ جہاں بڑے پرندے تھے وہاں چھوٹے پرندے قیام نہیں کرسکتے تھے۔ کوؤں کا ایک غول کسی بندر کے پیچھے پڑ گیا تھا۔ کوؤں کے غول نے یقیناً بندر کو اپنے آرام میں مخل ہونے سے روکا ہوگا اور بندر نے قوت کے بل پر ان کی نہ سنی ہوگی۔ بس چھڑ گئی کوؤں سے اور اب وہ اس ناجائز بندر کو جنگل سے نکال دینے پر ہی تل گئے تھے۔ اتحاد کے سامنے بندر کی نہیں چل رہی تھی اور اب وہ درخت درخت بھاگا پھر رہا تھا۔ دوسرے بندر کوؤں کے ہمنوا بن گئے تھے اور اپنے ایک ساتھی کی حمایت کر کے اپنے لیے عذاب مول لینا نہیں چاہتے تھے۔ یہ اتحاد کی بات تھی جو بندروں میں نہیں تھا۔

انسان کا ایک اور اہم مسئلہ۔ لیکن سارے مسائل انسان نے اپنے نام کیوں کر لیے ہیں۔ سب پر اپنا حق کیوں سمجھ لیتا ہے۔ اس لیے کہ وہ کہہ سکتا ہے۔ لکھ سکتا ہے۔ سوچ سکتا ہے۔ سوچتے تو دوسرے بھی ہوں گے مگر کہہ نہیں سکتے، لکھ نہیں سکتے۔

ہواؤں کے جھکڑوں سے پتھروں سے ٹکراتا ایک خوب صورت سا نیل کنٹھ میری آغوش میں آگرا اور میں خیالات سے چونک پڑا۔ بارش کا زخمی اب اڑان کی قوت نہیں رکھتا تھا۔ وہ بے بس ہوچکا تھا۔ اس نے موت کا یقین کرلیا تھا اور جب موت کا یقین ہوجائے تو پھر جگہ کا تعین بے کار ہے۔ کہیں بھی آجائے، کیسے بھی آجائے۔ خواہ اس کی گردن مروڑ کر پھینک دو۔ خواہ بارش بھری ہوا کا کوئی جھونکا اسے اٹھا کر کسی چٹانی دیوار سے دے مارے۔

میں نے اسے آہستہ سے اٹھایا۔ پھٹی ہوئی قمیص کے دامن سے اسے ہولے ہولے خشک کیا۔ اس کے زخموں کو تلاش کرنا بے کار تھا۔ کیا فائدہ اگر زخم نظر آ بھی جاتے تو میں بھلا ان کا کیا علاج کرتا۔ میرے پاس کون سی دوا تھی۔ میں بھی بے بس تھا اس کے مانند۔ کوئی فرق نہیں تھا ہم دونوں میں۔ میں اشرف ہوں۔ میں انسان ہوں لیکن خدا کے قانون کی پیروی کرنے کے بعد۔ اگر قانون ساز کے احکامات سے ہی بغاوت کردی جائے تو پھر میرا مددگار کون۔ میں اس پرندے کی طرح بے بس ہوں۔ بے بس نہ ہوتا تو انسانوں کی آبادی کی ہوئی بستیوں کو چھوڑ کر ان ویرانوں کا باسی نہ ہوتا۔ انسان سے غیر انسان شکل اختیار نہ کرلیتا۔ میری داڑھی بڑھی ہوئی ہے۔ مونچھوں کے بال ہونٹوں پر اتنے نیچے لٹکے ہوئے ہیں کہ دہانہ چھپ کر رہ گیا ہے۔ کپڑے تار تار ہیں۔ ابتدا میں کئی بار میں نے انہیں دھویا تھا لیکن اب ان میں اتنی سکت نہیں ہے کہ وہ میل کا سہارا چھوڑ کو خود سلامت رہ سکیں۔ میں خود بھی بہت دن سے نہیں نہایا مبادا کپڑے بدن سے اتارتے ہوئے بالکل ہی پھٹ جائیں اور میں بالکل ہی برہنہ ہوجاؤں۔

اس جنگل میں جانوروں کے سوا کوئی نہیں ہے لیکن میں برہنہ نہیں رہ سکتا۔ نہ میں ٹارزن ہوں کہ جانوروں کی کھال کی چڈی بنا کر درختوں پر چھلانگیں مارتا پھروں۔ ایک خوف ہے، ایک احساس ہے جب یہ کپڑے میل پسینے سے خستہ حال ہوکر بدن کا ساتھ چھوڑ دیں گے تو کیا ہوگا۔ جانور مجھے دیکھتے ہیں، کیا مجھے شرم نہ محسوس ہوگی۔ میرے احساسات مردہ نہیں ہوئے ہیں۔ مجھ میں اور جانوروں میں فرق ہے۔

کتنا عرصہ ہوگیا۔ میں نے تو حساب بھی نہیں رکھا کہ کتنا عرصہ ہوگیا مجھے ان جنگلوں میں پناہ لیے ہوئے۔ اس طویل عرصے میں، میں نے اپنے جیسے کسی ذی روح کی شکل بھی نہیں دیکھی۔ آہ...... انسان، انسانوں سے دور رہ کر کتنا عجیب ہوجاتا ہے۔ کیسا محسوس کرتا ہے۔ یہ قیدِ تنہائی تھی۔ ہاں سزا تو مجھے مل رہی تھی۔ قانون انسانیت کے ہاتھوں نہ سہی، قانونِ قدرت کے ہاتھوں سہی۔ میں نے ایک معصوم، بے گناہ کو قتل کیا تھا۔ ایک ایسی ارمانوں بھری کو جس نے زندگی کی چند بہاریں دیکھی تھیں۔ شاید سترہ...... شاید اٹھارہ۔

بار بار اس نے سامنے والی چٹان پر...... یا اس لمبی پھلیوں والے درخت کے تنے کے ساتھ کھڑے ہوکر یا ٹھنڈے پانی کے اس چشمے کی دوسری طرف کھڑے ہوکر مجھ

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

سے سوال کیا تھا۔

''تم نے مجھے کیوں مارا۔ بولو، میں نے تمہارا کیا بگاڑا تھا۔ ہر انسان اپنی زندگی جیتا ہے۔ رشتے ختم ہوجاتے ہیں، عزیز بچھڑ جاتے ہیں۔ نام قبر کی گہرائیوں میں دفن ہوجاتے ہیں۔ لوگ زندہ رہتے ہیں۔ جیتے ہیں پچھلوں کو بھول جاتے ہیں۔ پھر ان کی اپنی ایک زندگی ہوتی ہے اور وہ اسے کھونا نہیں چاہتے۔ وقت ختم ہوجائے تو مجبوری ہے ورنہ موت کو کون خوشی سے گلے لگاتا ہے۔ تم نے کسی کے لیے مجھے کیوں قتل کیا، جواب دو؟'' اس کا تیکھا چہرہ میرے سامنے ہوتا ہے۔ سادہ سی آنکھوں میں شکایت ہوتی ہے اور مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے میرا لباس تار تار ہوگیا ہو۔ میری روح برہنہ ہوگئی ہو۔ کیسی شرم آتی ہے مجھے، کوئی جواب نہیں ہوتا میرے پاس اور میں نظریں جھکا لیتا ہوں، سوچتا ہوں اس سے معذرت کرلوں، سوچتا ہوں اپنے گناہوں کا ازالہ کروں، لیکن کیا؟

خود کو موت کے حوالے کردوں۔ گھڑی کی سوئیاں بارہ بجاتی ہیں۔ نیا وہم ہوتا ہے اور میری گردن کی رگیں تن جاتی ہیں۔ میری روح میرے بدن میں پھڑ پھڑاتی ہے۔ میرا حلق خشک ہوجاتا ہے پھر میری جان نکل جاتی ہے۔ آہ...... مجھے موت سے خوف محسوس ہوتا ہے، آبادیاں میرے لیے موت کی وادیاں ہیں، کیونکہ میں قاتل ہوں۔

بارہ بجے تھے۔ ٹھیک بارہ بجے جب میں نے خونی درندے کے مانند ایک معصوم ہرنی پر وار کیا تھا۔ بس ایک سسکی سی ابھری اور سترہ سال کی کہانی ختم ہوگئی میرے ہاتھوں۔ ہاں وہ بے گناہ تھی۔ وہ میری بہن کی موت کی ذمے دار نہیں تھی لیکن اس وقت یہ احساس نہیں تھا مجھے، میں تو جنونی ہورہا تھا۔ اس وقت تو میں نے اس قتل کو ایک مقدس فریضہ بنالیا تھا اپنے لیے۔ میں احتشام علی کو خون کے آنسو رلانا چاہتا تھا۔ میں اسے وہ روحانی اذیت دینا چاہتا تھا جو میرے رگ وپے میں رچی ہوئی تھی۔

اور میں نے یہی کیا تھا۔ سارے فیصلے جنون کی پیداوار تھے۔ میں نے جو کچھ کیا تھا، ایک جنون کے تحت کیا تھا۔ ورنہ وہ معصوم اسکول کے سفید یونیفارم میں ملبوس، دو چھوٹی چھوٹی چوٹیاں باندھے، سادہ سادہ آنکھوں کی مالک بے گناہ تھی۔ اپنے باپ کی شقاوت سے ناواقف، اسے کیا معلوم تھا کہ اس کے کنجوس باپ کی بے اعتنائی ایک گھر تباہ کر چکی ہے۔ اسے تو کچھ بھی نہیں معلوم تھا۔ کاش وہ میری نگاہ میں نہ آتی۔ کاش میں اس کے بارے میں نہ جانتا ہوتا۔

لیکن ہونی ہو کر رہتی ہے۔ آہ! دل نہیں چاہتا وہ سب کچھ یاد کرنے کو۔ لیکن اس کے سوا اور کچھ ہے بھی تو نہیں میری زندگی میں۔ ماضی کو اور کون سے نام سے یاد کروں۔ بہت پہلے ایک گھر تھا جس میں ماں تھی باپ تھے۔ آسیہ عاشی تھی، میں تھا۔

سب سکون سے تھے۔ کوئی الجھن نہیں تھی زندگی میں۔ عاشی دوسری کلاس میں تھی۔ میں نے میٹرک کرلیا تھا اور نتیجہ نکلنے کے بعد چھٹیاں گزارنے کے منصوبے بنا رہا تھا کہ دفعتاً انقلاب برپا ہوگیا۔ بس اور منی بس کے حادثے میں ابو ہلاک ہوگئے۔ دفتر گئے تھے واپس آرہے تھے لیکن زندہ واپس نہ آئے۔ آدھی رات کو ان کی کچلی ہوئی لاش اسپتال سے گھر پہنچی تھی، جانے کیا کیا ہوا تھا۔

گھر والوں کا رو رو کر برا حال تھا۔ مجھے بھی اب یہ احساس تھا کہ میں بے سہارا رہ گیا ہوں۔ میرا باپ اب اس دنیا میں نہیں ہے۔

رونے پیٹنے کا وقت ختم ہوگیا۔ آنسو خشک ہوگئے۔ بھوک لگنے لگی، نیند آنے لگی۔ ضروریات منہ پھاڑ کر سامنے آکھڑی ہوئیں۔ ماں نے ایک روایتی ماں بننے کی کوشش کی، سلائی کی۔ پڑوس کے کام کیے لیکن آنکھوں کی بیماری ہمیشہ سے تھی، روشنی چلی گئی اور وہ کچھ کرنے کے قابل نہیں رہیں۔ پڑوس کے ایک خاں صاحب نے مجھے مل میں نوکری دلادی۔ کپڑوں کے دھاگے صاف کرتا تھا، معمولی تنخواہ ملتی تھی۔

پریشانیاں شروع ہوگئیں۔ احساس ہوا کہ اگر یہی ڈگر رہی تو یہ سب زندہ نہ رہ سکیں گے۔ کپڑا بننے کی مشین چلانا شروع کی تو آمدنی کچھ بڑھی لیکن ابھی کسر تھی۔ ماں کی آنکھوں کا علاج نہیں ہوسکتا تھا۔ ایڈوانس کی درخواست دی، منظور ہوگئی۔ گھر کا کچھ فالتو سامان بیچا اور ماں کو اسپتال میں داخل کروادیا لیکن آپریشن کے خوف نے ماں کے دل کی حرکت بند کردی۔ بس خاموشی سے مرگئی بے چاری اور یہ سہارا بھی چھن گیا۔

اب عاشی تھی، نہ جانے کیوں دل میں خوف بیٹھ گیا تھا۔ ابا مر گئے۔ امی چلی گئیں۔ کہیں عاشی بھی ساتھ نہ چھوڑ دے۔ رات کی تنہائیوں میں سوتے سوتے جاگ جاتا، اسے زندہ سلامت دیکھ کر دل کو قرار آتا۔ دو بہن بھائی تھے، بس۔ اخراجات کم ہوگئے تھے۔ عاشی برابر اسکول جارہی تھی لیکن وہ خوف...... وہ خوف دل سے کبھی نہیں نکل سکا۔ آہ...... کیسا منحوس خوف تھا۔

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

کئی سال گزر چکے تھے ان دونوں حادثوں کو لیکن دل کہتا تھا کہ تیسرا حادثہ بھی ضرور ہوگا۔ عاشی نے میٹرک کا امتحان دیا۔ آخری پرچہ دینے کے بعد گھر آئی تو بے حد مسرور تھی۔ نہ جانے کیا کیا منصوبے تھے اس کے دل میں۔ زندگی میں پہلی بار اسے نگاہ بھر کر دیکھا تھا۔ سولہ سال کی ہو گئی۔ شاعروں کی شاعری کا موضوع۔ ادیبوں کے رومان کی عمر، میں نے تشویش سے اسے دیکھا۔

ارے اچانک کتنی بدل گئی ہے یہ۔ اسے تو گہری نگاہوں سے دیکھا بھی نہیں جارہا تھا۔ دل چاہ رہا تھا کہ کہوں......

''ارے عاشی یہ تمہیں کیا ہوگیا۔'' پر نہ کہا۔ کچھ اور سوچا۔ ماں باپ نہیں تھے۔ عاشی بڑی ہو چکی ہے۔ میں غریب آدمی ہوں۔ اس کی شادی بھی تو کرنی ہوگی۔ اب بہت سی نئی ذمے داریوں کا احساس ہوا۔ ہاں بہت سے پیسے جمع کرنے ہیں اس کے لیے۔ اب ان پیسوں سے کام نہیں چلے گا، کچھ کرنا ہوگا اس کے لیے۔

اور کچھ کرنے کے لیے تگ و دو شروع کر دی۔ ڈبل ڈیوٹی کرنے کے بارے میں سوچا لیکن یہ ممکن نہیں تھا۔ کوئی اور ملازمت۔ ایک ماہ کی چھٹی لی اور دوسری نوکری کی تلاش شروع کر دی۔ سب سے کہا۔ نوازش علی صاحب نے امید بندھائی۔ ''ایک جگہ ہے تو سہی، بات کروں گا۔''

''کب؟'' میں نے بے صبری سے کہا۔

''دیکھو، ایک دو دن میں بتاؤں گا۔'' نوازش علی صاحب نے کہا۔ پھر دو دن کے بعد انہوں نے کہا۔ ''اس پتے پر احتشام صاحب سے مل لو، میں نے بات کر لی ہے تمہارے لیے۔''

شائن کلرز میں، میں احتشام صاحب کے پاس پہنچ گیا۔ بھاری بھرکم بدن کے خالص کاروباری آدمی تھے۔ یہ بہت بڑا اسٹور تھا جہاں ہر قسم کے پینٹس فروخت ہوتے تھے۔ رنگوں کی کئی بڑی کمپنیوں کی ایجنسی تھی ان کے پاس۔ بڑی سی دکان کے سب سے پچھلے حصے میں پارٹیشن کر کے انہوں نے ایک دفتر بنایا تھا۔ ان کی میز پر تین فون رکھے ہوئے تھے۔ مختلف رنگوں کے۔

''تمہیں نوازش علی صاحب نے بھیجا ہے؟''

''جی۔''

''تعلیم کتنی ہے؟''

''میٹرک ہوں۔''

''حساب کتاب کر سکتے ہو؟''

''جی ہاں۔''

''ملازمین پر کڑی نگاہ رکھنی ہوگی۔ یہ چوری کرتے ہیں، پیسوں کی ہیرا پھیری کرتے ہیں۔ میں نے نوازش علی صاحب سے کہا تھا کہ کسی قابلِ اعتماد اور ایماندار آدمی کو بھیجیں میرے پاس۔''

''میں یہ سب کر لوں گا۔''

''گاہکوں سے نرم لہجے میں بات کی جاتی ہے۔''

''میں جانتا ہوں جناب۔''

''صبح نو بجے آنا ہوگا۔ شام سات بجے حساب کتاب پورا کرنا ہوگا۔ آٹھ بجے چھٹی ہوگی۔''

''جی بہتر۔''

''ایک خاص بات اور سن لو۔ اس جگہ منصور نامی ایک شخص کام کرتا تھا۔ ایک سال کی سزا کاٹنے گیا ہے۔''

''جی؟'' میں نے حیرت سے کہا۔

''پچاس ہزار روپے غبن کر لیے تھے اس نے، میں نے اسے سزا کرا دی۔'' احتشام صاحب نے کہا۔

''اس کا جرم ثابت ہو گیا تھا؟'' میں نے سہمے ہوئے لہجے میں کہا۔

''رقم بھی برآمد ہو گئی تھی پھر میں بھلا کہاں چھوڑ سکتا تھا۔'' احتشام صاحب گردن اکڑا کر بولے۔

''تب ٹھیک ہے، آپ کو مجھ سے کوئی شکایت نہیں ہو گی۔''

''تنخواہ ساڑھے تین ہزار، دوپہر کا کھانا یہیں پر۔ چائے وغیرہ سب ملے گی۔ کل سے آجاؤ۔'' احتشام صاحب نے کہا۔

دوسرے دن سے میں نے کام شروع کر دیا۔ ماحول بدل گیا۔ میں نے شدید محنت کر کے احتشام صاحب کا دل جیتنے کی کوشش کی۔ سب کے ساتھ میرا رویہ اچھا تھا۔ تین سال کی مدتِ ملازمت کے دوران میں نے کبھی ایک پیسے کی بے ایمانی نہ ہونے دی۔ لیکن اس دوران بہت سے تجربات ہوئے۔ مالکان، ملازمین کو کبھی نہیں سراہتے۔ مبادا ان کی نگاہوں میں اپنی قدر و قیمت نہ بڑھ جائے۔ وہ خود کو اہم نہ سمجھنے لگیں۔

احتشام صاحب بھی اس قسم کے مالکان میں سے تھے۔ وہ میرے سامنے ایک بار بھی نہیں مسکرائے تھے۔ انہوں نے چہرے پر ملائمت پیدا کر کے کبھی کوئی بات نہیں کی تھی۔ نہ کبھی میرے گھر کے معاملات یا میری ضرورت کے بارے میں پوچھا۔ ایک دفعہ بھی میری بیماری کے

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

بارے میں نہیں پوچھا تھا جبکہ میں کئی بار بیمار ہو چکا تھا۔ شدید بخار کے عالم میں بھی میں نے چھٹی نہیں کی تھی۔ میں کئی بار چند کاموں سے ان کے گھر گیا تھا۔ میں نے کئی بار وہ لڑکی دیکھی تھی۔ دھلے دھلے چہرے والی۔ دو چوٹیاں باندھے، روشن آنکھوں کی مالک، دوسرے ملازمین نے بتایا تھا کہ اس کا نام عالیہ ہے۔ وہ احتشام صاحب کی بیٹی ہے۔ اس کی ماں نہیں ہے۔ احتشام صاحب نے اس کی وجہ سے شادی نہیں کی...... لیکن......''

مجھے کیا...... یہ ان کے گھریلو معاملات تھے۔ مالکان کے گھریلو معاملات میں کرید رکھنا کوئی اچھی بات تو نہیں ہے۔ میں نے ملازموں کی ان باتوں میں کبھی دلچسپی نہیں لی تھی۔ اس دوران دو سو روپے سالانہ کے حساب سے میری تنخواہ میں اضافہ ہو گیا تھا اور بیس روپے دوپہر کے کھانے کے لیے ملتے تھے جس میں سے 10 روپے خرچ کرتا اور 10 بچایا کرتا تھا۔ بہن کے لیے میں نے ٹین کا ایک صندوق خریدا تھا پھر ہر ماہ ایک جوڑا خرید کر ڈال دیتا۔ جب جوڑے پورے ہو گئے تو دوسرے لوازمات وغیرہ لیے۔ ان کے علاوہ ہزار روپے ماہوار بینک میں جمع کرتا رہا۔ ابھی تو نجانے کیا کیا چاہیے تھا اس کے لیے۔

پہلے سال اسے کالج میں داخل نہیں کرا سکا تھا لیکن دوسرے سال کوشش کر کے میں نے یہ کام بھی کر دیا تھا اور اب وہ سیکنڈ ایئر میں تھی۔ سب ٹھیک تھا، تھوڑا اطمینان نصیب ہوا تھا لیکن وہ خوف...... وہ خوف میری تقدیر بن چکا تھا۔ لاکھ ذہن کو سمجھاتا لیکن......

آہ...... وہ خوف غلط نہیں تھا۔ کچھ ہونے والا تھا اور جو ہونے والا تھا، دل بہت پہلے اس کی پیش گوئی کر چکا تھا۔ وہ ایک منحوس دوپہر تھی۔ وہ میری زندگی کا سب سے منحوس دن تھا۔ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ احتشام صاحب موجود نہیں تھے۔ میں نے ریسیور اٹھایا۔

''شائن کلرز۔''

''جی فرمائیے۔''

''دیکھیے آپ کے ہاں کوئی الیاس صاحب ہیں؟''

''جی ہاں، میں بول رہا ہوں، کون صاحب ہیں؟''

''الیاس صاحب الائیڈ کالج میں آپ کی بہن آسیہ عاشی پڑھتی ہیں۔''

''جی۔'' میری آواز لرز گئی۔

''برائے کرم آپ فوراً سول اسپتال پہنچ جائیں۔ ہیڈ انجری وارڈ میں۔'' دوسری طرف سے کہا گیا اور میں گھوم کر رہ گیا۔ میں نے بہت کوشش کی لیکن آواز سینے کی گہرائیوں میں دفن ہو کر رہ گئی تھی۔ ریسیور ہاتھ میں چپک کر رہ گیا تھا۔ دوسری طرف سے ریسیور رکھ دیا گیا لیکن میں اسی طرح گم صم کھڑا رہا۔ آنکھوں کی روشنی چلی گئی تھی۔ سوچنے سمجھنے کی قوتیں سلب ہو گئی تھیں۔ آپ کی بہن آسیہ عاشی...... برائے کرم وارڈ نمبر دس...... کانوں میں یہی سرگوشیاں ابھر رہی تھیں۔

پھر ریسیور ہاتھ سے نکل کر میز پر گر پڑا اور احتشام صاحب کی کرخت آواز ابھری۔

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

''ارے..... ارے، حواس قائم نہیں ہیں کیا۔ کیا ہو گیا؟'' انہوں نے آگے بڑھ کر ریسیور اٹھا لیا اور اسے دیکھنے لگے۔ ''ٹوٹ جاتا تو..... ہوا کیا ہے تمہیں؟''

''میں..... میری بہن..... سول اسپتال.....'' نہ جانے کس طرح یہ آواز میرے منہ سے نکلی۔

''کس کا فون تھا؟''

''پتا نہیں؟'' میں نے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔

''کون تھا، کیا کہہ رہا تھا؟''

''وارڈ نمبر دس، ہیڈ انجری۔ آسیہ عاشی..... میں جا رہا ہوں سیٹھ صاحب، نہ جانے کیا ہو گیا ہے۔ نہ جانے کیا.....''

''عجیب بدحواس انسان ہو، پوری بات بتاؤ۔''

''فون بجا تھا۔ کسی نے میرا نام پوچھا اور پھر مجھے سول اسپتال آنے کو کہا۔ نجانے کیا ہوا ہے۔'' میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

''جاؤ..... ہو کر آؤ..... اور ہاں، وہ لیجر بنا لیا ہو تو مجھے دے جاؤ۔ حمزہ کا نیا اسٹاک آیا یا نہیں؟'' سیٹھ صاحب نے پوچھا۔

''ابھی نہیں۔'' میں نے آنسو خشک کیے۔

''تم نے فون بھی نہیں کیا ہوگا۔ بھلے آدمی فون کرو انہیں۔ آج تین دن ہو گئے اور ابھی تک انہوں نے مال نہیں بھیجا اور ہاں..... وہ سفید.....''

''میں اسپتال جا رہا ہوں سیٹھ صاحب۔'' میں نے کہا اور لرزتے قدموں سے باہر نکل آیا۔ مجھے نہیں معلوم کہ میری اس نافرمانی کا سیٹھ صاحب پر کیا ردِعمل ہوا۔ باہر نکل کر میں نے انتہائی کوشش کر کے خود کو سنبھالا اور ایک رکشا روک کر اس میں بیٹھ گیا۔ رکشا ڈرائیور سے میں نے سول اسپتال چلنے کے لیے کہا تھا۔ آنکھوں کے سامنے تاریک لہریے رقصاں تھے۔ دل کا وہ خوف عود کر آیا تھا۔ ایک اور چارپائی خالی نظر آ رہی تھی۔ ایک اور آواز معدوم ہوتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ بیٹے الیاس..... الیاس میاں سننے کو تو اب کان ترس گئے تھے۔ بھیا کی آواز بھی گہرے اندھے کنوئیں میں ڈوبتی جا رہی تھی۔ جی چاہا کہ رکشا سے کود جاؤں، چیختا ہوا سڑکوں پر دوڑ پڑوں..... ''نہیں یہ آواز گم نہ کرو، آہ، یہ تنہا آواز ہے، میری زندگی میں۔''

سول اسپتال میں داخل ہو کر ریسپشن سے وارڈ نمبر دس کا پتا پوچھا۔ ہیڈ انجری ڈپارٹمنٹ وارڈ نمبر دس، بیڈ نمبر سولہ پر عاشی پڑی ہوئی تھی۔ دو ڈاکٹر اور ایک نرس اس کے پاس موجود تھے۔ سر پر پٹی کسی ہوئی تھی۔ ناک میں نلکیاں لگی ہوئی تھیں، ہونٹ خشک تھے، یہ عاشی ہی تھی۔

ایک دلدوز آواز حلق سے نکلی اور اس کے بعد ہوش نہ رہا۔ ہوش آیا تو اسپتال کے ایک بینچ پر پڑا ہوا تھا۔ نرسیں اور ڈاکٹرز ادھر ادھر آ جا رہے تھے۔ چند لمحات سر چکرایا چکرایا سا رہا پھر اٹھ کر بیٹھ گیا۔

بینچ ہیڈ انجری وارڈ کے سامنے ہی تھی۔ دس نمبر منہ چڑا رہا تھا۔ میں جلدی سے وارڈ میں داخل ہو گیا۔ آہ میری عاشی اسی طرح بےسدھ پڑی ہوئی تھی۔ ایک نرس اس کے قریب کھڑی تھی۔ اس نے مجھے دیکھا اور اس کی آنکھوں میں ہمدردی کے تاثرات ابھر آئے۔

''آپ برائے کرم خود پر قابو رکھیں، ہمت سے کام لیں۔''

''یہ..... یہ سب کچھ سسٹر..... یہ سب کچھ.....'' میں نے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔

''ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے ان کا۔ کون ہیں یہ آپ کی؟''

''بہن ہے یہ میری..... بہن ہے میری سسٹر۔''

''اور کوئی نہیں آیا ان کے پاس..... کسی اور کو خبر نہیں ہوئی شاید۔''

''اور کوئی نہیں ہے ہمارا سسٹر۔ ہم دونوں ہی ایک دوسرے کے لیے ہیں، ہمارا کوئی پرسانِ حال نہیں ہے۔'' میں رونے لگا۔

''پلیز، آپ ہمت کریں۔ اس طرح تو آپ کی ذمے داری اور بڑھ گئی ہے، ان کے دماغ میں چوٹ آئی ہے، باقی خراشیں معمولی ہیں۔ کوئی فریکچر وغیرہ نہیں ہے لیکن دماغ کی چوٹ۔''

''دماغ کی چوٹ کیسی ہے سسٹر؟''

''خطرناک بھی ہو سکتی ہے۔''

''یہ ہوش میں کب آئے گی، ایکسیڈنٹ کیسے ہوا؟'' میں نے بےتابی سے پوچھا۔

''افسوس مجھے تفصیل نہیں معلوم۔ آپ پولیس سے معلوم کر سکتے ہیں۔'' نرس نے کہا۔ اس کی ہمدردی محدود تھی۔ میں پھٹی پھٹی آنکھوں سے عاشی کو دیکھتا رہا۔ آہ عاشی، یہ ہونا تھا۔ میرے دل میں خوف تھا تیرے لیے۔ آہ، اس خوف کی کوئی نہ کوئی حقیقت ضرور تھی۔

اسی وقت ڈاکٹر آ گیا۔ مجھے دیکھ کر بولا۔ ''اب کیسے ہیں آپ، صدمے سے بےہوش ہو گئے تھے، خود کو سنبھالیے۔''

''ڈاکٹر صاحب یہ ایکسیڈنٹ کیسے ہو گیا؟''

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

''یہ شاید کالج سے نکل رہی تھیں۔ سڑک پار کرتے ہوئے کوئی نامعلوم گاڑی ٹکر مار کر بھاگ گئی۔ پولیس تفتیش کر رہی ہے۔ شاید کار والا پکڑا جائے۔''

''یہ کب تک ہوش میں آجائے گی ڈاکٹر صاحب، کوئی گہری چوٹ تو نہیں ہے۔'' میں نے سوال کیا۔

ڈاکٹر خاموش رہا پھر بولا۔ ''آپ دعا کریں، اگر یہ ہوش میں آگئیں تو کوئی خطرہ نہیں ہے۔ پولیس آفیسر سے ملاقات کرلیں۔ وہ آپ کے ہوش میں آنے کا انتظار کر رہا تھا۔''

ساری کارروائیاں بے معنی تھیں میرے لیے۔ ان کا جو دل چاہے کرتے رہیں۔ میں پھر عاشی کے پاس واپس آگیا۔ میرا دل خون کے آنسو رو رہا تھا۔ عاشی میں زندگی کی کوئی رمق نہیں تھی۔ سارا دن گزر گیا۔ رات آگئی۔ میں عاشی کے سرہانے تھا لیکن مجھے اس کے پاس رات کو رکنے کی اجازت نہیں تھی۔

چنانچہ میں باہر جا کر بیٹھ گیا۔ ساری رات اسی جگہ گزر گئی۔ رات بھر مجھے عاشی کی آوازیں سنائی دیتی رہیں۔ دل ڈوبتا رہا تھا، نہ جانے کیا کیا خیالات آتے رہے تھے۔ دوسرے دن پھر وہیں پہنچ گیا۔ عاشی کے انداز میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ البتہ اسے شدید بخار ہو گیا تھا۔ ڈاکٹر نے پرچہ لکھ کر دیا۔

''یہ دوائیں اور انجکشن آپ کو باہر سے لانے ہوں گے، انہیں لے آئیے۔''

''کوئی افاقہ ڈاکٹر......''

''ابھی کچھ نہیں کہا جاسکتا۔'' ڈاکٹر نے جواب دیا۔ ہوش میں آنا ضروری تھا۔ عاشی کی زندگی بچانے کی جدوجہد کرنی تھی۔ اس کے لیے جو کچھ جمع کیا تھا۔ خرچ کرنا تھا۔ چنانچہ ہمت کر کے گھر آیا۔ جمع شدہ یہ رقم لی، دوائیں خریدیں اور اسپتال پہنچ گیا۔

ڈاکٹر مخلصانہ جدوجہد کر رہے تھے۔ دس دن گزر چکے تھے۔ عاشی کو ہوش نہیں آیا تھا۔ یہ دس دن دس سالوں کی کہانیاں رکھتے تھے۔ عاشی کے لیے جو کچھ ہوسکتا تھا، کیا جا رہا تھا۔ ان دس دنوں میں، میں نے احتشام صاحب کی طرف رخ بھی نہیں کیا تھا۔ دل و دماغ قابو میں ہی نہیں تھے۔ بس دن رات تھے اور اسپتال کا کمرا یا باہر کا لان۔ گھر آنے کی ضرورت ہی نہیں پڑی تھی۔

عاشی کو دو مرتبہ ایک خصوصی ایکسرے کے لیے دوسری جگہ لے جانا پڑا تھا۔ ان دو ایکسروں میں آٹھ ہزار

ایک تاجر نے اپنے بیٹے کو نصیحت کی۔ ''تجارت میں کامیابی کے دو گُر ہیں۔ پہلا یہ کہ اگر تم نے گاہک سے کوئی وعدہ کرلیا تو اسے پورا کرو، خواہ آندھی آئے یا طوفان۔''

''اور دوسرا گر ابو؟'' بیٹے نے سوال کیا۔

''کبھی وعدہ نہ کرو۔''

کراچی سے تسنیم یونس کا تعاون

روپے خرچ ہوئے تھے۔ دو ہزار روپے دواؤں وغیرہ میں خرچ ہو گئے تھے اور اب پندرہ سو روپے باقی رہ گئے تھے۔ یہی کچھ جمع کر سکا تھا عاشی کے لیے۔ اس کا تھا، اس کے کام آرہا تھا۔ ابھی تک اس سلسلے میں کوئی مشکل نہیں پیش آئی تھی۔

ایکسرے رپورٹ سے معلوم ہوا تھا کہ دماغ کے نچلے حصے میں خون کی تہ جم گئی ہے۔ اس کا صاف ہونا ضروری ہے۔ ڈاکٹر خون کی اس تہ کو دواؤں کے ذریعے صاف کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ایک چھوٹا سا آپریشن بھی کیا گیا تھا۔ سب کچھ ہو رہا تھا۔ میرے دن رات عجیب حالت میں گزر رہے تھے۔ دنیا کے بارے میں کچھ معلوم نہیں تھا۔ کھانا، پینا اور سونا سب ختم ہو چکا تھا۔ بھوک لگی تو کچھ بھی کھا کر بھوک مٹائی۔ نیند کی شدت ہوئی تو زمین پر سو گیا۔ اس طرح ایک ماہ گزر گیا۔ میری عاشی بے ہوش تھی اور مسلسل بے ہوش تھی۔

پھر ایک دن ایک بڑے ڈاکٹر نے مجھے بلایا۔ ''آپ کا نام الیاس ہے؟''

''جی۔''

''آپ کی بہن کا ایک بڑا آپریشن ہوگا۔ سرجن حیدر علی یہ آپریشن کریں گے۔ آپ اپنی بہن کو دوسرے اسپتال لے جانے کی تیاریاں کریں۔''

''میری راہنمائی کیجیے ڈاکٹر صاحب، مجھے کیا کرنا ہوگا؟''

''یہاں سے آپ کو سلپ مل جائے گی۔ آپ ان کا داخلہ وہاں کرادیں۔'' مہربان ڈاکٹر نے کہا اور میں تیاریوں میں مصروف ہو گیا۔ ایک ایمبولینس نے عاشی کو دوسرے اسپتال میں پہنچا دیا۔ سلپ پر اس کا داخلہ ہو گیا۔ مجھ سے دو ہزار روپے مانگے گئے جو صرف داخلہ فیس تھی۔ میں نے متعلقہ کلرک سے کہا۔

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

''میرے پاس صرف بارہ سو روپے ہیں۔ باقی آٹھ سو روپے کا انتظام اگر شام تک ہو جائے تو کوئی حرج تو نہیں ہے؟'' کلرک نے مجھے غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''مجھے آج تنخواہ ملی ہے۔ آٹھ سو روپے میں اپنے پاس سے جمع کیے دیتا ہوں، کل آپ مجھے دے دیں۔''

''بہت بہت شکریہ۔'' میں نے ممنونیت سے کہا۔

عاشی کو ایک اسپیشل کمرے میں لے جایا گیا اور میں آٹھ سو روپے کی تلاش میں گھر آیا۔ فروخت کرنے کے لیے جو چیز نظر آئی اسے سمیٹا، کچھ قیمتی چیزیں عاشی کے جہیز کے لیے جمع کر رکھی تھیں، انہیں لیا، بڑی تگ و دو کے بعد پانچ ہزار میں سب کچھ فروخت کر دیا۔ دوسرے دن سب سے پہلے اس کلرک کے آٹھ سو روپے ادا کیے۔ اس کے بعد عاشی کے پاس پہنچ گیا۔ ڈاکٹروں نے اسے دواؤں کا استعمال شروع کرا دیا تھا۔ دوپہر کو مجھے ڈاکٹر حیدر کے کمرے میں بلایا گیا۔ ڈاکٹر نے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔

''آپ آپریشن کی تاریخ لے لیں اور رقم جمع کرا دیں۔ آپریشن جلد ہونا ضروری ہے۔''

''سر! میں غریب آدمی ہوں، کتنی رقم جمع کرنا ہو گی؟''

''کلرک آپ کو بتا دے گا۔ چپراسی انہیں دفتر لے جاؤ۔'' کلرک نے مجھے ایک فارم جمع کرنے کے لیے دیا پھر اس نے میرے کلیجے میں چھرا بھونک دیا۔

''پچیس ہزار روپے سرجن کی فیس۔ دس ہزار روپے دیگر اخراجات آپ کے پاس رقم کا انتظام ہے؟''

''کتنے روپے؟'' میں نے پھولے ہوئے سانس کے ساتھ پوچھا۔

''پینتیس ہزار روپے؟'' کلرک نے کہا اور مجھے چکر آ گیا۔ سر بری طرح گھوم رہا تھا۔ میں خاموشی سے باہر نکل آیا۔ سرجن حیدر اپنے کمرے سے باہر نکل رہے تھے۔ ان کے قدموں میں گر پڑا۔

''میرے پاس کچھ نہیں ہے ڈاکٹر صاحب! خدا کے لیے میری بہن کو بچا لیجیے، میرے پاس کچھ نہیں ہے۔''

''بھئی میں فیس میں رعایت کر سکتا ہوں لیکن اخراجات تو ہوں گے۔ آپ میری فیس سے پانچ ہزار کم کر لیں اس سے زیادہ میں کچھ نہیں کر سکتا۔'' سرجن چلے گئے۔ تیس ہزار روپے...... عاشی کی زندگی کی قیمت تیس ہزار روپے تھی۔ اب تو فروخت کرنے کے لیے بھی کچھ نہیں رہ گیا تھا۔ زمین و آسمان تاریک تھے۔ کہیں روشنی نہیں تھی۔ کوئی ایسا نہیں تھا جس سے بھیک مانگ سکتا۔ سڑک پر مارا مارا پھرتا رہا۔ اب تو خوف کے باعث اسپتال کا رخ بھی نہیں کر پا رہا تھا۔ سیٹھ احتشام یاد آئے۔ تمام امیدیں ختم ہو چکی تھیں۔ تاہم پہنچ گیا ان کے پاس۔ میری جگہ ایک دوسرا آدمی کام کر رہا تھا۔ سیٹھ صاحب دفتر میں موجود تھے۔ مجھے دیکھ کر برہم ہو گئے۔

''نہایت گھٹیا انسان ہو تم، اگر نوکری چھوڑنی تھی تو بتا تو دیتے۔''

''قیامت گزر گئی ہے مجھ پر سیٹھ صاحب! مجھے تیس ہزار روپے چاہئیں، یہ رقم مجھے دے دیں سیٹھ صاحب ورنہ میری بہن مر جائے گی۔ سیٹھ صاحب زندگی بھر آپ کی غلامی کروں گا۔ ساری زندگی آپ کی خدمت کروں گا۔ اس وقت میری بہن کی زندگی تیس ہزار کی ہے۔ صرف تیس ہزار روپے میں میری عاشی جی سکتی ہے۔ مجھے تیس ہزار روپے دے دیں۔''

''پاگل ہو گئے ہو کیا، تیس ہزار...... میاں عقل کی بات کرو۔''

''دعائیں دوں گا سیٹھ صاحب، تیس ہزار صرف تیس ہزار۔'' میں نے روتے ہوئے کہا۔

''میں تمہیں تیس روپے بھی نہیں دوں گا، تمہاری جگہ میں نے دوسرا آدمی رکھ لیا ہے، اپنے حساب کے پیسے لو اور جاؤ یہاں سے۔''

''میری کہانی تو سن لیجیے سیٹھ صاحب...... میری کہانی......''

''میں کہتا ہوں میرا دماغ مت کھاؤ، دفع ہو جاؤ یہاں سے۔ تیس ہزار مانگنے آئے ہیں۔''

''سیٹھ صاحب۔''

''میں کہتا ہوں نکل جاؤ یہاں سے۔'' سیٹھ احتشام غرائے اور میں وہاں سے نکل آیا۔ آہ عاشی، میری بہن، تیرا بھائی، تیری زندگی کی قیمت نہیں حاصل کر سکا۔ مجھے معاف کر دے، مجھے معاف کر دے۔ میری آنکھوں سے آنسو ابل رہے تھے۔ گھر کی ایک اور چارپائی خالی ہو جائے گی۔ اب عاشی کبھی واپس نہیں آئے گی۔

انہی سوچوں میں سڑکوں پر گھومتا رہا اور شام ہو گئی۔ مجھے یاد آیا کہ سیٹھ احتشام رات کو دکان بند کرتے ہیں تو دن بھر کا کیش ان کے پاس ہوتا ہے۔ دکان سے نکل کر وہ کار میں بیٹھتے ہیں اور کار دکان سے تقریباً بیس گز دور ہوتی ہے۔ بیس گز تو بہت ہوتے ہیں۔

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

سیٹھ احتشام دکان سے باہر نکلے۔ رقم کا تھیلا ان کے پاس تھا۔ میں نے دانت پیس کر انہیں دیکھا۔ ان کے سر پر پہنچ گیا، پھر میرا گھونسا ان کی گدی پر پڑا۔ رقم کا تھیلا میرے ہاتھ میں آ گیا اور میں تیز رفتاری سے دوڑ پڑا۔ میں آن کی آن میں بہت دور نکل آیا تھا۔ پیچھے کیا ہوا مجھے کچھ معلوم نہیں تھا۔ ایک سنسان گوشے میں، میں نے تھیلا کھول کر دیکھا۔ ساٹھ ہزار روپے تھے۔ میں نے تیس ہزار روپے اس میں سے نکال لیے۔ باقی رقم احتشام کی امانت تھی۔ یہ رقم لے کر میں اسپتال پہنچا۔ کیشیئر وغیرہ جا چکے تھے۔ رقم دوسرے دن بھی جمع ہو سکتی تھی۔ میں نے اسپتال کے احاطے میں ڈیرا جما لیا۔ رات بھر اس رقم کی حفاظت کرنا تھی۔

ذہن میں کوئی خیال نہیں تھا سوائے اس کے کہ اب عاشی کا آپریشن ہو جائے گا۔ سوچنے سمجھنے کی قوتیں ختم ہو گئی تھیں۔ رات کے تقریباً بارہ بجے ہوں گے جب اچانک چند لوگ میرے اطراف میں پھیل گئے۔ ایک آواز سنائی دی۔

''یہی ہے۔'' اور مجھے دبوچ لیا گیا۔ آواز سیٹھ احتشام کی تھی اور مجھے دبوچنے والے پولیس کے آدمی تھے۔ وہ مجھے لے کر پولیس اسٹیشن چل پڑے۔ راستے میں لاتوں اور گھونسوں سے میری تواضع ہوتی رہی۔ پولیس اسٹیشن پہنچتے پہنچتے میں بے ہوش ہو گیا۔

نہ جانے کب ہوش آیا۔ میں لاک اپ میں تھا۔ سب مجھے نفرت کی نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ کوئی مجھ سے ہمدردی نہیں رکھتا تھا۔ مجھ سے سوالات کیے گئے۔ میں نے ڈاکا زنی کا اعتراف کر لیا۔ مجھے عدالت میں پیش کیا گیا۔ میری ذہنی حالت بحال نہ تھی۔ اب مایوسی کے سوا میری زندگی میں کچھ نہیں تھا۔ میں نے سادگی سے اپنا بیان دہرا دیا۔ اس بیان میں، میں نے کوئی بات نہیں چھپائی تھی۔ میری ذہنی حالت اعتدال پر نہیں تھی۔ میں مایوس ہو چکا تھا۔ لاک اپ سے مجھے جیل منتقل کر دیا گیا کیونکہ پولیس کو میرے کیس میں کوئی الجھن نہیں تھی۔ سیدھا سادہ کیس تھا۔

دل ٹکڑے ٹکڑے ہو چکا تھا۔ جانتا تھا کہ عاشی کے آپریشن کے لیے رقم نہیں مہیا ہو سکی۔ پتا نہیں اس کا کیا ہوا ہوگا۔ سیکڑوں خیالات تھے ذہن میں۔ میں مجرم تھا۔ میں نے قانون شکنی کی تھی۔ قانون نے مجھے اس جرم کی سزا دو سال دی۔ وجۂ جرم بھی قانون کے سامنے تھی لیکن اس پر توجہ دینا تو کسی کا فرض نہیں تھا۔ میری پریشانی، میری بہن کی زندگی میرا ذاتی مسئلہ تھا۔ عاشی کی طرف سے صبر کر لیا اور جیل کی سلاخوں کے پیچھے گزرنے والے دنوں میں کھو گیا۔ خدا نے انسان کو حالات پر قابو پانے کی قوت نہیں دی لیکن صبر کی قوت ضرور عطا کی ہے۔ میں بھی اسی قوت کے سہارے جی گیا۔ جیل میں بہت سے قیدی تھے جن سے میری شناسائی ہو گئی۔ استاد منصور خاص طور سے مجھ پر مہربان تھے۔ ہر فن مولا تھے۔ نقب زنی، جیب تراشی اور شراب بنانے کے فن انہیں آتے تھے۔ بہت سے شاگرد جیل میں بنائے تھے۔ اس دوران انہوں نے مجھ سے میرے بارے میں پوچھا اور میں نے انہیں اپنی کہانی سنا دی۔

''تو بہن کا کیا ہوا؟'' استاد نے پوچھا۔

''مجھے نہیں معلوم۔ لیکن جو ہوا ہوگا استاد، اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔''

''اور تو بڑا نالائق ہے۔ بھائی پہلے کیوں نہیں بتایا۔ تو عدالت سے درخواست کر سکتا تھا۔ ٹھہر جا آنے دے میرے کسی شاگرد کو۔ تیری بہن کے بارے میں معلوم کراؤں گا۔''

استاد کا ایک شاگرد ان سے ملنے آیا تو انہوں نے مجھ سے تمام معلومات لے کے اسے بتا دیں اور وہ دوسرے دن آنے کا وعدہ کر کے چلا گیا۔ یہ پھر سے کرب کی رات بن گئی۔ صبر ایک مجبوری ہے۔ جب انسان اور کچھ نہیں کر سکتا تو صبر کرتا ہے۔ یہ صبر بھی ایک کچے دھاگے کے مانند ہوتا ہے۔ اسے ٹوٹتے دیر نہیں لگتی۔ میرا ضبط بھی ختم ہو گیا۔ میں انتظار کے بخار میں پھنکنے لگا۔ استاد کا شاگرد حسب وعدہ آ گیا۔ اس نے جو اطلاع دی وہ غیر متوقع نہ تھی۔ آپریشن نہیں ہوا تھا۔ میری بہن کا انتقال ہو گیا تھا۔ یہ اندازہ تو پہلے ہی ہو چکا تھا۔ تاہم دل خون کے آنسو رویا۔ استاد میرے غم میں شریک تھے۔

''او یار، یہ دنیا بڑی نا ہنجار ہے۔ کسی کو کسی سے لگاؤ نہیں ہے۔ مجھے بڑا دکھ ہے بھئی۔''

شب و روز بے مصرف ہو گئے تھے۔ اب کوئی امنگ نہیں تھی دل میں۔ ہاں کبھی کبھی جنون عود کر آتا تھا اور اس جنون کے عالم میں، میں اپنی بہن کے قاتلوں کا تجزیہ کرنے لگتا تھا۔ کون ہے قاتل۔ وہ ڈرائیور جس نے بے پروائی سے ڈرائیونگ کر کے میری بہن کو موت کی آغوش میں پہنچا دیا۔ وہ ڈاکٹر جس نے میری بہن کا آپریشن صرف اس لیے نہیں کیا کہ میں اس کی مانگ پوری نہیں کر سکا یا سیٹھ احتشام جس نے مجھ پر ظلم کیا اور مجھے اس حال کو پہنچا دیا۔

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

سیٹھ احتشام بے قصور تھے۔ وہ بھلا ایک غیر متعلق آدمی کو اتنی رقم کیوں دے دیتے۔ میں نے انہیں لوٹا اور انہوں نے انتقام لیا۔ ڈاکٹر بے قصور تھا کیونکہ یہ اس کا پیشہ تھا۔ اس کی زندگی میں ایسے سیکڑوں واقعات ہوئے ہوں گے۔ ڈرائیور بھی بے قصور تھا۔ ظاہر ہے وہ اس دن کسی لڑکی کو ہلاک کرنے کے لیے تو گھر سے نہیں نکلا تھا۔

پھر قصوروار کون ہے۔ ذہن ماؤف ہونے لگا۔ بدن میں تشنج پیدا ہو گیا۔ یہ سب قاتل ہیں...... میں ان سب سے انتقام لوں گا۔ ہاں، میں ان سب کو موت کے گھاٹ اتار دوں گا، سب کو......

''او پاگلوں جیسی باتیں مت کر بھائی، پولیس اس ڈرائیور کو تلاش نہیں کر سکی تو تو اسے کیسے تلاش کرے گا؟''

ایک دن استاد نے میری باتیں سن کر کہا۔

''تو میں اس ڈاکٹر کو قتل کر دوں گا۔''

''وہ بھی بے قصور ہے۔ بھئی اس نے تیرے ساتھ رعایت کی تھی۔ یہی بڑی بات ہے۔ کچھ ہمدردی تو کی اس نے؟''

''تو پھر سیٹھ احتشام......'' میں نے دانت پیس کر کہا۔

''دیکھ بھئی جو گزرنی تھی گزر گئی ہے۔ خون خرابا کرے گا تو تیری زندگی بھی چلی جائے گی۔ جیل کی چکی پیسے گا یا پھانسی ہو جائے گی۔ کیا فائدہ ہے ان باتوں سے۔ اوہ بھئی یہ اللہ کا قانون ہے، اس کی مصلحتوں سے تو کیسے لڑ سکتا ہے۔ اوہ بھئی اللہ کا شکر کر...... اس سے صبر مانگ...... اس کے کام وہی جانتا ہے۔ ہم بندے تو بلبلے ہیں، اسی کے پیدا کیے ہوئے اور اس کی مخلوق اس سے لڑ سکتی ہے کیا؟''

''یہ کیسا قانون ہے استاد جو سمجھ میں نہیں آتا۔ اگر بندے واتنا کمزور بنانا تھا تو اسے محبتوں کے ان شدید جذبوں سے کیوں روشناس کیا؟''

''لو بھئی، اس نے بندوں کو جو سمجھانا تھا وہ سمجھا دیا۔ اگر تیری بہن کو زندہ رہنا ہوتا تو ایسے ایسے سو حادثوں کے بعد بھی زندہ رہتی، بس اتنی ہی لکھی تھی اس کی۔ کوئی اور حادثہ ہو جاتا۔ خود کو سنبھال بھئی، تو اگر کسی کو قتل کرنے کی کوشش کرے گا تو بے کار بات ہوگی۔ ہاں اگر ان میں سے کسی کی تیرے ہاتھوں لکھی ہے تو دوسری بات ہے۔ خدا سے دعا مانگ، اس سے بغاوت نہ کر...... یہ سارے اس کے کام ہیں۔''

دو سال پورے ہو گئے اور مجھے جیل سے رہا کر دیا گیا۔ یہ نئی افتاد تھی۔ میں جیل کا عادی ہو گیا تھا۔ گھر کی طرف رخ کرنے کی ہمت نہیں تھی۔ دل کے ہر گوشے سے عاشی پکار رہی تھی۔ دل و دماغ لہولہان ہو گئے۔ ایک بار پھر انتقام کا لاوا پکنے لگا اور دماغ تاریک ہو گیا۔ احتشام صرف احتشام۔ اس نے مجھ پر ذرا بھی رحم نہیں کیا۔ اگر وہ چاہتا تو انسانی ہمدردی کی بنیاد پر میری مدد کر سکتا تھا۔

''ہاں، میں احتشام کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔'' میں منصوبے بنانے لگا۔ احتشام کا دوبارہ تعاقب کیا اور اس کے گھر تک ایسے راستوں کا اندازہ لگانے لگا جہاں اسے موت کے گھاٹ اتار سکوں۔ دوسری بار جب میں اس کا پیچھا کر رہا تھا تو شام کا وقت تھا، احتشام کی کار گھر کے دروازے کے پاس رکی تو دفعتاً کسی طرف سے ایک لڑکی نکل آئی۔ سفید یونیفارم میں ملبوس۔ پتا نہیں کھیل کا لباس تھا یا اسکول کا، دھلا دھلا سادہ سا چہرہ، ترشی ہوئی دو چوٹیاں۔

''ابو'' اس نے بڑے لاڈ سے پکارا۔

''ارے عالیہ بیٹے، کہاں بھئی؟''

''انکل آفتاب کے ہاں جا رہی ہوں۔ آپ اس وقت کیسے آ گئے؟''

''بس بیٹے! جلدی آ گئے آج۔ کیا ہمارے آنے کے بعد بھی تم انکل آفتاب کے ہاں جاؤ گی؟''

''اب نہیں جاؤں گی ابو''

''تو پھر آؤ اندر چلو'' احتشام نے کہا اور اس کے ساتھ اندر داخل ہو گئے۔

احتشام کی آنکھوں سے محبت کے سوتے پھوٹ رہے تھے۔ بیٹی کے لیے۔ کتنا چاہتا ہے یہ مردود اسے۔ اگر یہ کسی حادثے کا شکار ہو گئی ہوتی تو کیا وہ اس قدر مطمئن ہوتا، پاگل ہو جاتا وہ۔ بالکل میری طرح۔ ہاں میری طرح پاگل...... میری طرح...... یہ میرے ذہن نے سوال کیا اور انتقام کا ایک انوکھا خیال میرے ذہن میں پیدا ہو گیا۔ آہ، یہ تو بہت اچھا خیال ہے۔ اگر میں نے دس انچ لمبا چاقو احتشام کے سینے میں اتار دیا تو وہ ایک چیخ مارے گا اور مر جائے گا۔ صرف ایک بار۔ اسے بار بار مرنا چاہیے میری طرح، بالکل یہی ہونا چاہیے اور اس کا طریقہ ایک ہی ہے۔ اس کی بیٹی کو ہلاک کر دیا جائے۔

میرا رُواں رُواں مسرت سے کانپ اٹھا۔ اس سے عمدہ خیال اور کون سا آ سکتا تھا میرے ذہن میں۔ میں اسے قتل کر دوں گا۔ میں اس لڑکی کو ضرور قتل کر دوں گا۔ یہی ہونا چاہیے بالکل یہی۔ لیکن اس کے بعد...... اس کے بعد مجھے

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

بھی زندہ رہنا چاہیے۔ اپنی زندگی کے اس اہم مقصد کو پورا کرنے کے بعد میں جنگلوں میں روپوش ہو جاؤں گا۔ اس دنیا سے رشتہ توڑ لوں گا۔

ہاں انسانوں کے درمیان اب مجھے سکون نہیں ملے گا۔ میں اپنے فیصلے پر اٹل ہو گیا اور میں نے انتظامات شروع کر دیے۔

میں نے اس لڑکی کے معمولات کا جائزہ لیا۔ کالج آتی جاتی تھی لیکن ایک قوی ہیکل ڈرائیور کے ساتھ۔ پڑوس کے ایک گھر میں ٹینس کھیلنے جاتی تھی۔ سیٹھ صاحب کی ایک ہی بیٹی تھی۔ اس کی بیوی نہیں تھی۔ باپ کی محبت بیٹی کے لیے وقف تھی۔ احتشام اسے پاگلوں کی طرح چاہتا تھا۔ اس کی چاہت کا مجھے بخوبی اندازہ ہو گیا تھا۔ لیکن لڑکی کو قتل کرنے کی کوئی ترکیب سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ گھر سے باہر اسے قتل کرنا ناممکن تھا۔ یہ کام صرف احتشام کے گھر میں داخل ہو کر ہی سرانجام دیا جا سکتا تھا۔

میں نے اس سلسلے میں کوشش شروع کر دی۔ گھر کے ایک ملازم سے میں نے دوستی گانٹھی اور ایسے اوقات میں اس سے ملنے لگا جب احتشام سے مڈبھیڑ کا کوئی خطرہ نہ ہو۔ اس ملازم کا نام جلیل تھا۔ وہ بہت باتونی تھا اور اس کی یہ فطرت میرے کام کی تھی۔ میں کبھی کوٹھی میں داخل نہیں ہوا تھا لیکن جلیل کے ذریعے مجھے گھر کے چپے چپے سے واقفیت ہو گئی۔ مجھے پتا چل گیا کہ عالیہ کی خواب گاہ کون سی ہے۔ ان لوگوں کے معمولات کیا ہیں۔ سب کچھ معلوم ہو گیا مجھے اور میری تیاریاں آخری مراحل میں داخل ہو گئیں۔ میں نے ایک خنجر خرید لیا اور وقت کا انتظار کرنے لگا۔

پھر ایک شام بارش ہو رہی تھی۔ ماحول پر ایک عجیب سی وحشت چھائی ہوئی تھی، یہ وحشت میرے حواس پر طاری ہو گئی۔ میں نے آج اپنا کام کرنے کا تہیہ کر لیا۔ چاقو لباس میں چھپا کر ضروری تیاریوں کے بعد باہر نکل آیا۔ میں نے اپنے کام کے لیے بارہ بجے کا وقت منتخب کیا تھا۔ یہ وقت بہت موزوں تھا۔ دھواں دھار بارش نے میرے کام میں آسانیاں پیدا کر دی تھیں۔ تھوڑی دیر کے بعد میں گھر پہنچ گیا۔ احتشام کی کار گھر میں موجود تھی۔ وہ گھر میں ہی تھا۔

گھر کے عقبی حصے سے میں اندر داخل ہو گیا۔ ملازم بارش کی وجہ سے اپنے اپنے کوارٹروں میں جا چکے تھے۔ کوئی نظر نہ آیا اور میں ایک راہداری سے گزر کر اندر داخل ہو گیا۔ وقت قریب آتا جا رہا تھا اور میں اپنے کام کے لیے تیار تھا۔ دفعتاً پورا گھر تاریک ہو گیا۔ غالباً بجلی چلی گئی تھی۔ میں اس صورتِ حال سے ذرا بھی پریشان نہیں ہوا۔ جلیل کے ذریعے مجھے علم ہو چکا تھا کہ عالیہ کا کمرا کون سا ہے۔ ایک راہداری سے گھوم کر میں اس کے آخری سرے پر پہنچ گیا۔

ابھی تک میرے کام میں کوئی رکاوٹ نہیں ہوئی تھی۔ میں اب عالیہ کے کمرے کے قریب تھا۔ میں نے دروازے کو تھوڑا سا دھکیلا اور وہ کھل گیا۔ میں خاموشی سے اندر رینگ گیا۔ میرا دل دھک دھک کر رہا تھا۔ میری آنکھیں تاریکی میں بھی دیکھ رہی تھیں۔ عالیہ اپنے بستر پر نہیں تھی۔ اس کی مسہری خالی تھی۔ میں دروازے کے قریب رک کر انتظار کرنے لگا۔ زیادہ انتظار نہ کرنا پڑا۔ دروازہ بہت زور سے کھلا اور ایک نسوانی ہیولا اندر داخل ہوا۔ انداز دوڑنے کا سا تھا۔

انتظار کرنا بے سود تھا جو کام جس قدر جلد ہو جائے بہتر ہے۔ میں نے چاقو سنبھالا اور بڑی مہارت سے لڑکی پر جھپٹ پڑا۔ میں نے ایک ہاتھ اس کے منہ پر جمایا اور دوسرے ہاتھ سے چاقو لڑکی کے دل میں اتار دیا۔ دوسرا اور پھر تیسرا وار کر کے میں مطمئن ہو گیا۔ دس انچ کا لمبا چاقو تین بار اس کے دل میں پیوست ہوا تھا۔ اب اس کے جانبر ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ میں نے اسے زور سے زمین پر دھکا دیا اور باہر نکل آیا۔ باہر کچھ بھاگ دوڑ ہو رہی تھی۔ پتا نہیں کیوں۔ بہرحال مجھے دیوار پھلانگ کر باہر نکل آنے میں کوئی دقت نہیں ہوئی۔

پانی سے بھرے ہوئے ایک گڑھے میں چاقو پھینک کر میں روشنی میں آ گیا۔ میں نے اپنا لباس دیکھا۔ خوش قسمتی سے خون کا کوئی دھبا اس پر موجود نہیں تھا۔ میں نے اس کا خیال رکھا تھا۔ چنانچہ اب پروگرام کے دوسرے مرحلے کا آغاز کرنے میں مجھے کوئی دقت نہیں ہوئی۔ میں نے یہاں سے سیدھا ریلوے اسٹیشن کا رخ کیا تھا۔

اس قتل کا مجھے کوئی افسوس نہیں ہوا تھا۔ میں مطمئن ہو کر خوش تھا۔ عاشی کا انتقام لے لیا گیا تھا۔ میں نے ٹکٹ خرید لیا اور پھر ٹرین میں جا بیٹھا۔

تھوڑی دیر تک بدحواسی کا شکار رہا تھا لیکن پھر خود کو سنبھالنے میں کامیاب ہو گیا اور پھر جب ٹرین نے اسٹیشن چھوڑا تو میں بالکل مطمئن ہو گیا تھا۔ رات کا ایک بجا تھا۔ میں نے ٹھیک بارہ بجے اسے قتل کیا تھا اپنے پروگرام کے مطابق۔

سفر ساری رات جاری رہا۔ اس وقت صبح کے تقریباً سات بجے تھے جب ٹرین ایک چھوٹے سے ریلوے اسٹیشن پر رکی۔ یہ صبح کے حسن کا کرشمہ تھا یا تائید غیبی کہ مجھے

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

یہ جگہ بڑی خوب صورت لگی اور میں بلاارادہ وہاں اتر گیا۔ ٹرین آگے بڑھ گئی۔ اسٹیشن پر اِکادُکا آدمی نظر آرہے تھے۔ میں وہاں سے آگے بڑھ گیا۔

بہت چھوٹی سی بستی تھی۔ دو دن میں نے اس بستی کے سرائے میں قیام کیا۔ میں قانون سے بچنا چاہتا تھا لیکن خوف نے میرا پیچھا نہ چھوڑا۔ میں نے خود کو غیر محفوظ تصور کیا تھا۔ کہاں جاؤں، کون سی جگہ خود کو روپوش کرلوں۔ ایک شام ایسی دہشت سوار ہوئی کہ بستی چھوڑ کر پہلے کھیتوں اور پھر جنگل میں نکل آیا۔ ویران لق ودق جنگل تاحدِنگاہ پھیلا ہوا تھا۔

میں درختوں کے درمیان سفر کرنے لگا۔ رات ہوگئی تو ایک درخت کے نیچے آرام کرنے لیٹ گیا۔ دوسری صبح پھر آگے بڑھ گیا۔ طرح طرح کے جانور نظر آرہے تھے۔ پرندے اور چوپائے۔ میں ان کے درمیان سفر کرنے لگا۔ اب آبادی کا کہیں نام ونشان نہیں تھا۔ میں مسرور تھا۔ ان جنگلوں میں مجھے کون تلاش کرسکتا ہے۔ وہاں میں نے ایک جگہ منتخب کرلی۔ پانی کی ایک قدرتی جھیل کے کنارے میں نے اپنا مسکن بنالیا۔

دنیا کی غلاظتوں سے دور پاک اور صاف جگہ تھی۔ جنگلی پھلوں کے درخت یہاں بکثرت تھے اور میں اس قدرتی غذا کے سہارے زندگی بسر کرنے لگا۔ چند روز تو پریشانی میں گزرے لیکن پھر میں اس زندگی کا عادی ہوگیا۔ جھیل کے کنارے ابھری ہوئی ایک چٹان میرا مسکن بن گئی۔ میں اس کے سائے میں بیٹھ کر خود کو دنیا بھر کی آفات سے محفوظ تصور کرتا تھا۔ شب وروز گزرنے لگے۔ خیالات معدوم ہوتے گئے۔

لیکن ایک احساس، ایک خیال کبھی کبھی مجھے بےچین کردیتا تھا۔ ایک خوب صورت، سادہ سا چہرہ سوال بن کر میرے سامنے آکھڑا ہوتا۔ ”تم نے مجھے قتل کیوں کیا؟ قصوروار تو میرا باپ تھا۔ میں تو نہ تھی۔“

”اوہ بھئی یہ خدا کا قانون ہے تو اس کی مصلحتوں سے کیسے لڑ سکتا ہے۔“ اور خدا کا یہ قانون میرے سامنے تھا۔ معصوم اور بےضرر پرندے خوراک کی تلاش میں نکلتے اور خوراک ہی کی تلاش میں نکلنے والوں کا شکار بن جاتے۔ پیٹ دونوں کا تھا۔ دونوں ہی فطرت کے تقاضوں کی تکمیل کے لیے مصروفِ عمل ہوتے۔ ان میں کون ظالم تھا، کون مظلوم، ہزار ہا مناظر میرے سامنے آتے۔ پُرسکون تنہائیوں میں ان کا مشاہدہ کرنے کا موقع ملتا۔ میں دیکھتا کہ بڑے جانور چھوٹے جانوروں پر حاوی ہوتے۔ چھوٹے جانور ان سے چھوٹے جانوروں پر۔

حشرات الارض زندگی کے لوازمات کے لیے مصروفِ عمل نظر آتے۔ تیز ہوا کے جھونکے ان سے زندگی چھین لیتے۔ صدیوں کی کہانی لمحوں میں ختم ہوجاتی۔ ان کی جگہ دوسرے کیڑے مکوڑے لے لیتے۔ گھونسلوں میں چھوٹے چھوٹے معصوم چڑیوں کے بچے۔ ماں سے خوراک کی فرمائش کرتے۔ ماں تا بھری بچوں کی مانگ پوری کرنے نکلتی اور کسی شاہین کا شکار ہوجاتی۔

بچوں کی آوازیں خاموش ہوجاتیں۔ کبھی کبھی وہ گھونسلوں سے نکل کر پھر سے اڑ جاتے۔ کبھی ہوا کے جھونکوں سے گھونسلے بکھر جاتے اور ان کی سوکھی ہوئی لاشیں زمین پر گر پڑتیں۔ ایک بار میں نے ایک مٹی کے گولے کو توڑ کر دیکھا، درمیان میں ایک ننھا سا کیڑا کلبلا رہا تھا۔ گولے میں کوئی مسام نہیں تھا لیکن کیڑے کے منہ میں ایک سبز پتی دبی ہوئی تھی۔ کہاں سے آئی ہے یہ خوراک کون مہیا کرتا ہے اسے۔ سب کچھ ناقابلِ فہم، عقل چھوٹی ہے۔ کائنات وسیع۔ ایک نظام ہے جو متعین ہے۔ اسے چلانے والا تاحدِنگاہوں سے اوجھل، لیکن عمل موجود۔

بارش رک گئی۔ آسمان صاف ہوگیا۔ پرندے چہچہانے لگے۔ لیکن دل کی حالت کچھ زیادہ ہی خراب ہوگئی تھی۔ میں نے دنیا ترک کردی ہے۔ موت کے خوف نے مجھے یہاں لا پھینکا ہے۔ کیا یہاں موت نہیں آئے گی؟ کیا دنیا میں آنے سے پہلے کوئی احساس تھا۔ میں نے دنیا میں آنے کی خواہش کی تھی۔ کیا میں دنیا سے جانے سے خود کو روک سکتا ہوں۔ ایک دن یہ گھونسلا بکھر جائے گا۔ میری سوکھی ہوئی لاش ہوا کے کسی تیز جھونکے سے منتشر ہوجائے گی۔ اعضا بکھر جائیں گے۔ پھر یہ ماہ وسال کی دھوپ میں تپیں گے۔ ننھے ننھے کیڑے اس سے لپٹ جائیں گے اور اس کے بعد ہڈیاں گل کر مٹی ہوجائیں گی۔

ہر چیز مٹی ہے، لوہا، لکڑی، سونا، ہیرا اور مضبوط سے مضبوط چیز۔ بالآخر مٹی میں بدل جاتی ہے۔ گردشِ کائنات کو روکنے کی کوئی سبیل ہے اور اس کے بعد ایک نئی زندگی کا تصور۔ ہاں یہ تصور آخری امید ہے اور یہ امید ایک ایسی ہستی سے ہے جو ہر جگہ موجود ہے۔ گناہ وثواب کانی آنکھ سے چھپ سکتا ہے لیکن دیکھنے والی آنکھ...... محاسبہ کرنے والے ہاتھ کہاں نہیں ہیں۔ گناہ انسان سے چھپ سکتا ہے، ان آنکھوں سے نہیں۔

بدن پر لرزہ طاری ہوگیا۔ آہ، کس قدر بھٹکا ہوا

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

ہوں۔ میں کتنا بھول گیا ہوں خود کو۔ نہیں میرے معبود تو موجود ہے تو حاضر ہے۔ میں تجھ سے نہیں چھپ سکتا۔ میں تجھ سے نہیں چھپوں گا۔ میں سزا کا طالب ہوں۔ میں سزا چاہتا ہوں۔ میں سزا چاہتا ہوں۔ آنکھوں سے آنسو نکلے۔ حلق سے سسکیاں نکلنے لگیں۔ تیرے قانون سے میں بغاوت نہیں کرسکتا۔ مجھے معاف کر دے میرے آقا۔ تیری دی ہوئی زندگی میں نے چھینی تھی۔ میں اس کی سزا چاہتا ہوں۔ لبیک لبیک! میں اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔

پورے بدن پر رعشہ طاری تھا۔ دل تھرا رہا تھا۔ میں نے اپنی الجھن کا حل پالیا تھا۔ میں نے ایک فیصلہ کرلیا تھا اپنی ذات کے لیے۔ اور اس راہنمائی کے لیے میں نے نہا کر شکرانے کے نفل پڑھے۔ میں سزا قبول کرنے کے لیے چل پڑا۔ میرے قدموں میں لغزش نہیں تھی۔ بڑی مضبوطی سے میں اپنی منزل کی طرف بڑھ رہا تھا۔ طویل عرصے کے بعد میں نے آبادی دیکھی، انسان دیکھے۔ نئے درخت نکل آئے تھے۔ نئی کونپلیں پھوٹ رہی تھیں۔ سوکھے پتے جھڑ چکے تھے۔ عملِ کائنات جاری تھا۔ یہ قدرت کا قانون ہے۔ میں اس سے انحراف نہیں کرسکتا۔ میں اس میں تحریف نہیں کر سکتا تھا۔

پولیس انسپکٹر تک رسائی بڑی مشکل سے ہوئی تھی۔ میرا حلیہ دیکھ کر لوگوں نے مجھے پاگل سمجھا تھا۔ پولیس انسپکٹر نے بھی مجھے ایسی ہی نگاہوں سے دیکھا تھا۔

''کیا بات ہے؟''

''میں اپنے جرم کا اعتراف کرنے آیا ہوں۔ میں خود کو گرفتاری کے لیے پیش کرتا ہوں۔''

''خوب، تم نے دوسری جنگِ عظیم کرائی تھی؟'' انسپکٹر نے پوچھا۔

''جی...... جی نہیں۔''

''تب، جان ایف کینیڈی کے اصلی قاتل تم ہو؟''

''آپ میری بات سنجیدگی سے سنیے۔ میں قاتل ہوں۔ میں ایک قتل کا اعتراف کرنے آیا ہوں۔''

''کرو بھئی، اعتراف کرو، ہم کب منع کرتے ہیں۔''

انسپکٹر مذاق کے موڈ میں تھا۔

''میں نے شائن کلرز کے مالک احتشام علی کی بیٹی عالیہ کو قتل کیا تھا۔ آج سے دو ڈھائی سال پہلے کی بات ہے۔ آپ میری بات پر یقین کریں۔ معلوم کرلیں یہ بات۔ میں اس قتل کا اعتراف کر کے اپنی مضطرب روح کو سکون دینا چاہتا ہوں۔ برائے کرم مجھے گرفتار کریں۔'' میں نے کہا اور

انگلی کی طاقت

بیوی نے انگلی کے اشارے سے شوہر کو بلایا۔

شوہر۔ ''کیا کام ہے؟''

بیوی۔ ''کچھ نہیں بس انگلی کی طاقت چیک کر رہی تھی۔''

سارا جہاں

ایک مراثی کا گدھا گم ہوگیا۔ وہ ڈھونڈ ڈھونڈ کر تھک گیا آخر ایک درخت کے نیچے آکر بیٹھ گیا، وہیں ایک طرف ایک لڑکا اور لڑکی بیٹھے پیار بھری باتیں کر رہے تھے، لڑکا کہہ رہا تھا۔

''میری جانم تیری آنکھوں میں مجھے سارا جہاں نظر آرہا ہے۔''

مراثی نے یہ سنا تو فوراً بولا۔ ''دیکھنا یار کہیں میرا گدھا نظر آئے تو بتانا۔''

عبدالجبار رومی انصاری، لاہور

اب پولیس انسپکٹر سنجیدہ ہوگیا۔

''یہ نام تو سنا ہے میں نے کسی کیس کے سلسلے میں۔'' انسپکٹر نے گھنٹی بجا کر اردلی کو بلایا۔ اردلی نے ایس آئی کو اور پھر رجسٹرار کو۔ انسپکٹر نے مجھ سے کچھ سوالات کیے اور میں نے اسے اپنی پوری کہانی سنادی۔ انسپکٹر اب بالکل سنجیدہ ہو گیا تھا۔ اس نے چندفون کیے اور پھر مجھے گرفتار کر کے لاک اپ میں بند کر دیا گیا۔ میری روح منور ہوگئی تھی۔ میں نے صحیح قدم اٹھایا تھا۔ درست فیصلہ کیا تھا میں نے اپنے مستقبل کے بارے میں۔

میری فراہم کی ہوئی تفصیلات کے بارے میں تحقیقات شروع ہوگئیں۔ پہلا دن گزر گیا۔ دوسرا دن اور پھر تیسرا دن۔ چوتھے دن گیارہ بجے پولیس انسپکٹر نے مجھے دفتر میں بلایا۔

''کہو میاں صاحب کیسے حال ہیں؟'' وہ پھر غیر سنجیدہ تھا۔

''ٹھیک ہوں۔''

''کچھ اور قتل وتل کیے اس دوران؟''

''جی؟''

''کتنے دن اور سرکاری روٹیاں کھانا چاہتے ہو؟''

''میں نہیں سمجھا جناب؟''

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

''جی چاہتا ہے تمہیں ٹھیک سے سمجھادوں مگر نہ جانے کیوں رحم آتا ہے۔ چلو دفان ہو جاؤ۔''

''جی؟'' میں کچھ سمجھ نہیں سکا تھا۔

''جسے تم نے قتل کیا تھا۔ اس نے مرنے کے بعد بی اے کا امتحان دیا ہے اور پاس ہوگئی ہے۔ دو چار قتل اور کرو پھر آجانا۔ کچھ کریں گے تمہارے لیے۔''

''جناب عالی! آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ آپ یقین کیجیے میں نے اسے قتل کیا تھا اور......''

''وہ مقتولہ زندہ ہے۔ ہاں اس کا باپ احتشام ضرور مر چکا ہے۔ وہ قتل کے الزام میں گرفتار ہوا اور پھر جیل میں مرگیا۔''

''کون احتشام علی؟'' میں نے تعجب سے پوچھا۔

''میاں، شائن کلرز کا مالک احتشام علی۔''

''اسے اپنی بیٹی کے قتل کے الزام میں......''

''بیٹی نہیں، بھائی داشتہ...... اس نے اپنی داشتہ کو قتل کیا تھا۔ اس کی داشتہ خود اس کے قتل کا ارادہ رکھتی تھی اور اس مقصد سے بارش کی ایک رات وہ اس کے گھر اس وقت آگئی جب وہ تنہا تھا۔ اس نے پہلے احتشام سے لگاوٹ کی باتیں کیں اور بہلا پھسلا کر اس پر وار کر دیا۔ ممکن ہے احتشام نے زخمی ہونے کے باوجود اس سے چاقو چھین کر اس پر وار کر دیا۔ احتشام کی داشتہ زخمی ہو کر بھاگی اور جان بچانے کی غرض سے جو کمرا سامنے آیا اس میں گھس گئی اور پھر اس نے احتشام کی بیٹی کے کمرے میں جان دے دی۔ لیکن دوست، ایک منٹ، ایک گڑبڑ ہے۔'' پولیس انسپکٹر سوچ میں ڈوب گیا۔ ''احتشام نے عدالت میں بیان دیا تھا کہ اس نے مقتولہ پر دو وار کیے تھے جبکہ مقتولہ کے بدن پر پانچ زخم پائے گئے تھے۔ احتشام آخر تک یہی کہتا رہا تھا کہ اس نے دو وار کیے ہیں۔ معاملہ گڑبڑ ہے۔ کیا باقی وار تم نے کیے تھے اس پر؟''

''آہ...... ممکن ہے، ایسا ہی ہوا ہو۔'' میں نے آہستہ سے کہا۔ پولیس انسپکٹر الجھی ہوئی نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا پھر اس نے ایس آئی کو آواز دی اور بولا۔

''لے جاؤ میاں، اسے بند کر دو۔ یہ جان نہیں چھوڑے گا۔'' اور ایک بار پھر مجھے لاک اپ میں بند کر دیا گیا۔ میرے بیان کے بارے میں تحقیقات ہوئی۔ پوسٹ مارٹم رپورٹیں دیکھی گئیں لیکن صرف دو وار تھے جن کی وجہ سے موت واقع ہوئی تھی۔ دوسرے تین زخموں کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ مقدمہ چلتا رہا۔ مجھے جیل بھیج دیا گیا۔ حکومت نے مجھ پر وکیل مقرر کر دیا۔ میری پوری کہانی کی تصدیق کی گئی۔ عاشی کی موت کے بارے میں چھان بین ہوئی پھر ایک دن میرا وکیل مجھ سے ملا۔

''تمہاری بہن عاشی کسی حادثے کا شکار ہوئی تھی؟''

''جی ہاں۔''

''اور تم نے اسے ایک بڑے اسپتال میں داخل کر دیا تھا؟''

''جی ہاں۔''

''اس کا آپریشن ہونا تھا؟''

''جی۔''

''یہ آپریشن سرجن حیدر علی نے کرنا تھا؟''

''جی ہاں۔''

''اور آپ نے احتشام علی کو لوٹنے کی کوشش کی تھی؟''

''جی۔''

''اور آپ کو سزا ہوگئی تھی؟''

''جی...... مگر......''

''سزا کاٹنے کے بعد آپ اپنے گھر گئے تھے؟''

''نہیں، مجھے اس گھر میں قدم رکھتے ہوئے خوف محسوس ہوتا تھا۔''

''احمق ہیں آپ۔ کانسٹیبل اسے بھیجو۔'' وکیل صاحب نے کہا اور کانسٹیبل باہر چلا گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ ایک ڈری سہمی سی لڑکی کے ساتھ اندر آیا۔ میں نے اسے دیکھا اور میری سانس بند ہوگئی۔ میرے بدن پر رعشہ طاری ہوگیا۔ آنکھیں دھندلا گئیں۔ وہ میری عاشی تھی۔ وہ میری بہن عاشی تھی۔ مجھ پر دورہ پڑ گیا۔ پاگل ہوگیا میں۔ سجدے میں گر گیا۔ نہ جانے کیا کچھ کیا میں نے بڑی مشکل سے میں اپنے آپ کو اعتدال پر لا سکا تھا۔

''سرجن حیدر علی کو صورتِ حال معلوم ہوئی تو انہوں نے فی سبیل اللہ عاشی کا آپریشن کر دیا اور وہ ٹھیک ہوگئی۔ تمہیں کسی نے اس کی موت کی غلط اطلاع دی تھی۔ وہ آٹھ ماہ اسپتال رہی اور گھر پہنچا دی گئی۔ تمہارے پڑوسیوں نے آج تک اس کی کفالت کی ہے۔ بہرحال یہ خدا کا قانون ہے اور سنو...... انشاء اللہ آئندہ پیشی پر تم رہا ہو جاؤ گے۔ تمہیں شک کی گنجائش دی گئی ہے کیونکہ موت پہلے دو وار کی وجہ سے ہوئی ہے۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ یہی بتاتی ہے۔ احتشام اگر زندہ ہوتا تو شاید اس کیس میں کوئی جان ہوتی۔ لیکن وہ سزا کے دوران دل کے دورے سے مر چکا ہے۔ میری طرف سے نئی زندگی کی مبارک باد قبول ہو۔''

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

پسِ جہاں

تنویر ریاض

زندگی سے ہر ذی روح کو پیار ہے... اور اس زندگی کو دلکش و خوب صورت بنانے کے لیے ہر شخص اپنی کوششوں کا سفر جاری رکھتا ہے... مگر کبھی یہ بے وفا زندگی آغازِ سفر میں ہی داغ مفارقت دے جاتی ہے... تمام تر شوخیوں اور شرارتوں سے بھرپور نوجوان کی تصویر کہانی... ایک دن اچانک ہی اس کا خوشگوار سفر تمام ہو گیا...

ایک بہن کی محبت جو اپنے بھائی سے کیا وعدہ نبھانا چاہتی تھی......

صحافت کے شعبے میں تھوڑے عرصے خدمات انجام دینے کے بعد جب مجھے پرائیویٹ سراغ رساں کا لائسنس ملا تو بہت جلد اندازہ ہو گیا کہ عام طور پر ایک سراغ رساں کو کیا کام کرنا ہوتا ہے گو کہ عام طور پر زیادہ تر پرائیویٹ سراغ رساں مرد ہوتے ہیں لیکن ان کی کہانیاں اور کارنامے پڑھ کر مجھے بھی اس کام سے دلچسپی ہو گئی اور میں نے پرائیویٹ سراغ رساں بننے کا فیصلہ کر لیا۔ میں اب بھی اس کام کو رومانوی اور پُرجوش سمجھتی ہوں۔ میں نے

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

ایسے کئی معاملات نمٹائے جن میں کسی کے ساتھ ناانصافی ہورہی تھی۔ مثلاً ٹریفک حادثے کی صورت میں بیمہ کمپنی سے معاوضے کی ادائیگی۔ ملازم پیشہ افراد کے لیے واجبات کا حصول اور ایسے گاہکوں کو پکڑنا جو مالی معاملات میں بددیانتی کے مرتکب ہوتے ہوں لیکن اب مجھے پہلی بار ایک قتل کا معما حل کرنا تھا۔

میرا دفتر پرموورٹ کے علاقے میں ایک چھوٹے سے مال میں ہے جس کے شیشے کے دروازے پر سنہرے حروف میں میرا نام لکھا ہوا ہے۔ 'کے سی ڈوبنر سراغ رساں' اس ایک کمرے کے دفتر میں ایک میز، ٹیلی فون، تین کرسیاں، ایک کمپیوٹر اور دو عدد فائل کیبنٹ ہیں۔ اس روز جب قتل کا یہ کیس میرے پاس آیا تو میں اپنے سنگین مالی حالات کی وجہ سے پریشان تھی۔ میرے اکاؤنٹ میں صرف سو ڈالر رہ گئے تھے اور مجھے فوری طور پر کام کی ضرورت تھی۔

دفتر کا دروازہ کھلا اور ایک درمیانی عمر کی عورت اندر داخل ہوئی۔ اس کی عمر پچاس کے لگ بھگ ہوگی۔ اس نے نیلی جینز، ٹی شرٹ اور بغلی جیکٹ پہن رکھی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک موٹی فائل اور کندھے پر سیاہ چمڑے کا بیگ لٹکا ہوا تھا۔

''کے سی ڈوبنر کہاں ہے؟'' اس نے نیچی آواز میں کہا۔

میں نے اپنی جگہ سے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ ''میں ہی کیرون ڈوبنر ہوں۔''

اس نے مشکوک انداز میں مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''تم پرائیویٹ سراغ رساں ہو؟''

میں نے چہرے پر مصنوعی مسکراہٹ سجاتے ہوئے کہا۔ ''ہاں اور میرے پاس اس کا لائسنس موجود ہے۔''

وہ کرسی پر بیٹھ گئی اور فائل میز پر رکھتے ہوئے بولی۔ ''میرا نام آئرین ڈفلپ ہے۔ میرا خیال ہے کہ تمہاری خدمات حاصل کرلوں۔''

''ٹھیک ہے۔'' میں نے بال پوائنٹ پین اور پیڈ اٹھاتے ہوئے کہا۔ ''میں تمہاری کیا خدمت کرسکتی ہوں۔ تم کس سلسلے میں یہاں آئی ہو؟''

''اوہ۔'' اس نے کہا۔ ''اس کا تعلق میرے بھائی جان سے ہے جو مرچکا ہے۔''

''یہ سن کر افسوس ہوا۔''

''شکریہ، لیکن اسے قتل کیا گیا تھا۔ گزشتہ برس اور میں چاہتی ہوں کہ تم اس کا سراغ لگاؤ۔''

میں نے پین میز پر رکھتے ہوئے کہا۔ ''مسز ڈفلپ۔''

''مس۔''

''مس ڈفلپ۔ یہ میرا کام نہیں ہے۔''

''تم ایک سراغ رساں ہو اور تمہارا کام معاملات کو حل کرنا ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ تم میرے بھائی کے قتل کا بھی سراغ لگاؤ۔''

''یہ کام پولیس کا ہے۔ پرائیویٹ سراغ رساں کا نہیں۔''

''انہوں نے اسے حادثاتی موت قرار دے کر معاملہ ختم کردیا لیکن میں جانتی ہوں کہ وہ قتل تھا اور میری خواہش ہے کہ تم اسے ثابت کرو۔''

''مس ڈفلپ، مجھے یقین ہے کہ انہوں نے پوری کارروائی کی ہوگی۔ اگر میں یہ کیس لے لوں تو یہی کروں گی۔ فائلوں کا معائنہ، چند لوگوں سے ملاقاتیں اور آخر میں یہی نتیجہ سامنے آئے گا۔ نہیں مس، میں تمہارا وقت اور پیسا ضائع کرنا نہیں چاہتی۔''

اس نے مجھے غصے سے دیکھا اور پرس کھول کر کچھ ٹٹولنے لگی پھر اس نے سو ڈالر کے دس نوٹ نکال کر میری میز پر رکھ دیے۔

''یہ کافی ہوں گے۔'' اس نے کہا۔ ''اگر تم نے یہ کیس حل کردیا تو مزید معاوضہ دوں گی۔ اگر تمہیں کوئی نئی بات معلوم نہ ہو تب بھی یہ پیسے تمہارے ہیں۔ کیا اب بھی انکار کی کوئی گنجائش ہے؟''

میں نے اپنی مالی صورت حال کے پیش نظر رضامندی ظاہر کرتے ہوئے کہا۔ ''ٹھیک ہے مس ڈفلپ، میں تمہارا کیس لے رہی ہوں لیکن ایک بار پھر بتادوں کہ میں اس معاملے میں بہت زیادہ پُرامید نہیں ہوں۔''

''کوئی بات نہیں۔'' اس نے کہا۔ ''میں یہ سب اپنے بھائی کے لیے کررہی ہوں ورنہ ضمیر کی خلش مجھے پریشان کرتی رہے گی کہ کیسی بہن ہوں جو اپنے بھائی کے لیے کچھ نہ کرسکی۔''

کچھ ضروری کاغذی کارروائی مکمل کرنے کے بعد وہ مجھے آدھ گھنٹے تک اپنے بھائی کے بارے میں بتاتی رہی۔ وہ دونوں ونڈسر کے نزدیک قصبے میں رہتے تھے۔ ان کی شادیاں نہیں ہوئی تھیں اور وہ اپنے مرحوم والدین کے مکان میں رہائش پذیر تھے۔ جان ایک ماہر کاریگر تھا اور بیک وقت کارپینٹر، پلمبر، الیکٹریشن اور اسکول گارڈ کے طور پر کام

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

کرتا تھا۔ معاون اسکاؤٹ ماسٹر ہونے کے علاوہ اس نے دو سال پلاننگ بورڈ میں بھی کام کیا۔ وہ لائنز کلب اور کنزرویشن کمیشن میں بھی فعال تھا۔

ایک اتوار کی صبح وہ علاقے کے کچرا گھر کے پاس کھڑا ہوا تھا کہ ایک نامعلوم گولی اس کے دل پر لگی اور وہ موقع پر ہی جاں بحق ہوگیا۔ اس واقعے میں کوئی گرفتاری عمل میں نہیں آئی اور بعد میں اسے حادثاتی موت قرار دے دیا گیا۔

''معاف کرنا۔'' میں نے نوٹ پیڈ سے نظریں اٹھاتے ہوئے کہا۔ ''حادثاتی؟''

اس نے تائید میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''ہاں۔''

''گولی کہاں سے آئی تھی؟''

اس کے بیان کے مطابق کچرا گھر سے متصل ایک لکڑی کا ڈھیر تھا اور اس کے عقب میں کئی ایکڑ زمین ہے جو ونڈسر راڈ اور گن کلب کی ملکیت ہے۔ اس کے ایک سرے پر شوٹنگ رینج ہے۔ اس صبح جب جان ڈفلپ اپنے دوستوں کے ساتھ کھڑا باتیں کر رہا تھا تو وہاں شوٹنگ کا بھی مقابلہ ہو رہا تھا۔ ونڈسر پولیس ڈپارٹمنٹ، اسٹیٹ پولیس اور اسسٹنٹ اٹارنی جنرل کے مطابق اس مقابلے میں چلائی جانے والی ایک گولی ہدف کے بجائے جان ڈفلپ کو لگ گئی۔

''گویا ان کے خیال میں وہ ایک دردناک حادثہ تھا۔''

''لیکن یہ احمقانہ بات ہے۔'' آئرین نے کہا۔ ''میں وہاں گئی تھی۔ تمہیں بھی جانا چاہیے۔ تم دیکھو گی کہ کسی بھی طرح کوئی بھٹکی ہوئی گولی میرے بھائی کو نہیں لگ سکتی۔''

''اگر وہ بھٹکی ہوئی گولی نہیں تو تمہارے خیال میں یہ ایک قتل تھا؟''

اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے اور وہ بولی۔ ''یقیناً وہ قتل ہی تھا۔''

''کیا تمہارے بھائی کا کوئی دشمن تھا۔ ایسے پڑوسی جو اسے پسند نہ کرتے ہوں۔ ایسے غیر مطمئن گاہک جو اس سے بغض رکھتے ہوں؟''

اس نے میرے ہر سوال کا جواب نفی میں دیا اور روتے ہوئے بولی۔ ''وہ بہت اچھا انسان تھا اور قصبے کے سب لوگ اسے پسند کرتے تھے۔ وہ سب جانتے تھے کہ کسی بھی مشکل میں وہ اسے بلا سکتے ہیں۔ ہر کوئی اس سے بات کرنا پسند کرتا تھا۔''

میں نے کچھ مزید نوٹس لیے اور کہا۔ ''اس واقعے کو ایک سال ہو چکا ہے۔ اب تمہیں یہ خیال کیوں آیا؟ تم چھ مہینے پہلے میرے پاس کیوں نہیں آئیں؟''

''کیونکہ مجھے ایک نیا ثبوت مل گیا ہے۔'' اس نے بتایا پھر فولڈر میں ہاتھ ڈال کر ایک ڈی وی ڈی نکالی اور بولی۔ ''دیکھو اس ڈی وی ڈی میں میرے بھائی کو گولی لگتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔''

میں نے اس کے ہاتھ سے ڈی وی ڈی لیتے ہوئے کہا۔ ''یہ تمہیں کہاں سے ملی؟''

اس کے چہرے پر فتح مند مسکراہٹ دوڑ گئی۔ ''یہ مجھے ایک مہینے پہلے ملی جب ایک کالج کا طالب علم اس علاقے میں بھیڑیوں پر ریسرچ کر رہا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ بھیڑیے اس علاقے میں آوارہ گردی کرتے ہیں اور وہ چوبیس گھنٹے ان کی نگرانی کر رہا تھا۔ اس کے پاس دو کیمرے تھے۔ ایک دن اور دوسرا رات کی ریکارڈنگ کے لیے۔ میں نے دن والی ویڈیو دیکھی اور اس میں جان کو گولی لگتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔''

''پولیس کو اس ریکارڈنگ کا پتا کیوں نہیں چلا؟''

''کیونکہ اس لڑکے کو معلوم نہیں تھا کہ اس نے کیا ریکارڈ کیا ہے۔ ماں کی بیماری کی وجہ سے وہ اس پر توجہ نہ دے سکا اور نہ ہی اس نے ٹیلی وژن پر خبریں دیکھی تھیں پھر میں نے گزشتہ ہفتے ایک اخبار میں اس کی اسٹوری کے بارے میں پڑھا تو اسے فون کیا۔''

''تم نے پولیس کو یہ بات کیوں نہیں بتائی؟''

اس نے اپنے ہونٹ بھینچتے ہوئے کہا۔ ''کیونکہ مجھے ان پر بھروسا نہیں ہے۔ وہ اسے نظرانداز یا ضائع کر دیں گے۔''

''ٹھیک ہے۔ میں اسے دیکھ لیتی ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''پھر میں تحقیقاتی افسروں اور جائے وقوعہ پر موجود لوگوں سے بات کروں گی لیکن میں ایک بار پھر کہہ رہی ہوں مس ڈفلپ......''

''تم مجھے آئرین کیوں نہیں کہتیں؟''

''آئرین، مجھے اس کا بہت کم امکان نظر آتا ہے کہ کوئی مفید بات معلوم کر سکوں۔''

اس نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ ''کچھ نہ ہونے سے کچھ ہونا بہتر ہے۔'' پھر وہ فولڈر میری طرف کھسکاتے ہوئے بولی۔ ''اس میں سارا ریکارڈ موجود ہے۔ پولیس کی رپورٹیں، اخبارات کے تراشے وغیرہ۔''

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

میں بھی اس کے ساتھ ہی کھڑی ہوگئی اور کہا۔ ''مجھے جیسے ہی کچھ معلوم ہوا تو تمہیں فون کر دوں گی...... کیا میں ایک بات پوچھ سکتی ہوں؟''

''بالکل۔''

''تم مجھ تک کس طرح پہنچیں؟ کیا کسی نے تمہیں میرے بارے میں بتایا تھا؟''

اس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''زرد صفحات پر میری نظر سب سے پہلے تمہارے نام پر ہی گئی، یہ محض اتفاق ہی ہے۔''

رات کو ڈنر کرنے کے بعد میں نے وائن کا دوسرا گلاس لیا اور لیونگ روم میں چلی گئی۔ میں نے وہ ڈی وی ڈی پلیئر میں لگائی اور ٹی وی آن کر دیا۔ اسکرین پر ایک مینو نمودار ہوا جس پر چھوٹے چھوٹے خانوں میں تاریخیں درج تھیں۔ میں نے ایک بار پھر فائلیں دیکھیں۔ جان ڈفلپ اتوار 23 جون، گیارہ بج کر پچاس منٹ پر گولی کا نشانہ بنا تھا۔ میں نے 23 جون کے خانے پر ڈبل کلک کر دیا۔ میرے سامنے ایک واضح تصویر ابھر آئی جس کے نچلے حصے میں تاریخ کے ساتھ ساتھ وقت بھی آرہا تھا۔ یہ صبح سات بجے کا منظر تھا جب لوگ گھروں سے نکل رہے تھے۔ میں نے ویڈیو آگے بڑھائی۔ یہ صبح آٹھ بجے کا وقت تھا اور کچرا گھر کھول دیا گیا تھا۔ یہ ایک L ٹائپ عمارت تھی جس کی لمبی سائڈ پر کئی حصے بنے ہوئے تھے جن میں علاقے کے مکین اپنا کچرا پھینک رہے تھے۔ میں ویڈیو کو آگے بڑھاتی رہی اور جب گیارہ پینتالیس کا وقت آیا تو میں نے پلے کا بٹن دبا دیا اور طویل سانس لے کر کاؤچ کی پشت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔

میں نے دیکھا کہ جان ڈفلپ اپنے پک اپ ٹرک کے پاس کھڑا دو آدمیوں سے بات کر رہا تھا۔ وہ دونوں اس کے دائیں بائیں کھڑے تھے۔ جان قہقہے لگا رہا اور اشارے کر رہا تھا۔ یہ سوچ کر میرے بدن میں سنسنی دوڑ گئی کہ ایک ایسے شخص کو دیکھ رہی ہوں جو روئے زمین پر چند سیکنڈوں کا مہمان ہے پھر سب کچھ ختم ہوگیا۔ جان بل کھا کر زمین پر گر پڑا۔ دونوں آدمی جھک کر اس کا معائنہ کرنے لگے۔ ان میں سے ایک نے سیل فون اپنے کانوں سے لگا لیا۔ دوسرے لوگ بھی اس جانب دوڑ پڑے۔ چند منٹ بعد ایک پولیس کار وہاں پہنچی۔ اس کے پیچھے ایک ایمبولینس بھی تھی۔ اس کے بعد مزید کچھ دیکھنے کے لیے نہیں تھا۔ سوائے اس کے کہ کچھ پولیس آفیسر لوگوں سے باتیں کر رہے تھے پھر ایمبولینس وہاں سے روانہ ہوگئی اور جائے وقوعہ کے گرد زرد فیتہ لپیٹ دیا گیا۔

میں نے وہ حصہ دوبارہ دیکھا جس میں جان کو گولی لگی تھی۔ مجھے ایسا لگا جیسے میرے دماغ میں کوئی چیز کلبلا رہی ہے۔ ضرور کوئی گڑبڑ تھی...... لیکن کیا؟ میں نے ایک بار پھر ویڈیو کا وہ حصہ دیکھا جب پہلی بار جان ڈفلپ پر میری نظر گئی تھی۔ وہ کسی مشکل میں نظر نہیں آرہا تھا اور نہ ہی کسی سے بحث کر رہا تھا بلکہ میں نے اسے خوشگوار موڈ میں دیکھا۔ میں نے وہ حصہ دوبارہ دیکھا جب تک کہ اسے گولی نہ لگ گئی۔ اس طرح میں نے تین بار اس کے مرنے کا منظر دیکھا۔

اگلے دن میں نے ونڈسر کے پولیس چیف جونا ڈکسن سے ملاقات کا وقت لیا۔ اس کی عمر پینتالیس سال تھی۔ اس نے مجھے بتایا کہ اسے یہاں آئے صرف چھ ماہ ہوئے ہیں۔

''کاش میں تمہاری کوئی مدد کرسکتا کیرن لیکن یہ کیس میرے آنے سے پہلے کا ہے۔'' اس نے ڈیسک پر پنسل بجاتے ہوئے کہا۔ ''اور جب میں نے چارج لیا تو تمہیں یقین نہیں آئے گا کہ ریکارڈ کی کیا حالت تھی۔ میں نے جان ڈفلپ کی رپورٹ دیکھی ہے۔ اس میں کچھ نہیں ہے۔ اگر مزید معلومات درکار ہیں تو تمہیں اسٹیٹ پولیس میں کسی سے بات کرنا ہوگی۔ وہی بڑے جرائم کو دیکھتے ہیں۔''

''کیا تم سمجھتے ہو کہ وہ ایک حادثہ تھا؟''

''میں نے سنا ہے کہ وہ ایک اتفاق تھا۔ اچانک رونما ہونے والا حادثہ۔ وہاں ایک شوٹنگ رینج ہے اور اس وقت شوٹنگ کا مقابلہ ہو رہا تھا۔''

''لیکن وہ رینج درختوں اور زمین کی بلند سطح کے پیچھے ہے۔'' میں نے کہا۔ ''وہ جگہ نظروں کے سامنے نہیں پھر وہاں سے چلائی ہوئی گولی کس طرح جان ڈفلپ کو لگ سکتی ہے؟''

اس نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔ ''شوٹنگ رینج میں نشانہ بازی کے لیے لوہے کے بنے ہوئے ہدف استعمال کیے جاتے ہیں جو مختلف جانوروں مثلاً خم دار سینگوں والی جنگلی بھیڑ، جنگلی سؤر اور خرگوش کی شکل کے ہوتے ہیں۔ خیال یہی ہے کہ ایک گولی کسی ایک ہدف کے اوپری حصے سے ٹکرائی اور خم کھا کر کم رفتار سے جان کو لگ گئی جیسا کہ میں نے کہا یہ محض ایک اتفاق تھا۔''

''اس کی بہن کو ایک ویڈیو ملی ہے جس میں یہ منظر موجود ہے۔''

''یہ ویڈیو کس نے بنائی؟''

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

''ایک کالج کے طالب علم نے۔ وہ وہاں بھیڑیوں کی نقل و حرکت کی نگرانی کررہا تھا۔ اسی میں کچرا گھر اور پارکنگ لاٹ بھی نظر آرہا ہے۔ تم اس میں جان کو گولی لگنے کا منظر بھی دیکھ سکتے ہو۔ کیا تم وہ ویڈیو دیکھنا چاہو گے؟''

چیف نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''نہیں، یہ اس ٹاؤن کا کیس نہیں ہے۔ اس کا تعلق اسٹیٹ پولیس سے ہے۔''

''ٹھیک ہے۔'' میں نے کہا۔ ''تمہیں یہ تو معلوم ہوگا کہ اسٹیٹ پولیس کے کس آفیسر نے یہ کیس ہینڈل کیا تھا؟''

''ایک منٹ۔'' یہ کہہ کر وہ ایک فائل کیبنٹ کی طرف گیا۔ اس نے ایک فائل نکالی اور اسے دیکھنے کے بعد واپس اپنی جگہ پر رکھ دیا۔

''ڈیٹکٹیو سارجنٹ ہینک میسی۔ وہی تحقیقاتی ٹیم کا سربراہ تھا۔''

''شکریہ۔ ایک بات اور، اس ٹاؤن کلرک کا نام کیا ہے؟''

''ریٹا گڈون۔''

میں نے ٹاؤن کلرک کا نام اس لیے پوچھا کہ یہ لوگ پیدائش اور اموات کے سرٹیفکیٹ جاری کرنے، کاروں کی رجسٹریشن اور دوسرے بلدیاتی اُمور کے ذمّے دار ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ انہیں ہر بات کا علم ہوتا ہے اور وہ ایک طرح سے غیر سرکاری خفیہ ایجنسی کا کام کرتے ہیں لیکن بدقسمتی سے وہ لنچ پر گئی ہوئی تھی۔

مجھے ہینک میسی کو ڈھونڈنے میں ڈیڑھ دن لگ گیا۔ وہ اسٹیٹ پولیس سے ریٹائر ہونے کے بعد موٹر وے میں رہ رہا تھا جو ونڈسر سے آدھے گھنٹے کی مسافت پر تھا۔

''جان ڈفلپ۔'' وہ ایک آرام کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ''وہ عجیب و غریب کیس تھا۔ وہ کچرا گھر کے پاس کھڑا ہوا لوگوں سے باتیں کررہا تھا اور اچانک ہی آلوؤں کی بوری کی طرح گر پڑا۔ گولی اس کے دل کے پار ہوگئی۔''

''اس کی تحقیقات کس طرح شروع ہوئی؟''

''وہاں تقریباً نصف درجن لوگ موجود تھے جو کوڑا پھینکنے آئے تھے یا جان سے باتیں کررہے تھے۔ اس کی موت فوری طور پر واقع ہوگئی۔ ہم نے ان سب لوگوں کے انٹرویو کیے۔ اس کے ماضی کے بارے میں معلوم کیا لیکن کوئی خاص بات سامنے نہیں آئی۔ سوائے اس کے کہ وہاں ایک شوٹنگ رینج ہے اور جب اسے گولی لگی تو وہاں شوٹنگ کا مقابلہ ہورہا تھا۔

''لیکن ایسا لگتا نہیں ہے کہ رینج سے چلائی ہوئی گولی اسے لگ جائے۔ میں سمجھتی ہوں کہ کچرا گھر اور رینج کے درمیان زمین کی سطح کافی بلند ہے۔''

''یہ محض ایک اتفاق ہے۔'' اس نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔ ''اور یہ کبھی بھی ہوسکتا ہے۔''

''گولی چلانے والے کو ڈھونڈنے کا کوئی طریقہ نہیں تھا؟''

''اس روز وہاں تقریباً تیس شوٹرز تھے اور ہمیں جو خول ملا وہ اتنا مسخ شدہ تھا کہ اس کے کیلیبر کا پتا چلانا بھی مشکل تھا۔ بہرحال وہ ایک حادثاتی موت تھی۔''

میں چند منٹ اس کے پاس پورچ میں بیٹھی لان اور تالاب کے نظارے سے لطف اندوز ہوتی رہی۔ اس نے دونوں بازو سینے پر باندھتے ہوئے کہا۔ ''مس کیرن، تمہیں کیا چیز پریشان کررہی ہے؟''

''مجھے ایک نیا ثبوت ملا ہے۔''

مجھے امید تھی کہ وہ جوش میں آکر اچھل پڑے گا لیکن وہ اسی طرح کرسی پر جھولتا رہا۔

''کس قسم کا ثبوت؟''

''لگتا ہے کہ وہاں کسی کالج کے طالب علم نے درختوں پر کیمرے لگا رکھے تھے۔ وہ بھیڑیوں کی نقل و حرکت ریکارڈ کررہا تھا۔ جان ڈفلپ کی بہن کو اس کا پتا چل گیا۔ اس نے وہ ڈی وی ڈی حاصل کرلی۔ میں نے وہ دیکھی ہے اور اس میں گولی لگنے کا منظر بھی ہے۔''

''اس میں کیا دکھایا گیا ہے؟''

میں نے جو کچھ دیکھا تھا وہ اسے بتا دیا۔ اس نے پوچھا۔ ''کیا اس میں کوئی بات مشتبہ تھی؟ کیا وہاں سے کوئی کار گزر رہی تھی؟ کسی کھڑکی سے بندوق کی نال نظر آئی؟ کیا کوئی شخص چلتا ہوا وہاں آیا اور اس نے جان کے سینے پر پستول رکھ دیا؟''

''نہیں۔''

''کوئی ایسی بات جو غیر معمولی ہو جس سے اس خیال کی تصدیق نہ ہوسکے کہ یہ حادثاتی موت تھی؟''

مجھے یوں لگا جیسے کسی تفتیشی مرکز میں ہوں۔ میں نے تنگ آکر کہا۔ ''ایسی کوئی بات نہیں۔''

''تمہیں مبارک ہو کہ ایک ایسی چیز مل گئی جس سے ہمارے نتیجے کی تصدیق ہوتی ہے۔ اس کے باوجود اگر تم مزید جاننا چاہتی ہو تو میں ایک ایسے آدمی کا نام بتا سکتا ہوں جو تمہیں ہماری فائلیں دکھا سکتا ہے لیکن میرے خیال میں یہ

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

وقت ضائع کرنے کے برابر ہوگا۔"
دوسرے دن میں ونڈسر کے ویسٹ ٹرانسفر اسٹیشن گئی جسے ٹاؤن ڈمپ یا کچرا گھر بھی کہا جاتا ہے۔ وہاں ایک پختہ سڑک گارڈ کی چوکی تک جا رہی تھی جو اسی گاڑی کو اندر جانے کی اجازت دیتا جس پر اسٹیکر لگا ہو۔ اس کے علاوہ یہ بھی اطمینان کرتا ہے کہ کوئی ممنوعہ شے پھینکنے کے لیے نہیں لے جائی جا رہی۔ وہاں موجود خدمت گار ایک خوش شکل شخص تھا جس نے نیلے رنگ کی ٹی شرٹ اور خاکی پتلون پہن رکھی تھی۔ اس نے گیٹ کی کھڑکی کھول کر پوچھا۔
"مس، تمہارے پاس اسٹیکر ہے؟"
"نہیں۔" میں نے خوشگوار لہجے میں کہا۔
"تمہارا پتا؟"
"میں پرمورٹ میں رہتی ہوں۔"
"یہاں پرمورٹ کا کچرا نہیں پھینکا جاتا۔"
"میں جانتی ہوں۔" میں نے کہا۔ "لیکن ونڈسر منتقل ہونے کے بارے میں سوچ رہی ہوں لیکن اس سے پہلے تمہارا ڈمپ دیکھنا چاہتی ہوں۔"
"ٹھیک ہے۔" اس نے کہا۔ "تم اندر جا سکتی ہو لیکن ڈمپ کے سامنے گاڑی مت کھڑی کرنا۔"
وہ سڑک آگے جا کر بائیں جانب مڑ گئی۔ یہاں ویسی ہی عمارتیں تھیں جو میں نے ڈی وی ڈی میں دیکھی تھیں۔ میں نے گاڑی ایک کونے میں کھڑی کی اور عمارت کے سامنے چلی گئی۔ وہاں چار کھلے ہوئے حصے اور سات پارکنگ لین تھیں۔ کار اور ٹرک وہاں آ کر رکتے اور لوگ پلاسٹک کے تھیلوں میں کچرا وہاں ڈال دیتے۔
ان ساتوں لین میں گاڑیوں کی آمد و رفت مسلسل جاری تھی۔ میں ان چاروں کھلے ہوئے حصوں میں گئی۔ ایک حصہ درخت کی شاخوں، کاٹ کباڑ اور ایسی ہی دوسری چیزوں کے لیے مخصوص تھا جبکہ دوسرے تین حصوں میں گھروں کا عام کچرا پھینکا جا رہا تھا۔ وہاں سفید اور سبز رنگ کے تھیلوں کا ڈھیر لگ گیا تھا۔ پھر ایک بلڈوزر آیا اور اس نے ان تھیلوں کو اٹھا کر ایک کونے میں کر دیا۔ میں مڑی اور میں نے اپنے سامنے سڑک پر وہ جگہ دیکھی جو مجھے جانی پہچانی لگی۔ بالکل یہی وہ جگہ تھی جہاں جان ڈفلپ کو گولی لگی تھی۔
پارکنگ کی دوسری جانب میں ایک ڈھلوان سطح پر گئی اور بلندی پر جا کر رک گئی۔ میرے دائیں جانب درختوں کی ایک قطار تھی اور مجھے یقین تھا کہ اس طالب علم نے وہیں اپنے کیمرے نصب کیے ہوں گے۔ میرے عقب میں ڈمپ تھا اور بائیں جانب لکڑیاں رکھی ہوئی تھیں۔
ونڈسر راڈ اور گن کلب سے گولیاں چلنے کی آواز آئی۔ میں نے مڑ کر ڈمپ کی عمارتوں کو دیکھا اور میری نظریں اس جگہ رک گئیں جہاں ڈفلپ کھڑا ہوا تھا۔ کیا یہ ممکن ہے کہ ایک گولی ہدف سے ٹکرا کر خم کھاتی ہوئی نیچے کی طرف آئی اور سیدھی اس کے دل پر لگ گئی۔ کندھے، ٹانگ یا پیٹ پر نہیں بلکہ عین دل پر؟
گولیاں چلنے کی آواز سن کر مجھے گھبراہٹ ہونے لگی۔ میں اپنی کار میں بیٹھی اور گھر واپس آ گئی۔
اس رات میں دیر تک جاگ کر وہ ڈی وی ڈی بار بار دیکھتی رہی جو آئرین نے مجھے دی تھی، پھر میں نے اسے ایک ہفتے پہلے یعنی سولہ جون کی تاریخ میں دیکھنے کا فیصلہ کیا۔ اس روز بھی جان ڈفلپ تین آدمیوں کے ساتھ کھڑا ہوا تھا۔ وہ ان سے باتیں کرنے کے ساتھ ساتھ ہاتھ بھی ہلا رہا تھا۔ جلد ہی میں نے ان کے نام بھی رکھ دیے۔ سرمئی داڑھی والا، سیاہ داڑھی والا اور گنجا۔ میں نے ڈی وی ڈی کو تھوڑا سا آگے پیچھے کیا تو مجھے ان کی گاڑیوں کے نام اور نمبر پلیٹ کا بھی پتا چل گیا پھر میں 9 جون پر چلی گئی۔ اس روز بھی وہ تینوں ویڈیو میں موجود تھے۔ آخری دستیاب ویڈیو دو جون کی تھی۔ اس میں وہ تینوں جان...... کے ساتھ گرما گرم بحث کرتے نظر آ رہے تھے۔
پرمورٹ کا پولیس اسٹیشن ونڈسر کے مقابلے میں ایک قدم آگے تھا۔ یعنی وہاں وائی فائی کی سہولت بھی تھی۔ نیا پولیس چیف پیکارڈ تقریباً میری ہی عمر کا تھا۔ میں اس کے چھوٹے سے دفتر میں ملی اور اسے بتایا کہ میں کیا تلاش کر رہی ہوں۔
"اوہ کیرن، تم جانتی ہو کہ نمبر پلیٹ کا پتا لگانے کے لیے کتنے سخت قوانین ہیں۔"
"میں نے اس بارے میں سنا ہے لیکن میں تم سے پیشہ ورانہ مدد کی توقع کر رہی تھی۔"
اس نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے کہا۔ "لیکن تمہارا تعلق کسی قانون نافذ کرنے والے ادارے سے نہیں ہے۔"
"میں بھی وہی کام کرتی ہوں۔ کیا اس کی کوئی اہمیت نہیں ہے؟"
"مفت میں کام نکالنا چاہتی ہو۔"
"ٹھیک ہے۔ میری طرف سے ڈنر۔"
اس نے قہقہہ لگا کر ہاتھ بڑھایا۔ میں نے اسے تین

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

لائسنس پلیٹ نمبر دیے اور چند منٹوں بعد اس نے مجھے مطلوبہ نام اور پتے بتادیے۔

پہلا نام برٹ ہوونگ کا تھا جسے میں کالی داڑھی والا کہہ رہی تھی۔ اس نے مجھ سے اپنے گھر کے پورچ میں بات کی۔ اس نے سیاہ ٹی شرٹ اور جینز پہن رکھی تھی اور ننگے پیر تھا۔ میں نے اپنا تعارف کروایا اور آمد کا مقصد بیان کیا۔

''وہ احمق گزشتہ سال گولی کا نشانہ بنا اور تم اب اس کی تحقیقات کررہی ہو؟'' اس نے پوچھا۔

''دراصل ایک نیا ثبوت ملا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''وہاں ایک کالج کے طالب علم نے کیمرے نصب کررکھے تھے تاکہ جانوروں کی نقل وحرکت ریکارڈ کرسکے۔''

''پھر میں کیا کروں؟''

میں نے کوئی جواب دینے کے بجائے اپنے بیگ سے پورٹیبل ڈی وی ڈی پلیئر نکالا اور اسے ایک منتخب ویڈیو دکھاتے ہوئے کہا۔ ''دیکھو، اس میں تم ٹومی میگوئر اور رالف ڈونلڈ کے ساتھ موجود ہو۔ ایسا لگتا ہے کہ گولی لگنے سے ایک ہفتے پہلے تمہاری اس کے ساتھ کوئی بحث ہوئی تھی۔''

''کوئی بحث نہیں ہوئی۔'' اس نے کہا۔

''تم جانتے ہو۔'' میں نے محتاط انداز میں کہا۔ ''اس طرح کی ریکارڈنگ سے بہت کچھ معلوم کیا جاسکتا ہے۔ میں ایک ایسی عورت کو جانتی ہوں جو ہچکاک میڈیکل سینٹر کے شعبہ آڈیولوجی میں کام کرتی ہے اور ہونٹوں کی حرکت پڑھ لیتی ہے۔ شاید وہ مجھے بتاسکے کہ تم تینوں جان سے کیا کہہ رہے تھے۔''

وہ دیر تک ڈی وی ڈی کو دیکھتا رہا پھر بولا۔ ''ہم صرف باتیں کررہے تھے۔''

''کس بارے میں؟''

''کیا تم کبھی جان سے ملی ہو؟'' اس نے پوچھا۔

''نہیں۔'' میں نے جواب دیا۔

''اس بے وقوف کو بولنے کا مرض تھا۔ اگر تم اس سے پوچھو کہ کیا وقت ہوا ہے تو وہ تمہیں بتانے میں ایک گھنٹا لگادے گا کہ ایک گھڑی کیسے بنتی ہے۔ دنیا کے مختلف ملکوں کے اوقات میں کتنا فرق ہے اور ایک گھڑی کی مدد سے برطانیہ کی نیوی کس طرح سمندر میں حکمرانی کرتی ہے، وغیرہ وغیرہ۔''

''یہ تو واقعی دلچسپ بات ہے۔'' میں نے کہا۔ ''اس کے علاوہ اس کے بارے میں کوئی اور بات؟''

''یہ بتانے سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ وہ مرچکا ہے۔''

''لیکن اس کی بہن نہیں سمجھتی کہ اس کی موت حادثاتی تھی۔ تم اس وقت وہاں موجود تھے جب اسے گولی لگی۔ تمہارا کیا خیال ہے؟''

وہ اپنی داڑھی کھجاتے ہوئے بولا۔ ''میرا خیال ہے کہ اب تمہیں جانا چاہیے۔''

دوسرا نمبر ٹومی میگوئر کا تھا۔ وہ ٹھیکے دار تھا اور اس کے دروازے پر ایک سرخ رنگ کا پک اَپ ٹرک نظر آیا۔ جب میں اس کے گھر پہنچی تو وہ بیلچے کے ذریعے ٹرک میں سے لکڑی کے ٹکڑے اور تختے نکال کر پلاسٹک کے بنے ہوئے کوڑے دانوں میں ڈال رہا تھا۔ اس نے کام والے جوتے، جینز اور سفید ٹی شرٹ پہن رکھی تھی۔ میں نے اپنا تعارف کرواتے ہوئے آمد کا مقصد بتایا اور وہ ڈی وی ڈی بھی دکھادی۔ اس نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''میرے پاس کہنے کے لیے کچھ نہیں ہے۔''

''لیکن تم وہاں موجود تھے جب اسے گولی ماری گئی۔'' میں نے کہا۔ ''کیا تم سمجھتے ہو کہ وہ حادثاتی موت تھی؟''

''میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔''

''اس ڈی وی ڈی کو دیکھنے سے پتا چلتا ہے کہ تم تینوں کو کسی معاملے پر جان سے اختلاف تھا...... وہ کیا بات تھی؟ تم تینوں کیوں اس کے ساتھ ہر ہفتے گرمی دکھاتے رہے؟''

اس بار اس نے کوئی جواب نہیں دیا لیکن میں دیکھ سکتی تھی کہ اس نے بیلچے کو مضبوطی سے پکڑ لیا ہے۔ مجھے یوں محسوس ہوا کہ وہ میرے سر پر بیلچہ مارنے کے بارے میں سوچ رہا ہے۔ کاش میرا ریوالور دفتر کے بجائے میری کمر سے بندھا ہوتا۔

اس کے باوجود میں نے اسے دباؤ میں لانے کے لیے کہا۔ ''میری ایک دوست ہچکاک میڈیکل سینٹر کے شعبۂ آڈیولوجی میں کام کرتی ہے اور اسے ہونٹوں کو پڑھنا آتا ہے۔ میں اس سے کہہ سکتی ہوں کہ وہ ڈی وی ڈی دیکھ کر بتائے کہ تم تینوں کس بات پر اس سے لڑرہے تھے۔''

اس نے بیلچہ چلاتے ہوئے کہا۔ ''باتیں، باتیں، باتیں۔ اسے بولنے کا مرض تھا جس طرح لوگ ٹی وی شو میں آکر بے تکان بولتے ہیں۔''

اس روز میری تیسری ملاقات اس گنجے شخص رالف ڈونلڈ سے ہوئی۔ وہ قصبے کے وسط میں واقع ہارس فیدر نامی شراب خانے کا مالک تھا۔ وہ لمبے قد اور چوڑے شانوں والا

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

گنجا شخص تھا اور اس کے سر کو دیکھ کر لگتا تھا جیسے اس پر استرا پھیر دیا گیا ہو۔ اس نے نیلی جینز اور سیاہ رنگ کی پولو شرٹ پہن رکھی تھی جس پر شراب خانے کا مونوگرام بنا ہوا تھا۔ دوپہر کے رش کی وجہ سے وہ خاصا مصروف تھا۔ میں اس کے پیچھے پیچھے ریستوران کے عقب میں گئی جہاں وہ ایک ٹرک سے وائن اور بیئر کی بوتلیں اتار کر رکھ رہا تھا۔

''تم جان ڈفلپ کی موت کی تحقیقات کر رہی ہو۔ میں نے سنا ہے کہ وہ ایک حادثے میں مارا گیا اور شوٹنگ رینج سے آنے والی ایک گولی اسے اتفاقیہ لگ گئی۔''

''یہ پرانی کہانی ہے۔'' میں نے کہا۔

''کیا تمہارے پاس کوئی نئی خبر ہے؟''

''میں سوچ رہی تھی کہ شاید تم اور تمہارے دوست برٹ ہوونگ اور ٹومی میگوئر اس شوٹنگ کے تناظر کے بارے میں کچھ کہہ سکیں۔''

وہ اپنا کام روک کر کھڑا ہو گیا اور ہانپتے ہوئے بولا۔ ''تمہیں یہ خیال کیوں آیا؟''

میں نے اسے ڈی وی ڈی کے بارے میں بتایا کہ اس میں صرف وقوعہ والے دن ہی کی نہیں بلکہ اس سے پہلے تین اتواروں کی ریکارڈنگ بھی موجود ہے۔

اس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''میں اسے زیادہ نہیں جانتا تھا۔''

''لیکن اس کی بہن کا کہنا ہے کہ وہ بہت مقبول تھا اور رضا کارانہ کاموں میں پیش پیش رہتا تھا۔ اس کے علاوہ بوائے اسکاؤٹس اور لائنز کلب کی سرگرمیوں میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیتا تھا۔''

''تم کبھی جان سے ملی ہو؟''

''نہیں۔''

''اسے فضول بکواس کرنے کا شوق تھا۔ باتیں، باتیں اور صرف باتیں۔ اسے اپنی آواز سے محبت تھی۔ وہ نہیں سمجھتا تھا کہ ہم جیسے لوگوں کو اپنے کام بھی کرنا ہوتے ہیں۔ کیا ہماری گفتگو ختم ہو گئی؟''

''صرف ایک سوال اور۔'' میں نے جلدی سے کہا۔ ''جس روز جان کو گولی لگی، تم وہاں نہیں تھے بلکہ صرف برٹ اور ٹومی ہی ویڈیو میں نظر آ رہے ہیں۔ کیا میں پوچھ سکتی ہوں کہ تم اس وقت کہاں تھے؟''

''یہاں، اسی ریستوران میں کام کر رہا تھا۔''

''کیا واقعی؟ میں نے اس سے پہلے تمہاری ہوسٹس کیرول کو فون کر کے معلوم کیا تھا۔ اس نے بتایا کہ اس روز تم طبیعت خراب ہونے کی وجہ سے گھر پر آرام کر رہے تھے۔ کون سی بات صحیح ہے؟''

اس نے اپنا ہاتھ روکتے ہوئے کہا۔ ''اب تم جاؤ، مجھے بہت کام کرنا ہے۔''

''میں بھی کام ہی کر رہی ہوں اور میں یہ بتا دوں کہ میری ایک دوست ایسی بھی ہے جو ہونٹوں کی حرکت پڑھ لیتی ہے۔''

وہ اپنی جگہ ساکت ہوتے ہوئے بولا۔ ''یہ کیا کہہ رہی ہو؟''

میں تھوڑا پیچھے ہٹتے ہوئے بولی۔ ''آج میں نے اس دوست کو شام سات بجے ڈنر پر بلایا ہے۔ وہ ڈی وی ڈی دیکھ کر بتائے گی کہ تم تینوں جان پر کیوں ناراض ہو رہے تھے۔ وہ اپنے کام میں ماہر ہے اور ہچکاک میڈیکل سینٹر کے شعبہ آڈیولوجی میں کام کرتی ہے۔ ایک بار ہمیں تمہاری ناراضگی کی وجہ معلوم ہو گئی تو میرے لیے تحقیقات کو آگے بڑھانا آسان ہو جائے گا۔''

میں نے عقبی دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے آخری پتا پھینکا۔ ''پھر میں یہ جاننے کی کوشش کروں گی کہ جس روز جان کو گولی لگی، تم وہاں کیوں نہیں تھے اور تمہارے دونوں دوست سامنے کے بجائے اس کے دائیں بائیں کیوں کھڑے ہوئے تھے جیسے انہیں اس کو گولی لگنے کی توقع ہو۔''

پھر مجھے ایک اور کام یاد آ گیا جو میں بھول چکی تھی۔ میں ونڈسر ٹاؤن ہال گئی تو خوش قسمتی سے ٹاؤن کلرک ریٹا گڈون موجود تھی اور اس سے بڑھ کر یہ کہ وہ ایک مہربان عورت ثابت ہوئی۔ میں نے اسے مختصراً جان ڈفلپ کے بارے میں بتایا اور وضاحت کی کہ میں کیا معلوم کرنے آئی ہوں۔

اس نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ ''کیوں نہیں۔ ان معلومات تک رسائی ہر شہری کا حق ہے، تم یہیں ٹھہرو، میں ابھی آتی ہوں۔''

میں نے فائل کیبنٹ کھلنے اور بند ہونے کی آواز سنی پھر وہ واپس آئی تو اس کے ہاتھ میں دو فٹ موٹا فائلوں کا بنڈل تھا۔ ''میری، بچے کی طبیعت خراب ہونے کی وجہ سے گھر پر ہے۔'' ریٹا نے کہا۔ ''تم اس کی میز استعمال کر سکتی ہو۔''

میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور ان فائلوں میں گزشتہ برس ہونے والی مختلف ٹاؤن بورڈز کی میٹنگوں کا ریکارڈ

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

دیکھنے لگی۔ اس کام سے فارغ ہونے کے بعد میں نے ریٹا کو فائلیں واپس کر دیں اور اس سے ایچ ایم ڈی کارپوریشن کے بارے میں ایک سوال کیا اور ریٹا نے مجھے فوراً ہی جواب دے دیا جس کی مجھے تلاش تھی۔

اس رات میں اپنے کچن میں روسٹ بیف تیار کر رہی تھی۔ اس کے ساتھ ہی میں نے وائن کی تین بوتلیں بھی نکال کر میز پر رکھ دیں پھر میں یہ دیکھنے کے لیے لیونگ روم میں گئی کہ کہیں میرا کتا روسکو کچھ گڑبڑ تو نہیں کر رہا۔ وہاں رالف ڈونلڈ ہاتھ میں ہینڈگن لیے موجود تھا اور نفرت زدہ انداز میں مجھے دیکھ رہا تھا جبکہ روسکو کاؤچ پر بیٹھا اسے گھور رہا تھا۔

رالف نے مجھے گندی گالیاں دینا شروع کر دیں پھر اس نے اپنے ریوالور کا رخ میری جانب کیا۔ میں روسکو کے برابر میں بیٹھ گئی۔ میری پالتو بلی نے مجھے دیکھا اور اپنے کام میں مصروف ہو گئی۔ رالف نے ایک قدم اور آگے بڑھایا اور مزید مغلظات بکتے ہوئے بولا۔ ”تم کچھ نہیں سمجھتیں۔ تمہیں کچھ معلوم نہیں۔ معاشی صورتِ حال ہر دن، ہر گھنٹے اور ہر منٹ کے بعد بگڑتی جا رہی ہے اور آگے بڑھنا مشکل ہو گیا ہے۔ اس لیے کسی کام میں تاخیر کی گنجائش نہیں۔“

میرے دونوں ہاتھ زانو پر رکھے ہوئے تھے اور ریوالور کچن میں تھا۔ ”جان ڈفلپ بھی یہ بات نہیں سمجھ سکا ہو گا۔“ میں نے کہا۔ ”اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ تم نے اس سے کیا کہا ہو گا۔ اسے وہاں گھومنا، دوستوں اور پڑوسیوں سے باتیں کرنا اچھا لگتا تھا لیکن تم تینوں نے اسے روکا اور کہا کہ وہ کچرا پھینک کر گھر چلا جائے اور اپنا کام کرے۔“

”تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ وہ کچرا گھر ہے، کوئی تفریح کی جگہ نہیں۔ وہاں لوگ کچرا پھینک کر چلے جاتے ہیں۔ اٹینڈنٹ کو اس کی کوئی پروا نہیں۔ اس وجہ سے وہاں ٹریفک بڑھ جاتا ہے۔ ہم تینوں کاروباری لوگ ہیں اور ہم کچرا پھینکنے کے لیے آدھا گھنٹا انتظار نہیں کر سکتے۔“

میں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”لیکن معاملہ اس سے بھی آگے کا ہے۔ جان ایک حقیقی رضاکار تھا اور بوائے اسکاؤٹس، لائنز کلب اور ٹاؤن کنزرویشن کمیشن کے لیے کام کر رہا تھا۔ وہ اس بات پر غور کر رہے تھے کہ وہ ایک بڑے ٹکڑے کو محفوظ زمین کا درجہ دیں یا نہیں۔ اسے ایچ ڈی ایم کارپوریشن لینا چاہ رہی تھی۔ یعنی ہوڈنگ، میگوئر اور ڈونلڈ۔ تم تینوں اس زمین کو ڈیولپ کر کے اپنے استعمال میں لاتے۔ سرمایہ تمہارا، ٹھیکا ٹامی کا اور برٹ اسے استعمال میں لاتا لیکن جان ڈفلپ کمیشن کا چیئرمین تھا۔ اس نے اس منصوبے کی مخالفت کی اور دوسرے ممبران کو قائل کر لیا کہ اس زمین کا تحفظ کیا جائے۔ اس کے مرنے کے بعد ہی تم تینوں کا مقصد پورا ہو سکتا تھا۔“

اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ اس نے دونوں ہاتھوں میں ریوالور پکڑ کر اس کا رخ میری جانب کیا اور بولا۔ ”مجھے وہ ڈی وی ڈی چاہیے۔ ہم یہاں بیٹھ کر تمہاری دوست کا انتظار کریں گے جسے تم نے ڈنر پر بلایا ہے۔“

میں نے کہا۔ ”وہ ڈی وی ڈی ٹیلی وژن پر رکھی ہے اور میری دوست یہاں نہیں ہے۔“ میں نے تھوڑا سا توقف کرنے کے بعد کہا۔ ”لیکن اس وقت تمہارے پیچھے ایک پولیس آفیسر کھڑا ہوا ہے اور اس کے پستول کا رخ تمہارے سر کی جانب ہے۔“

اس نے زوردار قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ ”تم سمجھتی ہو کہ میں تمہارے جھانسے میں آ جاؤں گا۔“

عقب سے چیف پیکارڈسن کی آواز آئی۔ ”اپنا ریوالور پھینک دو۔“

اس کے بعد سب کچھ ترتیب سے ہوا۔ گرفتاری، اعترافِ جرم، اس کے دوسرے دونوں ساتھی بھی گرفتار ہو گئے اور میں نے آئرین کو فون کر کے پوری صورتِ حال بتا دی۔ اس کے بعد میں اور پولیس چیف واپس اپنے مکان پر آ گئے۔ میں جانتی تھی کہ وہ اس قتل کا معما حل ہونے پر بہت خوش تھا۔ اس سے نہ صرف قصبے کے لوگوں میں اس کی ساکھ بڑھ گئی بلکہ اس کی ترقی کا راستہ بھی ہموار ہو گیا۔

اس وقت وہ سادہ کپڑوں میں ملبوس میرے کچن میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے کہا۔ ”کیرن پلیز، برا نہ منانا، ہچکاک میڈیکل سینٹر کے شعبہ آڈیولوجی میں تمہاری کوئی دوست نہیں ہے۔ تم نے ان تینوں کو بے وقوف بنانے کے لیے یہ کردار تخلیق کیا تھا اور میں بھی آج ڈیٹ پر نہیں آیا بلکہ تم چاہتی تھیں کہ اگر رالف آئے تو میں یہاں موجود رہوں۔ اس لیے یہ اتفاقیہ نہیں بلکہ طے شدہ ملاقات ہے۔“

میں نے اسٹو میں دیکھا۔ روسٹ بیف پوری طرح جل چکا تھا۔ میں نے اس کی طرف مڑتے ہوئے کہا۔ ”تم جانتے ہو، میں کیا سوچ رہی ہوں؟“

”کیا؟“

”میرا خیال ہے کہ ہمیں کہیں باہر کھانا کھانا چاہیے۔“

ویسے بھی میں نے اس کے ساتھ ڈنر پر جانے کا وعدہ کیا تھا اور اب اسے پورا کرنے کا وقت آ گیا تھا۔

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

آوارہ گرد

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

قسط:38

مندر، کلیسا، سینی گاگ، دھرم شالے اور اناتھ آشرم... سب ہی اپنے اپنے عقیدے کے مطابق بہت نیک نیتی سے بنائے جاتے ہیں لیکن جب بانیوں کے بعد نکیل بگڑے ذہن والوں کے ہاتھ آتی ہے تو سب کچھ بدل جاتا ہے... محترم پوپ پال نے کلیسا کے نام نہاد راہبوں کو جیسے گھنائونے الزامات میں نکالا ہے، ان کا ذکر بھی شرمناک ہے مگر یہ ہورہا ہے... استحصال کی صورت کوئی بھی ہو، قابل نفرت ہے... اسے بھی وقت اور حالات کے دھارے نے ایک فلاحی ادارے کی پناہ میں پہنچا دیا تھا... سکھ رہا مگر کچھ دن، پھر وہ ہونے لگا جو نہیں ہونا چاہیے تھا... وہ بھی مٹی کا پتلا نہیں تھا جو ان کا شکار ہو جاتا... وہ اپنی چالیں چلتے رہے، یہ اپنی گھات لگا کر ان کو نیچا دکھاتا رہا... یہ کھیل اسی وقت تک رہا جب اس کے بازو توانا نہ ہو گئے اور پھر اس نے سب کچھ ہی الٹ کر رکھ دیا... اپنی راہ میں آنے والوں کو خاک چٹا کر اس نے دکھا دیا کہ طاقت کے گھمنڈ میں راج کا خواب دیکھنے والوں سے برتر... بہت برتر قوت وہ ہے جو بے آسرا نظر آنے والوں کو نمرود کے دماغ کا مچھر بنا دیتی ہے... پل پل رنگ بدلتی، نئے رنگ کی سنسنی خیز اور رنگا رنگ داستان جس میں سطر سطر دلچسپی ہے...

تحیر، سنسنی اور ایکشن میں ابھرتا ڈوبتا دلچسپ سلسلہ...

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

گذشتہ اقساط کا خلاصہ

شہزاد احمد خان شہزی نے ہوش سنبھالا تو اسے اپنی ماں کی ایک ہلکی سی جھلک یاد تھی۔ باپ اس کی نظروں کے سامنے تھا مگر سوتیلی ماں کے ساتھ۔ اس کا باپ بیوی کے کہنے پر اسے اطفال گھر چھوڑ گیا جو یتیم خانے کی ایک جدید شکل تھی، جہاں بوڑھے بچے سب ہی رہتے تھے۔ ان میں ایک لڑکی عابدہ بھی تھی، شہزی کو اس سے انسیت ہوگئی تھی۔ بچے اور بوڑھوں کے سنگم میں چلنے والا یہ اطفال گھر ایک خداترس آدمی، حاجی محمد اسحاق کی زیرِ نگرانی چلتا تھا۔ پھر شہزی کی دوستی ایک بوڑھے سرمد بابا سے ہوگئی جن کی حقیقت جان کر شہزی کو بے حد حیرت ہوئی کیونکہ وہ بوڑھا لاوارث نہیں بلکہ ایک کروڑ پتی شخص تھا۔ اس کے اکلوتے بے حس بیٹے نے اپنی بیوی کے کہنے پر سب کچھ اپنے نام کروا کر اسے اطفال گھر میں پھینک دیا تھا۔ ایک دن اچانک سرمد بابا کو اس کی بہو عارفہ ادارے سے لے کر اپنے گھر چلی گئی۔ شہزی کو اپنے اس بوڑھے دوست کے یوں چلے جانے پر بے حد دکھ ہوا۔ اطفال گھر پر رفتہ رفتہ جرائم پیشہ عناصر کا عمل دخل بڑھنے لگتا ہے۔ شہزی کا ایک دوست اول خیر چوہدری ممتاز خان کے حریف گروپ جس کی سربراہ ایک جوان خاتون مختاری بیگم ہے، سے تعلق رکھتا تھا۔ وہاں وہ چھوٹے استاد کے نام سے جانا جاتا تھا۔ بڑا استاد کبیل دادا ہے جو زہرہ بانو کا خاص دستِ راست اور اس کا یکطرفہ چاہنے والا بھی تھا۔ زہرہ بانو درحقیقت ممتاز خان کی سوتیلی بہن ہے۔ دونوں بھائی بہنوں کے بیچ زمین کا تنازعہ عرصے سے چل رہا تھا۔ زہرہ بانو، شہزی کو دیکھ کر بے ہوش ہوجاتی ہے۔ کبیل دادا، شہزی سے خار کھانے لگتا ہے۔ اس کی وجہ زہرہ بانو کا شہزی کی طرف خاص التفات ہے۔ بیگم صاحبہ کے حریف، چوہدری ممتاز خان کو شہزی ہر محاذ پر شکست دیتا چلا آرہا تھا، زہرہ بانو، لئیق شاہ نامی ایک نوجوان سے محبت کرتی تھی جو درحقیقت شہزی کا ہم شکل ہی نہیں، اس کا بچھڑا ہوا بھائی تھا۔ شہزی کی جنگ پھیلتے پھیلتے ملک دشمن عناصر تک پہنچ جاتی ہے۔ ساتھ ہی شہزی کو اپنے ماں باپ کی بھی تلاش ہے۔ وزیر جان جو اس کا سوتیلا باپ ہے، اس کی جان کا دشمن بن جاتا ہے۔ وہ ایک جرائم پیشہ گینگ ''اسپیکٹرم'' کا زونل چیف تھا، جبکہ چوہدری ممتاز خان اس کا حلیف۔ رینجرز فورس کے میجر ریاض ان ملک دشمن عناصر کی کھوج میں تھے لیکن دشمنوں کو سیاسی اور عوامی حمایت حاصل تھی۔ لوہے کو لوہے سے کاٹنے کے لیے شہزی کو اعزازی طور پر بھرتی کرلیا جاتا ہے اور اس کی تربیت بھی پاور کے ایک خاص تربیتی کیمپ میں شروع ہوجاتی ہے، بعد میں اس میں شکیلہ اور اول خیر بھی شامل ہوجاتے ہیں، عارفہ علاج کے سلسلے میں امریکا جاتے ہوئے عابدہ کو اپنے ساتھ لے جاتی ہے۔ اسپیکٹرم کا سربراہ لولووش، شہزی کا دشمن بن چکا ہے، وہ جے بی سی (جیوش بزنس کمیونٹی) کی ملی بھگت سے عابدہ کو امریکی سی آئی اے کے چنگل میں پھنسا دیتا ہے۔ اس سازش میں بالواسطہ عارفہ بھی شریک ہوتی ہے۔ باسکل ہولارڈ، ایک یہودی نژاد کٹر مسلم دشمن اور جے بی سی کے خفیہ دنیائے مسلم کے خلاف سازشوں میں ان کا دستِ راست ہے۔ باسکل ہولارڈ کی فورس ٹائیگر فیگ شہزی کے پیچھے لگ جاتی ہے۔ باسکل ہولارڈ کی لاڈلی بیٹی انجیلا، لولووش کی بیوی ہے۔ اڈیسہ کمپنی کے شیئرز کے سلسلے میں عارفہ اور سرمد بابا کے درمیان چپقلش آخری نہج پر پہنچ جاتی ہے، جسے لولووش اپنی ملکیت سمجھتا ہے، ایک نو دولتیا سیٹھ نوید سانچے والا مذکورہ شیئرز کے سلسلے میں ایک طرف تو لولووش کا ٹاؤٹ ہے اور دوسری طرف وہ عارفہ سے شادی کا خواہش مند ہے۔ اس دوران شہزی اپنی کوششوں میں کامیاب ہوجاتا ہے اور وہ اپنے ماں باپ کو تلاش کرلیتا ہے۔ اس کا باپ تاج دین شاہ، درحقیقت وطنِ عزیز کا ایک گمنام بہادر غازی سپاہی تھا۔ وہ بھارت کی خفیہ ایجنسی کی قید میں تھا۔ بھارتی خفیہ ایجنسی بلیوتمسی کا ایک افسر کرنل سی جی بھجوانی، شہزی کا خاص ٹارگٹ ہے۔ شہزی کے ہاتھوں بیک وقت اسپیکٹرم اور بلیوتمسی کو ذلت آمیز شکست ہوتی ہے اور وہ دونوں آپس میں خفیہ گٹھ جوڑ کر لیتے ہیں۔ شہزی، کبیل دادا اور زہرہ بانو کی شادی کرنے کی بات چلانے کی کوشش کرتا ہے جس کے نتیجے میں کبیل دادا کا شہزی سے نہ صرف دل صاف ہوجاتا ہے بلکہ وہ بھی اول خیر کی طرح اس کی دوستی کا دم بھرنے لگتا ہے۔ باسکل ہولارڈ، امریکا میں عابدہ کا کیس دہشت گردی کی عدالت میں منتقل کرنے کی سازش میں کامیاب ہوجاتا ہے۔ امریکا میں مقیم ایک بین الاقوامی مبصر اور رپورٹر آنسہ خالدہ، عابدہ کے سلسلے میں شہزی کی مدد کرتی ہے۔ وہی شہزی کو مطلع کرتی ہے کہ باسکل ہولارڈ، سی آئی اے میں ٹائیگر فیگ کے دو ایجنٹ اس کو اغوا کرنے کے لیے خفیہ طور پر امریکا سے پاکستان روانہ کرنے والا ہے۔ شہزی ان کے شکنجے میں آجاتا ہے، ٹائیگر فیگ کے مذکورہ دونوں ایجنٹ اسے پاکستان سے نکالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جہاز راں کمپنی اڈیسہ کے شیئرز کے سلسلے میں لولووش برما (رنگون) میں مقیم تھا۔ اس کا دستِ راست سے جی کوہارا، شہزی کو ٹائیگر فیگ سے چھین لیتا ہے اور اپنی ایک لگژری بوٹ میں قیدی بنالیتا ہے۔ وہاں اس کی ملاقات ایک اور قیدی، بشام چھلکری سے ہوتی ہے جو کبھی اسپیکٹرم کا ایک ریسرچ آفیسر تھا جو بعد میں تنظیم سے کٹ کر اپنے بیوی بچوں کے ساتھ روپوشی کی زندگی گزار رہا تھا۔ بشام اسے پاکستان میں موئن جو دڑو سے برآمد ہونے والے طلسم نور ہیرے کے راز سے آگاہ کرتا ہے جو چوری ہوچکا ہے اور تین ممالک ہٹلر کی طرح اس ہیرے کی آڑ میں تیسری عالمی جنگ چھڑوانا چاہتے ہیں۔ جسے انہوں نے ورلڈ بگ بینگ کا نام دے رکھا ہے۔ لولوش اور سی جی بھجوانی کے ایک مشترکہ معاہدے کے تحت سے جی کوہارا کی بوٹ میں بلیوتمسی کے چندر ناتھ، شیام اور کوریلا آتے ہیں۔ وہ شہزی کو آنکھوں پٹی باندھ کر بلیوتمسی کے ہیڈ کوارٹر لے جاتے ہیں، وہاں پہلی بار بلیوتمسی کے چیف سی جی بھجوانی کو شہزی اپنی نظروں کے سامنے دیکھتا ہے، کیونکہ یہ وہی درندہ صفت شخص تھا جس نے اس کے باپ پر اس قدر تشدد کے پہاڑ توڑے تھے کہ وہ اپنی یادداشت کھو بیٹھا تھا۔ اب پاکستان میں شہزی کے باپ کی حیثیت ڈکلیئر ہوگئی تھی کہ وہ ایک محبِ وطن گمنام سپاہی تھا، تاج دین شاہ کو ایک تقریب میں [illegible] ں اعزاز سے نوازا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے شہزی کی اہمیت بھی کم نہ تھی، یوں بھجوانی اپنے منصوبے کے مطابق اس کی رہائی کے بدلے شہزی کے ساتھیوں، زہرہ بانو اور اول خیر وغیرہ سے پاکستان میں گرفتار شدہ اپنے جاسوس سندر داس کو آزاد کروانا چاہتا تھا۔ ایک موقع پر شہزی، اس بری قصاب، سے جی کوہارا اور اس کے ساتھی بھوک کو بے بس کر دیتا ہے، وہاں سوشیلا کے ایل ایڈوانی سے اپنی بہن، بہنوئی اور اس کے دو معصوم بچوں کے قتل کا انتقام لینے کے لیے شہزی کی ساتھی بن جاتی ہے۔ دونوں ایک خونی معرکے کے بعد ایک ساحل پر جا پہنچتے ہیں۔ وہاں ایک بوڑھا جونکی بابا ان کو اپنی جھونپڑی میں لے جاتا ہے۔ شہزی کی حالت بے حد خراب ہوچکی تھی۔ جونکی بابا اس کا علاج کرتا ہے وہیں پتا چلتا ہے کہ یہ بوڑھا جونکوں کے ذریعے لوگوں کا خون نچوڑتا تھا۔ شہزی کے دشمن مسلسل تعاقب کرتے ہوئے اس جھونپڑی تک آپہنچتے ہیں مگر شہزی اس بوڑھے سمیت جھونپڑی کو آگ لگا دیتا ہے اور سوشیلا کے ہمراہ وہاں سے فرار ہوجاتا ہے...... اور بھٹکتے بھٹکتے ایک بستی میں جا پہنچتا ہے۔ پولیس ان دونوں کے تعاقب میں تھی مگر شہزی اور سوشی کا سفر جاری رہتا ہے۔ حالات کی مستقل پرفریبیوں کے باوجود وہ اس چھوٹی سی بستی میں تھے کہ کوہارا اور چندر ناتھ حملہ کر دیتے ہیں۔

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

خونی معرکے کے بعد شہزی اور سوشیلا وہاں سے نکلنے میں کامیاب ہوجاتے ہیں۔شہزی کا پہلا ٹارگٹ صرف سی جی بھگوانی تھا۔اسے اس تک پہنچنا تھا۔ممبئی ان کی منزل تھی۔موہن اور ان دونوں کو ایک ریسٹورنٹ میں ملنا تھا مگر اس کی آمد سے پہلے ہی وہاں ایک ہنگامہ ان کا منتظر تھا۔کچھ لوفر ٹائپ لڑکے ایک رینا نامی لڑکی کو تنگ کر رہے تھے۔شہزی کافی دیر سے یہ برداشت کر رہا تھا۔بالآخر اس کا خون جوش میں آیا اور ان غنڈوں کی اچھی خاصی مرمت کر ڈالی۔رینا اس کی مشکور تھی۔اسی اثنا میں رینا کے باڈی گارڈ وہاں آجاتے ہیں اور یہ روح فرسا انکشاف ہوتا ہے کہ وہ ایل کے ایڈوانی کی پوتی ہے۔ان کے ساتھ آسمان سے گرے کھجور میں اٹکنے والا معاملہ ہوگیا تھا۔ابھی شہزی اس انکشاف کے زیر اثر تھا کہ رینا کا سیل فون بج اٹھتا ہے۔کال سنتے ہی رینا خوف زدہ نگاہوں سے شہزی کی طرف دیکھتی ہے اور قریب کھڑے بلراج سنگھ سے چلا کر کہتی ہے، یہ پاکستانی دہشت گرد ہے۔پھر جیسے پل کے پل کایا کلپ ہوجاتی ہے۔مگر شہزی چالاکی سے بلراج کو قابو کرلیتا ہے اور رینا کو اپنے پاکستانی ہونے اور اپنے مقاصد کے بارے میں بتا کر قائل کرنے میں کامیاب ہوجاتا ہے۔رینا، شہزی کی مدد کرتی ہے اور وہ اپنے ٹارگٹ بلیوتلسی تک پہنچ جاتا ہے۔پھر وہاں کی سیکیورٹی سے مقابلے کے بعد بلیوتلسی کے ہیڈ کوارٹر میں تباہی مچا دیتا ہے اور سی جی بھگوانی کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔شہزی نے ایک بوڑھے کا روپ دھارا ہوا تھا۔سی جی بھگوانی، شہزی کے گن کے نشانے پر تھا مگر اسے مار نہیں سکتا کہ شہزی کے ساتھی اول خیر، شکیلہ اور کبیل دادا اس کے قبضے میں تھے اور کالا پانی ''انڈیمان'' پہنچا دیے گئے تھے۔کالا پانی کا نام سن کر شہزی گنگ رہ جاتا ہے کیونکہ وہاں جانا ناممکنات میں تھا۔اپنے ساتھیوں کی رہائی کے لیے سی جی بھگوانی کو ٹارچر کرتا ہے۔بھگوانی مدد کے لیے تیار ہوجاتا ہے۔اس اثنا میں کوریلا فون پر بتاتی ہے کہ تینوں کو ''کلی منجارو'' پہنچا دیا گیا ہے۔یہ نام سن کر شہزی مزید پریشان ہوجاتا ہے۔اچانک بلراج سنگھ حملہ آور ہوتا ہے۔مقابلے میں سی جی بھگوانی مارا جاتا ہے۔پھر شہزی کی ملاقات نانا شکور سے ہوتی ہے، جو ممبئی کا ایک بڑا اسمگلر تھا۔نانا شکور شہزی کی مدد کے لیے تیار ہوجاتا ہے اور پھر شہزی، سوشیلا اور نانا شکور کے ہمراہ کلی منجارو کی طرف روانہ ہوجاتا ہے۔نانا شکور کی سربراہی میں رات کی تاریکی میں سفر جاری تھا۔جھاڑی کے گھنے دلدلی جنگل کی حدود شروع ہوچکی تھی کہ اچانک جنگلی وحشی زہریلے تیروں سے حملہ کردیتے ہیں۔نانا شکور کے گارڈ اور ڈرائیور مارے جاتے ہیں۔سوشیلا کے پیر میں تیر لگ جاتا ہے اور وہ زخمی ہوجاتی ہے۔شہزی اپنی گن سے جوابی فائرنگ کرکے کچھ جنگلی وحشیوں کو ختم کردیتا ہے۔پھر وہ وہاں سے نکل بھاگنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں مگر تاریکی کی وجہ سے نانا شکور دلدل میں پھنس کر ہلاک ہوجاتا ہے۔اس سناٹے میں اب شہزی اور زخمی سوشیلا کا سفر جاری تھا کہ کوریلا اور سے جی کوہارا سے ٹکراؤ ہوجاتا ہے۔غیبی مدد کے طور پر اڑدھے کوریلا اور سے جی کوہارا کے رستے میں آجاتے ہیں۔شہزی، سوشیلا کے ساتھ سے جی کوہارا کی جیپ میں بچ نکلنے میں کامیاب ہوجاتا ہے اور نیم صحرائی علاقے میں پہنچ جاتا ہے جہاں حدِ نگاہ کالی چٹانوں کے سوا کچھ نہ تھا۔سوشیلا کو جیپ میں چھوڑ کر خود ایک قریبی پہاڑی کا رخ کرتا ہے تاکہ راستوں کا تعین کرسکے۔واپسی کے لیے پلٹتا ہے تو ٹھٹک کر رک جاتا ہے۔کیونکہ ہر طرف رینگتے ہوئے کالے سیاہ رنگ کے موٹے اور بڑے ڈنک والے بچھو نظر آئے۔یہ سیاہ پہاڑی بچھو تھے جنہیں دیکھ کر شہزی کے اوسان خطا ہوجاتے ہیں۔بچھوؤں سے بچ نکلنے کے لیے وہ اندھا دھند دوڑ پڑتا ہے۔ڈھلوان پر دوڑتے ہوئے لڑکھڑا کر گر پڑتا ہے اور چٹانی پتھر سے ٹکرا کر بے ہوش ہوجاتا ہے۔ہوش میں آنے پر خود کو ایک لانچ میں پاتا ہے۔وہ لانچ منیجر کیم کھلا اور اس کی بیٹی سونگ کھلا کی تھی۔وہ نایاب کالے بچھوؤں کے شکاری تھے اور بچھوؤں کا کاروبار کرتے تھے۔اچانک سونگ کھلا کی نظر بے ہوش شہزی پر پڑتی ہے اور اسے ان بچھوؤں سے بچالیتی ہے مگر سوشیلا کے بارے میں وہ کچھ نہیں جانتی تھی۔شہزی خود کو ایک ہندو ظاہر کرکے فرضی کہانی سنا کر باپ بیٹی کو اعتماد میں لے لیتا ہے۔اس اثنا میں برمی مسلم گروپ کا مجاہد ٹولا ان پر حملہ کردیتا ہے۔شہزی کو جب یہ معلوم ہوتا ہے کہ کیم کھلا کو بے گناہ اور مظلوم برمی مسلمانوں کے قتل کا ٹاسک ملا ہوا ہے تو وہ کیم کھلا اور اس کے ساتھیوں کو جہنم واصل کردیتا ہے، پھر نارتھ انڈیمان کے ساحل کا رخ کرتا ہے۔جہاں کلی منجارین سے ٹاکرا ہوجاتا ہے۔شہزی گھات لگا کر ان کے ایک ساتھی دیال داس کو قابو کرلیتا ہے اور اس کا بھیس بھر کر ان میں شامل ہوجاتا ہے۔وہاں پتا چلتا ہے کہ اس سارے چکر میں جنرل کے ایل ایڈوانی کا ہاتھ ہے اور اس کا نائب بلراج سنگھ بھی موجود ہے۔وہیں لنگڑے کوڑھی کے بھیس میں کبیل دادا اس کے سامنے آجاتا ہے جسے دیکھ کر شہزی حیران رہ جاتا ہے۔ کبیل دادا کی زبانی معلوم ہوتا ہے کہ ممبئی ائرپورٹ پر بھارتی خفیہ ایجنسی کے ہاتھوں گرفتار ہونے کے بعد ان تینوں کو بلیوتلسی کے ہیڈ کوارٹر پہنچا دیا جاتا ہے۔وہاں سے سی جی بھگوانی انہیں انڈر ورلڈ ڈان بھولا ناتھ کے نجی قید خانے ڈیول کیج بھیج دیتا ہے،وہاں کا ایک قیدی بدمعاش داور شکیلہ پر نظر رکھتا ہے منصوبہ بندی کے تحت شکیلہ داور کو جھانسے میں لے لیتی ہے اور ہمارا کام آسان ہوجاتا ہے۔داور کو قابو کرکے قید خانے سے نکلنے میں کامیاب ہوجاتے کہ اچانک ہی دھماکے ہوتے ہیں اور ہر طرف گیس بھر جاتی ہے اور پھر ہمیں کچھ ہوش نہ رہا۔ہوش میں آئے تو خود کو زنجیروں میں بندھا پایا۔ایک بیگار کیمپ تھا جس کی کمانڈ بلراج سنگھ کے ہاتھ میں تھی۔جنرل ایڈوانی یہاں اپنے خاص مشن کی تکمیل اور ٹھکانے کو مضبوط بنانے کے لیے ڈارک کیسل نام کی عمارت تعمیر کروا رہا تھا جس کے پیچھے بیرونی طاقتیں تھیں۔ایڈوانی نے اپنے مکروہ مفادات کے لیے کلی منجارین سے مل کر جاوا قبیلے کے سردار کو مار کر پورے جاوا قبیلے کو اپنا غلام بنالیا تھا۔ایڈوانی اور بلراج شہزی کو دیال داس کے بہروپ میں پہچان نہ سکے اور وہ چالاکی سے اپنا اعتماد بحال کرنے میں کامیاب ہوجاتا ہے۔پھر شہزی منصوبے کے تحت بلراج سنگھ کو جہنم واصل کرتا ہے۔ایڈوانی ڈارک کیسل سے موٹر بوٹ کے ذریعے فرار کی کوشش کرتا ہے۔شہزی ساتھیوں سمیت ایڈوانی کا پیچھا کرتا ہے اور اسے سمندر برد کرکے ہیرا حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے پھر مقامی قبائلیوں کی سرزمین اور ڈارک کیسل ان کے حوالے کرکے ہندوستانی مچھیروں کے روپ میں پاکستان کے لیے روانہ ہوتے ہیں۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

زہرہ بانو نے مجھے بتایا تھا کہ...... وہ اجنبی خاتون جس نے اپنا نام سوزی بتایا تھا، وہ آنسہ خالدہ کی کوئی قریبی سہیلی تھی۔سوزی کے کہنے کے مطابق آنسہ خالدہ، عابدہ کے سلسلے میں بہت زیادہ فعال تھی اور اس کی رہائی وغیرہ کے سلسلے میں اس نے اپنی طرف سے ہر ممکن کوشش کی تھی۔حتیٰ کہ جب عابدہ پر مقدمہ چلا اور وہ تمہاری طرف سے مایوس ہونے کے باوجود بھی عابدہ کے سلسلے میں کچھ نہ کچھ کرتی رہی تھی۔یہاں تک کہ جب عابدہ کو سزا ہوگئی اور اُسے کیلی

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

فورنیا کے مضافات میں واقع امریکا کی دوسری خطرناک جیل میں قید بامشقت، سزا کے طور پر بھیج دیا گیا تو آنسہ خالدہ تب بھی چین سے نہیں بیٹھی تھی۔

اُس نے ایک بین الاقوامی مبصر اور سینئر رپورٹر کی حیثیت سے کورکوران جیل کا دورہ کیا اور عابدہ سے ملاقات کی کوشش بھی چاہی مگر اسے عابدہ سے ملنے نہیں دیا گیا، اس کے لیے خصوصی پاس کی ضرورت تھی جو کیلی فورنیا کے میئر سے حاصل کیا جاتا تھا۔

آنسہ خالدہ نے اسی وقت کیلی فورنیا کے میئر سے اس خصوصی پاس کے لیے ملاقات کی کوشش کی تو اس میں بھی کئی دن لگ گئے، وجہ میئر کی عدم دستیابی تھی، جب وہ ملا تو اس نے بڑی ردوکد کے بعد پاس اسے دے دیا اور آنسہ خالدہ اپنی کار میں ایک بار پھر کورکوران روانہ ہوگئی۔

وہاں کی لیڈی چیف وارڈن نے آنسہ خالدہ کو پھر بھی ملنے نہیں دیا جس کے باعث آنسہ خالدہ اور لیڈی چیف وارڈن کے بیچ خاصی تلخ کلامی ہوئی۔ بعد میں آنسہ خالدہ نے پتا نہیں اپنے کون سے خفیہ ذرائع سے پتا چلانے کی کوشش کی تو اسے شبہ ہوا کہ عابدہ جیل سے غائب کردی گئی تھی، جس پر آنسہ خالدہ نے لیڈی وارڈن کو اپنے اس خدشے کا اظہار کرتے ہوئے یہ دھمکی دی کہ اگر اُسے عابدہ سے نہیں ملنے دیا گیا تو وہ اپنے اخبار میں (جس میں وہ کام کرتی تھی) اور ٹی وی چینل کے ذریعے اپنے اس شبہے کا کھلے عام اظہار کردے گی کہ عابدہ کو کسی خاص مقصد کے تحت جیل سے غائب کردیا گیا تھا۔

اس کے دوسرے دن ہی آنسہ خالدہ خود غائب کردی گئی جس کا ابھی تک کوئی پتا نہیں چل سکا تھا۔ سوزی کو خدشہ تھا کہ آنسہ خالدہ کے غیاب یا اغوا میں سی آئی اے چیف باسکل ہولارڈ کا ہی ہاتھ ہے اور کچھ پتا نہیں کہ اس نے آنسہ خالدہ کے ساتھ کیا حشر کیا ہو......

تاہم عابدہ کے معاملے میں باسکل ہولارڈ کے لیے وہاں فقط ایک آنسہ خالدہ ہی تھی جو اُن کے لیے دردِ سر بنی ہوئی تھی۔ خدا جانے کہ اب وہ زندہ بھی تھی یا تاریک راہوں میں ماردی گئی تھی۔

زہرہ بانو سے تمام تفصیل جاننے کے بعد میں کئی لمحوں تک سکتے کی حالت میں رہا، میرے کانوں میں اب عابدہ کی خاموش فریادوں اور سسکیوں کی گونج میں ایک اور بے بس عورت کی فریاد بھی شامل ہوتی محسوس ہونے لگی تھی لیکن...... نہیں، ذرا ہی غور کرنے پر ان سسکیوں کے پیچھے ایک مکروہ اور زہریلی ہنسی کی بازگشت بھی سنائی دی۔ میرے چشمِ تصور میں بدنصیب عابدہ اور آنسہ خالدہ کی فریاد کناں صورتوں کے ساتھ عارفہ کا بھیانک چہرہ بھی کسی زہریلی ناگن کی طرح پھنکاریں مارتا ہوا رقصاں دکھائی دینے لگا۔

یہی وہ کم ظرف اور احسان فراموش عورت تھی جس کی وجہ سے عابدہ ایک بھیانک اور عالمی شطرنج بازوں کی گہری چال کا شکار ہوکر ان کے پھندے میں بری طرح پھنس چکی تھی۔ میں عابدہ، عارفہ اور پھر سیٹھ نوید کے بارے میں سوچنے لگا، ان کے تعلق میں گہری سازش پوشیدہ تھی۔

''کوئی لمبی کھیڈ ہوگئی ہے شہزادے! کیا سوچنے لگا؟''

معاً ہی مجھے کبیل دادا کی آواز سنائی دی اور میں نے ایک لمبی سانس خارج کی۔

''ہاں، کبیل دادا! بہت لمبی بازی کھیلی جارہی ہے۔ ایسی بازی جس کی بساط کے مہرے بہت دور تک پھیلا دیے گئے ہیں۔'' یہ کہتے ہوئے میں نے...... زہرہ بانو سے فون پر کہا۔

''سوزی کے بارے میں کوئی تفصیل؟''

''کوئی تفصیل نہیں، سوائے اس کے کہ وہ آنسہ خالدہ کی روم میٹ اور دوست ہے۔'' زہرہ بانو نے جواب دیا۔

''اس نے آنسہ کے نمبر سے رابطہ کیا تھا؟''

''نہیں، میرا خیال ہے یہ سوزی نام کی اس خاتون کا اپنا نمبر تھا۔''

''آپ نے محفوظ کرلیا یہ نمبر؟''

''ہاں! نمبر سیو ہوچکا ہے۔''

''اسی وقت مجھے بھیج دیں۔''

''لل...... لیکن شہزی!''

''میں جو کہہ رہا ہوں، وہی کریں زہرہ!'' میں اس کی بات کاٹ کے بولا۔

''میں بھیجتی ہوں مگر تم لوگ......''

''ہماری فکر چھوڑیں۔'' میں نے پھر اس کی بات کاٹی۔ ''میں بتا چکا ہوں، ہماری فکر کرنے کی اب ضرورت نہیں، ہم خیریت سے وطن لوٹ چکے ہیں اور ایک مناسب وقت پر بیگم ولا میں ہماری آمد ہوجائے گی۔''

''اوکے...... اوکے......'' زہرہ نے جلدی سے کہا اور پھر رابطہ منقطع کردیا۔ میں تھکا تھکا اور ٹوٹا ٹوٹا سا ایک کرسی پر گر گیا۔ میں نے اپنا سر صدمے کے باعث اتنا جھکا لیا تھا کہ میری ٹھوڑی سینے سے جا لگی تھی۔

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

''اوخیر..... کاکے! حوصلہ پکڑ..... کیا ہوا؟ بیگم صاحبہ نے کیا بتایا ہے عابدہ کے بارے میں؟'' اول خیر نے فکرمندی سے پوچھا۔ کبیل دادا اور شکیلہ بھی میری طرف تشویش آمیز نگاہیں جمائے ہوئے تھے۔ میں نے انہیں دھیرے دھیرے سب بتا دیا۔

''یا اللہ! عابدہ بہن کو اپنے حفظ و امان میں رکھنا..... اس کی عصمت و جاں کی حفاظت فرمانا۔'' شکیلہ نے فوراً عابدہ کے لیے دعائیہ کلمات ادا کیے اور بے اختیار ہم سب کے لبوں سے زیرلب آمین برآمد ہوا تھا۔

''لگتا ہے شہزی! عابدہ کا معاملہ واقعی گمبھیر سا ہو گیا ہے۔'' کبیل دادا نے کہا۔ ''میرا خیال ہے کہ عابدہ کی رہائی کے سلسلے میں انفرادی طور پر تم کچھ بھی نہیں کر سکتے، بات کڑوی ضرور ہے مگر شہزادے! حقیقت یہی ہے۔''

کبیل دادا کی بات پر میرے دل کو جیسے گھونسا لگا۔ کبیل دادا صاف اور کھری بات کہہ ڈالتا تھا۔ جھوٹی اُمید اور طفل تسلیاں دینا اس کا شیوہ نہیں تھا۔ دیکھا جاتا تو یہ کچھ غلط بھی نہ تھا۔ میں واقعی انفرادی سطح پر اب تک عابدہ کے لیے بھلا کر ہی کیا پایا ہوں؟ ایک عارفہ کو تو میں امریکا جا کر وہاں کی عدالت میں عابدہ کے حق میں گواہی دینے پر مجبور نہیں کر پایا تھا جس کے نتیجے میں عابدہ کو..... سزا ہو گئی۔ پہلے اور بعد میں بھی آنسہ خالدہ ہی کے آسرے پر تھا کہ وہ کچھ کر پائے، مگر صورتِ حال یہ تھی کہ خود اُس بے چاری کا بھی پتا نہ تھا کہ وہ کہاں غائب کر دی گئی تھی؟

میں اسی طرح مایوس اور خاموش سا خالی الذہنی کی حالت میں کرسی پر بکھرا بکھرا سا بیٹھا رہا۔

''یہ سارا کیا دھرا اسی عارفہ کا ہے۔'' اول خیر دانت پیس کر بولا۔

''میں تو کہتا ہوں کہ ملتان جاتے ہی سب سے پہلے اسی گردن ناپنی چاہیے۔''

''عارفہ کی حیثیت محض ایک فارورڈ بلاک کی سی ہے اور بس..... عابدہ کے حوالے سے شہزی کا خوف سر پہ ضرور سوار رہتا ہوگا، اسی لیے اس نے ہمارے دشمنوں کی پشت پناہی لی ہے اور کیا خبر گیو اینڈ ٹیک کی صورت میں وہ ان کی جاسوس کا بھی کردار ادا کر رہی ہو۔'' شکیلہ نے کچھ غور کرنے کے انداز میں کہا تو کبیل دادا نے اپنی پہلی والی بات کے تسلسل میں اپنا بیان نما مشورہ جاری رکھا۔

''اگر ہم انفرادی سطح پر کچھ کرنے سے قاصر ہیں تو پھر ہمیں اجتماعی سطح پر کچھ کرنا ہوگا، یعنی حکمراں طبقے اور سربرآوردہ سیاسی شخصیات کے علاوہ مقتدرہ سماجی شخصیات، پرنٹ والیکٹرانک میڈیا کے ذریعے عابدہ کی رہائی کو ملک کا ''ہاٹ ایشو'' بنا دیں.....''

کبیل دادا کی بات پر میرے ہونٹوں پر تلخ سی مسکراہٹ ابھری اور اسی انداز و لہجے میں بولا۔ ''تب بھی کچھ نہیں ہوگا۔ ہاں البتہ فصلی بٹیروں کو اپنی سیاسی دکانیں چمکانے موقع مل جائے گا۔ عابدہ کی رہائی کی آڑ میں شور وغل ہوگا، امریکا کے خلاف جھنڈے لہرائے جائیں گے۔ نعرے بازی ہوگی۔ غُلغلہ مچے گا اور پھر سب پانی کا بلبلہ بن جائے گا۔ یوں یہ ایشو زیادہ ہاٹ بن جائے گا، ہمارے لیے نہیں عابدہ کے دشمنوں کے لیے۔''

میرے لب و لہجے اور لفظ لفظ میں مایوسی اور تلخی بھر آئی تھی۔ اسی دوران زہرہ بانو نے مجھے میسیج کر کے سوزی کا نمبر بھیج دیا۔ میں نے فوراً نمبر سیو کیا اور ڈائل کر دیا۔

میں سوزی سے خود بھی بات کرنا چاہتا تھا، کچھ باتیں ہوتی ہیں جو رہ جاتی ہیں اور براہِ راست کچھ نئی باتوں کا پتا چلتا ہے۔ دو تین بار رابطے کی کوشش کرتا رہا مگر سوزی سے بات نہ ہو سکی۔ میں بری طرح جھنجلا گیا، ایسے میں جانے کیوں اول خیر ذرا سرک کر میرے قریب آگیا اور یہی وہ وقت تھا جب میں نے غصے اور جھلاہٹ میں سیل فون پھینکا تو اول خیر نے فوراً اسے کیچ کر لیا۔

''اوخیر..... کاکے! اس کی ابھی ہمیں سخت ضرورت ہے۔'' وہ شاید میرے ذہنی خلجان کو پہلے ہی بھانپ چکا تھا۔ اسے ادراک ہو گیا تھا کہ میں سیل فون کے ساتھ کیا حرکت کرنے والا تھا۔

میں کرسی سے اُٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگا۔ کبیل دادا، شکیلہ اور اول خیر خاموش تھے۔ عابدہ کا جب بھی ذکر چھڑتا، میں شدید ذہنی دباؤ اور جھنجلاہٹ کا شکار ہو جاتا، درمیان میں کسی کو بھی بولنے کی جرأت نہ ہوتی تھی، فقط تسلی کے چند بول ادا کر دیے جاتے تھے۔

''میں اس ناگن کو ہرگز زندہ نہیں چھوڑوں گا..... اس احسان فراموش حرافہ نے میری عابدہ کے ساتھ جو کیا ہے، اس کا خمیازہ اسے ضرور بھگتنا پڑے گا۔''

''شہزی! تم نے ٹھیک کہا ہے۔'' شکیلہ بولی۔ ''ہمیں شور شرابا کرنے کے بجائے اپنے طور پر ہی عابدہ کی رہائی کے لیے کچھ سوچنا ہوگا اور بیگم ولا پہنچتے ہی ہمارا کام، اس سلسلے میں سر جوڑ کر بیٹھ کے اس کا لائحہ عمل تیار کرنا ہوگا اور خود ہی عملی کارروائی کرنا ہوگی۔ بات بڑی ہے، مگر ناممکن تو

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

نہیں۔''

شکیلہ کی بات پر میں نے اس کی طرف دیکھا۔ وہ غلط نہیں کہہ رہی تھی۔ عابدہ کی رہائی کے سلسلے میں اب یہی کرنا چاہیے تھا اور کوئی راستہ نہ تھا۔ تاہم اس وقت ہمارا بہ خیریت ملتان اور بیگم ولا پہنچنا زیادہ ضروری تھا۔ یہاں بھی ہمارے دشمنوں کی کمی نہ تھی۔

دن بھر سوتے رہنے کے باعث ہماری رات کی نیند اُڑ چکی تھی۔ کبیل دادا کا خیال تھا کہ اب سونے کے بجائے، صبح چھ بجے والی ٹرین میں برتھیں بک کروا کے ملتان کا قصد کیا جائے اور وہیں لمبی تان کر سوتے ہوئے طویل سفر کاٹا جائے۔ کیونکہ رات اب نصف سے زیادہ گزر چکی تھی۔ اول خیر نے روم سروس کے ذریعے چائے اور کچھ کھانے پینے کے لیے منگوالیا۔

ہم آپس میں عابدہ اور امریکا مہم کے بارے میں ہی باتیں کرتے رہے۔

چائے ختم کی ہی تھی کہ میرے سیل کی بیل گنگنائی۔ یہ زہرہ بانو کی کال تھی۔ میں نے فوراً سیل فون کان سے لگا کر 'ہیلو' کہا۔

''شش...... شہزی! میرا خیال ہے تم ابھی ملتان مت آؤ......'' دوسری جانب سے زہرہ بانو کی کچھ تشویش زدہ سی آواز اُبھری جس نے خود مجھے تفکر میں مبتلا کر دیا، فوراً پوچھا۔

''کیوں کیا ہوا؟ خیریت؟ کوئی نئی بات ہوئی ہے؟''

''نہیں۔ لیکن پتا نہیں کیوں شہزی! میرا دل گھبرا سا رہا ہے۔ تمہاری اور ساتھیوں کی آمد کی جہاں مجھے خوشی ہے وہیں، خدشات اور طرح طرح کے وسوسے بھی دل و دماغ کو پریشان کر رہے ہیں۔''

''تم کیا شہزی کو کمزور سمجھنے لگی ہو یا دشمنوں کو طاقت ور......'' میں نے سنجیدگی سے کہا۔

''یہ بات تو نہیں......'' وہ کہتے کہتے رہ گئی۔

''دلل...... لیکن میرا خیال ہے یہاں کے کچھ حالات سنبھل جاتے اس کے بعد......''

''حالات کو کیا ہوا ہے؟ میرے لیے سب پہلے جیسا ہی ہے۔''

''سب کچھ اب پہلے جیسا نہیں رہا ہے شہزی!'' وہ فوراً بولی۔ ''موجودہ اور پیش آمدہ حالات کا تمہیں اندازہ نہیں، نہ ہی علم ہے۔ نوشابہ جیسی ٹین ایجر لڑکی کو آگے لانے والوں نے نہ صرف اس کے ہاتھ مضبوط کر دیے ہیں بلکہ وہ خود بھی ایک نئی طاقت سے اُبھرے ہیں۔ دشمنوں نے ایک دوسرے کی سپورٹ میں ایک چین سی بنا لی ہے اور ان کی اصل طاقت کا سبب بھی یہی ہے۔''

''کم از کم آپ کے منہ سے یہ باتیں سن کر مجھے حیرت ہو رہی ہے زہرہ!'' میں نے کہا۔

''یقین نہیں آتا کہ میں اُسی خاتون سے مخاطب ہوں، جو ایک نڈر اور دلیر عورت تھی اور وہ بھی جو بذاتِ خود ماضی میں نجانے کیسے کیسے پُرآلام مصائب سے گزری اور خود سے کئی گنا بڑھ کر طاقت ور دشمنوں کو ناکوں چنے چبوائے، مگر آج......''

''مجھے تمہاری فکر ہے شہزی!'' وہ تڑپ کر بولی۔ ''دشمن بزدل ہے اور بزدل دشمن کبھی بھی بہت بڑی فتح بھی حاصل کر لیتا ہے۔''

''تم میری فکر نہ کرو، میرا اللہ مالک ہے۔ میں اور باقی ساتھی صبح کی ٹرین سے روانہ ہو رہے ہیں اور میرا خیال ہے تمہارا ان حالات میں بار بار مجھ سے رابطہ کرنا کسی خطرے سے کم نہیں ہے۔''

وہ میرا اشارہ سمجھ گئی، بولی۔ ''یہ خدشہ اپنی جگہ سہی شہزی! لیکن......''

''انشاء اللہ کل ملیں گے۔ خدا حافظ'' میں نے اس کی بات کاٹ دی اور رابطہ منقطع کر دیا۔

کبیل دادا، اول خیر اور شکیلہ کی سوالیہ نظریں میرے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ میں نے انہیں زہرہ بانو کے خدشات کے بارے میں بتا دیا۔ جسے سن کر وہ تینوں بھی متفکر سے نظر آنے لگے مگر جواباً تینوں نے خاموش رہنا ہی بہتر جانا۔

صبح سویرے منہ اندھیرے ہم نے ہوٹل چھوڑ دیا اور اسٹیشن کا رخ کیا۔ ٹکٹ ہم لے چکے تھے، نیند سے ہمارا برا حال تھا۔ کبیل دادا کی آرام کرنے والی ترکیب کارگر ثابت ہوئی تھی، ٹرین کے روانہ ہوتے ہی ہر کوئی اپنی اپنی برتھ پر چڑھ کر سو گیا۔

لیٹتے ہی ہمیں نیند نے آلیا تھا۔ پتا نہیں کتنی دیر سوتے بیت گئی۔ شور پر میری آنکھ کھلی۔ ٹرین رکی ہوئی تھی۔ مسافروں کا شور تھا مگر بیشتر مسافر اُترے ہوئے تھے اور بوگی خالی خالی سی دکھتی تھی۔ گرمی بھی تھی۔ میں پسینے سے شرابور تھا۔ یہ شاید اندرونِ سندھ کا کوئی علاقہ تھا۔ سندھ کی گرمی تو یوں بھی بڑی مشہور تھی۔ میں نے برتھ پر لیٹے لیٹے تھوڑا گردن جھکا کر کھڑکی سے باہر دیکھنا چاہا، مقدور بھر ہی

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

باہر کا منظر نظر آسکا۔ میں یہی سمجھا تھا کہ کوئی اسٹیشن ہوگا مگر مجھے کھڑکی سے باہر خودرو جھاڑیوں والی بنجر زمین کے سوائے کچھ نظر نہ آیا، یا پھر کچھ لوگ نیچے اُترے چہل قدمی کر رہے تھے۔ پلیٹ فارم عنقا تھا۔ مجھے حیرت ہوئی کہ شالیمار جیسی ایکسپریس ٹرین یوں جنگل میں کیونکر روک دی گئی تھی۔

''بھائی! کون سا اسٹیشن ہے؟'' میں نے اسی طرح گردن لٹکا کر ایک قریب کی سیٹ پر سگریٹ پیتے عمر رسیدہ شخص سے پوچھ لیا۔ اس سے مخاطب ہونے کے دوران میں نے محسوس کیا تھا کہ وہ میرے نیچے والی برتھ پر بے سدھ لیٹی شکیلہ کو گھورنے میں محو تھا۔ مجھے جاگتا دیکھ کر وہ کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔ تاہم جواب میں میری طرف دیکھ کر بولا۔

''اسٹیشن......؟ یہ اسٹیشن کہاں ہے بھائی؟ بنجر میدان ہے۔'' اس نے جواب دیا اور کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔

''ارے...... پھر ٹرین کیوں رکی ہے؟ کیا انجن خراب ہوگیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''اُوپر ہی لیٹے رہو بھائی آرام سے...... انجن خراب نہیں ہوا ہے۔'' وہ شخص شاید چڑا بیٹھا تھا، شاید میں نے اس کی ''نظرداری'' میں رخنہ ڈال دیا تھا۔ اسی لہجے میں جواب دیا۔ لوگوں کی عادت تھی، انسان کس کس کی ہوس زدہ نگاہ کو روک سکتا تھا۔

''انجن خراب نہیں ہوا تو پھر ٹرین کیوں رکی ہوئی ہے؟ کوئی اسٹیشن بھی نہیں ہے؟''

میں نے قدرے پریشانی سے کہا مگر وہ بداخلاق سا آدمی میری بات سنی ان سنی کر کے کھڑکی سے باہر دیکھنے میں مصروف ہوگیا۔ مجھے غصہ تو بہت آیا مگر یہی سوچا کہ نیچے اُتر کر خود ہی پتا کرنا چاہیے۔ ایک نظر میں نے اپنے ساتھیوں پر ڈالی۔ وہ بے خبر سو رہے تھے۔ میں برتھ سے نیچے اُترا اور اپنے دل کی بھڑاس نکالے بنا نہ رہ سکا اور اس بداخلاق شخص سے بولا۔

''بھائی صاحب! اگر کوئی انسان کچھ پوچھ رہا ہو تو اسے بتانے میں زبان نہیں گھس جاتی۔''

آدمی بڑا ڈھیٹ واقع ہوا، بدستور بے پروا...انداز میں باہر ہی دیکھتا رہا۔ میں ٹرین سے نیچے اُتر آیا۔ غضب کی گرمی پڑ رہی تھی۔ حالانکہ ابھی صرف گیارہ ہی بج رہے تھے۔ دھوپ بھی خوب جم کر نکلی ہوئی تھی۔ اگرچہ ہوا بھی کھل کر چل رہی تھی مگر اس میں بادِسموم کی جھلسا دینے والی کاٹ بھی تھی۔

پتا چلا ہم نواب شاہ سے تھوڑا ہی آگے تھے اور آگے پھاٹک پر ایک مال گاڑی پھنس گئی تھی۔ اس کی کچھ بوگیاں پٹری سے اُتر گئی تھیں۔ لوگوں میں رل مل کر مجھے ایک اور پریشانی کا علم ہوا، کچھ لوگ جنہیں زیادہ جلدی تھی اور ان کی منزل بھی قریب تھی، وہ اپنا سامان اُٹھائے پگڈنڈی پر چلے جا رہے تھے۔

میں دوبارہ بوگی میں سوار ہوا تو دیکھا اول خیر جاگا ہوا تھا اور برتھ پر پاؤں لٹکائے اسی بداخلاق آدمی کو کھری کھری سنا رہا تھا، جو شاید اسے بھی میری طرح ''تپلی'' دینے کے بعد اب کھڑکی سے باہر تکنے جا رہا تھا۔ میں بے اختیار اپنا سر جھٹک کر رہ گیا۔

''او خیر...... کاکے! کیا ہوا ہے؟ یہ ٹرین کیوں رک گئی ہے۔ کوئی اسٹیشن بھی نہیں......'' مجھے دیکھتے ہی وہ بولا۔

''لمبا مسئلہ کھڑا ہوگیا ہے!'' میں نے جواب دیا اور پھر اسے بتا دیا کہ کیا مسئلہ درپیش آچکا تھا۔ اس نے اپنا سر تھام لیا۔ اسے گرمی بھی بہت لگ رہی تھی۔ وہ پسینے سے شرابور تھا۔ یہی حال قریب کی برتھ پر لمبی تانے سوئے ہوئے کبیل واداکا تھا اور شکیلہ کی حالت تو زیادہ پتلی اور ''نازک'' ہو رہی تھی۔ اول خیر نے اس کی حالت دیکھتے ہوئے اسے اٹھانے کو کہا۔

''سونے دے بے چاری کو یار! تھوڑی دیر پہلے میں اور تم بھی اسی طرح سو رہے تھے۔''

''ہماری بات اور ہے کاکے!'' وہ منہ بسور کر بولا۔ ''یہ کاکی کم بخت زیادہ ہے۔ ہر کوئی آتے جاتے اسے گھور کر گزر رہا ہے۔''

اس کے کہنے کی دیر تھی کہ شکیلہ انگڑائی لیتے ہوئے اٹھ گئی۔

''ہائے اللہ! کس قدر سخت گرمی پڑ رہی ہے۔ اُوپر سے کم بخت ٹرین بھی رکی ہوئی ہے۔'' کہتے ہوئے وہ برتھ سے نیچے اُتر آئی اور جب کھڑکی سے باہر دیکھا تو پریشان کن حیرت سے بولی۔

''ارے......! یہ ٹرین اس سخت گرمی اور دھوپ میں یہاں تپتے ہوئے بنجر ویرانے میں کیوں رک گئی ہے؟''

''انجن کا ٹائر برسٹ ہوگیا ہے۔'' اول خیر نے کہا تو شکیلہ بھی شاید نیند کے خمار میں تھی یا پھر گرمی نے اس کا زیادہ ہی برا حال کر دیا تھا۔ اسی لیے سوچے بنا روا روی میں کہہ گئی۔

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

''تو پھر بدلنے میں کیا مشکل ہے؟''

انجن کو جیک لگا رہے ہیں...... ذرا ہی دیر میں ٹائر بدل دیا جائے گا۔'' اول خیر نے کہا اور شکیلہ کی بدحواسی پر خود بھی قہقہہ مار کر ہنس پڑا۔ میں اور کبیل دادا پہلے ہی مشکل سے اپنی ہنسی روکے ہوئے تھے۔ اب جو اول خیر کو بھاڑ سا منہ کھول کے قہقہہ مارتے دیکھا تو کبیل دادا کا بھی پھنسا پھنسا قہقہہ پھوٹ نکلا۔ میں ہنسے جا رہا تھا۔ شکیلہ کو فوراً ہی احساس ہو گیا کہ اول خیر نے اسے کس طرح ''سنجیدگی'' سے بے وقوف اور خشک ماحول کو زعفران بنا دیا تھا۔

''تم دونوں بھی اس کے ساتھ ملی بھگت کرتے ہو اسی لیے تو یہ سر پہ چڑھا رہتا ہے ہر وقت میرے...... ہُنہ......'' شکیلہ جھلائی گئی تھی، اسی لیے بے چاری کبیل دادا اور مجھ پر بھی بگڑ گئی۔ ہم بر تھیں چھوڑ کر اب سیٹوں پر آ بیٹھے تھے۔ پیاس کی شدت سے حلق سوکھ رہا تھا۔ اس ویرانے میں پانی ملنے کے کوئی آثار نظر نہیں آ رہے تھے۔

میں نے انہیں بھی ساری صورتِ حال بتا دی۔ وہ بھی پریشان اور فکر مند ہو گئے۔ ان کے چہرے سوالیہ نشان بن گئے تھے کہ اب کیا کرنا چاہیے؟

''میرا خیال ہے پہلے ڈائننگ ہال جا کر کولڈ ڈرنک وغیرہ پی لیں اس کے بعد کچھ سوچتے ہیں۔'' میں نے کہا۔ طلسمِ نور ہیرا میرے پاس تھا۔ ہیرے کو ڈبے سے نکال کر میں نے اسے کپڑے کی دھجی کی پٹی بنا کر اس میں گانٹھ کی صورت مضبوطی سے باندھ دیا تھا۔ وہ اب میری پینٹ کی بیلٹ میں اڑسی ہوئی تھی۔ جسے بہ آسانی میں ہاتھ لگا کر اس کی موجودگی کا احساس کر لیتا تھا۔

ہم لوگ ٹرین کے اندر ہی بوگیاں بدلتے ہوئے ڈائننگ کار پہنچے تو وہاں پہلے ہی لوگوں کا رش تھا۔ یہاں افراتفری کا کچھ ایسا منظر دیکھنے کو ملا کہ کوئی چیز حاصل کرنا جوئے شیر لانے سے کم محسوس نہ ہوتا تھا۔ تاہم اول خیر نے ان کے بیچ گھس گھسا کر منرل واٹر کی ایک بوتل لینے میں کامیابی حاصل کر ہی لی۔ ہم نے باری باری پانی پیا اور خالی بوتل ساتھ لیے دوبارہ اپنی بوگی میں آ کر سر جوڑے بیٹھ گئے۔

تھوڑی دیر بعد پتا چلا کہ نواب شاہ سے ایک انجن آ رہا ہے، جو ٹرین کو واپس نواب شاہ تک کھینچ لائے گا اور روٹ کلیئر ہونے تک تمام مسافروں کو وہاں اسٹیشن پر انتظار کرنا پڑے گا۔ یہاں سے نواب شاہ (پیچھے کی جانب) زیادہ دور نہ تھا جبکہ مسافروں نے پکا تہیہ کر رکھا تھا کہ نواب شاہ کے پلیٹ فارم پر وہ ریلوے انتظامیہ کے خلاف بھرپور احتجاج کریں گے۔

''ہمارے لیے تو مشکل ہو جائے گی۔ ہمیں بھی وہی کرنا چاہیے جو دوسرے مسافر کر رہے ہیں۔'' اول خیر نے کہا۔

''لیکن ان کا اسٹاپ قریب ہے۔ ہمیں ملتان جانا ہے۔'' کبیل دادا بولا۔

''ٹریک کی حالت مجھے ایسی نہیں لگتی کہ وہ چند گھنٹوں میں ٹھیک ہو جائے۔'' میں نے بھی اس کی تائید میں کہا۔ بالآخر اسی متفقہ فیصلے پر صاد کیا گیا کہ ٹرین سے اُتر کر پیدل ہائی وے تک سفر کیا جائے اور وہاں سے پنجاب جانے والی کسی تیز رفتار کوچ میں سوار ہوا جائے۔

اس فیصلے کے بعد عمل کرنے میں ہم نے مطلق دیر نہیں لگائی اور اپنا مختصر سا سامان اُٹھائے روانہ ہو گئے۔

سورج عین ہمارے سروں پر مسلسل آگ برسا رہا تھا۔ شدید دھوپ کے مارے آنکھیں چندھیا رہی تھیں۔ ہم چاروں بل کھاتی ناپختہ سی پگڈنڈی پر پیدل چلتے رہے۔

''اُف......! سندھ کی گرمی کے بارے میں سن تو رکھا تھا آج اس کا مزہ بھی چکھ لیا۔''

شکیلہ نے تھکے تھکے انداز میں چلتے ہوئے کہا۔ میں سب سے آگے تھا، شکیلہ میرے پیچھے اور اول خیر تھا، سب سے آخر میں کبیل دادا چلا آ رہا تھا۔

''ابھی تو صرف چکھا ہے، نازکی بیگم! آگے چل کر کھانی بھی پڑے گی گرمی......'' اول خیر ایسے وقت میں بھی اس سے پنگا لینے سے باز نہیں آیا۔

''دیکھو، اول خیر! مجھ سے اس وقت منہ ماری مت کرنا، میں پہلے ہی دھوپ اور گرمی کی شدت سے ہلکان ہو رہی ہوں......'' شکیلہ نے اسے تنبیہ کی۔ وہ ہانپنے بھی لگی تھی۔

''صرف تمہاری نہیں ہماری بھی یہی حالت ہو رہی ہے اس وقت...... ہم بھی انسان ہی ہیں تمہاری طرح......''

''اچھا!'' شکیلہ مضحکہ خیز لہجے میں بولی۔ ''مجھے تو آج پتا چلا ہے کہ تم بھی انسان ہو......''

''شکیلہ! اب تم خود اس سے اُلجھ رہی ہو۔ یہ تو آ بیل مجھے مار...... والی بات ہو گئی۔'' کبیل دادا نے ہولے سے شکیلہ کو ٹوکا۔ اول خیر کو تو بہانہ چاہیے تھا، بولا۔

''او خیر...... وڈے استاد جی! یہ کڑی بیل نہیں مج ہے مج...... نیلی بار کی مج......''

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

ہم اسی طرح...... ان دونوں کی نوک جھوک میں پیدل چلتے ہوئے بالآخر ہائی وے پر آگئے۔ یہاں کچھ مسافر لاریاں اور لگژری ائرکنڈیشن کوچز آتی جاتی نظر آتی تھیں مگر سب فل تھیں، ہمیں کسی کوچ میں سیٹ نہ مل سکی۔ ایک دو میں سیٹیں خالی تھیں مگر ہم چار تھے اور سیٹیں ایک یا دو تھیں۔

ہم نے ایک قریبی روڈ سائڈ ہوٹل میں پانی پیا اور چائے بسکٹ تناول کیے۔ اس کے بعد پھر سڑک کنارے آگئے۔ یہاں خاصی دھوپ تھی۔ کوئی سایہ دار جگہ نہ تھی۔ چونکہ کوچز شہر سے ہی اور بہت دیر دیر سے آرہی تھیں، اسی لیے بھری ہوئی تھیں۔ ایک سندھ زمیندارہ نام کی لمبی مسافر لاری کو تو دیکھ کر ہی ہول آگیا تھا، وہ کھچا کھچ بھری ہوئی تھی اور اس کی چھت پر بھی چلچلاتی دھوپ میں مسافر سوار تھے۔ کھڑکیاں کھلی ہوئی تھیں اور بغیر ائرکنڈیشنڈ کی تھی۔ اس کا کرایہ بھی سستا تھا۔

ہم پر مایوسی اور جھنجلاہٹ سی طاری ہونے لگی۔ ابھی ہم ایک بار پھر واپس ہوٹل کی طرف تھوڑا استانے کے لیے جانے کا ارادہ رکھتے تھے کہ نواب شاہ سے آتی ہوئی ایک کوچ طوفانی ہارن دیتی ہوئی وہاں آن رکی۔ کنڈیکٹر نے دروازہ کھولا اور ہم سے منزل پوچھی۔

''آجاؤ...... آجاؤ...... یہ کوچ ملتان ہی جارہی ہے اور تم چاروں کے لیے جگہ بھی خالی ہے۔'' کنڈیکٹر نے گویا ہمیں مژدۂ جانفزا سنا دیا۔ ہم خدا کا شکر ادا کرتے ہوئے جلدی سے اس میں سوار ہوگئے۔ کوچ ائرکنڈیشن تھی اور سیٹ بھی بیٹھنے کو مل گئی۔ ہم دھوپ اور گرمی کے باعث اس قدر ہلکان ہورہے تھے کہ سیٹوں پر براجمان ہوتے ہی پشت گاہ سے سر ٹکا کر آنکھیں موند لیں۔ کافی دیر تک اپنی تھکن اُتارتے اور سکون لیتے رہے اس کے بعد حواس بحال ہوئے تو کوچ کا جائزہ لیا۔

کوچ میں چند سیٹیں اور بھی خالی تھیں۔ ذرا ہی دیر بعد کنڈیکٹر کرایہ لینے آگیا۔ اسی سے معلوم ہوا کہ یہ کوچ براستہ دادو، سیہون شریف اور لاڑکانہ سے ہوتی ہوئی کندھ کوٹ، کشمور اور صادق آباد، رحیم یار خان سے ملتان جارہی تھی۔

مقصد ہمارا ملتان پہنچنا تھا، چاہے جس راستے سے جائے۔

لاڑکانہ کے ذکر پر مجھے بے اختیار بشام چھلگری کی یاد آگئی اور میرا دل اس معصوم سے شخص کو یاد کرکے مغموم سا ہوگیا۔ اس کی وجہ سے میں اپنے وطنِ عزیز کی ایک اہم امانت حاصل کرنے میں کامیاب ہوسکا تھا۔ یہی وہ شخص تھا جو ''اسپیکٹرم'' جیسی بین الاقوامی این جی اوز میں ایک اعلیٰ عہدے پر فائز تھا مگر جیسے ہی اسے ''اسپیکٹرم'' کی اصلیت اور ''خطرناکی'' کا علم ہوا، وہ ان سے نہ صرف کنارہ کش ہوگیا بلکہ طلسمِ نور ہیرے کے سلسلے میں بھی محتاط ہوگیا۔ تاہم بعد میں وہ ہیرا اس کے ہاتھوں چالاکی سے وکرم اور سوشیلا نے ہتھیا لیا تھا۔ حالانکہ بقول بشام کے ہی اس ہیرے کو وہاں کے ایک مقامی اور بااثر زمیندار نے چوری کروالیا تھا لیکن یہ بشام ہی تھا جس نے اپنی سی کوششوں سے اس ہیرے کو نہ صرف دوبارہ اس زمیندار سے حاصل کیا بلکہ اس زمیندار کو قومی ورثہ چوری کرنے کے جرم میں سزا بھی دلوانے کی کوشش چاہی تھی مگر وہ آزاد ہوگیا تھا مگر بدقسمتی سے وہ ہیرا بشام سے وکرم لے اُڑا تھا۔ (سوشیلا اس کی ساتھی تھی، جو بعد میں میری ساتھی بن گئی تھی)

مجھے وہ دردناک منظر بھلائے نہیں بھولتا تھا جب بے رحم سے جی کو ہارا اور اس کے قصائی فطرت ساتھی بھوک نے بشام کو گولی مار کر اس کی لاش بے آف بنگال کے پانیوں میں پھینک دی تھی۔ میری سماعتوں میں بشام کی وہ درد انگیز فریادیں بھی آج تک گونجتی رہتی ہیں۔

بشام کو سفاکی سے ہلاک کرنے والے بھوک کو تو میں جہنم واصل کرچکا تھا مگر مجھے کوہارا کے زندہ بچ جانے کا آج تک قلق تھا۔ شاید ابھی کاتبِ تقدیر نے اس کی زندگی کے ایام کچھ طویل کررکھے تھے لیکن میں نے بھی عہد کررکھا تھا کہ وہ جب بھی سامنے آیا، میں اس سے بھی بشام کے بے گناہ خون کا بدلہ ضرور لوں گا۔ جزائر انڈیمان میں بِتائے ہوئے سنسنی خیز اور ایڈونچرز روز و شب میں مجھے کوہارا سے نمٹنے کا خاطر خواہ موقع نہ مل سکا تھا۔ اس کی وجہ یہی تھی کہ میں بیک وقت اور اس سے بھی زیادہ کئی اہم محاذوں پر برسرِ پیکار تھا۔

بشام کے بارے میں یہ سب سوچتے ہوئے مجھے اس کی بیوی اور دو بچوں کا خیال آیا کہ پتانہیں ان بے چارے معصوم اور بدنصیبوں کو اپنے باپ اور شوہر کی ہلاکت کا علم بھی تھا کہ نہیں؟ بشام کے اغوا کے بعد اس کا یہ بدنصیب کنبہ کہاں چین سے بیٹھا ہوگا؟ انہیں تو کچھ خبر بھی نہ ہوگی کہ بشام اب اس دنیا میں نہیں رہا تھا۔ بشام اپنے کنبے کا واحد کفیل تھا۔ اس نے وطنِ عزیز کی امانت بچانے کے لیے اپنی جان کا نذرانہ دیا تھا اور ایک گمنام سپاہی کی حیثیت اختیار کرگیا تھا۔

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

بشام مرحوم کے بارے میں اس طرح سوچتے سوچتے اچانک ہی میرے ذہن میں ایک اور خیال بھی کلک ہوا تھا۔ میرا خیال تھا کہ بشام خراجِ تحسین کا حق تو رکھتا تھا تو کیوں نا ایسا کروں کہ میرے پاس موجود طلسم نور ہیرے کو جب میں ملکی حکام کے حوالے کرنے لگوں تو اس کا کریڈٹ...... بشام چھلگری کے نام کر دوں...... اس طرح ہی شاید بشام کی بیوہ اور بچوں کی کچھ مدد کا بھی آسرا ہو جاتا...... یوں بھی وہ ہی اب اس کے اعزاز کے حق دار تھے۔ میرا خیال تھا کہ میں نے یہ کوئی غلط فیصلہ نہیں کیا تھا۔ تائید ایزدی بھی یہی نظر آتی تھی کہ میں نے اس وقت لاڑکانہ کے روٹ کا بھی سفر اختیار کر رکھا تھا۔ کچھ سوچ بچار کے بعد بالآخر میں نے یہ کام انجام دے ڈالنے کا مصمم فیصلہ ہی نہیں پختہ ارادہ بھی کر لیا۔

ابھی میں نے کبیل دادا وغیرہ کو اپنے اس اچانک فیصلے سے آگاہ نہیں کیا تھا۔ مصلحتاً مناسب موقع کا منتظر تھا۔

''شہزادے! کن سوچوں میں گم ہے؟'' معاً میرے ساتھ کی سیٹ پر موجود کبیل دادا نے مجھے ہلکے سے کہنی کا ٹھوکا دیا اور میں خیالات سے چونک کر بے اختیار ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔

''کچھ نہیں یار دادا! بس، یوں ہی بیتے ہوئے ایام کی فلم سی ذہن کی اسکرین پر چل رہی تھی۔ کتنے کردار تھے، کتنے لوگ تھے، ان میں دوست، دشمن سب ہی تھے۔ اب جیسے وہ سب خواب ہی ہو گئے۔ یوں لگتا ہے جیسے میں ایک خواب سے بیدار ہوا ہوں۔''

میری بات پر کبیل دادا مسکرا کر رہ گیا۔ ہماری عقب کی دو سیٹوں پر اول خیر اور شکیلہ موجود تھے۔ کوچ خاصی تیز رفتاری سے رواں دواں تھی۔

ہم نے سیٹوں کی پشت گاہ سے سر ٹکا کر آنکھیں موند لی تھیں اور اسی طرح سوتے رہے۔ سیہون شریف تک سفر اسی طرح کٹ گیا۔ ایک روڈ سائڈ ہوٹل پر کوچ رکی تھی۔ ہم بھی نیچے اتر آئے۔

ہم چاروں کرسیوں پر براجمان ہو چکے تھے۔ اور کھانے کا آرڈر دے دیا۔

وہاں ہمارے ساتھ کی میز پر دو آدمی بھی بیٹھے تھے۔ وہ چائے پی رہے تھے۔ اپنے حلیے سے دونوں مقامی لگتے تھے۔ انہوں نے ہم پر بھی ایک سرسری سی نظر ڈالی تھی۔

یوں ہی ان کا یہ نظر غائر جائزہ لینے کے مختصر ترین دورانیے میں اچانک میں چونکا۔ اجرک پوش کی قمیص کی سائڈ پاکٹ سے ایک اخبار کی جھلک نظر آ رہی تھی اور اس میں چھپی ہوئی تصویر کو دیکھ کر ہی میں چونکا تھا۔ یہی وہ وقت تھا جب اس کے سامنے بیٹھے ٹوپی والے چھریرے جسم کے مالک ساتھی نے مجھے دیکھا اور پھر شاید اپنے اجرک پوش ساتھی سے سرگوشی میں کچھ کہا تھا جس پر وہ گردن موڑ کر میری طرف دیکھنے لگا۔

''اگر زحمت نہ ہو تو میں یہ اخبار دیکھ سکتا ہوں......''

اسے اپنی جانب متوجہ پا کر میں نے اس سے کہہ ڈالا۔ وہ تھوڑا خفیف سا ہوا مگر اس نے رول کیا ہوا وہ اخبار میری طرف بڑھا دیا۔

''شکریہ بھائی! ابھی ذرا دیر میں لوٹائے دیتا ہوں......'' میں نے خوش اخلاقی سے کہا۔ وہ بھی بے تاثر سی مسکراہٹ سے بولا۔ ''کوئی بات نہیں۔'' زبان اردو مگر لہجہ سندھی تھا۔

میں نے جلدی سے اخبار لے کر کھولا۔ وہ کوئی مقامی سندھی اخبار تھا مگر میں وہ تصویر والا صفحہ کھول کر بغور اسے دیکھنے لگا۔

''او خیر...... کاکے! ایسا کیا دیکھ لیا ہے تُو نے اس اجنبی سی زبان کے اخبار میں......'' اول خیر نے مجھے اس قدر محو دیکھ کر کہا مگر میں نے اس کی بات کا جواب دیے بغیر سر اُٹھا کر اس شخص کی طرف دیکھا جس سے میں نے یہ اخبار لیا تھا۔ تصویر ''تلاشِ گمشدہ'' کی تھی۔ بس یہی ایک لفظ میری سمجھ میں آ سکا تھا۔ اخبار بھی چند روز پرانا تھا۔ ایک عجیب بات اور میں نے محسوس کی تھی کہ اس تصویری خبر یا اشتہار کو قلم سے نشان زدہ کیا ہوا تھا۔

''کیا تم اس تصویر سے متعلق مندرجات پڑھ کر مجھے کچھ بتا سکتے ہو......؟''

میں نے مذکورہ آدمی سے کہا۔ میں اس سے اردو میں ہی بات کر رہا تھا۔

وہ شخص ایک دم چونکا تھا اور کوئی جواب دینے سے پہلے اس نے پہلی بار بڑی برماتی نظروں سے مجھے دیکھا تھا پھر جواباً بولا۔

''یہ ایک گمشدہ شخص کی تلاش کا اشتہار ہے۔'' اس نے جانے کیوں مختصراً بتایا تو میں بولا۔

''جی بھائی! مجھے بھی اتنا ہی سمجھ آ سکا ہے مگر کیا تم اس اشتہار کے مندرجات پڑھ کر بتا سکتے ہو کہ اس تصویر والے شخص کے بارے میں کیا لکھا ہے؟ مجھے سندھی نہیں آتی۔''

میں نے درخواست کرنے کے انداز میں کہا۔ جانے کیوں وہ شخص بڑے غور سے میرا چہرہ تکنے لگا تھا جبکہ اس کا ساتھی

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

بھی کچھ اُلجھن کا شکار نظر آ رہا تھا۔ مذکورہ شخص نے مجھے بتایا۔
''یہ تصویر ہشام جھلگری نامی ایک ایسے شخص کی ہے جو کچھ عرصہ پہلے اچانک .... پُراسرار طور پر.... غائب ہو گیا ہے۔ لاڑکانہ کا رہائشی تھا۔ ایک بیوی اور دو چھوٹے بچے ہیں مگر بدقسمتی سے پولیس اسے اب تک تلاش نہیں کر پائی ہے۔ یہ اشتہار لگا ہے یہ گا ہے لگتا رہتا ہے۔''
''اوہ......'' میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔ میں نے ہشام جھلگری کے بدنصیب کنبے کی تلاش اور ان سے متعلق جو کچھ ارادہ کر رکھا تھا۔ قدرت شاید اس سلسلے میں میری مدد کر رہی تھی۔ میں نے پوچھا۔
''نیچے اس کا پتا وغیرہ تو لکھا ہوگا؟''
''ہاں! لکھا ہے۔'' اس نے کہا اور مجھے بتا دیا۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور اپنی کرسی پر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔
اس دوران میں ہمارا کھانا آ گیا تھا۔
کھانا بڑا لذیذ تھا۔ ہم نے خوب پیٹ بھر کر کھایا۔ ساتھ ہم سندر داس سکینہ کی سزائے موت سے متعلق بھی دھیمے دھیمے لہجے میں گفتگو کرتے رہے جو مختصر ہی رہی۔
کھانے سے سیر ہونے کے بعد ہمیں سگریٹ کی طلب ہوئی۔ پاس ہی سگریٹ کیبن تھا۔ کبیل دادا گولڈ لیف کا ایک پیکٹ خرید لایا۔
''او خیر...... وڈے استاد جی! یہ ہوئی نہ بات......''
اول خیر سگریٹ کو دیکھ کر خوش ہو گیا۔ ہم سب کبھی کبھار ہی پینے والوں میں سے تھے۔
اول خیر وغیرہ نے مجھ سے اخبار کے بارے میں کچھ پوچھنے کی کوشش کی تھی مگر میں نے اسے آنکھ کے اشارے سے خاموش رہنے کا کہا۔
اسی وقت ہماری کوچ نے ہارن دینا شروع کر دیا۔ مسافر سوار ہونے لگے۔ ہم نے بھی اپنی جگہ چھوڑی اور بل دے کر کوچ میں سوار ہو گئے۔
میں نے دیکھا کہ وہ دونوں افراد بھی ایک دم اپنی جگہ چھوڑ کر ہماری والی کوچ میں سوار ہو رہے تھے۔ کنڈیکٹر سے اُنہوں نے کوئی بات کی تھی اور پھر وہ آخری والی دو سیٹوں پر جا کر براجمان ہو گئے۔
کھانے کے بعد ہماری آنکھیں بوجھل سی ہونے لگیں اور ہم نے سیٹ کی پشت گاہ سے سر ٹکا کر آنکھیں موند لیں۔ نجانے کتنی دیر بیت چلی تھی کہ اچانک میری آنکھ کھلی۔
''کا کے! نیا پواڑا پے گیا ہے۔'' مجھے اپنے کان میں اول خیر کی آواز سنائی دی۔
''کیا ہوا ہے؟'' میں نے قدرے ہڑبڑا کر پوچھا۔ ''کوچ میں خرابی ہو گئی ہے؟''
''ہاں...... کہہ رہے ہیں کہ آئل لیک ہونے کی وجہ سے انجن سیز ہو گیا ہے۔'' اول خیر نے بتایا۔
''ویسے ہم اس وقت ہیں کہاں......؟'' کبیل دادا نے کھڑکی کے بند شیشے سے باہر جھانکا۔
''دادو کے کہیں آس پاس ہی ہیں۔'' اول خیر نے بتایا۔
''اوہ...... تو ابھی ہم سندھ میں ہی ہیں۔'' شکیلہ بولی۔
شکیلہ بیٹھی رہی جبکہ میں، اول خیر اور کبیل دادا نیچے اُتر آئے۔ دیکھا، مسافر کوچ کے ڈرائیور اور عملے پر بری طرح گرم ہو رہے تھے۔ میں نے ایک مسافر کو بس کے عملے سے غصے سے یہ کہتے سنا۔
''اڑے بابا! یہ کس جگہ پر منہ کالا کر دیا ہے تم نے...... یہ تو سارا علاقہ دھاڑیلوں (ڈاکوؤں) کا ہے، ابھی اِدھر کوئی ہتھیار بند گروہ آ گیا نی...... پھر گئے ہم سب کام سے......''
''اڑے چاچا! خیر کا جملہ منہ سے نکالو...... کیوں بدفعالیاں بک رہے ہو......'' ایک اجرک پوش جوان مرد نے اس عمر رسیدہ شخص کو ٹھرکا۔ باقی سب نے بھی زیرِ لب کلمۂ خیر کا وِرد کیا۔
اب یوں ہوا کہ مسافروں نے کرایہ واپس کرنے کا تقاضا شروع کر دیا۔ پہلے تو ڈرائیور اور کنڈیکٹر ہچر مچر کرنے لگے مگر مسافروں کے دباؤ کے آگے انہیں مجبوراً ان کے پیسے واپس کرنا پڑے۔ پیچھے سے جو بسیں کوچز تھوڑی تھوڑی دیر بعد آ رہی تھیں، مسافر ان میں سوار ہونے لگے۔
یوں ہوتے ہوتے ... بہت کم مسافر رہ گئے۔ ہمیں بھی کرایہ واپس مل گیا تھا۔ یہ کارِ خیر اول خیر نے انجام دیا تھا۔ کنڈیکٹر نے پہلے تو اڑی بازی دکھانے کی کوشش کی تھی، کیونکہ ہمارا روٹ لمبا تھا اور کرایہ زیادہ بنتا تھا پھر ہم چار تھے۔ کنڈیکٹر کو بہت سے پیسے ہمیں لوٹانے پڑ رہے تھے۔ وہ چالاک نصف سے بھی کم کرایہ دینے کے لیے پر تولے ہوئے تھا۔ دوسری مجبوری سے ہماری اس طرح فائدہ اُٹھا رہا تھا کہ اب بیشتر مسافر دوسری بسوں میں سوار ہو کر روانہ ہو چکے تھے، اب ہم سمیت چند ہی مسافر باقی بچے تھے، انہیں بھی ان بدمعاشوں نے اس کمزوری سے فائدہ اُٹھاتے

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

ہوئے ..... کرایہ لوٹانے سے انکار کر دیا تھا۔ اسی ''کمی'' کے باعث ڈرائیور اور کنڈیکٹر ہم سے اکڑ رہے تھے۔ ان کی بدمعاشی پر مجھ سے زیادہ کبیل دادا کو طیش آ گیا اور اس نے اول خیر کو ایک طرف ہٹاتے ہوئے کنڈیکٹر کی گردن اپنے ایک ہاتھ سے دبوچ لی اور غصے سے غرا کر بولا۔

''اوئے ..... ! ایک تو اتنے لمبے روٹ پر اتنی بڑی کوچ چلا رہے ہو اور یہ بھی نہیں پتا چلا تم کو کہ آئل لیک ہو رہا ہے، جبکہ ڈائل پر اس کا کاشن بھی آ جاتا ہے۔ شرافت سے پورے پیسے نکالو ہمارے ..... زیادہ بدمعاشی کی تو اِدھر ہی سڑک پر لمبا لٹا دوں گا۔''

اسی وقت میں نے دیکھا کہ موٹا تازہ ڈرائیور اور اس کا ساتھی لڑکا جارحانہ انداز میں کوچ کی طرف بڑھے، میری اور اول خیر کی عقابی نظریں ان دونوں کو بپھرے ہوئے انداز میں کوچ میں چڑھتا دیکھ رہی تھیں، فوراً ہی وہ دوبارہ نمودار ہوئے۔

''او..... خیرا!'' اول خیر کے منہ سے ہولے سے برآمد ہوا اور خود میرے وجود میں طیش ناک اُبال کی سنسنی دوڑ گئی۔ وہ ہم سے باقاعدہ لڑنے کے موڈ میں آ گئے تھے۔ ان دونوں نے ہاتھوں میں لوہے کے پانے اور آئرن راڈ اُٹھائے ہوئے تھے۔

ان کی ڈھٹائی اور سینہ زوری پر اول خیر کو بھی طیش آ گیا تھا۔ لہٰذا وہ دونوں..... ہی جارحانہ انداز میں کبیل دادا کی طرف لپکے، ان دونوں نے شاید واقعی ہمیں عام سے مسافر سمجھنے کی غلطی کر ڈالی تھی۔

لہٰذا اول خیر اور میں نے بیک وقت بجلی کی طرح اپنی جگہ سے حرکت کی..... لڑکے نے اول خیر پر سریے سے وار کرنا چاہا تو اول خیر نے بڑے اطمینان سے اپنی ایک لات چلائی، جو لڑکے کے پہلو میں لگی۔ وہ اپنے حلق سے اوغ کی آواز نکالتا ہوا اپنے مضروب پہلو پر ہاتھ رکھے وہیں سڑک پر بیٹھ گیا، اس موٹے تازے ڈرائیور نے غصے سے دانت پیستے ہوئے اپنے ہاتھ میں پکڑے ہوئے بڑے سے آہنی پانے کو میرے چہرے پر رسید کرنے کی کوشش چاہی تھی کہ میں پُرغیظ انداز میں اپنے ہونٹ بھینچتا ہوا اس پر جھپٹا۔ اس کا آہنی پانے والا ہاتھ جو فضا میں بلند تھا، مجھے قریب آتا دیکھ کر نیچے آیا، وار کرنے کی اس کی حسرت دل ہی میں رہ گئی۔ کیونکہ اگلے ہی لمحے میں نے اپنے ایک ہاتھ سے اس کی وہ کلائی دبوچ لی تھی اور دوسرے ہاتھ کے گھونسے نے اس کے جبڑے کو بری طرح ہلا کر رکھ دیا۔ اس کے حلق سے بھی خرخراتی آواز نکلی تھی، میں نے اسی پر ہی بس نہیں کیا تھا اور اس کی کلائی موڑ دی۔ پانا ٹن ..... ٹن ..... کرتا ہوا سڑک پر گرا اور اس کے بعد ڈرائیور بھی۔ کیونکہ میں نے اس کی کلائی والی وہ ہڈی ہی توڑ ڈالی تھی۔ وہ بری طرح گرم سڑک پر پڑا تڑپتا رہا۔ اُدھر اول خیر اس لڑکے سے بھڑا ہوا تھا اور کوئی تیسری بار اسے بس کی باڈی سے ٹکرا کر نیچے گرا چکا تھا۔

''بس..... ! کافی ہے۔'' اچانک کبیل دادا کی آواز ابھری۔

''ان کی بدمعاشی تو دیکھو، کمینے، لوہے کے سریے لیے آ گئے تھے۔ تمہاری تو.....'' اول خیر نے موٹی سی گالی دے ڈالی۔ شکیلہ بھی نیچے اُتر آئی تھی۔

''چل بیٹا! اب شرافت سے ہمارے اور ان کے بھی پیسے واپس لوٹاؤ، جنہیں تم نے دھونس دھمکی سے چپ رہنے پر مجبور کر رکھا تھا۔'' کبیل دادا نے کنڈیکٹر سے کہا۔ کنڈیکٹر کو اپنے دونوں ساتھیوں کے حشر سے خاطر خواہ عبرت حاصل ہو چکی تھی۔ اس نے فوراً جیب سے کرائے کے پیسے نکال کر نہ صرف ہمیں بلکہ ان چند مسافروں کو بھی لوٹا دیے۔ ان بچے کھچے مذکورہ مسافروں کی تعداد چار تھی۔ دو مرد ایک جوان عورت دوسری ایک ضعیف خاتون تھی۔ جوان عورت کی گود میں بچہ بھی تھا۔

وہ دونوں آدمی بھی ایک طرف خاموش کھڑے تھے۔ انہوں نے ابھی تک کوئی ذرا سی بھی چون و چرا نہ کی تھی۔

دادو سے لاڑکانہ چونکہ اب شارٹ روٹ رہ گیا تھا اسی لیے سیہون، دادو اور لاڑکانہ تک مسافر ویگنیں بھی چلتی تھیں۔ وہ گاہے بگاہے ادھر سے گزر رہی تھیں۔

''میرا خیال ہے اس مقام سے آگے جا کر کسی گاڑی کو ہاتھ دینا چاہیے۔'' کبیل دادا نے کسی خیال کے تحت کہا۔ ہم اس کی بات کا مطلب سمجھ گئے اور آگے بڑھ گئے۔

چند فرلانگ پیدل مارچ کرنے کے بعد عقب سے آتی ہوئی ایک مسافر ویگن کو میں نے ہاتھ دیا۔ وہ لاڑکانہ جا رہی تھی۔ ہم اس میں سوار ہو گئے۔ میرے ساتھیوں کو حیرت ہوئی تھی مگر میرے اشارہ کرنے پر وہ خاموشی سے سوار ہو گئے۔ اسی دوران میری اچانک عقبی سیٹوں پر نگاہ پڑی، وہ دونوں افراد بھی پہلے سے ہی سوار تھے اور میری جانب گھور رہے تھے۔ میں ہولے سے شناسا انداز میں مسکرایا تھا۔ انہیں دیکھ کر مجھے کوئی خاص حیرت نہیں ہوئی تھی۔ ظاہر ہے یہ لوگ ہماری طرح منزل کے ستائے ہوئے

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

تھے۔

دو گھنٹے بعد یعنی رات تک ہم لاڑکانہ پہنچ چکے تھے۔ یہاں عام سے ہوٹل تھے۔ سرائے بھی تھیں۔ ایک ہی ہوٹل ڈھنگ کا تھا، یہ سپنا ہوٹل تھا۔ ہم یہاں آ گئے اور دو کمرے کرائے پر لے لیے۔ شکیلہ میرے کمرے میں ہوتی تھی۔ اس وقت ہم ایک ہی کمرے میں بیٹھے تھے، چائے منگوائی گئی اور اس دوران جب ساتھیوں نے مجھ سے یوں اچانک لاڑکانہ قصد کرنے کا سوال کیا تو میں نے انہیں بتا دیا۔

''او خیر..... لگتا ہے۔ اپڑیں شہزی کا کے کا انڈیا مشن ابھی پورا نہیں ہوا.....'' اول خیر نے مسکرا کر کہا۔

''ہاں، اول خیر! مگر یہ مشن اتنا مشکل یا خطرناک نہیں ہے، مجھ پر یہ فرض لازم بنتا ہے کہ میں بشام کی بیوہ اور اس کے بچوں سے مل کر نہ صرف انہیں اس تلخ حقیقت سے آگاہ کروں بلکہ انہیں دیکھوں میں کہ وہ کس حال میں ہیں؟ اور وہ اعزاز کے بھی حقدار ہیں۔ کیونکہ ... طلسم نور ہیرے کی بازیابی کا کریڈٹ میں ... بشام کے نام کرنے کا اصولی فیصلہ کر چکا ہوں۔'' میں نے سنجیدگی سے کہا تو کبیل دادا متاثر کن لہجے میں بولا۔

''یار شہزادے! کبھی کبھی مجھے تجھ پر بڑا رشک آتا ہے..... کہ تُو دل کا کس قدر سخی انسان ہے۔ ایسے مواقع پر .... تو لوگ دوسروں کا کریڈٹ بھی اپنے سر لینے کی کوشش کرتے ہیں مگر تُو ہے کہ..... بس! کیا کہوں آگے.....'' کبیل دادا سر جھٹک کر چپ ہو رہا تو میں بولا۔

''دادا..... انسان کا ضمیر بھی کوئی شے ہے یار.....! حق دار کو حق نہ ملے یہ تو مجھے یوں بھی برداشت نہیں ہوتا۔ لیکن سچ کہوں گا کہ میرے اندر کوئی ایسا انسان ضرور بیٹھا ہے جو میری رہنمائی کرتا ہے۔ کیا غلط ہے اور کیا صحیح، اس کا مجھے خود ہی ادراک ہونے لگتا ہے۔ تمہیں تو سب معلوم ہی ہے، وہ حالات بھی جن سے میں نے تمہیں آگاہ کیا۔ بتاؤ مجھے، کیا میرا یہ فیصلہ غلط ہے؟''

''ہرگز نہیں، شہزی!'' شکیلہ بولی۔ ''بشام چھلگری نے اس ہیرے کی اپنی جان سے بڑھ کر حفاظت کی تھی لیکن افسوس پھر بھی وہ دھوکا کھا گیا مگر اسی ہیرے کی وجہ سے وہ سے جی کو ہارا جیسے سفاک اور خطرناک دشمن کے ہتھے چڑھا اور اس نے مرنے سے پہلے اس ہیرے کی گمشدگی سے متعلق تمہیں بھی آگاہ کیا۔''

میرے ساتھی میرے اس نیک مقصد کی برآوری پر متفق تھے۔

سپنا ہوٹل خاصا شاندار تھا۔ اس اجرک پوش نے مجھے جو پتا سمجھایا تھا، اس پر روانگی کا ارادہ اگلے دن صبح کا تھا ہمارا۔

وہ رات ہم نے سو کر گزاری اور اگلے دن ٹوٹے پھوٹے سفر کی تکان اُتار کر تازہ دم ہو گئے۔

جب ہم بشام چھلگری کے کنبے کی تلاش میں ہوٹل سے نکلنے لگے تو کبیل دادا نے مجھے حسبِ سابق ایک مشورہ دیتے ہوئے کہا۔

''ایک بار پھر سوچ لے شہزی! ہمیں بشام چھلگری کے گھر والوں کا پتا تو معلوم ہو ہی گیا ہے تو جلدی کس بات کی ہے؟ بعد میں آرام سے یہ کام نمٹا لیں گے، میرا مطلب تھا کہ اس وقت ہمارے پاس طلسم نور ہیرے کی صورت میں ایک قیمتی قومی امانت موجود ہے۔''

میں نے کہا۔ ''ہم کسی سے جنگ کرنے نہیں جا رہے ہیں دادا! میں صرف بشام کی بیوہ کو اس کے بدنصیب شوہر کی خبر دوں گا کہ وہ اب اس کی تلاش اور جاں گسل انتظار ترک کر دے۔ بے چاری کو کچھ تو سکون مل ہی جائے گا۔ باقی اعزاز والی باتیں اور حکومت کی طرف سے اس بدنصیب کنبے کی کفالت کے بارے میں اس کی رہنمائی بھی کرنا چاہتا ہوں۔ یہ اس کا حق ہے۔''

''میرا خیال ہے شہزی صحیح کہہ رہا ہے دادا!'' شکیلہ نے میری تائید میں کبیل دادا سے کہا۔

''میں صرف اس لیے کہہ رہا تھا.....'' کبیل دادا نے اس کی بات کاٹ دی۔ ''مجھے ان دونوں اجرک اور ٹوپی پوش افراد پر کچھ شبہ سا ہوا ہے۔ میرا خیال ہے وہ کسی خاص مقصد کے لیے ہماری ریکی کر رہے تھے۔''

''اس شبہے کی کوئی خاص وجہ تو ہو گی تمہارے دل میں؟'' اول خیر نے اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ شاید وہ بھی کبیل دادا کی اس شبہے والی بات پر کھٹکا تھا۔

''ایک نقطہ میرے ذہن میں آیا تھا۔'' کبیل دادا نے جواب دیا۔ ''ان کے پاس بشام چھلگری کی گمشدگی والا جو اخبار تھا، وہ پرانا تھا۔ اس تصویری اشتہار پر میری بھی نگاہ پڑی تھی، جب تم اسے غور غور سے دیکھ رہے تھے، کیا تم نے محسوس نہیں کیا تھا کہ اس اشتہار کو قلم زد کیا ہوا تھا؟''

''تو تمہارا خیال ہے کہ وہ دونوں بھی بشام چھلگری کی تلاش میں تھے؟'' میں نے کچھ کچھ سمجھتے ہوئے کہا۔

''ہاں!''

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

''ممکن ہے وہ لوگ بشام چھلگری کے رشتے دار ہوں؟''

''اب یہاں تم میری بات ٹھیک طریقے سے سمجھو گے۔'' گبیل دادا پُرمعنی انداز میں مسکرایا۔ ''اسی پوائنٹ کو ذہن میں رکھ کے سوچو ذرا..... شہزی! اگر یہ بات تھی تو پھر ان دونوں نے ہم سے بشام سے متعلق ایک بات بھی نہ کی بلکہ کسی خاص مقصد کے لیے انہوں نے ہماری ریکی ضرور شروع کر دی جبکہ ان کی منزل کوئی اور تھی۔ اس بات کی پوری تسلی کرنے کے بعد ہی وہ ہم سے الگ ہوئے تھے کہ ہم لاڑکانہ پہنچ چکے ہیں۔''

''تت..... تو تمہارا خیال ہے دادا کہ ہمارے ہوٹل سے باہر نکلتے ہی وہ ہم پر.....''

''سو فیصد ممکن ہے یہ بات.....'' گبیل دادا نے کہا۔

''شہزی! وڈے استاد جی غلط نہیں کہہ رہے ہیں، باہر ہمیں خطرہ ہے۔'' اچانک اول خیر نے کچھ ایسے لہجے میں کہا کہ میرے پورے وجود میں سنسنی کی ایک لہر سی دوڑ گئی۔

''اس امکان کو نظر انداز نہیں کر سکتے مگر یہ کام انجام ضرور دینا ہوگا لیکن اگر ایسا کچھ ہے بھی تو یہ لوگ ہیں کون؟ ہمیں ان سے کس قسم کا خطرہ ہو سکتا ہے؟''

''اس طلسم نور ہیرے سے متعلق ہم سے زیادہ تمہیں ہی جان کاری ہے شہزی!'' گبیل دادا بولا۔ ''یہ تو تم ہی سوچ کے گھوڑے دوڑا کر اس بات کا اندازہ لگا سکتے ہو کہ ہمیں ان دونوں مشکوک افراد سے کس قسم کا خطرہ ہو سکتا ہے؟''

ابھی میرے پاس یہ سب سوچنے اور ماضی کے حالات کا تجزیہ کرنے کا وقت نہ تھا۔ میں نے کہا۔

''محتاط رہو اور آگے بڑھو.....''

ہم ہوٹل سے باہر آ گئے۔ البتہ ہوٹل کا قیام ہم نے ترک نہیں کیا تھا۔ ہمارا مختصر سامان وہیں کمروں میں رکھا تھا۔ ہوٹل سے باہر آ کر ہم نے گرد و پیش کا جائزہ لیا۔ حالانکہ صبح کا وقت تھا مگر سورج تو جیسے ابھی سے ہی سوا نیزے پر آیا معلوم ہوتا تھا۔ گرمی اسی طرح شدت کی پڑ رہی تھی۔ دس بج رہے تھے۔ اخبار کے اشتہار کے مطابق (جو اس اجرک پوش شخص نے مجھے بتائی تھی) بشام کی بیوہ لاہوری محلے میں کے ایک مکان میں رہتی تھی۔ وہاں تک ہم ایک تانگے میں سوار ہو کر پہنچے تھے۔

اس دوران میں ہم اپنے گرد و پیش سے بہت محتاط بھی رہے تھے مگر ہمیں پھر دوبارہ وہ دونوں مشکوک افراد دکھائی نہیں دیے تھے۔ ہم تانگے سے اُترے کرایہ دیا اور لوگوں سے پوچھتے ہوئے بشام چھلگری کے گھر کے دروازے تک جا پہنچے۔

میں نے ایک نظر مکان کا جائزہ لیا۔ وہ ایک عام سا چھوٹا مکان تھا، بمشکل اسی گز پر ہوگا اس کے در و دیوار خستہ حالی کا منظر پیش کر رہے تھے۔ مجھے اپنے سینے میں دکھ کی ایک لہر کا احساس ہوا اور پھر میں نے ہونٹ بھینچ کر دروازے پر دستک دے ڈالی۔

پہلی ہی دستک پر ...... اندر سے ایک نسوانی آواز اُبھری۔ مقامی زبان (سندھی میں) کسی نے کچھ پوچھا تھا۔ مجھے اس عورت کی آواز اور لہجہ دونوں ہی گھٹا گھٹا سا محسوس ہوا تھا۔ تاہم اپنے تئیں مطلب سمجھتے ہوئے میں نے اردو میں کہا۔

''کیا یہ بشام چھلگری کا گھر ہے؟''

اندر یک دم ہی چند ثانیے کے لیے دھڑکتی سی خاموشی طاری ہوگئی پھر جب دوبارہ وہی نسوانی آواز اُبھری تو اس بار لہجے میں ہلکی سی کپکپاہٹ واضح طور پر موجود تھی۔

''جج..... جی ہاں! لل..... لیکن آپ کون ہیں؟''

اس بار عورت نے بھی سندھی لہجے میں اردو بولی تھی۔

''بہن جی! اگر زحمت نہ ہو تو آپ سے بشام چھلگری کے متعلق کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں۔'' میں نے نرم لہجے میں کہا۔

اس دوران میں میری ہدایات کے مطابق گبیل دادا، اول خیر اور شکیلہ، گرد و پیش میں عقابی نظریں ڈالے ہوئے تھے۔

میرا خیال تھا کہ اب کی بار خاتون فوراً دروازہ کھول دے گی مگر ایسا نہ ہوا۔ لگتا تھا وہ شاید کچھ خوف زدہ اور سہمی ہوئی تھی۔ اس کی پھر سراسیمہ سی آواز اُبھری۔

''آپ لوگ..... پپ..... پولیس کے آدمی ہیں یا..... زمیندار شاہنواز خان نے آپ کو بھیجا ہے؟''

''دیکھیں بہن جی!'' میں نے بند دروازے کی طرف منہ کر کے ملائمت آمیزی سے کہا۔

''ہم نہ پولیس والے ہیں نہ ہی کسی زمیندار کے آدمی ہیں۔ ہم تو خود اس علاقے میں اجنبی ہیں اور ایک خاص مگر نیک مقصد کے لیے ہی یہاں آئے ہیں۔ مجھے آپ بشام چھلگری کا دوست کہہ سکتی ہیں۔''

میرے یہ کہنے کی دیر تھی کہ اسی وقت دروازہ کھل گیا اور دروازے کے عقب سے جس خاتون کا چہرہ برآمد ہوا، اسے دیکھ کر میں چونکے بنا نہ رہ سکا تھا۔

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

☆☆☆

چونکنے کی وجہ عام سہی مگر حقیقت یہ تھی مجھے اس خاتون کو دیکھ کر ایک نامعلوم سے کرب کا احساس ہوا تھا انسان فطرتاً جمال پرست ہے مگر اس جمالیاتی ذوق میں کسی ہوس یا منفی جذبہ کارفرما نہ تھا۔ یہ بھی بس ایسا ہی جذبہ تھا جیسا کہ ہم کسی خوش رنگ پھول یا مہکتے گلشن، دل فریب نظارے کا لطف لیتے ہیں اور بس...... وہ ایک جوان اور حسین عورت تھی۔ چہرہ کتابی تھا اور اس کی کشادہ آنکھیں کسی خاموش جنگل کی جھیل جیسی گہرائی لیے ہوئے تھیں۔ ان میں اُداسی کا رنگ بھی ایک معصوم سی خوب صورتی لیے ہوئے تھا۔ وہ سروقد تھی۔ اس کے گھنے ریشمی بال ایک چٹیا کی صورت میں بندھے ہوئے تھے۔ میرے دل میں اسے دیکھ کر کرب کی لہر کا پیدا ہونا یہی معنی رکھتا تھا کہ کتنی حسین خاتون اور کتنی بدقسمت تھی کہ اس بھرے حسن اور جوانی میں بیوہ ہوگئی اور...... کتنا خوش قسمت تھا بشام پھلگری جس کی اس قدر حسین بیوی تھی مگر افسوس......

"جی آ...... آپ کون......؟" اس نے مجھے ایک نگاہ دیکھنے کے بعد ان تینوں پر بھی نظر ڈالی تھی اور کچھ گھبرا سی گئی تھی۔ اس نے جلدی سے ڈھلکی ہوئی چادر سر پر رکھی۔

"گھبرائیں نہیں بہن! ہم غلط لوگ نہیں ہیں۔ مناسب ہوگا کہ اندر آرام سے بیٹھ کر گفتگو کی جائے۔" اس بار میرے خفیف سے اشارے پر شکیلہ نے اس عورت سے تشفی بھرے انداز میں کہا۔ "لیکن...... کیا آپ ہمیں پہلے یہ تسلی دے سکتی ہیں کہ آپ بشام کی کیا لگتی ہیں؟"

"وہ میرے شوہر ہیں۔" اس عورت نے دھیرے سے کہا۔ "مم...... مگر وہ...... کافی عرصے سے لاپتا ہیں۔"

"جی ہاں بہن! ہمیں معلوم ہے۔" میں نے کہا۔

"اسی کے متعلق ہی تو ہم آپ کو کچھ بتانے آئے ہیں۔"

"اندر آجائیے۔" اس نے فوراً ہمیں اندر آنے کا راستہ دیا۔ ہم سب اندر آگئے۔

گھر اندر سے بھی غربت اور تنگ دستی کا منظر پیش کررہا تھا۔ اکھڑی ہوئی اینٹوں والا دھوپ میں جلتا مختصر سا صحن اور سامنے اسی طرح کا جھکا جھکا برآمدہ اور دو کوٹھری نما کمرے نظر آرہے تھے۔ ایک نوعمر لڑکا جو بمشکل تیرہ برس کا ہوگا اور ایک معصوم سی لڑکی جو لڑکے سے دو تین سال ہی چھوٹی نظر آتی تھی، برآمدے کے ایک ستون کے ساتھ کھڑے ہماری طرف حیرت بھری نظروں سے تکے جارہے تھے جن میں نامعلوم سے خوف کی بھی آمیزش محسوس ہوتی تھی۔ مجھے اب یہ بات کھٹکنے لگی تھی کہ ایسا کیوں تھا؟ مغمومیت کی فضا تو سمجھ میں آتی تھی مگر یہ خوف...... کی فضا یہاں کیوں چھائی ہوئی تھی حتیٰ کہ بچے بھی اسی کی لپیٹ میں تھے۔ مجھے کچھ حیرت تو اس بات پر بھی ہوئی تھی کہ بشام پھلگری "اسپیکٹرم" کے ایک فیلڈ آفیسر کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس حساب سے اس کی تنخواہ بھی اچھی ہوگی مگر پھر یہ تنگ دستی؟ یا پھر ممکن ہو کہ "اسپیکٹرم" کی اصلیت آشکارا ہونے کے بعد اس سے کنارہ کشی اور بعد میں روپوشی اور اس کے غیاب کے بعد اس بدنصیب کنبے کی یہ حالت ہوئی ہو؟

"اس کمرے میں آجائیے۔" عورت نے کہا۔ اس کا لہجہ شستہ اور پڑھے لکھوں جیسا تھا۔ اس نے عام سی سرلون کی شلوار قمیص پہن رکھی تھی۔ ہم اندر ایک کمرے میں آگئے۔ یہاں ایک چارپائی بچھی ہوئی تھی جس پر رنگ دار چادر بچھی ہوئی تھی۔ مقامی زبان میں اسے رلی کہا جاتا تھا۔ ہم ابھی یہ سوچ ہی رہے تھے کہ ایک چارپائی پر کون کون بیٹھے کہ وہ خاتون دو عدد بغیر پشت گاہ والی کرسیاں لے آئی۔

میں تو کرسی پر بیٹھ گیا مگر میں نے اس خاتون کو بھی دوسری کرسی پر اپنے سامنے بیٹھ جانے کا کہا۔ باقی کبیل دادا، اول خیر اور شکیلہ چارپائی پر پاؤں جھلائے بیٹھ گئے۔

کمرے میں چھت کا پنکھا چل رہا تھا۔ ایک روشن دان تھا۔ بغیر سلاخوں کا...... وہاں سے دن کی روشنی آرہی تھی، تاہم پھر بھی عورت نے لائٹ آن کردی تھی۔

دونوں بچے بھی اب دروازے پر آن کھڑے ہوئے تھے۔ عورت نے انہیں برابر والے کمرے میں جانے کو کہا۔ وہ چلے گئے تو عورت ہماری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

"میں آپ کے لیے پانی وغیرہ......"

"نہیں بہن! رہنے دیں۔" میں نے اسے منع کیا اور ایک گہری سانس خارج کی۔ اسے اس کے شوہر کے بارے میں کچھ بتاتے ہوئے میرا دل بھاری سا ہورہا تھا۔

"آ...... آپ میرے شوہر کے بارے میں بتانا چاہ رہے تھے؟" عورت نے کہا۔ وہ خاصی مضطرب الحال اور آزردہ خاطر نظر آنے لگی تھی۔

"آپ کو سب بتا دیا جائے گا بہن!" میں نے کہا۔

"پہلے مجھے یہ بتائیے کہ آپ لوگ اتنے خوف زدہ اور ڈرے ہوئے کیوں ہیں؟"

میں نے غور کیا کہ میری بات پر عورت کے چہرے پر سراسیمگی کے سائے کچھ اور گہرے ہوئے اور پھر وہ کچھ کہتے کہتے بھرا سی گئی...... اس کے سر پر اوڑھی ہوئی چادر سرک گئی

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

تھی۔ وہ سسک پڑی۔ میں نے فوراً کرسی سے اُٹھ کر اس کی چادر اس کے سر پر رکھ دی اور اپنا ایک ہاتھ بھی اس کے سر پر رکھ دیا اور بولا۔

''میں نے آپ کو بہن کہا ہے تو اب میں آپ کو دل سے سمجھوں گا بھی...... بشام کی میرے دل میں کیا اہمیت ہے۔ اس کا اندازہ آپ صرف اس بات سے لگا سکتی ہیں کہ میں نے آپ کی مدد کرنے کے لیے ہی اس اجنبی علاقے میں پہلی بار قدم رکھا ہے۔ یہ تینوں میرے بھائیوں سے بھی بڑھ کر ساتھی ہیں اور بشام بھی میرا ایک ایسا ہی دوست اور بھائی تھا۔''

''تھا......؟'' وہ عورت چونکی۔ اس نے اشکبار نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔ میں کرسی پر دوبارہ براجمان ہو چکا تھا۔

''خ خ...... خدا کے لیے مجھے جلدی بتائیے کہ بشام کدھر ہے؟ کہاں ہے وہ؟ تاکہ ہماری اس عذاب ناک زندگی سے جان چھوٹے۔''

میں نے ایک گہری ہمکاری بھری اور کہا۔ ''حوصلہ رکھیں بہن! میں نے کہا ناں...... میں آپ کو سب بتا دوں گا...... ہم بہت دور سے آئے ہیں اور صرف اسی لیے آئے ہیں کہ آپ کی مدد کی جا سکے جس کی آپ حق دار بھی ہیں۔''

عورت نے کہا۔ ''میں کیا بتاؤں...... میں تو خود بدنصیبی کی زندگی گزار رہی ہوں اور کب سے اپنے گم شدہ شوہر کی راہ تک رہی ہوں...... پھر خود کو بہلا لیتی ہوں مگر ان دونوں معصوموں کو کیسے بہلاؤں جو ہر روز مجھ سے ایک ہی سوال پوچھتے ہیں کہ...... ''اماں! بابا، کہاں چلے گئے ہیں؟ وہ کب آئیں گے؟'' اتنا بتا کر وہ چپ ہوئی اور اپنی چادر سے نمناک آنکھیں پونچھنے لگی۔ اس بار کبیل دادا نے عورت سے سنجیدگی کے ساتھ مخاطب ہو کر کہا۔

''بہن! آپ کا نام پوچھ سکتا ہوں؟''

''ارم۔'' خاتون نے ہولے سے اپنا نام بتایا۔ اس کے بعد کبیل دادا نے خود سمیت ہم سب کا بھی تعارف کروایا۔

''ارم بہن! ہم چاروں کو آپ غور سے دیکھ لیں۔'' کبیل دادا دوبارہ اپنے مخصوص انداز میں ارم سے مخاطب ہوا۔ ''یہاں میں اللہ کو گواہ بنا کر آپ سے کہتا ہوں کہ ہم چاروں کا آپس میں کوئی خونی رشتہ نہیں ہے۔ ہم ایک دوسرے کے نہ بھائی لگتے ہیں نہ بہن۔ ہم ایک دوسرے کے عزیز رشتے دار بھی نہیں ہیں۔ لیکن ارم بہن! کیا آپ یقین کریں گی کہ ہم چاروں پھر بھی ایک دوسرے پر جانیں چھڑکتے ہیں، کہیں بھی یقینی موت کو آنکھوں کے سامنے دیکھتے ہیں تو اپنے ساتھی کی ڈھال بن جاتے ہیں۔ کیوں؟ اس لیے کہ دنیا میں صرف ایک خونی رشتہ ہی بڑا نہیں کہلاتا۔ انسانیت اور دوستی کا رشتہ اس سے بڑھ کر افضل ہے۔ ہم چاروں بھی ایسے ہی دوست ہیں۔ ایک دوسرے کی عزت کو اپنی عزت سمجھتے ہیں۔'' اتنا کہہ کر کبیل دادا ذرا تھما پھر اصل بات کی طرف آتے ہوئے بولا۔

''ہم یہاں آئے تو اور مقصد کے لیے تھے، اگرچہ وہ بھی ہم پورا کر کے ہی جائیں گے مگر یہاں آپ کو ایسی خوف کی حالت میں پا کر ہم بے چین ہو گئے ہیں۔ آپ نہیں جانتیں کہ آپ کے شوہر بشام نے ملک و قوم کے لیے کتنا بڑا کارنامہ انجام دیا تھا اور ہم اس کے قدردانوں میں سے ہیں۔ اسی ناتے ہم آپ کی مدد کرنا چاہتے ہیں، ہم پر بھروسا کریں اور ہم سے اب کچھ نہ چھپائیں۔ آپ میری بات کا مطلب شاید سمجھ گئی ہوں گی۔''

ارم نے ایک نگاہ اُٹھا کر کبیل دادا کی طرف دیکھا۔ وہ اب کچھ سنبھلنے لگی تھی۔

''شاید اللہ سائیں نے مجھ بدنصیب عورت کی دعا سن لی ہے۔ اپنے شوہر (بشام) کی گمشدگی کے بعد میں واقعی بہت کمزور اور مجبور ہو گئی ہوں۔ لیکن...... خدا کے لیے پہلے مجھے یہ تو بتایا جائے کہ میرا شوہر کہاں ہے؟''

''بہن! کہا ناں ہم نے کہ ہم آپ کو سب بتا دیں گے لیکن پہلے آپ اپنی مصیبت کے بارے میں بتائیں۔'' اس بار شکیلہ نے اس سے تشفی آمیز لہجے میں کہا تو ارم چند لمحے کے لیے خاموش سی ہو گئی۔ شاید وہ اپنی کوئی دکھ بھری داستان سنانے کے لیے مناسب الفاظ کا سہارا تلاش کر رہی تھی پھر کہنا شروع ہوئی۔

''ہماری حالت پہلے ایسی نہ تھی، جیسی اب آپ کو نظر آ رہی ہے۔ میرا شوہر بشام ایک بین الاقوامی این جی اوز میں اچھے عہدے پر فائز تھا۔ دادو میں ہمارا شاندار بنگلا تھا۔ ہم بہت ہنسی خوشی زندگی گزار رہے تھے۔ نجانے پھر کسی کی ہماری ہنستی بستی زندگی کو نظر لگ گئی اور پھر کچھ نہ رہا۔ بشام کے ایک استاد پروفیسر کریم بخش، آرکیالوجسٹ تھے۔ دونوں استاد شاگرد موئن جودڑو میں مل کر ایک بڑے پروجیکٹ پر کام کر رہے تھے۔ اس کے لیے ہمیں بھی اپنا پورا گھر بار لاڑکانہ شفٹ کرنا پڑا۔ کھدائی کے دوران میں کوئی نادر و قیمتی ہیرا اُن کے ہاتھ لگا جسے قومی امانت سمجھتے

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

ہوئے حکومت کے ذمے داران کے حوالے کرنے کی تیاریوں میں مصروف تھے کہ وہ ہیرا ایک مقامی زمیندار شاہنواز خان نے اُڑا لیا۔ بشام کو اس کی خبر ہوگئی کہ وہ ہیرا زمیندار شاہنواز نے اُڑایا ہے تو اس نے اس کے خلاف قانونی کارروائی کی اور وہ ہیرا اس کے قبضے سے برآمد کرالیا مگر زمیندار شاہنواز چونکہ ایک با اثر شخص تھا، اس نے خود کو قانون کی گرفت سے چھڑا لیا مگر اب وہ ہمارا دشمن بن چکا تھا۔ اپنی سبکی کو اس نے انا کا مسئلہ بنالیا، ساتھ ہی وہ ہیرا بھی دوبارہ حاصل کرنے کی تگ و دو میں مصروف رہا۔ ہمیں بھی تنگ کرنے اور ستانے لگا۔ پھر بدقسمتی سے وہ ہیرا دوبارہ اُڑا لیا گیا۔ بشام بھی ان دنوں بہت پریشان رہنے لگا تھا اس کی وجہ وہ یہی بتاتا تھا کہ وہ اسپیکٹرم نامی جس بین الاقوامی این جی اوز میں کام کرتا تھا وہ اب پہلے جیسی نہیں رہی تھی اس کے پسِ پردہ عالمی پیمانے پر وہاں مجرمانہ سرگرمیاں پروان چڑھنا شروع ہوگئی تھیں۔ بشام کو ان لوگوں سے بھی جان کا خطرہ ہونے لگا تھا، لہٰذا اُنہوں نے ان کی نوکری سے استعفیٰ دے دیا اور لاڑکانہ میں ہی روپوشی کی زندگی بتانے لگا۔

اس دوران زمیندار شاہنواز مسلسل ہمیں تنگ کرتا رہا اور دھمکیوں کے ذریعے اس ہیرے کو لوٹانے کا کہتا تھا جبکہ ہیرا پہلے ہی دھوکے سے اُڑایا جا چکا تھا پھر ایک دن اچانک بشام غائب ہوگیا۔ میں یہی سمجھی تھی کہ زمیندار شاہنواز خان نے ہی دشمنی میں اسے اغوا کرایا ہے مگر جلد ہی مجھے ادراک ہونے لگا کہ یہ کام کسی اور آدمیوں کا ہے، کیونکہ شاہنواز کو خود بشام کی تلاش تھی۔ اب وہ دن ہے اور... میں بے سکون ہوکر رہ گئی ہوں۔ شاہنواز کو شبہ ہے کہ بشام کسی خاص مقصد کے لیے جان بوجھ کر غائب ہوا ہے اور وہ ہیرا ابھی اسی کے پاس ہے، یوں اب وہ آئے روز اپنے مسلح آدمیوں کے ذریعے مجھے ڈراتا دھمکاتا ہے۔ بشام کے بارے میں پوچھتا ہے۔ مجھے اغوا کی دھمکیاں دیتا ہے۔ ہر وقت اس کے آدمی ہماری نگرانی کرتے رہتے ہیں اور ہمیں اپنے گھر میں ہی قیدی کی حیثیت سے رہنا پڑتا ہے۔ بس بھائی! یہی مجھ دکھیاری عورت کی داستان ہے۔''

ارم اتنا بتا کر خاموش ہوگئی۔ کمرے میں چند ثانیے پُرسوچ سی خاموشی طاری رہی۔ اس کے بعد میں نے کسی خیال کے تحت ارم سے پوچھا۔

''کیا وہ ہیرا تم نے دیکھ رکھا تھا؟ میرا مطلب ہے تمہارے شوہر بشام کے پاس تھا تو یقیناً اس نے تمہیں بھی دیکھنے کو دیا ہوگا؟''

''ہاں۔'' ارم نے اثبات میں اپنا سر ہلایا۔

''اس ہیرے کو دریافت کرنے والے پروفیسر کریم بخش نے جو نام دے رکھا تھا وہ تمہیں معلوم ہے؟''

''ہاں۔'' ارم نے پھر اپنے سر کو اثباتی جنبش دی اور تب ہی میں نے فوراً کہا۔

''طلسم نور ہیرا......؟''

''ہاں...... ہاں! شہزی بھائی! بالکل یہی نام تھا اس ہیرے کا مگر......''

میں اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑا ہوا اور پھر اپنی شرٹ کے نیچے اور پینٹ کی بیلٹ میں اُڑسے ہوئے کپڑے کی گانٹھ میں بندھے طلسم نور ہیرے کو کھول کر اپنی ہتھیلی پر رکھا اور اس کے سامنے کر دیا۔ ہیرے کو دیکھ کر ارم کی آنکھوں میں شدید حیرت کے تاثرات ابھرے۔ اس کا منہ کھلا رہ گیا تھا۔ وہ یک ٹک اسے دیکھتی رہی پھر اٹکتے ہوئے لہجے میں بولی۔

''ی ی...... یہ تت...... تمہارے پاس کک...... کیسے آیا؟''

''ششش......'' میں نے اپنے ہونٹوں پر اُنگلی رکھی۔ ''تمہیں دل سے بہن کہا ہے تو سمجھتا بھی ہوں...... اب تم بھی اس بھائی کا مان رکھو گی اور یہ راز اپنے تک ہی محدود رکھو گی۔ یہ میں نے تمہیں اسی لیے دکھایا ہے تاکہ تمہیں میری باتوں کا یقین آجائے جو ابھی میں تم سے کہنے والا ہوں۔''

یہ کہہ کر میں نے ہیرا دوبارہ کپڑے کی گانٹھ میں بند کر کے شرٹ کے نیچے بیلٹ میں اڑس لیا اور کرسی پر بیٹھ گیا۔

''ارم بہن! اب میں تم سے جو کچھ کہنے والا ہوں وہ تم نے بڑے حوصلے اور خاموشی کے ساتھ مگر بہ غور سننا ہے۔'' کہتے ہوئے میں نے ڈھیرے ڈھیرے مگر مختصر اَلفظوں میں وہ سب بتا دیا جو صرف اس کے شوہر بشام کی اس ہیرے کو ملک دشمنوں سے بچانے کی تگ و دو اور اپنی جان کی قربانی تک محدود تھا۔

ارم، اپنے شوہر بشام کے عبرت ناک انجام اور اس ہیرے کی کتھا سن کر جیسے ایک دم سکتے میں آگئی جبکہ ہیرے کے حصول کے سلسلے میں بھی مختصراً میں نے یہی بتایا تھا کہ ہم نے یہ کس طرح ملک دشمنوں سے حاصل کیا تھا اور اس میں بھی بشام کی رہنمائی کا ہی دخل تھا، نیز اب ہم یہ ہیرا حکومت کے ذمے دار اہلکاروں کے حوالے کرنے کے ساتھ ساتھ خراجِ تحسین کے طور پر تمہیں بھی اتنا انعام دلوانے کی کوشش کریں گے جس کا تم اور تمہارے بچے حق رکھتے ہیں۔

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

ارم ہچکیاں لے کر رو پڑی تھی۔ ایسے میں اول خیر نے شکیلہ کو مخصوص اشارہ کیا اور وہ جلدی سے اُٹھ کر ارم کے پاس چلی گئی اور اسے سنبھالا دیتی ہوئی چارپائی پر لے آئی اور اپنے قریب بٹھا کر اسے تسلیاں دینے لگی، کمیل دادا اُٹھ کر ارم والی خالی کرسی پر آبیٹھا تھا۔ کمرے کی فضا ایک بار پھر مغموم سی ہوگئی تھی۔ وہ دونوں بچے بھی کافی دیر بیت جانے کے باعث دوبارہ معصوموں کی طرح ہمارے کمرے کی چوکھٹ میں آن کھڑے ہوئے تھے اور سراسیمہ سی نظروں سے ہمیں گھورے بھی جا رہے تھے مگر پھر اپنی ماں کو روتے دیکھ کر لڑکے نے ہمت کی اور اندر آگیا اور اپنی ماں کے پاس آن کھڑا ہوا۔ میں نے اسے قریب بلا کر پیار کیا جبکہ اول خیر نے دروازے پر کھڑی بچی کے سر پر شفقت بھرا ہاتھ پھیر کر اسے پیار کیا اور اندر لے آیا۔

ارم نے روتے ہوئے اپنے دونوں بچوں کو خود سے لپٹا لیا۔ یہ رقت آمیز منظر دیکھ کر ہم چاروں بھی مغموم سے ہو گئے۔

''حوصلہ پکڑو میری بہن!'' بالآخر میں نے اپنے اندر کے بوجھل پن پر قابو پاتے ہوئے اس سے کہا۔

''ہمارے ہوتے ہوئے تمہیں کسی سے خوف زدہ ہونے اور پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔'' پھر ایک لمحے توقف کے بعد کسی خیال سے پوچھا۔

''تمہارا بشام مرحوم کے سوا اور کوئی ہے؟ میرا مطلب ہے، تمہارا کوئی عزیز یا بھائی وغیرہ؟''

''نہیں بھائی! میرا..... بشام کے سوا دنیا میں کوئی نہیں تھا۔''

ارم نے غمگین سے لہجے میں کہا تو میں بولا۔ ''ٹھیک ہے پھر تم ہمارے ساتھ چلو، یہاں اب تمہارا اکیلے رہنا یوں بھی مناسب نہیں ہوگا۔''

''تمہارا شکریہ بھائی!'' ارم نے دھیرے سے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ ''میں اِدھر ہی ٹھیک ہوں..... پڑھی لکھی ہوں، اب بھی محلے کے بچوں کو ٹیوشن پڑھا کر گزارا کر لیتی ہوں۔''

''دیکھو بہن!'' کمیل دادا نے کہا۔ ''ابھی تھوڑی دیر پہلے میں نے تم سے جو کہا تھا تم نے شاید اس پر غور نہیں کیا۔ ہم چاروں کا بھی آپس میں کوئی رشتہ نہیں ہے، لیکن ہم چاروں کا ساتھ کسی خونی رشتے سے کم بھی نہیں ہے۔ اس میں تم بھی شامل ہو جاؤ گی تو کون سا فرق پڑ جائے گا؟ اور پھر ہم تو تمہیں اور تمہارے ان دونوں معصوم بچوں کو ان کا حق اور جائز مقام دلانے کا عہد بھی کر چکے ہیں۔ شہزی نے اس بیش قیمت اور قومی امانت کی بازیابی کا کریڈٹ مرحوم بشام بھائی کو ہی دینے کا حتمی فیصلہ..... کر لیا ہے جو اس کا حق بھی تھا۔''

کمیل دادا کی بات پر ارم سوچ میں پڑ گئی تو شکیلہ نے بھی اسے سمجھایا۔

''ارم بہن! یہاں رہو گی تو شاہنواز تمہارا اور تمہارے بچوں کا جینا دوبھر کر دے گا، یوں بھی وہ اب تک تم لوگوں پر عرصۂ حیات بھی تنگ کر چکا ہے۔''

''تم لوگوں کا خلوص اپنی جگہ مگر میں کسی پر بوجھ نہیں بن سکتی۔'' اس نے کہا۔

''تم کسی پر بھی بوجھ نہیں بنو گی بہنا!'' میں نے پیار سے سمجھایا۔ ''ہم تمہاری جو مدد کریں گے تو تم پر کوئی احسان نہیں کریں گے۔ تم اس کا حق رکھتی ہو۔ حکومت انعامات کے ضمن میں تمہاری بھرپور مدد کرے گی۔ یہ ملکی اور قومیت کا معاملہ ہے۔ تمہارے لیے ایک قابلِ فخر اعزاز کا سوال ہے۔''

''بھائی! یہ تو تم لوگوں کا سچا جذبۂ انسانیت ہے، ورنہ تم لوگوں کو کیا پڑی تھی کہ ایک غریب دکھیاری کے لیے اتنا دردِ سر مول لیتے۔'' ارم بولی۔

''کوئی دردِ سر نہیں۔ بس فیصلہ ہو گیا بہن! اب تم ہمارے ساتھ چلو گی مگر خود مختار بن کر.....'' اول خیر بولا۔

''اور یہ خیال بھی اپنے دل سے نکال دو کہ تم کسی پر بوجھ بنو گی۔ شہزی بھائی کو تم نہیں جانتیں، وہ بے شک عمر میں ہم سے چھوٹا ہے مگر ہم اسے اپنا بڑا کہتے ہیں، اس لیے کہ وہ دل کا بڑا ہے اور اپنے کام کا بھی۔ ابھی ایک فیصلہ کرو مگر سوچ لینا کہ اس معذرت اور معافی کے ساتھ کہ تم یہاں بالکل غیر محفوظ ہو۔ تمہارے ساتھ دو چھوٹے معصوم بچے ہیں، خود تم جوان اور اکیلی ہو۔ ایسے میں شاہنواز جیسے درندے.....''

''وہ بہت خطرناک اور بااثر آدمی ہے۔'' ارم نے فوراً کہا۔ ''مم..... مجھے تو ڈر ہے کہ کہیں اس کے آدمی تم لوگوں کو بھی.....'' ابھی اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ اچانک دروازے پر کسی نے زور زور سے دستک دی۔ ہم سب چونک گئے۔ ارم کے چہرے سے یک دم ہی ہراس مترشح ہونے لگا۔ تاہم وہ فوراً بولی۔

''آ آ..... میں دیکھتی ہوں جا کر.....''

''تم ٹھہر جاؤ بہن! ہم دیکھ لیتے ہیں، باہر کون ہے؟'' میں نے کہا تو وہ انکار میں سر ہلا کر بولی۔

''نہیں شہزی بھائی! مجھے ہی دیکھنے دیں۔'' میں چپ رہا۔ ارم کمرے سے نکلی۔ ہم کمرے میں کھڑے ارم کو صحن

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

سے دروازے کی طرف جاتا دیکھتے رہے۔ ارم نے دروازہ کھولے بغیر ہی اندر سے پوچھا۔

''کون......؟''

''دروازہ کھولو مائی! اندر کون لوگ آئے ہوئے ہیں؟'' باہر سے کسی کی بھاری اور کھرکھراتی ہوئی آواز ابھری۔ صحن مختصر ہونے کے باعث میرے کانوں تک بھی یہ کرخت سی مردانہ آواز آئی تھی۔ ارم کے لیے شاید یہ آواز غیر شناسانہ تھی۔ کیونکہ دوسرے ہی لمحے میں نے اسے فکرمند سا محسوس کیا۔

''بھبھ...... اندر میرے کچھ عزیز رشتے دار آئے ہوئے ہیں؟''

''رشتے دار......؟ اور تیرے......؟''...... ''وہی کرخت سی بھاری مردانہ آواز ابھری۔ جس میں کوٹ کوٹ کر طنز اور ناگواری بھری ہوئی تھی۔ ''میں کہتا ہوں دروازہ کھولو اور انہیں باہر نکالو...... ہم اُن سے بات کرنا چاہتے ہیں، ورنہ......!'' دھمکی آمیز انداز میں جملہ دانستہ اُدھورا چھوڑا گیا تو ارم نے آگے بڑھ کر لرزتے ہاتھوں سے دروازے کی کنڈی کھول دی۔

میں ہونٹ بھینچے کھڑا دروازے کی طرف گھورتا رہا۔ دروازہ کھلتے ہی ایک موٹا تگڑا اور رکیم شحیم سا آدمی اندر داخل ہوگیا۔ ارم اسے راستہ دینے کے لیے پہلے ہی ایک طرف جا کھڑی ہوئی تھی۔ اس کے عقب میں تین افراد اور بھی تھے۔ دو کو تو میں دیکھتے ہی چونکا تھا۔ یہ وہی دو مشکوک اجرک پوش تھے، جن سے میں نے اخبار لیا تھا اور تبھی سے وہ ہمارے پیچھے لگ گئے تھے۔ تیسرا کوئی اور تھا۔

ان کے چہروں سے جارحانہ انداز مترشح ہوتا تھا۔ ان چاروں نے کھلے گھیر والی شلوار قمیصیں پہن رکھی تھیں اور کوئی بعید نہ تھا کہ ان کے بغلی ہولسٹرز میں اسلحہ بھی ہوتا۔ وہ کرخت آواز والا لمبا تڑنگا شخص خاصا خونخوار اور کوئی چھٹا ہوا بدمعاش ہی نظر آتا تھا۔ اس کے بال بڑے تھے، قلمیں اس کے سیاہ رُوگالوں تک لمبی تھیں، گھنی مونچھیں اور چہرے پر چھدری سی داڑھی تھی۔

وہ میری ہی عمر کا نظر آتا تھا۔ آنکھوں سے آن کی آن میں مدِمقابل کو پچھاڑ دینے کی وحشت ہلکورے لے رہی تھی۔ اس کے ہونٹ موٹے اور رنگ کالا تھا۔ بالوں میں تیل چپڑا ہوا تھا۔

انہیں اس طرح دیدہ دلیری سے اندر آتے دیکھ کر میں بھی اپنے آپے میں نہ رہا اور کمرے کے کھلے دروازے سے باہر صحن میں آگیا اور پورے قد کے ساتھ اس بدمعاش کے بالکل آمنے سامنے جا کھڑا ہوا۔ مجھے اس طرح سامنے آتا دیکھ کر اس بدمعاش کی موٹی موٹی وحشت زدہ سی آنکھوں میں پہلے تو ایک عجیب سا رنگ آکر گزرا اس کے بعد ان میں نفرت اور جنگجوانہ سی چمک لہرائی۔

''کون ہو تم لوگ......؟ اور اس طرح کیوں اندر گھسے چلے آئے ہو؟'' میں نے اس بدمعاش کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اسی تلخی اور بغیر کسی دباؤ والے لہجے میں کہا۔ اسی اثنا میں کبیل دادا اور اول خیر بھی میرے پیچھے کمرے سے نکل آئے تھے۔ وہ میرے دائیں بائیں سینہ تانے کھڑے ہوگئے تھے۔

میرا تجربہ تھا کہ ایک اکیلی، کمزور اور مجبور، دکھوں کی ماری ہوئی عورت پر اس طرح کی سینہ زوری کرنے والے فطرتاً بزدل ہوتے ہیں۔ اکڑتے بھی ہیں تو کسی کی شہ پر...... ورنہ اپنی حیثیت میں یہ کچھ نہیں ہوتے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ ایک تو میرے اس طرح کے بغیر مرعوب ہوئے انداز اور لہجے کی درانہ وار تلخی اور اس کے بعد کبیل دادا اور اول خیر کے تیوروں کو دیکھتے ہی بھانپنے کے انداز میں اسے چند ثانیوں کے لیے چپ سی کھا گئی تھی مگر دوسرے ہی لمحے اس کے سر پر وہی خرانٹ پن سوار ہوگیا۔ اس کے موٹے اور بھدے نقوش والے چہرے کے تاثرات کریہہ ہوئے۔ ایک نظر کبیل دادا اور اول خیر پر ڈالنے کے بعد وہ اکھڑپن سے بولا۔

''یہی سوال ہم نے تم سے پوچھا ہے جواب دو مجھے کہ......تم لوگ......''

''تم ہم سے یہ سوال پوچھنے کا حق ہی نہیں رکھتے مسٹر!'' اس بار کبیل دادا نے فوراً اس کی بات کاٹ کر اور دبدبے والے انداز میں کہا تو اس کی موٹے ڈیلوں والی آنکھوں میں جارحانہ چمک کسی آندھی کی طرح اُمڈی مگر دوسرے ہی لمحے اسی مشکوک اجرک پوش نے مداخلت کر ڈالی اور دو قدم آگے بڑھتے ہوئے اپنے اس سردار نما ساتھی سے مخاطب ہو کر بولا۔

''اڑے سائیں ٹھہرو...... یہ تو وہی لوگ ہیں جن سے میں اور جانو جرمن مل چکے ہیں۔ مجھے بات کرنے دو اِن سے ذرا......''

یہ اجرک پوش آدمی یا تو واقعی مصالحتی مزاج کا حامل تھا یا پھر کسی معاملہ فہمی کی آڑ میں کوئی چالا کی چلنا چاہتا تھا۔ اس کا دوسرا ٹوپی پوش ساتھی جسے اس نے جانو جرمن کے

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

JBD

جہانگیر بکس

نسیم حجازی کے شاہکار تاریخی ناول

آخری معرکہ -/550
جب سومنات کے بڑے بت کو توڑنے کی باری آئی تو ہندو راجے اور پجاری سلطان کے قدموں میں گر پڑے اور کہا ہم اس کے وزن کے برابر سونا دینے کیلئے تیار ہیں۔ سلطان کا چہرہ غصے سے تمتما اٹھا اور اس نے جواب دیا "میں بت فروش نہیں، بت شکن کہلانا چاہتا ہوں" نسیم حجازی کی ایک ولولہ انگیز تحریر

اندھیری رات کے مسافر -/475
اندلس میں مسلمانوں کی آخری سلطنت غرناطہ کی تباہی کے دلخراش مناظر، بوڑھوں، عورتوں اور جوانوں کی ذلت و رسوائی کی المناک داستان

ثقافت کی تلاش -/300
نام نہاد ثقافت کا پرچار کرنے والوں پر ایک تحریر، جنھوں نے ملک کی اخلاقی و روحانی قدروں کو طبلوں کی تھاپ، گھنگھروؤں کی چھنا چھن کے ساتھ پامال کیا

قیصر و کسریٰ -/625
ظہور اسلام سے قبل عرب و عجم کے تاریخی، سیاسی، اخلاقی، تہذیبی اور مذہبی حالات زندگی اور فرزندان اسلام کے ابتدائی نقوش کی داستان

اور تلوار ٹوٹ گئی -/550
شیر میسور (ٹیپو سلطان شہید) کی داستان شجاعت، جس نے محمد بن قاسم کی غیرت، محمود غزنوی کے جاہ و جلال اور احمد شاہ ابدالی کے عزم و استقلال کی یاد تازہ کر دی

گمشدہ قافلے -/500
انگریزوں کی اسلام دشمنی، بنیے کی عیاری، ... اور سکھوں کی معصوم بچوں اور مظلوم عورتوں کو خون میں نہلانے کی لرزہ خیز داستان

داستانِ مجاہد -/300
فتح دیبل کے بعد راجہ داہر نے راجوں مہاراجوں کی مدد سے دو سو ہاتھیوں کے علاوہ 50 ہزار سوار اور پیادوں کی نئی فوج بنائی، فاتح سندھ کی معرکۃ الآرا داستان

پردیسی درخت -/450
اسلام دشمنی پر مبنی ہندوؤں اور سکھوں کے گٹھ جوڑ کی کہانی جنھوں نے مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کیلئے تمام اخلاقی حدود کو پامال کرنے سے بھی گریز نہ کیا

یوسف بن تاشفین -/500
اندلس کے مسلمانوں کی آزادی کیلئے آلام و مصائب کی تاریک راتوں میں امید کی قندیلیں بلند کرنے والے گمنام سپاہی کی داستان

معظم علی -/475
لارڈ کلائیو کی اسلام دشمنی، میر جعفر کی غداری، بنگال کی آزادی و حریت کے ایک مجاہد معظم علی کی داستان شجاعت

خاک اور خون -/550
سسکتی، تڑپتی انسانیت، قیامت خیز مناظر، تقسیم برصغیر کے پس منظر میں داستان خونچکاں

کلیسا اور آگ -/450
فرڈی نینڈ کی عیاری، مسلمان سپہ سالاروں کی غداری، سقوط غرناطہ اور اندلس میں مسلمانوں کی شکست کی داستان

قافلۂ حجاز -/599
راہ حق کے مسافروں کی ایک بے مثال داستان

محمد بن قاسم -/425
عالم اسلام کے 17 سالہ ہیرو کی تاریخی داستان، جس کے حوصلے اور حکمت عملی نے ستاروں پر کمندیں ڈال دیں

پورس کے ہاتھی -/300
1965 کی جنگ کے پس منظر میں بنیوں اور برہموں کے سامراجی عزائم کی شکست کی داستان، جنھیں ہر محاذ پر منہ کی کھانی پڑی

انسان اور دیوتا -/450
برہمنی سامراج کے ظلم و بربریت کی صدیوں پرانی داستان، جس نے اچھوتوں کو رد عمل اختیار کرنے پر مجبور کیا

پاکستان سے دیارِ حرم تک -/300
تاریخی پس منظر میں لکھا جانے والا ایک دلچسپ سفرنامہ حجاز

آخری چٹان -/450
سید خوارزم جلال الدین خوارزمی کی داستان شجاعت جو تاتاریوں کے سیل رواں کے لیے ایک چٹان ثابت ہوا

سو سال بعد -/225
گاندھی جی کی مہاتمائیت، اچھوتوں اور مسلمانوں کے خلاف سامراجی مقاصد کی منہ بولتی تصویر

سفید جزیرہ -/325
بحرالکاہل کے کسی نامعلوم جزیرے کی داستان

شاہین -/475
اندلس میں مسلمانوں کے نشیب و فراز کی کہانی

WORLD TIMES
جہانگیر
اردو لغت
(جامع ترین)
ملفوظی طریقے سے تلفظ کے اندراج کے ساتھ اردو زبان کا پہلا لغت

جہانگیر بک ڈپو
022-2780128 | 042-35757086
042-37220879 | 051-5539609 | 021-32765086

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

عجیب نام سے مخاطب کیا تھا، میری عقابی نظروں نے اس کی بھی ایک موہوم سی حرکت کو تاڑا تھا۔اس نے ہولے سے اپنے سردار نما ساتھی کا بازو دبایا تھا۔

''اڑے بابا! تھوڑی غلط فہمی ہوگئی ہے وہ دور ہو جانی چاہیے۔ میرا خیال ہے ہمیں آرام سے بات کر لینی چاہیے۔'' اجرک پوش میری طرف دیکھ کر بولا۔

''ارم بہن! تم اندر جاؤ......'' میں نے اس کی بات جیسے سنی ان سنی کرتے ہوئے قریب ڈری سہمی کھڑی ارم سے کہا اور وہ اپنا سر جھکائے اندر چلی گئی۔

''ہاں! بولو...... کیا بات ہے؟'' میں اس بدمعاش ٹائپ کو بری طرح نظرانداز کرتے ہوئے اس اجرک پوش سے مخاطب ہوکر بولا۔ ''لیکن...... ہمیں تم لوگوں کا یہ انداز پسند نہیں آیا کہ تم لوگ اس طرح کسی شریف خاتون کے گھر میں گھسے چلے آئے ہو، یہ غیر قانونی ہی نہیں غیر اخلاقی حرکت ہے، خیر، بات کرو......''

میری بے خوفی اور بدستور جوابی کارروائی نے اس لمبے تڑنگے بدمعاش کو اندر ہی اندر کھولا دیا تھا مگر چونکہ شاید اس ٹوپی پوش نے اس کا ایک بازو ہنوز دبائے رکھا تھا اسی لیے وہ خاصے ضبط سے کام لینے پر مجبور تھا۔

''اب اِن باتوں کو چھوڑو بابا! یہ بتاؤ کہ تم لوگ کون ہو؟ اور اس عورت کے کیا لگتے ہو؟ اس کے بعد ہم بھی تمہیں اپنے بارے میں بتا دیں گے، بات ادھر ہی ختم ہو جائے گی۔''

اتنی ڈوز دینا کافی تھا۔ لہٰذا میں نے بھی قدرے مصالحانہ رویہ اختیار کرتے ہوئے جواباً اس سے کہا۔ ''ہم بشام چھلگری کے دوست ہیں۔ وہ ہمارے لیے بھائیوں جیسا تھا مگر بدقسمتی سے وہ اب اس دنیا میں نہیں رہا ہے۔ یہی اطلاع کرنے ہم پنجاب سے یہاں آئے تھے۔ کیونکہ ارم بہن کو مطلع کرنا ہمارا فرض بنتا تھا۔''

میرے اس انکشاف نے اُن کے بشروں کے تیور ہی بدل دیے۔ وہ آتی جاتی بجلی کے بلبوں کی طرح جیسے جلنے بجھنے سے لگے۔ چند ثانیے تو غیر یقینی اور ملے جلے تاثرات ان کی آنکھوں سے ہویدا ہوتے رہے، اس کے بعد اجرک پوش مجھ سے بولا۔

''کیا یہ بات تم پورے وثوق اور یقین سے کہہ رہے ہو؟''

''اتنی بڑی بات میں جھوٹ یا بغیر کسی تصدیق کے کر بھی نہیں سکتا۔'' میں نے ٹھنڈی ہوئی متانت سے جواب دیا پھر بولا۔'' اب تم لوگ اپنے بارے میں بتاؤ...... کون ہو تم؟''

''ٹھہرو بابا! ٹھہرو...... ابھی ہماری بات پوری کہاں ہوئی ہے؟'' اس بار ٹوپی پوش نے مجھ سے مخاطب ہوکر کہا تو شاید کمیل دادا کو غصہ آگیا، ٹوپی پوش کو مزید بولنے کا موقع دیے بغیر کہا۔

''ہماری بات پوری ہو چکی ہے...... اب تم لوگوں کو ہمارے سوالوں کا جواب دینا ہے۔''

''ٹھیک ہے بابا، ٹھیک ہے، بتاتے ہیں......'' ٹوپی پوش جانو جرمن کے بجائے اجرک پوش نے اپنا سر ہلاتے ہوئے کہا۔

''ہم زمیندار شاہنواز خان کے آدمی ہیں۔ وہ یہاں کا ایک بڑا معزز اور معتبر وڈیرا ہے...... درحقیقت ہمیں خود بھی بشام کی تلاش تھی لیکن......'' وہ کچھ سوچ کر ذرا رکا پھر بولا...... ''ٹھیک ہے، بہتر ہوگا کہ تم لوگ ابھی ہمارے ساتھ شاہنواز خان کی اوطاق میں چلو تو باقی باتیں وہیں آرام سے بیٹھ کر کر لیتے ہیں۔''

اس کی بات پر میں اور کمیل دادا ذرا سوچتے بن گئے تو اول خیر نے پہلی بار مداخلت کرتے ہوئے ان سے کہا۔

''ہمیں شاہنواز خان سے ملنے میں کوئی اعتراض نہیں ہے، لیکن ابھی ہم ان سے نہیں مل سکتے۔ اس کا فیصلہ ہم بعد میں سوچ کر کریں گے۔''

''تم لوگوں کو اسی وقت وڈے سائیں (شاہنواز خان) کی اوطاق میں چلنا ہوگا۔ تم نہیں جانتے وہ کون ہے اور اس علاقے میں کیا حیثیت رکھتا ہے۔'' اس بار اسی لمبے تڑنگے بدمعاش نے منہ کھولا تھا۔ شاید اپنے ''وڈے سائیں'' کی بڑائی میں اول خیر کی اس بات نے اس کی انا کو دھچکا لگایا تھا۔

''وہ جو کوئی بھی ہو، ہم ان کا احترام کرتے ہیں لیکن اس طرح کی زور زبردستی ہوگی تو گفتگو کا وہ ماحول نہیں بن پائے گا جیسا تم لوگ چاہتے ہو۔'' میں نے کہا۔

''چنگا بابا چنگا......'' اجرک پوش نے کہا۔ ''بہتر ہوگا کہ آج ہی ہمارے وڈے سائیں سے ملاقات کر لو...... یہ معاملہ ایسا ہی نازک ہے اس میں دیر نہیں ہونی چاہیے اور جتنی جلدی نمٹ جائے تو یہ سب کے لیے اچھا ہوگا۔ ہم ابھی چلتے ہیں اور دو تین گھنٹوں بعد ہمارا آدمی گاڑی میں یہاں

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

آجائے گا لینے کے لیے۔''

اس کے بعد وہ ہماری کوئی بات سنے بغیر نکل گئے۔

اول خیر نے آگے بڑھ کر دروازہ بند کیا اور پلٹ کر اپنا سر جھٹکتے ہوئے بولا۔

''ہونہہ! سب کو اپنی رعایا سمجھ رکھا ہے ان کے وڈے سائیں نے......'' میں اور کبیل دادا طنزیہ انداز میں مسکراتے ہوئے کمرے کی طرف پلٹے تو ارم اور شکیلہ وہاں کھڑی ہماری طرف دیکھ رہی تھیں۔ ارم کے ساتھ اس کے دونوں بچے بھی لگے کھڑے تھے۔ میں نے غور کیا اب پہلے کی نسبت ان تینوں کے چہروں پہ خوف کے بجائے کچھ بشاشت اور طمانیت کے آثار تھے۔ ارم نے بیٹے کا نام توصیف اور بیٹی کا شمائلہ بتایا تھا۔

ہم اندر کمرے میں آگئے۔

''شہزی! میرا خیال ہے ہمیں ان سے پنگا لیے بغیر کنی کترا کر یہاں سے نکل جانا ہوگا۔'' کبیل دادا کرسی پر پھیلتے ہوئے بولا۔ ''کیونکہ ہمارے پاس وہ نادر و قیمتی ہیرا ابھی موجود ہے۔ کہیں کسی لڑائی جھگڑے میں یہ پھر سے ہمارے ہاتھ سے نکل نہ جائے۔''

''مجھے پورا یقین ہے کہ یہ زمیندار شاہنواز خان عرف وڈا سائیں...... اسی ہیرے کے پیچھے پڑا ہوا ہے ابھی تک۔'' شکیلہ نے بھی رائے دی۔

''یوں بھی وڈے سائیں سے ملنا کوئی ضروری نہیں ہے ہمارا۔'' اول خیر نے بھی رائے دی تو میں نے کہا۔

''میرا خیال ہے کہ ضروری ہے۔'' میں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

''کیا؟'' شکیلہ کے منہ سے نکلا۔

''وڈے سائیں سے ملاقات کرنا۔'' میں نے جواب دیا۔ ''آخر پتا تو چلے کہ اس کے عزائم کیا ہیں؟ اسے نظروں میں لانا ضروری ہے۔''

''او خیر...... کا کے! سوچ لے، کہیں یہ ملاقات مہنگی نہ پڑ جائے۔'' اول خیر بولا۔

''تم لوگ ہرگز اس سے نہیں ملو گے۔'' بالآخر ارم نے کہا۔ ''وہ تمہیں ضرور کوئی نقصان پہنچانے کی کوشش کرے گا۔ تم نہیں جانتے، وڈے سائیں کے یہ چاروں حواری یہاں سے تمہارے لیے اپنے دل میں بغض لے کر گئے ہیں اور شاہنواز خان کو نمک مرچ لگا کر بتائیں گے۔''

''تم فکر نہ کرو بہن! ہم بھی اتنے تر نوالہ نہیں ہیں۔'' کبیل دادا نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ''شہزی وہی کرے گا جو اس کے دوراندیش ذہن میں موجودہ حالات کے مطابق اسے درست معلوم ہوگا۔''

''شاہنواز سے ملنے صرف میں اور اول خیر جائیں گے۔'' میں نے کہا۔ ''تم اور شکیلہ اِدھر ہی موجود رہو گے۔'' میں نے کبیل دادا کی طرف دیکھ کر کہا۔ ''تب تک تم ارم بہن کے ساتھ روانگی کی تیاری کا کوئی محفوظ پروگرام بناؤ گے۔''

اس کے بعد میں نے ارم سے مخاطب ہو کے کہا۔

''بہن! تمہاری ہمارے ساتھ روانگی میں کسی قسم کی دقت تو نہیں ہے؟''

''اتنی کوئی خاص تو نہیں۔ کل صبح میں اپنے دونوں بچوں کے اسکول سے لیونگ سرٹیفکیٹس نکلوا لوں گی اور تھوڑا بہت بینک کا کام ہوگا۔ باقی یہ گھر تو کرائے کا ہے۔ مالک مکان ایک عمر رسیدہ عورت ہے، پاس ہی رہتی ہے، اُسے اطلاع دینا ہوگی مکان خالی کرنے کی اور بس......'' ارم نے جواب دیا تو میں نے کہا۔

''یہ سارا کام تو آج بھی نمٹایا جاسکتا ہے۔ اس میں کیا مشکل ہے؟'' ارم سوچتی رہ گئی۔ وہ ابھی تک اپنے شوہر کی وفات کا سن کر مغموم سی ہو رہی تھی۔ شکیلہ اسے بدستور تسلیاں اور دلاسے...... دے رہی تھی۔ میں نے کبیل دادا اور شکیلہ سے کہا۔

''تم دونوں اسی وقت ارم بہن کے ساتھ نکل جاؤ اور یہ کام جلدی نمٹا لو۔ میں اور اول خیر اِدھر ہی بیٹھ کر وڈے سائیں کے آدمیوں کا انتظار کریں گے۔''

کبیل دادا فکرمند سا ہو گیا بولا۔ ''شہزی! وہ ہیرا ساتھ لے کر مت نکلنا۔ اسے اسی مکان کے کسی خفیہ گوشے میں رکھ جانا۔''

''میں یہ کام بہ آسانی کر لوں گا تم فکر مت کرو۔'' میں مسکرایا۔

''تم دونوں کا زمیندار شاہنواز خان کی اوطاق جانا خطرے سے خالی تو نہیں لیکن......'' کبیل دادا کی بات میں نے کاٹ دی اور بولا۔

''مجھے اس کا احساس ہے۔ اسی لیے میں تمہیں اور شکیلہ کو ساتھ لے جانے کے بجائے صرف اول خیر کو لے جا رہا ہوں...... بے فکر رہو، ہم محتاط رہیں گے۔''

''ہمارے پاس اسلحہ نام کی کوئی شے بھی نہیں ہے جو تھا وہ چھوڑ چکے ہیں۔''

''کوئی پروا نہیں...... دیکھا جائے گا۔'' میں کہا۔

تھوڑی دیر بعد ارم نے مختصر سی تیاری باندھی، کچھ

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

ضروری کاغذات سمیٹے، بچوں کو لیا، شٹل کاک ٹائپ برقع پہنا اور پھر کبیل دادا اور شکیلہ کے ساتھ گھر سے نکل گئی۔

میں اور اول خیر مکان میں اکیلے رہ گئے اور کافی دیر تک باتیں کرتے رہے۔ وقت گزرتا رہا۔ اس دوران میں نے زہرہ بانو سے فون پر رابطہ کر کے موجودہ صورتِ حال سے مختصراً آگاہ کیا۔ وہ کچھ فکرمند تو ہوئی، مگر مزید کچھ نہ بولی۔ تاہم سلسلہ منقطع کرنے سے تھوڑی دیر پہلے اس نے یہ ضرور کہا۔ مناسب ہو سکے تو کسی پھڈے میں ٹانگ پھنسانے سے بہتر ہوگا کہ جان چھڑا کر نکل آنا۔ میں نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا تھا کہ وہ فکر نہ کرے۔ یہ بات میرے ذہن میں بھی تھی مگر دشمنوں کی ناک کے نیچے سے نکلنے کے لیے ان کا سامنا کرنا بھی ضروری ہے۔

مزید اور بھی کافی وقت بیت گیا، مگر وڈے سائیں کے آدمی ہمیں لینے کے لیے نہیں آئے۔ اس پر مجھے سخت اچنبھا ہوا اور ہم سے بڑھ کر یہ سن کر کبیل دادا وغیرہ کو حیرت ہوئی تھی جب بعد سہ پہر وہ سارے کام کروا کے بہ خیریت لوٹے تھے۔

''بڑی عجیب بات ہے یہ......'' شکیلہ بڑبڑائی۔ ارم کو بھی حیرت ہوئی تھی۔ کبیل دادا نے تو آتے ہی مجھ سے پوچھا تھا۔

ارم اپنے سارے مذکورہ کام نمٹا آئی تھی۔ واپسی میں اس نے مالک مکان خاتون سے بھی ملاقات کی تھی۔ اس نے اسے ایک تالا چابی دے دی تھی کہ جب بھی جاؤ تو یہ والا تالا مکان میں لگا دینا۔

''چلو، اچھا ہوا اس امتحان میں پڑے بغیر معاملہ ٹل گیا۔'' اول خیر بولا۔ ''مجھے تو لگتا ہے کہ شاہنواز خان اپنے حواریوں کی باتوں سے ہمارے بارے میں اندازہ لگا چکا ہوگا کہ ہم دبنے یا ''تھلے لگن'' والے لوگ نہیں ہیں۔ وہ چپکا ہو کے بیٹھ گیا ہوگا۔''

''ایسا نہیں ہے اول خیر......'' کبیل دادا نے اچانک پُرخیال لہجے میں کہا۔ ''کیا خبر وہ کوئی اور کھچڑی پکانے میں مصروف ہو......''

صرف میں نے کبیل دادا کی اس بات سے اتفاق کیا تھا بولا۔ ''یہ ممکن ہے کہ شاہنواز کسی اور طریقے سے اس صورتِ حالات سے نمٹنے کا خفیہ ارادہ رکھتا ہو۔''

''خفیہ بھی اور مجرمانہ بھی......'' شکیلہ نے ٹکڑا لگایا۔

''مگر ہم اُسے کب موقع دینے والے ہیں؟'' اول خیر بولا۔ ''سارے کام نمٹا تو لیے ہیں، بس آج رات ہی چپ چپاتے کوچ کر جاتے ہیں۔ ارم بہن کا اتنا کوئی خاص زیادہ سامان نہیں ہے۔ پرائیوٹ ٹیکسی کروا کے جتنی جلد ہو سکے اس علاقے سے تو کم از کم نکل ہی جاتے ہیں۔''

ارم کھانا بنانے میں مصروف ہو گئی۔ شکیلہ اس کے منع کرنے کے باوجود اس کی مدد کر رہی تھی۔ ارم مرغی کا سالن، روٹیاں اور وائٹ رائس بنا رہی تھی۔

اول خیر دونوں بچوں کے ساتھ ''بچہ'' بنا اُن کا دل بہلانے میں مصروف تھا۔ میں اور کبیل دادا کمرے میں بیٹھے باتوں میں مصروف تھے۔

رات کے نو بجے تھے۔ شاہنواز کے آدمی نہیں آئے تھے۔ ارم نے کھانا اچھا بنایا تھا۔ ہم نے خوب پیٹ بھر کر کھایا۔

لاڑکانہ سے پنجاب کے لیے کوچز نہیں چلتی تھیں۔ اس کے لیے پہلے سکھر یا روہڑی تک کا سفر کرنا پڑتا تھا جو یہاں سے لگ بھگ دو گھنٹوں کی مسافت پر تھا، وہاں تک عام مسافر لاریاں اور ویگنیں جاتی تھیں جو ہر گھنٹے بعد روانہ ہوتی تھیں، کیونکہ وہاں کی سواریاں بہت ہوتی تھیں۔ ہم نے روہڑی یا سکھر پہنچ کر آگے ملتان تک کوچ یا ٹرین کا سفر جاری رکھنے کا ارادہ کر رکھا تھا۔

دس بجے تک ہم کھانے وغیرہ سے فارغ ہو چکے تھے۔ ارم نے اپنی تیاری کر لی تھی اور جو بھی ضروری سامان تھا وہ باندھ لیا تھا جو اتنا زیادہ نہ تھا، فقط ایک سوٹ کیس اور سفری بیگ۔ گیارہ بجے وہ سونے کے لیے اپنے دونوں بچوں کے ساتھ دوسرے کمرے میں چلی گئی، شکیلہ بھی اس کے ساتھ تھی جبکہ میں، اول خیر اور کبیل دادا اسی کمرے میں سونے کے لیے لیٹ گئے۔ ارم نے یہاں باہر صحن میں رکھی ہوئی ایک اضافی چارپائی ڈال لی تھی اور فرش پر رلی بچھا دی تھی۔ وہاں اول خیر لیٹ گیا تھا۔

گرمی اور حبس کے باعث کمرے کی ایک کھڑکی جو باہر کھلتی تھی، ہم نے کھولے رکھی تھی۔ چھت کا پنکھا چل رہا تھا۔ زیرو بلب نہ تھا، تاہم باہر کی اسٹریٹ لائٹ کی کچھ روشنی کھلی کھڑکی سے اندر آ رہی تھی۔

موجودہ حالات کے پیشِ نظر ہم نے فیصلہ کیا تھا کہ ہم میں سے کسی ایک کا جاگتے رہنا ضروری تھا۔ اس کے لیے پہلے دو گھنٹے میں نے اور بعد میں اول خیر اور کبیل دادا نے جاگنا تھا۔

اول خیر کے تو جلد ہی خراٹے گونجنے لگے تھے جبکہ کبیل دادا بھی شاید سینے پر ہاتھ رکھے سو گیا تھا، نیند سے

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

میری آنکھیں بھی بھاری ہونے لگی تھیں لیکن جانے کیا بات تھی کہ دل عجیب سی نامعلوم بے چینی کا شکار تھا۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ میرا بار بار دھیان اسی بات کی طرف جاتا تھا کہ شاہنواز کے آدمی جو ہمیں اپنے وڈے سائیں کی اوطاق میں لے جانے کے لیے بضد تھے، وہ ہمیں لینے کیوں نہیں آئے تھے؟

ابھی رات اتنی زیادہ نہیں گزری تھی۔ باہر گلی میں چند ایک لوگوں کے آنے جانے کی آہٹیں اور باتوں کی آوازیں آجاتی تھیں، کبھی کوئی زوردار قہقہہ بھی بلند ہوجاتا۔

اچانک باہر کسی گاڑی کے رکنے کی آواز ابھری۔ میرا دل یکبارگی زور سے دھڑکا۔ میں اُٹھ بیٹھا اور ابھی کمرے سے نکل کر صحن میں آیا ہی تھا کہ اچانک باہر سے دروازے کو زور زور سے پیٹا جانے لگا۔ آواز اس قدر زیادہ تھی کہ تقریباً سوئے ہوئے سبھی لوگ ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھے تھے۔ اول خیر اور کمیل دادا مجھے کمرے میں موجود نہ پا کر سب سے پہلے باہر کو لپکے تھے۔ میں اس وقت دروازے کی طرف جا کھڑا ہوا تھا۔

''کون ہے بھائی! اتنی زور زور سے دروازہ کیوں پیٹ رہے ہو؟''

''اڑے او...... اندر جو بھی ہے فوراً دروازہ کھولو، ورنہ توڑ دیا جائے گا...... پولیس نے مکان کو گھیرے میں لے رکھا ہے۔''

باہر سے ایک کڑک دار اور کرخت آواز ابھری۔ میں چونک پڑا۔ اول خیر اور کمیل دادا بھی یہ سن کر بری طرح چونکے تھے۔ ادھر میں نے پولیس کا نام سنتے ہی پل کے پل ایک فیصلہ کیا اور اپنی پینٹ سے بندھا طلسم نور ہیرا نکال کر پھرتی سے قریب کھڑی شکیلہ کی طرف اُچھال دیا اور وہ اسے کیچ کیے اندر کمرے کی طرف لپک گئی۔

متوقع اور غیر متوقع حالات کے پیدا ہونے پر میری پہلے سے ہی توجہ اسی نادر و قیمتی امانت پر مرکوز ہونے لگتی تھی، جسے ہم نے اپنی جان جوکھم میں ڈال کر حاصل کیا تھا۔

دوبارہ دستک ہوئی اور اس بار پولیس کا دروازہ توڑنے کا پورا ارادہ لگتا تھا کہ میں نے آگے بڑھ کنڈی گرا دی۔ دھڑ سے دروازہ کھلا اور چار پانچ مسلح وردی پوش پولیس والے اندر گھستے چلے آئے۔ انہوں نے آناً فاناً ہمیں اپنی گرفت میں لے لیا۔

''ی ی...... یہ کیا حرکت ہے؟'' میں نے چلّا کر کہا۔

...... انسپکٹر کی وردی میں ملفوف ایک درمیانی قامت کا شخص جس کا پیٹ وردی سے تھوڑا باہر کو آرہا تھا۔ اس کے سینے پر لگے ٹیگ پر میں نے اس کا نام رجب دین پڑھ لیا تھا۔ وہ میری جانب خرانٹ سی نظروں سے گھورتے ہوئے بولا۔

''ایسی حرکتیں تم جیسے مجرموں کے لیے ہی کی جاتی ہیں۔'' پھر اس نے سپاہیوں کو مقامی زبان میں کوئی حکم دیا۔ یہ مطلب ظاہر ہوتے ہی کہ ہمیں تھانے لے جایا جارہا تھا، کمیل دادا بولا۔

''انسپکٹر! تمہارے پاس اس غیر قانونی گرفتاری کے وارنٹ ہیں یا کسی کے کہنے پر تم یہ سب کر رہے ہو؟'' میں نے دیکھا، کمیل دادا کے یہ کہنے پر اس خرانٹ انسپکٹر کی جھلسی ہوئی رنگت والے چہرے پر ایک رنگ سا آکر گزرا اور پھر وہ چند قدم کمیل دادا کی طرف بڑھا۔ اس کے ہاتھ میں سیاہ رول تھا وہ اسے کمیل دادا کے فراخ سینے پر ٹھونک بجانے کے انداز میں مارتا ہوا بولا۔

''میرا نام انسپکٹر جمیل شاہ ہے اور میں خطرناک مجرموں کے سلسلے میں کسی وارنٹ کی ضرورت نہیں محسوس کرتا۔ اب تم اپنی زبان بند رکھو گے، ورنہ ادھر ہی تھانہ کھول دیا کرتا ہوں میں......''

''انسپکٹر صاحب! یہ میرے عزیز ہیں، کیا جرم کیا ہے انہوں نے؟'' اسی وقت ارم آگے بڑھ کر انسپکٹر جمیل شاہ سے مقامی زبان میں بولی تو انسپکٹر اس کی طرف چند لمحے بڑی قہر بار نظروں سے گھورتا رہا... پھر زہریلے لہجے میں بولا۔

''او...... مائی! تُو تو پہلے ہی ہماری نظروں میں مشکوک تھی۔ تیری باری بھی آئے گی، پہلے ان کا بیان لے لیا جائے۔''

اس کے بعد چند پولیس والوں نے گھر کی تلاشی لی اور یہ اطمینان کر لینے کے بعد کہ ہم تینوں کے علاوہ اور کوئی مرد گھر پر موجود نہ تھا، ہمیں ہتھکڑیاں پہنا کر باہر کھڑی موبائل میں سوار کرا دیا گیا۔ تھوڑی دیر بعد پولیس مجھے، کمیل دادا اور اول خیر کو لیے ایک خستہ حال سی پیلی اور سفید رنگ کی عمارت والے تھانے میں لے آئی جو لاڑکانہ شہر کے وسط میں ہی تھا۔

اول خیر اور کمیل دادا پریشان سے تھے اور میں اندر ہی اندر غصے سے کھول رہا تھا۔ میں زمیندار شاہنواز سے کسی اور ہی چال کی توقع کیے بیٹھا تھا مگر اس نے دوسرے رخ سے اپنی چال چلنے کی کوشش چاہی تھی۔ ورنہ بھلا پولیس کو کیسے ہمارا پتا چلتا؟ یہی کچھ سوچ کر میں نے فوراً بیدار مغزی

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

کا مظاہرہ کرتے ہوئے طلسم نور ہیرا شکیلہ کے حوالے کر دیا تھا۔ کیونکہ میں سمجھ گیا تھا کہ اس وقت صرف ہم تینوں ہی نشانے پر ہو سکتے تھے۔

تاہم مجھے انسپکٹر... رجب دین کی اس بدمعاشی اور دھونس دھاندلی پر بری طرح طیش آرہا تھا۔ ہمیں ابھی لاک اَپ تو نہیں کیا گیا تھا مگر ایک قدرے کشادہ کمرے میں لے جا کر کھڑا کر دیا تھا۔ اس دوران میری کھولتی ہوئی کیفیات کو بھانپتے ہوئے کبیل دادا نے میرے کان میں ایک سرسراتی سرگوشی ضرور کر ڈالی تھی۔

''شہزادے! اس انسپکٹر کے ساتھ زیادہ گرما گرمی مت کرنا۔ یہ مجھے شاہنواز خان کا ہی راتب خوار لگتا ہے اور...... یہ ان کا ہی علاقہ ہے، ہمارے ساتھ کچھ بھی کیا جا سکتا ہے۔''

لیکن مجھے ان ہتھکڑیوں سے بڑی سبکی اور تذلیل کا احساس ہو رہا تھا، یہی سبب تھا کہ جب انسپکٹر رجب دین اپنے ابھرے ہوئے پیٹ سے ڈھلکتی بیلٹ کو دونوں ہاتھوں سے اُوپر کرتے ہوئے اندر داخل ہوا تو میں نے کہا۔

''انسپکٹر! ہم کوئی عادی مجرم نہیں ہیں۔ آپ نے کوئی بات کرنی ہے تو یہ ہتھکڑیاں......''

''منہ بند رکھو اپنا...... سب جانتے ہیں ہم......'' وہ درشت لہجے میں مجھے گھور کر بولا۔

''کیا جانتے ہیں آپ ہمارے بارے میں؟ ہم چور اُچکے ہیں؟'' میں بھی چپ نہیں رہا۔ میرا چہرہ اس ماورائے قانونِ بدمعاشی پر غصے سے سرخ ہو رہا تھا۔

''انسپکٹر! آخر کسی نے تو ہماری رپورٹ کی ہو گی ناں؟ ایسے ہی تو نہیں آپ نے ایکشن لیا ہو گا۔'' کبیل دادا نے فوراً مداخلت کر ڈالی۔ وہ رجب دین سے مخاطب تھا۔

''ظاہر ہے......''

''کس نے کی ہے؟''

''زمیندار شاہنواز نے۔'' انسپکٹر نے جواب دیا۔

''کمال ہے، ہم اُسے جانتے تک نہیں اور اس نے ہمارے خلاف رپورٹ کر دی؟ اس کی کوئی وجہ تو ہو گی؟''

''وجہ وہ خود ہی یہاں بتائے گا، ابھی آنے والا ہے وہ......'' انسپکٹر بولا۔

''اُسے ہم سے ایک ہی دن میں ایسی کون سی شکایت ہو گئی ہے؟ جبکہ ابھی تک تو نہ اس نے اور نہ ہی ہم نے اسے دیکھا ہے۔'' اس بار اول خیر نے کہا۔

انسپکٹر نے سیاہ رول کو میز پر رکھا اور کرسی سنبھال لی۔

پھر اس کی پشت گاہ سے کمر ٹکا کر بہ غور ہمیں دیکھتا رہا۔ میری بھانپتی ہوئی نظریں اس کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ اس کے چہرے اور آنکھوں سے مجھے محسوس ہوتا تھا کہ اسے ہمارے خلاف خوب اچھی طرح سے ''ڈکٹیٹ'' کیا گیا ہے۔

اسی وقت باہر کسی گاڑی کے رکنے کی آواز ابھری۔ گاڑی کی ہیڈ لائٹس کسی کھڑکی یا دروازے سے گزر کر اندر کمرے میں بھی ایک لمحے کے لیے ابھری تھی۔

اسی وقت ایک اردلی اندر داخل ہوا اور انسپکٹر رجب دین سے مؤدبانہ مخاطب ہو کر بولا۔

''سر! سائیں وڈا آیا ہے۔''

''اندر بھیج دو انہیں۔'' انسپکٹر نے تحکمانہ کہا اور اردلی اُلٹے پاؤں واپس لوٹ گیا۔

تھوڑی ہی دیر بعد ایک خاصے ڈیل ڈول اور اُونچے قد و قامت کا بھاری بھرکم شخص اندر داخل ہوا۔ اس کے کاندھوں پر اجرک تھی اور سر پر ٹوپی۔ رنگت سرخ و سپید تھی مگر چہرے پر چیچک کے گڑھے نما داغ صاف نظر آتے تھے۔ اس کا چہرہ بھاری اور گردن خاصی چربیلی تھی۔ آنکھوں کے پپوٹے سوجے ہوئے لگتے تھے جو اس کی کثرت مے نوشی کی چغلی کھاتے رہے تھے۔ چہرے سے روایتی رعونت ٹپک رہی تھی اور آنکھوں میں اس وقت پُرطیش چمک ہلکورے لے رہی تھی۔

اس نے بیش قیمت کلف دار شلوار قمیص زیب تن کر رکھی تھی، مجھے اس کی عمر کا اندازہ تو ساٹھ سے متجاوز ہی محسوس ہوتا تھا، تاہم اس نے اپنے سر اور مونچھوں کے بالوں کو رنگا ہوا تھا۔ صحت بھی قابلِ رشک تھی۔ اس کے ہمراہ دو مسلح محافظ بھی تھے اور یوں لگتا تھا جیسے یہ تھانہ بھی اس ''وڈے سائیں'' کی اوطاق ہو۔ انسپکٹر رجب دین اسے دیکھتے ہی اپنے چہرے پر خوش آمدانہ مسکراہٹ لیے اس کے استقبال کے لیے فوراً ہی اپنی کرسی سے یوں اُٹھ کھڑا ہوا تھا جیسے وہ اس کا کوئی بڑا افسر ہو۔

''آؤ...... آؤ سائیں وڈا! بھلی کرے آیو...... (خوش آمدید)۔'' رجب دین اس سے بولا۔ مگر شاہنواز خان نے کمرے میں داخل ہوتے ہی پہلے تو ہم تینوں کو بڑی پُرغیظ نظروں سے گھورا اور پھر انسپکٹر کے سامنے والی کرسی گھسیٹ کر اس پر یوں ٹانگ پہ ٹانگ چڑھا کے بیٹھ گیا جیسے...... تھانے کا انچارج ہی وہی شخص تھا۔ اس کی کرسی اب انسپکٹر کی میز اور ہم تینوں کے درمیان ایسے رخ پر تھی کہ اس کے

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

سیدھے ہاتھ پر انسپکٹر اور بائیں جانب ہم کھڑے تھے۔

''انسپکٹر!''

دفعتاً اس کی گونج دار اور غصیلی آواز ابھری۔ اس نے ذرا گردن موڑ کر رجب دین کی طرف دیکھا۔ پھر ہم پر گھورتی ہوئی غضب ناک نظریں جمادیں۔

''ان تینوں نے بشام چھلگری کو قتل کر کے..... اس کی خوبصورت بیوہ کو ورغلانے کا جرم کیا ہے۔ اپنے گھناؤنے جرم پر پردہ ڈالنے کے لیے یہ اُسے خاموشی سے اپنے ساتھ لے جانا چاہتے تھے۔''

اس کی دروغ گوئی پر میرے تن بدن میں جیسے آگ سی لگ گئی۔ مجھے قدرے حیرت بھی ہوئی تھی کہ اسے کیسے پتا چلا ہم ارم سمیت کوچ کرنے والے تھے؟

''او خیر..... کاکے! ہولا رہویں.....'' اول خیر نے میرے کان میں سرگوشی کی۔ شاید کبیل دادا کی طرح اس نے بھی کسی گہری اور خطرناک سازش کی بُو سونگھ لی تھی۔ لیکن میری آتش مزاجی اس کھلی ناانصافی اور دیدہ دلیرانہ انداز میں اتنے بڑے جھوٹ اور الزام تراشی پر مجھے کچھ کرنے پر اُکسا رہی تھی۔

اس کے حواریوں نے یقیناً اسے ہماری زبانی بشام چھلگری کی موت کے بارے میں بتا دیا تھا۔ تب ہی مجھے اس غلطی کا احساس بھی ہوا کہ ہمیں یہ حقیقت ابھی نہیں ظاہر کرنا چاہیے تھی۔ مجھے اب اس بات کا بھی ٹھیک ٹھیک اندازہ ہو چلا تھا کہ ارم کے گھر کی مسلسل نگرانی کی جارہی تھی اور ممکن تھا کہ اس کے آدمیوں نے آج صبح دن میں ارم اور شکیلہ وغیرہ کی ریکی کی ہو، جو بقول ارم کے ہی مسلسل اس کی کڑی نگرانی میں مصروف تھے۔ انہیں اسکول اور پھر بیٹھک جاتے دیکھا ہو۔ شاہنواز کے حواری بھی اسی نگرانی کے باعث ارم کے ہاں آئے تھے اور ہمارا پوچھا تھا۔

''آپ اتنا بڑا الزام ہم پر کس ثبوت کی بِنا پر لگا رہے ہیں جناب؟ ہم تو آپ کو جانتے بھی نہیں ہیں کہ آپ ہیں کون.....؟'' کبیل دادا نے بڑے نپے تلے انداز میں براہِ راست زمیندار شاہنواز خان سے مخاطب ہو کر کہا۔ اس کی بات پر شاہنواز خان کی آنکھوں سے مترشح ہوتی طیش کی چمک مزید گہری ہو گئی۔ اس کا چہرہ لال بھبوکا ہو گیا اور وہ کبیل دادا کو گھورتے ہوئے غراتے لہجے میں بولا۔

''ہم کون ہیں اور کیا ہیں۔ یہ پورا علاقہ ہمیں جانتا ہے مگر تم یہ نہیں جانتے ہو کہ اس وقت تم تینوں کس کی جاگیر تلے کھڑے ہو.....''

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

''اندازہ تو ہمیں اس بات کا بھی خوب ہو رہا ہے کہ یہ سرکاری عمارت بھی آپ کی جاگیر میں ہی شامل ہے، شاہنواز خان......!'' بالآخر مجھ سے نہ رہا گیا۔ اس مطلق العنان اور مغرور شخص پر جب میں نے کسی مصالحت گوئی کا اثر زائل جاتا محسوس کیا تو میں نے بھی صاف لفظوں میں اور بے خوفی سے کہہ ڈالا۔

''لیکن...... یاد رکھنا سائیں! ہمارا تعلق آپ کی جاگیر سے نہیں ہے۔ جہاں صرف آپ کا حکم چلتا ہو...... کتنی دیر تک آپ ہمیں اس سازش کا نشانہ بنائے رکھو گے؟ آخر تو معاملہ عدالت تک جائے گا ہی......''

''بکواس بند کرو اپنی......'' شاہنواز حلق کے بل دہاڑا ساتھ ہی اس نے مجھے ایک عدد گندی گالی سے بھی نواز دیا۔ میرا دماغ گھوم گیا اور اپنی آنکھوں میں مجھے گرمائش سی اُترتی محسوس ہونے لگی۔ ایسی تذلیل میں پہلی بار ہی سہہ رہا تھا۔ اگر میرے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں نہ ہوتیں تو میں اس رذیل شخص کو گالی کا جواب ہاتھوں سے دیتا۔ لیکن خاموش پھر بھی نہیں رہا اور قہر آلود نظروں سے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے بولا۔

''شاہنواز خان! خود پر اتنا اُدھار رکھو کہ تمہیں کسی بڑے نقصان کی صورت میں اس کی تلافی نہ کرنی پڑ جائے۔ میں پھر کہہ رہا ہوں...... ہمیں اپنی کمزور، بے بس اور کچلی ہوئی رعایا سمجھنے کی غلطی مت کرنا۔ تم ہمارے بارے میں بھلا کیا جانتے ہو گے، جانتے تو ہم ہیں اچھی طرح سے تمہیں۔ جس نے ایک قومی امانت لوٹنے کی کوشش کی تھی اور جیل کی ہوا کھانی پڑی تھی۔ شکر کرو کہ تم پر غداری کا مقدمہ قائم نہیں ہوا تھا۔''

اس کی ناک نیچی کرنے کی خاطر میں نے اس کی اوقات یاد دلانا ضروری سمجھا تھا۔ اس کے قریب کھڑے دونوں مسلح حواری مجھے جارحانہ نظروں سے گھورنے لگے تھے جبکہ میری بات پر شاہنواز ہی نہیں بلکہ انسپکٹر رجب دین بھی چونکے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ شاہنواز کی اکڑفوں البتہ جاتی رہی تھی مگر غصہ اس کا ہنوز ناک کی مکھی بنا ہوا تھا جبکہ اس کی وسمہ لگی گھنی بھنوؤں والی آنکھوں میں اُلجھن کے تاثرات بھی ہلکورے لینے لگے تھے، وہ اپنی آنکھیں سکیڑ کر مجھے گھور کے بولا۔

''تم کون سی امانت کی بات کر رہے ہو؟''

''تم اچھی طرح جانتے ہو کہ میں کس امانت کی بات کر رہا ہوں...... میں یہ جانتا ہوں کہ ہمیں پھنسانے کی سازش اسی سلسلے کی کڑی ہے جس میں اُلٹا تم ہی پھنسو گے۔''

مجھے ایک بار پھر اس کے غبارے سے ہوا نکلتی محسوس ہوئی مگر اس کا کروفر جوں کا توں رہا۔ اس نے دوبارہ ہم سے مخاطب ہونے کے بجائے انسپکٹر رجب دین کو مخاطب کر کے کہا۔

''تم فوراً اِن کے خلاف پرچہ کاٹو...... ہشام کے قتل اور اس کی خوب صورت بیوہ کو ورغلانے کا...... میں دیکھتا ہوں یہ کیسے بچتے ہیں؟'' تحکمانہ انداز میں یہ کہتے ہوئے وہ ایک جھٹکے سے کرسی سے اُٹھ کھڑا ہوا اور پھر چند قدم ہماری طرف بڑھا پھر میرے چہرے کو گھورتے ہوئے بولا۔

''اگر تم لوگ اکڑ دکھانے کے بجائے میرے آدمیوں کے ساتھ میری اوطاق میں ملنے آجاتے تو نوبت یہاں تک نہ آتی۔''

تب ہی میرے ذہن میں ایک جھماکا ہوا، میں سمجھ گیا کہ مقصد اس کا کچھ بھی رہا ہو مگر ہمارے ملنے سے انکار پر اس کی انا کو ٹھیس پہنچی تھی اور اس کا اس نے بدلہ لیا تھا، مگر بات فقط اتنی بھی نہیں ہوسکتی تھی۔ میں نے بھی کچھ معاملہ فہمی کی طرف آتے ہوئے مگر سپاٹ لہجے میں اس سے کہا۔

''ہم نے آپ سے ملنے سے انکار کب کیا تھا۔ آپ کے آدمیوں نے غلط بتایا ہوگا آپ کو۔ ہم تو خود آج شام ہی آپ سے ملنے آپ کی اوطاق میں آرہے تھے۔''

وہ میری بات سن کر تھوڑی دیر تک مجھے سوچتی ہوئی سی نظروں سے دیکھتا رہا اس کے بعد اس نے ایک نگاہ اول خیر اور کبیل دادا پر ڈالی۔ حالانکہ وہ اپنا حکم ''صادر'' کرنے کے بعد وہاں سے رخصت ہونے لگا تھا، لیکن شاید میری آخری بات نے اسے کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔

''کیا نام ہے تمہارا......؟'' اس نے سرد لہجے میں مجھ سے پوچھا۔

''شہزاد احمد خان۔'' میں نے جواب دیا۔

پھر وہ جانے کے بجائے انسپکٹر رجب دین کی طرف مڑا جو ''وڈے سائیں'' کو کرسی چھوڑتے پا کر فدویانہ انداز میں اس کے قریب جا کھڑا ہوا تھا۔

''انسپکٹر! مجھے اس سے کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں۔ میں اسے ساتھ لے جانا چاہتا ہوں۔''

''برابر سائیں وڈا......!'' انسپکٹر فوراً بولا۔ مگر میں نے دیکھا کہ کبیل دادا اور اول خیر یک دم فکر مند نظر آنے لگے۔

''میں ابھی موبائل پر اسے آپ کی طرف بھجوائے

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

دیتا ہوں۔‘‘

’’نہیں...... اِسے ہم خود اپنے ساتھ لے کر جائیں گے۔‘‘ زمیندار شاہنواز خان بولا۔

’’تم ان کے دونوں ساتھیوں کو لاک اَپ کیے رکھنا اور ابھی یہ سب راز میں رکھنا۔ بعد میں دیکھتے ہیں اس معاملے کو۔‘‘

’’مجھے آپ کے ساتھ چلنے پر کوئی اعتراض نہیں۔‘‘ میں نے کہا۔’’ لیکن بہتر ہوگا کہ میرے ان دونوں ساتھیوں کو بھی میرے ساتھ چلنے کی اجازت دی جائے۔‘‘

’’تم کیا سمجھ رہے ہو تمہیں آزاد کیا جارہا ہے؟‘‘ شاہنواز نے طنزیہ مسکراہٹ سے میری طرف دیکھ کر کہا۔

’’مگر یہ ماورائے قانون ہے۔ میں پھر اس طرح تمہارے ساتھ نہیں جاسکتا۔ میری جان کو خطرہ ہوگا۔‘‘ میں نے کہا۔ اگرچہ میں اس بات سے ڈرتا تو نہیں تھا مگر مجھے اپنی نہیں بلکہ کبیل دادا اور اول خیر کی فکر تھی۔

’’انسپکٹر......! تم سرکار کے ملازم ہو یا اس جاگیردار کے......‘‘ کبیل دادا اس کھلی ناانصافی پر چپ نہ رہ سکا۔

’’اپنی زبان بند رکھو...... یہ وڈے سائیں یہاں کی محترم اور معتبر شخصیت ہیں۔ اپنی جاگیر کے لوگوں کی جان و مال کی اچھی طرح حفاظت کرنا جانتے ہیں۔‘‘ انسپکٹر رجب دین نے کبیل دادا کو جھڑکا اور پھر آواز دے کر دو پولیس والوں کو اندر بلایا۔

’’ان دونوں کو لاک اَپ کردو۔‘‘ اس نے کبیل دادا اور اول خیر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے سپاہیوں سے تحکمانہ کہا۔ وہ دونوں تپ گئے۔ میں نے انہیں تسلی دی مگر وہ مطمئن نہیں تھے۔ انہیں لاک اَپ کردیا گیا۔ وہ چلّاتے رہے۔

’’شہزی! اس کے جاگیردار کے ساتھ ہرگز مت جانا۔‘‘

میں خاموش رہا۔ شاہنواز کے ساتھ دو پولیس کے آدمی بھی کردیے گیے تھے۔ میرے ہاتھوں کی ہتھکڑیاں کھولی نہیں گئی تھیں۔ میں نے شاہنواز سے کہا۔

’’اگر تم دوستانہ ماحول کے بجائے مجھے اس طرح قیدی کی حالت میں ساتھ لے جاکر بات کرو گے تو تمہارا مقصد پورا ہوگا نہ ہی میں تمہارے کسی سوال کا جواب دینا ضروری سمجھوں گا۔‘‘ میں اندازہ کرسکتا تھا کہ وہ مجھے کیوں اپنے ساتھ لے جانا چاہتا تھا اور مجھ سے کیا پوچھنا چاہتا تھا۔

میری بات پر شاہنواز خان کی گھنی مونچھوں تلے ہونٹوں پر بڑی زہریلی مسکراہٹ ابھری اور وہ سرسراتے لہجے میں مجھ سے بولا۔

’’پولیس والے تو پھر بھی رعایت کرتے ہیں مگر ہم اس چڑیا کے نام سے بھی واقف نہیں ہیں۔‘‘ یہ کہہ کر وہ دروازے کی طرف بڑھتا چلا گیا۔

’’انسپکٹر......! سرکار کی وردی پہن کر یہ تم اچھا نہیں کر رہے ہو...... تمہیں اس کا حساب دینا ہوگا......‘‘ میں غیظ ناک لہجے میں رجب دین سے بولا۔ میری آواز شاید کبیل دادا اور اول خیر تک بھی پہنچ گئی تھی۔ مجھے شاہنواز خان کے دونوں مسلح حواریوں نے دبوچ لیا اور دروازے کی طرف گھسیٹ کر لے چلے جبکہ دونوں پولیس والے ان کی مدد میں پیش پیش تھے۔

☆☆☆

دو پولیس والے ساتھ تھے مگر مجھے پولیس کی گاڑی میں نہیں بلکہ شاہنواز خان کی لینڈ کروزر میں درمیانی سیٹ پر بٹھایا گیا تھا۔ خود وہ اگلی سیٹ پر ڈرائیور کے برابر میں براجمان تھا۔ میرے دائیں بائیں پولیس کے اہلکار اور عقبی سیٹ پر مسلح حواری تھے۔

یہ سفر خاموشی سے جاری تھا اور میں بھی خود کو تن بہ تقدیر کیے بظاہر خاموش بیٹھا وقت کا منتظر تھا۔ یہ ممکن تھا کہ میرے ساتھیوں کو اس بات کا پچھتاوا ہو رہا ہو کہ ہم نے سیدھے ملتان جانے کے بجائے لاڑکانہ کا رخ کیوں کیا تھا لیکن میرے دل میں ایسا کچھ نہیں آیا تھا، میرا دل جس شے کو کرنے پر آمادہ ہوجاتا تھا تو وہ میں کر گزرتا تھا۔ میرا ایمان تھا کہ جو درست اور نیک کام انسان کرنا چاہے تو اس کا خیال ازخود ہی دل میں آجاتا ہے۔ خیال تو برے کام کرنے کا بھی آتا ہے انسان کو...... مگر اس کے کرنے سے پہلے ضمیر اسے نہ کرنے کی دل پر دستک ضرور دیتا ہے جبکہ نیک کام یا مقصد کو کرنے کے لیے خود ہی اندر حوصلہ اور ہمت پیدا ہونے لگتی ہے اور اسے کرنے کی دل بھی گواہی دیتا ہے۔

سفر خاموشی سے جاری تھا۔ کھڑکیوں کے شیشے بند تھے اور اندر اے سی آن تھا۔ میں گردو جوار کا جائزہ بھی لیتا جارہا تھا۔ شکر تھا کہ میری آنکھوں پر پٹی نہیں باندھی گئی تھی، یوں بھی میرے لیے یہ سارا علاقہ اجنبی تھا، تاہم جہاں تک ہوسکتا تھا میں تھانے سے یہاں تک اور ارم کے گھر تک کا راستہ ذہن نشین کیے ہوئے تھا۔

مجھے ارم کے سلسلے میں تشویش لاحق ہونے لگی۔ اس کے ہمراہ اگرچہ شکیلہ بھی موجود تھی اور وہ ظاہر ہے کوئی معمولی عورت نہیں تھی۔ اس لیے مجھے کچھ تسلی تو ہوئی تھی لیکن پھر بھی وہ دونوں خواتین زمیندار شاہنواز خان کے حواریوں کے

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

سامنے بھلا کیا حیثیت رکھتی تھیں؟ یہ تو شکر تھا کہ ہمارے ساتھ ارم اور شکیلہ کو بھی پولیس نے گرفت میں نہیں لیا تھا، ہوسکتا تھا کہ اس میں بھی شاہنواز خان کی ''ہدایات'' کا دخل ہو۔ تاہم مجھے شکیلہ کے پاس موجود طلسم نور ہیرے کی بھی فکر تھی۔

قریباً دس پندرہ منٹ بعد قدرے مضافات میں بڑی سڑک پر سفر کرنے کے بعد لینڈ کروزر دائیں جانب کے نشیبی راستے کی سمت مڑ گئی۔ یہ کچے کا علاقہ معلوم ہوتا تھا، کیونکہ راستہ ناپختہ اور بل کھاتا ہوا، بنجر میدان سے ذرا آگے جا کر کھیتوں کھلیانوں کے درمیان سے ہوتا ہوا کسی دیہی آبادی والے علاقے تک چلا گیا تھا۔ کچے کے سفر میں ہمیں مزید دس پندرہ منٹ لگ گئے اور بالآخر گاڑی ایک قرمزی پتھروں والی بڑی سی حویلی کے سامنے پہنچی۔ سامنے ایک دیوہیکل چوبی طرز والا گیٹ نظر آتا تھا۔ وہاں موجود چوکیدار نے گاڑی پہچانتے ہی فوراً گیٹ کھول دیا تھا، لینڈ کروزر اندر داخل ہوگئی۔ خاصے وسیع احاطے کے ایک جانب جہاں ایک عدد نئے ماڈل کی کار بھی کھڑی تھی، لینڈ کروزر اس کے قریب لے جا کر روک دی گئی۔

ہم سب نیچے اُتر آئے۔

حویلی سے متصل مجھے ایک بڑی سی بیٹھک کا دروازہ دکھائی دیا تھا۔ شاید یہی اس زمیندار کی اوطاق تھی۔ اسی جانب سے چند مسلح افراد لمبے لمبے ڈگ بھرتے ہوئے ہمارے قریب آگئے۔

''اڑے او...... بخشل!'' شاہنواز نے انہی میں سے ایک خاصے لمبے تڑنگے شخص کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''حاضر سائیں وڈا......!'' وہ سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے مؤدبانہ بولا۔

''کوڑا خان آگیا ہے؟''

''ہاؤ سائیں وڈا! آگیا ہے وہ...... پر......'' بخشل نامی یہ شخص کچھ کہنا چاہتا تھا مگر زمیندار شاہنواز نے اس کی بات کاٹ دی اور کہا۔

''اُسے میرے پاس بھیج دو......''

''ٹھیک ہے سائیں!''

''اور...... سنو......''

''جی سائیں!''

''ان دونوں کو ذرا دیر کے لیے اندر اوطاق میں بٹھاؤ...... اور ان کے لیے چاں پاڑیں (چائے پانی) کا بندوبست کرو، بلکہ جو کھانا پینا چاہیں وہ انہیں فراہم کرو۔'' شاہنواز نے تحکمانہ کہا۔

''برابر سائیں وڈا......'' بخشل نامی وہ قدآور شخص سینے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔

''آؤ سائیں......'' اس نے دونوں پولیس والوں سے کہا۔ وہ ان کے ساتھ اوطاق کی طرف بڑھ گئے۔ دو افراد وہیں رکے رہے۔ شاہنواز ان سے مخاطب ہوکر رعب سے بولا۔

''دادن......!''

''حاضر سائیں!''

''اندر مہمان کمرے کے ساتھ والے کمرے میں اس کو لے جا کر بٹھاؤ...... میں تھوڑی دیر میں وہاں پہنچتا ہوں۔''

''برابر سائیں......!''

مجھے ان دونوں کے حوالے کر دیا گیا۔

حویلی کی عمارت کچھ پرانی سی مگر کسی قلعے کی طرح مضبوط نظر آتی تھی۔ خاصی بلند بھی تھی جس کے دریچے تاریک تھے ایک آدھ میں فقط روشنی محسوس ہوتی تھی۔ اس کے ایک دروازے سے مجھے جب اندر لے جایا گیا تھا تو اس کی بلندی پر مجھے ایک دریچے سے روشنی آتی محسوس ہوئی تھی، جو فوراً ہی بجھ بھی گئی تھی مگر میں نے وہاں کسی کی جھلک بھی محسوس کی تھی، کسی سائے کو میں نے پردہ سرکا کر نیچے جھانکنے کی کوشش کرتے دیکھا تھا، تب تک میں اندر داخل کیا جا چکا تھا۔ مذکورہ کمرا اسی دیوار کے عقب میں ہی بنا ہوا تھا اور اس کی کھڑکی باہر وسیع احاطے میں کھلتی تھی۔

اس کمرے کی فضا مجھے عجیب سی محسوس ہوئی تھی۔ فرنیچر کے نام پر وہاں صرف ایک بوسیدہ سا صوفہ اور ایک سرکنڈوں کا بنا مونڈھا دھرا دکھائی دیا تھا۔ بس، اس کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ چھت پر پنکھا تھا۔ جسے بلب روشن کرتے ہی چلا دیا گیا تھا۔ کمرے کی فضا البتہ کچھ ٹھنڈی محسوس ہوتی تھی۔ اس کا فرش بغیر پلستر کی اینٹوں کا بنا ہوا تھا۔ مجھے صوفے پر بیٹھنے کو کہا گیا۔ میرے ہاتھوں میں ہنوز ہتھکڑیاں لگی ہوئی تھیں جس سے میں سخت کوفت محسوس کرنے لگا تھا۔

انسپکٹر سے پہلے مجھ سے شاید شاہنواز خان نے کسی قسم کی ''تفتیش'' کرنا تھی۔ یہاں مجھے جنگل کا قانون محسوس ہو رہا تھا۔ جہاں اصل قانون کی حکمرانی کے بجائے ایک جاگیردار کا خودساختہ حکم چلتا تھا۔

میں اندر سے بری طرح تلملایا ہوا تھا۔ میں نے کبھی ایسے زوروجبر پر اپنا سر نہیں جھکایا تھا، نہ ہی اس کا عادی تھا میں......

تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ شاہنواز کھنکھارتا ہوا اندر داخل ہوا۔ میں اسے دیکھ کر تھوڑا چونکا۔ اس نے کلف

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

دار شلوار قمیص اُتار دی تھی اور اب نیچے چارخانوں والا تہبند اور اُوپر اس کے فقط ایک بنیان ٹائپ صدری تھی۔ اس کے پورے جسم پر کسی بن مانس کی طرح بال اُگے ہوئے تھے۔ اس کے عقب میں ایک خدمت گار ہاتھ میں چھوٹی سی ٹرے اُٹھائے اور سر جھکائے چلا آرہا تھا۔ میں نے دیکھا ٹرے پر ایک بوتل، گلاس اور پلاسٹک کا باؤل رکھا تھا۔ شاہنواز میرے سامنے سرکنڈوں کے مونڈھے پر بیٹھ گیا اور تہبند سنبھالتا ہوا اپنی دونوں ٹانگیں بھی اُونچی کرلیں۔ خدمت گار نے اس کے سامنے ٹرے رکھ دی اور واپس چلا گیا۔

شاہنواز نے ایک کڑوی سی نظر میرے چہرے پر ڈالی، باؤل کے اندر رکھی برف کی دو ٹکڑیاں کانچ کے گلاس میں ڈالنے کے بعد اس میں شراب اُنڈیلی پھر ایک گھونٹ بھرنے کے بعد مجھ سے کھرکھراتی آواز میں بولا۔

''تم لوگ مجھ سے چالاکی نہیں چل سکتے، کیونکہ میں تم لوگوں کی کارستانی سمجھ چکا ہوں۔ تم نے وہ... طلسم نور ہیرا حاصل کرنے کے چکر میں بے چارے بشام کا قتل کرڈالا...... معاملہ اِدھر ہی ختم ہوسکتا ہے اگر تم وہ ہیرا میرے حوالے کر دو...... بصورتِ دیگر تم چاروں پر نہ صرف قتل کا مقدمہ قائم ہو جائے گا بلکہ قومی ورثے کے حامل اس بیش قیمت ہیرے کی چوری بھی تم لوگوں کے سر پر آجائے گی۔ باقی میرے اثر ورسوخ کا تو تم نے اب تک اندازہ لگا ہی لیا ہوگا۔''

''ہم نے بشام کا قتل نہیں کیا ہے اور نہ ہی وہ ہیرا ہمارے پاس ہے۔'' میں اس کی باتوں سے مرعوب ہوئے بغیر سپاٹ لہجے میں بولا۔ ''اگر ایسا ہوتا تو پھر ہمیں یہاں آنے کی کیا ضرورت ہوتی؟''

''چلو مان لیا وہ ہیرا تمہارے پاس نہیں لیکن تم بشام کی بیوہ کے پاس کیا کرنے آئے تھے؟ کیا بشام نے ہیرا اپنی بیوی ارم کو دے رکھا تھا؟ تم لوگ اس سے وہ چھیننے آئے تھے؟''

''نہیں، ہم اسے اپنے ساتھ لے جانے آئے تھے۔''

''کیوں؟''

اسی وقت ایک شخص اندر داخل ہوا۔ یہ بخشل تھا۔

''سائیں وڈا! وہ...... کوڑا خان آیا ہے۔'' اس نے شاہنواز سے مؤدبانہ کہا۔

''بھیج دو اُسے اندر......''

''حاضر سائیں۔'' بخشل لوٹ گیا۔

اس کے ذرا ہی دیر بعد ایک شخص اندر داخل ہوا۔ میں اسے پہچان گیا تھا، وہی موٹے اور بھدے نقوش والا شخص جو اپنے حواریوں کے ساتھ دندناتا ہوا ارم کے گھر گھسا چلا آیا تھا۔ وہ خاصا پُرجوش سا نظر آرہا تھا۔ اس نے ایک نگاہ میرے چہرے پر ڈالی تھی۔ پھر شاہنواز سے مخاطب ہو کر بھاری سی آواز میں بولا۔

''سائیں وڈا!'' اُس چھوکری کو تو ہم لے آئے ہیں مگر دوسری چھوکری جو اِن کی ساتھی تھی، وہ بڑی چالاک ثابت ہوئی۔ وہ اس کے دونوں بچوں کو لے کر کہیں بھاگ گئی ہے۔''

اس کی بات پر میرا دماغ سنسنا اُٹھا جبکہ شاہنواز نے یہ سنا تو اس کا چہرہ غصے سے سرخ ہوگیا اور وہ کوڑا خاں کو ایک موٹی سی گالی دے کر بولا۔

''اڑے ہو حرامی کی اولاد! تم کتنے لوگ تھے اور وہ چھوکری دو بچوں کو لے کر آسانی سے تم سب کی آنکھوں میں دھول جھونک کر چلتی بنی۔ مجھے پورا یقین ہے کہ وہ ہیرا اسی کے پاس ہوگا......''

شاہنواز خان بے شک غصیلے مزاج کا آدمی سہی لیکن میں اس کی زود فہمی اور زیرک دماغی کا قائل ہونے لگا تھا۔ اس نے نجانے کیا سوچ کر بالکل ٹھیک اندازہ قائم کیا تھا مگر میں اندر سے بری طرح متفکر اور تشویش زدہ ہوگیا تھا۔ گویا ہمیں پولیس کے حوالے کرنے کے بعد اس عیار انسان نے اپنے حواریوں کو ارم اور شکیلہ کو بھی گھر سے اُٹھوانے کا ٹاسک دے رکھا تھا۔ مجھے اب صحیح معنوں میں حالات کی نزاکت اور خطرناکی کا اندازہ ہونے لگا تھا کہ ہم کسی معمولی انسان کی گرفت میں نہیں تھے۔ شاہنواز بہت تیزی کے ساتھ ہمارے خلاف جال بچھائے جارہا تھا، ایک طرف اس نے بڑی مکاری سے قانون کا سہارا لیتے ہوئے ہمیں ایک ایسے الزام میں پھنسوا دیا تھا جس کے لیے ہمارے پاس اپنی بے گناہی ثابت کرنے کے لیے نہ صرف کچھ وقت درکار ہوتا بلکہ اس میں کئی پیچیدگیوں سے بھی گزرنا پڑتا ہمیں۔ تب تک یہ خبیث اپنا گل کھلاتا رہتا۔ دوسری طرف یہ اپنی ذاتی طاقت کا بھی بڑی ڈھٹائی سے مظاہرہ کررہا تھا۔ گویا چکی کے دونوں پاٹوں کے درمیان میں ہمیں پیس رہا تھا۔

اب میں نے اس خطرناک صورتِ حالات سے ''اپنے طور پر'' نمٹنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ مجھے زیادہ فکر شکیلہ کی تھی، ایک تو ہماری طرح وہ بھی یہاں اجنبی تھی، دوسرا یہ کہ اس کے پاس وہ قیمتی ہیرا تھا جبکہ ارم کے دونوں بچے بھی اس کے ساتھ تھے۔ رات کے اس پہر اب جانے وہ بے چاری

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

کہاں ان بھاری بھرکم ذمے داریوں سے عہدہ برآ ہونے کی تگ ودو میں مصروف کارتھی، یہ مجھے نہیں پتا تھا۔

''بس..... سائیں وڈا.....! ہم اس چھوکری کو بھی تلاش کررہے ہیں۔ جانو جرمن تین ساتھیوں کے ساتھ.....''

''تم پھر اِدھر کیا کررہے ہو..... (گندی گالی)۔'' شاہنواز طیش ناک لہجے میں کوڑا خان سے بولا۔ ''تم بھی دفع ہوجاؤ یہاں سے اور اب اس چھوکری کو پکڑ کے ہی میری نظروں کے سامنے آنا ورنہ تمہیں میں اپنے بھوکے کتوں کے آگے ڈال دوں گا۔''

''بب..... برابر سائیں..... برابر.....'' کوڑا خان کا چہرہ خوف سے سفید پڑ گیا اور وہ تیزی سے لوٹ گیا۔

''شاہنواز خان! تم یہ سب اچھا نہیں کررہے ہو.....''

میں نے پہلی بار اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اسے ...تہدید کی تو وہ کھڑے کھڑے میری طرف پلٹا اور نفرت و غصے سے اپنے ہونٹ سکیڑ کر ایک زوردار تھپڑ میرے چہرے پر رسید کردیا۔ بدبخت کا ہاتھ بھی بڑا بھاری تھا جس نے میرا دماغ جھنجھنا ڈالا تھا۔ شاید اس نے اپنا سارا طیش اور غیظ و غضب اپنے تھپڑ میں سمو دیا تھا جس کے باعث میں صوفے سمیت پیچھے کو الٹ گیا تھا۔

''سیدھا کرو اِسے.....'' (گالی) وہ دہاڑا۔

صوفہ الٹتے ہی میں بھی رسن بستہ حالت میں آڑا ترچھا ہوگیا تھا۔ اس کے حواریوں نے مجھے دبوچا اور صوفہ سیدھا کرکے مجھے اس پر پٹخ دیا۔ میں کسمسا کر سیدھا ہوا تو شاہنواز نے جھک کر میرا گریبان پکڑ لیا اور اپنا مکروہ چہرہ میری آنکھوں کے قریب کرتے ہوئے پُرغیظ لہجے میں بولا۔

''یاد رکھو! میں اپنے مفادات کے سلسلے میں کسی پر رحم نہیں کھاتا۔ اس گوٹھ کے قبرستان میں بنی آدھی قبریں میری بنائی ہوئی ہیں، جہاں میرے دشمن ابدی نیند سو رہے ہیں۔ میں اس میں چار قبروں کا اور اضافہ کردوں گا، اگر تم نے میری بات نہ مانی.....''

اس کی حالت پاگلوں جیسی ہورہی تھی۔ وہ بری طرح اعصاب زدہ ہورہا تھا، اس کی باچھوں سے جھاگ بہنے لگا تھا۔ اسی وقت ایک حواری نے قریب آکر شاہنواز کو سنبھالا دیا اور نہایت احترام کے ساتھ اسے تھام کر مونڈھے پر بٹھا دیا اور ادھ بھرا وِسکی کا گلاس اس کے ہاتھ میں بھی تھما دیا۔ اس نے میری طرف جلتی سلگتی نظروں سے گھورتے ہوئے ایک گھونٹ بھرا اور چند سیکنڈوں بعد دوسرا۔ خود میری اپنی حالت اندر سے سرخ آندھیوں کی زد میں آئی ہوئی تھی۔ میرا

بس نہیں چل رہا تھا کہ یہ ہتھکڑیاں ٹوٹ جائیں اور میں اس بڈھے گدھ کو اس کی مطلق العنانی اور غرور کا مزہ چکھا دوں۔ وہ طاقت اور دولت کے گھمنڈ میں اپنے آپ کو خدا سمجھے ہوئے تھا۔ صاف پتا چلتا تھا کہ اس کا زور و جبر آج تک صرف کمزوروں اور بےبس لوگوں پر چلتا رہا ہوگا۔

''مجھے اس بات سے کوئی سروکار نہیں ہوگا کہ تم لوگوں نے بشام کا قتل کیا یا نہیں.....''

شراب کے چند گھونٹ بھرنے کے بعد اس کی حالت کچھ معمول پر آئی تو وہ ہانپتی سی آواز میں بدستور میری طرف گھورتے ہوئے بولا۔ ''لیکن مجھے بس، وہ ہیرا چاہیے۔ بشام تو میرا بھی دشمن تھا، وہ جائے جہنم میں..... کیونکہ اسی بدبخت نے ہی تو وہ مجھ سے چھینا تھا، بڑا محبِ وطن بنتا تھا، وہ اسے سرکار کے حوالے کرنا چاہتا تھا۔ ہونہہ..... سرکار.....! وہ ہیرا ہماری جاگیر کے قریب کھدائی سے ملا تھا۔ اس پر ہمارا حق زیادہ بنتا تھا۔''

''اُسے موئن جودڑو کے علاقے سے دریافت کیا گیا تھا اور اس کی حیثیت ایک قومی ورثے اور نوادرات کے اعتبار اور حوالے سے مستند ہوچکی تھی۔'' میں نے بھی ذرا سنبھالا لیتے ہوئے اسے باتوں میں مشغول رکھنا چاہا۔

''بکواس بند کرو.....'' وہ پھر گرجا۔ ''ہماری جاگیر اسی علاقے تک پھیلی ہوئی ہے۔''

میں خاموش رہا۔ اس سے بحث میں کوئی فائدہ نہ تھا۔ وہ بولا۔

''کیا وہ ہیرا تمہاری اسی ساتھی چھوکری کے پاس ہے؟''

''نہیں.....'' میں نے نفی میں سر ہلایا۔

''تو پھر کہاں چھپا رکھا ہے تم نے اُسے.....؟'' اس کے لہجے میں بھیڑیے کی سی غراہٹ عود کر آئی۔

''حیرت ہے، تمہیں اس بات کا ابھی تک علم ہی نہیں ہوسکا ہے کہ بشام بہت پہلے اس ہیرے کو حکومت کے حوالے کرچکا ہے۔'' میں نے چالاکی سے جھوٹ بولا۔ ''مگر بدقسمتی سے خود بشام کچھ نامعلوم افراد کے ہاتھوں ہلاک ہوگیا، کیونکہ اس ہیرے کو حاصل کرنے کے لیے کچھ خطرناک قسم کے ملکی اور غیرملکی لوگ بھی پڑے ہوئے تھے۔''

''جھوٹ بول رہے ہو تم۔'' وہ بولا۔ ''وہ ہیرا اگر حکومت کے حوالے کیا جاتا تو اب تک یہ اعلان ہوچکا ہوتا کیونکہ اس ہیرے کی گمشدگی کی وجہ سے لوگ حکومت کو بری طرح تنقید کا نشانہ بنا رہے ہیں کہ وہ اپنے اس قدر قیمتی قومی ورثے کی حفاظت تک نہ کرسکی، تو عوام کی کیا حفاظت کرے

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

گی۔ یہ ملکی ساکھ کا معاملہ ہے جو حکومت کو نخر سے کرنا ہے، وہ ہیرا اب بھی تم لوگوں کے پاس ہے۔''

وہ صرف غصے کا ہی تیز نہ تھا اس کے پاس دماغ بھی تھا، اس نے بالکل ٹھیک اندازہ لگایا تھا۔ کیونکہ وہ ہیرا اب ملکی سطح پر ہائی لائٹ ہو چکا تھا۔ اس کی تلاش بھی جاری تھی۔ میں نے کہا۔

''ہیرا میرے پاس ہوتا تو تم اب تک میری جامہ تلاشی لے کر اُسے اپنے قبضے میں کر چکے ہوتے۔''

''ہم...... تو تم ایسے نہیں بتاؤ گے۔'' اس کے لہجے میں دھمکی عود کر آئی۔

''میں اتنا بے وقوف نہیں ہوں کہ تمہاری باتوں میں آجاؤں گا، وہ بیش قیمت ہیرا تم اپنی گانٹھ میں باندھے نہیں پھر رہے ہو گے۔ تم نے اسے کہیں چھپا رکھا ہوگا۔''

''بخشل!'' اس نے آواز دی۔ بخشل فوراً حاضر کر دیا گیا۔

''اُس چھوکری کو اِدھر لاؤ...... ابھی پتا چل جاتا ہے۔'' شاہنواز خان نے اس سے تحکمانہ انداز میں کہا اور وہ ''حاضر سائیں'' کہتا ہوا پلٹ گیا۔ میری رگوں میں خون کی گردش یکلخت تیز ہو گئی۔ مجھے خدشہ ہوا کہ کہیں یہ بدبخت اور ظالم شخص بے چاری الم نصیب ارم کو کسی تشدد کا نشانہ نہ بنا ڈالے۔

تھوڑی ہی دیر میں بخشل ارم کو بیدردی سے دبوچے وہاں لے آیا۔ اس نے ایک نگاہ مجھ پر ڈالی اور اس کے چہرے کا ہراس اور گہرا ہو گیا۔

''چھوکری......! ان کا تمہارے پاس آنا اور تیرا ان کے ساتھ روانگی کا پروگرام یوں ہی نہیں ہو سکتا۔'' شاہنواز نے ڈری سہمی کھڑی ارم کو غضیلی نظروں سے گھورتے ہوئے کہا۔

''اور نہ ہی تم سب مل کر مجھے بے وقوف بنا سکتے ہو، جانتی ہو ناں میرے آدمیوں کو...... وہ ابھی تھوڑی دیر میں اُس اداکارہ چھوکری کو تیرے دونوں بچوں سمیت یہاں دبوچ لائیں گے۔ پھر سارا معاملہ سیدھا ہو جائے گا۔ پر ہم چاہتے ہیں کہ ایسی نوبت آنے سے پہلے ہمیں صاف صاف بتاؤ وہ ہیرا کہاں ہے اور یہ لوگ تمہارے پاس کیا لینے آئے تھے؟''

''اداکارہ چھوکری۔'' کا لقب اس نے یقیناً شکیلہ کو ہی دیا ہوگا، شاید اس لیے کہ شکیلہ کی وضع قطع کسی اداکارہ سے کم نہ تھی۔ صحت مند جسم پر چست کپڑے، اسٹائلش انداز میں سیٹ کیے ہوئے بال اور رنگ و روپ اور چال ڈھال بھی اس کی کچھ ایسی ہی تھی۔ وہ اسمارٹ بھی نظر آتی تھی۔

بہرحال ارم نے ایک ڈرتی ڈرتی نگاہ میرے چہرے پر ڈالی پھر شاہنواز سے بولی۔

''س...... سائیں! وہ...... وہ ہیرا میرے پاس نن...... نہیں ہے۔ باقی یہ لوگ میرے مرحوم شوہر کے بھائیوں جیسے دوست تھے اور مجھے اس کے مرنے ہی کی خبر دینے آئے تھے۔''

''اچھا......!'' شاہنواز نے اس کی طرف بدستور طنزیہ نظروں سے گھورتے ہوئے کہا۔ ''مگر تم پھر اس کے ساتھ کدھر جانے کا ارادہ رکھے ہوئے تھیں؟''

وہ اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے بولی۔ ''اپنے شوہر کے مرنے کا سن کر میں خود کو اکیلی اور بے یار و مددگار سمجھنے لگی تھی۔ پھر تمہارے آدمی بھی مجھے خوف زدہ کیے ہوئے تھے۔ میں نے اسی خوف سے بچنے کی خاطر ان سے خود ہی یہ درخواست کی تھی وہ مجھے بھی اپنے ساتھ لے جائیں۔''

میں اس کی سمجھداری اور دانش مندی پر دل میں تعریف کیے بنا نہ رہ سکا۔ ارم نے بڑی چالاکی اور ڈرامائی انداز میں ایک ایسا سچ نما جھوٹ بولا تھا کہ جسے سننے کے بعد شاہنواز چند ثانیوں کے لیے سوچتا ہوا سا بن گیا بلکہ سچی بات تو یہ تھی کہ وہ لاجواب سا ہو کر رہ گیا۔

کمرے میں تھوڑی دیر سکوت طاری رہا۔ اس دوران شاہنواز بوتل سے گلاس میں مزید وہسکی ڈالنے لگا اور ایک گھونٹ معدے میں اُتارنے کے بعد مونڈھے سے پشت ٹکا کر ہم دونوں کی جانب باری باری گھورتا رہا۔

اسی وقت ایک حواری اندر داخل ہوا۔

''س...... سائیں وڈا! کوڑا خان آ گیا ہے۔ چھوکری اور دونوں بچے اس کے ساتھ ہیں۔''

اس اطلاع پر زمیندار شاہنواز خان کے چیچک زدہ چہرے پر فاتحانہ مسکراہٹ ابھری تھی اور پھر میرا دل ہی نہیں بلکہ میرے دماغ کی سرحدوں پر نسیں بھی جیسے دھڑ دھڑانے لگی تھیں......

خونی رشتوں کی خود غرضی اور پرائے بن جانے والے اپنوں کی بے غرض محبت میں پرورش پانے والے نوجوان کی سنسنی خیز سرگزشت کے مزید واقعات آئندہ ماہ

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

محبت کا گھاؤ

عکس فاطمہ

سساری زندگی کسی کی تلاش میں بھٹکتے ہو... اور اس تلاش میں پوری عمر گنوا دو... لیکن صرف ایک دن... بلکہ صرف ایک ہی لمحہ ہوتا ہے جو کامیابی تک پہنچا دیتا ہے... ہر شخص کی زندگی میں کوئی دن ایسا آسکتا ہے جب وہ سب کچھ پالیتا ہے یا پھر کھو دیتا ہے... مغرب میں محبت کا تصور وہ نہیں جو مشرق میں سمجھا جاتا ہے... مغربی زندگی میں ہر دن ایک نئی محبت پروان چڑھ رہی ہوتی ہے... ایک انوکھی مثلث کے گرد گھومتی کہانی... تینوں کی زندگی میں ایک دن آہی گیا تھا...

دو محبوباؤں کے درمیان الجھے عاشق کا دردناک انجام......

ویبسٹر کی ڈکشنری میں خوف کا مطلب یہ بیان کیا گیا ہے کہ ایک ناگوار اور اکثر شدید قسم کا جذبہ جو خطرے کی توقع یا آگاہی کے سبب پیدا ہوتا ہے۔ مجھے اس سے اتفاق کرنا ہوگا۔

وہ جولائی کی ایک جھلسا دینے والی صبح تھی جب اپنے دروازے کی اطلاعی گھنٹی کی متوقع آواز پر مجھ پر خوف غالب آگیا۔ میں اسے سونگھ سکتی تھی۔ ایک سرد دھاتی ذائقہ میرے منہ میں بھر گیا اور اس نے میرے خون کو بخ کر دیا۔

یہ خوف تھا مجھ پر۔ یقین کریں کہ میں اس معاملے میں نوآموز تھی لیکن میں جانتی تھی کہ میرے دروازے کے دوسری جانب کون ہے اور یہی میرے اس خوف کا سبب تھا۔

اکائی کی کیفیت کو کچلتے ہوئے میں اٹھ کھڑی ہوئی اور دروازہ کھول دیا۔

''لیز اڈینیئل ؟''

میری آواز نہیں نکل سکی۔ سو میں نے بناوٹی شرمیلے پن کی کوشش کرتے ہوئے اثبات میں سر ہلا دیا۔

اس دراز قامت تنومند شخص نے اپنی جینز کی پچھلی جیب سے بظاہر اپنا بٹوا نکالا۔ لیکن وہ بٹوا نہیں تھا۔ اس کے بجائے ایک دمکتا ہوا سنہری پولیس بیج جارحانہ انداز میں مجھے گھور رہا تھا۔

''سراغ رساں مائک سارووڈا۔'' اس پولیس افسر نے اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا۔ ساتھ ہی اپنی دھوپ کی عینک اتار دی اور دانت نکوستے ہوئے بولا۔ ''کیا ہم ایک منٹ کے لیے بات کر سکتے ہیں؟''

میرے حلق کے درمیان... ایک چیخ جنم لے چکی تھی اور باہر نکلنے کے لیے زور لگا رہی تھی۔ سراغ رساں سارووڈا نے مجھے ایلس ان ونڈر لینڈ کی چشائر کیٹ کی یاد دلا دی اور ایلس کی بلی کے مانند میں جان گئی کہ بہتر ہوگا میں اس شخص کی کچھ تعظیم کروں۔ سو میں منہ پھاڑتے ہوئے احمقانہ انداز میں مسکرا دی اور دروازے پر سے ایک طرف ہٹتے ہوئے اسے اندر آنے کا راستہ دے دیا۔ ساتھ ہی بھرائی ہوئی آواز میں پوچھا۔ ''کیا ہوا؟''

حالانکہ میں پہلے ہی سے جانتی تھی کہ کیا ہوا ہے اور اس بات پر خوف زدہ تھی کہ سراغ رساں مائک سارووڈا کو بھی علم تھا کہ کیا ہوا ہے۔

وہ اندر آگیا اور کاؤچ کے پاس سے گزرتا ہوا میرے کچن میں چلا گیا۔ اس نے اپنی گھنی مونچھوں کو تاؤ دیا اور اپنی دھوپ کی عینک احتیاط کے ساتھ میرے کچن کاؤنٹر پر رکھ دی۔ ''میں معذرت چاہوں گا۔'' یہ کہہ کر اس نے اپنا مڑا تڑا رومال اپنی جینز کی پچھلی جیب سے نکالا اور اپنے منہ کا پسینا پونچھنے لگا۔ ''باہر جہنم سے زیادہ تیز گرمی پڑ رہی ہے۔''

میری پشت دروازے کے ساتھ جڑی ہوئی تھی اور مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میرے قدم فرش میں گڑے ہوئے ہیں۔ ائرکنڈیشنر سے آنے والی ٹھنڈی ہوا کے باوجود میرا بدن تمتما رہا تھا۔

''مس ڈینیئل ؟''

میں نے ایک اچٹتی نگاہ سراغ رساں پر ڈالی تو دیکھا کہ اس کی سرد نیلی آنکھیں دوش دینے والے انداز میں مجھ پر جمی ہوئی تھیں۔

''اسٹیو جارکنز مر چکا ہے۔ اس کی ایک دوست نے کل اسے اپنے بیڈ پر مردہ حالت میں پایا۔ اس کی موت اعشاریہ تین آٹھ کے ریوالور کی گولی سے ہوئی ہے۔''

اسے یہاں تک معلومات تھیں۔ اس احساس کے

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

ساتھ ہی مجھے کمرا تیزی سے گھومتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ میں نے مضطرب ہو کر اپنے پھیپھڑوں کو تازہ ہوا پہنچانے کی کوشش کی۔ میری ٹانگوں کی طاقت جیسے زائل ہو چکی تھی۔ میں فرش پر بیٹھتی چلی گئی۔ ''مائی گاڈ...... نہیں...... نہیں۔'' میں نے کراہتے ہوئے رونا شروع کر دیا۔ ''وہ میرا منگیتر تھا۔ وہ مر نہیں سکتا۔''

''دیکھو مس ڈینیئل، میں جانتا ہوں کہ یہ تمہارے لیے ایک مشکل وقت ہے لیکن مجھے چند باتوں کی وضاحت مطلوب ہے۔ اسٹیو کی جس دوست نے اس کی لاش دریافت کی تھی اس کا دعویٰ ہے کہ وہ اس کی گرل فرینڈ رہی ہے۔''

''اس کا نام؟''

''جولیا وِنتھروپ!''

اس بصیرت آمیز اطلاع کو سنتے ہی میری سوجی ہوئی آنکھیں پھٹ پڑیں۔

سراغ رساں مائک سارودا اپنی تفتیش پر ڈٹا ہوا تھا۔ وہ اپنی بات پر زور دیتے ہوئے بولا۔ ''کیا تم جانتی تھیں کہ تمہارا منگیتر مس جولیا وِنتھروپ سے ملاقاتیں کرتا تھا؟''

میں نے اپنی قمیص کے کنارے سے..... آنسو پونچھے اور اپنے مڑے ہوئے گھٹنوں پر نظریں جماتے ہوئے بولی۔ ''جولیا، اسٹیو کی پرانی گرل فرینڈ تھی۔ تم نے یقیناً اسے پہچاننے میں غلطی کی ہے۔''

''میں نے کوئی غلطی نہیں کی۔'' سراغ رساں سارودا نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا۔

میں اور اسٹیو ہر اتوار کی شب ڈنر کے لیے باہر جایا کرتے تھے۔ لیکن اس اتوار کی شب ہم دونوں بے حد تھکے ہوئے تھے اور ہم نے گھر ہی میں رہنے کا فیصلہ کیا۔ میں اس کے بیڈ پر سمٹی ہوئی پڑی تھی اور ہمارے درمیان آئس کریم کا باکس موجود تھا۔ میں نے یہ سوچتے ہوئے ایک اطمینان کا ٹھنڈا سانس لیا اور اس بات پر تعجب کرنے لگی کہ زندگی کتنی شاندار گزر رہی تھی۔

تب اسٹیو نے ایک جمائی لی اور بولا۔ ''کیا تم اندازہ لگا سکتی ہو کہ میں نے لوئز گنز اینڈ ایمونیشن اسٹور میں کسے دیکھا ہے؟''

میں نے چمچے کی پشت پر لگی ہوئی آئس کریم کو چاٹا اور نظریں اٹھاتے ہوئے اسٹیو کی جانب دیکھا پھر شانے اُچکا دیے۔

لوئز کا گنز اینڈ ایمونیشن اسٹور میرے لیے ایک

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

تکلیف دہ موضوع تھا۔ اسٹیو کا اصرار تھا کہ وہ مجھے میرے تحفظ کے لیے ایک گن خرید کر دینا چاہتا ہے جبکہ مجھے ہینڈ گن کی مالکہ بننے کے تصور ہی سے نفرت تھی۔

''کم آن، اندازہ لگاؤ؟'' اسٹیو نے اپنا سوال دہراتے ہوئے مجھے خیالات کی دنیا سے باہر نکال دیا۔

''او کے۔'' میں نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ ''ایلوس؟''

''سنجیدہ ہو جاؤ۔'' اسٹیو نے آئس کریم کے باکس میں چمچہ گاڑتے ہوئے کہا۔ ''وہ جولیا تھی۔ وہ واپس آچکی ہے۔''

جولیا، اسٹیو کی محبوبہ تھی لیکن پھر وہ بھاگ کر شکاگو چلی گئی تھی اور اس نے وہاں شادی کر لی تھی۔ یہ دو سال پہلے کی بات تھی لیکن یہ اس دور کی بات تھی جب مجھے یقین نہیں تھا کہ وہ اس پر فریفتہ ہو چکا تھا...... بالکل حال کے مانند!

میں نے کچھ تبصرہ کرنے کی خاطر منہ کھولا ہی تھا کہ اسٹیو نے آئس کریم بھرا چمچہ میرے منہ میں ڈال دیا۔

''وہ طلاق لے رہی ہے۔'' اسٹیو نے بتایا۔

میں نے اس کے تجاوز کرتے ہوئے ہاتھ کو پیچھے دھکیل دیا۔ ''اس بات کا ہم سے کیا تعلق ہے؟'' اس بات سے خوف زدہ ہو کر کہ اس بات کا ہم سے ہر طرح سے تعلق ہے، میں اٹھ کر بیٹھ گئی اور اپنی ٹانگیں سکیڑ کر اپنے سینے سے لگا لیں۔

''کوئی تعلق نہیں، بے بی۔ تم خائف ہو؟''

''کیا مجھے خائف ہونا چاہیے؟''

وہ دوسری جانب گھوم گیا اور بیٹھنے کے بعد اپنی لمبی ٹانگیں بیڈ کے سائڈ میں لٹکاتے ہوئے بولا۔ ''نہیں۔''

اس کی چوڑی برہنہ پشت پر نظریں جماتے ہوئے مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ میرا تمام کا تمام مستقبل گزشتہ چند منٹوں میں تبدیل ہو چکا ہے۔ اس کی متوقع بے وفائی اس وقت واضح ہو گئی جب وہ گھوما اور اس نے اپنی نظریں میری نظروں سے چراتے ہوئے پرے کر لیں۔ پھر بیڈ کی پرلی جانب ہاتھ بڑھاتے ہوئے اس نے نائٹ اسٹینڈ کی دراز کھولی اور اس میں سے اعشاریہ تین آٹھ کا ایک ریوالور نکال کر میری جانب بڑھا دیا۔ ''یہ لو!'' وہ بڑبڑایا۔ ''محتاط رہنا۔''

مجھے اب ہمارے تعلقات کا خاتمہ نمایاں دکھائی دیا۔ میری بہترین سہیلی ڈوروتھی مجھے پہلے ہوشیار کر چکی تھی کہ کسی ایسے شخص کے ساتھ ملاقاتیں مت کرنا جو محبت میں ناکامی کا شکار رہا ہو۔ جب اسے پتا چلا کہ میں اپنے سے پہلی والی اس کی محبوبہ کی جڑواں ہوں تو وہ ناقابل یقین انداز میں سر ہلاتی رہی۔

اور پھر اس وقت اس کا غصہ عروج پر تھا جب اس نے مجھے اپنے اپارٹمنٹ میں روتے ہوئے پایا۔

''جیسس!'' ڈوروتھی نے اپنی بات پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''اسٹیو کو اپنے قول سے پھرے ہوئے کتنا عرصہ ہو گیا ہے؟''

ڈوروتھی کی سبز آنکھیں غصے سے بھری ہوئی تھیں جبکہ میں اسٹیو کے ظاہری طور پر مجھے رد کیے جانے پر اپنے بڑھتے ہوئے ہسٹریا کو پھر سے نئی شکل دے رہی تھی۔ ڈوروتھی نے مجھے وائن کا ایک گلاس تھمایا اور دھم سے کاؤچ پر بیٹھ گئی۔

''میرے خیال سے مجھے اس بارے میں تمہیں یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ میں اس پورے معاملے میں کیا محسوس کر رہی ہوں۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے اپنی نازک انگلی سے میری جانب اشارہ کیا اور اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ ''وہ محبت میں ناکامی کا شکار تھا اور یہ اس کی نری قسمت تھی کہ تم اسے مل گئیں، جولیا کی جڑواں! اوہ گاڈ! کاش میں نے پہلے یہ پیش گوئی کر دی ہوتی۔''

''شکریہ ڈوروتھی۔ اب میں خود کو بہتر محسوس کر رہی ہوں۔'' اپنے بے وفا منگیتر کے وقار کو خلاصی دینے کی خاطر میں زبردستی مسکرا دی۔ ''ایسا کچھ نہیں ہے۔ مجھے یقین ہے کہ میں صرف عدم تحفظ کا شکار تھی۔'' میں نے زردی مائل مشروب پر نظر جما دیں۔ پھر سرگوشی کے لہجے میں بولی۔ ''وہ مجھ سے محبت کرتا ہے۔ میں جانتی ہوں کہ وہ مجھ ہی سے پیار کرتا ہے۔''

☆☆☆

سراغ رساں اور میں کچن میں تھے اور وہ مجھ پر دھونس جمانے کے لیے اپنی سی بھرپور کوشش کر رہا تھا۔

''مس جولیا وتھروپ نے بتایا ہے کہ تم نے اسٹیو جارکنز کو دھمکی دی تھی۔ کیا تم نے دھمکی دی تھی؟''

''یقیناً نہیں۔''

''لیزا۔'' اس نے آہنی لہجے میں کہا۔ ''تمہیں احساس نہیں ہے لیکن تم نہایت مشکل میں ہو۔ میں مذاق نہیں کر رہا۔''

سراغ رساں کی آنکھوں میں کسی قسم کی کوئی ہمدردی یا رحم دلی نہیں تھی۔ بس آنے والے عذاب کا وعدہ تھا جو

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

میرے سر پر منڈلا رہا تھا۔ میرے معدے میں مروڑ سا اٹھنے لگا۔

میں مشتبہ تھی۔ مجھے جیل ہوسکتی تھی۔

''وہ کوئی دھمکی نہیں تھی۔'' میں نے اقرار سے گریز کرتے ہوئے کہا۔

''نہیں؟''

''نہیں۔ درحقیقت وہ شدید غصے کے اظہار کی ایک جذباتی کیفیت تھی۔''

''آئی سی۔''

لیکن اسے دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اسے میری سخت آزار پہنچانے والی تذلیل یا میرے دکھائی نہ دینے والے درد کا احساس کیوں کر ہوسکتا تھا جس میں، میں مبتلا تھی اور جبکہ میں اسٹیو کی بے وفائی کو بھی اپنی آنکھوں سے دیکھ چکی تھی۔

مجھے اس تمام صورتِ حال میں خود کو سنبھالے رکھنے میں مشکل پیش آرہی تھی۔ اسٹیو...... جولیا...... سراغ رساں...... یہ سب میرے لیے بہت زیادہ تھا۔

سراغ رساں سارو ڈا نے غائب دماغی سے اپنی گھنی مونچھوں پر ہاتھ پھیرا اور اپنی چبھتی ہوئی نظروں سے مجھے گھورنے لگا۔ اس کی خاموشی میرا سانس روک رہی تھی۔ وہ تمام کی تمام مذموم کہانی سننا چاہتا تھا۔

اسٹیو اور جولیا عاشق معشوق تھے۔ لیکن میں اپنے طور پر اس کا اعتراف نہیں کرسکتی تھی۔ خطرے کے اشارے بہتات میں تھے لیکن میں اس کے جھوٹ کی توجیہہ پیش کرنے میں ماسٹر تھی۔ میں چکا چوند کر دینے والی حقیقت برداشت نہیں کرسکتی تھی اور نہ ہی اسٹیو چاہتا تھا کہ میں حقیقت شناس ہوجاؤں۔

اس رات بارش ہورہی تھی جب میں اسٹیو کے گھر پہنچی۔ میں وائن کی بوتل اور وکٹوریا سیکرٹ زیرجامے سے مسلح تھی۔ میں نے تہیہ کیا ہوا تھا کہ میں اسٹیو کے ذہن سے جولیا کی تمام یادیں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے فراموش کر کے رہوں گی۔

ان میں اتنی شائستگی بھی نہیں تھی کہ وہ بیڈروم کا دروازہ ہی بند کر دیتے۔ ہال سے اسٹیو کے بیڈروم کی جانب تیز تیز قدموں سے بڑھتے ہوئے مجھے ہانپنے اور کراہوں کی آوازیں سنائی دیں تو اچانک میرے قدم وہیں جم گئے۔ ایک طاقتور صدمے نے میرے پورے وجود کو پارہ پارہ کر دیا۔ میں محرومی کے احساس سے کانپنے لگی۔

میں نے نظریں اٹھا کر کھلے ہوئے دروازے کی طرف دیکھا۔ مجھے وہ دونوں دکھائی دیے۔ اسٹیو اور جولیا! اور وہ دونوں شدید جذباتی انداز میں ایک دوسرے سے چمٹے ہوئے تھے۔

میں حیرت اور غصے سے نڈھال ہورہی تھی۔ میں نے سانس کھینچنے کے لیے منہ کھولا۔ غیظ و غضب کا ایک سرد طوفان میری روح میں سرایت کر گیا حتیٰ کہ اس کی یخ انگلیوں نے میرے ذہن کو مفلوج کر دیا۔

مجھ میں اب مزید کچھ دیکھنے کی سکت نہیں رہی تھی لیکن میں ان کی جانب سے اپنی نظریں نہیں ہٹا سکی۔

اسٹیو نے دھیرے دھیرے اپنی بند آنکھوں کے پپوٹے کھولے اور اس کا حرکت کرتا ہوا جسم اچانک ساکت ہوگیا۔

مجھ پر نظر پڑتے ہی وہ بے ساختہ بولا۔ ''لیز!! اوہ مائی گاڈ!''

ساتھ ہی اس نے بیڈ پر سے چھلانگ لگائی۔ کمرے میں سیکس کی مشکی خوشبو پھیلی ہوئی تھی اور یہ میرے حواس پر بھی چھا رہی تھی۔

''مائی گاڈ!'' میں نے خود کو کراہتے ہوئے سنا۔ ''مائی گاڈ!''

یہ سب بڑا ہولناک تھا۔

اسٹیو نے اپنی کانپتی انگلیاں اپنے بے ترتیب بالوں میں پھیریں اور میری جانب بڑھنے لگا۔

''نہیں۔'' میں نے سر ایک جھٹکے سے جولیا کی جانب گھمایا اور پھنکارتے ہوئے بولی۔ ''تمہاری یہ جرأت؟'' پھر اپنی ہتھیلی کی پشت سے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے سیڑھیوں کی جانب لپکی اور چیخنے لگی۔ ''میں تمہیں قتل کر دوں گی۔'' میرا مقصد بھی یہی تھا۔

''لیز! واپس آجاؤ اور مجھ سے بات کرو۔''

''میں تم سے نفرت کرتی ہوں۔'' میں نے چیخ کر جواب دیا اور باہر سے دروازے کا بولٹ چڑھا دیا۔

سراغ رساں سارو ڈا ایک چھوٹی سی سیاہ کتاب میں لکھتا جا رہا تھا۔ اس دوران وہ کبھی مجھے گھورنے لگتا، کبھی اپنا سر ہلانا شروع کر دیتا اور پھر دوبارہ نوٹس لکھنا شروع کر دیتا تھا۔ مجھے یوں محسوس ہورہا تھا جیسے میں پاگل ہوجاؤں گی۔

میں باتھ روم کی جانب دوڑ پڑی۔ مجھے متلی آرہی تھی۔ ٹائل کے فرش کی ٹھنڈک نے مجھے کچھ آرام کا احساس دیا۔

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

''بہتر ہوگا کہ تم کسی وکیل کو طلب کرلو، لیزا۔'' سراغ رساں سارووڈا بدستور مجھے گن کے بارے میں کرید رہا تھا۔

''دیکھو۔'' میں نے ملتجی لہجے میں کہا۔ ''میں وہاں معاملات سلجھانے کے لیے گئی تھی، اسے قتل کرنے کے لیے نہیں۔''

سراغ رساں سارووڈا نے اپنے ہاتھ..... سینے پر باندھ لیے اور ایک گہرا سانس لیتے ہوئے بولا۔ ''لیزا، ریوالور تمہارا تھا۔ اس پر تمہاری انگلیوں کے نشانات بھرے ہوئے ہیں۔ تمہارے پاس جواز تھا اور تمہاری جائے واردات سے عدم موجودگی بھی نہیں۔ میں تمہیں بتا دوں کہ یہ سب کچھ تمہارے حق میں اچھا نہیں ہے۔''

مجھے احساس ہے کہ مجھے کچھ ضرور کہنا چاہیے تھا لیکن میں صرف اپنے ہاتھوں پر نظریں جمائے رہی۔ میں اس تمام خون کے بارے میں سوچ رہی تھی، اس تیز مشکی خوشبو کے بارے میں فکر مند تھی جو میرے پھیپھڑوں میں سرایت کر چکی تھی اور جانے کا نام نہیں لے رہی تھی۔

''لیزا؟''

''میں تمہیں بتا چکی ہوں۔'' میں نے روہانسے لہجے میں کہا۔ ''نائٹ اسٹینڈ کی دراز میں گن میں نے رکھی تھی۔ اسی وجہ سے اس پر میری انگلیوں کے نشانات ہیں۔ پلیز، مجھ پر یقین کرو۔''

سراغ رساں سارووڈا نے اپنی سفاکانہ چہل قدمی روک دی اور براہِ راست میرے سر پر آن کھڑا ہوا۔

''آئی ایم سوری لیزا، لیکن.....''

اتنے میں میرے فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ گھنٹی کی آواز نے میری اس ٹینشن کو مزید گہرا کر دیا جو پہلے ہی میرا دم گھونٹ رہی تھی۔

''لعنت ہو۔'' سراغ رساں سارووڈا پھنکارا۔ ''آگے بڑھو اور فون سن لو۔''

میں لڑکھڑاتے قدموں سے فون تک پہنچی۔ فون کال سراغ رساں کے لیے تھی۔ میں نے ریسیور اس کی جانب بڑھا دیا اور پوری توجہ کے ساتھ یہ سننے کی کوشش کرنے لگی کہ سراغ رساں کیا کہہ رہا ہے۔

''مجھے پولیس اسٹیشن واپس پہنچنا ہے۔'' سراغ رساں نے بتایا۔ تھینک گاڈ، میں نے سوچا۔ وقت، مجھے مزید وقت چاہیے۔

سراغ رساں نے میرے خیالات پڑھ لیے۔ وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ ''ابھی ہماری بات چیت مکمل نہیں ہوئی۔''

پھر اس نے لپک کر میز پر سے اپنی نوٹ بک اٹھائی اور اپنی پتلون کی عقبی جیب میں رکھتا ہوا پلٹ کر دروازے سے باہر نکل گیا۔

وہ جا چکا تھا۔ اس کے جانے کے بعد میں پاگلوں کے مانند خون آلود پیپر بیگ ٹٹولنے لگی۔ میرے ہاتھ بُری طرح کپکپا رہے تھے۔

بیگ میں موجود میری شرٹ کی حالت بُری تھی۔ اس پر اسٹیو کے خون کے دھبے موجود تھے اور جمے ہوئے خون کی وجہ سے اس کا کپڑا کئی جگہ سے اکڑ چکا تھا جیسے کلف زدہ ہو۔

مجھے اس لباس اور بیگ سے نجات حاصل کرنی تھی۔ اس سے اٹھنے والی بو سے میرا دم گھٹ رہا تھا۔ میں نے کسی پوشیدہ جگہ ڈھونڈنے کے لیے اپنے اپارٹمنٹ کا جائزہ لینا شروع کیا۔ اچانک میری نگاہ اپنے کچن کاؤنٹر پر پڑی تو میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔

وہ سراغ رساں کی دھوپ کی عینک تھی جسے وہ عجلت میں جاتے ہوئے ساتھ لے جانا بھول گیا تھا۔

میں ابھی شش و پنج میں تھی کہ مجھے دروازے پر کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔

میں نے تیزی سے دروازے کی جانب گردن گھمائی۔ وہاں سراغ رساں سارووڈا کھڑا ہوا تھا۔ اس پر نگاہ پڑتے ہی خوف و دہشت نے مجھے جکڑ لیا۔ مجھ پر وہ خوابناک کیفیت طاری ہوگئی جس میں آپ کے ہاتھ اور آپ کی ٹانگیں آہنی زنجیروں سے باندھ دی گئی ہوں اور ان کے بھاری وزن سے آپ جیسے فالج زدہ ہو گئے ہوں اور کسی قسم کی حرکت کرنے سے قاصر ہوں۔

سراغ رساں سارووڈا نے دروازے میں قدم رکھتے ہی اپنے مخصوص انداز میں اپنی گھنی مونچھوں کو تاؤ دیا۔ اس کی سفاکانہ نظریں میرے ہاتھ میں دبے ہوئے خون آلودہ پیپر بیگ پر جمی ہوئی تھیں جس میں میری خون آلود قمیص بھی موجود تھی۔ اسٹیو کے خون سے آلودہ!

''ویل۔'' سراغ رساں سارووڈا نے کہا۔ ''میرے خیال میں اب تمہیں بھی میرے ساتھ ہی پولیس اسٹیشن چلنا پڑے گا۔'' ساتھ ہی کچن کاؤنٹر کی جانب سر سے اشارہ کیا۔ ''اگر بُرا نہ مانو تو باہر آتے ہوئے میرے دھوپ کی عینک بھی اٹھاتی لانا؟''

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

موٹیل کے اس بدوضع چھوٹے سے کمرے کی کھڑکی سے باہر نظر رکھنا میرے اس کام کا حصہ تھا جو میں سرانجام دے رہا تھا۔ اسی لیے میری توجہ سنہری بالوں والی اس انتہائی پُرکشش حسینہ کی لمبی سنولائی ہوئی ٹانگوں پر مرکوز نہیں ہو رہی تھی جو بیڈ پر لیٹی ہوئی تھی۔

مجھے اپنی تمام توجہ کھڑکی سے باہر مرکوز رکھنی تھی۔ اگر کوئی گولی اس حسینہ کو لگ جاتی یا وہ سیمنٹ سے لدے کسی ٹرک کے نیچے کچلی جاتی تو سیدھی سی بات ہے کہ مجھے اس نگرانی کا کوئی معاوضہ نہیں ملنا تھا۔

اس لیے میں باہر سڑک اور پارکنگ لاٹ پر مسلسل نظریں جمائے ہوئے تھا اور امید کر رہا تھا کہ مجھے ایسا کچھ دکھائی نہ دے۔

''تم عجیب غیر معمولی قسم کی شخصیت ہو مسٹر سیمسن!'' اس حسینہ نے کہا۔ ''تم نے مشکل ہی سے دو الفاظ ادا کیے ہیں۔ بیشتر مرد میرے ساتھ تنہا ہونے کے لیے اپنا بازو تک کٹوانے کے لیے تیار ہو جائیں گے۔'' اس کے بیضوی

شاطرانہ چال

تمکین رضا

غیر معمولی واقعات میں ہر شے پر خصوصی توجہ دی جاتی ہے... اس کشیدہ صورتِ حال میں اس نے بھی کوئی پہلو تشنہ نہ چھوڑا تھا... ہر جگہ یکساں اور بھرپور بصیرت اور تندہی سے کام لیا تھا... مگر سامنے والے بھی زور آور تھے...

مجرموں اور قانون کے درمیان ہونے والی آنکھ مچولی......

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

چہرے پر ایک دلگداز مسکراہٹ پھیل گئی۔ ساتھ ہی اس نے ایک اور چاکلیٹ اپنے منہ میں ڈال لی۔ وہ بکس میں موجود بیشتر چاکلیٹ کھا چکی تھی۔

میں بھی جواباً مسکرا دیا۔ ''تم مجھے کونر کہہ سکتی ہو۔'' میں نے اپنا نام بتاتے ہوئے کہا۔

''کونر!'' اس نے میرا نام اس طرح لیا جیسے اس سے بہتر کوئی لفظ ابھی تک اس کے منہ سے ادا نہیں ہوا تھا۔

نومی اسپین، کرائم باس جمی ٹیون کے چنگل میں پھنسی ہوئی تھی اور وہ اس سے خوب پیسا اینٹھ رہا تھا۔ اسی لیے پنیسا کولا پولیس ڈپارٹمنٹ نے اس بات کے لیے قائل کر لیا تھا کہ وہ اپنے کرائم باس بوائے فرینڈ کی مخبری کر دے۔

یہی وجہ تھی جو میں نومی اسپین کی نگرانی کی ڈیوٹی سرانجام دے رہا تھا۔

عام طور پر نومی اسپین کی نگرانی مجھ جیسے تیسرے درجے کے پرائیویٹ سراغ رساں کے بجائے پولیس کے سادہ لباس اہلکاروں کو کرنی چاہیے تھی لیکن ڈیٹیکٹیو سارجنٹ فرینک مورگن میرے دوستوں میں سے تھا اور مجھے یقینی طور پر رقم کی ضرورت تھی۔ اسی لیے اس نے اس طرح میری مدد کی ٹھانی تھی۔ اتنے میں کمرے کے دروازے پر دستک ہوئی۔

میں دروازے کے پیپ ہول کی جانب گیا اور اس پر نگاہ رکھتے ہوئے باہر جھانکا۔ وہ اخروٹی بالوں والی موٹیل کی بور کلرک لورین تھی جو فرنٹ آفس میں بیٹھتی تھی۔ اس نے ہاتھوں میں تہ شدہ تولیوں کا ایک بنڈل تھاما ہوا تھا۔ میں نے دستک کا کوئی جواب نہیں دیا۔

سارجنٹ فرینک مورگن نے مجھے سختی سے تاکید کی تھی کہ کسی کو بھی اندر آنے یا باہر نہ جانے دیا جائے۔ اس جاب میں فرینک مورگن میرا باس تھا۔ اس لیے اس کے حکم کی تعمیل میرا فرض تھا۔

موٹیل کی کلرک لورین میرا جواب نہ پا کر کچھ دیر کھڑی رہی پھر واپس چلی گئی۔

اس کے جانے کے بعد نومی نے مجھ سے پوچھا۔ ''کون تھا؟''

''کوئی خاص فرد نہیں تھا۔'' میں نے جواب دیا۔

تین دن تک موٹیل کے کمرے میں محدود رہنے کے بعد میرے لیے یہ مشکل ہو گیا کہ میں نومی اسپین جیسی حسینہ سے نظریں چرائے رہوں۔

اس کا سراپا دلکش تھا۔ اس کی آنکھیں گہرے سبز رنگ کی تھیں۔ جب وہ اپنے پیروں پر لوشن رگڑنے کے لیے جھکی تو کھلے گلے کے لباس سے اس کا حسن اور عیاں ہو گیا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے مجھے کھلی دعوت دی جا رہی ہو۔

اتنے میں فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ میں نے آگے بڑھ کر ریسیور اٹھایا اور کوڈ ورڈ میں جواب دیا۔ ''پور کیو پائن!''

''جیک ریبٹ!'' دوسری جانب سے سارجنٹ فرینک مورگن نے بھی اپنا کوڈ ورڈ بتایا۔

سراغ رسانی کے اس فرسودہ کھیل سے میرا پیمانۂ صبر لبریز ہو چکا تھا۔

''سنو کونر۔'' فرینک مورگن نے کہا۔ ''میرے پاس ایک بُری خبر آئی ہے۔ کالے چور نے بتایا ہے کہ جمی ٹیون سنہری بالوں والی کو ہر ممکن طور پر مردہ دیکھنا چاہتا ہے۔ اس نے کسی نہایت عمدہ قاتل سے اپنی گرل فرینڈ کو ٹھکانے لگانے کے لیے رابطہ قائم کیا ہے۔''

''تمہارے پاس ہمیشہ میرے لیے اسی نوعیت کی عمدہ خبریں ہوتی ہیں۔'' میں نے جواب دیا۔

''کبھی رائل کراؤن کلر کا نام سنا ہے؟''

''نہیں۔''

''وہ ایک کرائے کا قاتل ہے۔ کوئی بھی نہیں جانتا کہ وہ کون ہے اور وہ دیکھنے میں کیسا لگتا ہے۔ صرف یہ بتایا گیا ہے کہ کولا کا دھتی ہے۔ چوبیس گھنٹے آرسی کولا پیتا رہتا ہے۔'' سارجنٹ فرینک مورگن نے بتایا۔

میں نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے نومی کی طرف دیکھا کہ کیا وہ ہماری ہونے والی گفتگو سن سکتی ہے۔ پھر مدھم آواز سے گویا ہوا۔ ''لعنت ہو فرینک۔ تم چند اسکواڈ کاریں یہاں کیوں نہیں بھیج دیتے؟ میں یہاں تن تنہا خود کو بے لباس محسوس کر رہا ہوں۔''

''تم جانتے ہو کہ میں ایسا نہیں کر سکتا دوست! محکمے میں کوئی غدار ہے جو رشوت لے رہا ہے۔ میرے اور ڈسٹرکٹ اٹارنی کے علاوہ کسی کو معلوم نہیں کہ تم کہاں ہو۔ بس ڈٹے رہو۔ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔''

''ٹھیک ہے۔'' میں نے جواب دیا اور سوچنے لگا کہ پولیس بھی کرپٹ ہے؟ زبردست!

میں نے فون بند کر دیا اور واپس کھڑکی کے پاس چلا گیا۔ باہر ہلکی مونچھوں والا ایک گھٹیا سا آدمی ایک فائر برڈ کار سے ٹیک لگائے کھڑا تھا۔ اس نے آرمی کی ایک سرپلس جیکٹ پہنی ہوئی تھی جس میں لگ بھگ سو گنز چھپائی جا سکتی تھیں۔ وہ سگریٹ کے گہرے کش لے رہا تھا جیسے اسے

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

تمبا کو نوشی سے بے حد رغبت ہو۔ وہ دیکھنے میں یقینی طور پر کرائے کا قاتل نہیں لگ رہا تھا لیکن شاید نکتہ یہی ہو۔
فون کی گھنٹی دوبارہ بجی۔ میں نے ریسیور اٹھا لیا۔
''پورکیو پائن۔'' میں نے اپنا کوڈ ورڈ بتایا۔
''اس..... کیا؟'' ایک عورت کی آواز آئی۔
''کوئی بات نہیں۔ تم کون ہو؟''
''میں فرنٹ ڈیسک سے لورین بول رہی ہوں۔ کیا آپ مزید ایک رات قیام کریں گے یا میں آپ کا بل تیار کر لوں؟''
فرینک مورگن نے کمرے کا پیشگی کرایہ ادا نہ کرنے کو کہا تھا مبادا ہمیں اچانک کمرا چھوڑنا پڑ جائے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ ڈیسک کلرک لورین نے مجھے ڈیسک پر سے فون کیا تھا۔ عمومی طور پر مجھے گھنٹوں پہلے اپنے ایک اور رات کے قیام کی تجدید کرالینی چاہیے تھی لیکن میں بھول گیا تھا۔
''پلیز ایک اور رات قیام کا اضافہ کرلیں۔''
''او کے۔''
میں نے فون بند کر دیا اور واپس کھڑکی پر چلا گیا۔ وہ مونچھوں والا جاچکا تھا۔
نومی نے ریموٹ کنٹرول سے ٹی وی کے چند چینل تبدیل کیے لیکن اس کی پسند کا کوئی پروگرام نہیں آرہا تھا۔ سو اس نے ٹیلی وژن کا سوئچ آف کر دیا اور بولی۔ ''میں بور ہو رہی ہوں۔''
''مجھے تمہیں زندہ رکھنے کا معاوضہ دیا جارہا ہے نہ کہ تفریح فراہم کرنے کا۔''
''لیکن ایک موٹیل کے کمرے میں زیادہ سے زیادہ دو افراد کی موج مستی کے لیے صرف یہی کچھ ہے۔'' یہ کہہ کر وہ بیڈ پر دراز ہوگئی اور جمائی لینے کے انداز میں اپنی کمر اٹھا دی۔ ''تم بہت عمدہ ہو، مسٹر ٹیمسن۔''
''یہ میرے کولون کی بدولت ہے۔''
''تم ایک مشکل شخص ہو، ہے نا؟''
''میں مشق کرتا رہا ہوں۔'' میں نے ایک سگار کا ریپر اتارتے ہوئے کہا اور سگار اپنے منہ میں دبا لیا۔ ''میں نے صاف ستھری بے باکانہ گفتگو کرنا جاسوسی کے اسکول میں سیکھی ہے۔''
''تم نے ویک اینڈ کورس میں داخلہ لیا تھا؟''
''ہاں۔ لیکن میرا قیام ایک اضافی دن تک رہا تھا..... یہ سیکھنے کے لیے کہ گھٹیا اور غلاظت والیوں کو کس طرح رد کیا جاتا ہے۔''
''لیکن میرے اندر کوئی گھٹیا پن نہیں ہے۔ میں تمہیں یقین دلا رہی ہوں۔''
''میں نے یہ تو کبھی نہیں کہا کہ تم......''
''او کے مسٹر ٹیمسن۔'' اس نے میری بات کاٹ دی اور جوتے اتار پھینکے۔ پھر بلی کے مانند بیڈ پر دراز ہو گئی۔ ''تمہیں میری رجھانے والی کوئی ادا پسند نہیں آئی۔ میں تین دن سے تمہارے سامنے اپنے ہونٹ دانتوں سے کاٹ رہی ہوں اور آنکھیں مار رہی ہوں۔ پہلو بدل بدل کر لیٹ رہی ہوں اور تم ہو کہ تمہیں کوئی پسینا تک نہیں آیا۔ مجھے معلوم ہے کہ میں دلکش اور دلفریب ہوں۔ تمہیں میرے یہ انداز پسند نہیں آئے لیکن تمہارے اس ناپسند کرنے پر میں تمہیں چاہنے لگی ہوں۔''
''اور پھر اگر تمہاری یہ ادائیں میری برداشت سے باہر ہو جاتیں تو پھر کیا رہ جاتا؟''
تب اس نے اپنا اوپری لباس اتار دیا اور میری آنکھیں پھٹ پڑیں۔ ''ایک تنہا خوف زدہ لڑکی!'' نومی نے کہا۔ ''بس یہی رہ جاتا مسٹر ٹیمسن، صرف ایک لڑکی۔''
میں نے اس کے پاس جا کر اسے اپنی طرف کھینچ لیا۔
''مجھے کونر کہہ کر پکارو۔''

☆☆☆

جب میری آنکھ کھلی تو رات ہو رہی تھی۔
نومی میرے سامنے سمٹی پڑی تھی۔ میں نے باتھ روم سے چھن کر آنے والی زرد روشنی میں اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ سوتے ہوئے وہ بالکل مختلف لگ رہی تھی۔ ماہ و سال سکڑ گئے تھے اور کسی گینگسٹر کی زنانہ ساتھی کے بجائے وہ کسی کی بیٹی لگ رہی تھی۔ کسی مخلوط تعلیمی ادارے میں پڑھنے والی لڑکی یا کسی پڑوسی کی لڑکی۔
میں نے اسے اپنے قریب کیا تو وہ مطمئن انداز میں بڑبڑانے لگی۔
لیکن مجھے اپنے غیر پیشہ ورانہ ہونے کا احساس ہونے لگا۔ میں اسے بیدار کیے بغیر بیڈ پر سے نیچے اتر گیا اور اپنا لباس پہن لیا۔ پھر میں نے کھڑکی سے باہر جھانکا۔
وہ مونچھوں والا واپس آچکا تھا اور بس کھڑا ہوا تھا۔
میں نے سگار اپنے منہ میں دبایا اور یہ سوچنے لگا کہ میں اس شخص کے بارے میں کیا قدم اٹھاؤں۔
مجھے یہ بے خطر خیال آرہا تھا کہ میں باہر نکل کر اسے گھیر لوں اور صاف صاف پوچھوں کہ وہ کیا کر رہا ہے۔ یہ ایک غیر پیشہ ورانہ قدم ہوتا۔ لیکن مجھے پتا چلا کہ میں نے

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

اعشاریہ تین آٹھ صفر کا ریوالور اپنی بیلٹ میں اڑس لیا تھا اور اسے اپنی جیکٹ سے ڈھانپ لیا تھا۔ شاید چونکہ میں اتنے دنوں سے کمرے میں بند رہا تھا اس لیے باہر نکلنے کے لیے مجھے یہ موقع غنیمت لگا تھا۔

میں نے اپنے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے انہیں درست کیا اور کمرے سے باہر قدم رکھ دیا۔ میں نے باہر نکلنے کے بعد دروازہ آرام کے ساتھ کوئی آواز پیدا کیے بغیر بند کر دیا۔

اس شخص کی طرف بڑھنے سے قبل میں ایک لمحے کے لیے رکا رہا اور اطراف کا جائزہ لینے لگا۔ کمروں کی قطار کے آخر میں ایک بوڑھی ملازمہ آہستہ قدموں سے رات کے گشت پر تھی۔ اسٹریٹ لائٹ کی مدھم زرد روشنی خالی پول کا ایک ڈراؤنا منظر پیش کر رہی تھی۔

میں اس مونچھوں والے شخص کی جانب بڑھ گیا۔ وہ اس مرتبہ بھی اسی فائر برڈ کار کے ساتھ ٹیک لگائے کھڑا تھا۔ میں جتنا اس شخص کے قریب جا رہا تھا اتنا ہی مجھے یقین آ رہا تھا کہ میں نے یہ غلطی کی ہے۔ وہ شخص بھوک کا مارا لگ رہا تھا۔ شاید ہفتے بھر سے وہ نہایا بھی نہیں تھا۔ اس کے بال بھی چپڑے ہوئے تھے۔ وہ اتنا ہی خطرناک دکھائی دے رہا تھا جیسے پانی میں نیم ڈوبی ہوئی گلہری!

اس نے اپنا سگریٹ نیچے پھینک دیا اور اسے اپنے جوتے سے رگڑ کر بجھا دیا۔

میں اس سے ایک بازو کے فاصلے پر پہنچ کر رک گیا۔

''او کے دوست، تم دن بھر سے یہاں موجود ہو۔ کس لیے؟''

اس نے نیم باز آنکھوں سے میری طرف دیکھا اور تیوریاں چڑھاتے ہوئے بولا۔ ''میں کوئی ہنگامہ نہیں چاہتا، چیف۔''

''یہاں پر صرف ہم دونوں ہی ہیں لیکن تم نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا۔'' یہ کہہ کر میں نے سگار منہ میں دبا دیا اور خود کو سخت گیر ظاہر کرنے کی کوشش کی۔

اس شخص کا ہاتھ اپنی آرمی جیکٹ میں چلا گیا اور پھر تیزی سے باہر آ گیا۔ مجھے چاندی جیسی ایک چمک دکھائی دی۔ میں نے اس کے چاقو کے پھل کی ٹھنڈک اپنے پیٹ میں محسوس کرنے کا انتظار نہیں کیا اور اس پر چھلانگ لگا دی۔ میں نے اس کے چاقو والے ہاتھ کی کلائی اپنی گرفت میں لے لی اور اس ہاتھ کو فائر برڈ کار سے ٹکاتے ہوئے اس پر اپنی گرفت مضبوط کر لی۔

دوسرے لمحے میں نے اپنے گھٹنے سے اس کی جانگھ پر ضرب لگا دی۔ اس شخص کے منہ سے ایک پھنکار سی نکلی اور وہ دہرا ہو کر زمین پر گر گیا۔ ساتھ ہی پیٹھ کے بل لڑھکنیاں کھانے لگا۔

میں نے اپنا ریوالور نکال لیا اور اس کے سر پر کھڑا ہو گیا۔ پھر اس کی کلائی پر پیر رکھ دیا تو اس کی مٹھی کھل گئی۔ اس کے ہاتھ میں جو شے موجود تھی، وہ کوئی چاقو نہیں تھا۔

وہ چاندی کا بنا ہوا ایک سگریٹ لائٹر تھا۔

''میں بس یہی سمجھا تھا کہ تمہیں اپنے سگار کے لیے لائٹر چاہیے، مین۔'' اس نے کراہتے ہوئے کہا۔ درد کی شدت سے وہ اب بھی زمین پر لوٹ رہا تھا۔ ''تم نے مجھ پر چھلانگ کیوں لگائی تھی، مین؟ نہایت ہی غیر دوستانہ رویہ تھا۔''

''میں تمہیں کوئی اور سمجھا تھا، سوری۔'' میں نے جواب دیا۔

''شٹ، مین۔''

''تم یہاں کیا کر رہے تھے؟'' میں نے پوچھا۔ ''تم اس مقام پر گھنٹوں سے کھڑے رہے ہو، کیوں؟''

''اس لیڈی نے، مین۔ اس نے اپنی کار کی نگرانی کرنے کے لیے کہا تھا۔'' اس شخص نے فائر برڈ کی جانب سر سے اشارہ کرتے ہوئے بتایا۔ ''اس کا کہنا تھا کہ یہاں گاڑیاں چوری ہونے کے چند واقعات ہو چکے ہیں اور میں ایک طریقے سے اس کی کار کی حفاظت کروں۔ درست؟ اس نے فی گھنٹا پانچ ڈالر کے حساب سے مجھے نگرانی کا معاوضہ دیا ہے۔ اس نے صرف اتنا کہا تھا کہ میں نمایاں کھڑا رہوں تاکہ لوگ مجھے دیکھ سکیں۔''

''باہر کھلے میں؟''

''ہاں، ورنہ تو میں پارکنگ لاٹ کے پار درخت کے نیچے بیٹھ جاتا اور کار کو دیکھتا رہتا۔''

مجھے اس بات میں کچھ گڑبڑ دکھائی دی۔ میں نے فائر برڈ کا دروازہ کھول دیا۔ کوئی چیز کار سے باہر فٹ پاتھ پر گر پڑی اور ساتھ ہی کسی دھاتی شے کے ٹکرانے کی آواز بھی سنائی دی۔

وہ آر سی کولا کا ایک نیم چرمُر کین تھا۔

''اوہ گاڈ!'' میں نے تیزی سے اپنا سر گھمایا اور پلٹ کر اپنے کمرے کی جانب دیکھا۔

رات کی ملازمہ کی ہاتھ گاڑی کمرے کے کھلے ہوئے دروازے کے عین برابر میں کھڑی ہوئی تھی۔

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

نو گاڈ، نو!

میں اتنا احمق کیوں بن گیا تھا کہ نومی کو کمرے میں تنہا چھوڑ کر باہر نکل آیا؟ میں نے پلٹ کر اس شخص کی جانب دیکھا جو اپنے پیٹ کے نچلے حصے پر ہاتھ رکھے زمین پر پڑا کراہ رہا تھا۔

تب پورا منظر ایک جھٹکے سے میرے فوکس میں آگیا۔ وہ ایک جال تھا...... جسے مجھے ورغلانے اور کمرے سے باہر نکالنے کے لیے بطور چارا وہاں کھڑا کیا گیا تھا۔

میں ریوالور ہاتھ میں لیے تیز رفتاری سے واپس اپنے کمرے کی جانب دوڑ پڑا۔

کمرے کے کھلے ہوئے دروازے پر پہنچ کر میں رک گیا اور اپنا ریوالور اوپر اٹھا لیا۔ وہ ملازمہ نومی کے اوپر اپنی ٹانگیں پھیلائے کھڑی تھی۔ اس کے ہاتھوں میں نائلون کے بنے ہوئے زنانہ لانبے موزے تھے جن سے وہ پوری قوت کے ساتھ نومی کا گلا گھونٹ رہی تھی۔

''رک جاؤ'' میرے منہ سے بے ساختہ یہی الفاظ نکل سکے۔ پھر میں نے تحکمانہ لہجے میں دوبارہ کہا۔ ''فوراً رک جاؤ''

ملازمہ نے اپنی گرفت ڈھیلی کر دی۔ نومی اس کی گرفت سے پانی کی طرح ٹپک گئی اور اس کے قدموں میں ڈھیر ہوگئی۔ اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئی تھیں جیسے کسی شے پر جم کر رہ گئی ہوں۔ اس کا منہ انگریزی حروف O کے مانند حیرت زدہ ہونے کا منظر پیش کر رہا تھا جیسے سانس لینے کے لیے التجا کر رہا ہو۔

''نہیں......!'' میں چیخ پڑا۔

ساتھ ہی میں اپنے ریوالور کا ٹریگر تیزی سے دباتا چلا گیا۔ ملازمہ کے سینے پر چھ سرخ نقطوں کی قطار ابھر آئی۔ جب اس کا جسم فرش پر گرا تو اس کے سر پر موجود گرے رنگ کی وگ بھی اتر گئی۔

وہ موٹیل کی ڈیسک کلرک لورین تھی!

دی رائل کراؤن کلر نے اپنا آخری قتل سرانجام دے دیا تھا۔

☆☆☆

فرینک مورگن نے مجھے باتھ روم کے فرش پر اپنی پیٹھ ٹب سے ٹکائے بیٹھے ہوئے پایا۔ اس جگہ باوردی پولیس والوں کا جم غفیر تھا۔ وہ نومی کی لاش کو ایک باڈی بیگ میں ڈال کر اپنے ساتھ لے گئے۔

فرینک مورگن کے ہاتھ میں آرسی کولا کا ایک کین تھا۔ اس نے اپنی درمیانی انگلی سے کین کا ڈھکن ایک چٹاخے کے ساتھ کھول دیا جیسے اس چٹاخے کی آواز سے لطف اندوز ہونا چاہتا تھا۔ ''انہوں نے لیڈی کی فائر برڈ میں ایسے بہتر کین پڑے پائے ہیں جو سب کے سب خالی تھے۔ کیا تم اس فضول شے پر یقین کر سکتے ہو؟''

''آئی ایم سوری۔'' میں نے کہا۔ ''میں غچا کھا گیا تھا۔ نومی مر چکی ہے اور یہ میری غلطی ہے۔''

فرینک مورگن نے نفی میں سر ہلایا۔ ''نہیں کونر، وہ مری نہیں ہے۔ میں نے مس نومی اسپین کو موبائل کے ایک ہوٹل میں چھپا کر رکھا ہوا ہے۔ جو عورت نومی کے روپ میں یہاں موجود تھی وہ ماریَن پرائس نامی ایک طوائف تھی جو جیل میں سزا کاٹ رہی تھی۔ اس نے اپنی سزا میں کمی کے عوض نومی کا روپ اختیار کرنے کی حامی بھرلی تھی۔ ہم نے اس کا انتخاب اس لیے کیا تھا کہ وہ دیکھنے میں کافی حد تک نومی اسپین کی بہن کے مانند لگتی تھی۔''

میرے چہرے کے تاثرات نے یقیناً میرے سارجنٹ دوست فرینک مورگن کو پریشان کر دیا تھا۔ وہ فوراً وضاحت پر اتر آیا۔

''ظاہر یہ ہوا کہ جو شخص گینگسٹر سے رشوت لے رہا تھا وہ کوئی اور نہیں خود ڈسٹرکٹ اٹارنی تھا۔ میں تمہیں بتادوں کونر کہ تھانے میں تفتیش کے دوران وہ سب کچھ اگل دے گا۔ میں ابھی تک اس پر یہ الزام ثابت کرنے سے قاصر تھا۔ سوری! میں تمہیں پہلے نہیں بتا سکا لیکن یہ ایک عجیب سی بات تھی۔ ہمیں پتا ہی نہیں تھا کہ ہمارے اندر کالی بھیڑ کون ہے۔ آخری لمحات میں یہ حقیقت سامنے آئی کہ مجرموں کا مخبر ڈسٹرکٹ اٹارنی ہے۔''

''اس وقت میں تم سے زیادہ خوش نہیں ہوں، فرینک۔''

''میں جانتا ہوں کونر اور مجھے اس بات پر افسوس ہے۔ تم مجھے فون کر لینا۔ میں تمہیں لنچ کرانے کا مقروض ہوں۔''

جب فرینک مورگن جانے لگا تو میں نے اس کی طرف دیکھا بھی نہیں۔ میں نے اپنا چہرہ اپنے ہاتھوں میں تھام لیا اور نومی کی بے جان آنکھوں کا عکس اپنے ذہن سے فراموش کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ میری کوشش یہی تھی کہ میرے ذہن میں بس اس کی یہی تصویر ہمیشہ کے لیے نقش ہو جائے جب وہ ایک معصوم اور بے فکر لڑکی کے مانند اطمینان سے بیڈ پر سو رہی تھی۔

◎◎

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

کچھ لوگ... ان کی باتیں اور ان کی شخصیت پُراسرار اور بھیدوں بھری ہوتی ہے... وہ اپنے گرد ایک ایسا خول چڑھا کر رہتے ہیں... جس کے اندر دیکھنا ممکن نہیں ہوتا... ایک چھوٹے سے گائوں کی کہانی... جہاں کے مکین عرصہ دراز سے بڑی پُرسکون زندگی گزار رہے تھے... مگر ایک دن ایک اجنبی شخص وارد ہوا اور اس نے گائوں کے پُرسکوت ماحول میں کنکر کے مانند ہلچل بپا کردی...

باذوق قارئین کے لیے مغرب سے موصول شدہ پراسرار... پرتجسس شاہکار پارہ...

اجنبی

منظر امام

یہ اکتوبر کی ایک سرد رات تھی۔

سردیاں پوری طرح آ گئی تھیں۔ روزویل ویسے بھی ایک چھوٹا سا قصبہ تھا۔ لوگ جلدی گھروں میں چلے جاتے۔ ہر طرف سناٹا سا پھیل جاتا۔ سڑکوں کنارے بڑے بڑے کھمبوں پر لگے ہوئے بلب اداس روشنیاں بکھیرتے رہتے۔ بہت کم لوگ آتے جاتے دکھائی دیتے۔

ایسے میں ایک گاڑی دھیرے دھیرے چلتی ہوئی ایک گلی میں داخل ہوئی۔ آوارہ گھومتے کتوں نے گاڑی کو

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

دیکھ کر بھونکنا شروع کر دیا لیکن گاڑی والا ان کی پروا کیے بغیر آگے بڑھتا گیا۔ ایک جگہ گاڑی آکر رک گئی۔

ڈرائیور کچھ دیر تک گاڑی میں بیٹھا جائزہ لیتا رہا۔ وہ ایک نوجوان آدمی تھا۔ اس نے سردی سے بچنے کے لیے گرم کپڑے پہن رکھے تھے۔ کچھ دیر بعد وہ گاڑی سے اتر کر سامنے والے ایک مکان کی طرف بڑھا۔ اس نے دروازے پر دستک دے دی۔ ایک عورت نے دروازہ کھولا۔

وہ اس آدمی کی طرف حیرت سے دیکھنے لگی۔ اس آدمی نے گڈ ایوننگ کہتے ہوئے کہا۔ ''معاف کیجیے میڈم۔ میں نے اتنی رات گئے آپ کو زحمت دی۔''

''کوئی بات نہیں، بتاؤ میں تمہارے لیے کیا کرسکتی ہوں۔'' عورت نے پوچھا۔

''میڈم کیا اس گاؤں میں کوئی ایسا ہوٹل ہوگا جہاں میں رات گزار سکوں؟'' اس نے پوچھا۔

''ہوٹل؟'' عورت ہنس پڑی۔ ''اس گاؤں میں ہوٹل؟ نہیں اجنبی یہاں کوئی ہوٹل نہیں ہے۔''

''میں یہاں واقعی اجنبی ہوں۔'' اس نے کہا۔ ''میں ایک رات یہاں گزارنا چاہتا ہوں تاکہ میں کل آپ کے اس خوبصورت گاؤں کو جی بھر کر دیکھ سکوں۔''

اس اجنبی کا لہجہ بہت نرم تھا۔ اس کی آنکھیں سبز تھیں۔ اس کی شخصیت ایسی تھی کہ اس عورت کو اس سے ہمدردی محسوس ہونے لگی۔ اس نے کہا۔ ''نوجوان، ویسے تو اس گاؤں میں کوئی ہوٹل نہیں ہے لیکن مسز ہریسن شاید تمہارے کام آسکیں۔ ان کے پاس ایک کمرا ہے۔ تم ان کے گھر ایک رات رک سکتے ہو۔ ایسا کرو، ایک منٹ ٹھہرو۔ میں اپنا کوٹ اٹھالوں۔ تمہارے ساتھ چلتی ہوں۔''

وہ عورت اس اجنبی کو مسز ہریسن کے گھر لے گئی۔ مسز ہریسن نے خوشی سے اس کو ایک کمرا دے دیا۔ اجنبی نے رات اسی کمرے میں گزاری تھی۔ دوسرے دن اتوار تھا۔ گاؤں کے لوگ اس دن یا تو آرام کیا کرتے یا پھر اپنے چھوٹے موٹے کام نمٹایا کرتے۔ اجنبی گلیوں میں گھومتا رہا۔ اس نے گاؤں کی تاریخ میں بہت دلچسپی لی۔ وہ گاؤں کے بہت سے لوگوں سے ملا۔ ان سے تعارف حاصل کیا۔ لیکن ایک مختلف بات یہ تھی کہ وہ چرچ کی طرف نہیں گیا تھا۔ یہ ایک غیر معمولی بات تھی۔ چرچ اس گاؤں کی سب سے خوبصورت عمارت تھی لیکن اجنبی نے اس میں کوئی دلچسپی نہیں لی۔

وہ اس طرف نہیں گیا۔ گاؤں والوں نے ایک دو بار تبصرہ بھی کیا پھر خاموش ہوگئے۔ گاؤں کے مردوں نے اس اجنبی کو پسند نہیں کیا تھا جبکہ عورتوں کے خیال میں وہ ایک شریف انسان تھا۔ وہ خوبصورت تھا۔ اس کا رویہ بہت مہذب تھا۔

اجنبی ایک رات گزار کر دوسرے دن گاؤں سے چلا گیا تھا۔ اس کے پاس ایک بڑی سی قیمتی گاڑی تھی۔ وہ اسی پر گاؤں آیا تھا۔ دو چار دنوں تک اس کے چرچے ہوتے رہے۔ پھر لوگ اس کو بھول گئے۔ چرچے ہونے کی بھی وجہ یہ تھی کہ وہ ایک چھوٹا سا گاؤں تھا۔ وہاں واقعات بہت کم رونما ہوا کرتے تھے۔ زندگی بہت سست رفتاری سے سفر کرتی تھی۔

دسمبر کی پہلی اتوار تھی۔ گاؤں والے عبادت کر کے چرچ سے باہر آرہے تھے کہ سامنے سے ایک گاڑی آتی دکھائی دی۔ یہ اسی اجنبی کی گاڑی تھی جو ان لوگوں کے پاس آکر رک گئی تھی۔ اجنبی نے گاڑی سے اتر کر ہاتھ ہلایا۔ ''ہیلو! میں واپس آگیا ہوں۔'' اس نے کہا۔

کچھ لوگوں نے خوش دلی سے اس کا استقبال کیا تھا۔ پھر اجنبی کی ایک بات نے ان سب کو حیران کر دیا۔ ''کیا آپ لوگ میری مدد کریں گے۔ مجھے یہ گاؤں بہت پسند آیا ہے۔ میں یہاں ایک مکان خریدنا چاہتا ہوں۔ یہیں رہنا چاہتا ہوں۔''

''یہاں رہنا چاہتے ہو؟'' سب حیران ہو گئے تھے۔ ''یہاں رہ کر کیا کرو گے۔ یہاں تو تم جیسے جوانوں کے لیے کوئی کام ہی نہیں ہے۔ خود اس گاؤں کے نہ جانے کتنے نوجوان کام کی تلاش میں گاؤں چھوڑ کر جاچکے ہیں۔ یہاں ہے کیا؟ یہاں کے نوجوان لڈنی چلے گئے ہیں جو یہاں سے قریب ایک بڑا قصبہ ہے۔ تم بھی وہیں چلے جاؤ۔''

''آپ لوگوں کا بہت شکریہ۔'' اس نے کہا۔ ''لیکن ہوسکتا ہے کہ میں کوئی کام تلاش کر ہی لوں۔ ہوسکتا ہے کہ میں کام لڈنی میں کروں اور اپنی رہائش یہاں رکھوں۔''

گاؤں والوں میں سے کسی نے مسٹر اسمتھ کے مکان کے بارے میں بتایا۔ اسمتھ کا مکان خالی پڑا تھا۔ اسمتھ کا انتقال ہو چکا تھا۔ اس کی بیوہ اس مکان کو بیچنا چاہتی تھی۔ وہ کونے کا ایک بڑا مکان تھا۔ گاؤں والوں نے اسے وہ مکان لے جاکر دکھا دیا۔ وہ چرچ کی گلی میں مرکزی سڑک پر واقع تھا اور اجنبی کو پسند بھی آیا تھا۔ وہ بہت دیر تک اس کو باہر سے دیکھتا رہا تھا۔

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

"ٹھیک ہے۔ میں ایک دو دنوں میں اس مکان کا سودا کرنے آتا ہوں۔" اس نے کہا پھر وہ اپنی گاڑی میں بیٹھ کر گاؤں سے رخصت ہوگیا۔ گاؤں والے بہت دیر تک اس کی گاڑی کو دیکھتے رہے۔ وہ تبصرے کرتے رہے کہ امیر آدمی معلوم ہوتا ہے۔

دو چار دنوں کے بعد اسمتھ کا مکان اسی اجنبی نے خرید لیا۔ پندرہ بیس دنوں کے بعد اجنبی اپنے خریدے ہوئے مکان میں منتقل ہوگیا۔ بہت دنوں سے اس مکان کی دیکھ بھال نہیں ہوسکی تھی۔ اسی لیے اس کی حالت بہت خستہ ہو رہی تھی۔ اجنبی نے اس مکان کے ساتھ محنت شروع کردی۔ وہ اس کو نئے سرے سے تعمیر کررہا تھا۔ اس نے کھڑکیاں بنوائیں۔ اندر باہر رنگ کیا۔ شیشے لگوائے۔ گاؤں والوں کے لیے وہ دن بہت حیرت کا تھا جب انہوں نے اس مکان پر ایک بورڈ لگا دیکھا۔ اس پر لکھا ہوا تھا "کارنر شاپ۔ مالک ڈیو سلاٹن۔"

سب ہی اس مکان کا یہ نیا روپ دیکھ کر حیران رہ گئے۔ ہر طرف اس دکان کے چرچے ہونے لگے۔ بہت پہلے اس گاؤں میں ایک دکان ہوا کرتی تھی لیکن وہ بہت پہلے بند ہوچکی تھی۔ اسی لیے اس نئی دکان نے ایک ہلچل مچا دی تھی۔ بہت سے لوگوں کو اس علاقے میں دکان کا آئیڈیا پسند آیا تھا لیکن کچھ لوگ ایسے بھی تھے جن کو دکان ناپسند تھی۔

شام کے وقت سب لوگ گاؤں کی بیٹھک میں جمع ہوئے۔ یہ ایک چھوٹا سا ہال تھا۔ جہاں ان کی میٹنگز ہوا کرتی تھیں۔

لوگ اسی کے بارے میں باتیں کررہے تھے۔ ایک آدمی نے کھڑے ہوکر کہا۔ "کارنر شاپ ایک اچھا آئیڈیا ہے۔ مجھے پسند آیا۔"

"ہاں، بہت اچھی بات ہے۔ ہمیں چیزیں لینے کے لیے لڈنی جانا پڑتا تھا۔ اب سب کچھ اپنے ہی علاقے میں مل جائے گا۔"

"ہاں۔ یہ بہت اچھی بات ہوگی۔" کسی نے تائید کی۔

مسز ہریسن کھڑی ہوگئی۔ "مجھے بھی یہ بات اچھی لگی ہے۔ ویسے بھی میں اس اجنبی کو جانتی ہوں۔ وہ ایک رات میرا مہمان رہ چکا ہے۔ وہ ایک شریف اور مہذب انسان ہے۔"

"اور روزویل ویسے بھی ایک پُرسکون علاقہ ہے۔ یہاں ایسی دکان کی ضرورت تھی۔" کسی نے کہا۔

ایک اسکول ٹیچر کھڑی ہوگئی۔ اس نے دکان کی مخالفت کر ڈالی۔ اس کے ساتھ ہی ہارٹ کھڑا ہوگیا، وہ ایک جسیم قوی ہیکل آدمی تھا۔ اس کی آواز بھی بہت بلند تھی۔ اس نے بھی دکان کی مخالفت کی۔ کچھ لوگ دکان کے حق میں بولنے لگے۔ ذرا سی دیر میں کھچڑی سی پک گئی۔ پھر کسی نے کہا۔ "دیکھیں، شور کرنے سے بہتر ہے کہ ہم خود مسٹر سلاٹن کی بات سن لیں جو اس علاقے میں دکان کھول رہے ہیں۔ وہ کیا کہتے ہیں؟"

یہ معقول تجویز تھی۔ سلاٹن سے کہا گیا کہ وہ اپنا موقف بیان کرے۔ سلاٹن کھڑا ہوا۔ اس کی آواز مہذب تھی۔ اس نے کہا۔ "خواتین و حضرات! میں اس پُرسکون علاقے کو ڈسٹرب نہیں کرنا چاہتا۔ میں یہاں اجنبی ہوں لیکن چاہتا ہوں کہ یہاں رہ کر آپ میں شامل ہو جاؤں۔ اس کارنر شاپ سے آپ لوگوں کو بہت آسانی ہو جائے گی۔ یہاں سے تازہ پھل اور سبزیاں ملیں گی۔ انڈے ملیں گے۔ مجھے یہاں کے لوگ بہت اچھے لگتے ہیں۔ اس کے علاوہ میرے ذہن میں ایک بات اور بھی ہے۔ میں گاؤں کی مصنوعات بیچا کروں گا۔" اس نے بتایا۔

"گاؤں کی مصنوعات سے تمہاری کیا مراد ہے؟" ایک عورت نے دریافت کیا۔

"دیکھیں ہوسکتا ہے کہ اس گاؤں میں کچھ لوگوں کے پاس کوئی ہنر ہو۔ وہ بہت اچھی چیزیں بناتے ہوں۔ مثال کے طور پر کوئی بسکٹ اچھے بناتا ہو یا کوئی کڑھائی کا کام جانتا ہو۔ اس کا کام شاپ میں ڈسپلے کیا جائے گا۔ اس کے علاوہ میں اس بات کی ضمانت دیتا ہوں کہ چیزیں یہاں سستی ملا کریں گی۔ میں جانتا ہوں کہ مسز کین بہت اچھے کیک بناتی ہیں۔"

پھر اس نے ہارٹ کی طرف دیکھا جو سب سے زیادہ مخالفت کررہا تھا۔ "مسٹر ہارٹ، میں جانتا ہوں کہ آپ کو باغبانی کا شوق ہے۔ میں نے آپ کے گارڈن کے پھول دیکھے ہیں۔ بہت خوبصورت ہیں۔ وہ پھول بھی میری دکان میں رکھے جاسکتے ہیں۔"

کسی نے بتایا کہ فلاں خاتون برتن بہت اچھے بناتی ہیں۔ فلاں کے پاس یہ ہنر ہے۔ فلاں یہ کام جانتی ہے۔ وغیرہ۔

"میں یہی تو کہہ رہا ہوں کہ اس گاؤں میں ہنر کی کمی نہیں ہے۔ میں آپ سب کی چیزیں اپنی دکان میں رکھوں گا۔ اس گاؤں میں سیاح بھی آتے رہتے ہیں۔ وہ چیزیں ان کو فروخت ہوں گی۔ اس طرح اس گاؤں میں آمدنی کا

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

ذریعہ پیدا ہو جائے گا۔''
ہارٹ نے پوچھا۔ ''ہمارے درمیان ڈیلنگ کیا ہو گی؟''
''بہت آسان ہے۔ میں آپ کی چیزیں اپنی دکان سے بیچوں گا۔ تھوڑا سا کمیشن میں رکھوں گا۔ باقی آپ کا ہو گا۔''
''ہاں، یہ تو بہت اچھا ہو گا۔'' کیک بنانے والی نے کہا۔
''میں بھی تیار ہوں۔'' ہارٹ ہاتھ اٹھا کر بولا۔
کچھ ہی دیر میں سب اس منصوبے سے خوش اور مطمئن نظر آ رہے تھے۔ سلاٹن اب ان کی نگاہوں میں بہت عزیز ہو گیا تھا۔ سب اس کو پسند کرنے لگے تھے۔
ایک خوشگوار پیر کی صبح کو کارنر شاپ کا افتتاح ہو گیا۔ بہت سے لوگ خریداری کے لیے آ گئے۔ سلاٹن دن بھر دکان میں مصروف رہا تھا۔ اب اسے دکان میں کسی کام کرنے والی کی ضرورت تھی۔ اس کی اسسٹنٹ اسی گاؤں کی ایک لڑکی اینا منتخب ہو گئی۔ اس نے دکان میں اپنا کام شروع کر دیا۔
سلاٹن نے کہا تھا کہ اس کی دکان میں چیزیں سستی اور تازہ ملیں گی۔ اور یہی ہوتا رہا۔ دکان میں گاہکوں کی تعداد بڑھتی چلی گئی۔ سب کو اس بات پر حیرت تھی کہ وہ آخر کس طرح مارکیٹ سے کم ریٹ پر گاؤں والوں کو چیزیں فروخت کرتا ہے۔
سلاٹن اینا کے لیے بھی اچھا مالک ثابت ہو رہا تھا۔ وہ اسے بہت اچھی سیلری دیا کرتا۔ کبھی کبھی اینا کا دوست پیٹر بھی اینا کی مدد کرنے آ جایا کرتا۔ سلاٹن اس کو بھی معاوضہ دیتا تھا۔
سلاٹن نے لڈنی کے اخبار میں بھی اپنی دکان کا اشتہار دے دیا تھا۔ جس کی وجہ سے لڈنی والے بھی اس کی دکان میں آنے لگے تھے۔ یعنی وہ دکان اچھی خاصی چل نکلی تھی۔ گاؤں والوں کو حیرت بھی تھی لیکن وہ خوش بھی تھے۔
سلاٹن ایک اکیلا انسان تھا۔ وہ دکان کی اوپری منزل کے ایک کمرے میں رہا کرتا۔ سلاٹن گاؤں کی ایک ہردلعزیز شخصیت ہو گیا تھا لیکن کوئی اس کے کمرے میں نہیں جاتا تھا۔
سیڑھیوں کے نیچے اس نے دو کمرے بنوائے تھے۔ ایک میں اسٹاک رکھا جاتا تھا اور دوسرا کمرا ہمیشہ بند رہتا۔ اس کے دروازے پر سلاٹن نے ایک نوٹس لکھ کر لگا دیا تھا۔
''خاص آرڈر والوں کے لیے۔ کمرے میں داخل ہونا منع ہے۔'' اس کمرے میں اینا کو بھی جانے کی اجازت نہیں تھی۔
اینا کو اس بات پر حیرت تھی۔ اس نے ایک دن سلاٹن سے پوچھ ہی لیا۔ ''سر! ایک بات بتائیں۔ اس کمرے میں کیا ہے۔ آپ اس کو بند کیوں رکھتے ہیں؟''
''وہ کمرا خاص آرڈر والے خاص لوگوں کے لیے ہے۔'' سلاٹن نے جواب دیا۔
''میں خاص آرڈر کا مطلب نہیں سمجھی۔''
''بہتر یہی ہے کہ تم اپنے کام سے کام رکھو۔'' سلاٹن نے کہا۔
تین مہینے گزر گئے۔ سب کچھ اسی طرح چلتا رہا۔ کوئی خاص بات نہیں ہوئی۔ پھر ایک دن ایک غیر معمولی عورت اس دکان میں داخل ہوئی۔ وہ بہت حسین تھی۔ اس کا تعلق اس گاؤں سے نہیں تھا۔
اس کا لباس بہت قیمتی اور خوبصورت تھا۔ وہ بہت قیمتی گاڑی میں آئی تھی۔ وہ دکان میں داخل ہو کر تجسس بھری نگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھ رہی تھی۔ اینا نے اس کی انگلیاں دیکھیں۔ ان میں قیمتی ہیروں کی انگوٹھیاں تھیں۔ اس عورت نے اینا سے پوچھا۔ ''کیا روزویل کی یہی کارنر شاپ ہے؟''
''یس میڈم۔ اس علاقے میں یہی ایک دکان ہے۔'' اینا نے بتایا۔
''مجھے اس دکان کے مالک مسٹر سلاٹن سے ملنا ہے۔'' اس عورت نے کہا۔
''میڈم وہ اوپر والے کمرے میں ہیں۔ آپ دو منٹ ٹھہریں۔ میں ان کو جا کر بتاتی ہوں۔ آپ کا نام کیا ہے؟''
''انہیں بتاؤ، گورڈن ان سے ملنے آئی ہیں۔ گریٹا گورڈن۔''
اوہ خدا۔ اینا تو اس عورت کو جانتی تھی۔ اب نام بتاتے ہی اس عورت کے خدوخال اس پر واضح ہونے لگے تھے۔ ''آپ وہی گریٹا گورڈن ہیں نا۔ مشہور فلم اسٹار۔'' اینا نے پوچھا۔
''ہاں۔ میں وہی ہوں۔'' وہ مسکرا دی۔ اس کے ساتھ ہی وہ کچھ نروس بھی دکھائی دے رہی تھی۔
''اوہ۔ بس ایک منٹ ٹھہر جائیں۔ میں انہیں بلا کر لاتی ہوں۔'' اینا نے کہا اور اندر کی طرف دوڑ لگا دی۔ اس نے سیڑھیوں کے پاس ہی پہنچ کر چلانا شروع کر دیا۔ ''مسٹر

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

سلاٹن۔ مسٹر سلاٹن۔''

''کیا بات ہے؟'' اوپر سے آواز آئی۔

''کوئی آپ سے ملنے آیا ہے۔'' اینا نے بتایا۔

''کون ہے؟''

''گریٹا گورڈن۔'' اینا نے بتایا۔ ''فلم اسٹار گریٹا۔''

''میں آرہا ہوں۔'' سلاٹن نے کہا۔

اینا، گریٹا کے پاس واپس آگئی۔ اس نے بتایا کہ مسٹر سلاٹن آرہے ہیں۔ چند ہی لمحوں میں سلاٹن بھی آگیا تھا۔ اس نے بہت گرم جوشی سے گریٹا سے ہاتھ ملایا تھا۔ گریٹا بھی اسے دیکھ کر بہت خوش ہوئی تھی۔

جب دونوں نے ہاتھ ملایا۔ اس وقت بھی گریٹا کی انگوٹھیوں کے ہیرے جگمگا رہے تھے۔ اینا نے اپنی زندگی میں کبھی اتنے ہیرے نہیں دیکھے ہوں گے۔ گریٹا چاروں طرف دیکھ رہی تھی۔ اس نے سلاٹن سے پوچھا۔ ''مسٹر سلاٹن دکان تو بہت اچھی ہے۔ کیا تم اس علاقے سے مطمئن ہو؟''

''جی ہاں گریٹا۔ ویسے تو یہ ایک چھوٹا علاقہ ہے لیکن بہت پُرسکون ہے اور میں یہاں خوش ہوں۔ تم میرے ساتھ آؤ۔''

سلاٹن اسے لے کر اندر چلا گیا۔ وہ دونوں اسی کمرے میں گئے تھے جو ہمیشہ بند رہتا تھا اور جس کے دروازے پر لکھا تھا۔ ''خاص آرڈر والوں کے لیے۔'' اینا کو یہ دیکھ کر بھی حیرت ہوئی تھی کہ گریٹا اور سلاٹن ایک دوسرے کے صورت آشنا نہیں تھے۔ اسی لیے وہ اس طرح ملے تھے جیسے پہلی بار ملے ہوں۔

اینا اپنی کرسی پر بیٹھ کر سوچتی رہی۔ وہ دیکھنا چاہتی تھی کہ کیا ہوتا ہے۔ وہ خاص آرڈر کیا ہے جس کے لیے گریٹا جیسی فلم اسٹار یہاں تک آگئی ہے۔ اینا بہت پُرجوش ہو رہی تھی۔ وہ پورے گاؤں کو گریٹا کے بارے میں بتا دینا چاہتی تھی۔ سب سے پہلے وہ یہ خبر اپنے دوست پیٹر کو دیتی کہ آج دکان میں کون آیا تھا۔ اس نے گریٹا کی بہت سی فلمیں دیکھی تھیں۔ وہ اینا کو بہت پسند تھی۔ اس کی فلمیں بہت کامیاب ہوتی تھیں۔

دس منٹ کے بعد گریٹا باہر آگئی۔ سلاٹن سیڑھیاں چڑھتا ہوا اوپر چلا گیا اور گریٹا، اینا کے کاؤنٹر کے پاس آگئی، وہ بہت الجھی ہوئی دکھائی دے رہی تھی جیسے بہت پریشان ہو، اس کا چہرہ زرد ہو رہا تھا۔ اس کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں جیسے دیر تک روتی رہی ہو۔ اینا کو یہ سب دیکھ کر

غلط فہمی

ایک امریکی جوڑا سیاحت کے لیے اسپین گیا۔ رات کے وقت انہیں شہر واپس آنا پڑا۔ موسلا دھار بارش ہو رہی تھی اور ڈرائیور ٹیکسی کو اندھا دھند دوڑائے لے جا رہا تھا۔

عورت نے اسے پریشان ہو کر آواز دی۔ ''ٹھہرو، میرے کپڑے خراب ہو رہے ہیں۔ ایسی بھی کیا جلدی ہے۔ میں کہتی ہوں ٹھہرو بھی۔''

ڈرائیور نے سنی ان سنی کر دی۔ خیر جب واپس شہر میں ہوٹل پر پہنچے تو عورت نے اتر کر ڈرائیور کو آڑے ہاتھوں لیا۔ بالآخر وہ بولا۔

''معاف کیجیے گا۔ غلط فہمی ہو گئی۔ میں سمجھا کہ آپ اپنے خاوند سے کہہ رہی ہیں۔''

بھکر سے ملک صفدر حسین عاصم کا تعاون

ایک شخص اپنے دوست سے فون پر کہہ رہا تھا۔ ''میری بیوی دو گھنٹے لیٹ ہو گئی ہے۔ مجھے اندیشہ ہے کہ یا تو وہ اپنی کسی سہیلی کے گھر رک گئی ہے یا کسی کار وغیرہ کی لپیٹ میں آگئی ہے یا شاپنگ میں لگ گئی ہے...... یا پھر!''

''پھر کیا؟'' دوست نے پوچھا۔

''یا پھر کسی نے اسے اغوا کر لیا ہے۔'' اس شخص نے کہا۔ ''اور خدا کرے یہی سچ ہو۔''

دبئی سے عرفان اظہار کی خواہش

حیرت

کسی پارٹی میں ایک خاتون نے دوسری خاتون سے کہا۔ ''حیرت ہے کہ پچھلے ہفتے تمہیں آسکر کلب کی تقریب میں مدعو نہیں کیا گیا؟''

دوسری خاتون مسکرائیں۔ ''مجھے بھی حیرت ہے کہ تمہیں اس تقریب میں کیوں مدعو کیا گیا تھا؟''

کوٹری سے حمیرا اقبال کا جواب

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

حیرت ہوئی تھی۔

''خیریت تو ہے مس گریٹا۔ کیا ہوا ہے؟'' اس نے پوچھا۔'' آپ ٹھیک تو ہیں نا؟''

''ہاں، ہاں۔ میں ٹھیک ہوں۔'' گریٹا نے کہا لیکن اس کی حالت ٹھیک نہیں تھی۔ اینا نے اس کے لیے ایک کرسی لا کر رکھ دی۔

''پلیز بیٹھ جائیں۔'' اس نے کہا۔'' کیا کسی ڈاکٹر کو لے آؤں؟'' اس نے پوچھا۔

''نہیں، نہیں میں ٹھیک ہوں۔ پلیز کسی کو بھی میرے بارے میں مت بتانا کہ میں یہاں آئی تھی۔ پلیز! یہ میری درخواست ہے۔ اس کا خیال رکھنا۔''

اینا بددل سی ہوگئی تھی۔ وہ تو پورے گاؤں کو یہ خبر دینا چاہتی تھی۔ سب کو بتانا چاہتی تھی کہ اس کی دکان میں کتنی مشہور ہستی آئی تھی لیکن گریٹا نے اسے منع کر دیا تھا۔

''میں تمہیں کچھ دینا چاہتی ہوں۔'' گریٹا نے اپنے بیگ سے ایک تصویر نکالی۔'' یہ میری تصویر ہے۔ میں اس پر اپنے دستخط کر دیتی ہوں۔ تم کو میں یاد رہوں گی۔''

اس نے دستخط کر کے تصویر اینا کو دے دی۔'' اس کو اپنے پاس رکھنا اور میری بات یاد رکھنا۔ کسی کو بھی پتا نہ چلے کہ میں یہاں آئی تھی۔ پلیز۔''

پھر اس نے اینا کو گلے سے لگا کر اس کے گال پر پیار کیا اور دکان سے باہر نکل گئی۔ اینا اس کے بارے میں سوچتی رہی۔'' کتنی خوبصورت عورت ہے۔ کتنی باوقار۔ اس کی چال کتنی دلکش ہے۔ اس کا ہر انداز خوبصورت ہے اور اس کے ہاتھ کتنے خوبصورت ہیں اور اس وقت اینا نے دیکھا کہ گریٹا کی انگلیاں خالی تھیں۔ اب ان میں کوئی انگوٹھی نہیں تھی۔ ساری انگوٹھیاں کہیں جا چکی تھیں۔

☆☆☆

معاملات چلتے رہے۔

سلاٹن نے کبھی گریٹا کے بارے میں کوئی بات نہیں کی۔ اس نے یہ بھی نہیں بتایا کہ وہ کس قسم کا آرڈر لے کر اس کے پاس آئی تھی۔ ایک دن اینا نے مجبور ہو کر اس سے گریٹا کے بارے میں پوچھ ہی لیا۔'' سلاٹن، تم کس طرح اس کو جانتے ہو؟ کیا وہ تمہاری دوست ہے؟''

سلاٹن کے تاثرات بدل گئے۔ اس کے ماتھے پر بل پڑ گئے تھے۔ اس نے سخت لہجے میں کہا۔'' بس میں اس کے بارے میں کوئی بات سننا نہیں چاہتا۔ وہ ایک خاص آرڈر لے کر میرے پاس آئی تھی۔ اب اس کے بارے میں کوئی سوال نہ کرنا۔''

اینا نے اس کے بعد کوئی سوال نہیں کیا۔ اس نے اپنا وعدہ نبھایا تھا۔ اس کا دل تو یہی چاہتا تھا کہ وہ سب کو گریٹا کے بارے میں بتا دے لیکن اسے اپنا وعدہ یاد آ جاتا تھا۔ پھر بہار کے خوبصورت دن آ گئے۔

یہ علاقہ ویسے بھی خوبصورت تھا۔ بہار نے ہر جگہ پھول بکھیر دیے تھے۔

اس گاؤں میں سیاحوں کی آمدورفت شروع ہو گئی تھی۔ اس بار بہت سیاح آئے تھے۔ گاؤں کے لوگ اپنی اپنی بنائی ہوئی چیزیں دکان میں رکھ جاتے۔ سیاح خرید لیا کرتے۔ گاؤں والوں کی آمدنی بڑھ گئی تھی۔

ایک خوبصورت شام کو اینا کے دوست نے اس سے شادی کی درخواست کر دی۔ پیٹر اس کا پرانا دوست تھا۔ دونوں نے ایک ساتھ بہت اچھے دن گزارے تھے۔ اینا نے ہاں کر دی۔ ان کا ارادہ اسی سال شادی کے بندھن میں بندھ جانے کا تھا لیکن شادی کے لیے پیسوں کی ضرورت تھی۔ اس کے لیے دونوں نے دن رات محنت شروع کر دی۔

پیٹر اس علاقے کا ایک اچھا فٹ بال کا کھلاڑی تھا۔ وہ ہر سنیچر کو میچ کھیلا کرتا۔ یہ اس کی تفریح بھی تھی۔ اینا کی تفریح یہ تھی کہ وہ چھٹی والے دن لڈنی جا کر کوئی فلم دیکھ آتی۔ اسے فلمیں دیکھنے کا شوق تھا۔ اس کے گاؤں میں کوئی سنیما ہال نہیں تھا۔ اسی لیے اسے لڈنی جانا پڑتا تھا۔

اس کے علاقے میں اخبارات آیا کرتے تھے۔ اس نے ایک اخبار میں گریٹا کے بارے میں ایک خبر پڑھی۔ گریٹا کی تصویر بھی چھپی تھی۔ اس میں لکھا تھا کہ گریٹا کو ایک میگا فلم مل گئی ہے۔ بہت بڑی فلم تھی۔ اینا کو خبر پڑھ کر خوشی ہوئی تھی۔ اس کا دل چاہا کہ وہ سلاٹن سے یہ خبر شیئر کرے لیکن اسے اپنا وعدہ یاد آ گیا۔ لیکن اس دن جب سلاٹن اس کے کاؤنٹر کے پاس آیا تو اس نے وہ اخبار دیکھ لیا۔ اس نے گریٹا کی تصویر دیکھ لی تھی۔

''مسٹر سلاٹن، دیکھیں تو سہی۔ گریٹا کی تصویر چھپی ہے۔ اس کو ایک بہت بڑی فلم مل گئی ہے۔ لیکن یہ فلم اسے سوزی کے زخمی ہو جانے کے بعد ملی ہے۔ اس فلم میں پہلے سوزی کو کاسٹ کیا گیا تھا۔ لیکن اتفاق سے سوزی ایک حادثے میں زخمی ہو گئی تھی۔ اس کا ایک بازو ٹوٹ گیا تھا۔ اس کے بعد گریٹا کو کاسٹ کر لیا گیا تھا۔ سوزی نے بیان دیا تھا کہ وہ اپنے بیڈروم سے نکل کر واش روم کی طرف جا رہی

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

تھی کہ اس کا پیر سلپ ہو گیا اور اس کے بازو کی ہڈی ٹوٹ گئی۔''

گریٹا نے اس حادثے پر افسوس کے ساتھ یہ بھی کہا کہ یہ اتفاق ہے کہ اس کو اتنی بڑی فلم میں چانس مل گیا۔

اینا جس قدر پُرجوش ہو رہی تھی۔ سلاٹن اسی قدر ٹھنڈا ہو رہا تھا۔ وہ اس کہانی میں کوئی دلچسپی نہیں لے رہا تھا۔ وہ صرف اتنا ہی بولا تھا۔ ''پتا نہیں، ہو سکتا ہے کہ یہ اس کی خوش قسمتی ہو۔ اور جہاں تک میرا سوال ہے تو مجھے فلموں وغیرہ سے کوئی خاص دلچسپی نہیں ہے۔ اس لیے میں نہیں جانتا کہ یہ خوش قسمتی ہے یا بدقسمتی۔''

گرمیاں شروع ہو گئی تھیں۔ اس موسم کے سیاحوں کا اس گاؤں میں آنا شروع ہو گیا تھا۔ موسم بہت خوبصورت تھا لیکن اینا بہت الجھی ہوئی تھی۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ وہ گھٹن محسوس کرنے کے ساتھ ساتھ بہت سے سوالات میں بھی گھری ہوئی تھی۔ بے شمار سوالات تھے۔ گریٹا، سلاٹن کے پاس کیوں آئی تھی؟ خاص آرڈر والے کمرے میں کیا تھا۔ سلاٹن گریٹا کو اس کمرے میں کیوں لے گیا تھا؟ واپسی میں گریٹا کیوں رو رہی تھی اور اس کی قیمتی انگوٹھیاں کہاں چلی گئی تھیں؟

اب اس کے ساتھ ایک دوسری پرابلم بھی تھی۔ پیٹر اس سے محبت کرتا تھا۔ دونوں شادی کرنے والے تھے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اینا، سلاٹن کو پسند کرنے لگی تھی۔ سلاٹن عمر میں پیٹر سے زیادہ تھا لیکن وہ ذمے دار تھا۔ اس کی شخصیت میں ایسی کوئی بات تھی جو اپنی طرف متوجہ کر لیتی تھی۔ دن کا وقت اس کا سلاٹن کے ساتھ گزرتا اور شام کو وہ پیٹر کے ساتھ ہوتی۔

ایک دن سلاٹن نے اسے حیران ہی کر دیا تھا۔ وہ کوئی کام کر رہی تھی کہ وہ اینا کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ بہت غور سے اینا کو دیکھ رہا تھا۔ اینا گڑبڑا گئی۔ ''یس سر...... کیا مجھ سے کوئی غلطی ہو رہی ہے؟''

''ارے نہیں۔'' سلاٹن مسکرا دیا۔ ''میں تو یہ معلوم کرنے آیا تھا کہ کل تم کیا کر رہی ہو۔ کوئی خاص مصروفیت تو نہیں ہے؟''

''نہیں سر۔ بتائیں، کیا کرنا ہے؟'' اینا نے پوچھا۔

''میں چاہتا ہوں کہ تم کل کا دن میرے ساتھ گزارو۔'' سلاٹن نے کہا۔

''سر، وہ۔ وہ پیٹر کو شاید اچھا نہ لگے۔'' اینا نے کہا۔

''ایسی کوئی بات نہیں ہو گی۔'' سلاٹن نے کہا۔ ''پیٹر ہفتے کو اپنے فٹ بال گیم میں مصروف رہتا ہے۔ ہم لڈنی جائیں گے۔ وہاں پہلے تو کوئی اچھی سی فلم دیکھیں گے پھر کسی اچھے سے ریستوران میں کھانا کھائیں گے۔ اس کے بعد واپس آ جائیں گے۔ کچھ بھی نہیں ہو گا۔ لیکن تم فریش ہو جاؤ گی۔''

''او کے۔'' اینا مسکرا دی۔ ''میں چلوں گی لیکن ایک شرط ہے۔''

''چلو وہ شرط بھی بتا دو۔''

''شرط یہ ہے سر کہ آپ مجھے بہترین سنیما ہال میں لے جائیں گے اور بہترین کھانا کھلائیں گے۔''

سلاٹن بھی مسکرا دیا۔ ''چلو منظور ہے۔''

دوسرے دن دونوں لڈنی گئے۔ سلاٹن نے اینا کو شاپنگ کروائی۔ ایک اچھا سا سوٹ دلوایا۔ اس کے بعد دونوں سنیما چلے گئے جہاں ایک اچھی سی فلم لگی ہوئی تھی۔ فلم دیکھنے کے بعد دونوں نے ایک شاندار ریستوران میں کھانا کھایا اور واپس آ گئے۔

☆☆☆

یہ ایک خوبصورت دن تھا۔ چمکتا ہوا جو اینا کے ہونٹوں پر مسکراہٹ لے آیا تھا جبکہ پیٹر سارا دن فٹ بال کے میچ میں مصروف رہا تھا۔ سلاٹن اور اینا کی واپسی رات میں ہوئی تھی۔

سلاٹن نے اپنی گاڑی اینا کے مکان سے فاصلے پر روکی تھی۔ اینا نے اتنی خوبصورت تفریح کے لیے اس کا شکریہ ادا کیا۔ سلاٹن نے اسے خود سے بھینچ لیا تھا۔ اینا کے لیے یہ سب بہت اچانک اور حیرت زدہ کرنے والا بھی تھا اور اسے ایک طرح کی طمانیت بھی محسوس ہو رہی تھی۔

گرمیاں گزر گئیں۔ سلاٹن کی دکان پہلے کی طرح مصروف رہی۔ سلاٹن دکان پر توجہ دے رہا تھا۔ کبھی کبھی وہ اتوار کو بھی دکان کھول لیا کرتا۔ اینا دونوں طرف سے الجھن میں تھی۔

اسے سلاٹن بھی پسند آ رہا تھا۔ وہ ایک امیر انسان تھا۔ اس میں ایک خاص قسم کی کشش تھی۔ وہ اینا کو زندگی کی خوشیاں دے سکتا تھا۔ دوسری طرف پیٹر تھا جو اس کا بچپن کا ساتھی اور منگیتر تھا لیکن وہ اینا کو شاپنگ نہیں کروا سکتا تھا۔ اس کے پاس اتنا نہیں ہوتا کہ وہ اینا کو کہیں باہر لے جا سکے۔ اس کی ساری دلچسپی فٹ بال میں تھی۔ وہ ہر ہفتے کو فٹ بال کھیلا کرتا تھا۔

ایک اتوار کو فٹ بال کا بہت بڑا میچ تھا۔ یہ ستمبر کی

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

ایک خوش گوار شام تھی۔ لوگ اپنے ٹی وی سیٹ کے سامنے اس میچ کو دیکھنے کے لیے بیٹھ گئے تھے۔ پورے گاؤں میں سب سے بڑا ٹی وی سیٹ مسٹر ہارٹ کے پاس تھا۔ اس نے کئی لوگوں کو دعوت دی تھی کہ وہ اس کے گھر آکر میچ دیکھیں۔ ان لوگوں میں پیٹر اور اینا بھی تھے۔

یہ بات میچ سے ایک دن پہلے کی ہے۔ اینا نے دکان بند کی۔ اس نے دکان کا سامان معمول کے مطابق سمیٹنا شروع کیا۔ اسی وقت گھنٹی بج اٹھی۔ کوئی آیا تھا۔ اس نے دروازہ کھولا۔ ایک نوجوان کھڑا تھا جس کے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا سوٹ کیس تھا۔

''جی فرمائیں۔ میں کیا مدد کرسکتی ہوں؟'' اینا نے پوچھا۔

''مجھے مسٹر سلاٹن سے ملنا ہے۔'' اس نوجوان نے کہا۔

''مجھے افسوس ہے کہ شاید آج ملاقات نہ ہو سکے۔ دکان بند ہو چکی ہے۔'' اینا نے کہا۔

''لیکن میری ان سے ملاقات طے ہے۔'' نوجوان نے بتایا۔

اس سے پہلے کہ اینا کچھ اور کہتی سلاٹن پیچھے آکر کھڑا ہوگیا۔ ''ہاں میں نے ان کو وقت دیا تھا۔'' سلاٹن نے کہا پھر اس نے نوجوان کی طرف دیکھا۔ ''تم لیٹ ہو گئے ہو۔''

''سوری۔ میں ایک......''

سلاٹن نے اس نوجوان کی بات کاٹ دی۔ اس کا لہجہ بہت خشک تھا۔ ''میں بے اصولی پسند نہیں کرتا۔''

اینا نے دیکھا۔ وہ نوجوان خوف زدہ دکھائی دے رہا تھا۔ پھر اس نے پوچھا۔ ''تو کیا میں واپس چلا جاؤں؟''

''چلو، آجاؤ اندر۔'' سلاٹن نے کہا۔ پھر اس نے اینا کی طرف دیکھا۔ ''پانچ بج رہے ہیں۔ تم گھر جاسکتی ہو۔'' اس نے کہا۔

''لیکن سر...... میں کچھ دیر رکنا چاہتی ہوں۔'' اینا نے کہا۔

''میں نے کہا کہ تم گھر جاؤ۔'' سلاٹن کی آواز بلند تھی اور لہجہ درشت تھا۔

اس کے باوجود اینا وہاں رکنا چاہتی تھی۔ وہ دیکھنا چاہتی تھی کہ وہ نوجوان کیوں آیا ہے۔ وہ تجسس میں مبتلا ہوگئی تھی۔ ویسا ہی تجسس جیسا اداکارہ گریٹا کے آنے سے ہوا تھا۔ سلاٹن اس نوجوان کو اپنے ساتھ اندر لے گیا۔ اسی کمرے میں۔ اسپیشل آرڈر والے کمرے میں۔ جہاں سلاٹن کی اجازت کے بغیر کسی کو جانے کی اجازت نہیں تھی۔ ایک اور خاص کسٹمر آگیا تھا۔

اینا کاؤنٹر پر بیٹھ کر کچھ دیر انتظار کرتی رہی لیکن کب تک۔ پانچ بج کر تیس منٹ ہو چکے تھے۔ اس نے اپنا کوٹ اٹھایا اور دکان سے باہر آگئی۔ لیکن وہ زیادہ دور نہیں گئی۔ وہ ایک کونے میں جاکر کھڑی ہوگئی۔ وہاں سے دکان دیکھی تو نہیں جاسکتی تھی لیکن دکان سے باہر آنے والے کا پتا چل سکتا تھا۔ کچھ دیر بعد دکان کا دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔ وہ نوجوان واپس جارہا تھا۔

اینا نے اس کی آواز سنی۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ''کیا ایسا ہو جائے گا؟''

''کیا مطلب ہے تمہارا؟'' سلاٹن کی تیز آواز آئی۔

''میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ کیا اس کے سوا اور کوئی راستہ نہیں ہے؟''

''نہیں، کوئی راستہ نہیں ہے۔ تم فکر مت کرو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

اینا نے آڑ سے نکل کر دیکھا۔ وہ نوجوان اپنی گاڑی کی طرف جارہا تھا اور اس کے ہاتھ میں وہ چھوٹا سا سوٹ کیس نہیں تھا جو وہ اپنے ساتھ لایا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ اپنی گاڑی تک پہنچ سکتا، اینا تیزی سے اس کے سامنے جاکر کھڑی ہوگئی۔ ''ایکسکیوزمی۔'' اینا نے آواز دی۔

نوجوان رک گیا۔

''میرا خیال ہے کہ آپ کوئی چیز دکان میں بھول کر جارہے ہیں۔'' اینا نے کہا۔

''نہیں تو۔'' نوجوان نے کہا۔ ''میں کچھ بھول کر نہیں جارہا۔''

اینا نے اس کی طرف دیکھا اور خود ہی کانپ کر رہ گئی۔ اس نوجوان کا چہرہ سفید ہو رہا تھا۔ انتہائے خوف سے۔ جیسے وہ دکان کے اندر کوئی بھیانک چیز دیکھ کر باہر آیا ہو۔ ''جاؤ، چلی جاؤ۔'' اس نے کہا۔ ''میں کچھ نہیں بھولا۔ جاؤ۔ مجھے جانے دو۔''

پھر وہ گاڑی میں بیٹھا اور اتنی تیزی سے گاڑی اسٹارٹ کرکے لے گیا جیسے دنیا بھر کی بلائیں اس کا پیچھا کر رہی ہوں۔ اینا اپنی جگہ ساکت کھڑی رہی تھی۔ کئی سوالات تھے۔ وہ نوجوان کارنر شاپ کیوں آیا تھا۔ اس کو خاص کمرے میں کیوں لے جایا گیا تھا۔ وہ کیا خاص آرڈر دینے آیا تھا۔ اور وہ اپنے ساتھ جو سوٹ کیس لایا تھا، وہ کہاں چلا گیا تھا؟

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

اگلے دن فٹ بال میچ تھا۔ ہارٹ نے گاؤں کے دس آدمیوں کو اپنے ٹی وی پر میچ دیکھنے کی دعوت دی تھی۔ ان میں اینا اور پیٹر بھی تھے۔ اینا کو فٹ بال سے زیادہ دلچسپی نہیں تھی۔ وہ ہارٹ کی بیوی کے ساتھ کچن میں لگی رہی تھی۔

ٹی وی لاؤنج میں اٹھنے والے شور سے اندازہ ہو رہا تھا کہ میچ بہت اچھا ہو رہا ہے۔ سب شور کر رہے تھے۔ ہاف ٹائم کے وقت پیٹر کچن میں داخل ہوا۔ ''اینا چلو میچ دیکھ لو۔ بہت زبردست جا رہا ہے۔ تم بھی انجوائے کرو۔ میک بیلی نے بہت اچھا گول کیا ہے۔ مزہ آ گیا۔''

''نہیں بھئی، مجھے تو کچن میں مزہ آ رہا ہے۔'' اینا نے کہا۔ ''تم ایسا کرو۔ یہ چائے کی ٹرے اپنے ساتھ لے جاؤ۔'' اینا نے ٹرے پیٹر کی طرف بڑھا دی۔

پیٹر ٹرے اپنے ساتھ لے گیا۔ میچ اپنے عروج پر تھا۔ میک بیلی نے دوسرا گول بھی کر دیا تھا۔ اسکور دو صفر تھا۔ اسی دوران مخالف نے بھی دو گول کر دیے۔ اب اسکور برابر ہو گیا تھا۔ میچ ختم ہونے میں صرف پانچ منٹ رہ گئے تھے۔

پیٹر اپنے پسندیدہ کھلاڑی کے لیے شور کیے جا رہا تھا۔ شاباش بیلی شاباش۔ ایک اور گول۔ ایک اور گول۔ پھر آخری لمحوں میں بیلی نے ایک اور گول کر کے اپنی ٹیم کو فتح دلوا دی۔ پھر کچھ گڑبڑ ہو گئی۔ بیلی مخالف ٹیم کے گول پوسٹ کے برابر ہی تھا۔ اس نے بال کو بہت زوردار ٹھوکر ماری تھی لیکن وہ زوردار ٹھوکر بال کے ساتھ ساتھ گول کیپر کی گردن پر بھی پڑی تھی جس کی وجہ سے اس کی گردن کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی اور وہ بہت بُری طرح زخمی تھا۔

میدان میں اسٹریچر اور ڈاکٹر وغیرہ آ گئے تھے۔ کچن سے ہارٹ کی بیوی اور اینا بھی باہر آ گئی تھیں۔

''کیا ہوا؟'' ہارٹ کی بیوی نے پوچھا۔

اسے سچویشن بتا دی گئی تھی۔ کھیل ختم ہو چکا تھا۔ ایک ٹی وی اینکر میک بیلی سے انٹرویو لینے لگا تھا۔

''بیلی تم نے آج بہت شاندار کھیل کا مظاہرہ کیا ہے۔ خاص طور پر تمہارا تیسرا گول تو کمال کا تھا۔ تو کیا تمہیں امید تھی کہ تم اپنی ٹیم کو کامیابی دلا سکو گے؟''

بیلی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ بہت خوف زدہ دکھائی دے رہا تھا۔ بار بار ہونٹوں پر زبان پھیر رہا تھا۔ اس سے دوسرا سوال اس زخمی گول کیپر کے بارے میں کیا گیا لیکن اس بار بھی وہ خاموش رہا تھا۔ وہ ہولے ہولے کانپ رہا تھا۔ سب لوگ ٹی وی کی طرف متوجہ تھے لیکن کسی نے اس بات پر دھیان نہیں دیا تھا کہ اینا وہاں نہیں تھی۔ وہ اٹھ کر کچن میں آ گئی تھی۔

اینا بھی بہت خوف زدہ تھی۔ وہ بھی کانپ رہی تھی۔ وہ میک بیلی سے پہلے بھی مل چکی تھی۔ یہ وہی نوجوان تھا، جو سلاٹن سے ملنے آیا تھا۔

اینا کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اب اسے کیا کرنا چاہیے۔ وہ ابھی صرف اٹھارہ برس کی تھی۔ اس نے زندگی کے زیادہ رنگ نہیں دیکھے تھے۔ وہ سلاٹن سے بیلی کے بارے میں پوچھنا چاہتی تھی لیکن اس کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔

وہ پوچھنا چاہتی تھی کہ بیلی اس کے پاس کیوں آیا تھا؟ گریٹا کیوں آئی تھی۔ اسپیشل آرڈر کیا ہوتا تھا۔ اس کمرے میں کیا تھا۔

ایک دن اینا اور سلاٹن دکان میں اکیلے تھے۔ اس وقت کوئی کسٹمر نہیں تھا۔ سلاٹن نے پیٹر کے بارے میں پوچھا۔ ''تمہارا پیٹر کیسا ہے؟''

''ٹھیک ہے۔''

''وہ تو اپنے کھیل میں مصروف رہتا ہوتا ہوگا۔ تم سے کہاں ملاقات ہوتی ہوگی؟''

''نہیں سر۔ ہفتے میں ہم دو تین بار مل لیتے ہیں۔'' اینا نے بتایا۔

''تم دونوں کا شادی کا کیا ارادہ ہے؟''

''ابھی ہم نے ایسا کوئی فیصلہ نہیں کیا ہے؟'' اینا نے بتایا۔ ''میرا خیال ہے کہ اگلے سال تک۔''

''تم کچھ بھی بہت اکتائی سی لگتی ہو۔'' سلاٹن نے کہا۔ ''تم کچھ تبدیلی کیوں نہیں لاتیں؟''

''کیسی تبدیلی سر؟''

''تم ایسا کرو۔ میرے ساتھ لندن چلو۔ تفریح کرنے اور اس یکسانیت کا شکار زندگی سے کچھ نجات کے لیے۔ دو دن کی تفریح کے بعد فریش ہو کر واپس آؤ گی۔''

اینا اس وقت بہت پُرجوش بھی ہو رہی تھی۔ اس کے ساتھ ہی اسے خوف سا بھی محسوس ہو رہا تھا۔ وہ صرف ایک بار لندن گئی تھی۔ وہ بھی ایک دن کے لیے۔ اس نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ''لیکن پیٹر سے کیا کہوں گی؟''

''اوہو...... بھول جاؤ۔ اس وقت ہم وہاں جی بھر کے سیر کریں گے۔ اچھے ہوٹلوں میں کھانے کھائیں گے۔ شاپنگ کریں گے۔ اچھی سی فلمیں دیکھیں گے۔ اس کے بعد واپس آ جائیں گے۔ پیٹر کو پتا نہیں چلے گا۔ وہ ویسے بھی اپنے کھیلوں میں مصروف رہتا ہے۔''

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

اینا کچھ سوچنے لگی۔ پھر اس نے سلاٹن کی طرف دیکھا۔ ''چلیں سر۔ میں آپ کے ساتھ چلنے کو تیار ہوں لیکن ایک شرط ہے۔''

''اچھا۔ چلو وہ شرط بھی بتا دو۔''

''آپ کا اسپیشل آرڈر کیا ہوتا ہے۔ لوگ کیوں آتے ہیں۔ کیوں وہ آپ کے ساتھ اس کمرے میں چلے جاتے ہیں جہاں کسی کو بھی جانے کی اجازت نہیں ہے۔''

''اوہ......!'' سلاٹن نے ایک گہری سانس لی۔ ''اینا تم ایک ہوشیار لڑکی ہو۔ تم اچھی بارگیننگ کر رہی ہو۔''

''جو بھی سمجھ لیں سر۔'' اینا نے کہا۔ ''بتائیں یہ سب کیا ہے؟''

اچانک سلاٹن کا لہجہ درشت ہو گیا۔ ''ٹھیک ہے۔'' اس نے کہا۔ ''لیکن صرف ایک سوال کی اجازت ہے۔ صرف ایک سوال۔''

''سوال یہ ہے کہ لوگ کیوں آتے ہیں۔ اور......''

''اور نہیں......!'' سلاٹن چیخ پڑا۔ ''میں نے کہا تھا نا کہ صرف ایک سوال۔''

''اچھا چلیں یہ بتا دیں کہ کیوں آتے ہیں؟''

''مجھ سے مدد مانگنے آتے ہیں اور میں ان کی مدد کر دیتا ہوں... بلکہ اپنی مدد بیچتا ہوں۔''

''میں نہیں سمجھی۔ کس قسم کی مدد؟''

اب سلاٹن بھڑک اٹھا۔ ''میں نے کہا تھا نا کہ صرف ایک سوال۔ بس۔''

اینا نے اس کے بعد کوئی سوال نہیں کیا۔ اس کے اور سلاٹن کے درمیان ایک معاہدہ ہوا تھا کہ وہ صرف ایک سوال پوچھے گی۔ سلاٹن اس کا جواب دے گا۔ وہ جواب دے چکا تھا۔

بہرحال اب اینا کو اس کے ساتھ لندن جانا تھا۔

جمعے کی شام کو وہ لندن پہنچے۔ رات کا کھانا ایک اچھے سے ہوٹل میں کھایا۔ اس کے بعد ان کا قیام بھی ایک خوبصورت ہوٹل میں ہوا تھا۔ ہفتے کے دن سلاٹن نے اسے شاپنگ بھی کروائی۔ پھر شام کے وقت وہ ایک اچھی سی فلم دیکھنے چلے گئے۔ اتوار کا دن انہوں نے ایک پارک کی سیر کی۔ اور اتوار کی شام کو واپس آ گئے۔

پیر کی صبح اینا معمول کے مطابق کارنر شاپ پہنچ گئی۔ اس دن زیادہ کسٹمر نہیں آئے تھے۔ اور جو آئے بھی وہ مقامی افراد تھے جنہیں روزمرہ ضرورت کی چیزیں درکار تھیں۔ دوپہر کے وقت پیٹر اس کے پاس آ گیا۔ اینا اس کو دیکھ کر بہت خوش ہوئی تھی۔ ''ہیلو۔'' اس نے خوش دلی سے کہا۔

پیٹر کچھ بجھا ہوا سا دکھائی دے رہا تھا۔

''بتاؤ۔ تمہارا میچ کیسا رہا؟'' اینا نے پوچھا۔

''ہماری ٹیم جیت گئی لیکن میں اس میں کھیل نہیں سکا تھا۔ میں گیا ہی نہیں تھا۔''

''کیوں؟''

''میری طبیعت خراب تھی۔ اسی لیے میں تین چار دن تک گاؤں میں ہی رہا۔'' پیٹر نے بتایا۔

اینا کا چہرہ زرد ہو گیا تھا۔ ''اب کیسے ہو تم؟'' اس نے پوچھا۔

''ٹھیک نہیں ہوں۔'' پیٹر نے بتایا۔ ''اور میری بیماری کی وجہ بھی تم اچھی طرح جانتی ہو۔''

''میں؟ میں کیا جانوں؟''

''اور کون جان سکتا ہے۔ کیا تم اور سلاٹن لندن کی سیر نہیں کرتے رہے ہو۔ کیا وہ تم کو اپنے ساتھ نہیں لے گیا تھا۔ اینا یہ ایک چھوٹا سا قصبہ ہے۔ یہاں ایسی باتیں چھپی نہیں رہ سکتیں۔ سب کو معلوم ہو جاتی ہیں۔''

''پیٹر، تم غلط سمجھ رہے ہو۔'' اینا نے کہا۔

''میں سب سمجھ رہا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ یہ سب کیا ہے۔ سیدھی سی بات ہے۔ سلاٹن ایک پیسے والا انسان ہے۔ وہ تفریح کروا سکتا ہے۔ شاپنگ کروا سکتا ہے جو میں نہیں کر سکتا۔ کیونکہ میں ایک غریب انسان ہوں۔ میرے پاس وہ وسائل نہیں ہیں۔''

''پیٹر تم میری بات سمجھنے کی کوشش تو کرو۔ سلاٹن کے ساتھ کچھ ایسا معاملہ ہے جس نے مجھے......''

لیکن پیٹر نے اسے بولنے کا موقع نہیں دیا تھا۔ ''بس بہت ہو گئی۔ سلاٹن۔ سلاٹن۔ سلاٹن۔ اب میرے سامنے اس کا نام نہیں لینا۔'' اس نے کہا اور ایک جھٹکے سے مڑ کر دکان سے باہر چلا گیا۔ اینا سکتے میں رہ گئی۔ وہ پیٹر کو ناراض نہیں کرنا چاہتی تھی۔ وہ اسے سلاٹن کے بارے میں سب کچھ بتانا چاہتی تھی۔ اس کا حیرت انگیز رویہ۔ اس کا اسپیشل کمرا۔ اس کے یہاں آنے والے لوگ۔ گریٹا، بیلی اور بھی وہ لوگ جو پُراسرار طور پر آتے تھے اور سلاٹن جن کو اپنے خاص کمرے میں لے جاتا تھا۔ وہ سب کچھ پیٹر کو بتا دینا چاہتی تھی۔

اس نے پیٹر کو آوازیں بھی دیں لیکن اس نے مڑ کر نہیں دیکھا۔

وقت گزرتا گیا۔ اکتوبر آ گیا۔ یہ سردیوں کے دن

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

تھے۔ کارنر شاپ کی مصروفیات اسی طرح چل رہی تھیں لیکن اینا اب بجھ کر رہ گئی تھی۔ وہ اپنی عمر سے زیادہ کی دکھائی دینے لگی تھی۔ اس نے باہر آنا جانا بھی چھوڑ دیا تھا۔ وہ بہت تھکی تھکی سی دکھائی دیتی۔ گاؤں والوں کو معلوم ہو گیا تھا کہ اس کے اور پیٹر کے درمیان فاصلے ہو گئے ہیں۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ وہ سلاٹن کے ساتھ لندن گئی تھی۔

وہ ایک ہنسنے بولنے والی لڑکی تھی لیکن اب بدل کر رہ گئی تھی۔ وہ اب بھی روزانہ دکان جایا کرتی۔ اسے اب سلاٹن کے خاص کسٹمر کا انتظار تھا۔ وہ یہ دیکھنا چاہتی تھی کہ اب کون آتا ہے۔ اسے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔

ایک دوپہر ایک آدمی دکان میں داخل ہوا۔ وہ ایک ادھیڑ عمر انسان تھا۔ اس نے قیمتی کپڑے پہن رکھے تھے۔ اس کی مونچھیں بہت شاندار تھیں۔ اس کے ہاتھ میں ایک بریف کیس بھی تھا۔

''گڈ نون سر!'' اینا نے کہا۔ اس کا لہجہ بہت نرم تھا۔ اس نے اندازہ لگا لیا تھا کہ یہ بھی کوئی خاص کسٹمر ہے۔

اس آدمی نے سلام کا جواب دیتے ہوئے کہا۔ ''مجھے مسٹر ڈیو سلاٹن سے ملنا ہے۔''

اینا نے بات کا سلسلہ بڑھانے کی غرض سے پوچھا۔ ''کیا آپ کوئی سیلز مین ہیں؟''

حالانکہ وہ جانتی تھی کہ یہ شخص سیلز مین نہیں ہو سکتا۔ پھر بھی وہ اس میں دلچسپی لے رہی تھی۔

''ہاں۔ میں سیلز مین ہوں۔'' اس آدمی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''فرمائیں سر۔ عام طور پر میں ہی سیلز مین سے ڈیل کرتی ہوں۔ آپ مجھے بتائیں۔''

اینا نے اس کے بریف کیس کی طرف دیکھا۔ اس پر موٹے حروف میں لکھا تھا۔ A R I C S۔ جو اینا کی سمجھ میں نہیں آسکا تھا۔ اس نے اس آدمی سے کہا۔ ''سر اگر کوئی بزنس کی بات ہے تو مجھے بتا دیں۔''

''نہیں۔ مسٹر سلاٹن سے میرا ملنا ضروری ہے۔'' اس نے کہا۔

''ویسے تو وہ اس وقت بہت مصروف ہیں لیکن میں انہیں جا کر بتا دیتی ہوں۔ نام کیا ہے آپ کا؟'' اس نے پوچھا۔

''رابرٹ۔ آرتھر رابرٹ۔'' اس نے بتایا۔

اینا اندر چلی گئی۔ سلاٹن سیڑھیوں سے نیچے ہی آرہا تھا۔ اس نے پکار کر بتایا۔ ''ایک صاحب آپ سے ملنے آئے ہیں۔''

سلاٹن باہری کمرے کی طرف آیا۔ ''ہیلو مسٹر رائیزمین۔'' اس نے اس آدمی کو مخاطب کیا۔

''ہیلو مسٹر سلاٹن۔ تم سے مل کر خوشی ہوئی۔'' دونوں ہاتھ ملا رہے تھے۔

اینا کو یہ سن کر حیرت ہوئی تھی کہ اس آدمی کا نام رابرٹ نہیں رائیزمین تھا۔ پھر اس نے غلط بیانی کیوں کی تھی۔ سلاٹن اس آدمی کو اپنے ساتھ اسی مخصوص کمرے میں لے گیا تھا وہاں نہ جانے کیا ہوتا تھا اور اس کے بھید اینا کی نگاہوں سے چھپے ہوئے تھے۔

سلاٹن کچھ دیر بعد کمرے سے باہر آگیا تھا۔ اس نے اینا سے کہا۔ ''اینا، لنچ ٹائم ہو گیا ہے۔ تم جا سکتی ہو۔''

''شکریہ سر۔ میں کچھ دیر میں چلی جاؤں گی۔''

سلاٹن پھر اسی کمرے میں چلا گیا لیکن اینا وہیں کاؤنٹر پر رہی۔ اس کی سمجھ میں آرہا تھا کہ حرف اے کا مطلب تھا آرتھر۔ اور آر کا مطلب تھا رائیزمین۔ لیکن آئی سی ایس اس کی سمجھ میں نہیں آیا تھا۔

کچھ دیر بعد اینا نے دونوں کی آوازیں سنیں۔ دونوں اس کمرے سے باہر نکل آئے تھے۔ اور رائیزمین واپس جا رہا تھا۔ ''تمہارا بہت شکریہ مسٹر سلاٹن۔'' رائیزمین نے کہا۔

اینا نے سلاٹن کی آواز سنی۔ ''میری اسسٹنٹ لنچ کے لیے گئی ہے۔ تم خود ہی دروازہ کھول کر جا سکتے ہو۔''

اینا نے اس کے قدموں کی آہٹ سنی۔ وہ اوپر جا رہا تھا۔ رائیزمین باہر کے کمرے میں آگیا جہاں اینا کاؤنٹر پر بیٹھی تھی۔ وہ اینا کو دیکھ کر حیران ہوا تھا۔ ''اوہ، میں یہ سمجھا تھا کہ تم لنچ کے لیے جا چکی ہو۔'' اس نے کہا۔

''نہیں مسٹر رابرٹ۔ میں نے لنچ یہیں کر لیا ہے۔'' اینا نے بتایا۔

''میرا نام رابرٹ نہیں رائیزمین ہے۔'' اس نے کہا اس کے لہجے میں سختی تھی۔

''سوری مسٹر رائیزمین۔'' اینا مسکرا دی۔ ''آپ ہمارے یہاں کی فریش روٹی کیوں نہیں ٹرائی کرتے۔ گھر کی بنی ہوئی ہے۔ بہت اچھی ہوتی ہے۔''

اینا نے اسے روٹی کا ایک ٹکڑا توڑ کر دیا۔ اس نے وہ اپنے منہ میں رکھ لیا۔ ''واقعی بہت لذیذ ہے۔''

اینا نے روٹی ایک شاپر میں رکھ دی۔ اس آدمی نے اس کی قیمت دے دی تھی۔ اینا نے کہا۔ ''سر لائیں۔ میں یہ شاپر آپ کے بریف کیس میں رکھ دوں۔''

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

"بریف کیس؟ لیکن میرے پاس تو کوئی بریف کیس نہیں ہے۔"

"سر۔ شاید آپ اپنا بریف کیس کمرے میں بھول آئے ہیں۔ میں لے کر آتی ہوں۔"

اینا نے کاؤنٹر سے باہر آکر اندر کی طرف جانا چاہا کہ اس آدمی نے اچانک اس کا ہاتھ تھام لیا۔ "جہنم میں جائے بریف کیس۔ میرے پاس کوئی بریف کیس نہیں تھا اور مجھے ضرورت بھی نہیں ہے۔" اس کی گرفت بہت سخت تھی۔

"ٹھیک ہے سر ٹھیک ہے لیکن میرا ہاتھ تو چھوڑیں۔ آپ تو مجھے تکلیف پہنچا رہے ہیں۔"

اس نے اینا کا ہاتھ چھوڑ دیا اور تیزی کے ساتھ دکان سے باہر نکل گیا۔ اس نے اپنا شاپر بھی نہیں لیا تھا۔

اینا کو اب کسی خبر کا انتظار تھا۔ کسی انہونی کا۔ اس کا تجربہ تھا کہ سلاٹن کے پاس جو لوگ بھی آئے، ان کی کوئی نہ کوئی خبر ضرور اخبارات میں آئی تھی۔ جیسے گریٹا گورڈن۔ مائیک بیلی اور اب یہ رائیز مین۔ ایک بات اور بھی تھی کہ جو بھی یہاں آیا وہ اپنا کچھ نہ کچھ بھول کر یا چھوڑ کر یا دے کر چلا گیا تھا۔ گریٹا نے اپنی انگوٹھیاں چھوڑ دی تھیں۔ مائیک بیلی اپنا بیگ بھول گیا تھا اور اب یہ رائیز مین اپنا بریف کیس چھوڑ کر چلا گیا تھا۔

وہ ARICS میں بھی الجھی ہوئی تھی۔ اے آرتھر تو ہوگیا۔ آر سے رائز مین ہوگیا۔ اب یہ آئی سی ایس کیا تھا۔ ہو سکتا تھا کہ یہ اس کی کمپنی کا نام ہو۔

وہ اس معمے کو حل کرنا چاہتی تھی۔ اس نے خبارات دیکھے۔ ٹی وی کی خبریں سنیں۔ ریڈیو سنتی رہی لیکن آئی سی ایس کا معما حل نہیں ہوا۔ پھر اس کے ذہن میں آیا کہ اس کا سراغ لندن جا کر ہی مل سکتا ہے۔ وہ آدمی لندن سے آیا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ وہیں سے اس بھید کا کوئی سراغ مل جائے۔

ایک جمعے کے دن اس نے سلاٹن کے لیے ایک پرچہ لکھا کہ وہ کسی کام سے لڈنی جا رہی ہے اور شاپ نہیں آسکے گی۔

اس نے لڈنی کے لیے بس پکڑی اور ٹرین کے ذریعے لندن آگئی۔ اور ٹرین سے اترتے ہی آئی سی ایس کا معما حل ہوگیا۔ ایک بہت بڑا ہولڈنگ لگا ہوا تھا۔ جس پر لکھا تھا۔

"آئی سی ایس۔" انٹرنیشنل کمپیوٹر کمپنی۔ ساتھ میں رابطے کے لیے نمبر بھی تھا۔

وارث شاہ کے اشعار سے

"نیکی، سماج کے جامد رسم و رواج کی پابندی سے حاصل نہیں ہوتی بلکہ خلوص اور پیار سے حاصل ہوتی ہے۔"

"عشق انسان کے ذہن و قلب میں حارج خودغرضی کی پھپھوندی دور کر کے اسے سچی مسرت سے ہمکنار کرتا ہے۔"

"عورت سے بحث کرنا سراسر حماقت ہے۔ عورت کی منطق نرالی ہوتی ہے۔ اور وہ افلاطون کی داڑھی بھی کتر لیتی ہے۔"

"سماج میں ننگ و ناموس کے نام پر ایک دوسرے سے نفرت کرنے والے مرد عورتوں کو بیاہ دیا جاتا ہے اور پیار کرنے والوں کی راہ میں سنگین دیواریں کھڑی کر دی جاتی ہیں۔"

"پیار، تیز مزاج، تندخو اور لڑاکا عورتوں کو بھی سدھا لیتا ہے۔"

سرائے عالمگیر سے سعدیہ علوی کا انتخاب و تحریر

اس نے اس نمبر پر فون کیا۔ فون اٹھانے والی کوئی عورت تھی۔

اینا نے پوچھا۔ "مجھے مسٹر رائیز مین سے بات کرنی ہے۔ وہ شاید اس کمپنی میں کام کرتے ہیں؟"

"کام......!" دوسری طرف سے ہنسنے کی آواز آئی۔ "وہ اس کمپنی کے وائس چیئرمین ہیں۔"

"کیا میں ان سے بات کر سکتی ہوں؟"

"نہیں، وہ اس وقت میٹنگ میں ہیں۔ ان سے بات نہیں ہو سکتی۔"

"اور شام کے وقت؟"

"نہیں، شام کے وقت بھی نہیں۔ وہ شام کے وقت سوئٹزرلینڈ جا رہے ہیں۔ ان سے ایک ہفتے کے بعد بات ہو سکے گی۔"

اینا نے فون بند کر دیا۔ شام کے وقت اس نے واپسی کی ٹرین پکڑ لی۔ اس نے اسٹیشن سے وقت گزارنے کے لیے شام کا اخبار لے لیا تھا۔ پہلے ہی صفحے پر ایک خبر تھی۔

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

بہت ہی بھیانک خبر تھی۔ ایک پرائیوٹ طیارہ لندن سے کچھ فاصلے پر تباہ ہوگیا تھا۔ اس کے تمام مسافر مارے گئے تھے۔ وہ طیارہ سوئٹزرلینڈ جارہا تھا اور اس میں آئی سی ایس کمپنی کے عہدیدار سوار تھے۔ کمپنی کا ہیڈ بھی اس حادثے میں ہلاک ہوگیا تھا۔

کمپنی کے وائس چیئرمین مسٹر رائیز مین کو اس طیارے میں سفر کرنا تھا۔ لیکن ان کی ایک میٹنگ نکل آئی تھی جس کی وجہ سے وہ سفر نہیں کر سکے تھے۔ امید ہے کہ اب مسٹر رائیز مین ہی اس کمپنی کے ہیڈ مقرر ہوجائیں گے۔

کیا تھا یہ سب۔ اینا چکرا کر رہ گئی تھی۔ سلاٹن کیا تھا۔ اس کے پاس آنے والے اسپیشل کسٹمر کس کام کے لیے اس کے پاس آیا کرتے تھے۔ سلاٹن ان کی کس طرح مدد کیا کرتا تھا۔ اب تک جو بھی حادثے ہوئے انہیں اتفاق تو نہیں کہا جا سکتا تھا۔

دوسرے دن سلاٹن نے اس سے کچھ نہیں پوچھا۔ اس نے بھی کچھ نہیں بتایا تھا۔ سلاٹن نے اس سے کہا۔ ”میں کسی کام سے جارہا ہوں۔ میری واپسی دو چار گھنٹوں میں ہو گی۔“

وہ چلا گیا۔ اینا شاپ میں تنہا رہ گئی تھی۔ یہ بہت اچھا موقع تھا۔ شاپ میں اس وقت کوئی کسٹمر بھی نہیں تھا۔ اینا دکان کے پچھلے حصے میں پہنچ گئی جہاں وہ پُراسرار کمرا موجود تھا۔ اینا نے دروازے کا ہینڈل گھمایا۔ اس کی خوش قسمتی سے دروازہ کھلا ہوا تھا۔ سلاٹن اسے لاک کرنا بھول گیا تھا۔

اینا نے دروازے کو ہلکا سا دھکا دیا۔ وہ اندر کی طرف کھلتا چلا گیا۔

وہ پُراسرار کمرا تاریک اور گرم تھا۔ اینا نے اندر آکر بلب روشن کر دیا۔ روشنی تو ہوئی تھی لیکن بہت کمزور سی تھی۔ بہرحال اس نے ہر طرف دیکھنا شروع کر دیا۔ ہر طرف کارٹن تھے۔ باکس تھے۔ ایک میز تھی۔ دو کرسیاں تھیں۔ میز پر کوئی ایسا کاغذ یا سلپ وغیرہ نہیں تھی جو کسی قسم کے آرڈر کو ظاہر کرسکتی۔ اگر اسپیشل آرڈر لیے بھی جاتے تھے تو زبانی ہی ہوتے ہوں گے۔

اس نے ایک بکس کھولا۔ اس میں پرانے اخبارات اور میگزین وغیرہ تھے۔ ان کے بعد پرانے میلے کچیلے کپڑے تھے۔ اور ان کے بعد نوٹوں کی گڈیاں تھیں۔ ڈالرز۔ پونڈز۔ فرنچ جرمن۔ روسی۔ غرض کہ دنیا کے بہت سے ملکوں کی کرنسیاں اس بکس میں موجود تھیں۔ اینا حیران رہ گئی تھی۔ اس نے اپنی زندگی میں کبھی اتنے نوٹ نہیں دیکھے ہوں گے۔ اس نے بکس بند کیا اور دوسری طرف متوجہ ہوگئی۔ ایک طرف مائیک نیلی کا بریف کیس رکھا ہوا تھا۔ اینا نے اسے کھول کر دیکھا۔ وہ خالی تھا۔ پھر اسے رائیز کا سوٹ کیس نظر آگیا۔ اس نے اسے بھی کھول لیا۔ وہ بھی خالی تھا۔ اس میں بھی کچھ نہیں تھا۔

پھر اسے ایک بڑا سا بکس نظر آگیا۔ اس میں بہت سی گڑیاں تھیں۔ خوبصورت گڑیاں۔ لیکن ادھوری۔ کسی کی ٹانگیں ٹوٹی ہوئی تھیں۔ کسی کے بازو توڑ دیے گئے تھے۔ کسی کی آنکھیں نکلی ہوئی تھیں۔ اس نے اس بکس میں کچھ گاڑیاں بھی دیکھیں لیکن سب کی سب ٹوٹی ہوئی تھیں۔ ایک میز پر ایک میگزین بھی تھا جو فٹ بال کے حوالے سے تھا۔ اس میں تصویریں بھی تھیں لیکن ہر تصویر پھٹی ہوئی تھی۔ جان بوجھ کر پھاڑی گئی تھیں۔

ایک دوسرے بکس میں ٹوٹی گاڑیوں کے ساتھ ساتھ اسے ایک ہوائی جہاز کا ماڈل بھی مل گیا لیکن اس کے بھی پر ٹوٹے ہوئے تھے۔ اس کی حیرت میں اضافہ ہوتا جارہا تھا۔

حیرت انگیز کلیکشن تھا۔ کیا تھا یہ سب؟ اس نے یہ سب کچھ ایک میز پر سجا دیں۔ وہ حیرت سے انہیں دیکھ رہی تھی۔

اچانک وہ خوف سے اچھل پڑی۔ اس نے کسی کی آہٹ سنی تھی۔ کوئی دروازے پر تھا۔ دروازہ کھلا اور سلاٹن اندر داخل ہوگیا۔ اس نے میز پر بکھری چیزیں دیکھیں اور ہنس پڑا۔

”تم کو شاید گریٹا کی انگوٹھیاں نہیں مل سکی ہوں گی؟ کیوں۔“ وہ ہنس رہا تھا۔ ”میں جانتے ہوئے دروازہ کھول گیا تھا۔ مجھے اندازہ تھا کہ تم کمرے کا بھید معلوم کرنے کو بے چین ہوگی۔ اسی لیے میں نے تم کو آج ایک چانس دیا ہے۔ تو تم نے دیکھ لیا کہ یہاں آنے والے اپنی چیزیں مجھے دے کر جاتے ہیں۔ اب تم گریٹا کی انگوٹھیوں تلاش کر رہی ہوگی۔ وہ میں تم کو دکھاتا ہوں۔“ سلاٹن ایک میز کی دراز کھولنے لگا۔

اینا خوف زدہ تھی، بری طرح لیکن وہ اپنا خوف ظاہر نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اس کمرے کا راز اب ظاہر ہونے والا تھا۔

سلاٹن نے میز کی دراز سے انگوٹھیاں نکال کر میز پر رکھ دیں۔ ”یہ رہیں انگوٹھیاں۔“ اس نے کہا۔

”مسٹر سلاٹن۔ آخر کیوں؟ یہ لوگ آپ کو یہ سب کیوں دے کر چلے جاتے ہیں؟“ اس نے پوچھا۔

”اس لیے کہ یہ سب میرے کسٹمر ہیں۔ اتفاق سے تم

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

میرے کچھ کسٹمرز سے واقف ہوگئی ہو لیکن سب سے نہیں۔''
''مسٹر سلاتن، آخر کیوں؟ یہ سب آپ سے کیا چاہتے ہیں؟''
''میں ان کی مدد کرتا ہوں۔ وہ میرے پاس مدد مانگنے آتے ہیں۔ میں ان کی مدد کر دیتا ہوں۔''
''لیکن کس طرح آپ کیا مدد کرتے ہیں؟''
سلاتن نے وہ گڑیا اٹھالی جس کا ایک بازو ٹوٹا ہوا تھا۔
''کیا تمہیں سوزی یاد ہے؟'' اس نے پوچھا۔
''سوزی۔'' اینا سوچنے لگی۔
''ہاں۔ وہ اداکارہ جس کا بازو ٹوٹ گیا تھا اور اس کی جگہ گریٹا کو ایک بہت بڑی فلم میں چانس مل گیا تھا۔''
''ہاں، ہاں۔ یاد آگیا۔''
''یہ سوزی ہے۔'' سلاتن نے گڑیا ایک طرف پھینک دی۔
اینا کی رگوں میں خوف کی لہر دوڑ گئی تھی۔ کیا تھا یہ سب۔
''اور یہ......'' سلاتن نے وہ میگزین اٹھا کر دکھایا جو فٹ بال کے کھلاڑیوں کے حوالے سے تھا۔ اس کی تصویریں پھٹی ہوئی تھیں۔ اس نے ایک پھٹی ہوئی تصویر کی طرف اشارہ کیا۔ ''اس کو دیکھو۔ پہچانو کون ہے یہ؟''
اینا نے پہچان لیا تھا۔ وہ مائیک بیلی کی مخالف ٹیم کا گول کیپر تھا جس کی گردن کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی اور وہ مر چکا تھا۔
''مائیک بیلی اسی لیے میرے پاس آیا تھا۔ میں نے اس کی مدد کر دی تھی۔ اس نے میرا معاوضہ ادا کر دیا تھا۔ اور یہ...... یہ دیکھو۔'' اس نے کھلونا جہاز اٹھالیا جس کا پر ٹوٹا ہوا تھا۔ ''یاد ہے تمہیں۔ کون آیا تھا میرے پاس؟''
اینا کو سب یاد تھا۔ سب سمجھ میں آرہا تھا۔ وہ بہت بری طرح خوفزدہ تھی۔ سلاتن شیطان تھا۔ اس میں شیطانی قوتیں تھیں۔ اچانک سلاتن نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ اس کی گرفت بہت سخت تھی۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ''اینا مجھ سے خوف زدہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ مجھے تم پسند ہو۔ مجھے تمہاری ضرورت ہے اینا۔ تم مجھ سے شادی کرو گی۔ تم پیٹر سے شادی نہیں کرو گی۔ تمہاری شادی مجھ سے ہوگی۔''
''نہیں، نہیں۔'' اینا خوف سے چلانے لگی۔ ''مجھے جانے دیں پلیز۔ جانے دیں مجھے۔''
''اینا تم ابھی بھی نہیں سمجھیں۔ مجھ میں بہت طاقت ہے۔ پُراسرار قسم کی۔ میں تمہیں سب کچھ دے سکتا ہوں جو تم کہو۔ ہیرے جواہرات۔ سونا۔ پیسے سب کچھ۔ تمہارے پاس شاندار گاڑیاں ہوں گی۔ اینا ہمارے بچوں میں بھی میری یہ قوت آجائے گی۔ اینا میں تمہیں بہت کچھ دوں گا۔ اس کے عوض تم مجھے پیارے پیارے بچے دوگی۔''
''نہیں، نہیں۔'' اینا نے چلاتے ہوئے ایک ٹھوکر سلاتن کو ماری۔ سلاتن کے ہاتھ سے اس کا ہاتھ چھوٹ گیا۔ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ اینا نے باہر کی طرف دوڑ لگا دی۔ وہ دوڑتی جارہی تھی۔ پاگلوں کی طرح۔ وہ اپنے گھر تک دوڑتی ہی چلی گئی تھی۔

اس رات وہ سو نہیں سکی، ساری رات بھیانک خوابوں نے اسے سونے نہیں دیا۔ صبح ہوتے ہوتے اسے تیز بخار ہو چکا تھا۔ اس کے گھر والوں نے ڈاکٹر کو بلالیا۔ ڈاکٹر دوائیں دے کر چلا گیا تھا لیکن اس کا بخار کم نہیں ہوا۔ بڑھتا ہی چلا گیا۔ پیٹر بھی اسے دیکھنے آیا تھا۔ اس کو بھی بہت پریشانی تھی۔

وہ پورا دن اسی طرح گزر گیا۔ اینا کی طبیعت ٹھیک نہیں ہوسکی تھی۔ تیز بخار۔ بے ہوشی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور سانسیں تیز تیز چل رہی تھیں۔ اس دن بھی پیٹر اس کے پاس ہی بیٹھا تھا جب اس نے ایک عجیب سا شور سنا۔
علاقے والے ''آگ، آگ'' کا شور کررہے تھے۔
پیٹر بھی اینا کے گھر سے باہر آگیا۔ کارنر شاپ میں آگ لگ گئی تھی۔ سب کے سب آگ بجھانے کے لیے دوڑے چلے جارہے تھے۔ عورتیں مرد بچے۔ سب کے سب شور کررہے تھے۔ سلاتن کی گاڑی گھر سے باہر ہی کھڑی تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ گھر ہی میں تھا۔
اچانک سلاتن دکھائی دے گیا۔ وہ اوپری منزل کی ایک کھڑکی میں کھڑا تھا۔ لوگوں نے شور مچادیا۔ ''سلاتن، سلاتن کود جاؤ۔ کود جاؤ۔''
لیکن اس میں جنبش بھی نہیں ہوئی۔ وہ خاموش کھڑا رہا۔ پھر وہ ہنسنے لگا۔ جنونیوں والی ہنسی۔ جیسے اسے آگ کی کوئی پرواہی نہ ہو۔ عورتوں نے رونا دھونا مچادیا تھا۔ مرد شور کررہے تھے لیکن وہ اپنی جگہ کھڑا ہنستا رہا۔ وہ دکان پوری طرح جلتی چلی گئی۔ پھر راکھ کے ڈھیر کے سوا کچھ بھی نہیں رہا۔
اور دوسری طرف اینا بھی مر چکی تھی۔ لیکن یہ موت بخار یا بیماری والی نہیں تھی۔ اس کا پورا جسم کوئلے کی طرح سیاہ ہو چکا تھا۔ جیسے وہ آگ میں جل کر مری ہو۔

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

مظلوم عاشق

محمد فاروق انجم

کبھی کبھی کسی کند ذہن کو بھی کوئی تدبیر یوں سوجھ جاتی ہے... جیسے اندھیرے میں بجلی کوند جائے... عشق کے مرض میں مبتلا ایک ایسے ہی سیدھے سادے نوجوان کی داستان جسے بالآخر اپنی منزل تک پہنچنے کا راستہ مل گیا تھا... وہ ہر سہل پسند کے لیے کام کا مہرہ تھا... گھر کا ہر فرد اس کے بغیر ادھورا و بے بس تھا... ہلکے پھلکے مزاج کے ساتھ مجرموں کے گروہ کا کارنامہ... ہر کوئی ایک دوسرے کے پیچھے خوار ہو رہا تھا... اور عاشق نامراد کو ہر لمحہ اپنی کشتی بیچ سمندر میں ڈوبتی نظر آرہی تھی...

ابتداء سے انتہا تک دلچسپ پیرائے میں ڈوبتی ابھرتی کہانی کے شگفتہ ودلفریب نظارے

محلے کا سب سے زیادہ مصروف اور کام کی تلاش میں سرگرداں ایک ہی نوجوان تھا جس کا نام احتشام الدین تھا۔

احتشام صبح سویرے سے کام میں مصروف ہو جاتا تھا۔ وہ اپنے مالک کے جوتوں کو پالش کرنے سے، اُس کے رات گئے بیڈروم جانے تک کا ہر کام کرتا تھا۔ اور پھر فرش پر چٹائی بچھا کر سو جاتا تھا اور نیند بھی پوری نہیں ہوتی تھی اور اسے جگا دیا جاتا تھا اور وہ پھر کام میں جُت جاتا۔

ہر کوئی اسے ہی آواز دیتا تھا اور احتشام بھی ایسا تھا جیسے وہ بجلی کا انسان ہو، بھاگتا ہوا اُدھر چلا جاتا اور بھاگتا ہوا اِدھر چلا جاتا لیکن ایک بھاری بھرکم آواز جب اس کی سماعت میں پڑتی تو پھر اس کے قدم کسی دوسرے کی طرف نہیں بلکہ اس آواز کی سمت بھاگتے تھے۔ دن سے رات ہو جاتی تھی اور رات سے دن لیکن احتشام کے کام ختم نہیں ہوتے تھے۔ اس ساری بھاگ دوڑ میں وہ کسی ایسے ڈھنگ کے کام کی تلاش میں بھی تھا جس سے وہ کچھ کما بھی سکے۔ وہ اس مفت کی مشقت اور اذیت سے تنگ آچکا تھا۔

پورے محلے کی پھوپو خیراں کو اس کا نام لینے میں وقت پیش آتی تھی، ویسے بھی جب سے انہوں نے اپنے اگلے دانت نکلوائے تھے تب سے ان کے منہ سے الفاظ کم اور 'ہوا' زیادہ نکلتی تھی۔ پہلے تو وہ کسی نہ کسی طرح سے احتشام کہہ ہی دیتی تھیں، لیکن جس دن انہوں نے اپنے اگلے دانت نکلوائے اس دن انہوں نے اپنے کمرے کی کھڑکی کھول کر باہر جھانکا اور اپنے کسی کام کی غرض سے احتشام کو پکارا تو اس کا پورا نام نکلنے کے بجائے محض اتنا نکلا۔

''شام......شام......''

احتشام کے پاس اس وقت کچھ اور لڑکے بھی کھڑے تھے۔ پھوپو خیراں کی آواز سن کر سب نے متلاشی نگاہوں سے دائیں بائیں دیکھا کہ وہ کس کو پکار رہی ہیں۔ اسی اثنا میں پھوپو خیراں کی آواز آئی۔

''میں تجھے بلا رہی ہوں شام......'' پھوپو خیراں نے

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

احتشام کی طرف اشارہ کیا تو سب کو سمجھ آئی کہ پھوپو خیراں کس کو 'شام' کہہ رہی ہیں۔

''پھوپو میرا نام احتشام ہے۔''

''مجھ سے نہیں لیا جاتا اتنا مشکل نام...... ویسے بھی دانت کیا نکلے ہیں کوئی لفظ ٹھیک نکلتا ہی نہیں۔'' پھوپو خیراں نے کہا۔ اس دن سے سب اسے احتشام کہتے تھے اور پھوپو خیراں اسے 'شام' کہہ کر مخاطب کرتی تھیں۔ پھر رفتہ رفتہ اسے کوئی احتشام کہنے لگا اور کوئی شام......

احتشام الدین نے جب ہوش سنبھالا تو اس کے سامنے ماں باپ کے بجائے چچا اور چچی کا رشتہ تھا۔ چچا کا نام تاج اور اس کی بیوی کا نام صفورا تھا۔ دونوں بہت چالاک تھے اور ہر وقت ایک دوسرے کے کانوں میں گھسر پھسر کرتے رہتے تھے۔ احتشام نے کچھ اور ہوش سنبھالا تو اس نے چچا سے سوال کیا تھا۔

''چچا...... میرے ماں باپ کہاں ہیں؟''

اس کا سوال سن کر تاج نے یوں سانس خارج کی اور اپنی شکل ایسی دردناک بنائی کہ بے چارہ احتشام بھی ڈر گیا۔ اس کے بعد تاج دکھی لہجے میں بولا۔

''تمہارے ماں باپ ایک میلے میں تم سے بچھڑ گئے تھے۔''

احتشام نے اتنا سنا اور چپ ہو گیا جبکہ اس کا چچا اس انتظار میں رہا کہ احتشام اس سے مزید کوئی سوال پوچھے گا تو وہ تفصیل بتا دے گا۔ لیکن اس نے کوئی سوال ہی نہ کیا۔

اُن کی یہ باتیں دروازے میں کھڑا ریاض سن رہا تھا۔ ریاض کا رشتہ تاج کے ساتھ وہی تھا جو گیند اور بلّے کا ہوتا ہے۔ گیند پوری رفتار سے آتی ہے اور بلا اسے گھما کر دور پھینک دیتا ہے اور کبھی گیند باؤنسر کی شکل میں آتی ہے اور بلا اسے چھو بھی نہیں سکتا۔ دونوں کے دلوں میں ایک دوسرے کے لیے کدورت اور ہونٹوں پر مسکراہٹ ہوتی تھی۔

ریاض نے وہ بات سن کر اپنے دل میں رکھی اور جونہی

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

احتشام اسے اکیلا ملا تو اس نے باتوں باتوں میں وہ بات چھیڑ دی۔

''اس دن تیرا چچا کہہ رہا تھا کہ تیرے ماں باپ میلے میں بچھڑ گئے تھے؟''

''ہاں چچا بھی کہہ رہے تھے۔'' احتشام نے معصومیت سے کہا۔

''ذرا اپنے چچا سے سوال کرنا کہ میلے میں بچوں کے بچھڑنے کا تو سنا تھا، ماں باپ کے بچھڑنے کا پہلی بار سن رہا ہوں۔'' ریاض کی بات سنی تو احتشام کو بھی خیال آیا کہ ریاض ٹھیک کہہ رہا ہے۔ ساتھ ہی ریاض نے تاکید کہ وہ اسے یہ مت بتائے کہ یہ بات تم سے میں نے کہی ہے۔

احتشام نے موقع ملتے ہی چچا سے پوچھ لیا۔ ''چچا ایک بات تو بتائیں۔ میلے میں بچے بچھڑ جاتے ہیں، یہ کیسی عجیب بات ہوئی کہ میرے ماں باپ مجھ سے بچھڑ گئے اور میں گھر آ گیا؟''

تاج نے سوال سنا تو پہلے اس نے احتشام کی طرف یوں دیکھا جیسے ٹیلی وژن کا چینل خود بخود ہی بدل گیا ہو۔

''تم اپنے والدین کے ساتھ میلے میں گئے تھے اچانک وہ تم سے بچھڑ گئے۔ تم روتے ہوئے مجھے مل گئے۔'' چچا نے وضاحت کی۔

''اس کا مطلب ہے کہ میں اُن سے بچھڑ گیا تھا؟''

''اگر تم بچھڑے ہوتے تو وہ گھر آ جاتے، لیکن وہ گھر آئے ہی نہیں۔'' تاج نے کہا۔ احتشام چپ ہو گیا۔ یہ باتیں بھی ریاض سن رہا تھا۔

جونہی ریاض کو موقع ملا، وہ احتشام سے ملا اور کہا۔

''تمہارا دور کا چچا بہت چالاک ہے۔ بڑی ہوشیاری سے یہ تمہارے قریب آیا ہے۔ اس نے تمہارے والدین کو میلے سے اغوا کرا دیا تھا۔ تاکہ اُن کی زمین پر قبضہ کر سکے۔ وہ زمین اب اس کے قبضے میں ہے۔'' ریاض نے انکشاف کیا۔

احتشام نے سنا تو وہ پریشان ہو گیا پھر بولا۔ ''اگر ایسی بات ہے تو چچا نے مجھے اپنے پاس کیوں رکھا ہوا ہے اور مجھے اسکول میں پڑھا بھی رہا ہے؟''

''دوسروں کو دکھانے کے لیے یہ سب کر رہا ہے۔ ایک دن آئے گا کہ یہ تمہیں بھی دائیں بائیں کر دے گا۔'' ریاض نے اپنی جلن نکالی۔

احتشام اس دن کے بعد کچھ زیادہ ہی سوچنے لگا۔ ایک دن جب اس کا چچا اور چچی اپنے نو عدد بچوں کے ساتھ لاڈ کر رہے تھے تو احتشام نے اچانک سوال کر دیا۔

''چچا میرے ابا کی زمین بھی ہے؟''

احتشام کا یہ سوال بالکل اس طرح تھا جیسے ٹاک شو میں مہمان مرغوں کی طرح لڑ رہے ہوں اور بجلی چلی جائے اور سکوت چھا جائے۔

تاج نے پہلے اپنی منکوحہ کی طرف دیکھا جس کا چہرہ ایسا بن چکا تھا گویا اس کے بازو میں ٹیکا لگ رہا ہو۔ تاج نے ذرا غصیلے لہجے میں کہا۔

''تیرا دماغ خراب کون کر رہا ہے، جو تو ایسی باتیں کر رہا ہے؟''

''میرا دماغ کس نے خراب کرنا ہے، بس یہ بات ایسے ہی میرے دماغ میں آ گئی تو میں نے پوچھ لی۔'' احتشام نے کہا۔

''ایسے ہی تیرے دماغ میں بات نہیں آئی۔ بتا کس کے پاس بیٹھتا اُٹھتا ہے؟'' تاج نے اسے گھورا۔

''مجھے کس کے پاس اُٹھنا بیٹھنا ہے؟ آپ کے نو بچوں کے درمیان میں گم صم رہتا ہوں۔'' احتشام نے کہا۔

''میرے نو بچوں کو نظر نہ لگا دینا۔'' صفورا چلائی۔

''آئندہ سوچ سمجھ کر بولنا۔ ورنہ تیرا گھر سے نکلنا بند کر دوں گا۔'' تاج نے خبردار کیا۔

اس بات کے بعد چچا اور چچی کچھ نہ کچھ سوچتے رہتے۔ اب وہ چاہتے تھے کہ احتشام کو اس گھر سے جیسے بھی ہو، چلتا کر دیں۔ اس کے سوال بڑھنے لگے تھے۔ مشکل یہ تھی کہ وہ ایسا کچھ کر نہیں سکتے تھے کہ جس سے احتشام اس گھر سے غائب ہو جاتا۔ ایسا کچھ بھی ہو جانے سے الزام ان پر ہی آتا۔ لہٰذا وہ حد درجے محتاط رہتے تھے۔

دونوں میاں بیوی کوئی ایسی چال سوچنے لگے جس سے سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بچ جائے۔ اسی سوچ بچار میں احتشام نے میٹرک کا امتحان دے دیا۔ ریاض ان کی تاک میں رہتا تھا۔ وہ دونوں یہ بات جان گئے تھے کہ ریاض ہی ہے جو احتشام کا دماغ خراب کر رہا ہے۔ اور اس صورتِ حال میں اگر احتشام کو کچھ بھی ہو گیا تو ریاض ایسا شور مچائے گا کہ دونوں میاں بیوی کے لیے اپنا دفاع کرنا مشکل ہو جائے گا۔

احتشام کا اچھا خاصا قد کاٹھ نکل آیا تھا جبکہ چچا اور چچی کے سارے بچے پانچ فٹ سے اوپر نہیں گئے تھے اور اس بات پر چچی کو بہت تاسف رہتا تھا۔

اپنے بچوں کے چھوٹے قد کو بنیاد بنا کر چچی نے ایک دن ہنگامہ کھڑا کر دیا۔

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

''جسے ہم نے اپنے بچوں کی طرح پالا، جسے ہم نے پڑھایا لکھایا وہی ہمارا دشمن بن گیا۔'' صفورا نے اپنی ہمسائی صغراں سے کہا۔

''کیا ہو گیا؟'' صغراں نے پوچھ لیا۔

''میرے بچوں کے قد دیکھ رہی ہو۔ احتشام نے جادو سے ان کے قد باندھ دیے ہیں۔'' صفورا چلّائی۔

''ہائے میں مرگئی۔'' صغراں کو ایسا دھچکا لگا جیسے اس نے چچی کے بچوں کی باسکٹ بال ٹیم بنا کر کوچنگ کرنی ہو۔ اور اب قد بندھ جانے کی وجہ سے وہ یہ ذمے داری نبھانے سے معذور ہو گئی ہو۔

''اور کیا...... میرے بچوں کے قد باندھ دیے ہیں اس نے۔'' چچی اور بھی چلّائی۔

''لیکن تجھے کیسے پتا چلا کہ یہ کام اسی کا ہے؟'' صغراں نے بات کی تہ تک پہنچنے کی کوشش کی۔

''میں نے اپنے پیر جی سے پوچھا تھا۔ انہوں نے حساب ... لگا کر بتایا ہے۔'' صفورا نے بتایا۔

صغراں نے اپنی شہادت کی انگلی اپنے ہونٹوں پر رکھی اور حیرت کے سمندر میں غوطہ زن ہو گئی۔

ایک گھنٹے میں صغراں نے وہ بات پورے محلے میں ایسے پھیلا دی جیسے اس نے مچھر مار اسپرے کر دیا ہو۔ یہی صفورا چاہتی تھی۔ احتشام بیٹھے بٹھائے بدنام ہو گیا۔ اس محلے میں پڑھے لکھے لوگ ویسے ہی کم بلکہ نہ ہونے کے برابر تھے، جاہلیت کا بول بالا تھا اس لیے سبھی صفورا سے ہمدردی اور احتشام میں کیڑے نکالنے لگے۔

جب بات پوری طرح سے پھیل گئی تو تاج نے دوٹوک فیصلہ سنا دیا۔ ''ہم تمہارے لیے جو کچھ کر سکتے تھے، وہ کر دیا ہے، اب بہتر ہے کہ تم ہمارے گھر سے چلے جاؤ۔''

''ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں چچا جی۔'' احتشام نے کچھ دیر سوچنے کے بعد اجازت چاہی۔

''پوچھو۔'' تاج نے بادلِ ناخواستہ اجازت دی۔

''کیا جادو .... سے واقعی ہم کسی کا قد باندھ سکتے ہیں؟'' احتشام نے کہا۔

''تم مجھ سے زیادہ سوال نہ کیا کرو۔'' چچا بیزاری سے بولا۔ ''اپنا سامان باندھو اور نکلو یہاں سے۔''

''مجھے پتا چلا ہے کہ یہ مکان میرے ابا کا ہے۔'' اچانک احتشام نے کہا تو چچا چونکا۔

''یہ مکان میرا ہے۔ تیرے ابا کا کہاں سے آ گیا؟'' چچا نے ایسے آنکھیں دکھائیں گویا احتشام آنکھوں کا ڈاکٹر ہے۔

''اگر یہ مکان آپ کا ہے تو پھر اس مکان کی رجسٹری بھی آپ کے نام کی ہو گی۔ آپ مجھے وہ رجسٹری دکھا سکتے ہیں؟'' احتشام نے بے خوف انداز میں کہہ دیا۔

اس بات نے تو تاج کو دم بخود کر دیا۔ وہ احتشام کی طرف ایسے دیکھنے لگا جیسے وہ احتشام نہ ہو بلکہ کرکٹ کی وہ گیند ہو جو اونچی شارٹ کے بعد سیدھی اس کے ہاتھوں کی طرف آ رہی ہو اور اگر تاج نے ایک لمحے کے لیے اپنی نظر دائیں بائیں کی تو کیچ ڈراپ ہو جائے گا۔

جب تاج کے منہ سے کوئی لفظ نہ نکلا تو احتشام نے پھر کہا۔ ''چچا جی میں نے ایک گزارش کی ہے۔''

''تم کون ہوتے ہو مجھے یہ بات کہنے والے۔'' چچا نے غصہ دکھایا۔

''آپ کا بھتیجا ہوں۔'' احتشام نے معصومیت دکھائی۔

''چلو دفع ہو جاؤ...... آئندہ مجھ سے ایسی بات مت کرنا...... ورنہ......'' چچا نے اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

''ورنہ کیا......؟'' احتشام نے 'ورنہ' کے عقب میں چھپی دھمکی جاننا چاہی۔

تاج اسی وقت سمجھ گیا کہ اب احتشام چھوٹا بچہ نہیں ہے وہ بڑا ہو گیا ہے۔ اس کو پڑھا کر اس نے غلطی کی ہے۔ چنانچہ چچا نے مصلحت سے کام لیتے ہوئے کہا۔

''مجھے ایک ضروری کام سے جانا ہے۔ ہٹو ایک طرف۔'' چچا کہہ کر اٹھ کر چلا گیا اور احتشام کھڑا رہا۔

☆☆☆

اُسی رات چچا اور چچی نے سر جوڑ لیے اور سوچنے لگے کہ وہ اب احتشام کا کیا کریں۔ دونوں کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ اچانک چچا چونکا۔ چچی نے فوراً اس کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا تو چچا نے سرگوشی کی۔

''احتشام سے پیچھا چھڑانے کی ایک ہی صورت ہے۔''

''وہ کیا؟'' چچی نے پوچھا۔

''میرا ایک دوست ہے، اس کا جاننے والا معصوم خان کو جانتا ہے۔'' چچا نے کہا۔

''یہ معصوم خان کون ہے؟'' صفورا نے سوالیہ نگاہیں گھمائیں۔

''بہت بڑا بدمعاش ہے، جرائم کی دنیا میں اس کا طوطی بولتا ہے۔'' تاج نے بتایا۔

''اس کا طوطی بولتا نہیں ہوتا، اس کی طوطی بولتی ہے، ہوتا ہے۔ یقیناً اس نے بولنے والی طوطی رکھی ہو گی۔'' صفورا نے

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

پہلے تو اس کا جملہ ٹھیک کرانے کی کوشش کی۔
''تم اگر دو جماعتیں پڑھ لیتیں تو یقین کرو کہ جو ابھی تم نے کہا، اس کے کہنے کی تمہیں ضرورت نہ پڑتی۔''
''کیا مطلب ہے تمہارا؟''
''اس بات کا مطلب تم مجھ سے پھر کسی دن سمجھ لینا۔ میں ابھی اپنے دوست کے پاس جا رہا ہوں۔ وہ مجھے اپنے جاننے والے کے پاس لے جائے گا اور وہ معصوم خان سے ملوا دے گا۔ ہمارا مسئلہ حل ہو جائے گا۔'' تاج اٹھنے کے لیے تیار ہو گیا۔
صفورا نے ہاتھ جھٹکا۔ ''تم کیا کہہ رہے ہو، مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا ہے۔''
''سب سمجھ آ جائے گی۔ تم رکو میں آتا ہوں۔'' چچا نے پلنگ سے نیچے چھلانگ لگائی اور کمرے سے باہر چلا گیا۔ ایک دم وہ پھر واپس کمرے میں آیا اور اپنے صندوق کی طرف بڑھا۔ اسے کھول کر اس نے کچھ نکالا اور باہر نکل گیا۔ جبکہ چچی حیران پریشان معصوم خان کے بارے میں سوچے جا رہی تھی۔

☆☆☆

تاج نے جب اپنے دوست سے معصوم خان سے ملنے کی خواہش ظاہر کی تو اس کے دوست نے متحیر نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا اور پوچھا۔
''خیر ہے......؟ اس سے ملنے کی کیا ضرورت پڑ گئی ہے؟ وہ تو بڑا خطرناک آدمی ہے۔ سفاک ہے اور ظالم ہے......بس نام ہی اس کا معصوم خان ہے۔''
''بس تم مجھے اپنے جاننے والے کے پاس لے جاؤ اور وہ مجھے ابھی معصوم خان سے ملوا دے۔''
''چلو چلتے ہیں۔'' وہ دوست اسے اپنے جاننے والے کے پاس لے گیا۔
تاج کے دوست کا جاننے والا اس وقت اپنے گھر کے تھڑے پر بیٹھا نسوار منہ میں رکھ رہا تھا جب وہ دونوں اس کے پاس پہنچ گئے۔ جاتے ہی تاج کے دوست نے اپنے جاننے والے سے کہا کہ یہ ابھی معصوم خان سے ملنا چاہتا ہے۔
اس آدمی نے غور سے چچا کی طرف دیکھا اور پھر بولا۔
''کام کیا ہے؟''
''یہ میں انہی کو بتاؤں گا۔'' تاج نے کہا۔
اس آدمی نے اپنی ہتھیلی پر خارش شروع کر دی۔ چچا کا دوست سمجھ گیا اور اس نے چچا کے کان میں کچھ کہا تو چچا نے عجیب سا منہ بنا کر کہا۔
''مجھے علم ہے کہ ایسے موقعوں پر کچھ لینا دینا پڑتا ہے اس لیے گھر سے لے کر نکلا تھا۔''
تاج نے جیب سے پانچ ہزار کا نوٹ نکال کر اس آدمی کی ہتھیلی پر رکھ دیا۔ دونوں نے پانچ ہزار کا نوٹ دیکھا تو دونوں کے دل ایک دم سے دھڑکے اور اس نے وہ نوٹ جیب میں ڈالا اور انہیں معصوم خان کے پاس لے گیا۔

☆☆☆

وہ نام کا معصوم خان تھا ورنہ اس شخص میں کونسی ایسی سفا کی تھی جو موجود نہ ہو۔ وہ جرائم کی دنیا میں معتبر نام رکھتا تھا۔ پیسے لے کر کوئی بھی کام کرنے کو تیار ہو جاتا تھا۔ اس کا پانچ فٹ دس انچ کا قد، صحت مند جسم، بڑی اور سرخ آنکھیں، گھنی مونچھیں اور کندھوں تک لٹکتے ہوئے بال...... اس کی شخصیت کو کسی عام آدمی کے لیے دہشت ناک بنا دیتی تھی۔
وہ جس محلے میں رہتا تھا وہاں سبھی اس سے پیار کرتے تھے اور وہ محلے داروں کا خیال رکھتا تھا۔ جس جگہ معصوم خان کا گھر تھا اس کے سامنے چوکور پارک تھا اور اس چوکور پارک کے اردگرد گھر ایستادہ تھے۔ اور ان گھروں میں ایک گھر معصوم خان کا تھا۔
معصوم خان کا گھر دو منزلہ تھا۔ نیچے اس سے ملنے ملانے والوں کی آمد رفت رہتی تھی، جبکہ اوپر کی منزل پر اس کی سوتیلی بہن رہتی تھی۔
لوگوں کی نظر میں معصوم خان کا برف کا کارخانہ تھا اور اس کے علاوہ وہ اور بھی کاروبار کرتا تھا لیکن وہ سب ایک آڑ تھی، اس کا اصل کام جرائم کرنا تھا۔
اس وقت معصوم خان اپنی مخصوص کرسی پر براجمان تھا اور اس کے سامنے وہ تینوں کھڑے تھے۔ تاج کا خیال تھا کہ معصوم خان اتنا دہشت ناک نہیں ہوگا، لیکن اُسے دیکھ کر اس کی سانس جانے کیوں خشک ہوئی جا رہی تھی۔ تاج کے دوست کے دوست نے معصوم خان کو بتا دیا تھا کہ یہ شخص آپ سے ملنا چاہتا تھا۔
''کیا بات ہے، کیوں ملنا چاہتے تھے؟'' معصوم خان نے پوچھا۔ اس کی آواز میں رعب تھا۔
تاج کو تو جیسے سانپ سونگھ گیا تھا۔ وہ یہ بھول ہی گیا تھا کہ وہ کیا سوچ کر آیا تھا پھر اس نے جلدی سے اپنے دماغ پر زور دیا اور جو منصوبہ بنا کر آیا تھا اسے اپنے دل ہی دل میں دہرایا اور پھر ہمت کی۔

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

''میرے نو بچے ہیں۔''

''خاندانی منصوبہ بندی والے تنگ کرتے ہیں تو میں سرکاری بندوں کو ٹھکانے لگانے کا کام نہیں لیتا...... ان کو جیسے بھی مطمئن کرنا ہے وہ تمہارا کام ہے۔'' معصوم خان نے سنتے ہی کہہ دیا۔

تاج نے ایک لمحے سوچا کہ اس کے پاس وہ لوگ کب آئے تھے؟ پھر اس نے اپنا سر جھٹکا اور بولا۔

''بات وہ نہیں ہے جو آپ سمجھ رہے ہیں۔''

''پھر کیا بات ہے؟'' معصوم خان نے اس کی طرف دیکھا۔

''بات یہ ہے کہ میرے نو بچے ہیں......'' تاج نے سلسلہ کلام پھر اسی جگہ سے جوڑا۔

معصوم خان نے اکتاہٹ دکھائی۔ ''یہ تم مجھے بتا چکے ہو۔''

''میرا گزارہ بڑی مشکل سے ہوتا ہے۔ بڑی سخت محنت کرتا ہوں۔ اپنے بچے پالنا مشکل ہے کہ ایک دور کا یتیم بھتیجا بھی میرے گھر میں رہتا ہے۔ اتنا میرے نو بچے نہیں کھاتے جتنا وہ اکیلا کھا جاتا ہے۔ میں نے اپنا مسئلہ ان دونوں کے آگے بیان کیا تو ان دونوں نے آپ کی بہت تعریف کی۔ ان کا کہنا ہے کہ آپ بہت رحم دل اور خدا ترس ہیں۔ دوسروں کا بوجھ بانٹ لیتے ہیں۔ انہوں نے مجھے مشورہ دیا کہ میں اپنا بھتیجا آپ کے پاس چھوڑ دوں۔ آپ اس سے جو کام لینا چاہیں لیں۔'' تاج نے ہوشیاری سے بات کی کہ وہ دونوں ششدر نگاہوں سے تاج کا منہ دیکھنے لگے اور سوچنے لگے کہ، جو بات تم کر رہے ہو اس کا تو ہمارے فرشتوں کو بھی علم نہیں ہے اور تم نے کتنی ہوشیاری سے ان باتوں کی گانٹھ ہمارے کندھوں پر رکھ دی ہے۔ دونوں یہ بات محض سوچ سکے تھے، انہوں نے کچھ کہا نہیں۔ اس کی وجہ وہ پانچ ہزار کا نوٹ تھا جس نے ان دونوں کی زبانوں کو لگام دے دی تھی۔

''تم اپنے بھتیجے سے تنگ ہو؟'' معصوم خان نے بات کو سمجھنے میں بالکل بھی دیر نہیں لگائی۔

تاج نے فوراً کہا۔ ''جی بالکل ٹھیک، سمجھے ہیں آپ۔''

معصوم خان نے جولڑکا اپنے پاس کام کرنے کے لیے رکھا تھا وہ چار روز قبل اچانک اسے چھوڑ کر کہیں غائب ہو گیا تھا۔ ہزاروں اوپر کے کام رکے ہوئے تھے۔ اسے ایک... لڑکے کی شدید ضرورت تھی۔ اس لڑکے کو معصوم خان کے آدمیوں نے تلاش کرنا شروع کر دیا تھا لیکن اس لڑکے نے خفیہ طور پر اپنا پاسپورٹ بنوایا تھا اور پھر دبئی بھاگ گیا تھا۔ ورنہ معصوم خان کے آدمی اسے زمین کے اندر سے بھی نکال کر لے آتے۔

''میرے پاس وہ کیا کرے گا؟'' معصوم خان نے جان بوجھ کر سوچنے کے انداز میں کہا۔

''وہ بڑا ہوشیار ہے۔ سارے کام کرے گا۔ دو وقت کی روٹی چاہیے بس اُسے۔'' تاج ایک دم سے بولا۔

''دو وقت کی روٹی؟؟'' معصوم خان نے اس کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

تاج نے کہا۔ ''ہاں جی...... بس دو وقت کی روٹی۔''

''لیکن ابھی تو تم نے کہا تھا کہ وہ تمہارے نو بچوں سے بھی زیادہ کھا جاتا ہے۔ دو وقت کی روٹی میں وہ کتنا کھا جاتا ہوگا۔ اور تم نے اسے دو وقت کی روٹی پر رکھا ہوا ہے، دو پہر کی روٹی کیوں نہیں دیتے تم اُسے؟''

تاج گڑبڑا گیا۔ ''ہم گھر والے ایک وقت کی روٹی کھاتے ہیں اور وہ دو وقت کی کھا جاتا ہے، اتنا کھا جاتا ہے کہ راشن ختم ہو جاتا ہے۔''

''اچھا......'' معصوم خان نے اچھا کو کھینچا۔ ''تم ایسا کرو کہ ابھی اُسے لے آؤ۔''

''ابھی......؟ ٹھیک ہے میں ابھی لے آتا ہوں لیکن ایک بار وہ یہاں آ جائے تو پھر اسے یہاں ہی رکھیے گا۔'' تاج نے اُٹھنے سے قبل استدعا کی۔

''تم بے فکر ہو جاؤ۔ اسے ابھی لے آؤ۔ میں بیٹھا ہوں۔'' معصوم خان نے کہا تو تاج کی باچھیں کھل اُٹھیں۔ اس نے اپنے ساتھ آئے دونوں آدمیوں کی بھی پروا نہیں کی اور احتشام کو لینے کے لیے گھر کی طرف چل دیا۔

وہ دونوں باہر نکلے اور ایک نے تاج کو کوستے ہوئے کہا۔ ''بڑا جھوٹا آدمی ہے۔''

''تم اس بات کو چھوڑو، اس نے جو تمہیں جو پانچ ہزار کا نوٹ دیا ہے اس میں سے آدھے پیسے مجھے دو۔'' چچا کے دوست نے اپنے دوست سے کہا۔

''تم کو کس لیے دوں؟''

''اسے میں تمہارے پاس لے کر آیا تھا۔''

پہلے تو وہ چپ سوچتا رہا اور پھر اس نے بادلِ ناخواستہ جیب سے پانچ ہزار کا نوٹ نکالا اور اسے کھول کر سیدھا کیا تو اس کے اندر ایک پچاس کا نوٹ تھا۔

''پانچ ہزار پچاس روپے...... واہ۔'' تاج کا دوست خوش ہو کر بولا۔

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

تاج کے دوست کے دوست نے غور سے پانچ ہزار روپے کے نوٹ کو دیکھ کر پچاس روپے اپنی جیب میں ڈالے اور پانچ ہزار کا نوٹ اسے دیتے ہوئے برا سا منہ بنا کر بتایا۔ ''آئندہ ایسے آدمی کو میرے پاس لے کر مت آنا۔ بہت چالاک ہے۔ پانچ ہزار کے جعلی نوٹ میں پچاس کا نوٹ لپیٹ کر دے گیا ہے۔'' اتنا کہہ کر وہ جلا بھنا وہاں سے چلا گیا اور تاج کا دوست دم بخود پانچ ہزار کے جعلی نوٹ کو اُلٹ پلٹ کر دیکھتا رہا اور غصے سے ابلتا رہا۔

☆☆☆

تاج بڑی ہوشیاری سے احتشام کو نوکری کا جھانسا دے کر معصوم خان کے پاس لے آیا۔ معصوم خان نے اس کی طرف دیکھا اور سوچا کہ لڑکا بالکل ٹھیک ہے۔ اس کے ناشتا لانے سے لے کر تمام دوسرے چھوٹے موٹے کام کرنے کے لیے موزوں ہے۔

''کیا نام ہے تیرا؟'' معصوم خان نے پوچھا۔

''جی میرا نام احتشام ہے۔''

''مشکل نام ہے۔ مجھے تو سیدھے سادے نام لینے کی عادت ہے۔'' معصوم خان نے کہا۔

''آپ اسے کچھ بھی کہہ لیا کریں۔'' تاج بولا۔

''آج سے تم میرے پاس رہو گے۔'' معصوم خان نے احتشام کی طرف دیکھ کر کہا اور پھر تاج کو جانے کا اشارہ کر دیا۔

''اب یہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے آپ کے پاس ہی رہے گا ناں؟'' تاج نے اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ اب یہ واپس میرے پاس نہ آجائے۔

''اب یہ میرا خاص بندہ بن گیا ہے۔ اب یہ میرے پاس ہی رہے گا۔ میرے گھر میں۔'' معصوم خان مسکرایا۔

تاج اسے چھوڑ کر ایسا رفو چکر ہوا کہ پھر پلٹ کر احتشام کی خبر نہ لی اور احتشام کو معصوم خان نے اپنے اتنا قریب رکھا کہ اس کے سارے کام احتشام ہی کرتا تھا۔ وہ اس کے گھر میں رہتا تھا۔ بلا روک ٹوک وہ گھر میں جا سکتا تھا۔ شروع شروع میں احتشام کا دل نہیں لگا لیکن پھر اس نے سوچا کہ ... کے گھر سے یہ تو گھر اچھا ہے۔ کھانے پینے کی کوئی روک ٹوک نہیں ہے، بات بات پر چچی جیسی کوئی خاتون اسے کسی بات کا طعنہ نہیں دیتی ہے، اسے سونے کے لیے بستر ملا تھا جبکہ وہ چچا کے گھر میں چٹائی بچھا کر فرش پر سوتا تھا۔ اور سب سے بڑی بات یہ کہ اس چوکور پارک کے ساتھ بسنے والے ہر گھر سے اس کی واقفیت ہوگئی تھی۔ کسی بھی وقت کوئی بھی احتشام کو اپنے کام کے لیے بلا لیتا تھا اور وہ خوشی خوشی اس کا کام کر دیتا تھا۔

احتشام خوش تھا لیکن وہ اتنا مصروف ہوگیا تھا کہ اب اسے فرصت ہی نہیں ملتی تھی۔ کوئی نہ کوئی اپنے کام کے لیے اسے بلا لیتا تھا۔ اب وہ اس سے فرار چاہتا تھا۔ وہ بڑا ہوگیا تھا لیکن سب کا نوکر بن کر رہ گیا تھا۔ معصوم خان نے کیونکہ آڑے وقت کے لیے اپنے ہر ہمسائے کے ساتھ بنا کر رکھی ہوئی تھی اس لیے وہ بھی کسی کو منع نہیں کرتا تھا کہ احتشام کو کوئی اس کے علاوہ کام نہیں کہہ سکتا۔

احتشام اب اکتا گیا تھا۔ وہ اس مصروف اور بے مقصد زندگی سے تنگ آگیا تھا۔ شروع میں اسے سونے کے لیے بستر ملا تھا، اب معصوم خان نے اسے چٹائی دے دی تھی، ذرا سے غلط کام پر معصوم خان اسے سزا بھی دینے لگا تھا۔ اب احتشام کا اس جگہ کام کرنا اور بات بات پر ڈانٹ اور مار کھانا برداشت سے باہر ہوگیا تھا اس لیے وہ چاہتا تھا کہ... کہیں دور بھاگ جائے۔ لیکن اس کا بھاگنا مشکل تھا۔ اسی کام سے تنگ آکر پہلا نوجوان بھاگا تھا اور اب احتشام بھاگنے کی سوچ رہا تھا۔ لیکن اس کے پاس کوئی پیسہ نہیں ہوتا تھا۔ بھی سو پچاس کا نوٹ اس کی جیب میں آ بھی جاتا تو اس سے وہ کیا کر سکتا تھا۔

اچانک ہی احتشام کو محبت ہوگئی تھی۔ وہ بھی معصوم خان کی سوتیلی بہن کے ساتھ جس کا نام عارفہ تھا۔

عارفہ بہت خوبصورت تھی۔ جب احتشام اس گھر میں آیا تھا تو وہ نوعمر تھا۔ عارفہ تقریباً اس کی ہم عمر تھی۔ شروع میں تو دونوں کی طرف سے کوئی ایسے ایک دوسرے کو سگنل موصول نہیں ہوئے تھے کہ جس سے ان کے دلوں کے تاروں میں تلاطم برپا ہوتا۔ لیکن ایک دن اچانک احتشام نے دیکھا کہ عارفہ اس کی طرف دیکھ رہی ہے۔ جونہی احتشام کی نظر اس پر پڑی عارفہ نے اپنی نگاہیں دوسری طرف کرلیں۔ ایسا کئی بار ہونے لگا تو ایک دن اس نے موقع تنہائی دیکھتے ہوئے پوچھ ہی لیا۔

''تم ہر وقت میری طرف کیا دیکھتی رہتی ہو؟''

''یہ دیکھتی ہوں کہ پھوپو خیراں تجھے شام کیوں کہتی ہے۔'' عارفہ مسکرائی۔

''اس کے تو دانت نہیں ہیں اور اس کے منہ سے احتشام کے بجائے شام نکل گیا تھا۔''

''پیارا نام ہے شام......''

''مجھے اچھا نہیں لگتا۔''

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

''تمہیں اچھا لگے، یا بُرا اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔تم نے اپنے آپ کو خود ہی شام تھوڑی کہنا ہوتا ہے۔ویسے ایک بات کہوں۔'' عارفہ کا لہجہ رومینٹک سا ہو گیا تھا۔
''بولو کیا بات کہنی ہے؟''
''تم خوبصورت ہو گئے ہو۔''
''تمہارے بھائی نے سن لیا تو وہ تیرا گلا دبا دے گا۔''
''محبت خوف کی دیواروں سے نہیں ڈرتی۔''
''تو کیا تم کو مجھ سے محبت ہو گئی ہے؟'' احتشام کے دل کے تار ملے۔
''میں نے کب کہا کہ مجھے تم سے محبت ہو گئی ہے۔ میں نے کہا ہے کہ محبت خوف کی دیواروں سے نہیں ڈرتی۔''
''اس بات کا کیا مطلب ہوا؟''
''اس کا مطلب یہ ہوا کہ مجھے تم سے محبت ہو گئی ہے۔'' عارفہ نے اس کے کچھ قریب ہو کر خمار آلود لہجے میں کہا تو احتشام کے چہرہ کھل سا گیا اور اس نے شرماتے ہوئے کہا۔
''کچھ ایسے ہی جذبات میرے دل میں بھی ہے۔''
''تو تم نے مجھ سے کچھ کہا کیوں نہیں؟''
''تجھ سے کم اور تیرے بھائی سے زیادہ ڈرتا ہوں۔'' احتشام نے اعتراف کیا۔ اس کے بعد دونوں میں بات چیت ہونے لگی اور دونوں مستقبل کے سہانے خواب بھی دیکھنے لگے۔

ایک دن عارفہ نے پوچھا۔''تم اس گھٹن سے، کام سے گھبراتے نہیں ہو۔ تمہارا دل نہیں کرتا کہ تم آزاد زندگی گزارو...... جیسے میرا دل چاہتا ہے کہ میں اپنے اس سوتیلے جلاد بھائی سے کہیں دور آزاد فضاؤں میں زندگی سے بھرپور سانسیں لوں۔ مجھے تو یہ بھی نہیں پتا کہ اس شہر میں انارکلی کہاں ہے؟''
''یہاں کوئی انارکلی ہے؟'' احتشام نے ایک دم چونک کر پوچھا۔
''میں انارکلی بازار کی بات کر رہی ہوں جہاں خواتین خریداری کرتی ہیں۔'' عارفہ نے اپنی بات کی وضاحت کی۔
''دل تو بہت چاہتا ہے۔ اور سوچا بھی ہے کہ یہاں سے فرار ہو جاؤں۔ لیکن جیب میں پیسہ نہیں ہے۔ بھاگ کر کہاں جاؤں گا؟''
''میں تو اس پنجرے میں قید ہوں۔ کاش مجھے اُڑنے کا موقع مل جائے۔'' عارفہ نے حسرت بھرے لہجے میں کہا۔
''شاید کبھی موقع مل ہی جائے۔'' احتشام بولا۔

''ایک وعدہ کرو گے؟''
''ہاں بولو۔''
''تم جب بھی بھاگو گے مجھے بھی ساتھ لے کر بھاگو گے۔ پھر ہم شادی کریں گے اور ہنسی خوشی زندگی بسر کریں گے۔''
''شام...... شام......'' ایک دم سے معصوم خان کی آواز اس کی سماعت میں پڑی تو دونوں کے اندر ہلچل برپا ہو گئی۔ پھوپھو خیراں کی دیکھا دیکھی معصوم خان بھی احتشام کو شام ہی کہنے لگا تھا۔ اسے شام کہنے میں آسانی محسوس ہوتی تھی۔
''جی......'' احتشام بھاگتا ہوا معصوم خان کے پاس جا پہنچا۔
''یہ پیسے گن......'' معصوم خان نے اپنے ہاتھ میں پکڑے ہزار ہزار کے نوٹوں کی ایک گڈی اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔
احتشام نے نوٹ پکڑ کر گنے اور بولا۔''چالیس ہزار آٹھ سو ستر روپے ہیں۔''
''بالکل ٹھیک ہے......'' معصوم خان نے کہنے کے بعد اپنی جیبوں میں ہاتھ ڈالنے شروع کر دیے۔ وہ ایک جیب میں ہاتھ ڈال کر نکالتا اور دوسری جیب میں ڈال لیتا۔ وہ کچھ تلاش کر رہا تھا۔ اس کے چہرے پر پریشانی سی عیاں ہو گئی تھی۔ پھر وہ خود کلامی کے انداز میں بولا۔''یہ بجلی کا بل کہاں چلا گیا؟''
معصوم خان نے جب ساری جیبیں دیکھ لیں تو اپنے کمرے میں متلاشی نگاہیں دوڑانے لگا۔ پھر اس نے ایک دراز کھولی اور اسے دیکھا۔ اچانک اس کی نظر احتشام پر پڑی جو پیسے ہاتھ میں لیے کھڑا تھا تو وہ بولا۔''پیسوں کو تو جیب میں رکھو۔''
احتشام نے جلدی سے پیسے اپنی جیب میں ٹھونس لیے۔ معصوم خان نے کہا۔''بجلی کا بل تلاش کرو کہ وہ کہاں چلا گیا ہے......''
معصوم خان ایک طرف کھڑا ہو گیا اور احتشام کمرے میں ایک ایک چیز دیکھنے لگا لیکن بجلی کا بل کہیں نہیں ملا۔
''بل نہیں ملا......''
''ابھی تو یہاں رکھا تھا۔'' معصوم خان سوچتے ہوئے بولا۔''آج اس کی آخری تاریخ ہے۔ پچھلے مہینے بل جمع نہیں کرایا تھا۔ اگر آج بل جمع نہ ہوا تو بجلی کاٹنے والے آ جائیں گے، خیر مجھے ان کی تو کوئی فکر نہیں ہے۔ میری بجلی جو کاٹنے آئے گا پہلے میں اُسے کاٹ دوں گا، لیکن بل تو جمع ہونا

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

''

اوپر نہ ہو؟'' احتشام نے ایک دم سے کہا۔

اوپر دیکھ کر آ۔'' معصوم خان نے کہا اور احتشام اوپر چلا گیا۔

''کیا ہوا تم اوپر آ گئے؟'' اسے دیکھتے ہی عارفہ نے پوچھا۔

''بجلی کا بِل جمع کراتا ہے اور بِل نہیں مل رہا ہے۔ چالیس ہزار آٹھ سو ستر روپے کا بِل ہے۔'' احتشام نے بتایا۔

''جلاد بھائی نے پیسے دے دیے ہیں تمہیں؟''

''ہاں میری جیب میں ہیں۔''

عارفہ بھی بِل کی تلاش میں دائیں بائیں دیکھنے لگی اور پھر ایک دم چونکی اور اس نے احتشام کی طرف دیکھا۔

''میری بات سنو...... دیکھو پیسوں کا انتظام ہو گیا ہے۔ تمہارے پاس چالیس ہزار روپے ہیں۔ ہم بھاگ جاتے ہیں۔''

''چالیس ہزار روپے سے کیا ہو گا؟''

''بہت کچھ ہو جائے گا۔ تم بھاگنے کا سوچو۔''

''لیکن تمہارا بھائی ہمیں تلاش کر لے گا۔''

''تم نجومی ہو کہ بھاگنے سے پہلے ہی کہہ رہے ہو کہ وہ تلاش کر لے گا۔ ہم پنجاب میں رہیں گے ہی نہیں...... کراچی چلے جائیں گے۔'' عارفہ نے کہا۔

''میں نے کبھی کراچی دیکھا ہی نہیں ہے۔''

''کراچی جاؤ گے تو کراچی کو دیکھو گے۔ اب کراچی تمہارے خواب میں تو آنے سے رہا۔''

احتشام نے بھی سوچا اور بولا۔ ''کہہ تو تم ٹھیک رہی ہو۔ ہم بھاگ سکتے ہیں۔ اس کام سے میری جان چھوٹ سکتی ہے۔ کیا ابھی بھاگ جائیں۔''

''تم یہ پیسے سنبھال کر رکھنا۔ اگر بجلی کا بِل مل بھی جائے تو اسے جمع مت کرانا۔ ہم آج رات ہی موقع دیکھ کر بھاگ جائیں گے۔'' عارفہ نے سرگوشی کی۔

''اور اگر پکڑے گئے تو......؟'' ایک بار پھر احتشام نے اپنا اندیشہ ظاہر کیا۔

''تم بار بار یہ بات ہی کیوں کر رہے ہو؟ تم صرف بھاگنے کی سوچو۔'' عارفہ نے اسے گھورا۔

اسی وقت معصوم خان کی آواز آئی۔ ''شام...... بِل ملا؟''

''ابھی نہیں ملا......''

''نیچے آ جاؤ...... بِل مل گیا ہے۔'' معصوم خان کی آواز آئی۔

''بِل مل گیا ہے اب کیا کروں؟'' احتشام نے سرگوشی میں پوچھا۔

''اس کی کشتی بنا کر اُسے پانی میں بہا دینا لیکن جمع مت کرانا۔ اتنی بڑی رقم پھر تمہیں کبھی نہیں ملے گی۔ جلاد بھائی سے بِل لے کر پیسے اپنے کمرے میں کہیں چھپا دو۔''

''ٹھیک ہے۔'' احتشام نے اثبات میں سر ہلایا۔

''شام کہاں رہ گئے ہو؟'' ایک تیز آواز نے احتشام کے اندر خوف بھر دیا اور وہ اس جگہ سے ایسے بھاگا جیسے اگر وہ کچھ دیر اور رک گیا تو زمین کھل جائے گی اور وہ اس میں سما جائے گا۔

معصوم خان ہاتھ میں بِل پکڑے کھڑا تھا۔ ''یہ لو بِل اور ابھی جا کر جمع کرا آؤ۔''

احتشام نے بِل پکڑا اور کمرے سے باہر نکلتے ہی تیزی سے اپنے کمرے میں چلا گیا۔

کمرے میں جاتے ہی وہ سوچنے لگا کہ چالیس ہزار آٹھ سو ستر روپے کہاں چھپائے۔ اس گھر کا بِل وہی جمع کراتا تھا۔ اس سے قبل اس کے دماغ میں ایسی کوئی بات نہیں آئی تھی...... بلکہ اس سے قبل عارفہ نے اس سے اظہارِ محبت نہیں کیا تھا ورنہ وہ اسے تب ہی بتا دیتی کہ بجلی کا بِل جمع نہ کرواؤ اور بھاگ لو۔

احتشام نے وہ پیسے اخبار میں لپیٹے اور پلاسٹک کی تھیلی میں رکھے اور کمرے سے ملحق باتھ روم کے روشن دان میں پڑی شیمپو کی کئی خالی بوتلوں کے پیچھے رکھ دیے۔ اس کام سے فارغ ہو کر اس نے اپنے ہاتھ میں پکڑا بجلی کا بِل دیکھا اور اسے گولا سا بنا کر فلش میں بہا دیا۔

جونہی وہ اپنے کمرے سے نکلا سامنے معصوم خان سیڑھیوں کی طرف جا رہا تھا۔ احتشام کو دیکھ کر وہ رک گیا۔

''تم گئے نہیں ابھی؟''

''میں باتھ روم گیا تھا۔''

''جلدی جاؤ۔'' معصوم خان کہہ کر اوپر جانے کے لیے بڑھا اور پھر رک کر بولا۔ ''ایک منٹ ذرا بِل دکھانا......''

یہ سنتے ہی احتشام کی سانس خشک ہو گئی۔ بجلی کا بِل تو اس نے فلش میں بہا دیا تھا۔ اب وہ کیا دکھائے گا۔

''آپ نے بِل دیکھا تو ہوا ہے۔'' احتشام نے کہا۔

''دوبارہ دیکھنے سے وہ مٹ جائے گا کیا؟ مجھے دیکھنا ہے کہ کتنے یونٹ استعمال ہوئے ہیں۔''

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

احتشام سوچنے لگا کہ وہ پھنس گیا ہے۔ اب کیا کرے۔ اوپر عارفہ کھڑی تھی۔ اس نے ایک دم سے کہا۔

''بھائی...... آپ کا فون آرہا ہے۔ گھنٹی بج رہی ہے۔''

''آرہا ہوں۔'' معصوم خان کہہ کر اوپر چلا گیا اور احتشام باہر نکل گیا۔ اوپر جاتے ہی وہ بولا۔ ''فون تو میرے ہاتھ میں ہے...... اوپر کیسے بج رہا ہے؟''

''اوہ...... غلطی ہوگئی۔ وہ میرا فون بج رہا ہے میں سمجھی آپ کا فون ہے۔'' عارفہ مسکرائی۔

''لیکن تیرے پاس تو فون ہی نہیں ہے۔'' معصوم خان ایک دم چونکا۔

''آپ ایک بہن کا بھائی سے کیا ہوا مذاق بھی نہیں سمجھتے۔'' عارفہ ہنسی۔

''مجھے ایسا مذاق پسند نہیں ہے۔ اماں کہاں ہے؟'' معصوم خان نے اسے ڈانٹا۔

''وہ باہر ہی کہیں گئی ہیں۔'' عارفہ نے بتایا۔

اچانک معصوم خان کا موبائل فون بجنے لگا۔ وہ ایک طرف ہوکر فون سننے لگا جبکہ عارفہ کے کان اس کی طرف ہی تھے۔

دوسری طرف سے بات سننے کے بعد معصوم خان کی معصومیت جانے کہاں معدوم ہوگئی اور اس نے سفا کی سے کہا۔

''مانتا ہے تو ٹھیک ہے ورنہ اُس کی ایک ہڈی توڑ دو...... اس کی جرأت کیسے ہوئی کہ وہ میرے گودام سے ایک انچ کی بھی چوری کرے...... ہاں ٹھیک ہے...... میں بھی آتا ہوں......'' معصوم خان نے کہا اور فون بند کرکے پھر سیڑھیوں کی طرف چلا گیا جبکہ عارفہ جس جگہ کھڑی تھی، اسے دیکھ کر لگتا تھا جیسے وہ موم کی بنی لڑکی ہو۔ معصوم خان کا سفاکانہ لہجہ سن کر اس کے جسم میں خوف سرایت کرگیا تھا۔ ایک لمحے کے لیے اس نے سوچا کہ اگر وہ پکڑے گئے تو مجھے تو جو سزا ملے گی، وہ ملے گی ہی، لیکن چالیس ہزار آٹھ سو ستر روپے لے کر فرار ہونے کی پاداش میں اس کا جلاد بھائی، احتشام کا کیا حشر کرے گا؟

☆☆☆

احتشام نے عارفہ کے کہنے کے مطابق عمل کرڈالا لیکن وہ اندر سے بہت ڈرا ہوا تھا۔ وہ وقت گزارنے کے لیے ایسے ہی بینک کے دائیں بائیں گھوم کر ایک سڑک کی طرف نکل گیا اور پیدل چلنے لگا۔ اس سڑک کے ایک طرف کچھ گاڑیاں کھڑی تھیں۔

احتشام سوچ رہا تھا کہ جب سے وہ معصوم خان کے پاس آیا ہے اس کی ذاتی زندگی بالکل ہی ختم ہوکر رہ گئی ہے۔ وہ ہروقت بیل کی طرح ایک ہی محور میں چکر کاٹتے ہوئے کام میں مصروف رہتا تھا۔ وہ دو وقت کی روٹی کے لیے معصوم خان کا ہی نہیں بلکہ چوکور پارک کے اردگرد بسنے والے گھرانوں کا ایسا غلام بن کررہ گیا تھا جس کی محنت اس کے لیے لاحاصل تھی۔ اس لیے اس جگہ سے فرار ہونا بھی بہت ضروری تھا اور پکڑے جانے کا ڈر بھی سر پر تلوار کی طرح منڈلاتا تھا۔

اچانک اسے ایسا لگا جیسے اندھیرا چھا گیا ہو اور سورج کے ساتھ ساتھ اس کے دائیں بائیں موجود ہر چیز غائب ہوگئی ہو۔ اس کے ساتھ اس کے جسم میں ایسی ہلچل سی ہورہی تھی گویا جنوں نے اس پر حملہ کردیا ہو اور اس پر قبضہ جمانے کے لیے ہر جن اپنی کوشش میں مصروف ہو پھر اسے لگا جیسے وہ اُڑنے لگا ہو۔ اس کے پیر زمین سے اوپر ہوگئے تھے۔ اسے کسی نے اپنے چار ہاتھوں سے پکڑا ہوا تھا اور تیزی سے اسے کسی سمت لے جایا جارہا تھا۔

احتشام سوچ رہا تھا کہ یہ ماجرا کیا ہے۔ اب اسے کیا پتا کہ اس کے ساتھ کیا ہورہا ہے۔ دراصل جب وہ اپنی سوچوں میں گم چلا جارہا تھا تو دو آدمی اس کی تاک میں تھے۔ دونوں نے سیاہ رنگ کا برقع پکڑا ہوا تھا۔ اور وہ دونوں اس کے پیچھے دھیرے دھیرے آگے بڑھ رہے تھے۔ جیسے ہی ان کو موقع ملا انہوں نے نہ آؤ دیکھا نہ تاؤ...... اور وہ سیاہ برقع احتشام کے اوپر ڈال دیا اور ساتھ ہی اسے پکڑلیا۔

احتشام یہی سمجھتا رہا کہ اچانک اندھیرا چھا گیا ہے اور جس وقت وہ دونوں آدمی اسے اُٹھائے ایک کار کی طرف بھاگ رہے تھے تو احتشام کی دانست میں وہ اُڑ رہا تھا۔

سامنے ایک سفید کار کھڑی تھی۔ ایک نے اپنے ہاتھ سے کار کا پچھلا دروازہ کھولا اور احتشام کو سیاہ برقعے میں لپیٹے پچھلی سیٹ پر ٹھونس دیا۔ ایک احتشام کے اوپر بیٹھ گیا اور دوسرا ڈرائیونگ سیٹ کے ساتھ براجمان ہوتے ہی بولا۔

''جلدی سے نکلو......''

اس کے کہنے کے باوجود جو شخص ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا تھا، وہ متحیر نگاہوں سے یہ اچانک رونما ہونے والا ماجرا دیکھے جارہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ یہ کون لوگ ہیں اور کیا کررہے ہیں؟

''اب کیا ہوا چلتے کیوں نہیں ہو......'' جیسے ہی

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

ڈرائیونگ سیٹ کے ساتھ بیٹھے آدمی جس کا نام لطیف تھا، نے اس کی طرف دیکھا تو وہ ایک دم سے چونکا۔ اور اگلا سوال یہ کیا۔ ''تم کون ہو ؟''

''آپ لوگ کون ہو......؟ اور میری کار میں اس طرح گھسنے کی وجہ......'' اس نے جواب دینے کے بجائے دو سوال کر دیے۔

اسی اثنا میں کار کا دروازہ کھلا اور لطیف کو کسی نے بازو سے پکڑ کر باہر کھینچا۔ لطیف نے اس کی طرف دیکھا تو سامنے اس کا باس کھڑا تھا۔ جس کے اگلے دو دانت خرگوش کی طرح باہر نکلے ہوئے تھے اور اسے سبھی بادشاہ کہتے تھے۔

''میری کار وہ کھڑی ہے...... اندھوں کی طرح کام نہ کیا کرو۔'' بادشاہ نے ڈانٹا اور اس نے گردن گھما کر دیکھا تو وہ کار ایک طرف کھڑی تھی۔

پھر انہوں نے احتشام کو اسی حالت میں اُٹھایا اور اس کار میں پچھلی سیٹ پر پٹخ دیا۔ ایک احتشام کے اوپر بیٹھ گیا اور وہ دونوں کار کی اگلی سیٹوں پر بیٹھ گئے۔ اس کے ساتھ ہی کار ایک جھٹکے سے آگے بڑھ گئی۔

☆☆☆

سیاہ برقع ایک جھٹکے سے اُترا تو احتشام نے اپنی آنکھیں بند کیں اور پھر کھول کر دائیں بائیں دیکھا۔ وہ ایک ہال نما کمرے میں کھڑا تھا۔ اس کے سامنے وہ تینوں کھڑے تھے جو اسے یہاں تک لائے تھے۔

''میں کہاں ہوں؟'' احتشام نے پوچھا۔

''تمہارے لیے یہ جاننا ضروری نہیں ہے کہ تم کہاں ہو، یہ پوچھو کہ تم یہاں کیوں ہو۔'' خرگوش کے دانتوں والے بادشاہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''میں یہاں کیوں ہوں؟'' احتشام نے اس کی بات پر عمل کرتے ہوئے فوراً ہی سوال کر دیا۔

''تم یہاں اس لیے ہو کہ تم اغوا ہو چکے ہو اور تم کو ہم نے اغوا کیا ہے۔'' اس نے بتایا۔

''مجھے اغوا کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ میرا تاوان دینے والا کوئی نہیں ہے۔'' احتشام جلدی سے بولا۔ ''تم لوگوں نے مجھے اغوا کر کے خسارے کا سودا کیا ہے۔''

''تم ہم سے زیادہ نہیں جانتے کہ ہم نے تم کو کیوں اغوا کیا ہے۔'' خرگوش کے دانتوں والے نے ایک ہی سانس میں اپنی بات کہی۔

''تم جانتے ہو تو پھر مجھے بتا دو کہ مجھے اغوا کیوں کیا ہے۔'' احتشام نے اس کی طرف دیکھا۔

بادشاہ نے احتشام کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''ابھی تم کو سب پتا چل جائے گا۔''

احتشام چپ ان تینوں کا چہرہ باری باری دیکھنے لگا۔ اچانک سامنے والا دروازہ کھلا اور ایک پلستر لگی سیدھی ٹانگ نمودار ہوئی اور ... پھر اس کے پیچھے ایک پورا انسان وہیل چیئر پر بیٹھا ہال نما کمرے میں داخل ہوا۔ اس وہیل چیئر کے پیچھے ایک آدمی تھا جو اس وہیل چیئر کو دھکیلتا ہوا لا رہا تھا۔

احتشام وہیل چیئر پر براجمان آدمی کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ سر سے بالکل گنجا تھا اور اس کے ہونٹوں کے اوپر اور ناک کے نیچے باریک سی مونچھیں تھیں۔ اس نے سیاہ چشمہ لگایا ہوا تھا۔ اور چہرہ ایسا سپاٹ تھا کہ دیکھتے ہی عجیب سا لگتا تھا۔

وہ تینوں جو احتشام کو یہاں تک لائے تھے... سیدھے مؤدب کھڑے تھے۔ وہیل چیئر احتشام کے سامنے رک گئی۔ اس شخص نے سیاہ چشمہ اتارا اور غور سے احتشام کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔

''بادشاہ......'' اس نے خرگوش کے دانت والے کو اس کا نام لے کر مخاطب کیا۔

''یس باس۔'' وہ مؤدب ہو کر بولا۔

''تم جانتے ہو کہ ہم وقت ضائع کرنے کے عادی نہیں ہیں۔ اسے مختصراً ماضی کا ایک صفحہ پڑھ کر سناؤ۔ تاکہ ہم بات کو آگے بڑھا سکیں۔'' اس شخص نے کہا۔

بادشاہ بولنا شروع ہوا۔ ''یہ ہمارے باس ہیں۔ جرائم کی دنیا میں ان کا ایک نام ہے، رعب ہے، دہشت ہے، لیکن معصوم خان جو کہ دراصل معصوم نہیں ہے، نے ان کا رعب اور دبدبہ ختم کرنے کے لیے ان کو پکڑا اور اتنا مارا کہ یہ بے ہوش ہو گئے۔ پھر معصوم خان جو دراصل معصوم نہیں ہے، نے ان کی یہ والی ٹانگ توڑ دی اور ان کی ٹانگ کی ہڈیاں کرچی کرچی ہو گئیں، اور اس ٹانگ پر کئی ہفتوں سے پلستر چڑھا ہوا ہے اور توپ کی نال کی طرح ٹانگ ہر وقت اسی طرح سیدھی رہتی ہے۔ ہمارے باس کہیں بھی جاتے ہیں پہلے ٹانگ اندر جاتی ہے اور اس کے بعد باس کی شکل لوگوں کو دکھائی دیتی ہے۔''

''بالکل صحیح کہہ رہے ہو تم۔'' باس نے کہا۔

''ہم سب کو معصوم خان جو دراصل معصوم ہے نہیں، کے اس ظلم پر بہت غصہ ہے اور ہم نے وعدہ کیا تھا کہ معصوم خان جو دراصل معصوم ہے نہیں، کو پکڑ کر اس کی دونوں ٹانگوں کا قیمہ بنا کر دم لیں گے کہ ڈاکٹر اس کی دونوں ٹانگوں پر پلستر بھی نہ چڑھا سکیں۔'' بادشاہ کہتے کہتے جذباتی ہو گیا، لگتا تھا

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

جیسے وہ تقریر کررہا ہو۔

''جب تک معصوم خان سے میں بدلہ نہیں لوں گا مجھے چین نہیں آئے گا۔'' باس نے کہہ کر غصے سے دانت پیسے۔

''یہ آپ اور ان کی لڑائی ہے۔ مجھے کیوں اغوا کیا ہے؟'' ساری بات سن کر احتشام نے اپنے آپ کو اس معاملے سے نکالنے کی کوشش کی۔

''تین مہینوں سے ہم نے تم پر اور معصوم خان جو دراصل معصوم ہے نہیں، کے ایک ایک پل پر نظر رکھی ہوئی ہے۔ معصوم خان پر قابو پانے کے لیے ضروری ہے کہ ہم پہلے تم کو قابو کریں۔'' باس نے کہا۔

''میرے پاس تو پھل کاٹنے والا چاقو بھی نہیں ہوتا اور آپ مجھے ان سے بھی پہلے قابو کرنے کی سوچے بیٹھے ہیں۔'' احتشام بولا۔

''ہم معصوم خان کو اغوا کرنا چاہتے ہیں۔'' باس نے کہا۔

''آپ خوشی سے اُن کو اغوا کریں، بھلا میری اجازت کی کیا ضرورت ہے آپ لوگوں کو؟'' احتشام کہہ کر ہلکی سی ہنسی ہنسا۔

''ہم تم سے اجازت طلب نہیں کررہے۔'' باس نے غصہ دکھایا اور احتشام سہم کر کھڑا ہو گیا۔

''پھر میرا کیا کام ہے جی؟'' احتشام نے پوچھا۔

''بادشاہ...... اسے اپنے پلان کے بارے میں بتاؤ۔'' باس نے ایک بار پھر بادشاہ کو حکم دیا۔

بادشاہ نے اپنا گلا صاف کیا اور بولا۔ ''ہم معصوم خان جو دراصل معصوم ہے نہیں، کو اغوا کرنا چاہتے ہو اور تم اسے اغوا کرنے میں ہماری مدد کرو گے۔''

''نہیں اغوا کرنا مشکل ہی نہیں ناممکن بھی ہے۔ چوکور پارک کے اردگرد موجود ہر گھر سمجھ لیں اس کا محافظ ہے۔ وہاں سے انہیں نکال کر لے جانا بالکل ہی ناممکن ہے۔'' احتشام نے انہیں بتایا۔

بادشاہ مسکرایا۔ اس کے چہرے پر ایک شاطر سی مسکراہٹ تھی۔ ''تم ہماری پلاننگ کو نہیں جانتے۔ بس تم کو ہماری مدد کرنی ہے، سب ممکن ہو جائے گا۔''

''میں کیا مدد کرسکتا ہوں؟'' احتشام نے اس کی طرف دیکھا۔

''تم اس کے گھر جاسکتے ہو، باہر آسکتے ہو اور سارے کام تم ہی کرتے ہو۔ رات آٹھ بجے سے نو بجے تک معصوم خان جو دراصل معصوم ہے نہیں، کسی سے نہیں ملتا۔ سب جانتے ہیں کہ کتنا بھی ضروری کام ہو، وہ کسی سے نہیں ملے گا اس لیے رات آٹھ بجے سے نو بجے تک کوئی بھی اس سے ملنے نہیں آتا اور نہ ہی وہ کہیں جاتا ہے...... ویسے بتاؤ تو سہی کہ وہ اس دوران میں کرتا کیا ہے؟''

''وہ کھانا کھاتا ہے، دانتوں میں خلال کرتا ہے، چائے کا کپ پیتے ہوئے فریدہ خانم کی ایک غزل سنتا ہے اور پھر میل ملاپ میں مصروف ہو جاتا ہے۔'' احتشام نے بتایا۔

''اس کے پاس کسی کو بھی رات نو بجے سے پہلے آنے کی اجازت نہیں ہے۔''

''ٹھیک آٹھ بجے دودھ والا دودھ لے کر بھی آتا ہے؟'' بادشاہ نے کہا۔

''ہاں آتا ہے۔''

''اس دوران روزانہ ایک فقیر مانگنے بھی آتا ہے۔''

''ہاں...... ایک مہینے سے ایک فقیر لکڑی کی چھوٹی سی ریڑھی پر بیٹھا ہوتا ہے اور دوسرا فقیر وہ ریڑھی دھکیل رہا ہوتا ہے۔ وہ چوکور پارک کا چکر لگاتے ہیں، بھیک لیتے ہیں اور چلے جاتے ہیں۔''

بادشاہ منہ دبا کر ہنسا اس کے ساتھ اس کے ساتھی بھی ہنسنے لگے اور باس کے چہرے پر بھی مسکراہٹ رقص کرنے لگی۔

بادشاہ بولا۔ ''وہ کوئی فقیر نہیں ہیں بلکہ میں اور لطیف ہوتے ہیں۔''

اس انکشاف پر احتشام چونکا۔ ''آپ دونوں ہوتے ہو...... لیکن کیوں؟''

''اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ ہمارے دھندے میں مندی کا رجحان ہے۔ بالکل بھی نہیں بلکہ یہ ہماری منصوبہ بندی کا حصہ ہے۔ اب میں بتاتا ہوں کہ معصوم خان جو دراصل معصوم نہیں ہے، اسے اغوا کیسے کرنا ہے۔'' بادشاہ اس کے سامنے کھڑا ہو گیا اور اپنا گلا صاف کرنے کے بعد بولا۔ ''کل دودھ والا راستے میں ہی اغوا ہو جائے گا اور اس کی جگہ میرا آدمی دودھ دینے آئے گا۔ تم کھانا کھاتے ہوئے معصوم خان جو دراصل معصوم ہے نہیں، کے سالن میں بے ہوشی کی دوا ڈال دو گے جو میں تم کو دوں گا۔ دودھ والے کی موٹر سائیکل پر بہت سے کین لدے ہوتے ہیں۔ وہ جان بوجھ کر اس کے گھر کے دروازے کے پاس کھڑا ہو کر اپنے کین ٹھیک کرنے لگے گا۔ اس کا مقصد یہ ہوگا کہ اس کے دروازے پر ہونے والی ہلچل کا کسی کو پتا نہ چلے۔ اس دوران وہ دونوں فقیر اپنی ریڑھی لے کر بھی دودھ والے

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

کے پاس آجائیں گے اور اس سے بھیک میں دودھ مانگنے لگیں گے۔ اس اثنا میں سالن میں بے ہوشی کی دوا ہونے کی وجہ سے معصوم خان جو دراصل معصوم نہیں ہے......''

''تم اس کا نام لے کر یہ وضاحت کیوں کرتے ہو کہ وہ معصوم نہیں ہے؟'' باس کو چڑ ہوگئی۔

''مجھے اس پر غصہ ہی بہت ہے۔ بڑا معصوم بنا پھرتا ہے۔'' بادشاہ نے اپنے خرگوش جیسے دانت مزید باہر نکالے۔

''میں تمہارے جذبات کو سمجھتا ہوں لیکن اب تم بس اپنی بات مکمل کرو اور اس کی وضاحت چھوڑو۔''

''او کے باس۔'' بادشاہ نے کہا اور پھر احتشام کی طرف متوجہ ہوا۔ ''میں یہ کہہ رہا تھا کہ معصوم خان...... بے ہوش ہو چکا ہوگا۔ تم اسے اندر سے اُٹھا کر باہر لے آؤ گے اور میں ریڑھی سے اُٹھ کر کھڑا ہو جاؤں گا اور اپنی جگہ معصوم خان کو بٹھا کر اس پر وہی چادر ڈال دوں گا جو چادر میں لے کر بیٹھتا ہوں۔ ہم ریڑھی کو دھکیلتے ہوئے، بھیک کی صدا لگاتے ہوئے اس جگہ سے نکل جائیں گے۔''

بادشاہ نے کہنے کے بعد ایک بار پھر دانت نکالے۔ احتشام نے سوچا کہ انہوں نے معصوم خان کو اغوا کرنے کا منصوبہ تو خوب بنایا ہے۔

''تم ہمارا ساتھ دو گے؟'' باس بولا۔

''آپ لوگوں کا ساتھ دینے کا مجھے کیا فائدہ ہوگا؟'' احتشام نے جان بوجھ کر کہا۔

''معصوم خان کی دو ٹانگیں توڑ کر ہم اُسے ہمیشہ کے لیے اپاہج بنا دیں گے اور وہ ناکارہ ہو جائے گا۔ پھر تم آسانی سے اس کی بہن عارفہ سے شادی کر کے اسی گھر میں ہنسی خوشی رہنا۔'' باس کی بات سن کر احتشام چونکا کہ ان کو کیسے پتا ہے کہ اس کا عارفہ کے ساتھ چکر چل رہا ہے۔

''میرا عارفہ کے ساتھ کیا تعلق......؟'' احتشام نے جلدی سے کہا۔

''تمہارا اور عارفہ کا گہرا تعلق ہے۔ تم نے تو اس کے کہنے پر معصوم خان کے بجلی کے بل کے پیسے بھی دبا لیے ہیں۔''

''تم اتنا کیسے جانتے ہو؟'' اس انکشاف کے بعد احتشام کو پوچھنا ہی پڑا۔

''جب تم دونوں آپس میں باتیں کر رہے تھے تو میں ہمت کر کے اس گھر میں گھس چکا تھا اور تم دونوں کی باتیں سن رہا تھا۔ جب میں نے سنا کہ تم دونوں فرار ہونا چاہتے ہو تو میں اس گھر سے باہر نکلا اور باس کو آ کر ساری بات بتائی کہ بجائے ہم اس گھر میں گھس کر معصوم خان کے کھانے میں بے ہوشی کی دوا ڈالیں یہ کام ہم تم سے لے سکتے ہیں۔'' بادشاہ نے بتایا۔

اسی لمحے احتشام نے سوچا کہ اگر وہ ایمانداری سے ان کا ساتھ دے تو اس ظالم سے جان چھوٹ سکتی ہے اور ان دونوں کو کہیں بھاگ کر جانے کی ضرورت بھی نہیں رہے گی۔

''کیا سوچ رہے ہو؟'' باس نے پوچھا۔

''سوچ رہا ہوں کہ کیا کروں۔''

''تم ہمارا ساتھ دو۔ تمہارا بھی فائدہ ہے اور ہمارا بھی۔'' باس نے کہا۔

احتشام کی بچت اسی میں تھی کہ وہ ان کا ساتھ دے۔ چنانچہ اس نے حامی بھر لی۔ بادشاہ نے اسے ایک پڑیا نکال کر دی اور کہا کہ یہ بے ہوش کرنے والی دوا ہے کل رات جب وہ کھانا کھانے بیٹھے تو یہ دوا اس کے سالن میں ملا دینا۔

''معصوم خان کو اغوا کرنے کا کام کل کیوں کرنا ہے آج ہی کر لیتے ہیں۔'' احتشام نے کہا۔

''یہ کام ہمیں کل ہی کرنا ہے۔ آج ہماری ایک اور ڈیل ہے۔ میں اور باس دوسری مصروف ہوں گے اور آج رات کو چوکور پارک کے ارد گرد مانگنے کے لیے لطیف اور ساجھا جائے گے۔'' بادشاہ نے بتایا۔

احتشام نے پڑیا جیب میں رکھی اور کہا۔ ''ایک اور بات عرض کروں؟''

''ہاں کرو۔''

''آپ لوگوں کو معصوم خان سے انتقام لینا ہے۔ اس کے کھانے میں بے ہوشی کی دوا ملانے کے بجائے مجھے زہر دے دیں میں وہ ملا دیتا ہوں۔ خس کم جہاں پاک......''

احتشام کی بات سن کر ایک نہیں وہ چاروں ہی ہنسنے لگے۔ احتشام کو گمان ہوا کہ اس نے ان سے سنجیدہ بات کی تھی کہ کوئی لطیفہ سنا دیا تھا؟

جب وہ ہنسنا بند ہوئے تو باس نے کہا۔ ''اس طرح مارنے کا بھی ہم نے سوچا تھا۔ لیکن اس طرح مزہ نہیں آئے گا۔ اس نے میری ٹانگ خود توڑی تھی اور اس کی دونوں ٹانگیں ہم خود توڑنا چاہتے ہیں۔ اور پھر اُسے اپاہج اور لاچاری کی زندگی میں...... سسک سسک کر موت کی طرف بڑھتا ہوا دیکھنا چاہتے ہیں۔''

''اب سمجھ آئی بات؟'' بادشاہ بولا۔

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

''سمجھ آ گئی۔''

''اب تمہیں کل یہ سب کرنا ہے جو میں نے بتایا ہے۔ ہم فقیر کے بھیس میں اسی جگہ ہوں گے۔ اور یاد رکھو اگر تم نے ہم کو دھوکا دیا تو......'' بادشاہ نے یہ کہتے ہی اس کا گریبان پکڑا اور زور سے اپنی طرف کھینچا۔

''میں کیوں دھوکا دوں گا۔ میں تو خود اس سے نجات چاہتا ہوں۔ میں تو یہ کام آپ لوگوں کے لیے نہیں بلکہ اپنے لیے کروں گا۔'' احتشام نے کہا۔

بادشاہ مسکرایا۔ ''بہت خوب...... بالکل ٹھیک سوچ رہے ہو تم۔''

اس کے بعد بادشاہ نے اسے مزید ہدایات دیں اور ایک چھوٹا سا سستا سا موبائل فون بھی دے دیا جس میں صرف ایک نمبر ہی محفوظ تھا اور اس موبائل فون کو کب استعمال کرنا ہے اس بارے میں بھی اس نے اسے آگاہ کر دیا تھا۔

جب ساری باتیں ہوگئیں تو بادشاہ نے اسی طرح احتشام کے اوپر برقع ڈالا اور اسے اُٹھا کر باہر لے گئے۔

☆☆☆

احتشام کو انہوں نے جس جگہ سے اُٹھایا تھا اسی جگہ چھوڑ گئے تھے۔ احتشام کو یہ پتا نہیں چل سکا تھا کہ وہ اسے کہاں لے کر گئے تھے۔ وہ پیدل چلتے ہوئے گھر پہنچ گیا۔

''کہاں تھا تو......؟ اتنی دیر لگا دی۔'' جاتے ہی اس کا سامنا معصوم خان سے ہو گیا۔

''بینک میں بہت رش تھا۔'' احتشام نے بہانہ کیا۔

''بل جمع ہو گیا ہے؟''

''ہاں جی ہو گیا ہے۔''

''رسید دو مجھے......'' معصوم خان نے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

احتشام نے جلدی سے اپنا ہاتھ ایک جیب میں ڈالا اور پھر دوسری جیب میں اور اس طرح اس نے اپنی ساری جیبیں دیکھ لیں۔

''رسید کہاں چلی گئی۔'' احتشام پریشانی کی اداکاری کرتا ہوا بولا۔

''کہاں پھینک آئے ہو؟ اگر نہیں مل رہی تو تجھے الٹا لٹکا دوں کیا؟'' معصوم خان نے غصے سے کہا۔

''پتا نہیں کہاں چلی گئی ہے...... میری جیب میں ہی تھی۔'' احتشام سوچنے لگا۔ معصوم خان آگے بڑھا اور اس کا بازو پکڑ کر ایسے گھمایا جیسے موٹر سائیکل کو ریس دے رہا ہو،

احتشام کی چیخ ہی نکل گئی۔

''کس کو دے آیا ہے رسید......؟''

''مجھے لگتا ہے کہ میں بینک میں بھول آیا ہوں، یا پھر جب جیب سے رومال نکالا تھا تو وہ رسید کہیں گر گئی ہے۔''

احتشام تکلیف سے دو چار بولا۔

''اگر میری بجلی کٹی تو تیری گردن کاٹ دوں گا۔ تو جانتا ہے کہ گردن کاٹنا میرے لیے کوئی مشکل نہیں ہے۔ مجھے ایک ضروری کام سے نہ جانا ہوتا تو تجھے بتاتا کہ بے پروائی کیسے کی جاتی ہے۔'' معصوم خان نے ایک جھٹکے سے اسے چھوڑا اور گھر سے باہر نکل گیا۔ باہر کچھ آدمی کھڑے تھے اور اسے ایک جگہ جانا تھا۔

احتشام اپنا بازو سہلانے لگا کہ عارفہ بھاگتی ہوئی اس کے پاس آ گئی۔ ''فکر نہیں کرو محبت کی راہیں مشکل اور تکلیف دہ ہوتی ہیں۔''

''مجھے لگ رہا تھا کہ وہ میرا بازو توڑ کر ہی سانس لے گا۔'' احتشام نے کہا۔

''جلاد خان گھر سے باہر چلا گیا ہے۔ میں تو کہتی ہوں کہ ابھی چلتے ہیں اور فرار ہو جاتے ہیں۔'' عارفہ نے تجویز پیش کی۔

اس کی بات سن کر احتشام نے دائیں بائیں دیکھا اور اس کا بازو پکڑ کر کمرے میں لے گیا اور پھر بادشاہ اور باس کے ساتھ ہونے والی ساری بات چیت اس کے گوش گزار کر دی۔ عارفہ خاموشی سے سنتی رہی پھر مسکرائی۔

''یہ تو ہمارے لیے اور بھی آسانی ہو گئی۔ اس طرح ہمیں کہیں بھاگ کر جانے کی ضرورت نہیں ہو گی۔''

''یہی سوچ کر میں نے ہامی بھری تھی۔''

''وہ بے ہوشی کی دوا مجھے دے دو۔ کھانے میں میں ملا دوں گی۔'' عارفہ نے کہا اور احتشام نے وہ پڑیا اسے دے دی۔ احتشام نے ساری بات بتا دی تھی لیکن یہ بتانا بھول گیا تھا کہ یہ کام آج نہیں، کل کرنا ہے۔

☆☆☆

رات کو ٹھیک آٹھ بجے معصوم خان اپنا ہر ضروری کام چھوڑ کر اپنے کمرے میں موجود ہوتا تھا۔ وہ رات کا کھانا اور صبح کا ناشتا ایک ہی وقت پر پابندی سے کیا کرتا تھا۔ اس کا یہ معمول کئی سالوں سے تھا۔

رات کو جب اپنے وقت پر معصوم خان کھانا کھانے کے لیے بیٹھا تو عارفہ نے بڑی آسانی سے اس میں بے ہوشی کی دوا شامل کر دی اور کھانا معصوم خان کے آگے پیش کر دیا۔

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

اس نے کھانا شروع کر دیا۔

عارفہ تیزی سے کمرے سے نکل کر احتشام کے پاس گئی اور سرگوشی کے انداز میں بولی۔ ”میں نے بے ہوشی کی دوا شامل کر دی ہے۔“

اس کی بات سنتے ہی احتشام ایک دم چونکا۔ ”تم نے آج ہی بے ہوشی کی دوا شامل کر دی ہے۔“

”جلاد خان نے کھانا شروع بھی کر دیا ہے۔ اب جلدی سے جو کرنا ہے کرلو۔“ عارفہ پُرجوش تھی۔

”یہ دوا آج شامل نہیں کرنی تھی۔ کل کرنی تھی۔ اسے اغوا کرنے کا کل کا پروگرام تھا۔“ احتشام پریشان ہو کر بولا۔

”تم نے مجھے یہ بات تو بتائی نہیں تھی۔“

”میں نے ساری بات بتائی تھی، تم نے غور نہیں کیا ہوگا۔“

”اب جو ہونا تھا وہ ہو گیا ہے، تم ان کو فون کرو کہ وہ اسے لے جائیں۔“ عارفہ نے کہا۔

”آج وہ کہیں اور مصروف ہیں۔ پتا نہیں وہ آتے ہیں کہ نہیں۔“ احتشام سوچ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔

”تم ان کو فون کر کے بات تو کرو۔“

”پہلے یہ تو دیکھ لیں کہ وہ بے ہوش بھی ہوا ہے کہ نہیں۔“ احتشام نے اس سے کہا۔

عارفہ نے پُراعتماد لہجے میں کہا۔ ”اب تک وہ کھانے کے اوپر ہی گر چکا ہوگا۔“

”تم جا کر دیکھو۔“ احتشام نے کہا اور عارفہ کمرے کی طرف چلی گئی۔

عارفہ نے آہستہ سے کمرے کا دروازہ کھولا اور اندر جھانکا تو وہ چونک گئی سامنے معصوم خان کھانا کھا رہا تھا۔ عارفہ کو دیکھتے ہی وہ بولا۔

”اِدھر آؤ میرے پاس......“

عارفہ ڈرتے ہوئے اس کے پاس چلی گئی۔ ”میں پوچھنے آئی تھی کہ کسی اور چیز کی ضرورت تو نہیں ہے۔ اور آپ بالکل ٹھیک ہیں ناں۔ نیند تو نہیں آرہی ہے؟“

معصوم خان نے ایک جھٹکے سے اس کے سر کے بال پکڑ لیے اور عارفہ کی چیخ ہی نکل گئی۔

”گھر میں جتنا نمک پڑا تھا، وہ تم نے سارا کا سارا میرے سالن میں ڈال دیا ہے۔“

”غلطی ہو گئی بھائی......“ عارفہ تکلیف میں تھی۔

”تمہاری غلطی نے آج میرا کھانا برباد کر دیا لیکن اس کے باوجود میں سارا سالن کھا گیا۔ چلو اس طرف ایک ٹانگ پر کھڑی ہو جاؤ ورنہ دوسری ٹانگ توڑ دوں گا۔“

معصوم خان نے حکم دیا اور عارفہ ایک طرف ایک ٹانگ پر کھڑی ہو گئی۔ یہ کام تکلیف دہ تھا لیکن وہ اس کی حکم عدولی نہیں کر سکتی تھی۔ اس سے قبل بھی وہ کئی سزائیں بھگت چکی تھی۔

باہر احتشام مضطرب ٹہل رہا تھا۔ اس نے سوچا کہ ابھی تک جو عارفہ نہیں آئی اس کا مطلب ہے کہ معصوم خان بے ہوش پڑا ہوگا۔ احتشام نے موبائل فون نکالا اور بادشاہ کا نمبر پش کرنے کے بعد انتظار کرنے لگا۔ تھوڑی دیر کے بعد رابطہ ہوتے ہی بادشاہ کی پریشان سی آواز سنائی دی۔

”بولو کیا بات ہے؟“

”غلطی ہو گئی ہے۔“ احتشام بولا۔

”بات کو لمبا مت کرو اور جلدی بتاؤ اِدھر بھی ایمرجنسی چل رہی ہے۔“ بادشاہ بولا۔

”عارفہ نے بے ہوشی کی دوا کل کے بجائے آج ہی اُن کے کھانے میں ملا دی ہے۔ اب کیا کریں؟“

”کچھ مت کرو اور اطمینان سے بیٹھے رہو۔“ دوسری طرف سے بادشاہ نے عجلت میں کہا۔ ”باس کو سالن میں نمک زیادہ کھانے کی عادت ہے۔ اس لیے ہر وقت نمک ساتھ رکھتا ہوں۔ غلطی سے نمک والی پڑیا تجھے دے دی اور بے ہوشی کی دوا باس کے سالن میں نمک سمجھ کر ڈال دی ہے۔ اب وہ بے ہوش ہو گئے ہیں اور میں انہیں اسپتال لے کر جا رہا ہوں۔“

یہ سن کر احتشام پریشانی کے عالم میں اپنی آنکھیں گھمانے لگا۔ اس نے کہا۔ ”اچھا بہتر......“

”کل دو بجے اسی جگہ ملنا...... تجھے بے ہوشی کی دوا دے دوں گا۔ فون بند کرو۔ اسپتال آ گیا ہے۔“ بادشاہ نے کہا اور احتشام نے فون بند کر دیا۔

پورا ایک گھنٹا عارفہ ایک ٹانگ پر کھڑی رہی اور پھر اس کی جان چھوٹی۔ معصوم خان عارفہ اور احتشام پر کسی بھی طرح کا تشدد کرنے سے گریز نہیں کرتا تھا۔ وہ سخت دل تھا۔

جب معصوم خان اپنے آدمیوں کے ساتھ نیچے اپنے ڈیرے پر چلا گیا تو عارفہ جو ابھی تک تکلیف میں مبتلا تھی، اپنے پاس احتشام کو دیکھ کر بولی۔

”کس چیز کا بنا ہے، بے ہوش نہیں ہوا اور نمک کا زیادہ بول کر مجھے ایک ٹانگ پر کھڑا کر دیا۔“

”عارفہ وہ نمک ہی تھا۔“ احتشام نے کہا۔

”کیا کہا......؟ وہ نمک ہی تھا۔“ جونہی عارفہ کی تیز آواز

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

نکلی احتشام نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور چپ رہنے کا اشارہ کرتے ہوئے بتانے لگا کہ غلطی کہاں سے ہوئی ہے۔

☆☆☆

ٹھیک دو بجے بہانہ کر کے احتشام اس جگہ پہنچ گیا جہاں سے اسے کل اغوا کیا گیا تھا۔ لطیف اسے پُڑیا دے کر چلا گیا اور تاکید کر دی کہ کام ہوشیاری سے اور وقت پر کرنا ہے۔

احتشام نے وہ پُڑیا لا کر عارفہ کو دے دی۔ عارفہ کل کی ڈری ہوئی تھی کہ اگر آج بھی نمک ہی نکلا تو معصوم خان ہوسکتا ہے کہ اسے کل سے بھی زیادہ سخت سزا دے۔ چنانچہ اس نے ضروری سمجھا کہ وہ پہلے تسلی کر لے کہ یہ بے ہوشی کی ہی دوا ہے۔ اب اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ اسے کیسے چیک کرے۔ بہرحال اس نے پُڑیا ایک طرف چھپا کر رکھ دی۔

احتشام کو بادشاہ کے بار بار پیغامات موصول ہو رہے تھے اور اسے ہوشیار رہنے کے لیے تاکید کی جارہی تھی۔

شام کے سائے گہرے ہونے لگے تو احتشام اور عارفہ کے دل کی دھڑکنیں بھی تیز ہونا شروع ہوگئیں۔ پونے آٹھ بجے بادشاہ اور لطیف فقیروں کے روپ میں اس جگہ داخل ہو گئے تھے اور مانگنے کے لیے مسلسل صدا لگا رہے تھے۔

عارفہ نے سالن تیار کر لیا تھا اور روٹی پکا رہی تھی۔ ٹھیک آٹھ بجے معصوم خان کھانا کھانے کے لیے اپنے کمرے میں چلا گیا۔

عارفہ نے کانپتے ہاتھوں سے بے ہوشی کی دوا معصوم خان کے سالن میں شامل کر دی اور کھانا ٹرے میں سجا کر معصوم خان کے کمرے کی طرف چلی گئی۔

جونہی اس نے ٹرے معصوم خان کے سامنے رکھی تو اس نے پوچھا۔ ''آج تو نمک تیز نہیں ہے؟''

''نہیں بھائی...... بالکل ٹھیک ہے۔''

''چیک کیا تھا تم نے؟''

''ہاں چیک کیا تھا۔''

''اگر آج بھی نمک تیز ہوا تو تیرے دونوں ہاتھ گرم توے پر رکھ دوں گا۔'' معصوم خان نے کہا اور عارفہ بُری طرح سے ڈر گئی۔

معصوم خان کھانا کھانے لگا، سالن میں نمک تیز نہیں تھا۔ سب کچھ ٹھیک تھا اس نے کھانا کھاتے ہوئے عارفہ کو جانے کا اشارہ کیا۔ عارفہ کی جان میں جان آگئی اور وہ تیزی سے کمرے سے چلی گئی۔

احتشام ایک طرف کھڑا تھا۔ اس نے ہاتھ کے اشارے سے دریافت کیا کہ سب ٹھیک ہوگیا ہے؟ عارفہ نے بھی اشارے سے بتایا کہ وہ کھانا کھا رہا ہے۔ اب دونوں کو اس کے بے ہوش ہونے کا انتظار تھا۔

اسی اثنا میں دودھ والا آگیا۔ احتشام نے برتن پکڑا اور باہر کی طرف دوڑا۔ سامنے دودھ والے کی موٹر سائیکل پر بادشاہ کا آدمی تھا۔ وہ احتشام کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔

جیسے ہی دودھ ڈلوانے کے لیے احتشام نے برتن آگے کیا بادشاہ کے آدمی نے پوچھا۔

''کیا پوزیشن ہے؟''

''وہ کھانا کھا رہا ہے۔'' احتشام نے بتایا۔

''اب تک وہ بے ہوش ہو کر گر چکا ہوگا۔ تم برتن چھوڑ دو اور اس کی خبر لے کر میرے پاس آجاؤ۔'' اس نے دھیمے لہجے میں کہا اور احتشام برتن چھوڑ کر اندر چلا گیا۔

احتشام نے ڈرتے ہوئے دروازہ کھولا اور اندر جھانکا۔ سامنے معصوم خان پلنگ پر بے ہوش ہو کر ایک طرف گرا ہوا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ بے ہوش ہوگیا ہے۔

احتشام چلتا ہوا اس کے پاس گیا اور اس نے اس کا ہاتھ پکڑا اور بلند کر کے چھوڑ دیا اس کا ڈھیلا ہاتھ نیچے گر گیا۔ اس سے صاف عیاں تھا کہ وہ اب ہوش میں نہیں ہے۔

احتشام نے کھانے کی ٹرے اُٹھائی اور باہر لا کر عارفہ کو دیتے ہوئے کہا۔ ''تم یہ بچا ہوا سالن دھو دو تا کہ ہم پر کوئی شک نہ آئے۔''

عارفہ کچن میں چلی گئی اور احتشام نے باہر جا کر دودھ والے سے کہا۔ ''وہ بے ہوش ہوگیا ہے۔''

''جلدی سے اسے کسی بھی طرح کھینچ کر دروازے تک لے آؤ۔'' وہ بولا۔ پارک کی دوسری طرف وہ دونوں فقیروں کے روپ میں تھے اور ان کی صدا سب کو سنائی دے رہی تھی۔

احتشام اندر چلا گیا اور بادشاہ کے آدمی نے بادشاہ کو میسج کر دیا۔ ان کی ریڑھی کا رخ اس گھر کی طرف ہوگیا تھا۔

احتشام سیدھا کمرے میں گیا اور اس نے معصوم خان کو پلنگ سے نیچے گرایا اور پھر اس کی دونوں ٹانگیں پکڑ کر اسے کھینچتا ہوا سیڑھیوں تک لے آیا۔ صاف فرش پر وہ اسے کھینچ کر آسانی سے سیڑھیوں تک لے آیا تھا۔ اب اسے نیچے اتارنے کا مسئلہ تھا۔ وہ پھر بھاگ کر دودھ والے کے پاس گیا اور وہ اس کے ساتھ اندر آگیا۔ احتشام اور دودھ والے نے ٹانگیں اور بازو پکڑ کر اسے بمشکل نیچے اتارا۔ اس کا اچھا

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

خاصا وزن تھا۔ احتشام کو تو لگ رہا تھا جیسے وہ کسی ہاتھی کو اُٹھائے ہوئے ہو۔ اس کی سانس پھول چکی تھی۔

اس دوران ان دونوں کی ریڑھی بھی دودھ والے کے پاس آ گئی تھی۔ بے ہوش معصوم خان دروازے کے پاس ہی پڑا تھا۔ دودھ والے کے روپ میں بادشاہ کا آدمی پھر باہر چلا گیا تھا۔ آٹھ بج کر بیس منٹ ہوئے تھے اور پارک کے ارد گرد کوئی بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

''اب کیا کرنا ہے؟'' احتشام نے دروازے کے اندر ہی کھڑے ہو کر پوچھا۔ اس کی آواز آہستہ تھی۔

بادشاہ جو ریڑھی کے اندر بیٹھا ہوا تھا، اس نے دائیں بائیں دیکھا اور ریڑھی سے اُٹھ کر باہر آ گیا۔ انہوں نے ریڑھی اس طرح سے رکھی ہوئی تھی کہ اس کے آگے موٹر سائیکل تھی اور موٹر سائیکل کی آڑ میں کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

بادشاہ اور دودھ والے نے بڑی تیزی سے معصوم خان کو اُٹھایا اور بھیک مانگنے والی ریڑھی پر بٹھا دیا اور ساتھ ہی اس کے اوپر وہ پرانی چادر ڈال دی جو بادشاہ نے لی ہوئی تھی۔

''اس کے ہاتھ باندھ دو۔'' بادشاہ نے کہا۔

''یہ کم از کم چار گھنٹے تک بے ہوش رہے گا۔ ہاتھ باندھنے کی کیا ضرورت ہے؟'' لطیف بولا۔

اس کے ساتھ ہی دودھ والے نے اپنی موٹر سائیکل اسٹارٹ کی اور اس جگہ سے نکل گیا۔ جبکہ لطیف پیدل ہی ایک طرف چل پڑا اور بادشاہ اس ریڑھی کو دھکیلتا ہوا صدا دینے لگا۔

''کر بھلا...... ہو بھلا...... کر بھلا...... ہو بھلا......''

معصوم خان جیسے شخص کو اس کے گھر سے اغوا کرنا مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن تھا لیکن ان کی تدبیر نے معصوم خان کو اس کے گھر سے آسانی سے اغوا کر لیا تھا۔

''بابا جی روٹی لے جاؤ۔'' جونہی وہ ایک گھر کے سامنے سے گزرنے لگا ایک عورت نے باہر نکل کر آواز دی۔

بادشاہ تو اس جگہ سے نکلنے کے چکر میں تھا۔ اب اگر وہ روٹی نہیں لیتا تھا تو مسئلہ خراب ہو سکتا تھا۔ چنانچہ وہ رک گیا۔

''بھلا ہو میری بہن کا...... خدا اور دے......'' بادشاہ یہ کہتا ہوا اس عورت کے پاس چلا گیا۔

گرم روٹی کے اوپر تڑکا لگی ماش کی دال، ساتھ ایک قاش آم کے اچار کی، اور تھوڑی سی کٹی ہوئی پیاز بھی تھی۔

اقتباس (اقوال زریں)

1- جب کوئی تم پر ہنستا ہے تو تم اس کو معاف کر سکتے ہو لیکن جب تم اس پر ہنسو تو بسا اوقات تم خود کو اس حماقت پر معاف نہیں کر سکتے جب کوئی تمہارے ساتھ برائی کرے تو تم اس کی برائی کو فراموش کر سکتے ہو لیکن جب تم خود کسی کے ساتھ برائی کرتے ہو تو اپنی برائی کو ہمیشہ یاد رکھتے ہو۔ تو اب تمہیں یقین کر لینا چاہیے کہ وہ دوسرا شخص دراصل تمہاری ہی ذات ہے جس کا شعور بڑھا ہوا ہے لیکن ہے وہ ایک دوسرے جسم میں۔

2- عالم اور شاعر کے سامنے ایک سبزہ زار ہے۔
عالم جب اس سے گزر جاتا ہے تو حکیم بن جاتا ہے۔
شاعر جب اس کو طے کر لیتا ہے تو پیغمبر بن جاتا ہے۔

3- ایمان دل کے صحرا میں ایک سرسبز و شاداب قطعۂ زمین ہے جہاں فکر کے قافلے نہیں پہنچ سکتے۔

4- جو محبت روزانہ نہیں امنڈتی وہ روزانہ مرتی رہتی ہے۔

5- اگر تم اپنی قوم، اپنے ملک یا اپنی ذات کے تعصب سے ذرا بلند ہو جاؤ تو اپنے رب کی تمثیل بن جاؤ۔

6- نظام زندگی کو بدنظمی کے حوالے کر دینے کے شوق کا نام ہی اس مادی دنیا میں جہاد ہے۔

جانباز خان کا انتخاب گجرات سے

☆☆☆

نئی دلہن نے دولہا کے گلے میں بانہیں ڈال کر کہا۔
''ڈارلنگ ہم ہنی مون منانے بینکاک جائیں گے یا سنگاپور؟''
''جہاں تمہارے ڈیڈی چاہیں گے۔''
''وہ کیوں، ہنی مون منانے تو ہم جا رہے ہیں، ڈیڈی کی مرضی کیوں؟''
''بالکل ٹھیک کہا تم نے مگر اخراجات تو وہی برداشت کریں گے نا۔'' دولہا نے معصومیت سے جواب دیا۔

شادی شدہ

بیوی اُداس ہو کر ''جب شادی ہوئی تھی، آپ مجھے بہت چاہتے تھے لیکن اب......''

خاوند (بات کاٹتے ہوئے) ''خیر سیلن سچی بات یہ ہے کہ مجھے شادی شدہ عورتیں اچھی نہیں لگتیں۔''

لاہور سے وثیق الرحمن شاہین کی معاملہ فہمی

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

جونہی اس نے روٹی پکڑی بادشاہ کی بھوک چمک اُٹھی اور پھر یہ سب اسے ویسے بھی بہت پسند تھا۔ بادشاہ کا دل چاہا کہ وہ اسی جگہ بیٹھ کر روٹی کھانا شروع کر دے کہ وہ عورت پھر بولی۔

''بیٹھ کر کھالو...... میں ایک روٹی اور لاتی ہوں۔ تمہارے دوسرے ساتھی کے لیے......''

''وہ نہیں کھائے گا۔ بیمار ہے۔''

''کیا ہوا ہے اُسے؟''

''بس بیمار ہے۔ نڈھال ہے۔ اس کے علاج کے لیے اسے لیے پھرتا ہوں۔'' بادشاہ نے کہا اور غیرارادی طور پر ایک لقمہ توڑ کر کھالیا تو اسے ایسا مزہ آیا کہ اس نے پھر روٹی ایسے کھائی جیسے وہ چار دن کا بھوکا ہو۔ وہ بھول ہی گیا کہ وہ اس وقت کس مقصد کے لیے فقیر بنا ہوا ہے۔ اس کی مانگنے والی ریڑھی میں کون ہے۔

روٹی کھانے کے بعد اس نے ایک ننھی سی ڈکار لی اور جونہی وہ ریڑھی کی طرف بڑھا، وہ خاتون بولی۔

''ایک منٹ رک جاؤ بابا...... میرے میاں نے نہا لیا ہے۔ میں نے ان کو اس کی بیماری کے بارے میں بتایا ہے وہ کہتے ہیں میں ابھی چیک کرتا ہوں...... میرے میاں ڈاکٹر ہیں۔''

''ہائیں...... ؟'' یہ سنتے ہی جیسے بادشاہ کی آنکھیں کھل گئی ہوں۔ اس نے عورت کی طرف دیکھ کر کہا۔ ''آپ انہیں لے آئیں میں یہاں بیٹھا ہوں۔''

''آتے ہیں وہ۔'' عورت کہہ کر اسی جگہ کھڑی رہی۔

بادشاہ پریشان ہو گیا کہ اگر وہ تیزی سے بھاگا تو عورت کو شک ہو جائے گا اور وہ شور بھی مچا سکتی ہے۔ اس تذبذب میں وہ سوچنے لگا کہ وہ کیا کرے۔

احتشام دروازے میں کھڑا اُن کی طرف دیکھ رہا تھا۔ پھر جیسے اس نے دیکھا کہ اندر سے ڈاکٹر صاحب مع اپنے سازوسامان باہر نکلے ہیں تو احتشام بھی ٹھٹکا...... اور وہ ان کی طرف بھاگا۔

بادشاہ نے ڈاکٹر کو اپنی طرف آتا دیکھ کر معصوم سی شکل بنائی اور سوچا کہ جو بھی ہو، اسے اب بھاگنا ہے۔ اس سے پہلے کہ ڈاکٹر اس تک پہنچتا اور بادشاہ وہاں سے دوڑ لگاتا، احتشام اس جگہ پہنچ گیا اور ڈاکٹر سے بولا۔

''یہ مانگنے والے بڑے ڈراماباز ہوتے ہیں۔ چھوڑیں آپ ان سے اتنی ہمدردی نہ کریں۔''

''یہی بات میں نے اپنی بیوی سے بھی کہی تھی لیکن اس کی نرم دلی اس بات کو نہیں مان رہی۔'' ڈاکٹر بھی اسی جگہ رک گیا۔

''دفع کریں آپ ان کو۔'' احتشام نے ڈاکٹر کا بازو پکڑا اور اسے ایک طرف لے گیا اور موقع غنیمت جانتے ہوئے بادشاہ نے مانگنے والی ریڑھی آگے بڑھا دی۔

منصوبے کے مطابق اس جگہ سے نکلتے ہی کار پارکنگ میں ایک سفید کار کھڑی تھی اور اس کی ڈکی میں معصوم خان کو ڈال کر انہوں نے نکلنا تھا۔ اور کار انہوں نے ایسی جگہ کھڑی کی تھی جہاں اندھیرا بھی تھا اور اردگرد بھی کوئی نہیں تھا۔

ابھی بادشاہ ریڑھی لیے یہ دیکھ رہا تھا کہ لطیف کہاں کھڑا ہے کہ ایک میلا سا آدمی اس کے پاس آتے ہی تلخ لہجے میں بولا۔ ''کون ہے تو...... اِدھر کیا کر رہا ہے...... جانتا ہے یہ میرا ایریا ہے...... یہاں میرے آدمی بھیک مانگتے ہیں...... تو کدھر سے آ گیا......''

''ابے جا...... دفع ہو جا۔'' بادشاہ بولا۔

''مجھے کہہ رہا ہے......؟ دفع ہونے کا مجھے کہہ رہا ہے......؟ تیرا ٹھیکیدار کون ہے......؟'' وہ پھر اس کے ساتھ اُلجھا۔

بادشاہ نے ایک دم سے پستول نکالا اور اس کے پیٹ کے ساتھ لگا دیا۔ ''جانتا ہے کہ گولی چلا دوں......؟''

''ناراض کیوں ہوتا ہے، اس جگہ کا ٹھیکیدار ہوں تم سے پوچھ بھی نہیں سکتا۔'' ایک دم سے اس کی ساری اکڑ دھواں ہو گئی اور وہ ایک طرف بھاگ گیا۔ بادشاہ نے پستول اندر رکھا اور کار کی طرف چل دیا۔

بادشاہ لکڑی کی ریڑھی کو دھکیلتا ہوا تیزی سے کار کی طرف جا رہا تھا۔ راستے میں اگر کسی نے دس کا نوٹ نکال کر دینا بھی چاہا تو اس نے اس کی طرف توجہ ہی نہیں دی اور اس کے توجہ نہ دینے پر بھیک دینے والے نے حیرت سے بادشاہ کو ضرور دیکھا تھا۔

بادشاہ جب سفید کار کے پاس پہنچا تو لطیف پہلے سے موجود تھا۔ اس نے جلدی سے ڈکی کھولی اور دونوں نے... سرعت سے بھاری بھرکم معصوم خان کو اُٹھا کر اندر رکھا اور ڈکی نیچے کر دی، اسے مکمل بند نہیں کیا تا کہ ہوا آتی جاتی رہے۔

''معصوم خان کو بالآخر ہم نے اغوا کر ہی لیا۔'' لطیف خوش ہو کر بولا۔

''وقت ضائع مت کرو اور جلدی سے نکلو۔'' بادشاہ نے کہا۔

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

''ایک سگریٹ اور پان نہ لے آؤں۔'' لطیف نے اجازت طلب نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

ایک لمحے کے لیے بادشاہ نے سوچا اور پھر دائیں بائیں دیکھا۔ اس جگہ کوئی بھی نہیں تھا اور اس بات کا بھی اطمینان تھا کہ معصوم خان کم از کم چار گھنٹے تک ہوش میں نہیں آ سکتا۔ سامنے سڑک پار کرنے کے بعد پان سگریٹ کی دکان تھی۔

''چل دونوں چلتے ہیں۔'' بادشاہ نے کہا اور دونوں پان سگریٹ کی دکان کی طرف چل دیے۔ ابھی وہ پان سگریٹ کی دکان کے پاس نہیں پہنچے تھے کہ ایک آدمی اس طرف آیا اور اس نے کار کی طرف دیکھا اور پھر دائیں بائیں نظر دوڑائی اور تیزی سے دروازے کے پاس جا کر اس نے ایک باریک تار کی ہول میں داخل کیا اور دوسرے ہاتھ سے کار کے دروازے کا ہینڈل پکڑا، کار مقفل نہیں تھی۔ وہ ایک دم سے کار کا دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گیا۔ اس نے نیچے جھک کر تاروں کے ساتھ کچھ چھیڑ چھاڑ کی اور کار اسٹارٹ ہوگئی۔ دوسرے ہی لمحے اس نے کار بیک کی اور تیزی سے اس جگہ سے نکل گیا۔

دونوں پان سگریٹ لینے کے بعد جونہی اس جگہ آئے جہاں انہوں نے کار کھڑی کی تھی وہ چونک گئے۔ بادشاہ کے ہونٹوں میں دبا ہوا سگریٹ حیرت کے جھٹکے سے نیچے گر گیا۔

''کار کہاں گئی......؟'' بادشاہ کی حیران کن آواز نکلی۔

لطیف متحیّر اور متلاشی نگاہوں سے دائیں بائیں ہی دیکھے جا رہا تھا۔ ''ابھی تو یہاں کھڑی تھی۔''

''کار گئی کہاں؟'' بادشاہ کی حیرت معدوم نہیں ہو رہی تھی۔

''بادشاہ...... ہماری کار چوری ہوگئی ہے۔'' لطیف جلدی ہی بات کی گہرائی تک پہنچ گیا۔

''اگر کار چوری ہوگئی ہے تو اس کے اندر معصوم خان بھی چلا گیا ہے۔'' بادشاہ فکر مند ہوگیا۔ دونوں کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کریں۔ حیرت ان کے چہروں پر ایسے برس رہی تھی جیسے موسلا دھار بارش ہوتی ہے۔

☆☆☆

بادشاہ کی کار کو چوری کر کے وہ آدمی سیدھا معصوم خان کے گھر کے سامنے لے آیا تھا۔ وہ آدمی کار سے باہر نکلا دوسرے آدمی کو ہدایت دی وہ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ احتشام بھی اندر سے باہر آ گیا تھا۔ اس نے کار کی طرف دیکھا ہی تھا کہ وہ آدمی جو کار لے کر آیا تھا، اس نے پوچھا۔

''خان جی کہاں ہیں؟''

''پتا نہیں...... باہر ہی نکلے تھے۔''

''میں تب تک اندر بیٹھتا ہوں۔ مال لے کر آیا ہوں۔ پیسے لینے ہیں۔'' وہ آدمی کہہ کر اندر چلا گیا۔

وہ آدمی کار اس جگہ سے لے گیا اور اس محلے سے نکلتے ہی کمرشل گودام تھے وہاں ایک گلی میں جاتے ہی اس نے کار ایک گودام کے آگے کھڑی کر دی۔ ایک طرف سے بوڑھا چوکیدار باہر نکلا اور اس نے اس گودام کا شٹر اُٹھا دیا۔ اس گودام میں تین گاڑیاں اور بھی کھڑی تھیں اور جابجا کاٹھ کباڑ کا سامان پڑا تھا۔ اس آدمی نے جب کار اندر کھڑی کی تو اس گودام میں پیر رکھنے کو بھی جگہ نہیں بچی تھی۔

وہ آدمی کار سے باہر نکلا اور چپ چاپ ایک طرف چل دیا۔ بوڑھے نے شٹر نیچے کر کے تالا لگا دیا اور اندر گھپ اندھیرا چھا گیا۔

☆☆☆

معصوم خان کو ملنے والے حسبِ معمول کئی لوگ آئے تھے اور وہ نیچے ہال نما کمرے میں براجمان تھے۔ سگریٹوں کا دھواں ہر جگہ پھیلا ہوا تھا۔ اور ہر کوئی آپس میں باتوں اور قہقہے چھوڑنے میں مصروف تھا۔ سب کو حیرت تھی کہ معصوم خان کہاں چلا گیا ہے۔ اس وقت تو وہ کہیں بھی نہیں جاتا تھا کیونکہ رات گئے تک اس جگہ کئی معاملات طے ہوتے تھے۔

احتشام خوش و خرم اوپر عارفہ کے پاس بیٹھا تھا۔

''ہمارے سر سے بہت بڑی مصیبت اتر گئی ہے۔''

''ماننا پڑے گا کہ انہوں نے بڑی منصوبہ بندی سے جلاد خان کو اغوا کیا ہے۔'' عارفہ بولی۔

''اس وقت تمہارا بھائی ان کے قبضے میں ہوگا۔ انہوں نے اسے رسی سے باندھا ہوگا۔ اور جلاد خان ان کے سامنے چوہے کی طرح بیٹھا ہوگا۔ پھر وہ اس کی دونوں ٹانگیں توڑ دیں گے اور اسے اپاہج بنا دیں گے۔ جلاد خان کی ساری طاقت ختم ہو جائے گی اور ہم اس کے آنے سے پہلے شادی کر لیں گے۔'' احتشام نے خواب دیکھتے ہوئے کہا۔

اسی وقت احتشام کا موبائل فون بجنے لگا۔ احتشام نے اسکرین پر بادشاہ کا نام دیکھا تو اسے کان سے لگا لیا۔

''ایک مسئلہ کھڑا ہو گیا ہے؟'' دوسری طرف سے بادشاہ کی آواز آئی۔

''کیا مسئلہ ہو گیا ہے؟'' یہ سنتے ہی احتشام کے پیروں کے نیچے سے زمین نکل گئی۔ اسے لگا کہ معصوم خان ان کے چنگل سے بھاگ گیا ہے اور وہ ابھی کسی بھی وقت اس جگہ پہنچ

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

جائے گا۔

''جس کار کی ڈکی میں معصوم خان جو معصوم ہے نہیں، کو میں نے ڈالا تھا، وہ کار چوری ہوگئی ہے۔ معصوم خان جو کہ معصوم ہے نہیں، اس کے آدمی اس علاقے سے کاریں چوری کر کے اس کے پاس لے آتے ہیں۔ کوئی سفید کار تو نہیں آئی؟'' بادشاہ نے پوچھا۔

''سفید کار ہے؟''

''ہاں سفید کار ہے۔'' بادشاہ نے کہا۔

''ابھی آئی تھی اور اب وہ گودام میں چلی گئی ہے۔'' احتشام نے بتایا۔

''تم نے خود دیکھی ہے.....؟'' بادشاہ نے پُرجوش انداز میں پوچھا۔

''ہاں ابھی میری آنکھوں کے سامنے گودام میں گئی ہے۔ جس نے چوری کی ہے وہ اندر بیٹھا ہے پیسے لینے کے لیے۔'' احتشام نے بتایا۔

''میں آرہا ہوں۔ مجھے اس گودام میں لے چلو۔ چار گھنٹے کے بعد معصوم خان جو کہ معصوم ہے نہیں کو ہوش آجائے گا اور پھر مشکل ہوجائے گی۔'' بادشاہ نے کہا۔

''اس گلی میں اس کے چھ گودام ہیں۔ پتا نہیں کس گودام میں کھڑی کی ہوگی۔'' احتشام بولا۔

''مجھے بس تم ان گوداموں تک لے جاؤ باقی کام میرا ہے۔'' بادشاہ نے کہا۔ احتشام نے اسے وہ جگہ بتائی جہاں اسے پہنچ کر کھڑا ہونا تھا اور کہا کہ وہ اس جگہ پہنچ رہا ہے۔

''کیا ہوا.....؟'' جونہی احتشام نے فون کان سے الگ کیا عارفہ نے پوچھا۔

احتشام نے اختصار سے بتایا اور پریشان ہوکر بولا۔ ''کمال بات ہے۔ جلاد خان اغوا ہوکر بھی واپس اسی جگہ آگیا ہے۔ اگر وہ ہوش میں آگیا تو واپس آجائے گا پھر ہم کبھی ایک نہیں ہوسکیں گے۔''

''ایسا نہ کہو..... تم اُن کی مدد کرو اور کسی بھی طرح جلاد خان کو واپس اغوا کراؤ۔'' عارفہ بولی۔ احتشام کے جسم میں تو جیسے بے چینی کی چیونٹیاں بھر گئی تھیں۔ وہ ایک جگہ ٹک کر کھڑا نہیں ہو رہا تھا۔ اس پر خوف مسلط ہوگیا تھا جیسے ابھی معصوم خان دروازے سے نمودار ہوکر اس کی گردن دبوچ لے گا۔

''میں جاتا ہوں۔'' احتشام نے کہا اور اس پریشانی کے عالم میں وہ باہر جانے کے بجائے دوسرے کمرے کی طرف چل دیا۔ عارفہ نے جلدی سے اس کا بازو پکڑ کر اس کا رخ اس دروازے کی طرف کیا جس سے گزر کر اسے نیچے جانا تھا۔

جونہی وہ باہر گلی میں آیا، سامنے دلاور کھڑا تھا۔ بظاہر تو وہ معصوم خان کا دوست تھا لیکن وہ بغل میں لمبے پھل والا چھرا لیے پھرتا تھا اور اس تاک میں تھا کہ کسی طرح سے معصوم خان کو کچھ ہوجائے اور وہ اس کی جگہ کمان سنبھال کر سب کا باس بن جائے۔ لیکن اس کی یہ حسرت ابھی تک پوری نہیں ہوئی تھی۔

دلاور اندر ہی اندر معصوم خان کے آدمی جو اس کے بھی دوست تھے ان کے دل میں بہانے بہانے سے معصوم خان کے خلاف نفرت کے قطرے ڈالتا رہتا تھا اور اس نے بہت سی توڑ پھوڑ کردی تھی، معصوم خان سے ہر کوئی اندر ہی اندر اجیرن تھا، لیکن اس کے باوجود وہ ناکام تھا اور معصوم خان کی کرسی کو چھو بھی نہیں سکا تھا۔ کیونکہ معصوم خان کے جیتے جی یہ سب نہیں ہوسکتا تھا۔

دلاور نے جیسے ہی احتشام کو دیکھا اشارے سے اسے اپنے پاس بلالیا۔ ''باس کہاں ہے؟''

''پتا نہیں...... بغیر بتائے کہیں چلے گئے ہیں۔'' احتشام نے انجان بننے کی کوشش کی۔

دلاور نے اس کی طرف گھور کر دیکھا اور بولا۔ ''کل دوپہر کو تم بادشاہ کے پاس کھڑے کیا کر رہے تھے؟''

بادشاہ کا نام سنتے ہی احتشام چونکا۔ ''کک...... کون بادشاہ......؟''

''اتنے انجان نہ بنو۔ میں اس جگہ سے گزر رہا تھا اور وہ تمہارے پاس کھڑا تھا۔ وہ باس کا سب سے بڑے دشمن کا خاص آدمی ہے۔ بتاؤ کیا کہہ رہا تھا؟'' دلاور نے کچھ تیز لیکن دھیمے لہجے میں کہا۔

''آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے، میں کسی بادشاہ کو نہیں جانتا۔'' احتشام نے اپنی بات پر قائم رہتے ہوئے پھر جھوٹ بولا، لیکن وہ اندر سے ڈر گیا تھا۔

دلاور نے دائیں بائیں دیکھا اور اس کے پاس ہوتے ہوئے کہا۔ ''دیکھو میں خود باس کے خلاف ہوں۔ اور باس کے آدمیوں میں بھی بہت سے میرے ساتھ ہیں۔ مجھے سچ بتاؤ کیا بات ہے، اگر وہ باس سے کوئی انتقام لینا چاہتے ہیں تو میں ان کی مدد کرتا ہوں۔''

''پتا نہیں آپ کیا کہہ رہے ہیں، میری کچھ سمجھ میں نہیں آرہا ہے۔ میں پتا کروں کہ خان جی کہاں ہیں......'' احتشام کہہ کر جلدی سے اس جگہ سے چلا گیا اور دلاور اسے جاتا ہوا دیکھتا اور پھر اس کے پیچھے چل پڑا۔

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

احتشام ڈر گیا تھا۔ بادشاہ سے جب وہ اسی جگہ جا کر بے ہوشی کی دوا لے رہا تھا تو دلاور نے اس جگہ سے گزرتے ہوئے دونوں کو دیکھ لیا تھا۔ احتشام سوچ رہا تھا کہ اگر معصوم خان زندہ سلامت واپس آ گیا تو دلاور یقیناً اسے بتا دے گا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ احتشام نے دلاور کو حقیقت بتائی نہیں تھی اور دلاور پہلے ہی معصوم خان کے اور قریب ہونے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتا تھا۔ تاکہ وہ زیادہ سے زیادہ قریب ہو کر اس پر وار کر سکے۔

احتشام چوک میں پہنچا تو ایک طرف بادشاہ اور لطیف ایسے کھڑے تھے جیسے ان کی ٹھکائی کر کے ان سے وہ نقدی چھین کر لے گئے ہوں جو انہوں نے قطرہ قطرہ کر کے جمع کی تھی۔

احتشام نے ان کے پاس جانے کے بجائے انہیں اشارہ کیا اور وہ بھی اس کے پیچھے چلنے لگے۔ ایک گلی کے پاس پہنچ کر احتشام رک گیا اور ان کے قریب آنے پر بولا۔

''تم لوگ دلاور کو جانتے ہو؟''

''ہم کس کو نہیں جانتے۔'' لطیف نے زعم سے جواب دیا۔

''کل جب میں تم سے بے ہوشی کی دوا لے رہا تھا تو اس نے ہمیں دیکھ لیا تھا۔ مجھ سے پوچھ رہا تھا کہ ماجرا کیا ہے۔ میں تم سے کیوں مل رہا تھا؟'' احتشام نے بتایا۔

''تم کہہ دیتے کہ وہ مجھ سے راستہ پوچھ رہا تھا۔ مجھے کیا پتا کہ وہ کون ہے۔'' بادشاہ نے یہ کہہ کر ایک لمحے میں اس کا مسئلہ حل کر دیا۔

''ہاں...... یہ بات بھی ٹھیک ہے۔ اب میں اسے یہی کہوں گا۔'' احتشام بولا۔

''چلو ہم کو اس کے گوداموں کے پاس لے جاؤ۔'' بادشاہ بولا۔ ''وقت کم ہے اگر معصوم خان جو کہ دراصل معصوم نہیں ہے، اسے ہوش آ گیا تو بہت بُرا ہو جائے گا۔''

وہ ان کو ایک اور گلی کے نکڑ پر لے گیا۔ وہ گلی کشادہ تھی اور گلی میں آمنے سامنے چھ گوداموں کے شٹر دکھائی دے رہے تھے۔

''یہ چھ کے چھ گودام معصوم خان کے ہیں۔ یہاں صرف ایک بوڑھا چوکیدار ہوتا ہے۔ گوداموں کی چابیاں اسی کے پاس ہوتی ہیں۔''

''تمہارا کام ختم، تم جاؤ۔'' بادشاہ نے کہا اور احتشام اس جگہ سے فوراً چلا گیا۔ دونوں نے اس گلی کا جائزہ لیا۔ بالکل سنسان اور اندھیرے میں ڈوبی ہوئی گلی تھی۔ چوکیدار کہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اچانک بادشاہ کو لگا جیسے اس کے سر پر کوئی بھاری بھرکم چیز گری ہے۔ اس کی آنکھوں کے سامنے تارے ناچ گئے تھے۔ اس نے اپنے سر کو جھٹکا دیا اور گردن گھما کر لطیف کی طرف دیکھا لیکن وہ تو غائب تھا۔

سر میں تکلیف اور آنکھوں کے آگے چھائے اندھیرے کے باوجود اس نے متلاشی نظروں سے لطیف کو دیکھا اور اچانک وہ چونک گیا کیونکہ لطیف اس کے پیروں میں زمین پر لیٹا ہوا تھا۔

''ابے تو سو رہا ہے۔ میری جان پر بنی ہوئی ہے۔'' بادشاہ نے غصے سے کہا۔ اچانک اس کے سر پر ایک اور بھاری بھرکم چیز لگی اور پھر باوجود کوشش کے وہ اپنے آپ کو سنبھال نہیں سکا اور لطیف کے ساتھ ہی زمین پر لیٹ گیا۔

☆☆☆

معصوم خان کا کہیں پتا نہیں چل رہا تھا۔ اب جو لوگ آئے ہوئے تھے، وہ اپنی باتوں کو چھوڑ کر اس تشویش میں مبتلا ہو گئے تھے کہ معصوم خان کہاں غائب ہو گیا ہے۔ مختلف چہ میگوئیاں ہونے لگی تھیں۔ ہر کوئی احتشام سے سوال کر رہا تھا اور احتشام بالکل انجان بنا ہوا تھا۔

احتشام نے متلاشی نگاہوں سے دلاور کو تلاش کرنے کی کوشش کی لیکن وہ کہیں دکھائی نہیں دیا۔ احتشام کو فکر لاحق ہو گئی کہ کہیں دلاور آ کر سب کو یہ نہ بتا دے کہ اس نے کل اسے بادشاہ کے ساتھ دیکھا تھا۔

موقع ملتے ہی احتشام اوپر چلا گیا اور ساری صورت حال سے آگاہ کرنے کے بعد بولا۔ ''کسی بھی وقت کچھ بھی ہو سکتا ہے۔''

''تم ان کے درمیان رہو اور جاننے کی کوشش کرتے رہو کہ یہ کیا کہتے ہیں۔ اگر ہم فرار ہوئے تو ان کا شک ہم پر جائے گا اور ہم بری طرح سے پھنس جائیں گے۔'' عارفہ نے سوچنے کے بعد کہا۔

''میں ایسا کرتا ہوں کہ بہانے سے گوداموں کی طرف جاتا ہوں اور یہ جاننے کی کوشش کرتا ہوں کہ بادشاہ نے وہ کار تلاش کر لی ہے جس کی ڈگی میں جلاد خان تھا۔''

''یہ بھی ٹھیک ہے، لیکن ہوشیاری سے جانا۔ کسی کو کوئی شک نہ ہو۔'' عارفہ نے کہا۔

احتشام پھر نیچے چلا گیا۔ نیچے والے حصے میں آئے ہوئے لوگ ایک دوسرے کے ساتھ باتوں میں مصروف تھے۔ ہر ایک کا موضوع معصوم خان کی گمشدگی تھی۔

''کچھ پتا چلا......'' ایک نے سوال کیا۔

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

اچانک احتشام کے دماغ میں ایک عجیب سا خیال آیا۔ اس نے سب کی طرف ایک نظر ڈالی اور پھر ان کے پاس جا کر بولا۔

''خان جی کو کچھ دنوں سے شک تھا۔''

''کس بات کا......؟'' ایک ساتھ کئی آوازیں آئیں۔

''اس بات کا شک تھا کہ پولیس ان کے پیچھے ہے اور ان کی جاسوسی ہو رہی ہے۔'' احتشام نے جھوٹ بولنے کے لیے بھرپور ہمت کی۔

''اچھا......؟'' ایک ساتھ سب کے منہ سے اچھا نکلا۔

''روز شام کو دو فقیر ریڑھی پر آتے تھے۔ خان جی کو شک تھا کہ وہ پولیس کے آدمی ہیں۔''

''اچھا......'' ایک ساتھ پھر سب کے منہ سے نکلا۔

''مجھے شک سا ہونے لگا ہے۔'' احتشام نے کہہ کر سب کی طرف دیکھا۔

''کیا شک ہونے لگا ہے؟'' کئی آوازیں ابھریں۔

''کہیں ایسا نہ ہو...... میرے منہ میں خاک...... دیکھیں میں اپنا شک بتا رہا ہوں جو غلط بھی ہو سکتا ہے...... براہِ مہربانی مجھے پیٹنا نہ شروع کر دیجیے گا۔'' مزید جھوٹ بولنے سے قبل احتشام نے اپنے تحفظ کے لیے استدعا کی۔ وہ جانتا تھا کہ کچھ جوشیلے ایسے بھی ہوتے ہیں جن کو بات کی سمجھ بعد میں آتی ہے اور وہ پتا نہیں کیا سمجھ کر گھونسوں کی بارش کر دیتے ہیں۔

''تم بتاؤ...کیا شک ہے۔'' کچھ آوازیں پھر آئیں۔

''مجھے شک ہے کہ کہیں خان جی کو پولیس والے نہ لے گئے ہوں...اور یہاں بھی چھاپا نہ پڑ جائے۔'' احتشام نے رک رک کر اپنا جملہ مکمل کیا اور ایک دم سے خاموشی چھا گئی۔ ہر چہرے پر سراسیمگی چھا گئی۔ ایک کے علاوہ سب رخصت ہو گئے۔

''آپ خان جی کے سچے ساتھی ہیں جو ابھی تک نہیں گئے، ورنہ سب ہی ساتھ چھوڑ گئے ہیں۔'' احتشام دل ہی دل میں خوش تھا کہ اس کی تدبیر اور بروقت آمد ہونے والے جھوٹ سے ان سب سے نجات مل گئی ہے۔

''میں ان کے لیے نہیں بیٹھا۔ تم میرے ساتھ چلو اور گودام میں سے مجھے کار نکلوا کر دو جو میں چوری کر کے لایا تھا تا کہ اسے کہیں اور دے کر اپنی دیہاڑی سیدھی کر سکوں۔''

اس آدمی نے کہا تو احتشام نے سوچا کہ یہ تو اور بھی اچھا ہے۔ وہ اسے ابھی اس جگہ لے جاتا ہے اور بادشاہ وہاں پہلے سے موجود ہے، جونہی یہ کار اس گودام سے نکالے گا میں اشارہ کر دوں گا اور بادشاہ اس پر قابو پا کر اپنی کار لے لے گا۔

''جلدی چلو میرے ساتھ۔'' احتشام نے کہا اور دونوں اس گلی میں پہنچ گئے جہاں معصوم خان کے گودام تھے۔ گلی اسی طرح خاموش تھی کوئی ہلچل نہیں تھی۔ بلکہ کوئی سرسراہٹ بھی نہیں تھی ہر گودام کا شٹر بند تھا۔

دونوں جیسے ہی ایک گودام کے پاس پہنچے چوکیدار باہر نکل آیا۔ ''کیا بات ہے شام......''

''ابھی جو کار کھڑی کی تھی، وہ یہ آدمی لے کر آیا تھا۔ کہہ رہا ہے کہیں اور سودا کرے گا...... اسے کار واپس دے دو۔'' احتشام نے کہا۔

''ابھی آتا ہوں۔'' چوکیدار کہہ کر اندر گیا۔

احتشام دائیں بائیں بھی دیکھ رہا تھا کہ شاید اسے کہیں وہ دونوں چھپے ہوئے دکھائی دے دیں لیکن وہ تو بالکل ہی غائب تھے۔

چوکیدار نے ایک شٹر کھولا اور بولا۔ ''نکالو کار......''

وہ آدمی اس کار میں بیٹھا اور اسٹارٹ کر کے باہر لے آیا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ کار اس گلی سے نکال کر باہر لے گیا۔ جبکہ احتشام سوچ رہا تھا کہ بادشاہ اور لطیف کہاں چلے گئے۔ وہ ان کے بارے میں چوکیدار سے بھی نہیں پوچھ سکتا تھا۔ اس لیے چپ چاپ ہی واپس چل پڑا۔

☆☆☆

وہ آدمی کار کو دوڑاتا ہوا اس طرف لے جا رہا تھا جہاں چوری کی کاریں خریدی جاتی تھیں۔ سامنے پولیس کا ناکا لگا ہوا تھا۔ وہ کسی کو روک نہیں رہے تھے آمد و رفت جاری تھی۔ اس آدمی نے سوچا کہ وہ بھی آسانی سے نکل جائے گا۔ اچانک ایک پولیس والا سامنے آگیا اور رکنے کا اشارہ کرنے لگا۔ حالانکہ وہ اشارہ اس سے پچھلی کار کو کر رہا تھا جس کے اندر منچلے بیٹھے تھے اور اونچی آواز میں میوزک لگایا ہوا تھا، وہ آدمی سمجھا کہ اسے روکا جا رہا ہے۔ اس نے کار کی رفتار تیز کر دی اور تیزی سے ان کے پاس سے گزر گیا۔ پولیس والے پچھلی کار کو بھول گئے اور اس کے پیچھے دوڑیں لگا دیں۔

اب سڑک پر پولیس والے اس کا تعاقب کر رہے تھے۔ وہ تعاقب بھی ایسا کر رہے تھے کہ پکڑ کر ہی دم لیں گے۔ اس آدمی کی بڑی کوشش تھی کہ وہ ان کو چکما دے کر نکل جائے لیکن وہ اس سے ایک لمحے کے لیے بھی غافل نہیں تھے۔

اس تعاقب میں وہ کہیں اور ہی نکل آیا تھا اور پولیس کی گاڑی کافی پیچھے رہ گئی تھی۔ اچانک اس آدمی کی نظر ایک

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

زیرِ تعمیر عمارت پر پڑی۔ اس آدمی نے سوچا کہ اگر اس عمارت کے اندر جانے کے لیے کوئی راستہ ہوا تو ان سے چھپنے کے لیے کار اس عمارت کے اندر لے جائے گا۔

جونہی وہ عمارت کے قریب گیا۔ عمارت کا گیٹ کھلا ہوا تھا اور اندر اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ اس آدمی نے کار کی ہیڈ لائٹس بند کردیں اور کار سیدھی اندر لے گیا اور ایک طرف کھڑی کردی۔

ابھی وہ آنکھیں بند کر کے سانس ہی لے رہا تھا کہ اچانک پوری عمارت روشن ہوگئی۔ پھر اس کے کانوں میں کسی کی آواز پڑی۔

''شکر ہے تین گھنٹوں کے بعد بجلی ٹھیک ہوگئی اور ہمیں بھی روشنی دیکھنا نصیب ہوئی ہے..... اور یہ کار کون اندر لے کر آیا ہے؟''

اس آدمی نے اپنی آنکھیں کھول کر سامنے اور پھر دائیں بائیں دیکھا۔ اس کی آنکھیں حیرت سے پھٹ گئی تھیں۔ اس عمارت میں اس کے اردگرد چار پولیس والے کھڑے تھے اور وہ کار غلطی سے تھانے کی عمارت کے اندر لے گیا تھا۔ جس کی بجلی خراب تھی اور الیکٹریشن کافی دیر سے لگا ہوا تھا اور ابھی بجلی ٹھیک ہوئی تھی۔

''کون ہو تم......؟'' ایک پولیس والے نے اس کے قریب جا کر پوچھا۔

''میں جی غلطی سے اندر آ گیا۔'' اس آدمی نے معصومیت سے جواب دیا۔

پولیس والے نے اسے مشکوک نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اب آ ہی گئے ہو تو تلاشی بھی دیتے جاؤ.....''

''میں جی شریف آدمی ہوں۔ اندھیرے میں پتا نہیں چلا اور کار اندر لے آیا۔ میری بیوی اسپتال میں بیمار ہے مجھے جلدی ہے۔'' اس آدمی کے دل کی دھڑکن تیز ہوگئی تھی۔

''تلاشی تو دینی پڑے گی..... کہیں تم بارود لے کر تو نہیں آ گئے......'' یہ کہتے ہی پولیس والا خوف سے پیچھے ہٹ گیا۔ اس کی بات سن کر دوسرے پولیس والے جس جگہ تھے اسی جگہ رک گئے۔ ان میں کوئی بڑا افسر نہیں تھا سبھی پولیس والے تھے۔ اس آدمی نے اسے موقع غنیمت جانا اور فوراً کار اسٹارٹ کی، ایک جھٹکے سے بیک گیئر لگایا اور کار کو تھانے کی حدود سے باہر نکال دیا۔ دھول کا دھواں چھا گیا تھا۔ اس کے بعد اس آدمی نے کار کو اس رفتار سے اس جگہ سے بھگایا کہ اس نے ایک لمحے کے لیے کار کی رفتار آہستہ کرنا بھی گوارا نہیں کیا۔

اس تیز رفتاری میں وہ آدمی یہ نہیں دیکھ سکا کہ سامنے سڑک ختم ہوگئی ہے اور دائیں طرف کچی سڑک اترتی ہے۔ اس آدمی نے فوراً بریک لگائے لیکن کار کی رفتار تیز تھی اور کار کے ٹائر چیختے چلاتے رہے لیکن رکے نہیں اور اس کی کار جہاں سے سڑک ختم ہوتی تھی وہاں نیچے کی طرف راستہ جاتا تھا، جھٹکے کھاتی ہوئی نیچے اترنے لگی۔ اس آدمی کا سر کئی بار کار کے اسٹیئرنگ سے ٹکرایا اور اس آدمی کو ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی اس کی گردن پکڑ کر اس کا سر اسٹیئرنگ میں مار رہا ہو۔ جھٹکے اس قدر شدید تھے اور پیچھے ڈگی کھلی ہوئی تھی اور ایک بڑے جھٹکے نے معصوم خان کو اچھال کر باہر پھینک دیا۔ جبکہ بے قابو کار ڈھلان میں دور تک اترتی گئی اور پھر دھما کے سے ایک درخت سے جا ٹکرائی، اس آدمی کا سر اس قدر زور سے اسٹیئرنگ سے ٹکرایا کہ وہ بھی اسی جگہ بے ہوش ہو گیا۔

☆☆☆

بادشاہ کو ہوش آیا تو وہ کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ ساتھ والی کرسی پر لطیف اس سے کوئی پندرہ منٹ قبل ہوش میں آ کر اپنے سامنے کھڑے دلاور کو ایسے دیکھے جا رہا تھا جیسے وہ کسی اور ہی سیارے کی مخلوق ہو۔ دلاور کے ساتھ اس کے دو آدمی بھی کھڑے تھے۔

بادشاہ نے دلاور کی طرف دیکھا اور دلاور اس کی طرف دیکھ کر مسکرایا اور پوچھا۔ ''مجھے پہچانا......''

''جانتا ہوں۔'' بادشاہ نے بُرا سا منہ بنا کر جواب دیا۔

''دیکھو میرے پاس وقت کم ہے۔ مجھے بس یہ پتا کرنا ہے کہ تم معصوم خان کے گوداموں کے پاس کیا کر رہے تھے۔'' دلاور فوراً اصل بات کی طرف بڑھا۔ ''اور ایک بات میں واضح کردوں کہ اگر تم معصوم خان کے دشمن ہو تو میں بھی اس کا دشمن ہوں اور چاہتا ہوں کہ اس کی کرسی مجھے مل جائے۔ مجھ سے کچھ مت چھپانا اور سب کچھ صاف صاف بتادو اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ تم شام سے..... بھی کل ملے تھے۔''

''یہ شام کون ہے.....؟'' بادشاہ نے وضاحت چاہی۔

''احتشام کو ہم سب شام کہتے ہیں۔'' دلاور نے جلدی سے وضاحت کی۔

''اگر تم بھی معصوم خان جو دراصل معصوم نہیں ہے کہ دشمن ہو تو میں بات صاف بتادیتا ہوں اور اگر تم جھوٹ بول رہے ہو تو میں کچھ نہیں بتاؤں گا۔'' بادشاہ نے کہا۔

''یقین کرو کہ میں معصوم خان کا سب سے بڑا دشمن ہوں اور چاہتا ہوں کہ وہ میرے راستے سے ہٹ جائے اور

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

میں اس کا سارا کام سنبھال لوں۔'' دلاور نے ہاتھ کو ایسے جھٹکا دیا جیسے اس کے ہاتھ میں معصوم خان کی گردن ہو۔

''اگر ایسی بات ہے تو پھر ہاتھ ملاؤ دوست...... ہم معصوم خان جو دراصل معصوم نہیں ہے کو اذیت ناک موت دینا چاہتے ہیں۔'' بادشاہ نے کہہ کر اس کو اغوا کرنے کی ساری داستان اور اس کار کے چوری ہو جانے کا تذکرہ کرتے ہوئے بتایا کہ وہ کار اس گودام میں ہے اور معصوم خان اس کار کی ڈکی میں ہے۔ اور وقت کم ہے اسے ہوش آ گیا تو سارا کام خراب ہو جائے گا۔

یہ سن کر دلاور ایک دم سے پُرجوش ہو گیا۔ ''ابھی میرے ساتھ چلو...... ہم وہ کار ابھی نکالتے ہیں۔'' دلاور ایک دم سے اُٹھا۔ اس کے ساتھ ہی بادشاہ اور لطیف بھی کھڑے ہو گئے۔ وہ پانچوں جانے کے لیے دروازے کی طرف بڑھے۔

وہ کار میں بیٹھے اور اس جگہ پہنچ گئے۔ کار ایک طرف کھڑی کر کے دلاور نے کہا۔ ''میں چوکیدار کے پاس جاتا ہوں۔ معصوم خان کے بعد چوکیدار میری اور شام کی بات مانتا ہے، کیونکہ اس کو یہی حکم ہے۔ میں جا کر وہ کار نکال کر لاتا ہوں۔''

دلاور کہہ کر کار سے باہر نکلا اور گودام والی گلی کی طرف چلا گیا۔ اس نے وہ دروازہ بجایا جس چھوٹے کمرے میں چوکیدار ہوتا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد چوکیدار نے چھوٹی سے کھڑکی سے جھانکا اور دروازہ کھول کر باہر آ گیا۔

''ایک کار آئی تھی۔ سفید رنگ کی۔ وہ جس گودام میں ہے وہ شٹر کھولو میں کار لے جانا چاہتا ہوں۔''

''وہ کار وہی آدمی لے گیا ہے۔ جو لے کر آیا تھا۔'' چوکیدار نے بتایا۔

''وہ لے گیا ہے......؟ کب لے کر گیا ہے؟'' دلاور چونکا۔

''آدھا گھنٹا ہو گیا ہوگا...... یا اس سے بھی زیادہ وقت......'' چوکیدار نے کہا۔

یہ سنتے ہی دلاور نے اور کوئی بات نہیں سنی اور تیزی سے کار کی طرف چل پڑا۔ وہ تیز قدم اُٹھاتا کار کے پاس پہنچا اور اندر بیٹھتے ہی بولا۔

''جلدی چلو وہ آدمی اس کار کو لے جا چکا ہے۔''

''وہی آدمی جو کار لے کر آیا تھا؟'' بادشاہ نے کہا۔

''ہاں......'' دلاور نے سر ہلایا۔

''وہ اکیلا ہی آیا تھا؟''

''میں اکیلے کو کار دے سکتا تھا؟ ساتھ شام تھا۔'' چوکیدار نے بتایا۔

''شام کیا کہہ کر کار لے گیا تھا؟'' دلاور نے پھولی ہوئی سانس کے ساتھ پوچھا۔

''انہوں نے کہا تھا کہ سودا نہیں ہوا، کہیں اور کار بیچے گا۔'' چوکیدار نے حیرت سے اس کی طرف دیکھ کر جواب دیا۔ دلاور پھر تیزی سے چلتا ہوا کار تک پہنچا اور وہ جواب بتا دیا جو اسے چوکیدار نے بتایا تھا۔

''یہ بات شام نے کی تھی کہ اس آدمی نے؟ اگر شام نے کی تھی تو اس کا مطلب ہے کہ کوئی گڑبڑ ہو سکتی ہے۔'' بادشاہ نے اگلا سوال کیا تو دلاور کو ایک بار پھر کار سے نکل کر اسی طرح چلتے ہوئے چوکیدار کے پاس جانا پڑا اور اس نے پوچھا تو چوکیدار نے پہلے تو مزید حیرت سے دلاور کی طرف دیکھا اور پھر یاد کرتے ہوئے جواب دیا۔

''میرا خیال ہے کہ شام نے کہی تھی...... یا پتا نہیں اس آدمی نے کہا تھا؟''

دلاور اسی رفتار سے چلتا ہوا کار کے پاس پہنچ کر اندر بیٹھا تو یکے بعد دیگرے اس طرح چکر لگانے سے اس کی پنڈلیوں کا درد بھی بڑھ گیا اور سانس بھی پھول گئی تھی۔ دو، تین منٹ تک تو اس سے بات ہی نہیں ہوئی اور پھر اس نے چوکیدار والا جواب دے دیا۔

''چوکیدار کو سوچ کر بتانا پڑے گا کہ یہ بات کس نے کی تھی۔'' بادشاہ کو تسلی نہیں ہوئی تھی۔ دلاور ایک دم سے کار سے باہر نکلا اور کچھ قدم چل کر وہ رکا اور پلٹ کر ان کے پاس آ کر اپنے آدمیوں کی طرف آنکھیں نکال کر دیکھتے ہوئے بولا۔

''تم چاہتے ہو کہ میں اسی طرح سفر میں مر جاؤں...... نکلو کار سے اور چوکیدار کے بچے کو اُٹھا لاؤ۔''

''وہ غیر شادی شدہ ہے۔ اس کے بچے کو کہاں سے اُٹھا کر لائیں۔'' دلاور کے ایک آدمی نے اطمینان سے جواب دیا۔

''کم بختو چوکیدار کو اُٹھا لاؤ۔'' دلاور اپنی سیٹ پر بیٹھ کر خود ہی اپنی ٹانگیں دبانے لگا تھا۔ جونہی وہ باہر نکلنے لگے بادشاہ نے روک دیا۔

''اگر اُٹھانا ہے تو شام کو اُٹھا کر لاؤ۔ اس سے پوچھیں گے۔''

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

''جلدی کرو...... اگر معصوم خان جو کہ دراصل معصوم نہیں ہے کو ہوش آ گیا تو بہت مشکل ہو جائے گی۔'' بادشاہ نے تاکید کی اور کار تیزی سے اس جگہ سے نکل گئی۔

☆☆☆

ممکنہ خطرے کے پیشِ نظر وہ سب آدمی اس جگہ سے چلے گئے تھے۔ اب وہ گھر خالی تھا اور اندر صرف احتشام اور عارفہ رہ گئے تھے۔ عارفہ مستقبل کے سہانے خواب دیکھ رہی تھی اور احتشام اپنے کانوں میں خطرے کی گھنٹیاں بجتی محسوس کر رہا تھا۔ اسے ہر آہٹ کے ساتھ لگ رہا تھا کہ جلاد خان آ گیا ہے۔

''تم پریشان کیوں ہو......؟'' اس کا چہرہ دیکھ کر عارفہ نے پوچھا۔

''میں اس آدمی کے ساتھ اس لیے گیا تھا کہ بادشاہ وہاں موجود ہوگا اور کار اس کے حوالے کردوں گا۔ لیکن وہ وہاں نہیں تھا۔ کار وہی آدمی لے گیا۔ اب فکر اس بات کی ہے کہ جلاد خان کو اگر ہوش آ گیا ہوگا تو وہ اس کی گردن مروڑ کر یہاں آ جائے گا اور ہم مارے جائیں گے۔'' احتشام نے اپنا اندیشہ عیاں کیا۔

''ایسا ہوسکتا ہے۔ اب کیا کریں؟'' عارفہ بھی پریشان ہوگئی۔

اسی اثنا میں باہر کار رکی اور اندر سے دلاور اور اس کے آدمی باہر نکلے۔ دلاور کو باہر کوئی ہلچل دکھائی نہیں دی۔ وہ گیٹ کی طرف گیا اور جونہی اس نے ہاتھ لگایا گیٹ کھل گیا۔ اس کی دانست میں اندر لوگ موجود ہوں گے لیکن اندر سناٹا تھا۔

''کدھر گئے سارے۔'' دلاور کے آدمی نے پوچھا تو دلاور چونکا۔ اس نے باہر نکل کر آواز دی۔

''شام......شام......''

احتشام اوپر عارفہ کے پاس بیٹھا تھا۔ دلاور کی آواز سنتے ہی وہ مضطرب ہو کر اُٹھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ پہلے اس نے دائیں جانب قدم بڑھائے اور پھر بائیں طرف بڑھا اور اس کے بعد اس نے پوچھا۔

''یہ تو دلاور ہے......''

''جاؤ جا کر پوچھو کیا بات ہے۔''

''تم ہوشیار رہنا۔ میں سن کے آتا ہوں کہ کیا بات ہے۔'' احتشام نیچے چلا گیا۔ نیچے دلاور اپنے دو آدمیوں کے ساتھ کھڑا تھا۔

''کوئی دکھائی نہیں دے رہا کدھر گئے ہیں سب۔''

''وہ خان جی کا انتظار کرتے کرتے چلے گئے ہیں۔'' احتشام نے بتایا۔

''یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ تم جا کر بادشاہ کو بلا لاؤ۔ اطمینان سے بیٹھ کر سوچتے ہیں کہ کیا کرنا ہے۔'' دلاور نے خوش ہو کر کہا اور اس کا آدمی باہر چلا گیا۔ جبکہ دلاور کے چہرے پر معنی خیز مسکراہٹ تھی اور احتشام اس کی طرف دم بخود دیکھے جا رہا تھا۔

☆☆☆

معصوم خان نے اپنی آنکھیں کھول کر بند کرلیں۔ وہ زمین پر چت لیٹا ہوا تھا اور اس کے کپڑے مٹی میں اٹے ہوئے تھے۔ آسمان پر چاند نہ ہونے کی وجہ سے رات اندھیری تھی۔ معصوم خان کچھ دیر اسی طرح لیٹا رہا۔ اس کا دماغ خالی تھا اور وہ کچھ نہیں سوچ رہا تھا۔ پھر اس نے دوبارہ آنکھیں کھول کر اوپر دیکھا اور نگاہیں دائیں اور پھر بائیں گھمائیں۔ ایک دم سے اس کے دماغ میں سوال ابھرا کہ وہ کہاں ہے؟

اس سوال کے آتے ہی وہ جلدی سے اُٹھ بیٹھا۔ اس کی آنکھیں پوری طرح سے کھل چکی تھیں۔ اس نے دائیں بائیں اور اوپر دیکھا۔ معصوم خان کو یاد آیا کہ وہ اپنے کمرے میں بیٹھا کھانا کھا رہا تھا۔ اور پھر اس کے ساتھ کیا ہوا تھا، اسے بالکل بھی یاد نہیں تھا۔

معصوم خان کھڑا ہو گیا اور اس نے دیکھا کہ وہ ایک ویران جگہ کھڑا ہے۔

''مجھے یہاں کون لایا ہے؟'' معصوم خان نے اپنے آپ سے پوچھا۔ اس سوال کا بھی جواب اس کے پاس نہیں تھا۔ معصوم خان نے سوچا کہ وہ کس طرف جائے۔ پھر وہ ایک طرف چلنے لگا۔ وہ چلتے چلتے بھاگنے لگا۔ اسے سمت کا بالکل علم نہیں تھا بس چلنا شروع کردیا تھا۔ وہ کچے راستے پر بھاگتا ہوا درختوں کے جھنڈ میں گم ہو گیا۔ اندھیرا بہت تھا۔ کچھ سجھائی نہیں دیتا تھا۔ وہ کئی بار گرا بھی اور کسی درخت سے بھی ٹکرایا لیکن وہ بھاگتا رہا اور ایک دم سے درختوں سے باہر نکل آیا۔ سامنے ایک سڑک تھی اور سڑک کے پار دور اسے آبادی کی روشنیاں دکھائی دینے لگی تھیں۔

معصوم خان اس طرف دوڑنے لگا۔ وہ بھاگتے ہوئے آبادی میں داخل ہو گیا تھا۔ کچھ دور اسے بازار دکھائی دیا۔ اب اسے سمجھ آ گیا تھا کہ کیا کرنا ہے۔

معصوم خان نے جیب میں ہاتھ ڈالا تو اس کا پرس موجود تھا۔ پرس دوبارہ جیب میں رکھ کر اس نے ٹیکسی کی طرف

Downloaded From Paksociety.com

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

اشارہ کیا ہی تھا کہ اس نے سوچا کہ اس کے خلاف کوئی سازش ہوئی تھی۔ وہ کھانا کھاتے ہوئے اچانک بے ہوش ہو گیا تھا اور پھر وہ اس ویرانے میں تھا۔

☆☆☆

معصوم خان کے مخصوص کمرے میں اس وقت وہ چاروں موجود تھے۔ دلاور، بادشاہ، لطیف اور احتشام...... دلاور کی نظر بار بار معصوم خان کی کرسی کی طرف جا رہی تھی لیکن ابھی اس کی اس پر بیٹھنے کی جرأت نہیں ہوئی تھی۔

''شہر میں ایک ہی سب سے بڑی چور مارکیٹ ہے جہاں کاریں بکتی ہیں۔ میرا خیال ہے کہ ہمیں اس جگہ جانا چاہیے۔'' دلاور نے کہا۔

بادشاہ نے اپنی گھڑی پر وقت دیکھا۔ ''مجھے لگتا ہے کہ دیر ہوگئی ہے۔''

''ابھی رات کے سوا بارہ بجے ہیں۔ اتنی دیر نہیں ہوئی ہے۔'' دلاور نے کہا۔

''بے ہوشی کی دوا کا اثر زیادہ سے زیادہ چار گھنٹے رہ سکتا تھا۔ میرا خیال ہے کہ معصوم خان جو دراصل معصوم نہیں ہے کو ہوش آگیا ہوگا۔'' بادشاہ نے کہا تو احتشام کے لیے تھوک نگلنا مشکل ہوگیا۔ اسے لگا جیسے معصوم خان کے مضبوط ہاتھوں نے اس کی گردن دبوچ لی ہو۔

اس کی بات سن کر دلاور کے چہرے پر رقص کرتی مسکراہٹ بھی معدوم ہوگئی۔

''اگر وہ ہوش میں آگیا تو کیا کرے گا؟'' دلاور نے پوچھا۔

''میرا خیال ہے کہ وہ سیدھا یہاں آئے گا۔'' بادشاہ اُٹھ کر ٹہلنے لگا۔ وہ بھی مضطرب ہوگیا تھا۔

کمرے میں خاموشی ہوگئی تھی۔ معصوم خان کی دہشت اور خوف سب پر طاری تھا۔

بادشاہ پھر بولا۔ ''ویسے بھی ہم اسے تلاش نہیں کر سکتے۔ کہاں تلاش کریں گے؟ ہمیں کیا پتا کہ وہ اسے کہاں لے گیا ہے۔ اس لیے میں نے سوچا کہ میں اور لطیف یہاں سے چلے جائیں اور معصوم خان کو اغوا کرنے کا کوئی نیا پلان بنائیں اب ہمیں اجازت دو۔''

''تم کہیں نہیں جاؤ گے بلکہ میرے ساتھ ابھی پلاننگ کرو گے۔ اگر معصوم خان آ بھی گیا تو ہم اسے دوبارہ بے ہوش کر کے اغوا کریں گے اور تم اسے لے جانا اور اس کی ٹانگیں توڑ دینا۔'' دلاور کو بے چینی تھی کہ وہ کسی طرح سے معصوم خان کو غائب کرا کے خود اس کی کرسی پر براجمان ہو

جائے۔

''اب اسے اغوا کرنا آسان نہیں ہے۔ ہم نے ایک ہفتہ فقیر بن کر اس پارک کے اردگرد چکر لگا کر بھیک مانگی ہے، پوری پلاننگ کی تھی اور اس پلاننگ میں معصوم خان جو دراصل معصوم ہے نہیں، کو آسانی سے اسی مانگنے والی ریڑھی پر لاد کر اغوا کر کے لے گئے تھے۔ کم بخت وہ کار چور پتا نہیں کہاں سے آگیا تھا۔ عین وقت پر کار چوری کر کے لے گیا۔''

اسی وقت دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی۔ اس کا مطلب تھا کہ عارفہ دستک دے کر احتشام کو بلا رہی ہے۔ احتشام کمرے سے باہر گیا تو عارفہ کھڑی تھی۔ وہ اسے ایک طرف لے گئی اور سرگوشی کے انداز میں بولی۔

''ابھی جلاد خان کا فون آیا تھا۔''

''کیا کہہ رہی ہو؟'' یہ سنتے ہی احتشام کو جیسے کرنٹ لگ گیا۔

''اس نے پہلے پوچھا کہ اس وقت نیچے لوگ موجود ہیں۔ میں نے جواب دیا کہ سب لوگ موجود ہیں۔ تب اس نے کہا کہ تم چپکے سے بغیر کسی کو بتائے احتشام کو گاڑی دے کر بھیجو......'' اس کے بعد عارفہ نے اس جگہ کا نام بتایا جہاں معصوم خان کھڑا تھا۔

''اب کیا کریں۔ وہ تو ہمارا کچومر نکال دے گا۔ ہماری کبھی شادی نہیں ہو سکے گی۔ ہم اسی طرح کنوارے مر جائیں گے۔'' احتشام کے جسم میں اضطراب بجلی کی صورت بھاگ رہا تھا۔

''تم ہمت مت ہارو اور ان کو اپنے ساتھ ملاؤ اور جلاد خان کو دوبارہ اغوا کراؤ۔'' عارفہ نے ہمت بندھائی۔ ''اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں ہے ورنہ پھر ہمارا بچنا مشکل ہوگا۔''

احتشام سوچنے لگا۔ عارفہ صحیح کہہ رہی تھی کہ اگر وہ واپس آگیا تو دونوں کا بچنا مشکل ہو جائے گا۔

عارفہ نے کچھ سوچنے کے بعد کہا۔ ''ایک بات میرے دماغ میں آئی ہے۔''

''وہ کیا؟''

عارفہ نے اس کے کان میں کچھ کہنا شروع کیا اور جیسے جیسے وہ عارفہ کی بات سن رہا تھا، اس کی آنکھیں حیرت سے پھیلتی جا رہی تھیں۔

''ہاں یہ تو زبردست ہے۔'' عارفہ کے چپ ہوتے ہی وہ بولا۔ ''لیکن وہ سامان کہاں سے آئے گا؟''

''اس سے تو زیادہ گھر میں موجود ہوتا ہے۔ ابھی آتی

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

ہوں۔'' عارفہ کہہ کر اوپر چلی گئی۔ جب واپس آئی تو اس کے ہاتھ میں ایک بیگ تھا۔ عارفہ نے بیگ ایک طرف رکھ کر کہا۔ ''تم اندر جا کر ان سے بات کرو اور پھر جاتے ہوئے یہ بیگ لے جانا۔''

''ٹھیک ہے۔'' احتشام نے کہا۔

''ایک بات اور سنو' مجھے اپنا وہ موبائل فون نمبر دو جو تمہیں بادشاہ نے دیا تھا۔'' عارفہ نے کہا۔

احتشام نے اسے وہ نمبر لکھوا دیا تو عارفہ نے کہا۔ ''جب تم دیکھو کہ کام ہو گیا ہے اور وہ سب ایک جگہ بیٹھ گئے ہیں اور تم دائیں بائیں ہو گئے ہو تو تم مجھے گھر کے فون نمبر پر ایک مس کال دو گے۔ تمہارا نمبر فون کی اسکرین پر آجائے گا۔ اور اس کے بعد میری کال چلی جائے گی، یاد رکھنا کہ تمہاری مس کال کے بعد تم اپنا بچاؤ کر رکھنا۔''

''ایسا ہی ہوگا۔'' احتشام نے کہا۔

چنانچہ اس نے سب کچھ تیزی سے سوچا اور واپس کمرے میں چلا گیا جبکہ عارفہ دروازے کے ساتھ کان لگا کر کھڑی ہو گئی۔

اندر جا کر احتشام نے سب کی طرف باری باری دیکھا اور پوچھا۔ ''فرض کریں اگر معصوم خان واپس آ گیا تو کیا ہوگا؟''

''ہم دونوں تو جا رہے ہیں۔ تم ہی پھنسو گے۔'' بادشاہ نے اطمینان سے کہا۔

''میں کیسے پھنسوں گا؟'' احتشام نے جاننا چاہا۔

''کیونکہ وہ کھانا کھاتے ہوئے بے ہوش ہوا تھا۔ اتنا تو اسے بھی یاد آجائے گا۔ وہ اسی جگہ سے تحقیق شروع کرے گا اور حقیقت جاننے کے لیے تجھے الٹا بھی لٹکا دے گا۔'' بادشاہ نے وضاحت کی۔

''میرا کیا ہے میں تو اس کے سامنے کھلا ہی نہیں ہوں۔ جو کچھ بھی میں کر رہا ہوں' خفیہ اور چپ چاپ کر رہا ہوں۔ میں تو صاف بچ جاؤں گا۔'' دلاور بولا۔

احتشام نے ایک بار پھر ان تینوں کی طرف دیکھا اور کہا۔ ''ہم معصوم خان کو دوبارہ اغوا کر سکتے ہیں۔ اور ہمارے پاس چانس ہے۔''

''وہ کیسے؟'' بادشاہ اور دلاور نے ایک ساتھ پوچھا۔

''وہ توپ چوک پر کھڑا ہے۔ اس نے ابھی فون کیا ہے کہ میں اسے آ کر لے جاؤں۔''

''کیا واقعی...؟'' دونوں حیرت سے اچھلے۔

''میں اس کی کار نکال کر اسے لینے جاتا ہوں۔ تم تینوں ایک کار میں میرے پیچھے آؤ گے۔ جب میں معصوم خان کو توپ چوک سے لوں گا تو آگے ایک ویران سڑک آتی ہے۔ میں بہانے سے کار کھڑی کر دوں گا اور بادشاہ تم جلدی سے آ کر اس کی کنپٹی پر پستول رکھ دو۔ میں جلدی سے اسے باندھ دوں گا اور معصوم خان یہاں پہنچنے سے پہلے تمہارے باس کے پاس ہوگا۔''

''زبردست آئیڈیا ہے۔ اس طرح ہم پھر اسے اغوا کر سکتے ہیں۔'' دلاور خوش ہو گیا۔

بادشاہ اور لطیف بھی رضامند ہو گئے۔ بادشاہ نے باس کو فون کر کے پہلے ساری تفصیل بتائی اور ابھی تک نہ پہنچنے کی وجہ بتانے کے بعد کہا کہ وہ پھر سے اسے اغوا کرنے جا رہے ہیں۔

اس کے بعد احتشام نے معصوم خان کی کار نکالنے سے پہلے اس کی ڈکی میں وہ بیگ رکھا اور پھر کار نکال کر توپ چوک کی طرف چل دیا جبکہ وہ تینوں ایک کار میں بیٹھ گئے تھے اور کار احتشام کی کار کے پیچھے چل رہی تھی۔

☆☆☆

معصوم خان توپ چوک کے ایک طرف کھڑا تھا۔ جونہی اسے اپنی کار دکھائی دی، وہ جلدی سے کار کی طرف بھاگا۔ احتشام نے باہر نکل کر جلدی سے سلام کیا اور اس کے سلام کا جواب دیے بغیر معصوم خان ڈرائیونگ سیٹ کے ساتھ والی سیٹ پر براجمان ہوتے ہی تحکمانہ لہجے میں بولا۔

''جلدی سے کار یہاں سے نکالو۔''

احتشام کار کچھ آگے لے گیا تو معصوم خان نے حکم دیا کہ کار ایک طرف روک دو۔ اس جگہ رش نہیں تھا۔ احتشام نے بیک مرر سے دیکھا کہ دلاور کی کار ان سے پیچھے رش والی جگہ پر رک گئی تھی۔

''پہلے مجھے یہ بتاؤ کہ اس وقت گھر میں کون کون موجود ہے۔'' معصوم خان نے پوچھا۔

''آپ کے سارے آدمی موجود ہیں اور آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔'' احتشام نے جھوٹ بولا مگر اعتماد سے۔

''تم نے کیا بتایا کہ میں کہاں گیا ہوں؟''

''میں نے ان کو یہی بتایا ہے کہ وہ بغیر بتائے کہیں گئے ہیں۔'' احتشام نے جواب دیا۔

''مجھے یاد ہے کہ میں کھانا کھا رہا تھا پھر اچانک مجھے کیا ہو گیا تھا؟'' معصوم خان نے اپنی سرخ آنکھوں سے احتشام کی طرف دیکھا۔

''عارفہ جب برتن اٹھانے گئی تھی تو آپ بستر پر گرے ہوئے تھے۔'' احتشام نے کہا۔

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

"اور جب مجھے ہوش آیا تو میں ویرانے میں پڑا ہوا تھا۔" معصوم خان نے اسے گھورا بھی اور غصے سے بھی کہا کہ احتشام کانپ گیا۔

"ہم آپ کو اسپتال لے گئے تھے۔ میں دوائی لینے گیا تو آپ بستر سے غائب تھے۔" احتشام نے کہانی سنائی۔

اس کی بات سن کر معصوم خان سوچ میں پڑ گیا۔ "اس کا مطلب ہے کہ مجھے اسپتال سے اغوا کیا گیا ہے۔"

"میرا بھی یہی خیال ہے۔"

اچانک معصوم خان کو محسوس ہوا کہ اس کی کنپٹی کے ساتھ کوئی سخت چیز آ کر لگی ہے۔ اس نے اپنے بائیں جانب دیکھا تو وہ چونک گیا۔ اس طرف بادشاہ کھڑا مسکرا رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں پستول تھا اور اس کی نال اس نے معصوم خان کی کنپٹی کے ساتھ لگائی ہوئی تھی۔

"مجھے پہچانا......" بادشاہ نے کہا۔

"میں چوہوں کو بھولتا نہیں ہوں۔" معصوم خان بولا۔

"میں چوہا نہیں، بادشاہ ہوں۔ چوہے تو تم بنو گے جب میں تمہاری ٹانگ توڑوں گا اور اپاہج کر کے چوک میں بٹھا دوں گا۔" بادشاہ نے غصے سے کہا۔

"تمہاری یہ حسرت، حسرت ہی رہے گی۔" یہ کہتے ہی تیزی سے معصوم خان نے اپنی طرف کا شیشہ چڑھا دیا اور ایک ہاتھ سے اس کا پستول پکڑ لیا۔ اب بادشاہ کا بازو چڑھے ہوئے شیشے کی زد میں تھا اور وہ بازو معصوم خان نے پکڑا ہوا تھا۔

"چھوڑ دو مجھے، میں کہتا ہوں۔" بادشاہ خوفزدہ ہو کر بولا۔

"پہلے تمہارے باس کی ٹانگ توڑی تھی اور اب تیرا بازو توڑوں گا۔" معصوم خان کا غصہ قہر برسا رہا تھا اور احتشام بھیگی بلی کی طرح بیٹھا دیکھ رہا تھا۔

"گاڑی چلاؤ شام......" معصوم خان نے حکم دیا۔

احتشام کے تو ہاتھ پیر پھولے ہوئے تھے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ گاڑی اسٹارٹ کہاں سے کرنی ہے۔ وہ اپنے دائیں بائیں اور پیروں کی طرف یوں دیکھ رہا تھا جیسے اس کی کوئی چیز گم ہو گئی ہو۔

"گاڑی مت چلانا احتشام...... اگر یہ بچ گیا تو تم بھی پھنس جاؤ گے اور کبھی اس کی بہن سے شادی نہیں کر سکو گے۔" بادشاہ نے جلدی سے کہا۔

اس کی بات سن کر احتشام کے ہاتھوں کے تو طوطے اڑے ہی اڑے...... معصوم خان نے قہر آلود نظروں سے احتشام کی طرف دیکھا۔

مظلوم عاشق

انگریز برصغیر میں کیوں آئے؟
وہ جانتے تھے کہ یہاں کے لوگ حکومت کے قابل نہیں۔
مگر فرانسیسی کیوں آئے؟
وہ جانتے تھے کہ یہاں انگریز حکومت کے لائق نہیں۔

☆☆☆

مشہور دانشور اور ماہر نفسیات فرائڈ سے کسی نے پوچھا۔ "دنیا کی کتنی عورتیں شادی کرنے کی خواہشمند ہوتی ہیں؟"

فرائڈ نے جواب دیا۔ "99 فیصد۔"

پوچھنے والے نے دوسرا سوال کیا۔ "اور ایک فیصد کے بارے میں آپ کی رائے کیا ہے؟"

فرائڈ نے مسکرا کر جواب دیا۔ "وہ جھوٹ بولتی ہیں۔"

کوئٹہ سے عارش کا تعاون

"یہ کیا کہہ رہا ہے......؟"

"بکواس کرتا ہے۔ پتا نہیں کیا کہہ رہا ہے۔" احتشام کے منہ سے الفاظ نہیں نکل رہے تھے۔

"تم نے یہ کیا بکواس کی ہے۔" معصوم خان نے اس بار بادشاہ کی طرف دیکھا اور معصوم خان کو جواب ملنے سے پہلے محسوس ہوا کہ اس کے سر پر کوئی سخت چیز لگی ہے۔ اس سے پہلے کہ وہ گردن گھما کر اپنے پیچھے دیکھتا ایک بار پھر وہی سخت چیز اس کے سر پر لگی۔ اس کے بعد یکے بعد دیگرے اس کے سر پر ہتھوڑے کی طرح کوئی چیز لگنے لگی اور اسے اپنی آنکھوں کے آگے اندھیرا سا چھاتا محسوس ہونے لگا۔ پھر بھی معصوم خان کی کوشش تھی کہ وہ ایک بار اس کا دیدار ضرور کر لے جو اس کے سر پر کوئی چیز مار رہا تھا۔

سخت جان معصوم خان نے اپنی گردن گھما ہی لی۔ کار کی پچھلی سیٹ پر دلاور بیٹھا ہوا تھا اور اس کے ہاتھ میں پستول تھا جس کا بٹ وہ اس کے سر پر مار رہا تھا۔

دراصل جب دلاور نے دیکھا کہ بادشاہ پستول اس کی کنپٹی پر لگائے کھڑا ہے تو وہ بھی کار کے پاس آ گیا۔ اور جب اس نے یہ منظر دیکھا کہ بادشاہ پھنسا ہوا ہے تو وہ کار کی پچھلی سیٹ پر بیٹھا اور اس کے سر پر پستول کا بٹ مارنے لگا۔

"غدار......" معصوم خان نے کہا اور بے ہوش ہو گیا۔

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

''بڑا ڈھیٹ تھا، بے ہوش ہونے سے پہلے اس نے مجھے تھکا دیا۔'' دلاور نے اپنا بازو دباتے ہوئے کہا۔

''ابے شیشہ تو نیچے کرو۔'' بادشاہ چلایا۔

احتشام نے شیشہ نیچے کیا تو بادشاہ کی خلاصی ہوئی۔ اور وہ بھی پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ اس نے معصوم خان کے ہاتھ میں پکڑا اپنا پستول لے کر اپنے کوٹ کی جیب میں رکھ لیا۔

''بڑا سخت جان ہے۔'' بادشاہ بولا۔

''اب کیا کرنا ہے؟'' احتشام نے پوچھا۔

''گاڑی چلا اور سیدھا باس کے پاس لے چلو۔'' بادشاہ نے احتشام سے کہا۔

''پہلے اسے باندھ لو...... کمبخت ہوش میں آ گیا تو ہمارے ہوش اُڑا دے گا۔'' دلاور نے کہا۔

''رسی ہے شام؟'' بادشاہ نے پوچھا۔

''نہیں۔'' احتشام نے جواب دیا۔

''تمہارے پاس ہے۔'' بادشاہ نے دلاور سے پوچھا۔

''رسی رکھنا تمہارا کام تھا۔ اسے اغوا تم کر رہے ہو۔'' دلاور بولا۔

''میں ابھی رسی لے کر آتا ہوں۔ یہاں کوئی دکان ہے جہاں سے رسی خرید سکوں۔'' بادشاہ نے احتشام سے پوچھا۔

''تم اسے اغوا کرنے آئے تھے کہ دنبہ خریدنے آئے ہو کہ دنبہ ملے گا تو اس کے گلے میں ڈالنے کے لیے رسی وہاں سے لے لیں گے۔'' دلاور نے تمسخرانہ لہجہ اپنایا۔

''یہ وقت ایسی باتوں کا نہیں ہے۔ اسے ہوش آ گیا تو اغوا کرنے کا تیسرا چانس نہیں ملے گا۔''

''تم لوگ اسے کار سے باہر نکالو اور پچھلی سیٹ پر لٹا کر اس کے اوپر بیٹھ جاؤ تاکہ یہ حرکت نہ کر سکے۔'' احتشام نے تجویز پیش کی۔

''یہ بھی ٹھیک ہے۔''

انہوں نے موقع دیکھ کر معصوم خان کو باہر نکالا۔ وہ اتنا بھاری تھا کہ تینوں سے اٹھایا نہیں جا رہا تھا۔ اور چند لمحے کے لیے سانس لینے کے لیے انہیں معصوم خان کو زمین پر لٹانا پڑا اور عین اس وقت دن ون ٹو ٹو کی خالی گاڑی ایک مریض کو اسپتال چھوڑ کر اپنے آفس کی طرف جا رہی تھی کہ اچانک انہوں نے دیکھا کہ زمین پر ایک آدمی لیٹا ہوا ہے اور اس کے پاس آدمی کھڑے ہیں۔ انہوں نے جلدی سے ان کے قریب جا کر بریک لگائے اور ابتدائی طبی امداد کا سامان لے کر دو نوجوان باہر نکلے۔

''کیا ہوا ہے؟'' ایک نے پوچھا۔

جونہی ان سب نے ان کو دیکھا، وہ حیرت سے دم بخود دیکھتے ہی رہ گئے۔

''کیا ہوا ہے؟'' اس نے پھر پوچھا۔

''ہم تو راہ گیر ہیں۔ یہ ان کے ساتھ کار میں تھا۔ ان کو پتا ہوگا۔'' بادشاہ نے جلدی سے کہتے ہوئے احتشام کی طرف اشارہ کر دیا۔ احتشام کی یہ سنتے ہی جان نکل گئی۔

''بتاؤ بتاؤ بیٹا کیا ہوا ہے انہیں۔'' دلاور نے بھی احتشام سے پوچھا۔

''اچانک بے ہوش ہو گئے ہیں۔'' احتشام کو بتانا پڑا۔

وہ طبی امداد دینے لگے...... بادشاہ اس جگہ سے کھسکنے کا سوچنے لگا۔ دلاور بھی جانے کے لیے پر تول چکا تھا۔ احتشام پھنسا کھڑا تھا اور ان کو گھورتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ دونوں بہت چالاک ہیں۔ اب انہیں یقین تھا کہ وہ لوگ اسے ہوش میں لے آئیں گے۔ ان کے پاس اب بھاگنے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے تو انہوں نے بڑی ہوشیاری سے احتشام کو آگے کر دیا تھا۔

''انہیں اسپتال لے جانا پڑے گا۔'' ایک نے کہا اور دوسرا نوجوان جلدی سے گاڑی کے اندر سے اسٹریچر لے آیا۔ انہوں نے معصوم خان کو اسٹریچر پر ڈالا اور ایک بار پھر پوچھا۔

''یہ اچانک کیسے بے ہوش ہوئے ہیں؟''

''ہم کار میں جا رہے تھے انہوں نے ہماری کار روکی اور لوٹنے کی کوشش کی اور ان کے سر پر پستول کے بٹ مارے اور یہ بے ہوش ہو گئے۔ آپ دیکھ لیں ان کا سر زخمی ہے۔'' احتشام نے بھی ان کی پھینکی ہوئی گیند کو ان کی طرف اچھال دیا کہ وہ دونوں ایک دم سے چونکے۔ انہیں ایسی امید نہیں تھی۔

''یہ کیا جھوٹ بول رہے ہو۔'' دلاور نے گھبرائی ہوئی آواز میں کہا۔

''ان کے پاس اسلحہ بھی ہے۔'' احتشام بولا۔ ''ان کی تلاشی لے لیں۔''

وہاں راہ گیر بھی جمع ہو چکے تھے۔ یہ سنتے ہی ان سب نے دلاور اور بادشاہ کو قابو کر لیا۔ دونوں کے پاس اسلحہ بھی موجود تھا۔ لطیف اور دلاور کے دونوں ساتھی کسی وقت اور کس طرف رفو چکر ہو گئے، کسی کو کیا دلاور اور بادشاہ کو بھی علم نہیں ہو سکا تھا۔ اسی وقت پولیس کو فون کر دیا گیا۔ اور احتشام نے اس رش میں وہ بیگ جو اس نے ڈکی میں رکھا تھا وہ نکال کر کار کے ساتھ ہی رکھ دیا۔ جبکہ بادشاہ اور دلاور

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

لوگوں کی مضبوط گرفت میں مچھلی کی طرح تڑپ رہے تھے۔

''ہم انہیں اسپتال لے کر جا رہے ہیں۔ آپ کو بھی ساتھ چلنا ہوگا۔'' اس نوجوان نے کہا اور اسٹریچر اٹھا کر اپنی گاڑی میں رکھ دیا۔ وہاں دو ذمے دار لوگ موجود تھے۔ احتشام نے وہ بیگ ان کے حوالے کر کے کہا۔

''یہ بیگ بھی اِن کا ہے۔''

''ہمارا ہے......؟'' بادشاہ اور دلاور کے منہ سے حیران کن آوازیں نکلیں۔

''آپ بے فکر ہو جائیں۔ ہم انہیں پولیس کے حوالے کر دیں گے۔'' ایک ذمے دار آدمی بولا۔

''یہ بیگ تمہارا ہے۔'' بادشاہ نے دلاور سے سوال کیا۔

''میں تو اسے دیکھ پہلی بار رہا ہوں۔'' دلاور جلے لہجے میں بولا۔

''یہ شام کا بچہ تو ہم سے بھی ہوشیار نکلا۔ ہمیں پھنسا گیا ہے۔ ہم تو چپ چاپ گرفتار ہو گئے ہیں۔'' بادشاہ کی شکل سے لگ رہا تھا کہ وہ ابھی رو دے گا۔ احتشام نے اپنی کار ریسکیو کی گاڑی کے پیچھے لگا دی تھی۔ جبکہ دلاور اور بادشاہ کو ان لوگوں نے اچھی طرح سے قابو کیا ہوا تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد پولیس بھی آ گئی اور دونوں کو اپنی تحویل میں لے کر جب اس بیگ کو کھولا تو اس بیگ کے اندر پانچ کلو ہیروئن تھی۔ اس انکشاف نے تو بادشاہ اور دلاور کو حیرت کی بلندی پر پہنچا دیا تھا کہ وہ اتنی زیادہ مقدار میں ہیروئن کا بیگ اپنے ساتھ لیے گھوم رہے تھے۔ دونوں کی شکل دیکھنے کے لائق تھی۔ بالکل ایسی جیسی قصائی کی چھری کے سامنے معصوم بکرے کھڑے ہوتے ہیں۔

☆☆☆

معصوم خان ایمرجنسی وارڈ کے بیڈ پر چت لیٹا ہوا تھا۔ اس کے بازو میں ڈرپ لگی ہوئی تھی اور سر کو بھی پٹیوں میں لپیٹا ہوا تھا۔ ڈاکٹر نے بتایا تھا کہ اس کے سر پر بہت چوٹیں آئی ہیں۔

معصوم خان کو ابھی ہوش نہیں آیا تھا۔ جونہی احتشام کو موقع ملا اس نے عارفہ کو فون کیا اور ساری تفصیل بتا دی۔

عارفہ سننے کے بعد بولی۔ ''ہمارا پلان تو یہ تھا کہ جیسے ہی وہ سب جلاد خان کی کار میں بیٹھتے اور تم مجھے مس کال کرتے میں پولیس کو یہ اطلاع دے دیتی کہ اس نمبر کی کار میں ہیروئن ہے اور وہ سب پکڑے جاتے اور لمبے اندر چلے جاتے۔ تم نے حاضر دماغی کا مظاہرہ کیا اور اس بیگ کو آخر کار ان کے سر پر رکھ ہی دیا اور شکر ہے کہ وہ تو لمبے اندر چلے گئے ہیں۔ اب مسئلہ ہے جلاد خان کا......''

''جلاد خان کو اگر ہوش آ گیا تو ہم کبھی ایک نہیں ہو سکیں گے۔'' احتشام نے کہا۔

''اب کیا کریں؟'' عارفہ کی بھی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

''میں تو کہتا ہوں کہ جلاد خان ابھی ہوش میں نہیں ہے۔ میں اسے چھوڑ کر تمہارے پاس آتا ہوں اور ہم بھاگ جاتے ہیں۔'' احتشام نے کہا۔

''میرا خیال ہے کہ اس کے سوا ہمارے پاس کوئی دوسرا راستہ نہیں ہے۔ پتا نہیں کب جلاد خان مرے گا اور کب ہماری زندگی میں اس کی وجہ سے برپا ہلچل ختم ہوگی۔'' عارفہ کو غصہ بھی آنے لگا تھا۔

''مجھے تو یہ سمجھ نہیں آتی کہ ہم سوچتے کچھ ہیں اور ہوتا کچھ ہے۔'' احتشام بے چینی سے ایک طرف ٹہل بھی رہا تھا۔

''میں سامان پیک کرتی ہوں تم آ جاؤ تاکہ ہم یہ شہر چھوڑ کر کہیں اور چلے جائیں اور شادی کر لیں۔''

''تمہارے پاس کوئی کیش ہے۔''

''کیش تمہارے پاس ہی ہے جو بل نہ جمع کرانے کی وجہ سے رکھا ہوا ہے۔ ہاں گھر میں ڈھائی کلو چرس پڑی ہے وہ لے جائیں ساتھ۔'' عارفہ نے بتاتے ہوئے پوچھا۔

''خدا کے لیے ایسی غلطی نہ کرنا۔ راستے میں پکڑے گئے تو لمبے اندر جائیں گے اور بوڑھے ہو کر باہر نکلیں گے۔ ہم وہی کیش لے کر چلے جاتے ہیں۔ تم تیار ہو جاؤ، میں ابھی نکل رہا ہوں۔'' احتشام نے فون بند کیا اور ابھی جانے ہی والا تھا کہ عقب سے نرس نے آواز دی۔

''سنیں......''

احتشام نے فوراً گھوم کر نرس کی طرف دیکھا اور بادلِ ناخواستہ اس کے پاس چلا گیا۔ ''جی فرمایئے......''

''میں پہلے بھی کہہ چکی ہوں کہ اپنا مریض یوں چھوڑ کر مت جائیں۔ اب آپ ان کے بیڈ کے پاس سے دو انچ بھی کہیں نہیں جائیں گے۔ اسی طرح ایک حادثے کے مریض کو اسے لانے والا چھوڑ کر چلا گیا تھا تب سے بہت سختی کی ہوئی ہے۔'' نرس نے رعب سے کہا اور مجبوراً احتشام کو معصوم خان کے پاس جانا پڑا۔

وہ مسلسل تین گھنٹے...... معصوم خان کے پاس بیٹھا رہا۔ اس دوران عارفہ کا فون آیا تو اس نے اپنی مجبوری بتائی۔ اور یہ بھی بتایا کہ ایمرجنسی وارڈ کا دروازہ اندر سے بند کیا ہوا ہے اور چوکیدار مستعد کھڑا ہے۔

مزید ایک گھنٹے کے بعد معصوم خان کو ہوش آنا شروع

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

ہوگیا۔ مریض کو ہوش میں آتا دیکھ کر اس کے لواحقین خوش ہوتے ہیں مگر احتشام کی جان پر بن گئی تھی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کسی طرح سے معصوم خان بے ہوش ہو جائے۔

ڈاکٹر بھی اس وقت مریض دیکھ رہا تھا۔ جب وہ اس کے بیڈ کے پاس آیا اور معصوم خان کو ہوش میں آتا دیکھا تو اس نے فوراً احتشام کو سرزنش کی۔

''آپ نے مجھے نہیں بتایا...... آپ کو فوراً بتانا چاہیے تھا......''

''میں بتانے ہی والا تھا۔'' احتشام نے معصومیت سے کہا۔

ڈاکٹر چیک کرنے لگا اور پھر بولا۔ ''مریض اب ٹھیک ہے...... صبح تک اسے بالکل ٹھیک ہوش آجائے گا۔''

ڈاکٹر کہہ کر چلا گیا اور احتشام اسی جگہ بیٹھ گیا۔ معصوم خان کو ہوش آگیا تھا لیکن وہ چپ چھت کو دیکھ رہا تھا اور احتشام کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ اس جگہ سے سرنگ کھود کر کہیں غائب ہو جاتا۔

☆☆☆

صبح ہوگئی تھی۔

احتشام کے انتظار میں عارفہ دروازے کے ساتھ لگ کر ہی سوگئی تھی۔ صبح کے اجالے کے ساتھ وہ اُٹھی اور بیگ کھینچ کر اندر لے گئی۔ وہ سوچنے لگی کہ ان کی قسمت میں ملنا نہیں ہے۔ کیونکہ احتشام کی آخری فون کال سے اسے پتا چل گیا تھا کہ معصوم خان کو ہوش آگیا ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی ساری امیدیں دم توڑ گئی تھیں۔

دن کے گیارہ بجے تھے جب احتشام، معصوم خان کو لے کر گھر پہنچ گیا تھا۔ معصوم خان کو بستر پر لٹا دیا تھا۔ اس کا سر پٹیوں سے باندھا ہوا تھا اور وہ بالکل چپ تھا۔

معصوم خان کو بستر پر لٹا کر احتشام چپ چاپ ایک طرف بیٹھ گیا۔ ڈاکٹر نے کہا تھا کہ کچھ دواؤں کا اثر ہے، سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔

معصوم خان چپ بیٹھا کبھی دائیں اور کبھی بائیں دیکھ رہا تھا۔ احتشام کو لگ رہا تھا کہ جلاد خان کے حواس کام کر رہے ہیں اور ہوش میں آتے ہی وہ اس کی گردن دبوچ لے گا۔

احتشام چپکے سے اُٹھا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔ باہر عارفہ بیگ تیار کیے کھڑی تھی۔ اسے دیکھتی ہی بولی۔

''شکر ہے کہ تم آگئے۔ اس سے پہلے کہ جلاد خان مکمل ہوش میں آئے، بھاگ چلو۔''

''میں پیسے لے کر آتا ہوں۔'' احتشام نے کہا اور باتھ روم میں جاکر اس جگہ سے پیسے نکال لایا جہاں اس نے چھپائے تھے۔ ابھی احتشام نے بیگ پکڑا ہی تھا کہ کمرے کے اندر سے معصوم خان کی چیخ سنائی دی اور اس کے ساتھ ہی ایک دھماکے سے دروازہ کھلا اور معصوم خان پھولی سانس اور خوف میں مبتلا، احتشام کے پیچھے ایسے چھپ کر کھڑا ہو گیا جیسے کوئی بچہ کسی چیز سے ڈر کر کھڑا ہوتا ہے۔

احتشام اور عارفہ اس کی طرف حیرت سے دیکھے جارہے تھے۔

''کیا ہوا......؟'' عارفہ نے پوچھ ہی لیا۔

معصوم خان سے بولنا مشکل ہو رہا تھا۔ سانس پھولی ہوئی تھی اور دل کی دھڑکن بھی تیز تھی۔ وہ بمشکل بولا۔

''اندر...... چھپکلی ہے......''

معصوم خان کی بات سن کر دونوں کو حیرت کا جھٹکا لگا اور وہ ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ معصوم خان نے وہی کچھ کہا ہے جو انہوں نے سنا ہے یا وہ ان سے سنگین مذاق کر رہا ہے۔

☆☆☆

احتشام نے ڈاکٹر کو بلالیا تھا۔ اس نے چیک اَپ کرنے کے بعد بتایا۔ ''ان کے سر پر شدید چوٹوں کی وجہ سے ایک تو ان کی یادداشت چلی گئی ہے اور دوسرا یہ اب بچوں کی طرح کے ہو گئے ہیں......''

یہ سن کر احتشام اور عارفہ کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ خوشی سے جھوم اُٹھیں۔ اپنی خوشی کو دباتے ہوئے احتشام نے پوچھا۔

''یہ صورتِ حال کب تک رہے گی......''

''اس بارے میں کچھ نہیں کہا جاسکتا۔'' ڈاکٹر نے کہا۔ ''ان کا مناسب علاج ہوتا رہا تو جلد ہی ان کی یادداشت بھی بحال ہو جائے گی اور جو خوف اور ڈر ان کے اندر بیٹھ گیا ہے وہ بھی دور ہو جائے گا۔'' ڈاکٹر نے کچھ دوائیں لکھ کر دیں اور تاکید کی کہ یہ دوائیں اور چیک اپ باقاعدگی سے جاری رہنا چاہیے۔ ڈاکٹر چلا گیا اور دونوں خوشی سے اچھلنے لگے۔

اس بات کو دس سال بیت گئے تھے۔ عارفہ اور احتشام بیوی اور میاں کی حیثیت سے اسی گھر میں رہتے تھے۔ معصوم خان کی بنائی ہوئی پراپرٹی کی آمدنی کھاتے تھے، اور اپنے پانچ بچوں کی پرورش کر رہے تھے جبکہ مناسب علاج، بلکہ بالکل ہی علاج نہ کرانے کی وجہ سے معصوم خان اور بھی معصوم، ڈرپوک، بزدل ہو گیا تھا اور اس کی یادداشت روز بروز معدوم ہوتی جارہی تھی۔ اب ان دونوں کی زندگی میں کوئی ہلچل برپا نہیں تھی۔

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

زندگی کی مخصوص کردہ اپنی حدیں ہیں... جبکہ انسانوں کے خواب اس کے مقابلے میں کہیں زیادہ لامحدود ہیں... انسان وقت اور حالات کی قید میں ہوتا ہے... مگر اس کے تصور کی پرواز آزاد فضائوں کے مانند لامتناہی ہوتی ہے... بعض کے خواب اور خیالات یکساں ایک دوسرے سے ملتے ہیں... وہی ان کا مقصدِ حیات ہوتا ہے... تعمیر سے دور تخریبی سوچوں اور تصورات کو تعبیر دینے والے ایسے ہی کرداروں کے گرد گھومتی کہانی... جیسے مسرت اور غم... آنسو اور قہقہے... توانائی اور کمزوری آپس میں ہم آغوش ہیں کہ چاہیں بھی تو انہیں الگ نہیں کر سکتے... بالکل اسی طرح انسانی ذات میں پروان چڑھتی منفی سوچیں اسے خود سے علیحدہ نہیں ہونے دیتیں... خوش قسمتی سے خوشگوار اور دولت مند گھرانے میں جنم لینے والے اس حقیقت سے ناآشنا ہوتے ہیں کہ کمزور معاش کی تلخیاں اور اذیتیں زندگی کو کس قدر دگرگوں بنا دیتی ہیں... خوب سے خوب تر کے سفر میں ہر دن ایک نئی زندگی جینے والوں کی زہرآلود داستاں...

Downloaded From Paksociety.com

معاشرے کے ان ناسوروں کا گھناؤنا کھیل جو نئی نسل کو اندر ہی اندر کھا رہا تھا...... سرورق کی بھرپور کہانی......

وہ ایک بلند چٹان پر کھڑا تھا۔

اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کی شدید نمی تھی۔ ان امڈتے آنسوؤں کو بار بار ہتھیلی سے رگڑتے رگڑتے اب آنکھوں میں جلن ہونے لگی تھی لیکن اس وقت وہ ہر تکلیف سے بے نیاز تھا۔

اس نے گہری سانس لی اور اپنے دائیں جانب دیکھا۔ سڑک پر اِکا دُکا گاڑیوں کی آمد و رفت کے سوا کوئی منظر دکھائی نہ دیا۔ بائیں جانب گھنا جنگل اور جھاڑیاں

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

.....تھیں۔ فضا میں موجود خاموشی اور سناٹا اس کی یاسیت میں مزید اضافہ کرنے لگا۔

پردۂ تصور پر انیس سالہ زندگی فلم کی ریل کے مانند مختلف عکس بدل رہی تھی۔ اس کی زندگی خوشیوں سے عبارت تھی۔ خاندان، رشتے دار اور دوستوں کی جانب سے بھی ہمیشہ محبت، توجہ اور خلوص ملا۔ وہ ہر دلعزیز لڑکا تھا جس کی ذہانت اور سنجیدگی کے سبھی اساتذہ بھی معترف تھے۔

اپنی کامیابیاں یاد آتے ہی دل نے ایک بار پھر طے شدہ فیصلے سے بغاوت کر دی۔ ذہن کے دریچوں سے اپنی والدہ کی شبیہ نظر آئی جو اسے پڑھائی کی غرض سے یہاں بھیجنے کی قائل ہی نہ تھیں لیکن اس کی ضد کے سامنے ہتھیار ڈالنے پڑے۔

سماعت میں کچھ روز پہلے اپنے ایک ٹیچر کی گفتگو گونجنے لگی۔ وہ بھی کبھار لیکچر ختم ہونے کے بعد طلبہ کی ذہنی مضبوطی کے لیے ہلکی پھلکی بات چیت کیا کرتے تھے۔

''انسان شکست کھانے کے لیے پیدا ہی نہیں کیا گیا۔ اسے تباہ تو کیا جا سکتا ہے لیکن شکست نہیں دی جا سکتی۔ دنیا میں کچھ بھی ناممکن نہیں۔ ہر مشکل اور آسانی محض ہماری سوچ اور نظریے سے مشروط ہوتی ہے۔ لفظ امپوسبل کو اگر دوسرے نظریے سے دیکھا جائے تو جو صورت سامنے آتی ہے وہ کچھ یوں ہوتی ہے...... آئی ایم پاسبل۔''

ایک پل کے لیے اسے محسوس ہوا کہ وہ اپنی اس مشکل کو بھی شکست دے سکتا ہے لیکن اگلے ہی لمحے اسے اپنے وجود پر بے شمار کانٹے چبھتے ہوئے محسوس ہوئے۔ کراہت اور غلاظت کا احساس سب مثبت سوچوں پر حاوی ہو گیا۔ وہ اپنے بال نوچتا ہوا بری طرح رونے لگا۔

''میری غلطی کی قیمت کوئی دوسرا نہیں چکائے گا۔ اس غلطی کا تاوان میں خود ادا کروں گا۔'' وہ ہذیانی انداز میں بولا اور ایک جھٹکے سے اٹھ کر اپنی سابقہ پوزیشن میں آ کھڑا ہوا۔ اس کے موبائل نے گنگناتے ہوئے کال کی آمد کا عندیہ دینا شروع کر دیا۔ وہ خالی الذہنی کی کیفیت میں موبائل اسکرین کو دیکھنے لگا جہاں ایک مانوس نام اور عزیز ترین چہرہ جھلک رہا تھا۔

اس نے محبت سے اس تصویر کو بوسہ دیا اور موبائل پاور آف کرنے کے بعد اپنے یونیورسٹی بیگ میں رکھ دیا۔

اب کسی بھی قسم کی تاخیر کی گنجائش نہ تھی۔ ڈگمگاتے قدموں سے وہ اس چٹان پر آگے بڑھتا چلا گیا۔ کچھ ہی سیکنڈز میں اس کا وجود خلا میں معلق کشش ثقل کے قانون کے تحت زمین کی طرف عازم سفر تھا۔

انجینئرنگ یونیورسٹی کا وہ ذہین اور یقینی روشن مستقبل کا حامل لڑکا پختہ سڑک پر اوندھے منہ ایک لاش کی صورت میں موجود تھا۔ اس کا سر کسی تربوز کے مانند پھٹ چکا تھا اور اردگرد مغز اور گہرا خون بہہ رہا تھا۔

☆☆☆

دارالحکومت میں زندگی اپنے جوبن پر تھی۔ موسم قدرے خنک تھا اور اس خوشگواریت کا اثر یہاں کے رہائشیوں کے مزاج پر بھی واضح تھا۔ شہر کی ایک معروف شاہراہ کے دائیں جانب ذیلی سڑک پر 'اسٹائل اینڈ ایلی گینس' نامی بوتیک تھا۔ قیمتی گلاس ڈور سے جھلک دکھاتے دلکش اور دیدہ زیب ملبوسات راہگیروں کو ایک بار تو ٹھٹک کر رکنے پر ضرور مجبور کر دیتے تھے۔

اٹالین ٹائلز سے مزین در و دیوار، خوش اخلاق سیلز مین و سیلز گرلز اور انعامی سکیموں کے نت نئے اعلانات کی وجہ سے یہ بوتیک اس علاقے میں خاصی شہرت کا حامل تھا۔ دھیمے سُروں میں بجتی موسیقی اعصاب کو فرحت اور دلوں میں ترنگ پیدا کرنے لگتی۔

'اسٹائل اینڈ ایلی گینس' میں کسٹمرز کی ہر سہولت پر خصوصی توجہ دی جاتی تھی۔ گراؤنڈ فلور پر ایک 'ٹرائل روم' موجود تھا جہاں رسائی کے لیے ایک خصوصی ایلیویٹر کا انتظام بھی کیا گیا تھا۔ نئے آنے والے کسٹمرز اس غیر معمولی امر پر اچنبھے کا اظہار ضرور کرتے لیکن سیلز مین انہیں یہ کہہ کر مطمئن کر دیا کرتے کہ نچلے پورشن میں ماہر ٹیلر اپنے تمام تر ساز و سامان کے ساتھ ہمہ وقت موجود رہتا ہے۔ اس لیے کسی بھی لباس کی فٹنگ فوری طور پر کسٹمر کے مطلوبہ معیار کے مطابق کر دی جاتی ہے۔

اس بوتیک کی ایک اور خوبی یہ بھی تھی کہ اسے دانستہ طور پر کسی بھی ایک طبقہ یا صنف کے لیے مخصوص نہیں کیا گیا تھا۔ فیملی شاپنگ کے لیے اکثر لوگ یہیں کا رخ کیا کرتے۔ یہاں مڈل کلاس کے لیے ان کی استطاعت کے مطابق ملبوسات مل جاتے تو برگر کلاس کے لیے بھی امپورٹڈ ساز و سامان موجود رہتا تھا۔ ہاں، یہ بات الگ تھی کہ معیار میں فرق بہرحال بہت واضح تھا۔

بوتیک کا مالک سیٹھ رزاق تھا۔ سیٹھ رزاق بھاری بھرکم جسامت، چوڑے چہرے اور مضبوط ہاتھ پاؤں کا مالک تھا۔ اس کے نقوش بہت کھردرے تھے۔ اندر دھنسی چھوٹی چھوٹی آنکھوں سے اس کی ذہنی مضبوطی اور زمانہ سازی

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

واضح جھلکتی تھی۔ پیشانی قدرے تنگ تھی اس لیے حتی الامکان اپنے بال پچھلی جانب بنائے رکھتا۔ اس کے ہاتھوں میں قیمتی پتھروں سے مزین انگوٹھیاں شخصی تاثر مزید بوجھل کردیتی تھیں۔

مجموعی طور پر اس کی شخصیت بہت بے کیف تھی۔ کاروباری حلقے میں اسے 'قصاب' کے نام سے یاد کیا جاتا تھا اور وہ اس بات سے لاعلم بھی نہیں تھا۔ تاہم وہ اپنے تاثرات پوشیدہ رکھنے میں کمال کا ملکہ رکھتا تھا۔ اس کے چہرے سے دلی کیفیت کا اندازہ لگانا کبھی بھی آسان نہیں رہا تھا۔

اس وقت بھی وہ اپنے اردگرد کے ماحول پر مکمل نظریں جمائے بیٹھا تھا۔ بیرونی جانب سے گلاس ڈور کے کھلنے کا احساس ہوتے ہی وہ یک دم چوکنا ہوگیا۔ کسی بھی کاروباری دن کے آغاز میں اولین گاہک کے لیے سبھی دکاندار اور تاجر انتہائی وہمی نفسیات کے حامل ہوتے ہیں۔ وہ ہمیشہ بہت خوشگوار اور مثبت 'بوہنی' کے خواہشمند ہوتے ہیں۔ سیٹھ رزاق بھی اس معاملے میں شدید وہمی تھا۔

'اسٹائل اینڈ ایلی گینس' کے غیر تحریری قانون کے تحت پہلا کسٹمر ہمیشہ ہی سے وہ خود ڈیل کیا کرتا۔ اس لیے اب بھی اپنے موٹے 'بھدے ہونٹوں پر ایک بھرپور مسکراہٹ سجائے وہ نووارد کی طرف متوجہ ہوگیا مگر اس پر نظر پڑتے ہی ناگواری اور غصے کی ایک لہر نے اسے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ اپنی بیزاری اور نفرت بمشکل ضبط کرتے وہ دھیمی اور کرخت آواز میں بولا۔

''یہاں کیا لینے آئے ہو تم؟''

☆☆☆

وہ شہرِ خموشاں کے باہر موجود تھا۔ مرکزی دروازے کے پاس کھڑے ہوئے اسے تقریباً نصف گھنٹا بیت چکا تھا لیکن اب بھی قدم اندر جانے سے انکاری تھے۔ دل دکھ سے بوجھل تھا اور اعصاب پر ایک کشیدگی طاری تھی۔

بائیں جانب گل فروش ایک طویل قطار میں بیٹھے تھے۔ فضا میں تازہ پھولوں کی مہک کے علاوہ کسی دکاندار کے موبائل پر صوفیانہ کلام اپنی دھن بکھیر رہا تھا۔ اس کا ذہن اس کلام کے مکمل زیرِ اثر تھا۔

یار جنھاں دے پاؤن جدائیاں
رُل جاندے نیں وانگ شدائیاں

(جن کے اپنے بچھڑ جائیں، وہ صدمے اور دیوانگی سے بدحال ہوتے ہیں)

مغنی کی پُرسوز آواز میں یہ مصرعے سنتے ہی اس کا ضبط پاش پاش ہوگیا اور وہ بے اختیار بلکنے لگا۔

''کیا بات ہے صاحب جی! آج پھر اندر جانے کی ہمت نہیں ہو رہی کیا؟'' قطار میں موجود پہلے گل فروش نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھا۔

''اسے خاموشی اور سناٹے سے سخت وحشت ہوا کرتی تھی۔ ہلے گلے اور موج مستی کا شیدائی تھا وہ۔ زندگی اسے دیکھ کر اپنے وجود پر فخر کیا کرتی تھی۔ اور اب وہ اس خاموشی اور اندھیرے میں جانے کیسے جی رہا ہوگا۔'' اس نے گلوگیر آواز میں کہا۔

''صاحب جی! وہ جی ہی تو نہیں رہا۔'' گل فروش بھی افسردہ ہوگیا۔ ''آپ اس حقیقت کو تسلیم کیوں نہیں کر لیتے۔''

''کیسے تسلیم کرلوں یار! موت اتنی بے رحم کیسے ہوسکتی ہے۔ اسے مقابل پر ذرا بھی ترس نہیں آتا کیا۔''

''نہیں آتا جی! موت نابینا بھی ہوتی ہے اور بہری بھی۔ وہ نہ تو کسی کی جوانی' توانائی اور دنیا والوں کو اس کی ضرورت دیکھ سکتی ہے اور نہ ہی اس کی تڑپ اور سسکیاں سن سکتی ہے۔ ہم مدتوں سے یہاں بیٹھے ہیں۔ اور ہمارا کام دھندا ہی موت کی مہربانی سے چلتا ہے۔ یہی اس کائنات کا گورکھ دھندا ہے۔'' گل فروش شبیر اس سے کافی مانوس اور بے تکلف ہو چکا تھا اس لیے بلاجھجک اپنا مدعا بیان کردیا کرتا۔

''میں اکثر سوچتا ہوں شبیر کہ اس کی جگہ موت مجھے شکار کرلیتی۔ میں اُف بھی نہ کرتا۔ اب بھی میرے جینے کا کیا فائدہ ہے۔''

''ایسا کیسے ممکن ہے صاحب جی! ہوسکتا ہے قدرت نے آپ سے کوئی کام لینا ہو۔ کوئی ایسا کام جو صرف آپ ہی انجام دے سکتے ہوں۔ رب کی مصلحتیں ہم انسان کیا جانیں۔'' شبیر نے اسے نرمی سے سمجھایا اور اپنی دکان سے گلاب کے پھولوں کی ایک لڑی تھام کر ساتھی دکاندار سے بولا۔

''کرمو! میرے سامان کا ذرا دھیان رکھنا۔ میں صاحب جی کے ساتھ اندر جا رہا ہوں۔''

وہ محبت سے اس کا ہاتھ تھامے قبرستان میں لے گیا۔ ذرا دور جاتے ہی ایک قبر کے پاس ان کے قدم رک گئے۔ اس نے بوجھل سانس لیتے ہوئے فاتحہ خوانی کے لیے ہاتھ اٹھا دیئے۔ ذہن میں شبیر کا ایک فقرہ بار بار گونج رہا تھا۔

''ہوسکتا ہے قدرت نے آپ سے کوئی کام لینا

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

...... کوئی ایسا کام جو صرف آپ ہی انجام دے سکتے ...وں۔"

ایک فوری خیال نے اس کے رگ و پے میں سنسنی ...ڑا دی۔ زندگی یکدم بے حد سہل اور ایک نعمت محسوس ...نے لگی تھی۔

☆☆☆

"میری آمد اچھی نہیں لگی آپ کو بھائی ...احب!" نووارد کی آنکھوں میں کینہ اور ہونٹوں پر ایک ...گا دینے والی مسکراہٹ تھی۔

"تم یہاں لینے کیا آئے ہو حرام خور!" سیٹھ رزاق ...نے اپنا سابقہ سوال دہرایا۔

"باتیں دہراتے رہنے کی عادت ابھی بھی نہیں گئی ...پ کی۔ چلیں آپ اتنا اصرار کر رہے ہیں تو بتا دیتا ہوں کہ ...پ سے ملنے کا بہت دل کر رہا تھا۔ اس لیے دیدار کرنے ...لا آیا۔" وہ اطمینان سے بولا۔

"بکواس بند کرو حرام خور!" رزاق نے دانت پیسے۔

میرا نام اظہر ہے بھائی صاحب! احرام خور نہیں۔ اور ...تر یہی ہوگا کہ اپنی زبان قابو میں رکھیں۔"

"اور میرا نام بھی رزاق ہے...... سیٹھ رزاق...... اس ...یے تمہارے لیے بھی بہتر یہی ہوگا کہ مجھے بھائی صاحب ...کے سابقے لاحقوں سے مت پکارو۔"

"میں تو اپنے بڑے بھائی کو عزت و احترام دینا چاہ ...رہا تھا...... لیکن لگتا ہے آپ کو آج بھی عزت راس ہی نہیں ...ہے۔" اظہر نے سر کھجاتے ہوئے کہا۔

"نہیں ہوں میں تمہارا بھائی۔ اپنا منحوس وجود لے کر ...ہاں سے دفان ہو جاؤ۔" رزاق نے اس کی انتہائی تنگ ...نیالی اور گھسی ہوئی جینز؛ شوخ، چنگھاڑتے ہوئے رنگوں کی ...رٹ، لمبے الجھے بال، کان کی بالی، پان کے مسلسل استعمال ...سے رنگ دار دانتوں اور کثرتِ سگریٹ نوشی سے سیاہ ...چکے ہونٹوں کو نفرت اور حقارت سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"چہ چہ چہ...... آپ کو اپنی ولدیت پر بھی شبہ ہونے ...ہے اب۔ ورنہ مجھے تو یقین ہے کہ میں مراد چانڈیو ہی کا ...ا ہوں۔" وہ مصنوعی تاسف سے بولا۔ "بہتر یہی ہوگا کہ ...ہدگی میں میری چند باتیں سن لیں۔ پھر شکوہ نہ کیجیے گا کہ ...زمین کے سامنے آپ کا بھرم قائم نہیں رکھا۔"

رزاق چند ثانیوں کے لیے سوچتا رہا اور پھر بادل نا ...استہ اسے ہمراہ لیے اپنے ریسٹ روم میں چلا آیا۔ یہ ...یسٹ روم آرائش اور عیش و عشرت کی سہولیات میں کسی بھی لحاظ سے غیر ملکی سوئٹ سے کم نہ تھا۔

"بکو اب! کیا کہنا ہے تمہیں۔ اور جیل سے کب رہائی ملی؟"

"جیل تو میرا دوسرا گھر ہے۔ اور اپنے گھر میں آنا جانا تو لگا ہی رہتا ہے۔" وہ ڈھٹائی سے بولا۔ "آپ کے یہاں مہمان کی خاطر داری کرنے کا کوئی رواج نہیں ہے کیا۔" اس کی نظریں عقبی جانب بنے ایک کاؤنٹر اور شراب کی بوتلوں پر جمی تھیں۔

"میرا وقت ضائع نہ کرو اظہر! تمہاری پٹاری میں جو بھی سانپ ہے اسے اب نکال ہی دو۔" رزاق اس کے رویے سے جھنجلا چکا تھا۔

"مجھے آپ کے اس کاروبار میں بیس فیصد حصہ درکار ہے۔" اس نے اپنی انگلی میں موجود کی چین گھماتے ہوئے کہا۔

"تم کہیں نشے میں تو نہیں ہو...... یہ میرا ذاتی کاروبار ہے۔ اس میں سے تمہیں پھوٹی کوڑی بھی نہیں ملے گی۔"

"ذاتی تو نہ کہیے۔ آپ کے سسر اور بیوی کی جائداد سے بنا ہے۔"

"جس طرح بھی بنا ہو۔ یہ سراسر میری محنت اور لگن کا نتیجہ ہے۔ تمہیں اس میں حصہ کس بنیاد پر دے دوں میں۔" رزاق حلق کے بل چلایا۔

"آپ کی بیوی کے افیئر اور ہوٹل کے بند کمروں میں اپنے آشنا سے ملاقاتوں کو راز رکھنے کے لیے۔"

"تم حد سے بڑھ رہے ہو اظہر!"

"میں جانتا تھا آپ کو میری بات کا یقین نہیں آئے گا۔ تین روز کی مہلت دیتا ہوں آپ کو۔ اگر اس راز کی قیمت ادا نہ کی تو میں ایک شرط آپ کی بیوی کے سامنے رکھ دوں گا۔ وہ مجھ سے شادی کر لے اور پھر اپنی تمام سرگرمیاں اطمینان سے جاری رکھے۔"

"وہ کسی صورت مجھ سے علیحدگی اختیار نہیں کر سکتی۔ اس کے باپ نے نکاح نامہ میں بہت کڑی شرائط رکھی تھیں۔" رزاق نے اس کی خام خیالی پر مسکراتے ہوئے کہا۔

"علیحدگی...... علیحدگی کیوں اختیار کرے گی وہ بھلا؟ بیوہ تو دوسری شادی کے لیے قانونی اور مذہبی طور پر آزاد ہوتی ہے۔" اظہر کے سفاک لہجے نے رزاق کے بدن میں جھرجھری پیدا کر دی۔

☆☆☆

Downloaded From Paksociety.com

قیمت Downloaded from Paksociety.com

اظہر کے جانے کے بعد سیٹھ رزاق کا سکون اور اطمینان غارت ہوگیا۔

''اپنے اس عشرت کدے میں راجا اِندر بن کر نہ بیٹھے رہا کرو۔ بیوی کی سرگرمیوں پر بھی نظر رکھو جو مختلف ڈالیوں پر اپنا عارضی آشیانہ بنائے رکھتی ہے۔'' وہ جاتے ہوئے بھی اسے سُلگا گیا تھا۔

رزاق اپنے اعصاب پُرسکون رکھنے کے لیے ریسٹ روم میں موجود امپورٹڈ وہسکی سے دل بہلانے لگا۔ لیکن وہ سیال مادہ بھی آج دل و دماغ کی تپش کم نہیں کر پا رہا تھا۔

''تمہارا اب کوئی نہ کوئی علاج کرنا ہی پڑے گا بے غیرت انسان! میں یوں ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر نہیں بیٹھوں گا۔'' اس نے بڑبڑاتے ہوئے کہا اور انٹرکام اٹھا کر منیجر کو اندر آنے کی ہدایت کی۔

انٹرکام رکھتے ہی اس نے ایک اور جام تیار کیا اور دستک کی آواز سن کر ریموٹ کنٹرول سے دروازہ غیر مقفل کر دیا۔

''سر آپ نے بلوایا مجھے۔'' منیجر رفیق نے سر جھکائے اعتماد سے پوچھا۔

اس کی عمر پینتیس سال سے زائد نہ تھی۔ کسرتی جسم' جدید تراش خراش کا لباس اور ہیئر سٹائل اس پہ خوب جچتے تھے۔ سیٹھ رزاق کے پاس ملازمت حاصل کرنے کے لیے پُراعتماد شخصیت کے علاوہ حسن و وجاہت بھی لازمی شرائط تھیں۔ رفیق ایک سال قبل ہی 'اسٹائل اینڈ ایلی گینس' میں آیا تھا۔ اس کی شخصی خوبیوں کے باعث مشکل ترین کسٹمرز بھی بآسانی رام ہوجاتے۔

''میں کچھ دیر کے لیے گھر جانا چاہتا ہوں۔ تم یہاں سب کچھ سنبھال لینا۔'' رزاق نے وہسکی کے گھونٹ بھرتے ہوئے کہا۔

''شیور سر! نو پرابلم...... کیا آپ واپس آئیں گے؟'' اس نے محتاط انداز میں پوچھا۔ باس کی اس وقت شراب نوشی اسے کسی گڑبڑ کا عندیہ دے رہی تھی۔

''ہاں! شام تک آجاؤں گا۔'' اس نے رفیق کو جانے کا اشارہ کیا۔

نصف گھنٹے تک مزید جام لنڈھانے کے بعد وہ ریسٹ روم مقفل کر کے باہر چلا آیا۔ بوتیک میں معمول کی سرگرمیاں جاری تھیں۔ لیڈیز اور جینٹس پورشن دو الگ حصوں میں تقسیم کیے گئے تھے اور یہاں ہمہ وقت دو سیلز مین اور دو ہی سیلز گرلز موجود رہتیں۔

وہ عقابی نظروں سے...... اطراف کا جائزہ لیتا پارکنگ کی طرف بڑھ گیا۔ ڈرائیور اسے دیکھ کر مستعد ہو گیا اور فوراً آگے بڑھ کر پچھلا دروازہ کھول دیا۔

''گھر چلو۔'' اس نے کھردرے انداز میں کہا اور سیٹ کی پشت پر نیم دراز ہوگیا۔

☆☆☆

گاڑی ایک خوبصورت اور پُروقار بنگلے کے سامنے رکی تھی۔

مخصوص ہارن کی آواز سن کر گارڈ نے آہنی دروازہ کھول دیا۔ رزاق عجلت کے عالم میں پورچ میں اُترا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا اندر بڑھ گیا۔ اس کے ذہن میں ایک آتش فشاں سلگ رہا تھا۔

''روحی کدھر ہے؟'' اس نے ڈرائنگ روم میں ملازمہ سے پوچھا۔

''اپنے کمرے میں ہی ہوں گی سر!'' ملازمہ کے حیرت زدہ انداز پر اسے اپنے بے تکے سوال کا احساس ہوا۔

وہ جھنجلاہٹ میں سر جھٹکتا بیڈروم کا دروازہ زوردار انداز میں کھول کر کمرے میں داخل ہوگیا۔

''یہ کیا طریقہ ہے رزاق! تم نے تو مجھے خوفزدہ کر دیا۔'' روحینہ نے اپنے تراشیدہ بال سمیٹتے ہوئے کہا۔ وہ نائٹ گاؤن میں ملبوس اب بھی بستر پر ہی دراز تھی۔

''میری طبیعت کچھ ناساز ہے......بس اسی لیے ذہن قابو میں نہیں۔'' وہ ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔

روحینہ بھی بستر سے اُٹھ کر اس کے پاس چلی آئی۔

رزاق کو اس کی قربت اور ادائیں ہمیشہ ہی مسحور کر دیا کرتی تھیں۔ اس عورت میں جانے ایسا کیا جادو تھا کہ وہ اس کے سامنے اپنی قوتِ مدافعت کھونے لگتا۔

وہ بیالیس برس کی ہو چکی تھی لیکن اپنا وجود اس انداز سے سنبھال رکھا تھا کہ اپنی عمر سے دس برس چھوٹی دکھائی دیتی۔ اس کی شہابی رنگت' ریشمی بال' گداز جسم قدرت کی صناعی کا شاہکار تھے اور رزاق کو ہمیشہ اس بات پر فخر و غرور محسوس ہوتا کہ اس شاہکار کا وہ بلاشرکت غیرے مالک ہے۔

عورت اگر خوبصورت ہو اور جذبات کے اظہار سے واقف بھی ہو تو اچھے خاصے باشعور مرد کے ذہن کو کسی ماہر ٹیلی پیتھی کی طرح اپنے قابو میں کر لیتی ہے۔ اور ایسی عورت مرد کی کمزوری بن جاتی ہے۔ روحی بھی اپنی خودسپردگی اور اظہارِ محبت سے رزاق کی مردانہ انا کا غبارہ ہمیشہ پھلائے

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

رکھتی اور وہ اپنی عیاش فطرت کے باوجود اس کا عادی ہو چکا تھا۔

مگر آج اظہر کی بے ہودہ گوئی اسے بار بار زہریلے ناگ کی طرح ڈس رہی تھی۔ وہ اپنی انہی سوچوں میں گم صم بیٹھا تھا۔ روحی اس کی رمز شناس تھی اور کسی خطرناک حد تک سنجیدہ امر بھانپ گئی تھی۔

وہ سبک خرامی سے اٹھی اور صوفے کی پشت پر جا کر عقب سے اس کی گردن میں بازو حمائل کر دیئے۔

''کیا بات ہے سوئٹ ہارٹ! اتنے اَپ سیٹ کیوں ہو؟''

رزاق کی رہی سہی مدافعت بھی ہوا ہو گئی۔ ''آج اظہر آیا تھا میرے پاس۔''

روحی کو اس ادھورے فقرے کے پس منظر میں کسی طوفان کی آمد محسوس ہوئی۔ وہ اپنی قربت سے اسے مزید پگھلانے لگی۔ اپنا دایاں رخسار اس کے بائیں رخسار سے مس کرتے وہ دھیرے سے بولی۔ ''کیا کہہ رہا تھا وہ باسٹرڈ!''

''کچھ نہیں...... بس اناپ شناپ بک رہا تھا۔ مجھے تمہارے خلاف بھڑکانے کی کوشش کر رہا تھا۔''

''یہی کہہ رہا ہوگا کہ تمہاری بیوی بدکردار ہے...... غیر مردوں سے ملتی ہے...... اصل میں وہ تم سے سخت جیلس رہتا ہے...... تمہاری محنت اور قسمت سے خار کھاتا ہے۔''

''ہاں! یہی کچھ کہہ رہا تھا۔'' وہ تنفر سے بولا۔

''اور تم نے اس کی باتوں پر یقین کرتے ہوئے فوراً گھر واپسی کی راہ لے لی تاکہ مجھے رنگے ہاتھوں پکڑ سکو...... ہے ناں!'' روحی یکدم پیچھے ہٹتی تیزی سے بولی۔

رزاق کی سٹی گم ہو گئی۔ ''نن...... نہیں مائی ڈیئر! ایسی کوئی بات نہیں...... بائی گاڈ مجھے تمہاری محبت اور وفا پر کوئی شک نہیں۔'' وہ گھگیایا۔

''اگر واقعی ایسا ہے تو تم اس سے پیچھا کیوں نہیں چھڑوا لیتے۔ وہ آئے روز اپنی جلن اور حسد سے ہماری زندگیاں زہر آلود کرتا رہے گا۔''

''میں بھی یہی چاہتا ہوں...... کہ اظہر سے نجات مل جائے۔'' اس کی آواز نشے سے بوجھل ہونے لگی۔

روحی محبت سے اس کا ہاتھ تھامے اسے بیڈ تک لے گئی۔ اس کا کوٹ اتار کر ٹائی کی گرہ ڈھیلی کی اور نرمی سے اسے بستر پر لٹا کر بال سہلانے لگی۔ رزاق اس کے چہرے سے چھلکتی وارفتگی پر طمانیت محسوس کرتا جلد ہی نیند کی وادی میں کھو گیا۔

روحی کے چہرے پر موجود نقاب اب سرک چکا تھا۔ اس کے نقوش سختی سے تن گئے۔ وہ چوٹ کھائی ہوئی ناگن کی طرح اٹھی اور سائڈ ٹیبل پر موجود اپنا موبائل تھام کر ایک میسج لکھنے لگی۔

''میٹنگ از کینسلڈ...... سی یو اگین!''

بیڈ کی پشت سے ٹیک لگائے اس نے اپنی آنکھیں موند لیں اور موبائل اپنی پیشانی سے ہلکے ہلکے ٹکراتی رہی۔ چند لمحوں بعد اس نے بھیجا گیا میسج' اپنے کال ریکارڈز اور ایک خصوصی نمبر بھی موبائل سے ڈیلیٹ کر دیا۔

اس کی پیشانی پر ناگواری' تشویش اور غصے کے گہرے بل تھے۔

☆☆☆

روحینہ' چودھری سرفراز اور پشمینہ کی اکلوتی بیٹی تھی۔

چودھری سرفراز گارمنٹس انڈسٹری میں ایک ٹائیکون کی حیثیت اختیار کر چکا تھا۔ وسیع و عریض ہر سہولت سے آراستہ رہائش گاہ، نوکروں کی فوج، دولت کی فراوانی تھی۔ روحینہ کی پرورش میں دو ہی عوامل کا عمل دخل تھا، والدین کی عدم توجہی اور غیر ملکی میڈز۔

وہ فطرتاً اور مزاجاً انہی میڈز کا عکس بن گئی۔ ہوش سنبھالتے ہی اس نے اپنے اردگرد مادر پدر آزاد ماحول دیکھا۔ والدین بھی مکمل طور پر مغربی رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔ ان کے شاندار بنگلے میں آئے روز نت نئی تقریبات منعقد ہوتیں۔ شراب و شباب ان کا 'کلاس لیول' تھے۔

سرفراز اور اس کے دوست بے جھجک ایک دوسرے کی بیگمات سے فلرٹ کرتے' رقص کی دعوت دیتے۔ ان تقریبات کے علاوہ اگر ان کے ہاں کسی چیز کا جنون کی حد تک خیال رکھا جاتا تھا تو وہ 'خوبصورتی اور حسب نسب' تھے۔ نوکر چاکر' آرائشی اشیا اور پالتو جانور بھی اسی معیار کے تحت گھر میں لائے جاتے۔

روحینہ کا مزاج بھی ان حالات میں مکمل طور پر مغربی رنگ میں ڈھلنے کے علاوہ حسن پرستی اور شدت پرستی کی طرف مائل ہو چکا تھا۔ سولہویں سال میں قدم رکھتے ہی اس نے اپنے سر پر مسلط میڈز کی برطرفی کا مطالبہ کر دیا۔ سرفراز بیٹی کی اس خواہش کی تکمیل پر متامل تھا۔

''دیکھو بے بی! ابھی چند سال مزید کمپرومائز کر لو آپ کی ممی اور میں کاروباری دوروں میں مشغول ہوتے ہیں۔ اس لیے آپ کی دیکھ بھال کے لیے یہاں کسی نہ کسی کا

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

ہونا ضروری ہے۔"

"کم آن ڈیڈ! میں اب بچی نہیں ہوں جسے دیکھ بھال کی ضرورت ہو۔ میں ایک میچور لڑکی ہوں۔ چند ماہ بعد کالج جانے لگوں گی۔"

"وہ تو ٹھیک ہے مائی چائلڈ! لیکن آپ اکیلے کیسے رہو گی؟" پشمینہ نے بھی ہچکچاہٹ کا مظاہرہ کیا۔

"میں آج کل ایگزامز کے بعد فارغ ہوں۔ لہٰذا آپ لوگوں کی تسلی کے لیے سیلف ڈیفنس کے کسی ادارے میں داخلہ لے لیتی ہوں۔" اس نے اطمینان سے کہا۔

"مجھے تو کوئی اعتراض نہیں۔ مستقبل میں اسی نے کاروبار سنبھالنا ہے اس لیے خود اعتمادی اور اپنے فیصلے آزادانہ لینے کا عادی ہونا چاہیے۔" سرفراز نے بیوی سے کہا۔

روحی نے چند ہی ماہ میں ڈیفنس اور اٹیک کی بنیادی تکنیک میں کافی مہارت حاصل کرلی۔ اس کے اعتماد اور نازو انداز کے سامنے ٹھہرنے کی تاب کسی میں نہ تھی۔

کالج کی دنیا تسخیر کرنا اس کے لیے بالکل بھی مشکل ثابت نہ ہوا۔ وہ ایک ساحرہ تھی جس کے سحر سے بچنا کسی بھی مرد کے لیے ممکن ہی نہ تھا۔ وہ اپنی فطرت کے زیرِ اثر فلرٹ کرتی لیکن کسی کو بھی اپنے حواس پر حاوی نہ ہونے دیتی۔

اس کے زعم اور نسوانی انا پر پہلی ضرب یونیورسٹی میں اس وقت لگی جب اس کا ٹکراؤ شاداب خان سے ہوا وہ شخص اس کی زندگی مکمل طور پر بدل گیا۔

☆☆☆

مردان سے تعلق رکھنے والا شاداب خان وجاہت میں اپنی مثال آپ تھا۔ وہ اسی یونیورسٹی کا طالبعلم تھا اور ان دنوں اپنے پی۔ ایچ۔ ڈی کا تھیسس مکمل کرنے کے لیے پروفیسرز سے مدد لینے وہاں آتا تھا۔ بے نیازی اور غرور اس کے مزاج کا حصہ تھے۔ روحینہ سرفراز کو ایسے سرد ردعمل کی عادت تھی نہ قوتِ برداشت۔

وہ مختلف بہانوں سے اس کے آس پاس منڈلاتی' اسے مخاطب کرنے کے طریقے تلاشتی مگر وہ اسے نظر انداز کیے رکھتا۔ روحینہ کی نفسیات میں گرہیں پیدا ہونے لگیں۔ وہ اپنی ذات کا یقین کھو رہی تھی۔ غصہ اور رنج کی کیفیات میں گھری وہ کتنی ہی دیر آئینے کے سامنے اپنے چہرے اور فگر کو ٹٹولتی ایک ہی بات سوچتی چلی جاتی:

"مجھ میں کس چیز کی کمی ہے آخر؟ میں اسے دکھائی کیوں نہیں دیتی؟"

شاداب کی بے نیازی کے باوجود اس نے اپنی کوششیں ترک نہیں کیں۔ ایک روز وہ لائبریری میں کتابوں میں گھرا بیٹھا تھا۔ وہ اس کے پاس چلی گئی اور نروس سے انداز میں ایک خوبصورت پیکنگ میں ملفوف گفٹ پیک اس کے سامنے رکھ دیا۔

"یہ کیا ہے محترمہ؟"

"آپ کے لیے ایک چھوٹا سا گفٹ ہے۔"

"کس خوشی میں؟"

"آپ کی سالگرہ کے لیے۔"

"کس حیثیت سے؟" اس نے درشتی سے پوچھا۔

"دوست ہونے کی حیثیت سے۔ اور اگر آپ چاہیں تو یہ رشتہ دوستی سے آگے بھی بڑھ سکتا ہے۔" وہ بے باکی سے بولی۔

"میں اپنی بات دہرانے کا عادی نہیں ہوں...... اس لیے میری بات کان کھول کر سن لو محترمہ!...... مرد اور عورت کی دوستی ایک شیطانی بھرم ہوتا ہے۔ ان دونوں اصناف میں دوستی و دوستی کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔ میں تم جیسی لڑکیوں کے ہتھکنڈے بہت اچھی طرح سمجھتا ہوں...... اور بحیثیت دوست تم یہ گفٹ جو میرے لیے لائی ہو...... میں نے تمہیں اس رشتے کی سند کب دی تھی بائی داوے؟"

اس کے الفاظ تیزاب کے چھینٹوں کی طرح روحی کو جھلسانے لگے۔

"کیا میں اس قابل بھی نہیں شاداب خان کہ تمہاری دوست ہی بن سکوں۔"

"میں عورت ذات سے ناجائز رشتوں اور اس لین دین کا قائل نہیں ہوں۔" شاداب نے گفٹ پیک اس کی طرف دھکیلتے ہوئے کہا۔ "میری غیرت ان خرافات کی روادار نہیں۔ آئندہ بھی میرے نزدیک نظر آئیں تو میں ہر لحاظ و مروت بھول جاؤں گا۔"

وہ اپنی کتابیں سمیٹا جھٹکے سے اُٹھ گیا۔

روحینہ شدید احساسِ ذلت میں گھر گئی۔ لیکن جب ٹھنڈے دماغ سے سوچا تو اسے شاداب کی سوچ' طرزِ فکر اور کردار پر فخر محسوس ہونے لگا۔ وہ اس کی زندگی میں آنے والا اپنی نوعیت کا منفرد ترین مرد تھا۔ وہ اس 'باکردار' اور غیور، مرد کی محبت میں تو ایک عرصے سے مبتلا تھی مگر اب وہ اس کی ضد بھی بن گیا تھا۔

وہ کسی بھی قیمت اس ضدی اور سرکش مرد کو اپنے قدموں میں جھکانا چاہتی تھی۔ محبت اور چاہت کے اس

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

یکطرفہ سفر میں انا نے اپنا پھن پھیلا لیا تھا..... تباہی تو اب لوحِ تقدیر میں اَن مٹ سیاہی سے لکھا فیصلہ بن چکی تھی۔

☆☆☆

یونیورسٹی انتظامیہ کی جانب سے سالِ اول کے طلبہ و طالبات کو شمالی علاقہ جات کی سیر کے لیے لے جایا جا رہا تھا۔ شاداب خان کا تھیسس بھی مکمل ہو گیا تھا۔ وہ بھی ان کے ساتھ بطور گائڈ روانہ ہو گیا۔ ٹور ختم ہونے کے بعد اس نے اپنے آبائی علاقے کی طرف روانہ ہو جانا تھا۔

اس کے پاس ایک کیمرا بھی موجود تھا جسے وہ کسی ماہر فوٹوگرافر کی طرح گلے میں لٹکائے ان سب کی تصاویر لیتا رہا۔ اس ٹور میں لڑکیوں کی تعداد نہ ہونے کے برابر تھی اس لیے وہ مل بانٹ کر کام کر لیا کرتیں۔

اس شام روحی نے سب کے لیے کافی بنائی اور شاداب کے کپ میں منہ مانگے داموں پر خریدا ایک سفوف ملا دیا۔ کافی پینے کے بعد سب اپنے کمروں میں روانہ ہو گئے۔ شاداب کی سرد مزاجی کے باعث کسی بھی لڑکے نے اس کے ساتھ کمرا شیئر نہیں کیا تھا۔

روحی کیمرا ہاتھ میں تھامے اسی وقت اس کے پیچھے روانہ ہو گئی۔ شاداب بستر پر بیٹھا گہری سانسیں لے رہا تھا۔ اس کا ملایا ہوا سفوف اپنی کارکردگی کا بھرپور آغاز کر چکا تھا۔ شاداب کا سرخ چہرہ، لرزتا وجود، ابھری ہوئی رگیں اور آنکھوں کی وحشت دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر طمانیت بھری مسکراہٹ دوڑ گئی۔

''تم کیا لینے آئی ہو یہاں؟'' اس کے لہجے میں بے بسی محسوس کر کے روحی مزید سرشار ہونے لگی۔

''میں آپ کا کیمرا لوٹانے آئی تھی۔ آپ باہر بھول آئے تھے۔'' وہ حتی الامکان بے نیازی سے بولی۔

''وہاں میز پر رکھ دو۔'' وہ اس کے وجود سے نظریں چرانے لگا۔

روحی نے خاموشی سے حکم کی تعمیل کی اور اسے نظر انداز کیے واپس پلٹنے لگی۔

''روحی! کچھ دیر میرے پاس بیٹھ جاؤ پلیز.....''

شاداب کی بھنچی ہوئی آواز نے اس کے قدم روک لیے۔

''کس حیثیت اور رشتے سے محترم؟''

''پتا نہیں..... بس جانے کیوں میرا دل چاہ رہا ہے۔'' وہ اپنے ہونٹ کچلنے لگا۔

''آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے ناں!'' وہ اس کے قریب گئی اور اپنا ہاتھ اس کی پیشانی پر رکھ دیا۔

شاداب نے بے اختیار اس کی کلائی تھام لی۔

روحی نے ہلکی سی مزاحمت دکھائی مگر شاداب کی وحشت کے سامنے سونامی کی زد میں آئے تنکے کی طرح بہہ گئی۔

وہ اس کی سرکشی اور غرور زیر کرنے میں بالآخر کامیاب ہو گئی تھی۔

☆☆☆

اگلی صبح شاداب کی آنکھ حسبِ معمول فجر کے وقت کھل گئی۔ روحی نے اپنے منصوبے کے اگلے حصے پر عمل کا آغاز کر دیا۔

''بہت خوب شاداب خان صاحب! آپ بھی وہی روایتی مرد ثابت ہوئے۔ اپنی اعلیٰ کرداری کے دعوے تو بہت کیے تھے لیکن ایک ذرا تنہائی ملتے ہی مجھے بے مول کر دیا۔'' وہ حلق کے بل چلائی۔

''پروردگار کی قسم! میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا..... میں نہیں جانتا مجھے کیا ہو گیا تھا..... تم نے مجھے روکا کیوں نہیں؟ مجھے تھپڑ ہی مار دیتیں۔ شاید میں ہوش و حواس میں لوٹ آتا۔''

''جذبات اور وحشت میں بپھرے مرد کا سامنا ایک بے بس اور کمزور عورت کیسے کر سکتی ہے؟ آپ یہ بودے عذر دے کر اپنے گناہ سے بری نہیں ہو سکتے۔'' روحی کو اس کی ندامت مزید شیر کر رہی تھی۔

کمرے میں کچھ لمحوں کے لیے خاموشی چھا گئی۔

شاداب کی پیشانی عرق آلود ہو چکی تھی۔

''مجھ سے شادی کر لو روحینہ! میں اس احساسِ ندامت اور ضمیر پر بوجھ لیے زندہ نہیں رہ سکوں گا۔''

اس نے فوری جواب دینا مناسب نہ سمجھا اور خاموشی کے ایک مختصر وقفے کے بعد بولی۔ ''ٹھیک ہے! میں واپس جاتے ہی اپنے والدین سے بات کروں گی۔''

''میں آج ہی یہاں سے روانہ ہو جاؤں گا۔ ایک لینڈ لائن نمبر تمہیں دے دوں گا۔ تمہارے والدین کا جو بھی فیصلہ ہوا مجھے بتا دینا۔''

''لیکن یہ ٹور تو ابھی ختم نہیں ہوا۔'' وہ بوکھلائی۔

''میں یہاں رہ کر تمہارا سامنا نہیں کر سکوں گا۔ اب خدارا اپنے کمرے میں چلی جاؤ۔'' اس نے اپنے بال مٹھیوں میں بھینچ لیے۔

اگلے دو گھنٹے میں وہ کسی سے بھی کچھ کہے سنے بغیر ہوٹل چھوڑ گیا۔

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

ٹور مکمل ہونے کے بعد روحی نے والدین کو شاداب کے بارے میں بتا دیا۔ چوہدری سرفراز نے اس کی پسندیدگی جان کر بہت مثبت ردِعمل ظاہر کیا۔

''مجھے اپنی بیٹی کی چوائس پر مکمل بھروسا ہے......اس کی پسند معمولی ہرگز نہیں ہوسکتی۔''

''یس ڈیڈ! شاداب کی پرسنالٹی انتہائی شاندار ہے۔ اس کا رکھ رکھاؤ' بول چال' لباس خاندانی ہونے کی دلیل ہیں۔'' اس نے جوش سے کہا۔

''دیٹس گڈ! اس کے والدین کیا کرتے ہیں؟''

''ارے! وہ تو میں نے کبھی پوچھا ہی نہیں۔'' وہ معصومیت سے بولی۔

''یہ کوئی بڑا ایشو نہیں...... میں خود ہی سارے معاملات طے کرلوں گا۔ تم اسے میرے دفتر بھیج دینا۔''

سرفراز اس کے گال تھپتھپا کر اخبار کی طرف متوجہ ہوگیا۔

روحی نے شاداب کے دیے گئے فون نمبر پر رابطہ کر کے اسے فوری اطلاع دے دی۔

''میں دو روز بعد اپنے پروفیسرز سے ملاقات کے لیے آؤں گا...... تمہارے والد سے بھی مل لوں گا۔'' اس کے لہجے میں پژمردگی تھی۔

شاداب خان کی یہ بے بسی روحینہ کی انا کو بہت سکون دے رہی تھی۔

☆☆☆

تیسرے روز چوہدری ہاؤس ایک طوفان کی زد میں تھا۔

سرفراز نے دفتر سے واپس آتے ہی بیٹی کو اپنے کمرے میں طلب کرلیا۔

''شاداب سے ملاقات ہوگئی آپ کی ڈیڈ؟''

''ہاں! آج وہ آیا تھا میرے پاس۔''

''کیسا لگا آپ کو میرا انتخاب؟''

''تم ایک انتہائی کم عقل' احمق اور بے وقوف لڑکی ہو روحی!''

''میں نے آپ سے شاداب کے متعلق پوچھا ہے۔ میری تعریفیں پھر کسی وقت کے لیے اُٹھا رکھیے۔'' اسے باپ کا لہجہ ناگوار گزرا۔

''تم جس لڑکے کی شان میں زمین و آسمان کے قلابے ملا رہی تھیں...... ایک بار اس کا پس منظر تو جان لیا ہوتا۔ وہ اس پہاڑی علاقے کے ایک کاشتکار کا بیٹا ہے۔ اس کا باپ ٹھیکے پر پھل کاشت کرتا ہے۔''

''اس سے مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔''

''تم چاہتی ہو کہ گارمنٹس انڈسٹری کا قومی سطح پر معروف بزنس مین ایک غریب ہاری کو اپنا سمدھی بنا لے...... ڈیم فول! یہ کبھی ممکن نہیں ہوگا...... اس لڑکے کو تو میں نے اچھی طرح اس کی اوقات سمجھا دی ہے......تم بھی یہ حقیقت تسلیم کرلو۔''

''میں یہ سب ممکن کر کے دکھاؤں گی۔ شادی تو بہر حال میں اسی سے کروں گی۔'' وہ پاؤں پٹختی چلی گئی۔

سرفراز اس کے سرکش تیور دیکھ کر گہری سوچ میں کھو گیا۔ کچھ دیر بعد اس نے ٹیلی فون سیٹ اٹھایا اور دو مختلف افراد سے گفتگو کے بعد پُرسکون ہوگیا۔

☆☆☆

روحی اپنے والدین کی خاموشی کو ان کی بے بسی سمجھ کر خوشی سے نہال ہو رہی تھی۔ اس نے اپنی خفگی اور ضد کا تاثر گہرا کرنے کے لیے ناشتا اور ڈنر اپنے کمرے میں ہی منگوانا شروع کردیا۔

چند روز بعد سرفراز اس کے کمرے میں آیا اور سرد مہری سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''میرا دیرینہ دوست مراد اپنے بیٹے رزاق کے ساتھ کل آئے گا۔ دو ہفتے بعد تمہاری رزاق سے شادی طے ہے۔''

وہ اپنا فیصلہ سنا کر انہی قدموں پر لوٹ گیا۔ روحی کو شدید اضطراب لاحق ہوگیا۔ اس نے کریڈل سے ریسیور اُٹھایا اور بے تابی سے شاداب کا نمبر ڈائل کرنے لگی۔ وہ اس سے کورٹ میرج کرنے کے لیے ذہنی طور پر مکمل تیار ہو چکی تھی۔ اور اسے یقین تھا کہ شاداب جس اخلاقی دباؤ کا شکار ہے' اس فیصلے کے سامنے پس و پیش نہیں کرے گا۔

فون پر ملنے والی خبر نے اس کی سٹی گم کردی۔ وہ نمبر درحقیقت شاداب کے ایک ہمسائے کا تھا جس کی زبانی اسے علم ہوا کہ دو روز قبل شاداب خان کے گھر رات کے آخری پہر چند ڈاکوؤں نے حملہ کیا تھا۔ وہ تمام جمع پونجی اور زیورات لوٹنے کے بعد اہلِ خانہ کو گولیوں سے بھون کر چلے گئے۔

روحی کے لیے اپنی شادی اور اس حادثے کی 'ٹائمنگ' کے باعث دو جمع دو، چار کی طرح اصل مجرم کا اندازہ لگانا بالکل بھی مشکل نہ تھا۔ سرفراز کی سفاکی نے اس کا وجود یخ کردیا۔ وہ اپنے حواس پر قابو نہ رکھ سکی۔

ہوش آیا تو وہ ایک اسپتال کے کمرے میں موجود پشمینہ کی فکرمند نظروں کی زد میں تھی۔

Downloaded From Paksociety.com

قیمت Downloaded from Paksociety.com

''مجھے تم سے اس قدر حماقت کی توقع نہیں تھی روحی!''
''اور مجھے بھی ڈیڈ سے اس قدر سفاکی، سنگدلی کی توقع نہیں تھی...... انہوں نے شاداب کا مکمل خاندان ہی نابود کردیا۔'' وہ صدمے سے بولی۔
''اولاد جب اپنے بھلے بُرے کی تمیز کھو بیٹھے تو والدین کو ایسے فیصلے لینے ہی پڑتے ہیں۔ سرفراز نے بہت اچھا کیا۔''
روحی تاسف سے ماں کو دیکھنے لگی۔ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ ماں کچھ اور بھی کہنا چاہتی ہے لیکن مخمصے میں مبتلا ہے۔
''تم پریگننٹ ہو روحی! تمہیں اندازہ بھی ہے کہ اپنی مشکلات تم نے کس قدر بڑھا لی ہیں بہرحال میں نے ڈاکٹر سے بات کرلی ہے...... وہ ایک بھاری قیمت کے عوض تمہیں اس مصیبت سے نجات دلوا دے گا......''
''ہرگز نہیں! اگر ایسا ہوا تو میں کوئی بھی انتہائی قدم اٹھالوں گی۔'' وہ ہٹ دھرمی سے بولی۔ ''میں اس بچے کو دنیا میں ضرور لاؤں گی...... ہر قیمت پر لاؤں گی۔''
پشمینہ اس وقت منجدھار میں پھنس چکی تھی۔ شوہر کی جابرانہ طبیعت اور بیٹی کی ضد میں وہ بُری طرح پس رہی تھی۔
''ٹھیک ہے...... لیکن پھر تمہیں رزاق سے شادی پر کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہیے...... اگر سرفراز کو اس بچے کی بھنک بھی پڑی تو وہ اس کو کبھی زندہ نہیں رہنے دے گا۔''
ماں کی بات اس کی سمجھ میں آگئی اور دو ہفتوں بعد مذہبی قوانین کی دھجیاں اڑاتے ہوئے پشمینہ نے اپنی..... اس کی شادی رزاق چانڈیو سے ہوگئی۔ لیکن روحی کو آئندہ زندگی کی بابت ضروری نکات ذہن نشین کروانا نہ بھولی۔
''اس بچے کی پیدائش کا فیصلہ سراسر تمہاری ضد ہے روحی!''
''میں جانتی ہوں مام! اور مجھے اس فیصلے پر کوئی ملال نہیں۔''
''اپنی یہ ضد نبھانے کے لیے تمہیں بہت پاپڑ بیلنے ہوں گے۔ رزاق سے تمہاری شادی سرفراز نے کاروباری مفادات کے تحت کی ہے۔ اس کا حسب نسب اور مضبوط بیک گراؤنڈ اس کی کم روئی پر سبقت لے گیا ہے۔ تمہیں ہر ممکن طریقے سے اسے خوش اور مطمئن رکھنا ہے۔''
''شاداب کی نشانی محفوظ رکھنے کے لیے میں خلافِ طبع ہر کام کرنے کے لیے تیار ہوں۔''
''شادی کے بعد تمہیں صرف دو باتوں پر عمل کرنا ہے...... اس سے جذباتی محبت کا اظہار اور اطاعت۔ ان ہتھیاروں سے کسی کے بھی عقل و شعور کند کیے جا سکتے ہیں۔ اسے کبھی بھی اپنی ذات یا ماضی پر شک نہ ہونے دینا۔''
روحی کے دل و دماغ میں کچھ اور ہی منصوبے کلبلا رہے تھے۔ اس کے لیے اپنی ذات سے محبت کسی بھی دوسرے رشتے کی محبت سے بڑھ کر تھی۔ شاداب نے اس کے نسوانی پندار کو ٹھیس پہنچائی تو اس نے انتقاماً اس کے کردار کا بھرم پاش پاش کردیا۔
اور اب وہ سرفراز اور رزاق چانڈیو سے بھی ایک بھرپور انتقام لینا چاہتی تھی۔

☆☆☆

ارحم کی پیدائش کے بعد روحی کے علاوہ رزاق اور سرفراز بھی اپنے بزنس کے 'جانشین' کی آمد پر خوشی سے بے حال تھے۔
روحی نے ماں کی ہدایات پر من وعن عمل کیا۔ رزاق اس کی محبت و وارفتگی کا اسیر ہوتا چلا گیا۔ لیکن اسے شوہر کی قربت ہمیشہ بہت ناگوار گزرتی۔ وہ اپنے بیڈروم میں بے تحاشا پرفیوم چھڑک کے رکھتی اور یہ وہی خوشبو تھی جو شاداب خان بھی استعمال کرتا تھا۔
رزاق کو اپنے دام میں لانے کے بعد وہ اپنے انتقامی جذبے پر عمل کرنے کے لیے تیار ہوگئی۔ سرفراز ہارٹ اٹیک کے باعث زندگی کی دوڑ سے باہر ہوچکا تھا۔ اس کے انتقام کا نشانہ اب صرف شوہر کی ذات تھی۔ اسے مزید اولاد کی تمنا بھی بالکل نہ تھی۔
روحی نت نئے مردوں سے تعلقات قائم کرنے لگی۔ وہ ہر شخص میں شاداب خان ہی کو تلاش کرتی تھی۔ کسی کے بال اسے شاداب جیسے لگتے تو کسی کے قبائلی نقوش میں اس کی جھلک محسوس ہونے لگتی۔ اس نے شکار کا انتخاب ہمیشہ سوچ سمجھ کر ہی کیا تھا۔ وہ بلاوجہ اپنی زندگی اور عیش پرستی داؤ پر نہیں لگانا چاہتی تھی۔
وہ اس میدان کی شاطر کھلاڑی بن چکی تھی اور تاحال اپنی اسی روش پر قائم تھی۔ اس انتقامی زندگی میں اگر اس نے کچھ پایا تھا تو وہ 'ارحم' تھا۔
بیٹے کا خیال آتے ہی اس کا ذہنی تناؤ دور ہونے لگا اور احساسات معطر ہوگئے۔ وہ بے اختیار اس کے بیڈروم کی طرف بڑھ گئی۔

☆☆☆

اکیس سالہ ارحم چانڈیو زندگی سے بھرپور نوجوان تھا۔

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

موسیقی، گٹار، پیانو، انٹرنیٹ کے سوا اسے کچھ سوجھتا ہی نہیں تھا۔ اس کی شخصیت بھی بے حد شاندار تھی۔ پڑھائی میں وہ درمیانے درجے کا طالبعلم تھا اور اپنے طبقے کی کسی بھی علتوں میں مبتلا بھی۔ والدین کی جانب سے کسی بھی قسم کی روک ٹوک کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ بادی النظر میں اس کی زندگی بے حد پُرسکون اور 'مثالی' تھی۔

روحی دستک دے کر اس کے کمرے میں داخل ہوگئی۔ وہ بستر پر اوندھا لیٹا انگلش موسیقی سنتے ہوئے اپنے جدید ترین موبائل فون کے ساتھ مصروف تھا۔ اس کمرے میں فرنیچر، میوزک سسٹم، وائی فائی، لیپ ٹاپ سے لے کر آرائش وزیبائش کی سبھی چیزیں بے حد مہنگی اور جدید تھیں۔

''کیا بات ہے؟ آج یونیورسٹی نہیں گئے؟'' اس نے نرمی سے پوچھا۔

''نہیں! میرا موڈ نہیں آج۔'' وہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

''مزاج کیوں بگڑا ہے میرے شہزادے کا؟'' روحی نے اس کے بالوں کو سہلاتے ہوئے پوچھا۔

''مہک کے بارے میں کیا فیصلہ کیا ہے آپ دونوں نے؟'' وہ اکھڑے لہجے میں بولا۔

مہک اس کی دیرینہ دوست تھی۔ وہ عمر میں اس سے چند سال بڑی تھی اور ایک معروف ٹی وی چینل میں نچلے درجے کی ڈریس ڈیزائنر و میک اپ آرٹسٹ تھی۔ ان کی یہ دوستی اب شادی کی خواہش میں ڈھل چکی تھی لیکن رزاق کسی بھی صورت اس شادی کے لیے تیار نہیں تھا۔

''مجھے تو کوئی اعتراض نہیں...... لیکن تمہارے ڈیڈ سے تمہیں خود ہی بات کرنی ہوگی۔ ابھی وہ گھر پر ہی موجود ہیں۔ شام کو بات کر لینا۔'' روحی نے راہ سجھائی۔

باپ بیٹے میں سرد جنگ کئی روز سے جاری تھی۔ اور اب بھی ارحم کے تیور خطرناک ہی نظر آرہے تھے۔ ماں ہمیشہ اولاد اور والد کے درمیان پل کا کردار ادا کرتی ہے لیکن اس نے کبھی ایسی کوئی کوشش کی ہی نہیں تھی۔ رزاق سے ارحم کی کشیدگی اور غلط فہمیاں اسے بہت تسکین دیتی تھیں۔ شاداب خان کے بیٹے کے اسی کے ناحق قتل میں کسی نہ کسی حد تک ذمے دار شخص سے نارمل تعلقات روحی کبھی گوارا نہیں کر سکتی تھی۔

☆☆☆

دو گھنٹے بعد نیند سے بیداری اور لیمونیڈ پینے کے بعد رزاق کے ذہن سے الکحل کے اثرات کافی حد تک زائل ہو گئے۔ شدید بھوک سے اس کے معدے میں اینٹھن ہونے لگی۔ روحی سے کھانا لگوانے کا کہہ کر وہ ٹھنڈے پانی کے شاور تلے کھڑا ہوگیا۔ ٹھنڈک بھری پھوار اس کے اعصاب کو سکون دے رہی تھی۔

ڈائننگ ٹیبل پر ارحم اس سے پہلے ہی موجود تھا۔ اسے اپنا بیٹا ہمیشہ ہی اپنے لیے ایک دردِ سر محسوس ہوتا تھا۔ وہ ایک غیر مطمئن، مضطرب اور خود غرض نوجوان تھا جسے 'بوریت' کا مرض بھی لاحق تھا۔ اب بھی اس کے چہرے پر بیزاری اور بے چینی کے تاثرات نمایاں تھے۔

رزاق کی جہاندیدہ نظریں بھانپ چکی تھیں کہ وہ اپنے دل میں کوئی آتش فشاں دبائے بیٹھا ہے لیکن وہ اسے نظر انداز کیے کھانے میں مگن ہوگیا۔

''میں نے کچھ دن پہلے آپ سے ایک بات کی تھی۔'' ارحم نے کہا۔

''کون سی بات...... تم تو ہزاروں فرمائشیں کیا کرتے ہو...... میں کس کس کو یاد رکھوں؟''

''انجان مت بنیں...... آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ میں کیا پوچھ رہا ہوں؟'' وہ جھنجلا گیا۔

''آہاں...... چلو سمجھ لو میں نہیں جانتا۔'' رزاق اسے چٹکیوں میں اُڑا رہا تھا۔

''میں مہک سے شادی کی بات کر رہا ہوں۔'' اس نے چمچ زور سے میز پر پٹختے ہوئے کہا۔

''کون مہک؟ اچھا وہ لڑکی جو تم سے عمر میں کئی سال بڑی ہے...... بلکہ میں تو اسے لڑکی تسلیم ہی نہیں کرتا...... جو ایک تھرڈ کلاس میک اپ آرٹسٹ اور ڈریس ڈیزائنر ہے۔''

''آپ کسی سے ملے بغیر اس کے بارے میں کوئی رائے کیسے قائم کر سکتے ہیں؟''

''میں ایک بزنس مین ہوں مائی ڈیئر! کہیں بھی کوئی سودا کرنے سے پہلے مقابل کی 'مارکیٹ ویلیو' سب سے پہلے پرکھتا ہوں۔ مہک پنڈی کے ایک غیر معروف علاقے کی رہائشی تھی۔ اس کی والدہ نے اپنے ایک آشنا کی مدد سے پہلے شوہر کو قتل کیا اور پھر اسی سے شادی کر لی۔ اس وقت مہک کی عمر چودہ سال تھی۔ اگلے چار سال میں اس کے محلے کے اَن گنت لڑکوں کے ساتھ افیئرز کے علاوہ اپنے سوتیلے باپ سے بھی تعلقات رہے۔ اٹھارہ سال کی عمر میں کئی ابارشن کروانے کے بعد وہ شناختی کاغذات بنوا کر یہاں منتقل ہوگئی۔ مختلف تکنیکی اداروں میں دھکے کھاتے 'چھوٹی موٹی نوکریاں' اور بھانت بھانت کے مردوں سے تعلقات قائم کرتے کسی 'سفارش' کے طفیل ٹی وی چینل میں بھرتی ہوگئی۔

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

جسمانی نقدی ختم ہونے سے پہلے اپنی آئندہ زندگی پُرسکون بنانے کے لیے اسے ارحم جانڈیو کی صورت میں ایک سیڑھی میسر آگئی ہے۔ اب بھی اگر تمہیں لگتا ہے کہ میں اس انٹر پاس، متنازعہ کردار کی مالک عورت سے شادی کے لیے رضا مندی دے دوں گا تو تم سے بڑا احمق واقعی کوئی نہ ہوگا...... اور اگر کورٹ میرج جیسا گھساپٹا خیال ذہن میں چل رہا ہو تو میں مہک کو قتل کروا دوں گا۔'' وہ سفاکی سے کہتا چلا گیا۔

ارحم اور روحی ششدر بیٹھے رہ گئے۔

☆☆☆

قبرستان میں آج بہت رش تھا۔ گل فروشوں کے اسٹالز پر بھی کئی لوگ پھول خریدنے میں مگن تھے۔ اس نے اپنی بائیک ایک جانب کھڑی کی اور شبیر کے پاس جا کھڑا ہوا۔

''میں آپ ہی کا منتظر تھا صاحب جی!'' وہ فوری اس کی جانب متوجہ ہوا۔

''میں ایک ڈیڑھ ہفتے کے لیے شہر سے باہر جا رہا ہوں۔ تم اس کی قبر پر روزانہ پھول ڈال دیا کرنا۔'' اس نے پھولوں کی چند لڑیاں خریدنے کے بعد زائد پیسے دیتے ہوئے کہا۔

''آپ بے فکر ہو جائیں جی! میں قبر کی صفائی ستھرائی کا خیال بھی رکھوں گا۔'' شبیر کی یقین دہانی پر وہ خاموشی سے قبرستان میں داخل ہو گیا۔

اندرونی ماحول کا سناٹا، درختوں پر بیٹھے پرندے، تا حدِ نگاہ پھیلی قبریں، مختلف جذبات و احساسات میں کندہ کتبے اور قبروں کے آس پاس رینگتے کیڑے مکوڑے اس کی وحشت میں مزید اضافہ کیا کرتے۔

فاتحہ خوانی کے دوران اس کی آنکھوں میں ایک بار پھر نمی پیدا ہونے لگی تاہم آج اس نمی میں بے بسی اور احساسِ کرب کے بجائے ایک عزم تھا۔ اس نے گھٹنوں کے بل بیٹھ کر قبر کی مٹی اٹھائی اور جیب میں موجود ایک کاغذ میں اچھی طرح لپیٹ لی۔ کتبے پر لکھے نام کو محبت اور آنسوؤں سے بوسہ دے کر وہ باہر آگیا۔

اب اس کی منزل صادق خان کا گھر تھا۔ صادق خان غیر قانونی اسلحہ کا بیوپاری تھا اور شنید یہی تھی کہ اس کے پاس دنیا میں موجود ہر قسم کا اسلحہ موجود ہوتا ہے۔ وہ راول ٹاؤن کے ایک فلیٹ میں رہتا تھا مگر آج کل کافی محدود ہو چکا تھا۔ ساٹھ کے پیٹے میں موجود صادق بہت گھاگ اور کینہ پرور شخص تھا۔ اس کے سر کے بال تو ایک عرصہ ہوئے داغِ مفارقت دے چکے تھے تاہم اس نے اپنی داڑھی کی افزائش بہت اہتمام سے کر رکھی تھی۔ کسی بھی قسم کے خضاب کے بجائے وہ اسے سرخ مہندی سے رنگتا تھا۔

''مجھے کچھ اسلحہ درکار ہے خان! لیکن شرط یہی ہے کہ ایک نمبری چیز ہو۔'' اس نے لگی لپٹی رکھے بغیر کہا۔

''خو! وہ کس لیے؟'' صادق خان نے حیرانی سے منہ کھولا۔

''آم کھاؤ خان! پیڑ کیوں گنتے ہو؟''

''آج کل ام لوگوں پہ بہت عتاب آیا ہوا ہے یارا! اماری رہائش گاہیں، کاروبار اور نقل و حرکت پر خصوصی نظر رکھی جاتی ہے۔ ام تو سوچتا ہے یہ کام دھندا ختم کر کے واپس اپنے وطن لوٹ جائے۔'' صادق خان اپنا دکھڑا رونے لگا۔ ''ام نے گھر میں اسلحہ رکھنا بھی چھوڑ دیا ہے۔''

''مجھے گولی دینے کی کوشش نہ کرو خان! چور چوری سے تو جاتا ہے ہیرا پھیری سے نہیں......'' وہ تلخی سے بولا۔ ''میں دو منٹ میں یہاں تمہارے سامنے اسی فلیٹ سے اسلحہ کا انبار نکال سکتا ہوں۔''

صادق خان منہ بناتا اٹھا اور فلش کی خالی ٹینکی سے چند غیر ملکی ساخت کی گنز نکال لایا۔ اسلحہ دیکھ کر اس کی آنکھیں جوش سے چمکنے لگیں۔

''میرا ان سے تعارف تو کرواؤ خان۔'' اس نے تین گنز الگ کرتے ہوئے کہا۔

''یہ بریٹا پسٹل ہے...... یہ اعشاریہ 38 اور یہ میگنم اعشاریہ 357۔ اب بتاؤ تمہیں کونسا خریدنا ہے؟''

وہ کچھ دیر سوچتی ہوئی نظروں سے تینوں گنز دیکھتا رہا اور پھر میگنم الگ کرتے ہوئے بولا۔ ''اس کا حدود اربعہ کیا ہے؟''

''یہ بہت مہنگی گن ہے...... کوئی چھوٹا دیکھ لو۔''

''گن جتنی ہی مہنگی اور جدید ہو...... شکار پر اتنی ہی دہشت قائم ہوتی ہے۔''

''خو! تم بہت بدل گیا ہے۔'' صادق خان حیران ہوا۔ ''کس کو شکار کرنا ہے تم نے؟''

میرے گھر کے کاکروچز اور چھپکلیوں کو۔'' وہ سکون سے بولا اور پیسے اس کے سامنے رکھ دیے۔

''ایجنسیوں نے بہت سختی کر رکھی ہے یارا...... اگر کسی لفڑے میں پڑ گئے تو ام تمہیں پہچاننے سے بھی انکار کر دے گا۔''

''فکر مت کرو خان! میں نے کہیں خودکش حملہ نہیں

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

کرنا۔ تم بھی ویسے بہت بدل گئے ہو۔ اتنے بزدل تو نہیں ہوا کرتے تھے۔''

وہ جوابی طنز کرتا اس کے فلیٹ کی سیڑھیاں اُتر گیا۔ آج اسے اپنا وجود بہت توانا محسوس ہو رہا تھا۔

☆☆☆

دھوپ میں نہائی ہر شے بہت نکھری نکھری تھی۔

ہنڈا سوک اس ہوٹل کی زیرِ زمین پارکنگ میں رکی اور عبایہ و اسکارف میں ملبوس روحی باوقار انداز میں اترتی اندر بڑھ گئی۔ اپنی 'خفیہ ملاقاتوں' کے لیے وہ ہمیشہ یہی لبادہ استعمال کرتی تھی۔ ایک طویل مدت سے یہ گیٹ اپ اس کے لیے انتہائی کامیاب آڑ ثابت ہو رہا تھا۔ مختلف رنگوں کے عبایہ اور اسکارف وہ ہمیشہ اپنی گاڑی کے ایک خفیہ خانے میں رکھتی تھی۔

''یس میم!'' ریسپشن پر موجود چست لباس میں ملبوس ایک لڑکی نے خوش اخلاقی سے پوچھا۔

''روم نمبر 283۔''

وہ عمومی طور پر اپنی صوابدید پر کسی نہ کسی ہوٹل میں کمرا بُک کرواتی تھی۔ لیکن موجودہ حالات کے پیشِ نظر اسے اپنا معمول تبدیل کرنا پڑا۔

''تھرڈ فلور پر ہے میم! میں کسی ویٹر کو آپ کے ساتھ بھیج دیتی ہوں۔''

''نو تھینکس!'' اس نے متانت سے کہا اور لفٹ کی جانب بڑھ گئی۔

مطلوبہ کمرے تک پہنچ کر روحی نے احتیاطاً راہداری میں ادھر اُدھر جھانکا۔ وہ حتی الامکان کسی بھی قسم کی بداحتیاطی سے گریز کرتی تھی۔ اس نے ہلکی سی دستک دی۔ دروازہ فوراً کھل گیا۔

'اسٹائل اینڈ ایلی گینس' کا منیجر رفیق احمد بہت پُرشوق نگاہوں سے اس کا منتظر تھا۔

کمرے کا فرنیچر قدرے سستا تھا۔ ایک ڈبل بیڈ کے علاوہ وہاں صوفہ اور شیشے کی تپائی موجود تھی۔ ایک طویل معانقہ کے بعد وہ صوفے پر بیٹھی اور سنجیدگی سے کہنے لگی۔

''کل بوتیک پر کون آیا تھا؟'' وہ رزاق کے بیان کی تصدیق کرنا چاہتی تھی۔

''ایک تھرڈ کلاس حلیے والا شخص آیا تھا۔ باس اسے لے کر ریسٹ روم میں چلے گئے اور اس کے جانے کے بعد کتنی ہی دیر ڈرنک کرتے رہے۔''

''اسے مجھ پر شک ہو گیا ہے رفیق! اور یہ میرے لیے بہت گمبھیر صورتِ حال ہے۔ اس نے صرف وقتی طور پر میری باتوں کا یقین کیا ہے۔ لیکن وہ کبھی بھی نچلا نہیں بیٹھے گا۔''

''میرے لائق کوئی خدمت ہو تو بتاؤ۔''

''تم ریسٹ روم بگ نہیں کروا سکتے کیا؟'' وہ اضطراب سے بولی۔

''بہت مشکل ہے روحی! اس کا تمام تر کنٹرول سیٹھ رزاق کے پاس ہے۔ اس نے اپنا ریسٹ روم ایک قلعہ بنا رکھا ہے۔''

''ہونہہ! جانتی ہوں میں کہ وہ اس کا عشرت کدہ ہے۔'' اس نے نفرت سے سر جھٹکا۔

''اب میرے لیے کیا حکم ہے جناب!'' رفیق اسے نیم باز آنکھوں سے دیکھتے صوفے پر ہی اس کے مزید قریب ہوا۔

''تم نے فوری طور پر دو کام کرنے ہیں...... فوری طور پر اظہر کی ریکی شروع کرواؤ...... اس کی ہر نقل و حرکت کی رپورٹ مجھے ملنی چاہیے۔''

''ہو جائے گا...... اور دوسرا کام؟''

''آج کل رزاق کی نظرِ کرم کس پر ہے؟''

''سبینہ پر۔''

''تم کسی بھی طرح اس کے توسط ایک سپائی کیمرا ریسٹ روم میں پہنچا دو۔''

''یہ کام تم خود بھی تو کر سکتی ہو۔'' وہ اس کا اسکارف اتارتے بولا۔

''رزاق مجھے کبھی اس جگہ نہیں لے کر جائے گا...... مائنڈ اٹ۔ میرے باپ کی کرم فرمائی نے مجھے مجبور کر رکھا ہے کہ کاروباری معاملات میں اس سے دور رہوں۔ رزاق کی خاندانی جہالت بھی یہی سوچ رکھتی ہے۔''

''ٹھیک ہے...... یہ بھی ہو جائے گا۔''

''ان معاملات کو ہلکا مت لینا رفیق! کبھی معمولی سا ایک سوراخ بھی دیوہیکل جہازوں کو غرقِ آب کر دیتا ہے۔''

''کہہ رہا ہوں ناں! میں سب سنبھال لوں گا۔ بے فکر ہو جاؤ۔'' رفیق اس کے تفکرات سے اوبنے لگا۔

اسی پل دروازے پر ایک زوردار دستک نے ان دونوں کو چونکا دیا۔ 'ڈوناٹ ڈسٹرب' کے ٹیگ کے بعد یہ دستک کسی انہونی کا اشارہ تھی۔ ان دونوں ہی کے چہرے فق ہو گئے۔

☆☆☆

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

اسلحہ کی خریداری کے بعد وہ بہت پُراعتماد تھا۔ اس نے متوقع مہم کے لیے اپنے ذہن میں ایک مکمل خاکہ ترتیب دے لیا۔ وقت کی اس کایا پلٹ پر وہ خود بھی بہت حیران تھا۔ اس نے زندگی میں کبھی کسی چیونٹی کو دانستہ تکلیف نہ پہنچائی تھی۔ لیکن آج وہ ایک جیتے جاگتے انسان کو قتل کرنے جارہا تھا۔

اس نے سیاہ لباس پہن رکھا تھا اور اپنی جیکٹ کے نیچے ایک مخصوص بیلٹ میں 'سائلنسر لگی میگنم اعشاریہ 357' اڑس لی۔ ربر سول کے جوتے پہنتے ہوئے اس کی آنکھوں میں لہورنگ چادر تن رہی تھی۔

''بس چند گھنٹے اور اس دھرتی پر بوجھ بنے رہو...... تمہارا یومِ حساب آج ہی آئے گا۔'' اس نے خود کلامی کی۔

☆☆☆

دستک کی آواز تیز تر ہوتی جارہی تھی۔

رفیق نے روحی کو ٹوائلٹ میں جانے کا اشارہ کیا اور اپنے تاثرات پر قابو پاتا سختی سے بولا۔ ''ہوازدیئر؟''

''سر! میری بات سن لیجیے جلدی۔ ورنہ بہت بڑی مصیبت میں پھنس جائیں گے آپ دونوں۔'' ایک دبی ہوئی آواز آئی۔

رفیق نے وہ آواز پہچان لی تھی۔ یہ اس کے با اعتماد دوست کا بھائی تھا جس کے توسط اس نے یہاں کمرا حاصل کیا تھا۔ وہ اس ہوٹل میں ہیڈ ویٹر تھا۔

''ہاں بولو نوید! کیا مسئلہ ہے؟'' رفیق اسے اندر لے آیا۔

''آپ اور میڈم فوری طور پر یہاں سے روانہ ہو جائیے۔ نیچے ریسپشن پر ایک شخص آپ کے بارے میں انکوائری کررہا ہے۔ وہ بضد ہے کہ میڈم یہیں اسی ہوٹل میں موجود ہیں۔''

''کک...... کون شخص؟'' روحی کمرے میں آگئی۔

نوید نے بلا کم و کاست اس کا حلیہ بیان کردیا۔

''اوگاڈ! یہ مصیبت یہاں کیسے آن ٹپکی؟'' رفیق، اظہر کا حلیہ سن کر جھنجلا گیا۔

''کیا تمہارے ہوٹل کی یہی سروس ہے کہ وہ اپنے مہمانوں کی پرائیویسی کا خیال تک نہیں رکھ سکتے؟'' روحی تیزی سے بولی۔

''میڈم! پرائیویسی کا خیال رکھا جاتا ہے اسی لیے تو وہ آپ تک پہنچ نہیں پایا...... ورنہ وہ تو اب میڈیا اور پولیس کو بلوانے کی دھمکی دے رہا ہے۔''

نوید کی بات سن کر وہ دونوں مزید بوکھلا گئے۔

''مجھے کسی بھی طرح یہاں سے نکلنے کے لیے محفوظ رستہ فراہم کرو۔ رفیق اپنی موجودگی کا کوئی نہ کوئی جواز پیش کرسکتا ہے لیکن میرا یہاں سے نکلنا بہت ضروری ہے۔''

''آپ اپنی گاڑی کی چابیاں مجھے دیجیے! میں گاڑی پارکنگ سے نکال کر عقبی سڑک پر لے جاتا ہوں۔ گراؤنڈ فلور کے کچن سے ایک دروازہ اسی سڑک پر کھلتا ہے۔ آپ وہاں سے بحفاظت نکل سکتی ہیں۔ اگر اسٹاف آپ کو روکنے کی کوشش کرے تو یہ کارڈ انہیں دکھا دیجیے گا۔'' نوید نے اپنا سروس بیج اسے تھما دیا۔

روحی کے لیے ایک ایک لمحہ بہت بھاری تھا۔ اس کے پیٹ میں بگولے اٹھ رہے تھے۔ اگلے پانچ منٹ بعد جب وہ اپنی گاڑی تک پہنچی تو یوں ہانپ رہی تھی جیسے میراتھن دوڑ میں شریک رہی ہو۔ اس نے نوید کو سروس بیج کے ساتھ نوٹوں کی ایک موٹی گڈی تھمائی اور گاڑی بھگا لے گئی۔

ذہن پُرسکون رکھنے کے لیے اس نے ہلکی موسیقی لگائی اور گاڑی کی رفتار قدرے آہستہ کردی۔ کچھ دیر قبل درپیش صورتِ حال نے اس کے اعصاب میں توڑ پھوڑ مچادی تھی۔ یکایک اس کی نظر سڑک کے کنارے بائیک کے ساتھ اُلجھے ایک نوجوان پر پڑی۔ اس نے بے اختیار بریک لگایا اور گاڑی چرچراہٹ کی شدید آواز سے رک گئی۔

☆☆☆

سیٹھ رزاق ایک کاروباری میٹنگ میں مصروف تھا۔ 'اسٹائل اینڈ ایلی گینس' میں ایک خصوصی میٹنگ روم بھی موجود تھا جہاں وہ اپنے کاروباری حلیفوں سے پُرسکون اور آرام دہ ماحول میں معاملات طے کرلیا کرتا۔

میٹنگ کافی طویل تھی۔ فراغت ملتے ہی اس نے اپنا موبائل فون تھام لیا۔ فون کی گھنٹی خاموش تھی اس لیے اظہر کی درجنوں کالز موجود تھیں۔ رزاق کے ماتھے کے بل گہرے ہو گئے۔ اسی لمحہ فون دوبارہ بجنے لگا۔ اس نے سبز بٹن انگوٹھے کی پشت سے دبایا اور خشونت زدگی سے بولا۔

''کیا مسئلہ ہے تمہیں؟ کیوں بار بار فون کررہے ہو؟''

''رفیق احمد کدھر ہے؟''

''دو دن کی چھٹی لے کر اپنی والدہ کی عیادت کے لیے گیا ہے۔''

''بہت خوب! مجھے تو علم ہی نہ تھا کہ اس کی والدہ روحی صاحبہ ہیں۔'' اس نے تمسخر اڑایا۔

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

''کیا بکواس کر رہے ہو؟'' رزاق دہاڑا۔

''گارمنٹس انڈسٹری کو اپنی انگلیوں پر نچانے والا سیٹھ رزاق اپنی ناک تلے کھیلے جانے والے کھیل سے بے خبر ہے۔ کہیں اس بے خبری کی کوئی بڑی قیمت چکانی نہ پڑ جائے۔''

''تم شاید اس وقت نشے میں ہو۔''

رفیق احمد ہوٹل 'ہی اینڈ شی' میں موجود ہے اور اس کی شہرت کی وجہ تم خود بھی جانتے ہی ہو گے۔ تمہاری بیوی بہر حال ایک بار پھر میری گرفت سے نکل گئی ہے۔ پارکنگ میں موجود رفیق کی بائیک کی تصاویر واٹس ایپ پر بھیج دیتا ہوں۔ اب بھی یقین نہ آئے تو یقیناً تم سے بڑا احمق کوئی نہ ہو گا۔'' اظہر نے فون بند کر دیا۔

رزاق کو اپنے تمام شکوک حقیقت کا روپ دھارتے محسوس ہونے لگے۔ تصاویر دیکھنے کے بعد وہ اپنے ریسٹ روم میں پہنچا اور جام بنا کر آتشیں سیال اپنے حلق میں انڈیلنے لگا۔ اس کی کنپٹیوں میں خون ٹھوکریں مار رہا تھا۔ اپنے ذہن میں ایک منصوبہ ترتیب دیتے اس نے رفیق کا نمبر ملا لیا۔

''تمہاری والدہ کی طبیعت کیسی ہے اب؟'' اس نے چھوٹتے ہی سوال کیا۔

''وہ اسپتال میں ہیں اور میں بھی انہی کے پاس موجود ہوں باس!'' رفیق نے فراٹے سے جھوٹ بولا۔

''ٹھیک ہے..... تم چاہو تو ایک دو روز مزید رک جاؤ ان کے پاس۔ یہاں میں سب سنبھال لوں گا۔'' رزاق نے فراخدلی سے کہا۔

''تھینک یُو باس! میں جلد ہی رپورٹ کروں گا۔'' اس کے لہجے میں بے یقینی اور خوشی کی ملی جلی کیفیت تھی۔

رزاق کے لیے اپنا غصہ ضبط کرنا محال ہونے لگا۔ اس نے ہونٹ بھینچتے ہوئے روحی کا نمبر ملا لیا۔ لیکن کئی بار کوشش کے باوجود اس نے فون نہ اٹھایا۔ رزاق نے اسے ایک مختصر پیغام لکھ کر بھیج دیا۔ اس کے لیے ایک ایک پل قیامت ثابت ہو رہا تھا۔

☆☆☆

ٹائر چرچرانے کی سمع خراش آواز سے بائیک میں الجھا وہ شخص بے ساختہ چونکا تھا۔

وہ سیاہ لباس میں ملبوس چوبیس پچیس سالہ لڑکا تھا۔ صاف رنگت، وجیہہ نقوش اور چہرے پر ہلکی بڑھی ہوئی شیو تھی۔ خاموش اور ہلکی بھوری آنکھوں میں بہت اسرار پوشیدہ نظر آتے تھے۔ اس کی پیشانی پر کسی پرانی چوٹ کا نشان تھا لیکن بدنما محسوس نہیں ہوتا تھا۔ اس نے سائڈ مانگ نکال کر بال بنا رکھے تھے۔ اس کے قد و قامت اور انداز میں اسّی فیصد شاداب خان کی مشابہت تھی۔

روحی اسے بغور دیکھتی ایک بار پھر اپنے ماضی میں پہنچ گئی۔ وہ گاڑی سے باہر نکلی اور اسے مخاطب ہو کر بولی۔

''میں تمہاری کچھ مدد کر سکتی ہوں کیا؟''

''ہاں بالکل کر سکتی ہیں۔''

''شیور! مجھے خوشی ہوگی۔''

''اپنے کام سے کام رکھیے۔ یہی میری مدد ہوگی۔''

اس لڑکے کا لہجہ اور تیور بھی شاداب جیسے ہی تھے۔

روحی کو اس کی آنکھوں میں اپنے لیے نفرت اور حقارت محسوس ہو رہی تھی۔

''تمہیں لیڈیز سے بات کرنے کی تمیز نہیں ہے کیا؟'' وہ بل کھا کر بولی۔

''نہیں! مجھے بالکل تمیز نہیں ہے..... اپنا رستہ ناپیے محترمہ!''

وہ بائیک کی مرمت سے فارغ ہو کر ہاتھ جھاڑنے لگا۔ وہ بہت عجلت میں دکھائی دے رہا تھا۔

روحی کو شدید اشتعال آیا لیکن وہ بہت صبر سے کام لینا چاہتی تھی۔ اس لڑکے کو دیکھ کر اس کی ضد، انا اور جذبۂ تسخیر ایک بار پھر پوری قوت سے ابھرے تھے۔

''تمہارا نام کیا ہے ویسے؟'' اس نے ایک بار پھر اسے مخاطب کیا مگر وہ نظرانداز کر کے بائیک پر سوار ہوا اور آگے بڑھ گیا۔ روحی تلملا کر رہ گئی۔ یہ توہین اور ذلت اس کے لیے ناقابلِ برداشت تھی۔

گاڑی میں بیٹھتے ہی اس کی توجہ موبائل کی طرف مبذول ہوگئی۔ رزاق نے ایک میسج میں اسے اطلاع دی تھی کہ وہ کچھ نئے گارمنٹس کی ڈلیوری لینے کے لیے رات گئے تک وہیں رکے گا۔

''جہنم میں جاؤ'' اس نے سر جھٹکا۔

اسی دوران رفیق کی کال بھی موصول ہوئی۔ وہ بہت خوش محسوس ہو رہا تھا۔

''باس نے مجھے دو دن کی مزید چھٹی دے دی ہے۔ وہ آج رات کافی مصروف رہیں گے۔ ملاقات کے لیے کسی نئی جگہ کا بندوبست کر لیتے ہیں۔''

''انتہائی احمق اور کم عقل انسان ہو تم۔ وہ جال پھیلا رہا ہے اور تم خود اس میں پھنسنے کے درپے ہو۔'' وہ غرائی۔

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

''تمہاری انہی جلد بازیوں اور احمقانہ حرکتوں کے باعث آج میں اس مصیبت میں پھنسی ہوں۔'' اس نے غصے سے موبائل آف کردیا۔

رفیق سے اس کے تعلقات چند ماہ ہی پرانے تھے۔ باس کی خوبصورت بیوی کو اپنی جانب مائل بہ کرم دیکھ کر وہ اپنے حواس پر قابو رکھنے میں ناکام رہا تھا۔ کاروباری معاملات میں معاملہ فہمی، فراست اور حاضر دماغی کا مظاہرہ کرنے والا یہ شخص اپنی جذباتیت کی وجہ سے اس کے گلے میں ہڈی کی طرح اٹک گیا تھا جسے اگلتے بنتی تھی نہ ہی نگلتے۔

روحی اب کسی نئے شکار کی تلاش کے بعد اس سے دامن چھڑوانے کا مکمل تہیہ کرچکی تھی۔ اپنے نئے ساتھی کا خیال آتے ہی اس کے تصور میں وہی نوجوان آگیا۔

''دیکھ لوں گی تمہیں بھی میں۔'' وہ بڑبڑائی۔

☆☆☆

سیٹھ رزاق کی حالت کسی بسمل کی سی تھی۔ اس نے ایک جال پھیلا دیا تھا اور اب اسے پنچھیوں کی آمد کا انتظار تھا۔ اس کے دل و دماغ میں انگارے سلگنے لگے۔ بیوی کی بے وفائی کا تصور اسے اب بھی باطل محسوس ہورہا تھا۔

رزاق چانڈیو اندرونِ سندھ کا رہائشی تھا۔ وہ ایک روایتی زمیندار مراد چانڈیو کا بیٹا تھا۔ خاندانی روایات کے مطابق مراد نے کئی شادیاں کیں۔ اس کا اپنا ذاتی حرم بھی موجود تھا جس میں گوٹھ کی ہر خوبصورت اور جوان عورت کے لیے قیام ضروری تھا۔ اب یہ قیام قلیل المدت ہوتا یا کثیر المدت، اس بات کا انحصار مراد کی ذاتی پسند پر منحصر ہوا کرتا۔ زمینداری اور حکمرانی رزاق کو ورثے میں ملی تھی۔

مراد چانڈیو ایک اہم سیاسی پارٹی کا مستعد کارکن بھی تھا۔ اس پارٹی کے آشیرباد سے اس نے ہر ممکن ذاتی مفادات حاصل کیے۔ اظہر بھی سیاسی لیڈروں کے ساتھ ہی نتھی ہوکر رہ گیا۔ غنڈہ گردی اور قانون شکنی اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔

چودھری سرفراز مراد کا قریبی دوست تھا۔ مراد کی دوررس نظریں اس سے فوائد حاصل کرنے پر مرکوز تھیں۔ وہ دلی طور پر روحی اور رزاق کی شادی کا خواہشمند تھا۔ شومیٔ قسمت اس کے سوال کرنے سے قبل ہی سرفراز نے خود اس رشتے کی بات چھیڑ دی۔ مراد بھی اب مقامی سیاست سے ہٹ کر اپنے قدم دارالحکومت میں جمانا چاہتا تھا۔ اس کے علاوہ سرفراز کی ڈھیروں جائداد کے وارث رزاق اور اس کی اولاد بن جاتے تو وارے نیارے ہوجاتے۔

مراد، رزاق کو ساتھ لیے چودھری ہاؤس پہنچ گیا اور یہیں رزاق نے روحی کو پہلی مرتبہ دیکھا۔ زرد رنگت، نڈھال وجود اور ویران آنکھیں عجب تاثر دیتی تھیں۔ لیکن رزاق اس کی دلکشی اور سحر سے بچ نہ سکا۔ اداس حسن ہمیشہ ہی سے مرد کے لیے بہت کشش کا حامل رہا ہے۔ دریافت کا پرندہ اس اداسی اور خاموشی کے بھید تسخیر کرنے کے لیے اپنے نفع و نقصان سے بھی بے خبر ہوجایا کرتا ہے۔ تاہم مراد کی جہاندیدہ نظریں غالباً کچھ بھانپ گئی تھیں اس لیے سرفراز سے کہے بغیر نہ رہ سکا

''ارے سائیں! یہ اپنی بٹیا کی صحت تو ٹھیک ٹھاک ہے ناں؟ اسے کچھ کھلاتے پلاتے نہیں ہو کیا؟''

''ارے نہیں مراد صاحب! ایسی کوئی بات نہیں۔ بس یہ جولڑکی ذات ہوتی ہیں ناں...... اپنے والدین اور ان کے آنگن سے اتنی محبت بڑھالیتی ہیں کہ شادی کا نام سنتے ہی نڈھال ہونے لگتی ہیں۔ روحی کا بھی یہی حال ہے۔ میری صحت بھی اب کچھ ٹھیک نہیں رہتی۔ اس لیے اپنی زندگی میں ہی اس کا فرض پورا کردینا چاہتا ہوں۔''

اس وقت تو بات آئی گئی ہوگئی لیکن تنہائی میسر آتے ہی وہ بیٹے سے بھی اپنے خدشات کا اظہار کیے بغیر نہ رہ سکا۔

''سرفراز کی چھوکری اور تیری عمر میں دس سال کا فرق ہے۔ پہلے تو میں نے اسے دیکھا نہیں تھا لیکن اب لگتا ہے کہ اندرونِ خانہ کوئی اور ہی بات ہے۔ وہ اس کی شادی میں بہت عجلت برت رہا ہے۔''

''عجلت کو چھوڑیے بابا سائیں! ہمیں کیا لینا دینا ان کے گھریلو مسائل سے؟ ہمیں تو صرف یہاں اپنے پاؤں جمانے ہیں۔''

مراد بیٹے کی مرضی بھانپ گیا اور اس کا کندھا تھپکتے بولا۔ ''اس چھوکری کو اپنے دام میں رکھنا ہمیشہ۔ اور اپنے کاروباری معاملات سے دور بھی۔ عورت کی اصل جگہ گھرداری ہوتی ہے۔ اسے اپنے معاملات میں دخل اندازی کا موقع دینے والا مرد ہمیشہ سخت نقصان اٹھاتا ہے۔''

شادی کے بعد منصوبے کے مطابق اسے آئندہ چار سے پانچ سال میں یہاں اپنے تعلقات کا دائرہ وسیع کرتے ہوئے ایک سیاسی پارٹی کی بنیاد رکھنی تھی۔ روحی نے اپنے رویے سے مراد اور رزاق کے سبھی خدشات باطل ثابت کردیے تھے۔ بیٹے کی پیدائش کے بعد وہ دھیرے دھیرے اہم مقامی عہدیداران میں اپنا مقام بنانے لگا۔

سیاسی پارٹی کے لیے کاغذی کارروائی کا آغاز ہونے

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

سے قبل ہی ان کے ارمانوں کا محل زمین بوس ہوگیا۔ ملک میں جمہوریت کا خاتمہ ہوا اور سیاسی سرگرمیاں ایک جرم بن گئیں۔ اسی عرصہ میں رزاق نے بوتیک کی بنیاد رکھی۔ وہ روحی کی محبت کا قدرداں تھا لیکن 'بسیار خوری' اس کی رگوں میں سرایت کر چکی تھی۔ اس لیے یہ کافر منہ سے لگی چھٹتی ہی نہ تھی۔

سیاسی تبدیلی کی زد میں آکر اظہر کے ستارے بھی بُری طرح گردش میں آئے۔ اس کی غنڈہ گردی و دیگر جرائم اسے زیرِ عتاب لے آئے۔ جیل یاترا کے بعد تو وہ سکہ بند مجرم بن چکا تھا۔ مختلف جلسوں میں توڑ پھوڑ اور بدامنی کے لیے اس کی خدمات خصوصی طور پر حاصل کی جاتی تھیں۔

رزاق کی محنت رنگ لائی۔ اس کے بوتیک کی گڈوِل شاندار تھی۔ وہ اس کی مختلف شاخیں دوسرے شہروں میں بھی کھولنا چاہتا تھا۔ مراد چانڈیو کی وفات کے بعد سیاست میں حصہ لینے کا جنون دھیما ہوگیا تھا۔ مگر اب ملک کا سیاسی منظر نامہ دیکھتے ہوئے اس کے دل میں دبی برسوں پرانی تمنا ایک بار پھر سر اٹھانے لگی۔ وہ اب ذاتی پارٹی قائم کرنے کے لیے سرگرم ہوگیا۔

شادی کے بائیس سال گزرنے کے بعد بھی اسے روحی کے رویے میں کبھی کوئی کھوٹ محسوس نہیں ہوا تھا۔ مگر بالآخر اس کا چہرہ بے نقاب ہو چکا تھا۔

وہ سارا دن ریسٹ روم ہی سے بوتیک کے معاملات کی دیکھ بھال کرتا رہا۔

رات ڈھلے بوتیک کے ملازمین گھر روانہ ہونے لگے لیکن وہ ہنوز مے نوشی میں مشغول رہا۔ اسے علم ہی نہ ہو پایا کہ آج ان کی روانگی میں مخصوص ترتیب کا فقدان تھا۔

ریسٹ روم کے دروازے پر دستک نے اسے اپنے خیالات سے چونکا دیا۔ سینہ کی آمد کا وقت ہوگیا تھا۔ اس نے ملازمین کے لیے مخصوص لباس کے بجائے ایک مختصر اور ہوشربا لباس پہن رکھا تھا۔

رزاق کے سامنے وہسکی کی بوتل خالی ہو چکی تھی۔ اس نے مخمور نگاہوں سے سینہ کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''میرے لیے ڈرنک بناؤ سوئٹی! اور تمہیں بھی میرا ساتھ دینا ہوگا۔''

''شیور سر!'' وہ اٹھلاتی ہوئی کاؤنٹر تک گئی اور جام بنانے لگی۔ ''آج مجھے رفیق نے فون کیا تھا سر! وہ مجھ سے کوئی ذاتی کام لینا چاہتا ہے۔'' سینہ نے بتایا۔

''اس رذیل انسان پر مکمل نظر رکھو۔ میں بھی اس کے خلاف کچھ ثبوت چاہتا ہوں۔ مجھے شک ہے کہ وہ کچھ مالی بے ضابطگیوں میں ملوث ہے۔'' اس نے بات بنائی۔

''یس باس!'' سینہ اضافی آمدنی کے تصور سے پُر جوش ہونے لگی۔

نصف گھنٹے بعد وہ ریسٹ روم سے روانہ ہوئی تو اس کے بیگ میں ایک موٹی رقم کا اضافہ ہو چکا تھا۔ اپنی ان خفیہ ملاقاتوں کے دوران رزاق سیکیورٹی گارڈز کو چھٹی دے کر سی ٹی وی کیمرے بھی آف کر دیا کرتا تھا۔ سینہ کی روانگی کے پانچ منٹ بعد ایک بار پھر دستک نے اسے چونکا دیا۔

''الو کی پٹھی! پھر کوئی فرمائش کرنے آئی ہوگی۔'' اس نے بڑبڑاتے ہوئے دروازہ کھولا۔

سیاہ لباس اور ماسک میں ملبوس ایک اسلحہ بردار کو دیکھ کر اس کا نشہ ہرن ہوگیا۔

☆☆☆

کوئی بھی کھلاڑی محنت اور لگن کے بل بوتے پر خواہ کتنی ہی طویل اننگز کھیلے' ایک لمحہ ایسا ضرور آتا ہے جب اس کی قسمت دھوکا دے جاتی ہے اور وہ زندگی کی کریز پر اپنی ہی کسی غلطی سے اس اننگز کا خاتمہ کر بیٹھتا ہے۔

روحی کی حالت بھی ایسے ہی ایک کھلاڑی کی سی تھی۔ وہ اس وقت بے چینی سے اپنے کمرے میں چکر کاٹ رہی تھی۔ شاداب خان کو پسند کرنے کی سزا بہت طویل ثابت ہوئی تھی۔ سرفراز نے اس کی شادی رزاق سے کرتے ہوئے اسے اپنی وصیت سے بے دست و پا کر دیا تھا۔ وہ کسی بھی صورت اس سے طلاق یا خلع حاصل نہیں کر سکتی تھی۔ بصورتِ دیگر وہ اس جائداد سے بے دخل ہو جاتی۔ رزاق کی موت کے بعد بھی ارحم اکیس سال کی عمر میں اس کا وارث قرار پاتا۔

اس نے اپنے بینک اکاؤنٹ میں آن لائن بیلنس چیک کیا اور کچھ ضروری کاغذات سمیٹنا شروع کر دیے۔ ایسی کسی بھی صورتِ حال کے لیے اس کے پاس ترپ کے کئی پتے محفوظ تھے۔ وہ اگلی صبح ہی وہاں منتقل ہو جانا چاہتی تھی۔

وہ بستر پر نیم دراز الکحل سے اپنے اعصاب پُرسکون کرنے کی کوشش کرنے لگی۔ کچھ لمحوں بعد دروازے پر دستک ہوئی اور ارحم کا چہرہ نمودار ہوا۔ اس کے ساتھ چھریری جسامت اور تیکھے نقوش کی حامل ایک لڑکی بھی تھی۔ اس کا لباس انتہائی چست اور بال دو مختلف رنگوں میں رنگے تھے۔

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

''یہ کون ہے ارحم؟'' وہ حیران ہو گئی تھی۔

''میرا نام مہک ہے.....وہی مہک جس کی ذات سے آپ کے شوہر نے ہزار داستانیں منسوب کر ڈالی ہیں۔ اگر وہ مجھے اپنی بہو نہیں بنانا چاہتے تو انہیں میرے کردار پر بے جا کیچڑ اچھالنے کا حق کس نے دیا ہے؟'' وہ نہایت اعتماد سے بول رہی تھی۔

روحی خالی الذہنی کی کیفیت میں اسے دیکھتی رہی۔ مہک کے اعتماد اور خوبصورتی کے باوجود اس کی شخصیت میں جانے ایسی کیا بات تھی جو روحی کو انتہائی ناگوار محسوس ہو رہی تھی۔ وہ اپنی ذہنی حالت کی وجہ سے احساس کو الفاظ کا روپ نہیں دے پا رہی تھی۔

''ارحم! اس وقت میری طبیعت بہت بوجھل ہے۔ اس معاملے کو پھر کسی وقت کے لیے اٹھا رکھو۔'' اس نے ناگواری سے کہا۔

''مام! میں صرف یہ کہنے آیا ہوں کہ آپ اپنے بینک اکاؤنٹ میں موجود رقم میرے اکاؤنٹ میں ٹرانسفر کر دیں۔ میں جلد ہی مہک سے شادی کے بعد دبئی شفٹ ہو جاؤں گا۔ ہم وہاں ایک ذاتی بوتیک اور بیوٹی پارلر قائم کر لیں گے۔ ایک بار ہم یہاں سے چلے گئے تو پھر ڈیڈ ہمارا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکیں گے۔'' ارحم کے مطالبے اور ارادے نے اس کے قدموں تلے زمین نکال دی۔

☆☆☆

رزاق کے سامنے موجود شخص کے ریوالور کا رخ اسی کی جانب تھا۔

نقاب سے جھانکتی آنکھوں میں نفرت، حقارت، تپش اور سفاکی نے اس کا وجود شل کر دیا۔

''کون ہو تم؟ کیا چاہیے تمہیں؟'' وہ اپنے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے بولا۔

نقاب پوش خاموشی سے ریوالور کی زد پر اسے دھکیلتا ہوا اندر لے آیا۔

''میں یہاں کیش نہیں رکھتا......اس لیے تمہیں یہاں سے کچھ نہیں ملے گا۔''

''میں یہاں مال و دولت نہیں، وہ چیز لینے آیا ہوں جو تمہارے لیے سب سے زیادہ قیمتی ہے۔'' اس نے سلگتے لہجے میں کہا۔

''ہم بیٹھ کر بھی تو بات کر سکتے ہیں...... میں تمہیں منہ مانگی رقم دینے کو تیار ہوں۔'' رزاق گھگیا گیا۔

''تم نے مجھ سے جو چھینا، وہ بے مول تھا......اور مجھے بس اسی کی قیمت وصول کرنی ہے......جان کا بدلہ جان۔''

''مگر میں تو تم سے واقف ہی نہیں...... پھر میں کیسے کچھ چھین سکتا ہوں تم سے؟'' رزاق کا وجود لرزنے لگا۔

''اپنے کرموں کے بوجھ سے اس دھرتی کو آزاد کرو...... قبر میں تمہارے پاس بہت وقت ہوگا اپنے اس سوال کا جواب تلاش کرنے کے لیے۔'' اس نے رزاق کی پیشانی پر ایک گولی داغی اور اطمینان سے واپس روانہ ہو گیا۔

☆☆☆

انسپکٹر سکندر اپنے دفتر میں کچھ فائلز کی ورق گردانی کر رہا تھا۔ ماتحت ایس۔ آئی خالد اس کے پاس آیا اور سلیوٹ جھاڑ کر بولا۔

''شہر کی معروف کاروباری شخصیت سیٹھ رزاق چانڈیو کے قتل کی اطلاع موصول ہوئی ہے۔''

''کس نے دی ہے اطلاع؟ کس کے لواحقین نے؟'' سکندر نے فائل بند کی۔

''نہیں جناب! یہ خبر میڈیا پر پہلے ہی بریک ہو چکی ہے۔ مقتول کا گارڈ صبح معمول کے مطابق ڈیوٹی پر آیا تو گلاس ڈور غیر مقفل تھا۔ اس نے اندرونی حصوں کا جائزہ لیا تو ایک ریسٹ روم بھی چوپٹ کھلا تھا۔ رزاق کی لاش وہیں موجود تھی۔ اس نے انتہائی 'ذمے داری' کا مظاہرہ کرتے ہوئے یہ خبر ایک نیوز چینل کو دے دی۔ اس چینل کا دفتر بھی دراصل اسی سڑک کے اختتام پر واقع ہے۔ پھر ایک چینل کے بعد سبھی اس ریس میں شامل ہو گئے کہ یہ خبر سب سے پہلے انہوں نے بریک کی ہے۔ اس دوران ایک اینکر نے پولیس کی کارکردگی پر سوال اٹھایا تو اسے یاد آیا کہ پولیس کو تو اس معاملے کی اطلاع دی ہی نہیں گئی۔'' ایس۔ آئی خالد نے تفصیل بتائی۔

''ڈیم فول! ان نیوز چینلز نے تو پولیس ڈیپارٹمنٹ سے بیر باندھ لیا ہے۔ عوام کے ذہن اس طرح قابو میں کر رکھے ہیں کہ وہ ان کی ہر جھوٹی، سچی رپورٹ کو حقیقت تسلیم کر لیتے ہیں۔'' سکندر ہمیشہ ہی سے پولیس افسران کی ناقدری اور عوامی غیر ذمے داری سے نالاں رہتا تھا۔ ''خیر! موبائل تیار کرواؤ۔ ہمیں فوری روانہ ہونا ہے ورنہ میڈیا والے سستی اور کاہلی کا ایک اور فتویٰ صادر کر دیں گے۔''

''اوکے سر! دس منٹ میں سب تیار ہو جائے گا۔'' خالد مستعدی سے سلیوٹ کرتا پلٹ گیا۔

☆☆☆

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

ایک ریکارڈ ساز اننگز کھیلنے کے بعد اپنی غلطی سے آؤٹ ہوجانے والے کھلاڑی کو جب یہ نوید ملے کہ قسمت کی 'نوبال' نے اسے ایک اور موقع فراہم کردیا ہے تو خوشی 'بے یقینی اور اطمینان کی جس کیفیت میں وہ مبتلا ہوتا ہے' روحی بھی انہی محسوسات کے نرغے میں تھی۔

گزشتہ رات کی بے سکونی' ذہنی تناؤ' اور اضطراب کے باعث وہ سکون بخش ادویات لے کر سوپائی تھی اور اب کمرے کے دروازے پر ہونے والی دستک اس کے ذہن پر ہتھوڑے برسا رہی تھی۔ چکراتے دماغ کو قابو کرتے وہ اٹھی تو باہر ارحم موجود تھا۔ اس کے چہرے کی رنگت فق تھی۔

وہ اس کا ہاتھ تھامے واپس بیڈ روم میں آیا اور دیوار گیر ایل۔ ای۔ ڈی آن کردی۔ کسی نیوز چینل کا اینکر چیخ چیخ کر کچھ کہہ رہا تھا۔ پس منظر میں 'اسٹائل اینڈ ایلی گینس' کے ریسٹ روم کا منظر واضح تھا۔ نیم برہنہ رزاق چانڈیو کی لاش قالین پر مڑی تڑی حالت میں موجود تھی۔ اس کی پیشانی میں گولی کا نشان تھا اور خون بہہ کر جم چکا تھا۔

روحی کو اپنی خوش قسمتی پر یقین کرنا دشوار ہو رہا تھا۔ وہ بالآخر ایک جبری رشتے سے آزاد ہوگئی تھی۔

''مام! فریش ہوجائیں۔ پھر چلتے ہیں ادھر۔'' ارحم کی بوجھل آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔

''اوکے! پندرہ منٹ تک آتی ہوں میں۔'' وہ لڑکھڑاتے قدموں سے واش روم کی طرف چل دی۔

اس کی اداکارانہ صلاحیتوں کا اصل امتحان اب شروع ہوا تھا۔ ٹھنڈے پانی سے اپنے حواس بحال کرتی وہ اپنے ذہن میں ایک مکمل خاکہ ترتیب دے چکی تھی۔

☆☆☆

انسپکٹر سکندر جائے وقوعہ پر پہنچ کر ایک ہی نظر میں قتل سے قبل صورتِ حال بھانپ گیا۔

صوفے کے سامنے گلاس ٹاپ میز پر وہسکی کی ایک خالی بوتل اور دو گلاس دھرے تھے۔ ایک گلاس پر لپ اسٹک کے نشان بھی اس کی نظر سے پوشیدہ نہ رہ سکے۔ کونے میں موجود مسہری پر بے ترتیب چادر' ایک تکیے پر چند لمبے بال گزشتہ شب رزاق کی رنگین سرگرمیوں کا احوال سنا رہے تھے۔

سکندر نے سب سے پہلے گارڈ کو طلب کیا۔

''میڈیا تک یہ بات پہلے کیوں پہنچائی تم نے؟''

''میں نے جان بوجھ کر ایسا نہیں کیا سر...... اصل میں اس بلڈنگ کا گارڈ اسی وقت اپنی نائٹ شفٹ سے فارغ ہوتا ہے اور کبھی کبھار میرے پاس سگریٹ پینے کے لیے رک جاتا ہے۔ آج صبح بھی وہ اسی نیت سے میرے پاس آیا تھا۔ لیکن بوتیک کی حالت دیکھ کر وہ بھی میرے ساتھ ہی اندر چلا آیا۔ اسی نے اپنے مالکان کو اطلاع دی تھی۔''

''کل رات یہاں ڈیوٹی پر کون تھا؟'' سکندر نے پوچھا۔

''کوئی بھی نہیں...... باس کبھی کبھی رات یہیں گزارتے تھے اس لیے گارڈز کو آف دے دیتے تھے۔''

اس کی وضاحت سے سکندر کو اس شب بسری اور ملازمین کو رخصت دینے کا پس منظر سمجھ آگیا تھا۔

اس نے بوتیک منیجر کو طلب کرنے کے بعد اسے اپنے سوالات کی زد میں رکھ لیا۔

''یہاں کتنے ملازمین کام کرتے ہیں؟''

''دو سیلز مین اور دو سیلز گرلز۔'' رفیق جلدی سے بولا۔ وہ ٹی وی پر رزاق کے قتل کی خبر سن کر کچھ دیر قبل ہی بوتیک پر آیا تھا۔

''ان کی ڈیوٹی کے اوقات کیا ہیں؟''

''سب کی ایک ہی ٹائمنگ ہے۔ البتہ نائٹ شفٹ کے گارڈز الگ ہوتے ہیں۔''

''نچلے پورشن کے ملازمین کی کیا تعداد ہے؟''

''وہاں صرف ایک ٹیلر ہے۔ اوپری معاملات سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہوتا۔''

''مجھے سب ملازمین کے موبائل فون نمبرز اور موبائل سیٹ چیک کرواؤ۔''

''اس کا کوئی فائدہ نہیں سر! ڈیوٹی کے اوقات میں باس موبائل فون رکھنے کے سخت خلاف تھے۔ فون رکھنے کی اجازت صرف مجھے تھی اور میں بھی آج دو دن بعد ڈیوٹی پر آیا ہوں۔ آپ چاہیں تو میں اپنی غیر حاضری کے گواہ بھی پیش کرسکتا ہوں۔''

''وقت آنے پر ان سے بھی ضرور ملوں گا۔ فی الحال سب ملازمین کو اکٹھا کرو۔ میں ان کے فنگر پرنٹس اور پیرافن ٹیسٹ لینا چاہتا ہوں۔ اس کے علاوہ مجھے دفتری ریکارڈ میں موجود سب ملازمین کے شناختی کاغذات کی نقل درکار ہے۔ اگر کوئی شخص کسی دوسرے شہر سے یہاں آیا ہو تو اس کا موجودہ پتا بھی درج کردینا۔''

''شیور سر!'' رفیق مستعدی سے پلٹ گیا۔

اس کا انداز دیکھ کر سکندر اور خالد کی نظریں معنی خیزی سے ٹکرائیں۔

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

اسی وقت وہاں ایک عورت اور نوجوان داخل ہوئے۔ نوجوان کے تیور اکھڑے اکھڑے تھے جبکہ عورت کے چہرے اور آنکھوں پر مغموم تاثرات طاری تھے۔ وہ دونوں ہی ریسٹ روم کی حالت دیکھ کر خفت محسوس کر رہے تھے۔ لڑکے کی پیشانی کی رگیں ابھرنے لگیں۔

''ہیلو آفیسر! مسز رزاق چانڈیو ہیئر!'' عورت نے اپنا تعارف کروایا۔ ''اور یہ ہمارا بیٹا ارحم ہے۔''

''میں آپ دونوں ہی کا منتظر تھا۔'' سکندر نے اسے کہتے ہوئے خالد کو دونوں گلاس، تکیہ پر موجود بال اور چادر فرانزک لیب میں بھجوانے کا حکم دیا۔

''یہ سب کس لیے آفیسر؟'' روحی نے طنزیہ لہجے میں پوچھا۔

''فنگر پرنٹس اور ڈی این اے ٹیسٹ کے لیے۔'' سکندر کو اس کے انداز پر غصہ آنے لگا۔

''ان سب کی کیا ضرورت ہے؟ لپ اسٹک کا نشان اور بال سبینہ کے ہیں جو آج کل رزاق کی منظورِ نظر تھی۔'' اس نے اطمینان سے کہا۔ ''لیکن رزاق کو قتل بہر حال سبینہ نے نہیں کیا۔''

''آئی سی...... کافی باخبر معلوم ہوتی ہیں آپ...... حالانکہ مجھے علم ہوا ہے کہ کاروباری معاملات میں آپ کا کوئی عمل دخل نہیں۔''

''میں کبھی کبھار یہاں چکر لگایا کرتی تھی آفیسر! بوتیک کے دیگر معاملات میں میری دخل اندازی بالکل نہ تھی لیکن اپنے شوہر کے ذاتی معاملوں سے میں کبھی بھی بے خبر نہیں رہی۔ رزاق ایک بھونرا صفت انسان تھے۔ وہ سیلز گرلز کے علاوہ شہر کی اکثر پیشہ ورانہ کال گرلز کے ساتھ بھی اسی ریسٹ روم میں وقت گزاری کرتے تھے۔''

''رزاق صاحب کی کسی سے کوئی ذاتی دشمنی؟'' سکندر نے دریافت کیا۔

''اظہر چانڈیو...... رزاق کا چھوٹا سوتیلا بھائی۔'' اس نے بلا تامل کہا۔ ''وہ اس سے ایک حالیہ ملاقات کے بعد بہت اپ سیٹ تھے۔ وہ ان کی سیاسی پارٹی میں جبری شمولیت چاہتا تھا اس لیے ان پر دباؤ ڈال رہا تھا جبکہ اظہر کے سابقہ مجرمانہ ریکارڈ کی بنا پر رزاق ایسا نہیں چاہتے تھے۔''

''تو گویا آپ اظہر چانڈیو کو ملزم نامزد کر رہی ہیں۔''

''میں اس کے خلاف قتلِ عمد کی ایف آئی آر درج کرا کے ناقابلِ ضمانت وارنٹ جاری کروانا چاہتی ہوں۔''

سکندر نے اس کا بیان لکھوا کر دستخط لے لیے۔ رفیق احمد نے بھی اسے مطلوبہ کاغذات فراہم کر دیے۔ فنگر پرنٹس اور پیرافن ٹیسٹ لینے کے بعد 'اسٹائل اینڈ ایلیگینس' سیل کر دیا گیا۔ سبھی ملازمین شہر سے باہر نہ جانے کے پابند تھے۔

☆☆☆

وہ اپنے فلیٹ کی تنگ' خستہ حال سیڑھیاں چڑھتا بہت سرشار تھا۔

اس عمارت کا رنگ و روغن بھی اپنا اصل روپ کھو چکا تھا۔ مکینوں کی اکثریت اپنی نئی رہائشگاہوں میں منتقل ہو گئی تھی۔ بارہ سال قبل آنے والے ایک ہولناک زلزلے نے یہاں جا بجا دراڑیں اور شگاف پیدا کر رکھے تھے۔ یہ عمارت دس سال قبل ہی مخدوش قرار دی جا چکی تھی لیکن سابقہ رہائشی اس مردہ ہاتھی سے بھی کئی سوا لاکھ کمانے کا فن جانتے تھے۔ دوسرے شہروں سے آنے والے ملازمت پیشہ افراد اور طالب علموں کو انتہائی کم نرخ پر فلیٹس کرائے پر دے دیے جاتے۔

بد رنگ چوبی دروازہ کھول کر وہ اندر داخل ہوا اور اپنے لیے چائے بنانے چل دیا۔ اس فلیٹ میں ایک کمرا' انتہائی مختصر کچن، بیت الخلا اور چھوٹا سا ٹی وی لاؤنج تھا۔ کمرا اب مقفل ہی رہتا تھا۔ اس میں اتنی سکت ہی نہ تھی کہ اندر موجود سامان اور تصویروں کا سامنا کر سکے۔

اسے بہت تھکاوٹ محسوس ہو رہی تھی۔ گزشتہ روز کیے جانے والے قتل نے اس کے اعصاب پر سرشاری و کشیدگی کا ایک عجب بوجھل پن پیدا کر دیا تھا۔ چائے بنانے کے بعد وہ ٹی وی لاؤنج میں ہی آ گیا اور ایک کونے میں موجود چودہ انچ ٹیلی ویژن آن کر لیا۔ سالہا سال پرانے اس ٹی وی پر صرف نیوز اور اسپورٹس چینلز ہی ٹیون تھے۔

ایک نیوز چینل پر چلنے والی خبر نے اس کی حسیات مکمل طور پر اپنی جانب مبذول کر لی۔ وہ نہایت دلچسپی سے اسکرین پر نظریں جمائے بیٹھ گیا۔ سیٹھ رزاق کے قتل کے بعد میڈیا کی قیاس آرائیاں جاری تھیں۔ اس وقت بھی ایک 'ٹاک شو' میں روحینہ رزاق سے سوال و جواب کا سلسلہ جاری تھا جو اپنی مسکارا اور کاجل زدہ آنکھوں میں آنسو بھرے شوہر کی موت پر بے پناہ غم کا شکار دکھائی دے رہی تھی۔ وہ قانون سے انصاف کی طلبگار تھی۔

اس کے چہرے پر ایک سفاک مسکراہٹ دوڑ گئی۔

''بالکل ٹھیک کہہ رہی ہو تم مسز رزاق! تم سے بڑھ کر انصاف کا حقدار تو کوئی بھی نہیں۔ اور یہ انصاف میں تمہیں

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

دلواؤں گا۔ بہت جلد.....'' چائے کے کپ کے کناروں پر شہادت کی انگلی پھیرتا وہ اسکرین پر نظر آنے والی روحی سے ہم کلام تھا۔

☆☆☆

انسپکٹر سکندر بوتیک کے ملازمین کے شناختی کاغذات بغور دیکھنے میں مگن تھا۔ خالد نے کافی کا ڈسپوزابیل کپ اسے تھمایا۔

''بہت شکریہ یار! بڑی طلب محسوس ہو رہی تھی اس کی۔'' سکندر نے بے تکلفی سے کہا۔

''بہت بھاگ دوڑ میں گزرا آج سارا دن..... مجھے تو لگتا ہے کہ لواحقین 'اوپر' سے بہت جلد شدید دباؤ ڈلوانے لگیں گے۔''

''ہاں! بیگم رزاق بہرصورت اظہر چانڈیو کی گرفتاری اور سزا چاہتی ہیں۔'' سکندر نے اتفاق کیا۔

''ہیں کو اب کچھ نظر آتے ہیں کچھ..... مجھے تو ہر شخص ہی بہت الجھا ہوا اور پیچیدہ کردار کا مالک لگا ہے۔ مقتول کا منیجر ضرورت سے زیادہ مستعد ہے.....اور بیگم اس سے کہیں زیادہ باخبر!'' خالد نے کہا۔

''اور بیٹے کے بارے میں کیا خیال ہے؟''

''موصوف ماضی بعید ہی سے اپنے باپ سے بیزار اور ماضی قریب میں کوئی گہری چوٹ کھائے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ رفیق اور روحینہ میں بھی کوئی نہ کوئی ذاتی تعلق موجود ہے۔ وہ دونوں بظاہر ایک دوسرے سے بے نیاز نظر آتے ہیں لیکن ان کی حسیات ایک دوسرے پر ہی مرکوز رہتی ہیں۔''

''درست! ان دونوں میں کوئی خاص ربط و تعلق بہر حال موجود ہے۔'' سکندر نے کہا۔

''یعنی کہ کچھ تو گڑبڑ ہے۔''

خالد اور سکندر بچپن کے دوست تھے۔ یہ دوستی پیشہ ورانہ معاملات میں بھی اثر انداز نہ ہوئی۔ فرصت کے لحات میں وہ یونہی باہمی گفتگو سے کیس کی گمشدہ کڑیاں تلاش کرتے۔ خالد کو مختلف کرائم شوز دیکھنے کا بہت شوق تھا۔ وہ اکثر ان مواقع پر کسی نہ کسی مشہور کردار کا حوالہ اور مکالمہ ضرور استعمال کرتا۔

''اگر کوئی ثبوت میسر آجائے تو انہیں بھی ضرور رگڑیں گے..... ابھی تو پوسٹ مارٹم رپورٹ کا انتظار ہے بس۔''

''ریسٹ روم کے فنگر پرنٹس کی رپورٹ بھی مل گئی ہے..... وہاں رزاق اور سینہ کے علاوہ کسی کی انگلیوں کے نشان موجود نہیں۔ رزاق روزانہ صبح اپنی موجودگی میں ہی وہاں صفائی کروایا کرتا تھا۔'' خالد نے مزید اطلاعات دیتے ہوئے کہا۔

''اور پیرافن ٹیسٹ.....'' سکندر نے پوچھا۔

''سب کلیئر ہے..... سی سی ٹی وی کیمرے آف ہونے کی وجہ سے کسی کی روانگی اور قاتل کی آمد کا کوئی ریکارڈ موجود نہیں۔''

''کیمرے آف کرنے اور گارڈز کو چھٹی دے دینے کی منطق سمجھ سے بالاتر ہے۔''

''ممکن ہے کسی تنازع میں الجھنے سے بچنے کے لیے ایسا کرتا ہو۔ سیاست میں قدم جمانے کے لیے اسے بے داغ کردار و ماضی درکار ہوگا۔'' خالد نے تجزیہ کیا۔

''اظہر چانڈیو کی گرفتاری اس وقت بہت ضروری ہے۔ اس کی روپوشی کیس کو مزید الجھاتی رہے گی۔'' سکندر نے کافی کا خالی کپ ایک جانب رکھتے ہوئے کہا۔

☆☆☆

دو روز بعد پوسٹ مارٹم کی رپورٹ ملتے ہی سیٹھ رزاق کی میت ورثا کے حوالے کر دی گئی۔ روحی فوری تدفین پر مصر تھی۔ وہ گلیسرین کے مسلسل استعمال 'تعزیتی فون کالز' اور مہمانوں کی متواتر آمد سے اُکتا چکی تھی۔

تدفین کے بعد مہمانوں سے تعزیتی کلمات وصول کرنے کا دشوار مرحلہ بھی تمام ہوا۔ اپنے بیڈ روم میں آکر اس نے نیند کی ایک گولی نگلی اور انٹرکام پر ہیڈ ملازمہ کو ہدایات دیتے کہنے لگی۔

''مجھے کوئی بھی فون کال ٹرانسفر مت کرنا۔ تعزیت کے لیے جو بھی آئے اسے کہنا کہ بیگم صاحبہ کو ڈاکٹر نے انجکشن دے کر سلایا ہے اور کسی بھی ذہنی تناؤ سے دور رہنے کی تجویز دی ہے۔''

اپنے موبائل کو ہر طرح سے خاموش کرنے کے بعد وہ جلد ہی نیند کی وادیوں میں کھو گئی۔

شام ڈھلے اس کی آنکھ کھلی۔ کچھ لمحوں کے لیے وہ کسلمندی سے لیٹی چھت کو دیکھتی رہی۔ اسے بے حد آزادی اور فرحت کا ناقابلِ بیان احساس گھیرے ہوئے تھا۔ سائڈ ٹیبل پر پڑا موبائل دیکھا تو دیگر حلقہ احباب کے علاوہ رفیق کے بھی کئی پیغامات موجود تھے۔ وہ اس سے فوری طور پر اپنے مخصوص سابقہ مقام پر ملنا چاہتا تھا۔

اس نے ملازمہ سے کہہ کر کافی منگوالی۔

''ارحم کہاں ہے؟'' ملازمہ کی آمد پر اس نے

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

دریافت کیا۔

''وہ دوپہر ہی سے موجود نہیں ہیں میم!''

روحی نے بھویں اچکائیں اور ملازمہ کو جانے کا اشارہ کر کے ارحم کا نمبر ملایا۔ اس کا موبائل آف تھا۔

''مہک ہی کے ساتھ اپنی آزادی کا جشن منا رہا ہو گا۔'' اس نے اپنا موبائل ایک جانب رکھتے خود کلامی کی۔

روحی کو وہ لڑکی بالکل پسند نہیں آئی تھی۔ گزشتہ ملاقات پر اس کا شخصی تاثر رزاق کی باتوں کی ہی جھلک نظر آیا تھا۔ وہ اس معاملے کو بہت سکون اور ٹھنڈے دماغ سے نمٹانا چاہتی تھی۔

کافی ختم ہوتے ہی اس نے رفیق کو اپنی آمد کا پیغام بھیج دیا۔

اپنی گاڑی وہ ہمیشہ خود ہی ڈرائیو کیا کرتی تھی۔ بغلی سڑک پر آنے کے بعد اس نے گاڑی کے خفیہ خانے سے ایک عبایہ اور اسکارف نکال کر اوڑھا اور مطمئن ہو کر رفتار بڑھادی۔

اس کی توقعات کے عین مطابق رفیق بہت بے چینی سے اس کا منتظر تھا۔

''میں دوپہر سے تمہارا منتظر ہوں۔ موبائل فون خاموش' لینڈ لائن پر ملازمہ کا ایک ہی رٹا رٹایا جواب سن کر میرے کان پک گئے تھے۔ اب بھی اگر تمہارا کوئی جواب نہ آتا تو میں تمہارے گھر چلا آتا۔'' وہ ایک ہی سانس میں بولتا چلا گیا۔

''ان باتوں کو چھوڑو روئی! پہلے کچھ پینے پلانے کا بندوبست تو کرو۔'' اس نے بستر پر نیم دراز ہوتے ہوئے خوشگوار انداز میں کہا۔

ہوٹل کے اس کمرے میں ایک فریج بھی موجود تھا جہاں الکحل کے علاوہ کولڈ ڈرنکس بھی موجود ہوتی تھیں۔ رفیق بیئر کے دو ٹن لے آیا اور ایک اسے تھماتے ہوئے بتانے لگا۔

''میری انسپکٹر سکندر سے اظہر کی گرفتاری کے موضوع پر بات ہوئی تھی۔ اسی سے علم ہوا کہ وہ انڈر گراؤنڈ ہو چکا ہے۔''

''تم کیوں اپنی ذات خواہ مخواہ مشکوک بنا رہے ہو رفیق؟ تمہاری اس قدر دلچسپی میرا بنا بنایا کھیل بگاڑ دے گی۔ پولیس کو اپنا کام کرنے دو۔'' وہ چڑ گئی۔

''اظہر کا آزاد رہنا ہمارے لیے بہت خطرناک ثابت ہو سکتا ہے...... وہ ہماری شادی میں رکاوٹیں پیدا کر سکتا ہے۔''

''تم اپنے ہوش و حواس میں نہیں ہو شاید...... میں دوسری شادی کیسے کر سکتی ہوں بھلا؟''

''کیوں نہیں کر سکتیں...... اب تو تمہارا وہ بوڑھا' بدصورت شوہر بھی راستے سے ہٹ گیا ہے۔''

''میں ایک جوان بیٹے کی ماں ہوں رفیق! یہ سب میرے لیے ممکن نہیں۔'' روحی نے ٹالا۔

''اچھا...... اب تمہیں جوان بیٹے کا خیال آ گیا۔ پچھلے چھ ماہ سے ان ہوٹلوں میں مجھ سے ملتے ہوئے 'جوان بیٹا' شاید تم فراموش کر دیتی تھیں۔'' وہ لفظ چباتے بولا۔

''شٹ اپ! اگر تم نے یہی باتیں کرنی ہیں تو میں ایک پل مزید یہاں نہیں رکوں گی۔'' وہ اپنا بیگ تھامے اٹھ کھڑی ہوئی۔

''اوکے! اوکے! آئی ایم سوری......'' اس نے فوراً پینترا بدلا۔

رفیق نے اس ملاقات کے لیے خصوصی اہتمام کر رکھا تھا۔ اس نے کمرے میں بستر کے عین سامنے ایک ویڈیو ریکارڈنگ ڈیوائس لگا دی تھی۔ روحی کے ساتھ گزارے کچھ لمحات کی ریکارڈنگ کے بعد وہ اسے شادی کے لیے بلیک میل کرنا چاہتا تھا۔

ایک طویل معافی تلافی کے بعد وہ چڑیا بالآخر اس کے جال میں پھنس گئی۔ ایک گھنٹے بعد وہ اسی ہوٹل کی عقبی جانب اپنا عبایا گاڑی میں رکھتے نہایت سنجیدگی سے رفیق کو راستے سے ہٹانے کی منصوبہ بندی تیار کر رہی تھی۔

''ہونہہ! شادی کر لوں میں اس سے...... احمق کہیں کا...... مجھے زینہ بنا کر بوتیک کا مالک بننے کے خواب دیکھ رہا ہے۔'' اس نے بڑبڑاتے ہوئے اگنیشن میں چابی گھمائی۔

چند گز دور جاتے ہی اسے ایک بار پھر وہی مانوس چہرہ نظر آیا اور وہ گاڑی روکنے پر مجبور ہو گئی۔

☆☆☆

وہ آج بھی اپنی بائیک پر ہی موجود تھا۔ سڑک کے کنارے بائیک روکے وہ فون پر کسی سے بات کرنے میں مصروف تھا۔ روحی اپنی سابقہ تذلیل بھولے ایک بار پھر اس کی جانب بڑھ گئی۔ اسی اثنا میں وہ فون اپنی جیکٹ میں رکھ چکا تھا۔

''تم یہاں کیا کر رہے ہو بھئی؟''

''یہ سوال تو مجھے آپ سے پوچھنا چاہیے...... آپ یہاں کیا کر رہی ہیں؟'' اس کے لہجے کی نرمی اور حیرانی روحی

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

کے لیے خوش کن تھی۔
''میری یہاں موجودگی پر تم اس قدر کیوں حیران ہو؟''
''آپ عدت میں ہیں ناں...... بس اسی لیے پوچھ لیا۔'' وہ سادگی سے بولا۔
''تمہیں کیسے معلوم ہے؟؟ تم جانتے ہو مجھے؟''
''آپ کو تو اب شہر کا بچہ بچہ جان چکا ہوگا...... دو روز قبل رزاق چانڈیو کے قتل کی خبر اور آپ کا انٹرویو دیکھا تھا نیوز میں...... آئی ایم سوری! اس دن مجھے علم ہی نہ تھا کہ اتنی معزز ہستی مجھ سے مخاطب ہے۔''
''تم پر یہ عاجزی نہیں جچتی ڈیئر!...... تم پر تو وہی دبنگ لب ولہجہ جچتا ہے...... اور یو نو واٹ!! مجھے دبنگ مرد بہت پسند ہیں۔'' وہ اس کے قریب ہوتے ہوئے بولی۔
''تو کیا میں سمجھ لوں کہ میں بھی آپ کو پسند ہوں۔'' وہ معصومیت سے کہنے لگا۔
''ہاں! تم مجھے بہت پسند ہو......''
''آپ نے معاف کر دیا مجھے؟''
''میں ایک ہی شرط پر تمہیں معاف کروں گی۔'' روحی نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔
''جی حکم کریں...... آپ کی ہر شرط منظور ہے مجھے۔'' اس نے بھی جوابی گرمجوشی دکھائی۔
''تمہیں میرے ساتھ کچھ وقت گزارنا ہوگا۔''
''مجھے منظور ہے...... لیکن آپ کو میری منتخب کردہ جگہ پر چلنا ہوگا۔'' وہ معنی خیز انداز میں بولا۔
''او کے ڈن! اپنی بائیک یہیں کسی درخت کی آڑ میں پارک کر دو...... آئندہ تمہیں ایسی کھٹارا سواری پر بیٹھنے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔'' روحی نے بھی معنی خیز مسکراہٹ اچھالی۔
وہ خاموشی سے اس کے ساتھ فرنٹ سیٹ پر بیٹھ گیا۔
''مجھے رستہ بتاتے چلو۔''
''یہاں سے سیدھا چلتی رہیں پھر بائیں طرف موڑ لیجیے گا۔''
''تم نے یہ دستانے ابھی تک پہن رکھے ہیں۔ انہیں بھی بائیک کے ساتھ ہی چھوڑ آتے۔'' روحی کی نظر اچانک ہی اس کے ہاتھوں پر پڑی۔
''یہ تو میں نے اسکن انفیکشن کی وجہ سے پہنے ہیں۔'' وہ بے نیازی سے بولا۔
چند لمحوں بعد وہ ایک پہاڑی چٹان کے پاس موجود تھے۔ اس چٹان کے اختتام پر ایک جنگل کا آغاز ہو رہا تھا۔
''بہت خوبصورت جگہ ہے! یہاں ضرور کوئی ریسٹ ہاؤس وغیرہ ہوگا۔'' روحی نے جنگل کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
اس نے جواب دینے کے بجائے جیکٹ کی جیب سے سائلنسر لگا ریوالور نکالا اور روحی پر تان لیا۔
''یہ...... کک...... کیا کر رہے ہو؟'' روحی کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔
''قیمت وصول کر رہا ہوں...... اور تمہیں انصاف فراہم کر رہا ہوں۔'' اس نے غراتے ہوئے فائر کھول دیا۔
گولی روحی کے حلق کو چھید کر گاڑی کا شیشہ توڑتی نکل گئی۔ وہ اس کی لاش کو سیٹ پر لٹا کر گاڑی سے اترا اور اپنی بائیک کی تلاش میں چلتا اندھیرے کا حصہ بن گیا۔

☆☆☆

میڈیا پر ایک طوفانِ بدتمیزی برپا تھا۔
ہر نیوز چینل پر قیاس آرائیوں کا بازار گرم تھا۔ روحینہ رزاق کی ڈیڈ باڈی ایک بریکنگ نیوز بن کر ہر چینل پر نشر ہو رہی تھی۔ پولیس کی کارکردگی بھی شدید تنقید کی زد میں تھی۔ پولیس افسران پر میڈیا اور عوامی دباؤ یکساں تھا۔ مختلف سیاسی پارٹیوں کے اراکین کو مدعو کر کے دارالحکومت میں بد امنی اور قتل و غارت کے اس نئے سلسلے پر بحث و مباحثہ ہونے لگا۔ وہ بات الگ تھی کہ یہ اراکین متعلقہ موضوع سے ہٹ کر مخالف پارٹی کی ہرزہ سرائی کا کوئی بھی موقع ہاتھ سے جانے نہ دیتے۔ پولیس کی اس ناکامی کو ریاستی ناکامی قرار دے کر آئندہ اپنی حکومت کے قیام میں ایسے معاملات سے آہنی ہاتھوں سے نمٹنے کے دعوے ہی ان ٹاک شوز کا مطمحِ نظر تھے۔
اس سارے کھیل کا 'ماسٹر مائنڈ' اپنے بوسیدہ فلیٹ میں چائے کا کپ تھامے ارحم چانڈیو کا شدید ردِعمل دیکھ کر محظوظ ہو رہا تھا۔
''میری والدہ نے اظہر کے خلاف ایف آئی آر درج کروائی تھی۔ لیکن اسے تاحال گرفتار نہیں کیا جاسکا۔''
''ہماری اطلاعات کے مطابق اظہر روپوش ہو چکا ہے۔ آپ اس صورتِ حال پر کیا کہنا چاہیں گے؟'' اینکر نے سوال کیا۔
''اس کے غائب ہونے میں بھی پولیس ہی کی روایتی سستی شامل ہے۔ میرا انتظامیہ سے مطالبہ ہے کہ اظہر کا نام ایگزٹ کنٹرول لسٹ میں داخل کیا جائے اور کسی بھی قسم کے

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

سیاسی دباؤ کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے مجرم کو سزا دی جائے۔'' ارحم نے نخوت سے جواب دیا۔

''مجرم کو سزا تو واقعی ملے گی ارحم چانڈیو...... اور بہت جلد ملے گی۔'' اس نے مسکراتے ہوئے ٹی وی بند کیا اور اپنے گلے میں جھولتا ایک چرمی تعویذ محبت سے چوم کر میلے سے گدے پر نیم دراز اگلے 'شکار' کی منصوبہ بندی کرنے لگا۔

☆☆☆

انسپکٹر سکندر کا مزاج بہت برہم تھا۔

وہ ابھی ابھی اعلیٰ پولیس افسران کے ایک ہنگامی اجلاس میں شرکت کر کے لوٹا تھا۔ تاجر برادری اور میڈیا کے بے تحاشا دباؤ کی وجہ سے اسے خاصی سخت سست سننی پڑی تھیں۔ خالد اس کے پاس روحی کی پوسٹ مارٹم رپورٹ لے آیا۔

''کیا کہتی ہے یہ رپورٹ؟'' سکندر نے پوچھا۔

''روحینہ اور رزاق کے قتل میں تین نکات مشترک ہیں۔ الکحل کا استعمال...... ایک ہی گن سے قتل...... اور موت سے قبل جنسی ملاپ۔''

''واٹ؟'' اس کی آخری بات پر سکندر بے ساختہ چونکا۔

''روحینہ کا موبائل فون ریکارڈ چیک کروایا۔ اس نے کس سے آخری بار رابطہ کیا؟''

''موبائل فون پر پیٹرن لاک تھا لیکن ہمارے آئی ٹی آفیسر نے رسائی حاصل کر لی۔ اس روز روحینہ کو ایک ہی نمبر سے 'ملاقات' کے پیغامات موصول ہوئے تھے۔'' خالد نے بتایا۔ ''یہ نمبر اس کے فون میں محفوظ نہیں تھا لیکن ہم نے ٹریس کر لیا ہے۔''

''رفیق احمد کا ہوگا یہ نمبر۔'' سکندر نے وثوق سے کہا تو خالد نے بھی مسکراتے ہوئے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''رفیق کو گرفتار۔ کر لیا گیا ہے لیکن اس کے پاس قتل کے وقت اپنی عدم دستیابی کے کئی گواہ موجود ہیں۔''

''اور اظہر چانڈیو کے متعلق کیا اپ ڈیٹ ہے؟'' سکندر نے پوچھا۔

''وہ اب بھی روپوش ہے.... غالب امکان یہی ہے کہ اس کے 'آقاؤں' نے ہی اسے منظر عام سے غائب کر رکھا ہے۔''

''سیٹھ رزاق کے قتل میں مجھے اظہر ملوث نظر نہیں آتا۔ یہ روحینہ اور رزاق کی ملی بھگت تھی۔ ہوسکتا ہے اسے ان دونوں پہ کوئی شبہ ہو گیا ہو۔ قتل کی ٹائمنگ اور طریقۂ کار میں کسی ایسے شخص کا ہاتھ ہے جو بوتیک کے تمام اندرونی معاملات، کیمروں اور گارڈز کی عدم دستیابی سے باخبر تھا۔ البتہ روحینہ کے قتل میں اظہر کا ہاتھ ہوسکتا ہے۔ وہ اپنے خلاف مقدمے کی مدعیت ختم کرنا چاہتا ہوگا۔'' سکندر نے تفصیلی تجزیہ کیا۔

''پھر اس کے بعد اگلا شکار ارحم چانڈیو ہوگا۔ اس کی موت کے بعد مقدمے سے بریت کے ساتھ تمام جائداد کا بونس بھی اظہر ہی کو ملے گا۔'' خالد نے امکان پیش کیا۔

''بالکل ہوسکتا ہے۔ ارحم کی سکیورٹی کے لیے سادہ لباس میں اپنے کچھ اہلکار روانہ کر دو۔ اس کی نقل و حرکت بالکل محدود ہو جانی چاہیے۔ وہ ان اہلکاروں کے علم میں لائے بغیر کہیں بھی نہیں جائے گا۔''

خالد اثبات میں سر ہلاتا ہوا سلیوٹ کرنے کے بعد روانہ ہو گیا۔

☆☆☆

ارحم اپنے کمرے میں ایک دیوار گیر ایل۔ ای۔ ڈی پر انگلش فلم دیکھ رہا تھا۔

اس کی زندگی میں اچانک آنے والی ان تبدیلیوں نے اس کے وجود میں خلا کی کیفیت پیدا کر دی تھی۔ باپ کے کردار و عادات کی وجہ سے تو خیر اسے کبھی بھی اس سے لگاؤ رہا ہی نہ تھا لیکن ایک فطری ردِعمل کے تحت اسے اس رشتے سے محرومی کا قلق ضرور تھا۔

روحی کی موت نے اسے شدید صدماتی کیفیت میں مبتلا کیا تھا تاہم اس وقت اس کی بیزاری کی وجہ سادہ لباس میں پولیس اہلکار تھے جو سائے کی طرح اس کے تعاقب میں تھے۔ بیرونی نقل و حرکت میں مداخلت نے اسے مزید کوفت زدہ کر رکھا تھا۔ وہ اپنی ذات ایک شکنجے میں مقید محسوس کرتا۔

موبائل کی گھنٹی نے اس کے خیالات کی رو منقطع کر دی۔ فون اسکرین پر مہک کا نمبر اور تصویر دیکھ کر اس کے مزاج میں بشاشت آگئی۔

''ارحم! ایک پارٹی ملنا چاہتی ہے تم سے...... کسی بھی طرح میرے فلیٹ میں چلے آؤ...... ابھی۔'' وہ چھوٹتے ہی

کسی نے ایک دانشور سے پوچھا۔ ''ساس کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟''

دانشور نے ہنس کر کہا۔ ''ماضی میں پوتے پوتیاں پالتی تھیں، آج کل ٹی وی میں آنے والے ہر پروگرام پر بہو سے لڑتی اور بحث کرتی ہیں۔''

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

بولی۔

''بہت مشکل ہے مہک! پولیس اہلکار کسی عذاب کی طرح میرے سر پر مسلط ہو چکے ہیں۔'' وہ اس کا مطالبہ سن کر بیزار ہوا۔

''کوئی بھی رستہ نکالو...... تمہارا آنا بے حد ضروری ہے۔ وہ شخص میرے سیکنڈ پارٹنر سے ملنے کا خواہش مند ہے۔''

''مہک! میں یہ سب کچھ وائنڈ اپ کر دینا چاہتا ہوں...... اب کوئی ضرورت ہی نہیں رہی اس سلسلے کی...... اب تو ہماری شادی میں بھی کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔'' وہ سنجیدگی سے بولا۔

''میں تمہاری بات سے متفق ہوں ارحم! لیکن تم بھی جانتے ہو کہ پچھلا نقصان پورا کرنے کے لیے یہ ڈیل کس قدر ضروری ہے۔ اس احمق کی موت نے صورتِ حال کس قدر گمبھیر بنادی تھی۔ یاد نہیں تمہیں؟''

''سب یاد ہے مجھے لیکن تمہارے سب ہی خدشات بے بنیاد ثابت ہوئے پولیس تک یہ معاملہ پہنچا ہی نہیں۔''

''ہماری قسمت اچھی تھی ارحم ورنہ سب ختم ہو جاتا۔ میں اپنی نئی زندگی کا آغاز ہر قسم کے ذہنی تناؤ سے مبّرا رہ کر کرنا چاہتی ہوں۔'' اس نے متانت سے کہا۔

''اوکے! میں انہیں کسی طرح جل دے کر آتا ہوں۔'' ارحم نے فون آف کیا اور ایک گہری سوچ میں غرق ہو گیا۔

اپنی گاڑی استعمال کرنے یا مرکزی دروازے سے جانے کی غلطی وہ کبھی بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے عقبی جانب موجود سرونٹ کوارٹرز کے ذریعے بغلی سڑک کا رستہ اختیار کرنے کا فیصلہ کیا۔ شومئی قسمت اس وقت بھی ملازمین اپنے کاموں میں مشغول تھے اس لیے اس کی روانگی کا علم کسی کو بھی نہ ہو سکا۔

جلد ہی وہ ایک ٹیکسی میں سوار مہک کے فلیٹ کی جانب گامزن تھا۔

☆☆☆

مہک نے گہری سانس لیتے ہوئے فون بند کیا۔

اس کے کٹاؤ دار ہونٹوں اور نیلگوں آنکھوں میں آسودہ مسکراہٹ تھی۔ وہ خوب صورتی میں اپنی مثال آپ تھی تراشیدہ زلفوں میں بھی مصنوعی نیلگوں رنگ نمایاں نظر آتا۔

وہ سرشار انداز میں چلتی ٹی وی لاؤنج کی طرف بڑھنے لگی۔ ریشمی بالوں نے چہرے کے بائیں رخ کو ڈھانپ لیا۔

یہ فلیٹ اسے ایک پروڈیوسر نے اس کی کچھ 'خدمات' کے عوض دے رکھا تھا اور اس کی قیمت بھی وہ وقتاً فوقتاً وصول کرتا رہتا تھا۔ ارحم کو البتہ اس نے یہی بتا رکھا تھا کہ وہ اپنی ساتھی لڑکیوں کے ساتھ فلیٹ کا کرایہ، یوٹیلیٹی بلز اور دیگر اخراجات شیئر کرتی ہے۔

''کیوں بے وقوف بنا رہی ہو اسے شادی کا جھانسا دے کر؟'' لاؤنج میں آتے ہی ایک طنزیہ آواز اس کی سماعت میں پڑی۔

''یو شٹ اپ! تمہیں کسی کی ذاتی زندگی میں دخل دینے کا کوئی حق نہیں ہے۔'' مہک بھڑک اٹھی۔

یہ معصوم صورت شخص اس کے ایک دیرینہ کرم فرما کے توسط اس سے ملنے آیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں جانے ایسی کیا بات تھی کہ وہ اس کی موجودگی میں بہت اضطراب محسوس کرنے لگی۔

''لوگوں کی ذاتی زندگیوں میں دخل دینے کا سبق میں نے تمہی سے تو سیکھا ہے بلبل!'' وہ اپنے سینے پر ہاتھ لپیٹے اس کے پاس آ کھڑا ہوا۔

''میرا وقت ضائع مت کرو اور خاموشی سے باہر بیٹھ کر انتظار کرتے رہو۔''

''وقت ضائع کرنے کا مجھے بھی کوئی شوق نہیں اور انتظار تو میں اب بالکل بھی نہیں کر سکتا۔'' اس نے ایک ریوالور نکالتے ہوئے کہا۔

''یہ کیا بے ہودہ حرکت ہے؟ کون ہو تم؟'' وہ پہلی بار خوفزدہ ہوئی۔

''تم سے پہلے بھی دو افراد مجھے جاننے کی آرزو لیے تشنہ لب اس دنیا سے چلے گئے...... اور اب تمہاری باری ہے۔'' اس کے سفاک لہجے نے مہک کی سٹی گم کر دی۔

''تو کیا ارحم کے والدین کو بھی تم نے......'' مہک کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی اس نے پیشانی کا نشانہ لے کر گولی چلا دی۔ وہ تیورا کر گری۔

اس نے مہک کو بازوؤں سے گھسیٹتے ہوئے کچن میں دیوار کی اوٹ میں دھکیل دیا اور واپس ٹی وی لاؤنج میں چلا آیا۔ اب اسے ارحم کا انتظار تھا۔

☆☆☆

ارحم بہت بے چینی کا شکار تھا۔

اس کی زندگی نے اسے عجیب کشمکش میں مبتلا کر دیا

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

تھا۔ والدین کی موت کے بعد وہ شدید تنہائی محسوس کرتا۔ فطری طور پر اس کا میلان مہک کی جانب مزید بڑھنے لگا۔ اس نے مہک سے متعلق اپنے والدین کو اندھیرے میں رکھنے کی کوشش کی تھی۔

وہ ارحم سے دس سال بڑی تھی۔ تاہم اپنی ذات پر بھرپور توجہ کے باعث وہ پچیس برس سے زیادہ لگتی ہی نہیں تھی۔ ان دونوں کی شناسائی فیس بک پر ہوئی تھی۔ وہ سوشل میڈیا پر بہت مقبول تھا۔ دوستوں کے ساتھ سیر و تفریح کے پروگرام، مختلف مواقع پر لی گئی تصاویر وہ فوری طور پر فیس بک پر اپلوڈ کیا کرتا۔ ان تصویروں پر اس نے کسی بھی قسم کی پرائیویسی بھی نہیں رکھی ہوئی تھی۔

اس کی شخصیت سے متاثر ہو کر لڑکیاں اکثر اس سے بات چیت کر لیا کرتیں۔ فون نمبرز کے تبادلے ہوتے اور پھر نوبت ملاقاتوں تک بھی پہنچ جاتی۔ ایک روز 'مہک علی' نامی لڑکی کی جانب سے موصول ہونے والا میسج اسے معمول سے کافی منفرد اور دلچسپ محسوس ہوا۔

''ایکسکیوزمی! آپ کی یہ تصویر 'اسٹائل اینڈ ایلی گینس' میں اتاری گئی ہے ناں؟''

اس نے ارحم کی ایک تصویر دوبارہ اسی کو بھیجتے ہوئے دریافت کیا۔

''جی بالکل! آپ کا اندازہ درست ہے۔'' اس نے جواب بھیجا۔

''میں ایک دو بار وہاں گئی ہوں اس لیے پہچان لیا۔ بہت اچھا اور زبردست بوتیک ہے۔''

''جی ہاں! میں جانتا ہوں اور میں اکثر وہیں پایا جاتا ہوں۔''

''لگتا ہے آپ کو شاپنگ کا بہت شوق ہے۔'' مہک نے ایک مسکراتی ہوئی اسمائل بھیجی۔

''وہ بوتیک میرے ڈیڈ کا ہے مہک۔''

''بہت خوب...... یہ تو کمال اتفاق ہو گیا۔''

ان دونوں کی بات چیت کا سلسلہ دراز ہونے لگا۔ ارحم کے سماجی حلقے میں اکثر لڑکیاں ٹین ایجر تھیں۔ جن کی غیر سنجیدہ، بے معنی' ناز و انداز دکھاتی اور اس کی تعریفوں کے بدلے جوابی تعریفوں کے مطالبے پر مبنی گفتگو بالآخر اسے بہت بور کر دیتی۔ مہک کا میچور رویہ، سنجیدگی اور عملی سوچ اسے تیزی سے اپنی جانب مائل کرنے لگی۔

وہ ایک میک اپ آرٹسٹ اور ڈریس ڈیزائنر تھی۔ لیکن سینئر کے رویے سے نالاں بھی بہت تھی۔ ان کا تعلق بہت جلد دوستی کے دائرے سے نکل کر محبت کی حدود میں داخل ہو گیا۔ مہک اپنی عمروں کے تفاوت اور معاشی حیثیت کے فرق کے باعث اس رشتے کے مستقبل کی بابت بہت دوٹوک موقف رکھتی تھی۔

وہ ارحم ہی کی طرح مہم جو اور کسی حد تک منفی ذہانت کی حامل تھی۔

''تم اپنے گھر والوں سے شادی کی بات کرنے سے قبل اپنی معاشی حالت ذاتی طور پر مستحکم کر لو۔'' ایک روز اس نے سنجیدگی سے کہا۔

''اچھا! وہ کیوں بھلا اور کیسے؟''

''مجھے سو فیصد یقین ہے کہ تمہارے ڈیڈ ہماری شادی کے لیے کسی صورت نہیں مانیں گے اور تمہیں دباؤ میں لانے کے لیے جائداد سے بے دخل کر دیں گے۔''

''ہاں! ایسا بہت حد تک ممکن تو ہے لیکن ابھی میری پڑھائی نامکمل ہے اور جاب وغیرہ کرنا میرے مزاج کے خلاف ہے۔''

''میں تمہیں جاب کا مشورہ دوں گی بھی نہیں...... تمہارے پاس آئی۔ ٹی کی مہارت ہے...... اسے کام میں

میر تقی میر اردو زبان کے بہت بڑے شاعر تھے۔ ان کی عادت تھی کہ جب وہ گھر سے باہر جاتے تو تمام دروازے کھلے چھوڑ دیتے اور جب گھر واپس آتے تو تمام دروازے بند کر لیتے تھے۔ ایک دن ان کے کسی ملاقاتی نے اس کی وجہ دریافت کی۔ انہوں نے فرمایا۔ ''ارے بھائی! میں ہی اس گھر کی واحد دولت ہوں۔''

☆☆☆

ایک محفلِ ادب میں شہنشاہ اکبر کے لائق وزیر شیخ ابوالفضل کا ذکر چل نکلا۔ ایک ادیب بولے۔ ''اگر وہ دانشمند اس زمانے میں ہوتا تو شاید عدالتوں میں عرضی نویسی کر کے اپنا پیٹ پال رہا ہوتا۔''

اس محفل میں ایک دانشور بھی موجود تھے، سنتے ہی بول پڑے۔ ''اگر وہ اس زمانے میں ہوتا تو کم از کم ایم اے ایل ایل بی کی ڈگری ضرور حاصل کر لیتا اور کچھ نہیں تو ملک کے کسی با اثر سیاست داں کا قانونی مشیر ضرور لگ جاتا کیونکہ ابوالفضل میں زمانے کا ساتھ دینے کی خداداد صلاحیت اور سوجھ بوجھ تھی۔''

لاہور سے نگہت پروین کا تعاون

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

لاؤ۔'' وہ دھیرے دھیرے اسے اپنا منصوبہ بتاتی گئی۔

ارحم کی آنکھوں کی چمک بڑھنے لگی۔ ''اگر ایسا ہوا مہک تو ہمارے وارے نیارے ہو جائیں گے۔'' وہ جوش سے بولا۔

''تو پھر تم تیار ہو اس کام کے لیے؟''

''ہنڈرڈ پرسنٹ۔ میرے لیے یہ بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔''

ان دونوں کا مشترکہ کاروبار جلد ہی مستحکم ہو گیا۔ لیکن پھر ایک حادثے کے باعث انہیں اپنی سرگرمیاں محدود کرنا پڑی تھیں۔ ارحم کا دل اب اس سلسلے سے اکتانے لگا تھا۔ وہ مہک سے شادی کر کے اب زندگی میں یکسوئی چاہتا تھا۔

ٹیکسی ایک جھٹکے سے رکی اور وہ اپنی منزل مقصود پر پہنچ گیا۔

☆☆☆

فلیٹ کا دروازہ نیم وا تھا۔

اسے اچنبھا ہوا۔ وہ چوکنا ہو کر اندر بڑھا۔ لاؤنج خالی پڑا تھا۔ دائیں جانب سے اچانک ایک ٹھوس اور سرد شے اس کی گردن سے ٹکرائی۔

''کوئی ہیرو پنتی دکھانے کی کوشش کی تو بلا دریغ گولی چلا دوں گا میں۔'' ایک سرد آواز اس کے عقب سے ابھری۔

ارحم ساکت ہو گیا۔

وہ شخص اسے کسی اسلحے کی زد میں لیے اطمینان سے دھکیلتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔ اسے ایک صوفے کے کنارے بٹھا کر وہ اس کے سامنے چلا آیا۔ ریوالور کا رخ اب بھی اسی کی جانب تھا۔

ارحم اس کا چہرہ دیکھ کر فرط حیرت سے چلایا۔

''تم! تم یہاں کیا کر رہے ہو؟ اور اس بیہودگی کی کیا وجہ ہے؟'' اس نے ریوالور کی طرف اشارہ کیا۔

''اپنی منہ دکھائی کے لیے موجود تھا یہاں۔'' اس کی آواز میں بہت تپش تھی۔

''مہک کہاں ہے؟'' ارحم نے اپنے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔

''وہیں جہاں تمہارے والدین بھی موجود ہیں۔ وہ تینوں تو یہی حسرت دل میں لیے چلے گئے کہ اپنی موت کی وجہ جان سکیں...... لیکن تم تو اپنے قاتل کی رونمائی کے اصل حقدار ہو...... آفٹر آل اس کھیل کا آغاز تم ہی نے اس فاحشہ کے ساتھ مل کر کیا تھا۔'' وہ زہرخند ہوا۔

''تو کیا ان کو بھی تم نے......'' ارحم کے الفاظ گنگ تھے۔ ''انہوں نے کیا بگاڑا تھا تمہارا؟''

''حرامزادے! میرے بھائی نے کیا بگاڑا تھا تمہارا؟'' وہ دھاڑا۔

اسی وقت ارحم کے موبائل کی گھنٹی بجی۔

''اسے میرے حوالے کرو۔'' اس نے بایاں ہاتھ آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

ارحم نے موبائل اس کی جانب بڑھایا اور پھر یکدم اس کے اسلحہ بردار ہاتھ کی کلائی پر اپنی کھڑی ہتھیلی سے ضرب لگائی۔ پھر دوسرے ہاتھ سے اس کی جیکٹ کو کالر سے تھام کر اسے صوفے پر پٹخ دیا۔ اس کے گلے پر ارحم کا دباؤ بڑھنے لگا۔ دایاں ہاتھ اب بھی ارحم کی گرفت میں تھا۔

اس نے پوری قوت سے اپنے گھٹنے موڑے اور ارحم کی ناف پر ایک زوردار ضرب لگائی۔ اس کی گرفت کمزور ہوتے ہی دو گولیاں اسے اپنا نشانہ بنا گئیں۔ خون کا ایک فوارہ اچھلا اور ارحم چانڈیو کا قصہ بھی تمام ہو گیا۔ اس کا زیریں دھڑ صوفے پر اور بالائی دھڑ فرش پر موجود تھا۔

اس کی لاش کو ٹھوکر مارتا ہوا وہ اطمینان سے واپس چلا گیا۔

☆☆☆

ارحم کی گمشدگی زیادہ دیر پوشیدہ نہ رہ پائی۔

اس کی روانگی کے نصف گھنٹے بعد ان کا وکیل اظہر چانڈیو کے خلاف کیس کی پیروی کے لیے کچھ کاغذات پر دستخط کروانے لیے چلا آیا لیکن وہ گھر میں کہیں بھی موجود نہ تھا۔ موبائل فون پر کی گئی کالز کا بھی وہ کوئی جواب نہیں دے رہا تھا۔

سادہ لباس میں پولیس اہلکاروں نے فوراً سکندر اور خالد کو اطلاع پہنچا دی۔ سکندر کا غصہ آسمان سے باتیں کرنے لگا۔ اس غیر ذمے دار اور خطرناک روش پر وہ ارحم کو غائبانہ صلواتیں سنانے لگا۔

اسی پل اس کے فون کی گھنٹی بجی۔ خالد نے اس کے مزاج کی برہمی بھانپتے ہوئے فون اٹھالیا۔ دوسری جانب کی مختصر ترین گفتگو سن کر اس کے چہرے کی رنگت متغیر ہو گئی۔

''او کے! ہم پہنچ رہے ہیں۔'' اس نے ریسیور رکھتے ہوئے کہا۔

سکندر سوالیہ نظروں سے اس کی جانب دیکھنے لگا۔

''ارحم چانڈیو کا سراغ مل گیا ہے...... وہ ایک میڈیا ورکر مہک علی کے گھر میں مردہ حالت میں موجود ہے۔''

Downloaded From Paksociety.com

قیمت Downloaded from Paksociety.com

"فون کس کا تھا؟"

"مہک کے ایک ساتھی کا۔ وہ کسی شوٹنگ کے لیے پہلے سے طے شدہ پروگرام کے تحت اسے لینے آیا تھا۔ فلیٹ کے باہر گاڑی پارک کرنے کے بعد اس نے کئی بار مہک کو فون کیا لیکن جواب نہ ملا تو فلیٹ میں پہنچ گیا۔ دروازہ کھلا تھا۔ لاؤنج میں ارحم اور کچن میں مہک کی مڑی تڑی لاشیں موجود تھیں۔" خالد نے اسے آگاہ کیا۔

وہ فوراً جائے وقوعہ پر روانہ ہو گئے۔

فلیٹ میں کسی قسم کی بے ترتیبی نہ تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ قتل بہت اہتمام اور سکون سے کیے گئے ہیں۔ لاؤنج کی حالت میں معمولی سی ابتری تھی۔ سکندر کی عقابی نظریں ریڈار کی طرح اردگرد گردش کر رہی تھیں۔ ارحم کی لاش کے پاس ایک چابی موجود تھی۔ سکندر نے جھک کے اسے اٹھایا اور بغور جائزہ لینے لگا۔

اسے صوفے کے کشن کے درمیان ایک سیاہ ڈوری جھلکتی نظر آئی۔ سکندر نے ڈوری کھینچی تو اس کے ہاتھ میں ایک چرمی تعویذ آ گیا۔ وہ حیرانی اور پُرسوچ نظروں سے اسے دیکھتا رہا۔ یہ دیسی ساختہ تعویذ مہک یا ارحم کا تو ہرگز نہیں ہو سکتا تھا۔

اس نے کسی وجدانی قوت کے تحت اپنی جیب میں موجود ایک کاغذ تراش ننھے چاقو سے تعویذ سے منسلک پھولی ہوئی تھیلی ایک میز پر رکھ کر پھاڑ دی۔

میز پر مٹی اور تنکے بکھر کر رہ گئے۔ اس مٹی میں گلاب کے پھولوں کی دو خشک پتیاں بھی موجود تھیں۔

"یہ کیسی مٹی ہے؟" خالد نے میز کی سطح پر ہاتھ پھیرا۔

"یہ کسی قبر کی مٹی ہے خالد! ایسی بھربھری مٹی' تنکے اور گلاب کی پتیاں یکجا حالت میں کسی قبرستان میں ہی پائی جاتی ہیں۔" وہ اعتماد سے بولا۔ "تم لاشیں پوسٹ مارٹم کے لیے روانہ کرو اور ان دونوں کا لیپ ٹاپ' موبائل وغیرہ بھی اپنے قبضہ میں لے لو۔ مجھے یقین ہے یہاں بھی ہمیں کسی قسم کا کوئی فنگر پرنٹ نہیں ملے گا۔"

"اور اس کا کیا کرنا ہے؟" خالد نے میز کی طرف اشارہ کیا۔

"اسے محفوظ کر لو۔ کل صبح قبرستان چلیں گے۔"

☆☆☆

قبرستان کے باہر اس وقت زیادہ ہجوم نہیں تھا۔

سکندر نے گاڑی ایک جانب روکی اور قطار میں موجود گل فروشوں کی جانب دیکھنے لگا۔ وہ اس سے قبل تین قبرستانوں کا دورہ کر چکے تھے لیکن کوئی بھی سراغ ہاتھ نہیں آیا تھا۔ اس نے قطار میں موجود پہلے گل فروش کو اشارے سے اپنے پاس بلایا۔

"کیا نام ہے تمہارا؟" سکندر نے تحکمانہ انداز میں پوچھا۔

"شبیر...... لیکن مجھ سے کیا جرم ہو گیا ہے سرکار؟"

"کوئی جرم نہیں ہوا بیوقوف...... تم سے ایک شخص کی شناخت کروانی ہے...... ان شناختی کارڈز کو غور سے دیکھو اور بتاؤ کہ ان میں سے کسی کو تم نے یہاں آتے جاتے دیکھا ہے کبھی۔" سکندر نے 'اسٹائل اینڈ ایلی گینس' کے ملازمین کے کاغذات اسے تھمائے۔

شبیر آنکھیں سکیڑ کر مکمل دھیان سے انہیں دیکھتا رہا۔ پھر ایک تصویر کو دیکھ کر جوش سے بولا۔

"یہ شخص باقاعدگی سے یہاں آیا کرتا ہے۔ بہت دکھی تھا بے چارہ...... اس کے بھائی نے خودکشی کی تھی۔"

سکندر نے اس کے ہاتھ سے مطلوبہ کاغذ پکڑا اور دم سادھے کوائف پر نظر دوڑانے لگا۔

"نام...... عبدالباسط خان
جنس...... مرد
تاریخ پیدائش...... 1992ء
شناختی علامت...... پیشانی پر چوٹ کا نشان"

عقبی جانب ایک رہائشی پتا لکھا تھا جو راولپنڈی کے ایک مضافاتی علاقے کا تھا۔ ایک کونے میں باریک سی لکھائی میں رفیق احمد نے اس کا مقامی پتا درج کر رکھا تھا۔ یہ دارالحکومت ہی کی ایک عمارت کا ایڈریس تھا۔

گوہرِ مقصود ملتے ہی ان کے اعصاب میں برق دوڑ گئی۔ وہ مزید تاخیر کے متحمل نہیں ہو سکتے تھے۔

☆☆☆

عبدالباسط کسلمندی سے اپنے بستر میں لیٹا ہوا تھا۔

گزشتہ رات اپنی مہم سے واپسی پر وہ بہت سرشار اور مطمئن تھا۔ جانے کتنی مدت بعد وہ ایسی پُرسکون اور میٹھی نیند سونے میں کامیاب ہوا تھا۔ بیدار ہونے کے بعد اس نے حسبِ معمول ٹی۔ وی آن کیا۔

اس کی توقعات کے عین مطابق تمام نیوز چینلز پر ایک ہاہاکار مچی ہوئی تھی۔ وہ چمکتی آنکھوں اور پُرسکون اعصاب سے مہک اور ارحم کی لاشیں دیکھتا رہا۔ پھر عادتاً گلے میں موجود تعویذ اپنی شرٹ سے نکال کر ہونٹوں سے لگانا چاہا تو ششدر رہ گیا۔

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

تنویر اس کے سامنے موجود نہیں تھا۔

اسی وقت فلیٹ کا دروازہ ایک دھماکے سے کھلا اور تین پولیس اہلکاروں نے اسے اپنے نرغے میں لے لیا۔

☆☆☆

انسپکٹر سکندر اپنے دفتر میں موجود فون پر اے ایس پی صاحب سے نئی ہدایات لے رہا تھا۔

''کیا اس نے اعترافِ جرم کرلیا؟'' اے ایس پی نے استفسار کیا۔

''نو سر! بہت مضبوط اعصاب کا مالک ہے۔ فی الحال اس نے زبان نہیں کھولی لیکن ابھی ریمانڈ کی مدت باقی ہے...... وہ جلد ہی......''

''نہیں کھولی تو تم کس مرض کی دوا ہو......'' اے ایس پی نے اسے فوراً ٹوکا۔ ''مجھے اس کا اقبالی بیان بہرصورت چاہیے سکندر! میڈیا پہلے ہی ہمارے خلاف محاذ آرائی میں کم نہیں تھا۔ اب ایک معمولی سی درکر کی موت نے انہیں ہمارا عوامی تاثر مزید برباد کرنے کا موقع فراہم کردیا ہے۔ ہر طرف یہی قیاس آرائیاں ہورہی ہیں کہ پولیس عبدالباسط کو کوئی نہ کوئی محفوظ رستہ فراہم کردے گی۔'' وہ بری طرح دباؤ میں تھا۔

''میں بھرپور کوشش کرتا رہوں گا سر!'' سکندر ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔

''کوشش نہیں...... مجھے رزلٹ چاہیے...... صرف رزلٹ۔'' اس نے نخوت سے کہتے ہوئے فون آف کردیا۔

سکندر نے مخالف سمت میں بیٹھے خالد کو دیکھا۔ اس کے ماتھے پر بھی گہرے بل تھے۔ وہ جانتا تھا کہ کسی بھی لمحے ماحول کا تناؤ اور اعصابی کشیدگی دور کرنے کے لیے خالد اپنے 'شوق' کی پٹاری سے کوئی شگوفہ برآمد کرلے گا۔

''اس پر ہر قسم کا حربہ آزما کر دیکھ لیا ہے لیکن وہ ٹس سے مس ہی نہیں ہورہا۔ میرا دل چاہتا ہے کہ مجرم بس ایسے ہوں کہ جب انہیں ایک تھپڑ رسید کیا جائے تو وہ فوراً حوالات میں روتے ہوئے سب جرائم اُگل دیں۔'' خالد نے شرارت سے کہا۔

سکندر اس کی بات پر اپنا قہقہہ ضبط نہ کرسکا۔ ''ایسے مجرم درکار ہیں تو پڑوسی ملک کے ٹی وی شوز میں بھرتی ہو جاؤ۔ خوب مزے کرو۔''

''اس بارے بھی کبھی سوچیں گے۔ فی الحال تو اس کی زبان کا قفل توڑنا ہے۔''

''میں ایک اور کوشش کرتا ہوں کہ عبدالباسط اقبالی بیان دینے کے لیے رضامند ہوجائے۔'' سکندر نے کہا۔

کچھ ہی لمحوں بعد وہ حوالات میں اس کے سامنے ایک کرسی پر بیٹھا تھا۔ اسے باسط کی معصوم صورت اور شائستہ طور طریقے دیکھ کر یقین ہی نہیں ہوتا تھا کہ ایسا شخص چار افراد کا قاتل بھی ہوسکتا ہے۔ وہ اطمینان سے پاؤں پسارے اپنی نظریں چھت پر جمائے نیم دراز تھا۔

''تمہارے اس سکون اور اطمینان پر حیرت ہوتی ہے مجھے عبدالباسط خان! اسٹائل اینڈ ایلی گینس کا سب سے ہنرمند ٹیلر، محض چھ ماہ میں اپنی بہترین ساکھ بنانے کے بعد تمہیں ایسی کیا ضرورت آن پڑی تھی کہ تم نے چانڈیو خاندان کا مکمل صفایا کردیا...... دولت درکار تھی یا شہرت؟''

''کچھ بھی نہیں...... دولت نہ شہرت...... مجھے بس ان سے قیمت وصول کرنی تھی جو میں نے کرلی۔'' اس نے بے نیازی سے کہا۔ ''اب فحاشی کا وہ گڑھ ہمیشہ کے لیے اپنی موت آپ مرجائے گا۔''

''غلط فہمی ہے تمہاری...... بوتیک کے معاملات اظہر چانڈیو نے اپنے ہاتھ میں لے لیے ہیں۔ وہاں کاروبارِ زندگی پر کوئی فرق نہیں پڑا۔'' اس نے اعتماد سے کہا۔

''جھوٹ بول رہے ہو تم۔'' وہ تڑپ کر سیدھا ہوا۔

''مجھے جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت ہے۔ اگر تم صرف وہ بوتیک ختم کرنا چاہتے تھے تو چار افراد کو موت کے گھاٹ کیوں اتارا؟''

''وہ سب اسی قابل تھے آفیسر!''

''ہاں! میں جانتا ہوں کہ رزاق اور روحینہ اخلاقی پسماندگی کا شکار تھے لیکن ارحم نے کیا بگاڑا تھا تمہارا؟''

''اسی نے اس کھیل کا آغاز کیا تھا۔ اختتام میں نے کر دیا۔ لیکن اظہر اب پھر سے وہی سب شروع کردے گا۔ بہت برا ہوا یہ...... بہت برا۔'' اس نے بے چینی سے ہاتھ مسلے۔

''تم مجھے کھل کر بتاؤ باسط! ہوسکتا ہے جو کام تم نہ کر سکے، وہ میں مکمل کردوں...... میں اس وقت کسی ٹیپ ریکارڈر کے ساتھ نہیں آیا...... اپنا موبائل بھی تمہارے سامنے آف کیے دیتا ہوں۔ یہ گفتگو اقبالِ جرم قرار نہیں پائے گی، میرا یقین کرو۔'' سکندر نے نرمی و خلوص سے کہا۔

باسط کے بے ریا اور شفاف چہرے پر تائیدی تاثرات در آئے۔ اس کی خاموشی کا قفل ٹوٹنے لگا۔

☆☆☆

عبدالباسط خان چھ ماہ قبل دارالحکومت منتقل ہوا تھا۔

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

اس کا آبائی شہر راولپنڈی تھا جہاں وہ ایک مضافاتی بستی میں رہتا تھا۔ والدین کے علاوہ اس کی زندگی کا محور و مرکز عبدالہادی تھا۔ ان کی زندگی گھر سے اسکول اور اسکول سے گھر تک محدود تھی۔ کھیلنے کودنے کا شوق دونوں کو ہی نہیں تھا۔

زندگی میں پہلا تغیر ان کے والد کی ایک بم دھماکے میں ناگہانی موت کی صورت میں آیا۔ عزیز ایک ٹیکسی ڈرائیور تھا۔ اس روز بھی وہ ایک سواری کے ساتھ مارکیٹ میں موجود تھا۔ ایک انتہائی طاقتور بم دھماکے نے وہاں سبھی کے پرخچے اڑا دیے تھے۔ سرتوڑ کوشش کے بعد بھی وہ عزیز کے جسمانی اعضاء تلاش ہی نہ کر پائے تھے۔ اس کے شناختی کاغذات اور پرس میں موجود رقم کسی شقی القلب نے غائب کر کے لاش کو بالکل ہی لاوارث بنا دیا۔

ان کے گھر کی آمدن کا واحد ذریعہ وہی ٹیکسی تھی۔ حکومت کی جانب سے اس دھماکے میں شہید ہونے والے افراد کو دو لاکھ روپے فی کس دینے کا اعلان کیا گیا مگر وہ رقم بھی ان تک کبھی بھی پہنچ ہی نہ پائی۔ کھانے والے نفوس اب تین تھے اور کمانے والا راہی عدم۔ باسط کی عمر اس وقت چودہ سال تھی۔ وہ مڈل کلاس کا طالبعلم تھا لیکن اب پڑھائی لکھائی چھوڑنے کے سوا کوئی اور چارہ نہ تھا۔

اس کی والدہ نے اولاد کی بنیادی ضرورت پوری کرنے کے لیے علاقے کے متمول افراد کے گھروں میں صفائی ستھرائی اور کھانا بنانے کی نوکری حاصل کرنے کی کوششیں شروع کر دیں۔ باسط کو یہ سب بالکل گوارا نہ تھا۔ وہ ایک حساس اور بیدار مغز انسان تھا اس لیے بخوبی جانتا تھا کہ عزت و آبرو سے کام کرنے والی خواتین کو بھی ان کی پیٹھ پیچھے کن القابات سے یاد کیا جاتا ہے۔

باسط نے اپنی سبھی کتابیں اور کاپیاں ردی میں بیچ دیں۔ وصول ہونے والی رقم اونٹ کے منہ میں زیرے کے برابر ہی سہی لیکن دو ایک روز تو گھر میں ایک وقت چولہا جل سکتا تھا۔ عزیز خان کے ایک شناسا نے اسے راجہ بازار میں کپڑے کی ایک دکان پر سیلز مین کی نوکری دے دی۔ اسے ڈیڑھ سو روپے دیہاڑی ملتی اور کھانے کے لیے تیس روپے الگ۔ لیکن وہ یہ پیسے بھی خرچ نہ کرتا۔ رات گئے تمام رقم ماں کے ہاتھ پر دھر دیتا۔ سارا دن اگر بھوک لگتی تو جی بھر کر پانی پی لینے پر ہی اکتفا کر لیتا۔

ہادی اس سے عمر میں چھ سال چھوٹا تھا۔ گول مٹول، ہنس مکھ اور بے حد پرکشش۔ باسط نے اسے بچپن ہی سے اپنی اولاد کی طرح پیار کیا تھا اور باپ کی وفات کے بعد تو وہ حقیقتاً اس کے لیے پدرانہ جذبات محسوس کرتا۔ وہ اسے کسی بھی محرومی کا شکار نہیں ہونے دینا چاہتا تھا۔ اس کی زندگی ہادی کے خوابوں میں رنگ بھرنے کے لیے مختص ہو چکی تھی۔

گارمنٹس کی اس دکان پر کام کرتے ہوئے اسے دو سال کا عرصہ بیت گیا۔ ہادی علاقے کے سرکاری اسکول میں پڑھتا تھا جہاں فیس کا خرچ نہیں تھا۔ دیگر اخراجات پورے کرنے کے لیے باسط اپنی روزانہ اجرت سے بیس روپے الگ کر لیتا۔ اس کی دکان کے مالک نے بھی تہواروں کے موقع پر اس کی امداد کا سلسلہ جاری رکھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ مستقبل میں ہادی کو اچھے ادارے میں پڑھانے کے لیے اسے بہت بھاری رقم درکار ہو گی۔

بازار میں بھانت بھانت کے لوگوں سے روزانہ میل ملاقات کے بعد وہ بیدار مغز اور معاملہ فہم ہو چکا تھا۔ اس نے اپنی ملازمت کے اوقات کار سے ہٹ کر خود بھی کپڑوں کی سلائی کا فن سیکھنے کا ارادہ کر لیا۔ قدرت بھی اس کے لیے رستے ہموار کر رہی تھی۔ اس کی دکان کے مالک کو اس فیصلے کی بھنک پڑی تو اس نے باسط کو اپنے پاس طلب کیا۔

''تمہارا باپ میرا بہت اچھا دوست تھا۔ میں خواہش کے باوجود تم لوگوں کی براہِ راست مدد نہ کر سکا۔ ایسا کرتا تو مرحوم کی بیوہ پر انگلیاں اٹھائی جاتیں۔ اب اگر تم سلائی کٹائی کا ہنر سیکھنا چاہتے ہو تو میں تمہیں باہر کہیں دھکے کھانے نہیں دوں گا۔ اسی بازار میں میرا ایک گودام موجود ہے جہاں ریڈی میڈ ملبوسات تیار کر کے مطلوبہ دکانوں کو سپلائی کیے جاتے ہیں۔ تم کل سے وہیں چلے جایا کرنا۔''

''ٹھیک ہے استاد جی! مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے بھلا؟ لیکن پیسے......''

''خبردار جو پیسوں کی ادائیگی کا سوچا تو نے...... میں تجھ سے ایک پیسہ بھی نہیں لوں گا۔ کل سے دو گھنٹے پہلے ہی چھٹی لے لیا کرنا اور بعد میں بھی مزید کچھ وقت وہاں گزار لینا۔''

اور یوں باسط کی زندگی کا ایک نیا دور شروع ہو گیا۔

اگلے تین سال میں اس نے ذہانت، محنت اور لگن سے اپنی قابلیت ثابت کر دی۔ وہ ایک ہنرمند کاریگر بن گیا تھا جس کے ہاتھ میں زنانہ، مردانہ اور بچگانہ ملبوسات کی یکساں نفاست موجود تھی۔

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

دکان کے مالک شیخ اسحاق نے اسے فراخدلی سے کہیں بھی بہتر سے بہترین نوکری حاصل کرنے کی تجویز دی لیکن عبدالباسط خود کو اس کا مقروض سمجھتا تھا۔ اس نے اسحاق ہی کے ساتھ منسلک رہنے کا فیصلہ کیا۔ اس کی معقول ترین تنخواہ سے گھر میں خوشحالی نظر آنے لگی۔ اب وہ اپنے ادھورے خواب ہادی کی ذات کے توسط مکمل کرنا چاہتا تھا۔

باسط اپنی ضروریاتِ زندگی سے بے بہرہ تھا۔ دو جوڑے کپڑے اور ایک جوڑا چپل کے ساتھ پورا سال گزار دیتا لیکن ہادی کو کسی بھی قسم کی تنگی کا شکار نہیں ہونے دیتا تھا۔ اس کا ہر شوق، خوشی اور مطالبہ پورا کرتا۔ ہادی ایک ذہین اور قابل لڑکا تھا۔ میٹرک کے پرچوں کے بعد اس نے جم جانا شروع کر دیا۔ ان دنوں اس کے اعصاب پر دو ہی چیزیں سوار تھیں۔

کسرت اور اداکاری کا جنون۔

وہ ایک پیدائشی فنکار تھا۔ جب بھی فرصت ملتی، آئینے کے سامنے کھڑا ہو کر مشہور اداکاروں کے مکالمے مکمل جزئیات سے ادا کرتا۔ خواتین اداکاراؤں کی نقالی میں بھی اسے کمال ملکہ حاصل تھا۔

میٹرک کے بعد اس نے انٹر بھی نہایت شاندار نمبرز سے پاس کیا۔ اب وہ دارالحکومت کی ایک انجینئرنگ یونیورسٹی میں داخلہ لینا چاہتا تھا۔ باسط نے زندگی میں پہلی بار اس کا یہ مطالبہ تسلیم کرنے میں تامل محسوس کیا۔

''کیا یہاں رہ کر یہ ڈگری حاصل نہیں کر سکتے ہادی؟'' اس نے اداسی سے کہا۔

''کر سکتا ہوں بھائی جان! لیکن وہاں کے تعلیمی اداروں کا معیار اور ڈگری کی ویلیو زیادہ مستند ہے۔ آج کل تعمیراتی کام، سڑکیں، پُل، بس سروس، ٹرین سروس زوروں پر ہیں اور اسی طرح مقابلہ بھی بہت بڑھ گیا ہے۔ مستقبل میں بقاء کے لیے بین الاقوامی معیار کی ڈگری درکار ہے۔'' ہادی نے اسے اور والدہ کو قائل کر لیا۔

وہ ہاسٹل میں رہائش پذیر تھا۔ اپنی پڑھائی اور مستقبل کے لیے اس کی سنجیدگی بہت بڑھ چکی تھی اور اسی تناسب سے اس کے اداکاری کے شوق میں بھی اضافہ ہوا تھا۔ کالج کے بعد یونیورسٹی کے بہترین ماحول نے اس کی صلاحیتیں نکھار دی تھیں۔ وہ ادبی سوسائٹی کے تحت اکثر اسٹیج پروگرامز میں حصہ لیتا۔

پہلے سمسٹر کے بعد وہ کچھ دن گزارنے گھر آیا تو ماں کی گود میں سر رکھ کے لیٹ گیا۔

''میرا وہاں اکیلے دل نہیں لگتا۔ آپ اور بھائی جان بھی میرے پاس آ جائیں۔''

''تم اپنی ضد سے وہاں گئے تھے ہادی! اب کیا مسئلہ ہو گیا؟'' ماں نے نرمی سے پوچھا۔

''مسئلہ تو کوئی بھی نہیں ہے...... میں وہاں خوش ہوں۔ اساتذہ اور ماحول بھی بہت اچھے ہیں لیکن ہاسٹل میں آپ دونوں کی بہت یاد آتی ہے۔'' وہ اداس تھا۔

''ایک نئی جگہ پر زندگی کا دوبارہ آغاز آسان کام نہیں ہے ہادی!'' باسط نے کہا۔

''آپ ہنرمند ہیں، محنتی ہیں۔ آپ کو جاب حاصل کرنے میں کوئی مسئلہ نہیں ہوگا...... رہائش کے لیے کوئی چھوٹا سا فلیٹ حاصل کیا جا سکتا ہے۔ ہم اپنا یہ گھر کرائے پر دے دیں گے اور یہی کرایہ وہاں ادا کر دیا کریں گے۔''

باسط اس دفعہ بھی عزیز از جان بھائی کی بات ٹال نہ سکا۔ اس نے شیخ اسحاق سے مشورہ کیا۔ اسحاق نے اس کا رابطہ سیٹھ رزاق سے کروا دیا۔ باسط کی ستھری ان دن خوبی دیکھ کر رزاق پھڑک اٹھا اور اسے اسٹائل اینڈ ایلی گینس' میں نوکری دینے کی حامی بھر لی۔

دارالحکومت منتقلی ان کے لیے دشوار ثابت نہ ہوئی۔ نوکری کے بعد رہائش کا مسئلہ صادق خان نے حل کر دیا۔ وہ کچھ عرصہ پنڈی میں انھی کے علاقے میں رہائش پذیر رہا تھا اور باسط کی جدوجہد، محنت، صاف ستھری زندگی کا عینی شاہد تھا۔

چھ ماہ بعد ان کی والدہ نے بھی آنکھیں موند لیں۔ وہ اس نئے شہر کے ماحول میں رچ بس گئے تھے اس لیے یہیں ایک قبرستان میں اسے سپردِ خاک کر دیا۔

عبدالباسط خان 'اسٹائل اینڈ ایلی گینس' کی طرز پر چھوٹے پیمانے پر ہی سہی لیکن اپنا ذاتی بوتیک قائم کرنا چاہتا تھا۔ وہ مزید محنت کرنے لگا لیکن پھر مہک علی اور ارحم چانڈیو کے شیطانی دماغ اور منصوبوں نے ان کے ارادے اور خواہشات کو تنکوں کی طرح بکھیر دیے۔

☆☆☆

مہک نے ارحم کو ایک خاص مقصد کے لیے اپنے دام میں پھنسایا تھا۔ وہ اب تک شوبز انڈسٹری کے بعد میڈیا میں بھی اپنا کوئی خاطر خواہ نام نہیں بنا پائی تھی۔ یہاں ہر طرف گدھ بستے تھے جو مخالف صنف تو کجا ہم جنس پرستی کو بھی اپنے لیے ایک بہت بڑا اعزاز سمجھتے تھے۔

ہم جنس پرستی وہاں ایک فیشن تھی۔ مہک نے دولت

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

کمانے اور اپنی ترقی کی غرض سے جنس کے طلب گاروں کو لڑکیوں اور لڑکوں کی فراہمی کا آغاز کر دیا۔ اس نے ارحم کو 'ٹرائل روم' میں خفیہ کیمرے نصب کرنے کا مشورہ دیا تھا۔ وہ انسانی نفسیات کی ایک بہت بڑی کمزوری سے کھیلنے کے لیے مکمل گراؤنڈ تیار کر چکے تھے۔ پیچ بھی ان کی تھی 'باؤلرز بھی وہ اور ایمپائرز بھی ان کے۔

''کونسی کمزوری؟'' باسط بات کرنے کے دوران لمحہ بھر کے لیے رکا تو سکندر نے حیرانی سے استفسار کیا۔

''آئینہ......'' اس نے مختصراً کہا۔

''وہ کیسے بھلا؟'' سکندر اب بھی حیران تھا۔

باسط اس کی ناسمجھی پر ہلکا سا مسکرایا اور سلسلۂ کلام کا دوبارہ آغاز کرتے بولا۔

''آئینہ اور انسان کا باہمی رشتہ بھی بہت انوکھا ہے آفیسر! وہ اس کا بہترین دوست ہے۔ اسے اپنی کمزوریوں اور کوتاہیوں سے آگاہ کرتا ہے اور دوسری جانب اس کا بدترین دشمن بھی۔ کیونکہ یہی کمزوریاں اور کوتاہیاں وہ دوسروں کو بتادے تو انسان اپنا شخصی وقار کھو دیتا ہے لیکن ان سب کے باوجود یہ آئینہ انسانی فطرت کی بہت بڑی کمزوری ہے۔

'اسٹائل اینڈ ایلی گینس' کے ٹرائل روم میں قدِ آدم آئینے نصب تھے۔ ارحم نے بیک اور فرنٹ مرر میں خفیہ اسپائی کیمرے لگا دیے۔ کسٹمرز کو کسی بھی قسم کا شک نہ ہو پایا کیونکہ بیسمنٹ میں موبائل سگنلز پہلے بھی شاذ ہی آتے۔ اس لیے کیمروں کی موجودگی میں سگنلز ڈراپ ہو جانا ان کے لیے کسی اچھنبے کا باعث نہیں تھا۔

ارحم اور مہک لیپ ٹاپ پر ان کیمروں کی کارکردگی دیکھتے انسانی فطرت کی نیرنگیاں انہیں بہت محظوظ کرتیں۔ لڑکیوں کو ٹریس کر کے بلیک میل کرنا ارحم کے ذمے تھا۔ ویڈیوز کے پسِ منظر میں ہلکی سی چند تبدیلیوں کے بعد وہ اس کا بھرپور فائدہ اٹھاتے۔ وہ ہاتھ پاؤں بچا کر کام کر رہے تھے۔ بوتیک کی گڈول ان کے لیے بہت مضبوط آڑ تھی جسے وہ کسی بھی قیمت پر گنوانا نہیں چاہتے تھے۔

لڑکوں کے ٹرائل روم میں ملنے والی ویڈیوز البتہ خاصے کی چیز ہوتی تھیں۔ نوجوان لڑکے 'مرد' حتیٰ کہ عمر رسیدہ افراد بھی آئینے کے سامنے عجیب و غریب حرکات کرتے۔ اپنے مسلز باڈی بلڈرز کی طرح پھلا کر خوش ہوتے 'اپنی شاندار باڈی دیکھ کر خود کو ہوائی بوسے دیتے' کچھ منچلے لڑکیوں کے ناز و انداز میں اپنی تعریفیں کرتے تو کئی نفس پرست اپنے جسمانی اعضاء کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کرنے سے بھی گریز نہ کرتے۔

مہک ایسے ہی افراد کی تلاش میں رہتی تھی۔ وہ بہت اطمینان اور اعتماد سے انہیں اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرتی رہی۔ اور پھر ایک دن ان دونوں کی شیطنیت نے عبدالہادی کو اپنی زد میں لے لیا۔

☆☆☆

ہادی کی سالگرہ تھی۔

پنڈی میں ان کی والدہ ہمیشہ اپنی بساط کے مطابق خصوصی اہتمام کر لیا کرتی۔ پچھلے سال باسط نے چھوٹے بھائی کو ایک اسمارٹ فون تحفتاً دیا تھا اور اس سال اُس نے کچھ برانڈڈ کپڑوں کی فرمائش کی۔

باسط نے اسے اپنی پسند کے ملبوسات خریدنے کے لیے اس شام بوتیک پر بلوالیا۔ ٹاپ اور فٹنگ چیک کرنے کے لیے وہ ٹرائل روم میں چلا گیا۔ اب جانے یہ بدقسمتی تھی یا وقت کا کوئی کمزور لمحہ...... ہادی کے ذہن پر دو روز بعد سوسائٹی کے تحت منعقد ہونے والا ایک ڈراما حاوی تھا۔ وہ اس ڈرامے میں ایک بہت اہم کردار ادا کر رہا تھا۔ اسے اکثر اساتذہ کہا کرتے تھے کہ فنِ تقریر اور اداکاری میں اعتماد و نکھار پیدا کرنے کے لیے آئینے کے سامنے مشق بہت فائدہ مند ثابت ہوتی ہے۔

ہادی کو یہ تکنیکی نکتہ بہت غلط وقت' اور غلط ترین مقام پر یاد آیا تھا۔ اس نے اپنے ڈرامے کی ریہرسل شروع کر دی۔ وہ اپنی اداکاری میں اس قدر ڈوب چکا تھا کہ اپنا غیر مناسب لباس تک فراموش کرتے ہوئے مقابل اداکارہ کے مکالمے بھی خود ہی ادا کرنے شروع کر دیے۔

ملبوسات کی خریداری کے بعد وہ تقدیر کے داؤ سے بے خبر واپس لوٹ گیا۔

اگلے روز مہک معمول کے مطابق ریکارڈنگ دیکھتے ہوئے ہادی کی خوبصورتی' کسرتی جسم اور صلاحیتیں دیکھ کر پھڑک اُٹھی۔ اس کی انڈسٹری میں 'ذہنی مریض' نما افراد ایسے لڑکے ہاتھوں ہاتھ لیتے تھے۔ سی سی ٹی وی فوٹیج میں... بوتیک سے روانہ ہوتے ہوئے اس کے کندھے پر یونیورسٹی کے لوگو والا ایک بیگ نظر آنے کے بعد انہیں اس لڑکے کو تلاش کرنا بالکل بھی مشکل ثابت نہ ہوا۔

وہ دونوں ڈرامے سوسائٹی میں اس کی اداکاری دیکھنے کے بہانے وہاں جا پہنچے۔ طے شدہ منصوبے کے مطابق ارحم نے خود کو میڈیا کا نمائندہ ظاہر کرتے ہوئے اسٹیج

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

پر اس کی اداکاری کی بے حد تعریف کی اور ٹی وی ڈرامے میں موقع دینے کا چارا ڈالتے ہوئے اگلے روز اسے مہک کے فلیٹ پر بلا لیا۔

ہادی اس پیشکش پر بہت خوش تھا۔ اس نے ٹرائل دینے کا فیصلہ کر لیا۔ اس کا ارادہ یہی تھا کہ وہ کامیابی کی صورت میں ہی بڑے بھائی کو 'سرپرائز' دے گا بصورتِ دیگر خاموش ہو جائے گا۔

دو روز بعد وہ مہک کے فلیٹ پر پہنچ گیا۔ پروڈکشن ہاؤس کا ایک سینئر پروڈیوسر اور پولیس کا ریٹائرڈ افسر بھی وہاں موجود تھے۔ دونوں ہی ہم جنس پرست تھے۔ ہادی کو پلائی گئی کولڈ ڈرنک میں نشہ آور سفوف شامل کر دیا گیا۔

ہادی ہر لحاظ سے انہیں پسند آیا تھا۔

''یہ لڑکا تمہاری بہترین دریافت ہے مہک! کچھ روز بعد میں دبئی جا رہا ہوں۔ اور یہ بھی میرے ساتھ ہی جائے گا۔ اسے کسی بھی قیمت پر راضی کرو۔'' پروڈیوسر نے مہک کو نوٹوں کی ایک موٹی گڈی تھمائی۔

''اگر راضی نہ بھی ہوا تو دو چار روز کے لیے حوالات میں بھجوا دیں گے...... خود ہی لائن پر آ جائے گا۔'' افسر نے بے ہوش ہادی کو معنی خیز نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

ہادی کے ہوش میں آتے ہی اسے کسی 'قیامت' کا اندازہ ہو گیا تھا۔ مہک نے اسے شہزاد کی پیشکش سے آگاہ کیا۔ وہ اس کی قسمت پر رشک کر رہی تھی۔

''دولت تمہاری باندی بننا چاہتی ہے۔ تمہارے تو دن ہی پھر جائیں گے۔''

''میں ہرگز اس غلاظت کا حصہ نہیں بنوں گا...... سمجھے تم لوگ۔'' وہ چلایا۔

''ٹھیک ہے...... تو پھر میں تمہاری یہ ویڈیوز سوشل میڈیا پر وائرل کرنے کے بعد یونیورسٹی میں بھی سب طلبا اور اساتذہ کے نمبرز پر بھیج دوں گا...... انہیں بھی تو علم ہو کہ یہ معصوم صورت 'ذہین نظر آنے والا لڑکا اصل میں کن کاموں میں ملوث ہے۔'' ارحم نے اس کی تینوں ویڈیوز دکھائیں۔

ہادی کے اعصاب سخت شکستگی کا شکار تھے۔ وہ لڑکھڑاتے قدموں سے لوٹ آیا۔ اس نے باسط کو ایک مختصر سا آڈیو پیغام بھیجا تھا۔

''میں اپنی مرضی سے خودکشی کر رہا ہوں بھائی جان...... بس میری ایک آخری خواہش بھی پوری کر دینا...... میری لاش پوسٹ مارٹم اور پولیس سے محفوظ رکھنا...... مجھے خاموشی سے دفن کر دینا...... میں جینے کی قیمت مزید نہیں چکا سکتا۔''

باسط کو یہ پیغام بہت تاخیر سے موصول ہوا۔ بوتیک میں موبائل فون استعمال ہی نہ ہوتے تھے۔ اس تاخیر نے اس سے سب کچھ چھین لیا۔ ہادی نے اسی رات خودکشی کر لی تھی۔

☆☆☆

''تمہیں پولیس کو اطلاع کرنی چاہیے تھی۔'' سکندر نے اس کے خاموش ہونے پر کہا۔

''میں نے ساری زندگی اس کی خواہشات پوری کیں...... اب آخری خواہش کیسے ٹال دیتا؟''

''رزاق اور روحینہ کا اس معاملے میں کیا قصور تھا؟ انہیں تو اس قضیہ کا علم ہی نہ تھا۔'' سکندر نے اپنی الجھن بیان کی۔

''یہی تو ان کا قصور تھا کہ وہ لاعلم کیوں تھے، وہ اپنے بیٹے کی تربیت کے ذمے دار تھے۔ ان کی اسی کوتاہی کی سزا جانے کتنے افراد اور خاندانوں نے بھگتی ہوگی۔ ریکی کے دوران روحینہ اور رفیق کا افیئر علم میں آیا تو انہیں اذیت سے دوچار کرنے کے لیے میں نے ہی اظہر چانڈیو کو اس کے پیچھے لگایا تھا...... اس کا رفیق پر ہی اکتفا نہیں تھا...... وہ تو پکے ہوئے پھل کے مانند میری جھولی میں گرنے کے لیے بیتاب تھی۔'' باسط نے زیرِلب اسے گالی دی۔

''تمہیں ارحم اور مہک کے اس سارے قصہ کا علم کیسے ہوا؟ ہادی نے تو کچھ بھی نہیں بتایا تھا......'' سکندر کے ذہن میں ایک اور سوال مچلا۔

''میں بھی اکثر سوچتا تھا کہ اس نے حرام موت کیوں چنی؟ وہ زندگی کا دلدادہ تھا۔ تو پھر ایسا کیا ہوا کہ وہ ایک انتہائی قدم اٹھانے پر مجبور ہو گیا۔ سمسٹر بریک کی وجہ سے میں نے اس کے احباب کو اطلاع بھی نہ دے سکا۔ اور اس کی خواہش کے مطابق خاموشی سے تدفین کر دی۔'' باسط نے ایک بار پھر انکشافات کا سلسلہ شروع کیا۔

''ہادی کا سامان' کتابیں' کپڑے' جوتے اور موبائل اس کے لیے بہت قیمتی متاع تھے۔ وہ ان سب میں مرحوم بھائی کی خوشبو محسوس کیا کرتا۔ باسط کو اپنی زندگی بے مقصد لگنے لگی تھی مگر ایک روز شبیر کے عام سے فقرہ نے اس کے ذہن میں کھلبلی مچا دی۔ وہ تندہی سے ہادی کی خودکشی کی وجہ دریافت کرنا چاہتا تھا۔

اسی رات باسط نے ہادی کا موبائل آن کیا۔ اس کا موبائل اور کتابیں یونیورسٹی بیگ میں ہی موجود تھیں۔ باسط کو

Downloaded From Paksociety.com

قیمت Downloaded from Paksociety.com

یہ سب سامان اسی چٹان کے ایک پتھر پر رکھا ملا تھا۔
ایک انجانے نمبر سے موصول ہونے والے کچھ پیغام اور ویڈیوز دیکھ کر اس کی تمام الجھنیں رفع ہو گئیں......
وہ پیغام مہک کی جانب سے بھیجے گئے تھے۔ اس نے ہادی کو موبائل بند رکھنے اور بنا اطلاع غائب ہونے کی پاداش میں اس کی تمام ویڈیوز وائرل کرنے کی دھمکی دی تھی۔ اس ویڈیو کو دیکھنے کے بعد باسط کو سارا قصہ سمجھ آ گیا۔ لیکن اس پروڈیوسر اور افسر کے چہرے واضح نظر نہ آ رہے تھے۔ اس نے کپکپاتے ہاتھوں سے اس نمبر سمیت موبائل میں موجود سبھی نمبرز پر یک سطری پیغام بھیج دیا۔
''عبدالہادی اب اس دنیا میں نہیں رہا......''
مہک پر تو جانے اس خبر کا کیا اثر ہوا؟ مگر باسط کی زندگی کو اب ایک نیا مقصد مل گیا تھا۔ اس نے جاں توڑ ریکی کے بعد اپنے مجرموں کی فہرست تیار کی اور ان کا شکار کھیلنے کا فیصلہ کر لیا۔
روحینہ اس کی صورت شناس نہیں تھی۔ وہ اپنی نفسیاتی کجی کے باعث خود بخود اس کی طرف مائل ہوئی۔ مہک اور ارحم تک پہنچنے کے لیے اسے ایک درمیانی کڑی استعمال کرنی پڑی اور بالآخر اس نے اپنا مقصد حاصل کر لیا۔
''انصاف حاصل کرنے کے دو ہی طریقے ہیں آفیسر! پولیس تک رسائی حاصل کی جائے یا میڈیا تک اپنی آواز پہنچائی جائے۔ میں ان دونوں ہی کے پاس جانے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔ ان کے لیے میری زبان خاموش کروانا اپنی صفوں میں موجود کالی بھیڑوں کے خاتمہ سے زیادہ آسان ہوتا...... مجھے ہر حال میں ہادی کے مجرموں کے بوجھ سے اس دھرتی کو آزاد کرنا تھا۔'' باسط کی آنکھوں میں نمی تھی۔
''پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہوتیں، تمہیں قانونی راہ اپنانی چاہیے تھی۔'' سکندر نے زور دیتے ہوئے کہا۔
''اصل مجرم تو اب بھی شرافت کے نقاب میں پوشیدہ بیٹھے ہیں۔ اگر تمہارے ذہن میں کوئی کیڑا کلبلا رہا ہے تو میرا یہ بیان من و عن اپنے افسران تک پہنچا دینا۔ نتیجہ بھی جلد ہی برآمد ہو جائے گا۔'' اس نے طنزیہ کہا اور اپنا بازو آنکھوں پر رکھے حوالات کے ٹھنڈے فرش پر دراز ہو گیا۔

☆☆☆

انسپکٹر سکندر اس صورتِ حال پر اپنے ہاتھ بندھے ہوئے محسوس کر رہا تھا۔ اس نے بہت سوچ بچار کے بعد باسط کے یہ انکشافات اے۔ ایس۔ پی صاحب کے گوش گزار دیے۔
''میں تمہاری کارکردگی کی رپورٹ افسرانِ بالا تک پہنچا دوں گا۔ گڈ جاب ڈن۔'' اس نے کہا۔
اپنے دفتر میں واپسی کے بعد سکندر بہت خاموش تھا۔ خالد بھی اس کی کیفیت کو محسوس کیے بغیر نہ رہ سکا۔
''کس بات کی پریشانی ہے جناب؟''
''مجھے ایسا لگتا ہے کہ اس کیس میں ابھی بہت سے موڑ باقی ہیں۔'' سکندر نے پیشانی مسلی۔ ''ہمارے ہی ڈیپارٹمنٹ کے کچھ لوگوں کی شمولیت اصل ذمے داران کو کبھی کیفرِ کردار تک نہیں پہنچائے گی۔''
خالد بھی خاموش ہو گیا۔
اگلے روز ایک بڑی سیاسی جماعت کے احتجاجی مظاہرے کو روکنے کے لیے تھانوں سے اضافی نفری طلب کی گئی۔ دن بھر مظاہرین کے ساتھ خوار ہونے کے بعد وہ شام ڈھلے اپنے گھر پہنچا تھا۔ کچھ دیر آرام کے بعد ہی وہ تھانے کا چکر لگانا چاہتا تھا۔ اس نے ملازم کو کافی بنانے کا حکم دیا اور سگریٹ سلگا کر صوفے پر دراز ہو گیا۔
چند منٹ بعد ہی اسے خالد کا فون موصول ہوا۔
''تمہارے خدشات درست تھے...... نیوز چینل دیکھو جلدی۔''
سکندر نے الجھتے ہوئے ٹی وی آن کی۔ ہر چینل پر باسط ایک بریکنگ نیوز کی صورت میں موجود تھا۔ نیوز کاسٹر چیخ چیخ کر ایک ہی بیان دہرا رہے تھے۔
''شہر کے معروف بزنس مین رزاق چانڈیو اور ان کے اہلِ خانہ کا مبینہ قاتل پولیس حراست میں ہلاک......
تفصیلات کے مطابق عبدالباسط دو روز سے پولیس حراست میں تھا۔ کل شام سیاسی جماعت کے احتجاجی مظاہرے میں بدامنی پیدا کرنے کے شبہے میں ایک شخص نواز کو گرفتار کر کے حوالات بھیج دیا گیا۔ عبدالباسط نے نواز پر مجرمانہ حملہ کرنے کی کوشش کی جس کے بعد نواز نے اپنے دفاع کے لیے اسے ہلاک کر دیا......
ہم آپ کو ایک بار پھر بتاتے چلیں کہ عبدالباسط نے چانڈیو خاندان کے علاوہ ارحم چانڈیو کی منگیتر اور بے گناہ میڈیا کارکن مہک علی کو بھی قتل کر دیا تھا، وہ پولیس ریمانڈ میں تھا لیکن آج اس افسوسناک حادثے کے بعد عبدالباسط بھی ہلاک ہو گیا ہے۔ ہم پولیس افسران سے رابطہ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اس کیس کی تازہ ترین صورتِ حال سے ہم آپ کو آگاہ کرتے رہیں گے۔''

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

سکندر سوچتی نظروں سے اسکرین کو دیکھ رہا تھا۔ باسط کسی صورت بھی نواز پر مجرمانہ حملہ نہیں کر سکتا تھا۔ اس کے انکشافات یقیناً اعلیٰ سطح پر پہنچ چکے تھے۔ اور بااختیار افراد نے ایک پیج تیار کرنے کے بعد اسے فنا کے گھاٹ اتار دیا۔ اس کے موبائل کی گھنٹی بجی۔ ایک بوجھل سانس لیتے وہ اے ایس پی کی سخت سست سننے کے لیے تیار ہو گیا۔

''انسپکٹر! تمہاری کوتاہی کی سزا ہم سب بھگت رہے ہیں۔ تھانے میں نفری کیوں کم تھی؟''

''نفری اعلیٰ افسران کے حکم پر احتجاجی مظاہرے میں حالات پُرامن رکھنے کے لیے روانہ کی گئی تھی سر!'' اس نے ضبط کرتے ہوئے کہا۔

''اس ہائی پروفائل کیس کے لیے تمہیں کوئی متبادل انتظام سوچنا چاہیے تھا۔ بہر حال اس غیر ذمے داری کی جواب دہی اور سزا کے لیے ذہنی طور پر تیار رہنا۔'' وہ تکبر سے اسے دھمکاتے ہوئے بولا۔

''میں تر نوالہ نہیں ہوں...... اس کیس کا نیا رخ تو دنیا اب دیکھے گی۔'' وہ فون بند کر کے غصے سے بڑبڑایا۔

☆☆☆

سکندر کے سامنے لیپ ٹاپ سے الجھتا ایک نوجوان بیٹھا تھا۔

''مزید کتنا وقت درکار ہے سہیل؟'' اس نے اپنا سابقہ سوال دہرایا۔

''بس دو منٹ اور......'' سہیل نے مصروف سے انداز میں کہا۔ وہ خالد کا چھوٹا بھائی تھا اور غیر قانونی آئی ٹی معاملات میں خاصا ماہر تھا۔ سکندر نے اسے مہک کے لیپ ٹاپ پر موجود تمام تر 'قفل' ختم کرنے کے لیے بلایا تھا۔

''لیجیے! آپ کا کام ہو گیا۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''بہت شکریہ برادر!'' سکندر نے اس کے کندھے پر تھپکی دی۔

سہیل کے رخصت ہوتے ہی اس نے لیپ ٹاپ کو اچھی طرح کھنگالنا شروع کر دیا۔ اس کی توقعات کے عین مطابق 'اسٹائل اینڈ ایلی گینس' کے ٹرائل روم میں بنائی گئی ویڈیوز کے علاوہ مہک کے فلیٹ میں بلیک میلنگ کے لیے بنائی گئی کچھ ویڈیوز بھی ایک فولڈر میں موجود تھیں۔

سکندر کی آنکھیں جوش سے چمکنے لگیں۔ اس نے اپنی جیب میں موجود ایک قلم نکالا۔ اس قلم میں موجود ننھے سے آڈیو ریکارڈر میں اس نے باسط کا اقبالی بیان اسی روز محفوظ کر لیا تھا۔ آڈیو ریکارڈنگ سے اپنی آواز وہ سہیل سے گزشتہ روز ہی ختم کروا چکا تھا۔ اس نے وہ بھی مواد ایک ای میل کے ساتھ منسلک کیا اور مہک علی کے بدترین حریف چینل کو روانہ کر دیا۔ یہ فرضی ای میل اکاؤنٹ بھی ایک روز قبل ہی بنایا تھا۔

اسے ایک 'دھماکے' کا شدت سے انتظار تھا۔

☆☆☆

پولیس افسران کے اجلاس میں سخت تناؤ کی کیفیت تھی۔

ایس پی' اے ایس پی کے علاوہ انسپکٹر سکندر کو بھی طلب کیا گیا تھا۔ ایک روز قبل ریٹنگ میں نمبر ون چینل پر پر نشر ہونے والی کچھ متنازعہ ویڈیوز نے قانونی حلقوں کے علاوہ برقی میڈیا میں بھی کھلبلی مچادی تھی۔ عوام ایک معروف بوتیک کی آڑ میں ہونے والی فحاشی' چند ایک پولیس افسران کے کردار کی نقاب کشائی کے بعد میڈیا کے کچھ خفیہ گوشوں سے واقفیت پر شدید ردِعمل کا اظہار کر رہی تھی۔

''کیا رپورٹ ہے انسپکٹر؟'' اے ایس پی نے سکندر سے دریافت کیا۔

''عبدالباسط نے اپنی موت سے قبل اصل ذمے داران تک رسائی کا بندوبست کر دیا تھا۔ مہک علی کے چینل سے وابستہ ہر گناہ گار شخص کی گرفتاری عمل میں آچکی ہے۔ اسٹائل اینڈ ایلی گینس کو سیل کر کے اظہر چانڈیو اور رفیق احمد کو بھی شبہ کی بناء پر حراست میں لے لیا گیا ہے...... لیکن......'' سکندر نے دانستہ بات ادھوری چھوڑ دی۔

''لیکن کیا انسپکٹر؟'' ایس پی نے ناگواری سے کہا۔

''ہمارے ڈپارٹمنٹ کے کچھ سابقہ افسران کے نام بھی اس کیس میں سامنے آئے ہیں...... تو کیا انہیں......؟''

''کسی بھی شخص سے کوئی رعایت نہیں کی جائے گی...... اپنا تاثر بہتر بنانے کا اس سے بہترین موقع کوئی نہیں...... سابقہ افسران کو بھی شاملِ تفتیش کیا جائے گا......'' ایس پی نے میز پر اپنے ہاتھ سے ضرب لگاتے ہوئے کہا۔ ''پریشر ہینڈل کرنا سیکھو انسپکٹر! ورنہ میں یہ کیس کسی اور کے سپرد کر دیتا ہوں۔''

''بہتر سر! آپ کے حکم کی تعمیل ہر قیمت پر کی جائے گی۔'' سکندر نے اپنی خوشی اور مسکراہٹ دباتے ہوئے تابعداری سے کہا اور سر جھکائے اپنی نشست پر بیٹھ گیا۔

Downloaded From Paksociety.com